سوانح حیات قطب الارشاد والتکوین

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ

چراغِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

دار الحدیث دار العلوم دیوبند

مُرتّبہ

امام الزاهدین والعارفین حضرت مولانا قاضی محمد زاهد الحسینی رحمۃ اللہ علیہ

فہرست مضامین چراغِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

✪ ✪ ✪ ✪ ✪

اَلْاِہْدَاء

مخدومانِ عالی مقام

جناب مولانا محمد اسعد مدنی صدر جمعیۃ العلمائے ہند

جناب مولانا محمد ارشد مدنی استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند

جناب مولانا محمد اسجد مدنی ناظم دفتر جمعیۃ العلمائے ہند

زید مجدھم

کے حضور نذرانہ عقیدت

پیش کردہ :

خادمِ آستانہ حضرۃ مدنیؒ

محمد زاہد الحسینی غفرلہٗ

محرم الحرام ۱۴۱۸ھ

پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ

حق تعالیٰ شانہ، نے اپنی رحمتِ کاملہ کے ساتھ حضرتِ انسان کو پیدا فرمایا اور اس کی ہدایت ونجات کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا اور کسی وقت بھی انسان کو راہِ ہدایت کے بغیر نہیں چھوڑا۔ چنانچہ پہلے انسان آدم ہیں اور پہلے نبی بھی آدم علیہ السلام ہی ہیں، یہ سلسلہ چلتا رہا تا آنکہ اللہ تعالیٰ کے آخری اور لاڈلے رسول حضرتِ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، آپ چونکہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں اس لیے آپ کے بعد نبی اور رسول تو کوئی نہیں ہوگا مگر چونکہ ہدایتِ انسانی کا سلسلہ تو قیامت تک رہے گا اس لیے نسلِ انسانی کی فلاح وفوز کے لیے ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے اِس امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃً وسلاماً میں ایسے ایسے لوگ پیدا فرمائے جن کے متعلق سرورِ کونین صلی اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا: اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ

اللہ تعالیٰ نے آخری، کامل اور مکمل دین اس امتِ محمدیہ کو نصیب فرمایا تو اسی دینِ حق کو قیامت تک باقی رکھنے کا ذمّہ بھی خود ہی اٹھایا اور پھر ہر چیز کی حفاظت کے جو طریقے ہو سکتے ہیں انہیں بھی اختیار فرمایا، نیز اہلِ ایمان کو افضل ترین عبادت یعنی نماز میں یہ دعا مانگنے کا حکم فرمایا: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ اور اس مُنعم علیہ گروہ کی نشاندہی بھی خود ہی فرمادی، جیساکہ سورۂ نساء میں ارشاد فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ تو پھر ایسے لوگوں کا قیامت تک موجود رہنا ضروری بھی ہُوا اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق بھی ہُوا۔

ایسے پاکیزہ نفوس کی پاکیزہ زندگیاں، واقعات، احوال واقوال بیان کرنے اور یاد رکھنے ضروری ہیں

کیونکہ جب تک ان لوگوں کی زندگیوں اور پاکیزہ سیرت سے کماحقہٗ آگاہی نہیں ہوگی ان کی عزت و توقیر دل میں آ نہیں سکتی اور جب تک کسی کی توقیر و عظمت دل میں نہ ہو اس وقت تک اس کی پیروی و اطاعت مشکل و بھاری معلوم ہوتی ہے۔

چنانچہ خود اللہ رب العزت نے بھی اس منتخب گروہ کا تذکرہ اجتماعی اور انفرادی دونوں صورتوں میں فرمایا، ارشاد رب العالمین ہے: وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ۔ (سورۃ ص آیت ۴۷) (ترجمہ" اور وہ ہمارے نزدیک منتخب اور نیک لوگوں میں سے تھے"۔ اور فرداً فرداً بھی تعارف کرایا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ۔ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰى اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا۔ اور ان برگزیدہ انسانوں نے جب حق تعالیٰ کے پیغام پہنچانے میں ہر صعوبت، اذیت، تکلیف، مصیبت اور پریشانی کو برداشت کیا تو اللہ رب العزت نے ان کے نقد انعام کو بھی اپنی لاریب اور سچی کتاب میں ذکر فرمادیا کہ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۔ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۔ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۔

جب ایسے برگزیدہ انسان جن کے متعلق سرورِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: "علماء حق ہی انبیاء علیہم السلام کے وارث ہوتے ہیں"۔ تو ایسے علماء باعمل کی زندگی میں ان کے اقوال و افعال کی پیروی ضروری ہے اور بعد از وفات ان کے تذکرے، کارنامے، خدمات بیان کرنا، پھیلانا، دوسروں کو بتانا اور ان کی نشر و اشاعت کرنا بھی ضروری ہوا۔

اسی سلسلۃ الذہب میں دورِ حاضر کے امام الاولیاء، شیخ العرب والعجم، قطب الارشاد والمعرفت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ آپ کی سیرت و سوانح پر کافی کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جاتی رہیں گی، لیکن اپنے شیخ کے جو حالات و واقعات عشق و محبت میں ڈوب کر فہم و عقل کی روشنی میں حضرت اباجی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھے وہ شاید ہی کسی اور کے حصے میں آئیں۔ چنانچہ صاحبزادہ مکرم حضرت مولانا محمد اسجد مدنی صاحب دامت برکاتہم دیوبند سے تحریر فرماتے ہیں: "آپ نے جس خوبی سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ طیبہ اور ان کے فضائل کا احاطہ کیا وہ موضوع

آپ کی روحانی اور جذباتی وابستگی کے علاوہ آپ کے علم وفضل، نظر کی گہرائی، ذہن کی پرواز اور قلم کی روانی کا مظہر ہے''۔

شیخ العرب والعجم حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کیسی تھی؟ پوری تفصیل تو آپ کو کتاب پڑھ کر معلوم ہو سکے گی، یہاں میں صرف اپنے حضرت اباجی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مقولہ نقل کرتا ہوں جو آپ ہمیشہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ ''آج دنیا حضرت مدنی اور حضرت لاہوری نور اللہ مرقدہما کو نہ پہچان سکی لیکن ان برگزیدہ ہستیوں کی قدر پانچسو سال بعد اسی طرح آئے گی جس طرح آج دنیا سید الاولیاء سیدنا شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ کو جانتی و مانتی ہے''۔

یہاں میں گنہگار عرض کرتا ہوں کہ جس طرح دنیا ان برگزیدہ ہستیوں کو یاد کرے گی اسی طرح ان دونوں بزرگوں کے فیض یافتہ، شاگرد رشید، خلیفہ مجاز حضرت اباجی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی یاد کرے گی جن کے متعلق ایک ولی اللہ، مجاور روضۂ رسول اللہ، حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ (جو آج بھی جنت البقیع میں امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں آرام فرما ہیں) کے خادم خاص اور خلیفہ مجاز جو خود بھی مدینہ طیبہ میں تشریف فرما ہیں حضرت صوفی محمد اقبال صاحب مدظلہ نے بوقت ملاقات فرمایا کہ ''بحمد اللہ تعالیٰ آج میں نے حضرت اقدس قاضی صاحب کی زیارت میں اپنے دونوں بزرگوں یعنی حضرت مدنی اور حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہما کی زیارت کرلی''۔ اور پھر ان دونوں برگزیدہ ہستیوں کی شایان شان سوانح لکھنے کی سعادت بھی حضرت اباجی رحمۃ اللہ علیہ کو ہی نصیب ہوئی۔ چنانچہ حضرت اباجی رحمۃ اللہ علیہ خود فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس حیات مستعار میں دو کام مجھ سے لیے، ایک تو محبوب کائنات، محبوب رب العالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر ''رحمت کائنات'' تحریر کی جس کی مقبولیت خود بارگاہ نبوت سے ہوگئی، اور دوسرے اپنے شیخ ومربی حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کی سوانح بنام ''چراغ محمد'' اور اسی طرح شیخ التفسیر، امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ العزیز کی سوانح بنام ''مرد مومن'' تحریر فرمائی۔

حضرت اباجی رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ کی سوانح کی تیاری بہت دیر سے فرما رہے تھے اور عرصہ دراز سے اس کے لیے ضروری مواد اکٹھا فرما رہے تھے اور یہ ساری چیزیں تحریر میں ہی نہ تھیں بلکہ اکثر و بیشتر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو زبانی یاد تھیں، اور جب حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ آجاتا تو بس یوں سمجھ لیجئے کہ

جو ۸۴ سال کا بوڑھا، وجع القلب کا شکار نہیں بول رہا بلکہ ایک نوجوان جس کا دل اپنے شیخ کی محبت و عشق سے معمور ہے اور جس کے نورانی چہرے پر ولیٔ وقت، شیخ العرب والعجم کی داستانِ حیات سنانے سے نور کی بارش برس رہی ہے بے تکان دو دو گھنٹے بولے جا رہا ہے۔

بچپن ہی سے ہمارے گھر میں حضرتِ مدنیؒ اور حضرتِ لاہوریؒ کے تذکرے ہوتے تھے اور جس محبت و عقیدت سے حضرت اباجیؒ ذکر فرماتے ہم حیران ہوتے اور پھر حضرتؒ نے ہمیشہ ان اکابر کے تذکرے کے وقت ان کا نام نہ لیا بلکہ صرف حضرتِ مدنی اور حضرت لاہوری ہی فرمایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ انتہائی جذب و عشق میں فرمایا کہ بحمد اللہ مجھے اپنے شیخ سے اتنی عقیدت ہے کہ میں نے حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی جوتیاں فقط اٹھائی ہی نہیں بلکہ ان کو چوما بھی ہے۔ اور پھر مدت العمر یہ حالت رہی کہ جس کی نسبت بھی حضرتِ مدنیؒ کے ساتھ ہے اس کا تذکرہ آتا تو حضرت اباجیؒ کی حالت عجیب ہو جاتی۔

حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بوقتِ بیعت ایک جُبّہ عطا فرمایا تھا حضرت اباجیؒ کبھی کبھی اس کو نکال کر اس کی زیارت فرماتے ہم بھی زیارت کرتے اور پھر وہ مبارک جبّہ جو حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کے جسم مبارک کی زینت بنتا تھا پھر حضرت اباجیؒ کو عطا ہوا، وہ جُبّہ آج بھی حضرت اباجی رحمۃ اللہ علیہ کے سینہ مبارک پر پڑا ہوا ہے اور ان شاء اللہ قیامت کے دن جب اپنے پروردگار کے سامنے پیش ہوں گے تو حضرت اباجی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اپنے شیخ کی نشانی ضرور ہوگی۔

اسی طرح جب بھی اپنے محبوب آقا کے صاحبزادگانِ محترم تشریف لاتے تو حضرت اباجی رحمۃ اللہ علیہ کی حالت دیدنی ہوتی، اپنے شیخ کے صاحبزادوں کے قدموں میں بچھے بچھے جاتے تھے اور مسجد و مدرسے کے معائنے کے بعد ان کو اپنے کمرۂ خاص اپنے گھر میں ضرور لاتے اور جس چارپائی پر ہمیشہ خود آرام فرماتے تھے اسی پر ان کو بٹھاتے، ان کے سامنے دوزانو بیٹھ جاتے، ان سے دعا کرواتے اور زار و قطار روتے۔ میں سمجھتا تھا کہ حضرت اباجی اب بھی یہی تصور فرما رہے ہیں کہ جس چارپائی پر میرے مخدوم زادے بیٹھے ہیں اسی پر میرا سفرِ آخرت بھی ہو چنانچہ رب کریم نے ایسا ہی فرمایا[1]

اسی طرح حیاتِ مستعار کے آخری دنوں میں جب بتاریخ ۶ اکتوبر ۱۹۹۶ء مطابق ۲۲ جمادی الاول ۱۴۱۷ھ

---

[1] امام الزاہدین والعارفین حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی جامع سوانح ان شاء اللہ جلد ہی زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔

بروز اتوار حضرت اباجیؒ کو حضرت مولانا محمد اسعد مدنی دامت برکاتہم العالیہ کا اسلام آباد سے فون آیا کہ ملاقات کے لیے جی چاہتا ہے، تو حضرت اباجی رحمۃ اللہ علیہ اتنے خوش ہوئے، اتنے خوش ہوئے کہ بار بار فرماتے ضرور زیارت کے لیے جائیں گے۔ تازہ وضو فرمایا اور پھر حضرت صاحبزادہ مکرم مدظلہ کی زیارت وملاقات کے لیے سفر فرما کر مین روڈ تک تشریف لے گئے۔

ہمارے خاندان کی اعلیٰ شان، ولیٔ وقت، عالم بے بدل، مجاہدِ اعظم، حضرت مولانا محمد الیاس نور اللہ مرقدہٗ جو میرے پھوپھی زاد بھائی بھی تھے اور حضرت اباجی رحمۃ اللہ علیہ کے بہت پیارے بھانجے تھے، جن کی وفات پر حضرت اباجی رحمۃ اللہ علیہ زار و قطار روتے اور فرماتے تھے "محمد الیاس! میرا خیال تھا میں تیرے ہاتھوں میں رخصت ہوں گا مگر تو پہلے سبقت کر گیا"۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مدنیؒ کے ساتھ محبت وعقیدت تو پہلے سے تھی مگر جب حضرت ماموں صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ایسی محبت وعشق سے فرماتے اور اتنا تذکرہ ہوتا اتنا تذکرہ ہوتا کہ بس پھر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سوا قلب ونظر میں کوئی بھی نہ سما سکا۔

بہرحال زیادہ تفصیلات تو آپ خود اس کتاب میں پڑھ لیں گے۔ حضرت اباجی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر کام شروع کیا اور باوجودیکہ دل کی شدید تکلیف رہی مگر حضرتؒ رات دن کئی کئی گھنٹے اس پر کام فرما کر اس کو مکمل فرما گئے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا اور اہلِ علم، اہلِ حق نے اس کی جو قدر ومنزلت کی اس کے چند نمونے بھی آپ اس ایڈیشن میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ پہلا ایڈیشن دسمبر ۱۹۹۴ء میں طبع ہوا اور اس کی عنداللہ مقبولیت کا یہ عالم کہ پورے ملک بلکہ عرب وعجم، یورپ وافریقہ کے جید علماء وارباب علم وفضل نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے وقت کی اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں پر یہ ایک قرض تھا جسے حضرت قاضی صاحب نے اتار دیا۔

دوسرے ایڈیشن کے لیے تیاری ہو رہی تھی، کئی اضافے، حوالے اور دوسرے ضروری امور حضرتؒ نے تحریر فرما دیئے تھے اور اس پر کام ہو رہا تھا حتیٰ کہ حیاتِ مستعار کے آخری دن بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر کام فرمایا لیکن جب میرے رب کا بلاوا آ گیا تو حضرتؒ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے پروردگار کے پاس پہنچ گئے۔ اب اس بارِ گراں کا بوجھ ہم ناتوانوں کے نازک کندھوں پر آ گیا، اللہ تعالیٰ

نے ہمیں توفیق دی، ہمت دی اور زیادہ حصہ اس میں برادرِ عزیز حافظ نثار احمد الحسینی خادم حضرت اباجی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ انہوں نے بڑی محنت و محبّت سے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

ضروری گذارش

اگر اس نئے ایڈیشن میں کوئی فرو گذاشت ہو، کوئی سقم ہو تو علماء، صلحاء، اکابرینِ اُمت اور تمام قارئین کی خدمت میں عرض ہے کہ اسے ہماری نالائقی، کم علمی پر محمول فرما کر للّٰہ معاف فرما کر مطلع فرماویں تاکہ آئندہ اس کا تدارک کیا جاسکے، اسلیئے کہ ایک ولیٔ کامل کی سوانح ایک ولیٔ کامل ہی تحریر کر سکتا ہے جیساکہ پہلا ایڈیشن حضرتؒ نے تحریر فرمایا، ہم تہی دامن اس قابل نہیں لیکن یہ ایک عظیم نعمت و امانت تھی جسے آپ کے سامنے پیش کرنا ضروری تھا۔

محتاجِ شفاعتِ رحمتِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

قاضی محمد ارشد الحسینی
دار الارشاد اٹک شہر
یکم شعبان المعظم ۱۴۱۹ھ

ہدیۂ عقیدت از مرتب چراغِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

قطب العالم حضرت اقدس مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

بحضور

شیخ العرب والعجم قطب الارشاد والمعرفت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

شیخِ اعظم فخرِ عالم نائبِ حضرتِ رسولؐ
خیر خواہ وُلدِ آدم قُرۃُ عین البتولؓ

نکتۂ انظارِ مسلم دورِ پُر آشوب میں
ہے تیرے سوزِ وطن جس کی جانوں پر شمول

تجھ میں اخلاقِ رسولِ ہاشمی راسخ ہیں سب
مسندِ خیر الرسلؐ اب ہوگی تجھ کو وصول

کر نہیں سکتا کسی کا طعن تجھ کو مضطرب
کوششیں اعداء کی ساری ہوگئیں باطل فضول

جاں نثارِ دینِ احمدؐ چوں حسینِ کربلاؓ
نام سے تیرے ہیں ظاہر دینِ فطرت کے اصول

زاہدِ بیکس کی ہے ہردم یہی دل سے دعا
رحمتِ ربِّ غنی کرتی رہے تجھ پر نزول

نائبِ خیر الرسلؐ تجھ کو سمجھتا ہے جہاں
ہے بجا تجھ کو کہا جائے اگر ابن الرسولؐ

Phone : 3311455
3317729
FAX. : 3316173

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Jamiat-Ulama-i-Hind

جمعیۃ علماء الہند

1-BAHADUR SHAH ZAFAR MARG, NEW DELHI-110 002

Ref. No. ....   Date 29.6.98

مخدوم ومکرم علامہ قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

خدا کرے مزاج گرامی بصحت وعافیت بخیر ہو۔ یہ میری خوش نصیبی ہے

کہ ایک وساطت سے آپکی اعلیٰ پایہ کی جامع تصنیف "چراغ محمد"

دیکھنے کا موقع ملا۔

آپنے جس خوبی سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حیات طیبہ اور انکے

فضائل کا احاطہ کیا وہ موضوع سے آپکی روحانی اور جذباتی

وابستگی کے علاوہ آپکے علم وفضل نظر کی گہرائی۔ اور ذہن

کی پرواز اور قلم کی روانی کا مظہر ہے

حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کی حیات پر بہت

دانشوروں اور اصحاب علم وقلم نے روشنی ڈالی ہے انکی تفصیلات

آپنے مرتب اور یکجا کرکے آئندہ اس موضوع پر کام کرنے والوں

کیلئے ایک شمع روشن کردی ہے

شاید یہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے جسمیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ

کی جامع شخصیت کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے

یہ صرف انکی سوانح عمری نہیں انکے دور اور انکی دینی اور علمی

کاوشوں کی ایک نادر دستاویز ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Phone : 3311455
3317729
FAX. : 3316173

Jamiat-Ulama-i-Hind **جمعیۃ علماء الہند**

1-BAHADUR SHAH ZAFAR MARG, NEW DELHI-110 002

Ref. No. .... Date ....

کتاب بڑے اہتمام سے شائع ہوئی ہے اور اس کی دیدہ زیبی
یہ ظاہر کرتی ہے کہ صرف معنوی لحاظ سے ہی نہیں بلکہ
صوری حیثیت سے بھی اوصاف جمال سے پوری طرح آراستہ ہے
میں آپ کے علم اور علم میں کمتر ہوں اس لئے آپ کے اس علمی کارنامہ
کی صحیح قدر دانی سے عاجز ہوں۔ میری عقیدت مندی کے اظہار کی
مناسب شکل یہی ہوگی کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف
قدم بوسی حاصل کروں۔ بلا شبہ آپ مملکت علم و فضل کے خسرو ہیں
اگر یہ کتاب براہ راست مجھے آپ سے حاصل ہوتی تو وہ میرے
لئے ایک تبرک ہوتی

میرے لائق سوال سے مطلع فرماویں اور دعا کی سخت ضرورت
دعوات صالحہ اور خوشگوار یادوں میں فراموش نہ فرمائیں

والسلام

مُقدّمہ

(بار دوم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ

احقر نے آج سے تقریباً ایک سال پہلے شیخ الاسلام حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ کے حالات پر مشتمل ایک کتاب بہ نام "چراغ محمد صلی اللہ علیہ وسلم" شائع کرنے کی سعادت حاصل کی جس کی غرض اپنی عقیدت، محبّت کا اظہار تھا مگر بفضلہ تعالیٰ یہ کتاب میری توقع سے زیادہ قبول ہوئی۔ فالحمد للّٰہ علیٰ ذٰلک۔

جس کی مختصر کیفیت درج ذیل ہے :-

جانشین حضرت شیخ الاسلام مولانا سید محمد اسعد مدنی اور مولانا سید محمد ارشد مدنی دامت برکاتہم استاذِ حدیث دارالعلوم دیو بند خود مبارک دینے کے لیے تشریف لائے۔

◎ اس کتاب کی تعارفی تقریب زیرِ سرپرستی حضرت میاں محمد اجمل قادری دامت برکاتہم نہایت احتشام اور نزولِ برکات سے منعقد ہوئی۔ حضرت میاں صاحب زیدمجدہم نے اپنے جدِامجد دورِ حاضر کے امام الاولیاء مولانا احمد علی اور اپنے والدِ محترم امام الہدیٰ مولانا عبید اللہ انور نوراللہ مرقدہما کی نیابت کا حق باحسن وجوہ ادا فرمایا۔ فجزاھم اللہ خیرا الجزاء

◎ آپ نے اس کتاب کی مرکزی تعارفی تقریب کے لیے لاہور کے الحمراء ہال میں سیمنار منعقد فرمایا اور اپنے جریدہ ہفت روزہ خدام الدین کا ایک مستقل نمبر بہ عنوان "چراغ محمد" شائع فرمایا۔

ملکی جرائد الحق اکوڑہ خٹک، الخیر ملتان، نقیب ختم نبوت ملتان، بینات کراچی، الفاروق کراچی، انوارِ مدینہ لاہور کے علاوہ ایشیا کی قدیم یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند کے ترجمان ماہنامہ دارالعلوم دیوبند اور برصغیر کے عظیم علمی، ادبی، تحقیقی ادارہ دارالمصنفین اعظم گڑھ (بھارت) کے ترجمان ماہنامہ معارف اور جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان روزنامہ الجمعیۃ نے نہایت ہی وقیع تبصرہ فرمایا۔[1]

پاکستان، بھارت، حجازِ مقدس، افریقہ، امریکہ، انگلینڈ کے جن علماء کرام اور اہلِ علم حضرات کو اس کے مطالعہ کی سعادت میسر ہوئی انہوں نے اسے وقت کی بہت بڑی ضرورت قرار دیا کہ اس کے مطالعہ سے اہلِ حق علماء کرام خصوصاً شیخ العرب والعجم حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ کی سیاسی بصیرت کو خراجِ تحسین ادا کیا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے کئی مغالطوں کا ازالہ ہوا اور حقیقت ظاہر ہوگئی۔ افریقہ میں حضرت مدنیؒ کے ایک عقیدتمند نے انگریزی زبان میں اس کے ترجمہ کا ارادہ فرمایا تاکہ دوسرے ممالک کے اہلِ بصیرت کو بھی استفادہ کا موقع مل سکے۔[2]

کتاب کی پہلی اشاعت ختم ہو رہی ہے مگر شائقین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اس لیے حسبِ سابق توکلاً علی اللہ سبحانہٗ، اسے چند مفید اضافوں کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حسبِ سابق اسے قبولیت سے نوازیں اور حقیقت پسند اربابِ علم کو اس سے استفادہ کی سعادت بخشیں۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ وَهُوَ وَلِيُّ التَّوْفِيْقِ

خادم آستانۂ مدنی: قاضی محمد زاہد الحسینی غفرلہٗ

ذیقعدہ ۱۴۱۶ھ / اپریل ۱۹۹۶ء

---

[1] حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی، روحانی کمالات اور مجاہدانہ کارناموں پر اب الحمدللہ جگہ جگہ کام ہو رہا ہے۔ حال ہی میں فیصل آباد کی ایک طالبہ نے ایک مقالہ بہ عنوان "حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی تصنیفی و دینی خدمات" لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کی ڈگری حاصل کی۔

[2] حضرت مؤلف رحمۃ اللہ علیہ کے ایک عقیدت مند جناب بریگیڈیئر (ر) امان اللہ خان صاحب زید مجدہٗ نے "چراغِ محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انگریزی ترجمہ الحمدللہ مکمل کر لیا ہے۔ (ناشر)

حضرتِ اقدس مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی نور اللہ مرقدہٗ نے جس محبت اور محنتِ شاقہ کے ساتھ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح کو مرتب فرمایا، عمر کے اس آخری حصہ میں کتاب کی تکمیل یقیناً عند اللہ اس کی مقبولیت اور حضرتِ مدنیؒ کی کرامت ہے، اس عنوان پر کسی تفصیلی کتاب کا ایک عرصے سے علماءِ اُمت حضرات اہلِ علم اور حضرتِ مدنیؒ رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین کو انتظار تھا، کتاب ملک اور بیرونِ ملک ہاتھوں ہاتھ لی گئی، مشاہیرِ اُمت نے حضرتِ مدنیؒ کی اس مستند اور جامع سوانح حیات پر جس مسرت اور اعتماد کا اظہار فرمایا ان میں سے چند حضرات کی رائے گرامیہ کے اقتباس ہدیۂ ناظرین ہیں۔

حضرت مدنیؒ کے جانشین صاحبزادہ گرامی قدر حضرت مولانا سیّد محمد اسعد مدنی دامت برکاتہم

آپ کی کتاب دیکھی، ماشاء اللہ بہت اچھی ہے ...... دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ کی محنت قبول فرما کر ذخیرۂ آخرت بنا دے اور ترقی درجات کا ذریعہ بنے۔ آمین (۲۴/۲/ستمبر ۱۹۹۶ء)

صاحبزادہ گرامی قدر حضرت مولانا سید محمد اسجد مدنی دامت برکاتہم

آپ کی اعلیٰ پایہ کی جامع تصنیف "چراغِ محمدؐ" دیکھنے کا موقع ملا آپ نے جس خوبی سے

سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ طیبہ اور ان کے فضائل کا احاطہ کیا وہ موضوع آپ کی روحانی اور جذباتی وابستگی کے علاوہ آپ کے علم و فضل، نظر کی گہرائی، ذہن کی پرواز اور قلم کی روانی کا مظہر ہے۔

شاید یہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی جامع شخصیت کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا گیا، یہ صرف ان کی سوانح عمری نہیں بلکہ ان کے اور ان کی دینی اور علمی کاوشوں کی ایک نادر دستاویز ہے۔ (۱۱-۱۲-۱۹۹۶ء)

حضرت مولانا سید فرید الوحیدی صاحب دامت برکاتہم

حضرت مولانا سید فرید الوحیدی مدظلہ حضرت مدنیؒ کے حقیقی بھتیجے اسیر مالٹا مولانا سید عبد الوحیدؒ کے صاحبزادہ اور حضرت مدنیؒ کے مبسوط تذکرہ "شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ ایک تاریخی و سوانحی مطالعہ" کے مرتب ہیں، کتاب "چراغِ محمد" کے متعلق لکھتے ہیں:

"کتاب کا نام آپ نے بہت انوکھا اور جاذبِ قلب و نظر رکھا ہے، بہت سے ابواب ایسے ہیں جو تاریخ کے لیے انمول ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں، اور پھر ترتیب و تحقیق اس قدر مکمل اور مبسوط ہے کہ ایک بار شروع کر کے ختم کیے بغیر ہاتھ سے چھوٹتی نہیں، میں نے ایک ہی دفعہ پہلے صفحہ سے لے کر آخر تک مطالعہ کر کے ہی دم لیا ہے، ویسے تو آپ مشہور مؤلف اور صاحبِ قلم ہیں مگر اس کتاب نے آپ کی شخصیت کو چار چاند لگا دیئے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اور کتاب کو دین و دنیا میں مقبول و محبوب بنائے۔ جزاکم اللہ خیرا الجزاء (۲۲/۳/۱۹۹۵ء)

مشہور مؤرخ اور مصنف جناب ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری صاحب زید مجدہم

اس تالیفِ لطیف کے باب میں آپ کا اجر اللہ کے پاس ہے اور اس عہد کے تمام حق آگاہوں کا حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمۃ سے تمام نسبت و عقیدت رکھنے والوں پر آپ کا حقِ شکریہ واجب ہے، آپ نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے، اس کتاب کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے جتنی کہ علم و تحقیق اور دعوت و فکر کی دنیا میں عام طور پر تسلیم کی جائے گی۔ (۲۰/ مارچ ۱۹۹۵ء)

مشہور مصنّف اور محقق حضرت مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ العالی
(المجلس العلمی کراچی)

حضرت والا کی نہایت جلیل القدر اور عظیم کتاب "چراغِ محمدؐ" کا گرانقدر تحفہ دار المطالعہ مجلسِ علمی کے لیے موصول ہوا جو حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی بڑی جامع سوانحعمری ہے جس میں حیاتِ مدنیؒ کے جملہ پہلوؤں کو نہایت وضاحت اور خوبصورتی سے رقم کیا گیا ہے اور جو بحیثیتِ مجموعی اپنی مثال آپ ہے، بلاشبہ آپ نے حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے محبت و عقیدت رکھنے والے بے شمار انسانوں پر احسانِ عظیم کیا ہے جن میں ایک یہ ناچیز بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہانوں میں اس عظیم خدمت کا زیادہ سے زیادہ اجر عطا فرمائے اور آپ کی صحت و عمر میں برکت ہو۔ (۲۰ رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ مطابق یکم مارچ ۱۹۹۵ء)

عالمی مبلغ تحفظِ ختمِ نبوّت حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب دامت برکاتہم

"چراغِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم" ایسی محبت سے آپ نے تحریر فرمائی ہے کہ حیاتِ شیخ الاسلامؒ پر (لکھی گئی) تمام کتب سے سبقت لے گئی، کَمْ تَرَكَ الْاَوَّلُوْنَ الْاٰخِرُوْنَ کا مصداق ہے۔

(۱۰ ستمبر ۱۹۹۶ء)

حضرت مولانا عبد الدیان صاحب مدظلہٗ (فاضل دیوبند) اسلامیہ کالج پشاور

حضرت مدنیؒ کے متوسلین اور بالخصوص ہندوستان، پاکستان کے علمائے دیوبند پر یہ قرض تھا جو آپ نے ادا فرما کر سب کے سر شکر اور فخر سے بلند کر دیئے۔ جزاك الله فى الدارين خيرًا۔
اللہ تعالیٰ اس کتاب کو علماء کے لیے خصوصًا اور عام مسلمانوں کے لیے بھی نافع اور مفید بنائے۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین وصلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم (۱۲ دسمبر ۱۹۹۴ء)

علمی، دینی تحقیقاتی اداروں کا

"چراغ محمد" صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر تبصرہ

کتاب "چراغ محمد صلی اللہ علیہ وسلم" صرف ایک سوانح نہیں بلکہ اپنے عہد کا ایک مبسوط تذکرہ اور تاریخی دستاویز ہے، اسے مختلف علمی جرائد و اخبارات نے توقع سے زیادہ پذیرائی بخشی اور شاندار الفاظ میں تبصرہ کرتے ہوئے اسے اپنے عنوان کی اہم ضرورت اور تاریخی ماخذ قرار دیا، یہ سب منجانب اللہ صاحب سوانح رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت اور مرتب علام رحمۃ اللہ علیہ کے حسن عقیدت و محبت کا ظہور ہے۔ یہاں پاک و ہند کے چند رسائل و اخبارات کا تبصرہ پیش خدمت ہے جو انشاء اللہ اس کتاب کی اہمیت کو اور زیادہ واضح کرے گا۔

(۱) ایشیا کی عظیم علمی یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند کے ترجمان ماہنامہ "دارالعلوم دیوبند" نے "چراغ محمد صلی اللہ علیہ وسلم" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"حضرت مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی ان علمائے حق میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایات و توفیق سے وافر حصہ عطا فرمایا ہے، مولانا موصوف کا علم پختہ بالخصوص کتاب اللہ کے علوم و معارف میں آپ ید طولیٰ رکھتے ہیں اسی کے ساتھ خدائے علیم و حکیم نے تصنیف و تالیف کا بڑا ستھرا ذوق مرحمت فرمایا ہے، چنانچہ آپ کے رواں دواں قلم سے اب تک ایک سو چودہ کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں جن میں زیر تبصرہ کتاب "چراغ محمد" یعنی سوانح حیات قطب الارشاد والتکوین شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ، امتیازی شان کی حامل ہے۔ مولانا موصوف حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے تلمیذ و مسترشد ہیں، استادی و شاگردی کا رشتہ اپنے اندر ایک گونہ وسعت اور چون و چرا کی گنجائش

رکھتا ہے جبکہ پیری مریدی کا رابطہ کامل انقیاد اور سرافگندگی کو چاہتا ہے، اسلئے بیک وقت ان دونوں تعلقات کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا کارِ شیشہ و آہن سے بھی نازک تر کام ہے، اسے مولانا موصوف کی سعادت کہیئے یا کرامت کہ بکمال حسن و خوبی وہ دونوں منزلوں سے گذر گئے جس کی زندہ شہادت اُن کی یہ زیرِ نظر تالیف ہے۔

عصرِ حاضر کے علماء و مشائخ میں حضرت شیخ الاسلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے حالات و سوانح میں اب تک جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں کسی اور پر اتنا کام نہیں ہوا ہے، اسلئے ایسی مرکزِ توجہ شخصیت پر قلم اٹھانا بظاہر بڑا آسان ہے لیکن درحقیقت یہ انتہائی مشکل اور پتہ مار کام ہے، اسلئے کہ اس صورت میں صاحبِ قلم کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیشرو کے مقابلے میں اپنی تالیف کو مواد و مضامین اور اسلوب و نگارش کے اعتبار سے اس لائق بنائے کہ اس کے مطالعہ سے تکرار محض کا احساس نہ ہو، مجھے اِس بات کے اظہار میں کوئی باک نہیں کہ حضرت قاضی صاحب اپنی اس تالیف میں اس معیار کو قائم رکھنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ کی جامع کمالات شخصیت کا پورا مرقع کتاب میں آگیا ہے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کی شخصیت، اوصاف و کمالات اور خصوصیات و امتیازات کے تعارف کیلئے بلاشبہ یہ ایک چراغِ راہ ہے، البتہ ترتیبِ مضامین میں مزید ژرف نگاہی کی ضرورت ہے اُمید ہے کہ اگلی اشاعت میں اس کی جانب مزید توجہ دی جائے گی، اسی طرح حضرت مدنیؒ کے قیامِ مدینہ منورہ کے زمانہ کے حالات و کوائف اور آپؒ کے وہاں کے درسی مشاغل نیز اُس دور کے تلامذہ وغیرہ کا اضافہ بھی آئندہ ایڈیشن میں آجائے تو کتاب کی افادیت بہت بڑھ جائے گی ــــــ"

(ماہنامہ دارالعلوم جمادی الثانی، رجب المرجب ۱۴۱۷ھ مطابق نومبر، دسمبر ۱۹۹۶ء)

(۲) اسلامی دنیا کے عظیم، قدیم تحقیقاتی و تالیفاتی ادارہ دار المصنفین اعظم گڑھ (بھارت) کے ترجمان ماہنامہ **معارف** نے تحریر فرمایا ہے:۔

ــــــ "برِ صغیر کی بیسویں صدی کی تاریخ میں جن علمائے دعوت و عزیمت کے سوانح نمونۂ اسلاف اور لائق اِتباع ہیں اُن میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا نام نمایاں ہے، ان کے سوانح پر مشتمل چھوٹے بڑے متعدد تذکرے شائع ہوچکے ہیں، زیرِ نظر کتاب اسی سلسلہ کی جامع و مبسوط کڑی ہے، فاضل مؤلف نے اگرچہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس کتاب کو نہ تاریخی نظر سے دیکھا جائے نہ ادبی اور علمی، بلکہ ایک مخلص خادم

کے جذبات کی ترجمانی سمجھا جائے، لیکن انہوں نے جس محنت و تحقیق سے یہ تذکرہ مرتب کیا اس سے تصنیف و تالیف میں ان کا حسنِ ذوق و سلیقہ ظاہر و عیاں ہے، مولانا مدنیؒ کا تاریخی نام چراغ محمد ہے، کتاب کے لیے فاضل مؤلف نے اسی اسم با مسمّٰی کا انتخاب کیا اور خاندانی حالات تعلیم، مدینہ منورہ میں قیام، حضرت شیخ الہندؒ سے تعلق، ریشمی رومال کی تحریک، اسارتِ مالٹا، دیوبند میں تدریس اور وہاں کی تطہیر، جمعیۃ العلماء ہند میں شرکت، تقسیمِ ہند اور اس کے اثرات، تلامذہ و تصانیف وغیرہ موضوعات پر مفصل مباحث کے علاوہ ایک حصّہ میں مولانا مدنیؒ کا روحانی فیض اور خدمتِ خلق کے بے مثال جذبہ کے واقعات بھی بیان کیے ہیں، بعض معاصر اسلامی تحریکوں اور علامہ اقبال سے اختلافات وغیرہ بھی اس جامعیت سے بیان کر دیئے گئے ہیں کہ یہ تذکرہ برصغیر کی تاریخ خصوصاً مسلمانوں کی تاریخ پر سیر حاصل تبصرہ ہوگیا ہے۔" (معارف نومبر ۱۹۹۵ء)

(۳) جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان روزنامہ الجمعیۃ دہلی نے "چراغ محمد صلی اللہ علیہ وسلم" کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا :۔

"عظیم شخصیات ہمارے درمیان سے ظاہری طور پر غائب ہو جانے کے بعد حاضر رہتی ہیں یعنی جا کر بھی ہمارے درمیان رہتی ہیں، جاتی ہیں عنصری وجود کے اعتبار سے اور رہتی ہیں اپنے عظیم کارناموں کی وجہ سے، ایسی مقدس و عظیم ہستیاں موجودہ اور آنے والی دونوں نسلوں کیلئے منارۂ نور اور زندگی کی شبِ بیاباں میں قندیلِ رہبانی کا کام کرتی ہیں، اور یہ مقام ملتا ہے خود کو خدا اور خدمتِ خلق میں گم کر دینے کی قیمت پر، یعنی جب عظیم افرادِ انسانی اپنے آپ کو کھو دیتے ہیں تب آنے والی نسل خود کو پاتی ہے، ایسے عظیم افراد میں زندہ کارنامے چھوڑ جانے والوں میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمۃ والرضوان کا ایک نمایاں نام ہے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ اپنی زندگی میں بھی عظیم تھے اور ہم سے جدا ہونے کے باوجود ان کی عظمت، کردار کی شہنشاہی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے بلکہ کچھ نہ کچھ حیثیت و اعتبار سے زندگی اور کارناموں میں وسعت ہی پیدا ہوتی جا رہی ہے اور اعتراف کا دائرہ روز بروز پھیلتا ہی جا رہا ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جیسے فنا فی اللہ اور بے نفس بزرگ اپنی حیاتِ مبارکہ میں اس "کھلے اعترافِ عظمت" کا موقع نہ دیتے جیسا کہ ان کی پوری زندگی شاہد ہے کہ آپؒ نے ہمیشہ خود کو چھپائے رکھا۔

لیکن ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کے بعد قدرت نے یہ موقع فراہم کیا ہے کہ جس انسانیت کیلئے حضرت شیخ الاسلامؒ

نے خود کو مٹا دیا وہ آپؒ کی عظمتِ کردار اور بلند و زندہ کارناموں کا اعتراف بھی کرے اور اپنی زندگی کے لیے ان سے روشنی بھی لے۔ اور اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کا زندگی میں بھی اور جدا ہونے سے آج تک کسی نہ کسی انداز میں "اعتراف" بھی کیا جا رہا ہے اور بیشمار افراد نے روشنی بھی لی ہے اور آئندہ بھی لیتے رہیں گے، ایسے افراد میں اہلِ قلم بھی ہیں اور صاحبِ دل بھی۔ حضرت علامہ زاہد الحسینی زید مجدہم کی یہ زیرِ تبصرہ کتاب بھی ایک خوبصورت اعتراف بھی ہے اور مرقعِ عقیدت بھی اور ایک عہد ساز شخصیت کی تاریخ بھی۔ اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ صرف ایک شخص ہی نہیں بلکہ ایک عہد اور اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔

بڑے سائز کے ۴۴۲ صفحات کی کتاب میں مؤلف گرامی قدر نے ۸۰ کتابوں اور ۳۲ اخبارات و رسائل کے حوالے دیئے ہیں اور ان سب سے بہت ہی خوبصورت اور باترتیب انداز میں استفادہ فرماتے ہوئے حضرت شیخ الاسلامؒ کی بھرپور زندگی اور خدمات و کارناموں کا ایسا صاف و شفاف خوبصورت آئینہ بنایا ہے جس میں ہم دین و شریعت، ربانی اسرار و رموز، عرفانی حقائق، جہادِ زندگی، ملک و قوم کیلئے انتھک جد و جہد، خدمتِ حدیثِ نبوی، اصلاح و تزکیہ، تعلیم و تربیت اور سراپا علم و عمل کی تصویریں کھلی آنکھوں دیکھ سکتے ہیں۔

حضرت زاہد الحسینی دامت برکاتہم صرف مصنّف ہی نہیں ایک صاحبِ دل بزرگ بھی ہیں اور حضرت شیخ الاسلامؒ سے تعلیم و خلافت دونوں کا شرف بھی حاصل ہے، اس لیے انہوں نے آپؒ کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس میں دل و دماغ نے خوب خوب ساتھ دیا ہے اور عقیدت بھی ساتھ ساتھ سایہ فگن رہی ہے۔ اگرچہ حضرت مدنیؒ جیسی شخصیت کی زندگی اور خدمات و کارناموں کا احاطہ بہت مشکل ہوتا ہے تاہم مؤلف گرامی قدر نے اپنی حد تک اپنی سی کوشش و کاوش فرما کر آپؒ کے تعلق سے بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ حضرت مؤلف نے اپنی اس زیرِ تبصرہ کتاب کو اظہارِ عقیدت کا نام دیا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک عہد کی تاریخ ہے جس سے بہت سے تاریخی و شخصی اور زمانے کی رفتار اور مسائل و واقعات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کتاب میں حضرت شیخ الاسلامؒ کے وقت کے سماجی ماحول، سیاسی صورتحال، خاندانی پس منظر، سلسلۂ نسبت، حضرتؒ کے والد ماجد سید شاہ حبیب اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکرِ خیر، ابتدائی تعلیم، دارالعلوم دیوبند کی تکمیل، قیامِ مدینہ منورہ و درسِ حدیثِ نبوی، تحریک ریشمی رومال، اسارتِ مالٹا، تحریکِ خلافت میں شرکت، مقدمۂ کراچی، قیامِ سلہٹ، از سرِ نو دارالعلوم دیوبند کی مسندِ صدارت، جمعیۃ علماء ہند سے تعلق و صدارت

جنگِ آزادی میں حصہ اور اسارت، تقسیمِ ملک کے تعلق سے نظریہ، جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس ہائے عام کے خطبہ ہائے صدارت، سیاسی نظریات، مسئلہ متحدہ قومیت جیسے ۷۸ عنوانات پر کتاب کے حصہ اوّل میں روشنی ڈالی گئی ہے، یہ مباحث و تفصیلات کتاب کے صفحہ ۹ سے صفحہ ۴۹۰ تک ہیں۔ دوسرا حصہ صفحہ ۴۹۲ سے شروع ہوتا ہے، اس حصے میں حضرت شیخ الاسلامؒ کے روحانی مقام، کشف و کرامات، خدمتِ خلق، تحریک مدحِ صحابہؓ، آپؒ اور علامہ اقبال کا معاملہ، تفردات، اوراد و وظائف، مکتوبات، پسندیدہ اشعار، جماعتِ اسلامی کے سلسلے میں نقطۂ نظر، تحریکِ پاکستان ایسے ۲۰ عنوانات زیرِ بحث و گفتگو آئے ہیں ــــ غرض کہ زیرِ تبصرہ کتاب اپنی حد تک بہت ہی معلومات افزا اور ایک اچھی کاوش ہے ــــ" (روزنامہ الجمعیۃ دہلی ۷ تا ۱۳ فروری ۱۹۹۷ء)

(۴) حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار جامعہ خیر المدارس ملتان کے ترجمان ماہنامہ الخیر نے اپنے تبصرہ میں لکھا۔

ــــ "حضرت مدنی قدس سرہ پر بہت کچھ لکھا گیا اور ان شاء اللہ مزید لکھا جائے گا لیکن اس وقت حضرتؒ کے تلامذہ و مسترشدین میں زاہد العصر حضرت مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی دامت برکاتہم کو جو خصوصی مقام حاصل ہے اس کا مقتضا تھا کہ انہی کے قلم سے حضرت مدنی قدس سرہ کی ایک جامع مستند سوانح حیات سامنے آئے، الحمد للہ حضرت موصوف نے اس اہم فریضہ کو بطریقِ احسن پورا فرما دیا ہے۔ کتاب کا نام "چراغِ محمد" حضرت مدنی قدس سرہ کے نام پر رکھا گیا ہے، جس کے مقدمہ میں حضرت قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ: "اللہ تعالیٰ اس چراغ کو ہر قسم کی بادِ صرصر سے محفوظ رکھے تاکہ اس کی روشنی سے ہم جیسے کئی تہی دامن علماءِ حق کے صحیح مقام، اُن کی قربانیوں اور اُن کی علمی و عملی زندگی سے واقف ہو کر آپکے اختیار کردہ راہِ ہدایت پر چل کر نجاتِ دارین حاصل کر سکیں"۔ ہم اس تمنا و دعا پر صدقِ دل سے آمین کہتے ہوئے ناظرین سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ کی علمی و دینی اور روحانی شخصیت اور آپؒ کی مبارک زندگی کے مجاہدانہ کارناموں سے درسِ عزیمت و حمیت حاصل کرنے کے لیے اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔ مدارسِ دینیہ کے کتب خانوں اور ذاتی و سرکاری معیاری لائبریریوں کا اس مستند تاریخی دستاویز سے خالی ہونا بہت بڑی محرومی ہے ــــ"

(ماہنامہ الخیر ملتان، ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ مطابق دسمبر ۱۹۹۵ء)

۵ علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار اور جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے ترجمان ماہنامہ بینات نے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا :۔

"یہ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ کی سوانح حیات ہے۔ چراغ محمد (۱۲۹۶ھ، ۱۸۸۷ء) موصوف کا تاریخی نام تھا، قاضی صاحب نے کتاب کا نام بھی "چراغ محمد" رکھا ہے...... حضرت مدنیؒ کی شخصیت مجموعہ کمالات تھی، موصوف نے اپنے آپ کو اکابر کے کمالات سے آراستہ کیا تھا۔ وہ قائدانہ صلاحیتوں کے مالک، مجاہد، عالم ربانی، جلیل القدر شیخ طریقت اور اپنے اسلاف کا نمونہ تھے، بایں ہمہ اپنے آپ کو ننگ اسلاف سمجھتے اور لکھتے تھے، ان کا عوام سے بھی ربط تھا اور خواص سے بھی، وہ علماء بھی تیار کرتے اور طالبان طریقت کی تربیت بھی فرماتے تھے، وہ علماء و مشائخ ہند کی صف میں جس طرح یکتا و منفرد مقام رکھتے تھے اسی طرح قائدین کرام اور چوٹی کے سیاست دانوں کی صف میں بھی اپنی نظیر آپ ہی تھے، اس لیے خلق کا رجوع بھی ان کی طرف بہت تھا اور ہر طبقہ میں مقبول تھے ؎

درکفِ جامِ شریعت درکفِ سندانِ عشق   ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

یہ ایک تاریخ ساز شخصیت کی سوانح حیات ہی نہیں دیوبند کی تاریخ، اس کے اکابر کا اجتماعی تذکرہ، ہندوستان کی سیاسی و مذہبی تحریکات کا مختصر جائزہ، ہندوستان کی آزادی کی تاریخ بحوالہ علماء دیوبند، قیمتی معلومات سے آراستہ کتاب ہے، اس میں حضرت مدنیؒ کے صدارتی خطبات کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں جو بہت سے حقائق سے پردہ اٹھاتے اور بہت سی غلط فہمیاں دور کرتے ہیں۔ کتاب محنت سے تیار کی گئی ہے، دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت قاضی صاحب کی مساعی قابل تحسین ہیں۔ تاریخ و ثقافت اسلامیہ کے طلباء، ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی تحریکات نیز آزادئ ہند کی تاریخ کے شائقین اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ارادتمندوں کے لیے چراغ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ بہت مفید ہے۔"

(ماہنامہ بینات کراچی ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ)

۶ تحریک تحفظ ختم نبوت اور مجلس احرار کے ترجمان، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار ماہنامہ نقیب ختم نبوت نے اپنے تبصرہ میں لکھا ہے :۔

ـــــ "کتاب چراغِ محمد" میرے سامنے کھلی پڑی ہے اور میں مسلسل یہی سوچ رہا ہوں، کہ ؏ روایتوں کے تراشیدہ لوگ تھے کیسے؟

کون سی روایت؟ کیسی روایت؟ وہی روایت جو ہماری ضرورت تھی، ضرورت ہے اور ضرورت رہے گی، بات کو اگر مختصر کیا جائے تو اقبال کا سہارا لینا پڑے گا، وہ فرماتے ہیں:۔

"دیوبند ایک ضرورت تھی، اس سے مقصود تھا ایک روایت کا تسلسل، وہ روایت جس سے ہماری تعلیم کا رشتہ ماضی سے قائم رہے"۔

اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (رحمۃ اللہ علیہ) اسی دارالعلوم کے شیخ الحدیث تھے، شیخ الحدیث تو ہم بہت سے دیکھتے سنتے اور پڑھتے ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ سید حسین احمد مدنیؒ اپنی مثال آپ تھے، وہ جہادِ آزادی کے کارواں کے سالار تھے، بہادر تھے، نیک تھے، صاحبِ علم تھے، متبع سنت تھے، حلیم تھے، بردبار تھے، متواضع تھے، لیکن ایسے نہیں جیسے ہم آپ تصور کریں گے۔ اس بہادری، اس نیکی، اس علمیت، اس اتباعِ سنت، اس بردباری، اس حلم اور اس تواضع کا تصور بھی بہت مشکل ہے، اتنا مشکل کہ کم از کم آج اس کی کوئی مثال ڈھونڈنی محال ہے، محال نہیں ناممکن ہے، جی ہاں! ؏ ہم ترستے ہیں کلی کو وہ گلستاں بہ کنار ـــــ ایسے ہی ہوتے تھے ہمارے سلف صالحین۔

اللہ تعالیٰ قاضی محمد زاہد الحسینی مدظلہ جیسے بزرگوں کو تادیر سلامت رکھے تاکہ وہ اسی طرح بزرگوں کی مٹی میں جان ڈالتے رہیں ـــــ" (ماہنامہ "نقیبِ ختمِ نبوت" ملتان)

(۷) ایشیا کی عظیم تعلیمی درس گاہ جامعہ فاروقیہ کراچی کا آرگن ماہنامہ الفاروق (اردو و عربی) اظہارِ عقیدت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

ـــــ "حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے فتویٰ "ہندوستان دارالحرب ہے" سے جس تحریکِ آزادی کا آغاز ہوا تھا حضرتِ مدنیؒ اس تحریک کے نمایاں قائدین میں سے تھے اور جس عزیمت اور استقامت، حوصلہ و ہمت کے ساتھ آپ نے اس تحریک کی مردانہ وار قیادت کی اور اس کے ساتھ ساتھ علمی مشاغل اور اصلاحِ خلق کے ذریعہ کو جاری رکھا وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ آپ کے حالاتِ زندگی، سیرت و کردار پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس کتاب (چراغِ محمد) کی

خصوصیت یہ ہے کہ یہ جس شخص کے ہاتھوں لکھی گئی ہے وہ فنافی الشیخ کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ قاضی محمد زاہد الحسینی دامت برکاتہم جب سے حضرت مدنیؒ کی چوکھٹ سے وابستہ ہوئے آج تک حضرت مدنیؒ کے عاشقِ صادق اور غلام بے دام ہیں۔ آپ کی یہ کتاب اپنے شیخ سے عقیدت ومحبت، ان کے نظریہ کو اجاگر کرنے اور ان کے کام کو آگے بڑھانے کے سچے جذبے کی منہ بولتی تصویر ہے ـــــ" (ماہنامہ الفاروق، رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ)

(۸) عالمی انجمن خدام الدین کے آرگن ہفت وار خدام الدین لاہور نے "چراغِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم" کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ایک خصوصی نمبر بنام "چراغِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم" شائع کیا اور اس نمبر کے تعارف میں لکھا۔

......" اللہ تعالیٰ حضرتِ اقدس مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی دامت برکاتہم العالیہ کو صحت وتندرستی کے ساتھ سلامت باکرامت رکھیں کہ جنہوں نے اپنے استاذ اور شیخ قطب الارشاد والتکوین، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ کی سوانح پر برسہا برس کی محنتِ شاقہ کے بعد ایک گوہرِ نایاب (چراغ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) مشتاقانِ دید کو بہم پہنچایا ہے۔ سید الطائفہ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا تاریخی نام "چراغ محمد" ہے، اس حوالہ سے کتاب کے نام نے اور بھی تازگی اور جگمگاہٹ پیدا کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت قاضی صاحب مدظلہٗ کی اس محنتِ بیکراں کو شرفِ قبولیت بخشیں اور اس کتاب کو عالمِ اسلام کی راہنمائی کا ذریعہ بنائیں۔ (آمین یا الٰہ العالمین) حضرت قاضی صاحب مدظلہٗ کی دوسری کتابیں بھی عوام بالخصوص دینی اور علمی حلقوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر چکی ہیں اور خصوصاً دورِ حاضر کے امام الاولیاء شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی سوانح "مردِ مومن" کا تو کوئی جواب نہیں۔ ہمیں یقینِ واثق ہے کہ یہ کتاب بھی دینی اور علمی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل کرے گی......" (ہفت روزہ خدام الدین لاہور ۱۵ شوال ۱۴۱۵ھ / ۱۷ مارچ ۱۹۹۵ء)

(۹) پاکستان میں دار العلوم دیوبند کے ترجمان اور جامعہ مدنیہ لاہور کے آرگن ماہنامہ انوارِ مدینہ نے تحریر فرمایا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کی شخصیت اس قابل ہے کہ اس پر جس عنوان سے بھی لکھا جائے کم ہے، خدا کی شان ہے آپ کی حیات سے لے کر تا ہنوز آپ پر لکھنے کا عمل جاری ہے، ہر ایک اپنے ذوق اور معلومات و واردات کے مطابق لکھ رہا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک

عظیم کاوش زیرِ نظر کتاب "چراغِ محمد" ہے جو حضرت مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی دامت برکاتہم نے بڑی عرقریزی کے ساتھ ترتیب دی ہے۔ موصوف حضرت شیخ الاسلامؒ کے شاگرد و مسترشد، بارگاہِ مدنی سے براہِ راست فیض یافتہ اور شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ مجاز ہیں، آپ پہلے بھی مختلف رسائل وجرائد میں حضرت شیخ الاسلامؒ کی شخصیت سے متعلق مضامین لکھتے رہے ہیں، حال میں آپ نے حضرت شیخ الاسلامؒ کی سوانح سے متعلق یہ ضخیم کتاب تصنیف فرمائی ہے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کا تاریخی نام "چراغ محمدؐ" ہے، اس نام کی مناسبت سے حضرت قاضی صاحب نے اپنی اس تالیف کا نام بھی "چراغ محمد" رکھا ہے۔"

الغرض حضرت شیخ الاسلامؒ کی سوانح کے حوالے سے یہ کتاب انتہائی قیمتی معلومات سے پُر ہے، کتابت وطباعت عمدہ ہے، ڈائی دار جلد کے ساتھ مزین ہے۔

(ماہنامہ انوارِ مدینہ ذیقعدہ ۱۴۱۵ھ / اپریل ۱۹۹۵ء)

(۱۰) دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے ترجمان ماہنامہ الحق نے اپنے تبصرہ میں لکھا:۔

......"شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ایک شخصیت ہی نہیں ایک تحریک، ایک تاریخ، ایک عہد اور فکری اور علمی لحاظ سے ایک دلبستانِ فکر کا نام ہے۔ وہ جتنے عظیم انسان تھے قدرت نے ان سے علومِ نبوت، فروغِ تعلیم وتدریس، آزادیٔ ملت، اتحادِ امت اور ملی قیادت جتنا عظیم کام لیا، اسی طرح ان کا حلقۂ تلمذ واثر جس قدر وسیع اور عظیم تھا، ان کی خدمات جس قدر کثیر اور بے پناہ تھیں اسی تناسب سے ان کی جامع سوانح اُن کے متوسلین، تلامذہ بالخصوص علماء دیوبند کے ذمہ ایک قرض اور فرض تھا جو حضرتؒ کے سانحۂ ارتحال کے بعد ابھی تک باقی چلا آرہا تھا۔

لاریب! حضرتِ مدنیؒ کی زندگی اور سوانح وافکار پر متعدد کتابیں لکھی گئیں، خصوصی نمبر نکالے گئے، سیمینار ہوئے، ان کے علوم ومعارف مُدوّن اور مرتب ہوئے، مگر بایں ہمہ ایک جامع اور ہمہ پہلو حاوی سوانح کی تشنگی محسوس کی جا رہی تھی۔ اللہ کریم جزائے خیر عطا فرمائے بقیۃ السلف حضرت مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی دامت برکاتہم کو جنہوں نے "چراغِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم" کے نام سے حضرتِ مدنیؒ کی جامع سوانح اور کامل تذکرہ لکھ کر ایک فرضِ کفایہ ادا کر دیا جس پر پوری امت کی طرف سے وہ ہدیۂ تبریک اور شکریہ کے مستحق ہیں۔ وَاَجْرُھُمْ عَلَی اللّٰہِ......" (ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک، مارچ ۱۹۹۵ء)

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہٖ سید الانبیاء والمرسلین مولانا محمد وّ اٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔ اما بعد!

قرآنِ عزیز نے انبیاء علیہم السلام اور خود سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعتِ مبارکہ کے حالات بیان فرمائے ہیں، بعض انبیاء علیہم السلام کے حالات تفصیلاً اور بعض کے اجمالاً بیان فرمائے ہیں۔ صلحاء کے حالات کا ذکر بھی قرآنِ عزیز میں موجود ہے، جیسا کہ حضرت لقمان کی وہ نصیحت جو انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو فرمائی وہ قرآنِ عزیز نے ارشاد فرمائی ہے۔ اصحابِ کہف کے حالات، حکومتِ وقت سے اختلاف اور غار میں پناہ لینے اور دوسرے امور کو بیان فرمایا۔ سورۃ البروج میں موحدین کے استقلال اور ظالم حکومت کی سزا کو ذکر فرمایا۔ اِن سب حالات کے بیان کرنے میں حکمت یہ فرمائی کہ لوگوں کے لیے نصیحت، راہ نمائی، عبرت کا ذریعہ بن جائیں۔

اسی طرح صحابۂ کرام، تابعین اور بعد کے علماءِ کرام، اولیاءِ عظام کے حالات بھی امت کے لیے راہنما ہیں۔ خصوصاً ان علماءِ کرام کے حالات اور ان کی سرگذشت سے امت کو واقف کرنا اور واقف ہونا ضروری ہے جنہوں نے متواتر اور متوارث دین کو بچانے کے لیے ہر جابر طاقت کا مقابلہ کیا خواہ وہ طاقت اندرونِ ملک کی ہو (جیسا کہ مجدد الف ثانیؒ نے دینِ اکبری کا مقابلہ کر کے اس کا قلع قمع فرمایا) یا وہ طاقت بیرونی ہو اور اپنے مکر و فریب سے مُلک پر قابض ہو چکی ہو، جیسا کہ انگریزوں نے اسلامی مملکت ہندوستان پر قبضہ کر کے دینِ اسلام کے خلاف ہر ظلم و ستم کو روا رکھا۔ برصغیر میں جن اصحابِ عزیمت علماءِ کرام اور اولیاءِ عظام نے عیسائی حکومت کے قبضہ کو ظلم و ستم کے ساتھ تعبیر کرتے ہوئے اسے دار الحرب قرار دیا۔ ان میں شاہ ولی اللہ سے لیکر حضرت شیخ الہند اور آن کے سچے جانشین مولانا سید حسین احمد مدنی (رحمۃ اللہ علیہم) کا ممتاز مقام ہے اگرچہ اس مجاہد گروہ میں کئی علماءِ حق اِس قابل ہیں کہ ان کا تذکرہ شائع کیا جائے مگر اس گنہگار کی نظر میں اپنے کرم فرماؤں میں سے حضرت مدنی اور دورِ حاضر کے امام الاولیاء مولانا احمد علی لاہوری نوّر اللہ قبورہم کا ذکر زیادہ ضروری ہے۔ چنانچہ اس گنہگار نے کچھ عرصہ پہلے حضرت لاہوریؒ کے حالات پر "مردِ مومن" مرتب کی اور اب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حضرت مدنیؒ کی سوانح حیات پر قلم اٹھانے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

حضرت کا تاریخی نام "چراغ محمد" ہے اس لیے نزولِ برکات اور حصولِ حسنات کے لیے اس کتاب کا نام "چراغِ محمد" رکھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس چراغ کو ہر قسم کی بادِ صرصر سے محفوظ رکھے تاکہ اس کی روشنی سے ہم جیسے کئی تہی دامن علماء حق کے صحیح مقام، ان کی قربانیوں اور ان کی علمی عملی زندگی سے واقف ہو کر ان کے اختیار کردہ راہِ ہدایت پر چل کر نجاتِ دارین حاصل کر سکیں ۔ وما ذٰلك على الله بعزيز ، والله ولى التوفيق

ف : حضرت مدنی رح نے اکثر اوقات اپنے مکاتیب میں "ننگِ اسلاف حسین احمد" تحریر فرمایا ہے مگر بعض خطوط میں "چراغ محمد" بھی تحریر فرمایا ہے۔

خاکروبِ آستانۂ مدنی : زاهد الحسینی

حال وارد : منزل انوار القرآن، شارع مدنی، ایبٹ آباد (مورخہ ۱۶ ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ / ۸ جون ۱۹۹۳ء)

مقدمہ برائے طباعتِ ثانیہ

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جو چراغ آج سے کچھ عرصہ پہلے جلایا گیا تھا اس کی علمی، دینی اور روحانی روشنی سے کئی اُن سعادتمندوں نے نورِ بصیرت حاصل کیا جو بعض اپنوں اور بیگانوں کے معاندانہ مشاغبہ (پروپیگنڈہ) سے متاثر ہو کر شکوک اور اوہام کی تاریکی میں ایک مقبول بارگاہِ خداوندی سیدِ عالی نسب، مجاورِ روضۂ اطہر (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام) کے متعلق اپنے اذہان اور قلوب میں بغض اور کینہ کی آگ سُلگائے ہوئے تھے اِس چراغ کی روشنی سے وہ سینے منور ہو گئے اور اکثر جوانمردوں نے اپنے غلط خیالات سے توبہ کر لی اور حضرت مدنی رح اور دیگر علماء حق کے مجاہدانہ کارناموں اور اُن کی سیاسی بصیرت کو تمام عالمِ اسلامی کو درپیش مسائل کا حل یقین کر لیا ــــــ اکابر علماء کرام، مشائخ عظام اور علمی و دینی حلقوں نے اس چراغ کی پذیرائی کو سعادت سمجھا، حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی مسند درسِ حدیث کے جانشین حضرت مولانا سید محمد ارشد مدنی مدظلہ مبارکباد دینے کیلئے خود تشریف لائے، جبکہ عالمی انجمن خدام الدین لاہور کے امیر مولانا میاں محمد اجمل قادری مدظلہ نے لاہور میں ایک عظیم الشان سیمینار اسی چراغ کے متعلق منعقد فرمایا، ہفت روزہ خدام الدین نے خصوصی نمبر سے اور ماہنامہ الحق، الخیر، بینات وغیرہا دینی و علمی جرائد نے اُس قرض کی ادائیگی قرار دیا جو حضرتِ مدنی رح کے تلامذہ، مریدین اور معتقدین کے ذمے تھا۔ چنانچہ چند ہی ماہ میں پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا اور اب احباب کے بے پناہ اصرار کی وجہ سے اس شدید گرانی میں حالات کی نامساعدت کے باوجود بعض اضافہ جات کے ساتھ یہ کتاب دوسری بار شائع کی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ صاحبِ عنوان کی طرح اس کتاب کو مزید قبولیت سے نوازیں اور ہم سب کو مستعار زندگی کا سفر اس کی روشنی میں طے کرنے کی سعادت بخشیں۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْز

قاضی محمد زاهد الحسینی (دسمبر ۱۹۹۵ء / شعبان ۱۴۱۶ھ)

(ب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھٰذا مِن فضلِ ربی

اِس گنہگار پر خداوند کریم کے جو بے انتہا کرم اور احسانات ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ علم بالقلم کے ساتھ یک گونہ ربط پیدا فرما دیا، چنانچہ احقر کے قلم سے بعونہ تعالیٰ تقریبًا ۱۱۴ کتب اور رسائل تحریر ہو کر طبع اور شائع ہو چکے ہیں۔ الحمد للہ علیٰ احسانہ

ان میں سے اپنے کرم فرما حضرات کے حالات گاہ بگاہ دینی رسائل خصوصًا ماہنامہ الارشاد میں شائع کرنے کی سعادت حاصل رہی اور اب بھی ہے، مگر قابلِ ذکر اس موضوع پر حضرت شیخ التفسیر دورِ حاضر کے امام الاولیاء مولانا احمد علی قدس سرہ العزیز کے سوانح حیات ہے جو ملک کے عظیم تجارتی ادارہ فیروز سنز لاہور سے کئی بار طبع ہو چکی ہے۔ حضرتؒ کے اس سوانح حیات موسومہ بہ "مردِ مومن" کی تحریر میں اِس گنہگار کو نہ صرف شرکت بلکہ ترتیب اور تسوید میں حصہ وافر عطا ہوا جس کا مختصر سا ذکر عبدالحمید خان صاحب مرحوم کے قلم سے درج ذیل ہے:۔

"یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ حضرت کا حلقہ اثر اور معتقدین کا سلسلہ وسیع ہی نہیں بلکہ لامتناہی ہے، چنانچہ ان سب حضرات سے جو حضرت کی بابرکت صحبتوں سے مشرف ہو چکے ہیں یا جن خوش نصیب حضرات کو آپ سے تعلق کسی نہ کسی گوشے میں رہ چکا ہے حضرت کے حالات و واقعات فراہم کرنا آسان کام نہ تھا پھر بھی میں نے سوا تین سو سے زائد علمائے کرام صوفیائے عظام اور حضرت کے تربیت یافتہ خدام کی خدمت میں عریضے ارسال کیے کہ وہ اس میں اعانت فرمائیں مگر چنداں کامیابی نہ ہوئی۔۔۔۔۔
ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کام کی تکمیل کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے لیے ذرائع و اسباب خود مہیا فرما دیتے ہیں، چنانچہ عین اُس وقت جبکہ کام ابھی ابتدائی مراحل میں تھا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب جامعہ مدنیہ کیمبل پور (اٹک) کی ذاتِ گرامی امدادِ غیبی بن کر آگے

آئی، اگر اس مرحلہ میں قاضی صاحب موصوف کی پُرخلوص مساعی شامل نہ ہوتیں تو حضرت کے سوانح حیات کا اس قدر جلد پایۂ تکمیل کو پہنچنا ممکن نہ تھا کتاب کی ترتیب و تدوین میں موصوف کا نہایت قیمتی اور عظیم حصہ ہے، اللہ تعالیٰ آپ کے روحانی مراتب کو اور بلند فرمائے؛ آمین (مردِ مومن صہ۶م)

مردِ مومن کی اشاعت کا اصلی محرک "فیروز سنز" کا ادارہ ہے مگر اپنے محبوب آقا حضرت مدنی نوراللہ مرقدہ کے حالات کے شائع کرنے کا ارادہ مدت سے مقصود تھا جب بھی موقع ملتا ملک کے مقتدر رسائل اور اخبارات میں مختلف عنوانوں پر لکھنے کی سعادت حاصل رہی جبکہ اپنی زیرِ ادارت شائع ہونے والے ماہنامہ "الارشاد" نے تین بار مدنی نمبر شائع کرنے کی سعادت حاصل کی مگر یہ تشنگی پھر بھی باقی رہی اور قلب و فکر کا تقاضا روز افزوں ترقی پذیر رہا کہ جس ذاتِ بابرکات کی توجہات اور دعاؤں کے صدقہ میں ربّ العالمین نے اس قدر نوازا ہے اس ذاتِ بابرکات کے حالات میں جتنا ہو سکے تحریر کرنا ضروری ہے، اس سے ایک تو ع

ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے

کی روحانی اور ایمانی لذت حاصل ہوتی رہے گی اور دوسرا اُن طالبانِ حق کے لیے راہنمائی ہو جائے گی جو ذاتی اور سیاسی تعصبات سے بالاتر ہو کر وقت کے ایک ولی کامل، باخدا راہنما کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے کسی ایسی جامع کتاب کے متلاشی ہیں جس میں حضرتِ مدنی نوراللہ مرقدہٗ کی حیاتِ مبارکہ کے سارے اطوار اور سارے ادوار کا دلائل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہو، کیونکہ یہ بات فطرتی ہے کہ کسی باکمال نیاض شخصیت کے ساتھ حسد و بُغض رکھنے والے اُس کے محاسن کو تو پردہ میں کر دیتے ہیں مگر اس کی بشری کمزوریوں اور غیر ارادی لغزشوں کو اس کی زندگی کا مقصد بنا کر حق کے متلاشیوں کو اندھیرے میں رکھنے کے جُرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اسی کے بھروسہ پر اس اہم موضوع پر قلم اٹھا رہا ہوں، دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اِس مخلص بندے، مجاھد فی سبیل اللہ، خیر خواہِ اُمت کے صحیح حالات اُمت کے سامنے پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اسے قبول بھی فرمائے۔ آمین

مجھے اِس امر کا اعتراف ہے کہ کسی بھی شخصیت کے حالاتِ زندگی پر تبصرہ تقریباً آسان ہی ہوتا ہے کہ اس کے حالات اور اطوار کا مرکز اس کی ایک اہم حیثیت ہوتی ہے جس پر اس کی زندگی کے سارے حالات آکر جمع ہو جاتے ہیں مگر ایسی شخصیت اور ایسے انسان کے حالات پر تبصرہ کرنا، ان کو بیان کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے جو بالفاظِ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ :-

وَقار میں کوہِ گراں، تواضع میں مُشتِ خاک، دلداری میں لطیف پانی، بُغض فی اللہ میں آتشِ مجسم، سخاوت میں باریک ہوا، شجاعتِ قلب میں آہن، بھاری بھر کم ہونے میں وزندار قطعہ زمین اور خودداری میں بلند

آسمان مجلس میں جلوت میں نمایاں، خلوت میں پنہاں، قلب میں سب سے الگ قالب میں سب کے ساتھ، عالم جلوت نشین، صوفی خلوت نشین، مدرسہ میں مدرس، خانقاہ میں شیخ، سیاست میں سپاہی، میدان میں مردِ مجاہد، فقیروں میں درویش، عوام میں لیڈر، خواص میں مقتدا، وزراء میں مشیر، غرض ہر میدان میں امتیازی شان کے ساتھ موجود مگر سب شانوں میں تعلق مع اللہ بدستور اور خلوت اور انجمن کے صحیح مصداق،

ع ...یوں بہم کس نے کیے ساغر و سنداں دونوں"۔ (الحرم" مدنی نمبر)

اس سے زیادہ تعارف با لفاظ مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ درج کیا جاتا ہے ؎

سیاسیاتِ ہندی کا نشان ہے ذات سے تیری — یہ کشتی اس بحیرہ میں رواں ہے ذات سے تیری

اسیرِ مالٹا کی جانشینی تجھ کو حاصل ہے — سحابِ حریت گوہر فشاں ہے ذات سے تیری

غلاموں کو سکھایا تُو نے آئینِ جہاں بانی

کیا ہے فخرالدین رازیؒ کی نکتہ سنجی، بوعلی سینا اور فارابی کی منطق، ابنِ حزم اور ابنِ رُشد کی حکمت صرف ایک نتیجہ ہے ذکی الطبع افراد کی پُر عافیت کتب بینی کا، کیا ہے ترکِ دنیا اور متقشفانہ تصوف، ایک خوش گوار جذبہ ہے دنیاوی جھگڑوں سے فارغ البالی کا بہت آسان ہے، سالہا سال اعتکاف کے مکاشفات اور مراقبات کی لطف اندوزی بہت سہل ہے، برسہابرس مطالعہ کتب کر کے تبحرِ علمی کے مکان کی فراہمی بہت سہل ہے کسی خانقاہ کی کنجِ عزلت بہت سہل ہے یا کسی دار العلوم کی مسندِ تدریس، تم پوچھو مشکل کیا ہے؟ میں بتاؤں گا بہت مشکل ہے رجوع الی اللہ، زہد اور تقویٰ کے ساتھ خدمتِ خلق اور نوعِ انسانی کی ہمدردی، یعنی وہ سوز وہ گداز وہ تڑپ وہ بے چینی جو کبھی مسجد میں لے جائے، کبھی حلقۂ درس میں، کبھی منبر پر وعظ و تلقین کے لیے کھڑا کرے کبھی سیاسی پلیٹ فارم پر ترقیٔ ملت اور اعلاءِ کلمۃ الحق کے لیے، پھر کبھی اپنوں کی گالیاں سُنے اور کبھی پا بہ زنجیر جیل خانوں کی سلاخوں میں بند کرائے، دن کے وقت خدمتِ خلق میں مصروف اور پریشان رکھے تو رات کی تاریکی میں محبوبِ حقیقی کے سامنے زاھد شب بیدار بنا کر کھڑا کر دے، اُفق پر صبحِ صادق کی کرن چمکے تو وہ توبہ اور استغفار میں مشغول ہو، آفتاب کی پہلی کرنیں اس کو تسبیح و تہلیل میں مشغول دیکھیں پھر اس کے تبلیغی، تعلیمی، مذہبی اور سیاسی مشاغل کو دیکھتے دیکھتے حیرت و استعجاب کے مغرب میں رُوپوش ہو جائیں، عالم پر سیاہ تاریکی کی چادر تانی جائے، تھکے ماندے انسان اپنی آرام گاہوں کی طرف دوڑیں اور اہل و عیال کی پُر لطف چہل پہل سے دن بھر کی کوفت دُور کریں لیکن یہ مبتلائے سوزِ خلق اب بھی یا تو دور دراز سفر طے کر رہا ہو یا عالی اور عمیق مضامین کے حل کرنے میں دماغ سوزی کر رہا ہو یا مخلوقِ خدا کی تلقین میں مشغول ہو یا اپنے پروردگار کے سامنے سر بسجود گریہ و بکاء، عجز و نیاز، مناجات و تلاوت، طویل قیام، طویل رکوع و سجود سے زاہدانِ خشک کے خلوت خانوں کو شرمار رہا ہو۔ بیشک یہی ہے مشکل ترین سُنّت، یہی ہے انبیاء علیہم السلام کی سچی وراثت، یہی ہے

مضمونِ حدیث کے بموجب انبیاء سابقین علیہم السلام سے مشابہت، یہی ہے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب، اُسوۂ صحابہؓ کا سچا پیرو، یہی ہے مصلحِ خلق، یہی ہے شیخِ وقت، یہی ہے مُرشدِ صادق، یہی ہے قطبِ عالم، اسی کی زندگی درسِ عبرت ہے، قابلِ اتباع بلکہ واجب الاتباع ہے۔

اچھا بتاؤ دورِ حاضر میں کون ہے اس مقدس زندگی کا مالک اور اس مبارک سُنّت کا حامل و ماہر؟ وہی شیخِ وقت قطبِ عالم، مرشدِ خلائق جس کا نام نامی اس تمہید کا مبارک عنوان ہے سیدنا و مُرشدنا شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام حضرت مولانا علامہ سید حسین احمد مدنی صاحب شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند مدظلہ العالی دامت برکاتہ — دار العلوم دیوبند اپنی قسمت پر جس قدر ناز کرے کم ہے کہ ہر زمانہ میں اس کی صدارت کے لیے قدرت کے ہاتھوں نے مخلوق کا بہترین فرد منتخب فرمایا، آج بھی مجدّدِ وقت دار العلوم دیوبند کا شیخ الحدیث ہے، بقول مولانا ظفر علی خان مرحوم ؎

گرمیٔ ہنگامہ تیری ہے حسین احمد سے آج
جس سے پرچم ہے روایاتِ سلف کا سربلند

(ماہنامہ الارشاد مدنیؒ نمبر)

اس میں شک نہیں کہ علماء کرام اور مشائخ عظام اپنی اپنی صوابدید اور توفیق کے مطابق مسلمانوں کی راہنمائی کا فریضہ ادا فرماتے رہتے ہیں مگر جو مقام اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے مجاہد کو ملتا ہے وہ ان عبادت گذاروں کے اجر و ثواب سے کئی گنا زیادہ ہے، ارشادِ قرآنِ عزیز ہے:۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝

(سورۃ التوبۃ ع ۱۹)

کیا بنا لیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور عزت والی مسجد کی تعمیر کی خدمت کو اس آدمی کی طرح جو اللہ تعالیٰ پر اور آخری دن پر ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں (اس کے دین کے لیے) جہاد کرے، یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے ہاں (اجر و ثواب میں) برابر نہیں اور اللہ تعالیٰ راہ پر نہیں لاتا اُن کو جو اس کی حدیں توڑنے والے ہوں۔

اور حسبِ ارشاد رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم:۔

عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال المسلم الذی يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلٰی أَذَاهُمْ أَفْضَلُ مِنَ الَّذِی لَا يُخَالِطُهُمْ وَلَا يَصْبِرُ عَلٰی أَذَاهُمْ۔

(رواہ الترمذی وابن ماجہ۔ مشکوٰۃ باب الرفق والحیاء وحسن الخلق)

(ترجمہ) "وہ مسلمان جو لوگوں کی ہر شعبہ میں راہنمائی کرے اور نہ صرف نعرہ ہائے تحسین سے نوازا جائے بلکہ حق کی طرف مردانہ وار راہنمائی کرے اور حق کے مخالفوں کی اذیتوں کو برداشت کرتے ہوئے اُن کی خیر خواہی کا دامن نہ چھوڑے، یہ دُوسرے اُن مسلمانوں سے افضل ہے جن کا طریق کار ایسا نہ ہو۔"

حضرت عبداللہ بن مبارک اور مجاورِ حرم حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہم ہم زمان ہیں، اوّل الذکر عالم باعمل، محدّث و مفسر ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہد وقت بھی تھے اور فضیل بن عیاضؒ حرم کعبہ میں مجاور تھے اور وہیں انتقال ہوا، حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ (م ۱۸۱ھ) نے فضیل ابن عیاض (م ۱۸۷ھ) کو ایک طویل منظوم خط لکھا، جس کی ایک رُباعی درج کی جاتی ہے ؎

یَا عَابِدَ الْحَرَمَیْنِ لَوْ اَبْصَرْتَنَا
لَعَلِمْتَ اَنَّکَ فِی الْعِبَادَۃِ تَلْعَبُ
مَنْ کَانَ یَخْضِبُ خَدَّہٗ بِدُمُوْعِہٖ
فَنُحُوْرُنَا بِدِمَائِنَا تَتَخَضَّبُ

(تہذیب الاسماء و اللغات نووی ج ۱)

حافظ ابن عساکرؒ نے امام موصوف کے ترجمہ میں یہ اشعار نقل کیے ہیں۔ امام موصوف ایک سال درسِ حدیث دیتے، ایک سال تجارت کرتے، ایک سال جہاد میں شرکت کرتے، حضرت فضیل اس عہد کے مشہور عباد و زہاد میں سے ہیں، حاصل ان اشعار کا یہ ہے: "اے حرمین کے گوشہ نشین عابد! اگر تُو نے ہمارا حال دیکھا ہوتا تو معلوم کر لیتا کہ دنیا سے لاتعلق ہو کر جس عبادت میں تو مشغول ہے وہ تو ایک طرح کا کھیل ہے، جو شخص اپنے رُخسار آنسوؤں سے (عبادت میں) تر کرتا ہے اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ ہماری عبادت وہ ہے جس میں رُخسار آنسوؤں سے نہیں بلکہ گردنیں خون سے رنگین ہُوا کرتی ہیں"۔ حضرت فضیلؒ نے جب یہ اشعار پڑھے تو اُن کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور فرمایا: "صدق ابو عبد الرحمٰن، عبداللہ بن مبارک نے سچ کہا"۔

حضرت مدنی کی تقریباً ساری زندگی اسی طرزِ عمل کا مکمل نمونہ تھی۔ (نوّر اللہ مرقدہٗ)

مکتوباتِ شیخ الاسلام کے مرتب حضرت مولانا نجم الدین اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اُن کی حیاتِ مبارکہ کا حسین مرقع اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

حقیقت میں یہ شانِ زندگی جس نے نہ پہچانی — صحابہؓ کی حیاتِ پاک کو اُس نے نہیں جانا
گدازِ بوذر و عشقِ اویس و سوزِ سلمانی — وہ جس کی خلوتِ شب کی بدولت اب بھی زندہ ہے

ایسے جامع الصفات انسان کی کون کونسی ادا اور اس کی زندگی کے کون کون سے کارنامے کو اجاگر کیا جائے؟ خصوصاً یہ بات ایک ایسے صاحبِ قلم کے لیے اُس وقت زیادہ مشکل ہو جاتی ہے جبکہ اُس کے دل میں صاحبِ عنوان کا ادب و احترام ایک ایسی حیثیت اختیار کر چکا ہو کہ وہ اُسے اگرچہ معصوم تو نہ سمجھتا ہو مگر اپنے دور میں اُس کے سوا کسی پر نظر نہ جمتی ہو اور وہ اسے "اما تو چیزے دیگری" سے تعبیر کرتا ہو۔

اس لیے ناظرین کی خدمت میں درخواست ہے کہ وہ اس کتاب کو نہ تو تاریخی نظر سے دیکھیں نہ ادبی اور علمی نظر سے، بلکہ ایک خادم کے جذبات کے عکس کے طور پر ملاحظہ فرمائیں تو زیادہ مفید ہوگا۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات اور واقعات، کرامات اور مشاہدات پر کافی کتابیں شائع کی گئی ہیں اور ان کے ناموں میں حضرتِ مدنی، شیخ الاسلام، مجاہدِ جلیل وغیرھا عنوانات اختیار کیے گئے جو برمحل اور صحیح تعبیریں مگر احقر نے حضرت کے تاریخی نام چراغ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اختیار کیا ہے۔ حضرتؒ نسبی اور علمی، عملی اور روحانی طور پر اسی سراج منیر سے مستنیر اور مستفید ہوئے ہیں جن سے کل عالم ارض و سما نے ضیاء کا اقتباس کیا ہے اور جس پر کبھی بھی خسوف و کسوف نہ آسکے گا۔

اگرچہ کتاب کا تعلق حضرتِ مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی سوانح حیات کے ساتھ ہے مگر چونکہ آپ کی حیات کے مشاغل اور دین و وطن اور بلادِ اسلامیہ کیلئے جدوجہد کو پوری طرح سمجھنے کیلئے ان مشاغل اور خدمات کا پس منظر سمجھنا ضروری ہے تاکہ ان کی خدمات کی اہمیت اور عظمت معلوم ہوسکے اور کتاب کے پڑھنے والے حضرات کی معلومات میں تشنگی باقی نہ رہے، جیسا کہ:۔

_____ "تحریکِ خلافت میں آپ نے قائدانہ حصہ لیا اور انگریزی حکومت کی شاہ رگ کاٹنے کے لیے فوجی بھرتی کو حرام قرار دینے کا نہ صرف فتویٰ دیا بلکہ خالق دینا ہال کراچی میں افضل الجہاد کا فریضہ ادا کرتے ہوئے علی الاعلان اسے بیان فرمایا!" _____

اس ساری جدوجہد کو سمجھنے کیلئے انگریزوں کی تاجرانہ لباس میں آمد، ہندوستان پر ظالمانہ قبضہ، آزادئ وطن کے لیے ان تمام تحریکات کا اجمالی تذکرہ اور ہندوستان سے انگریزوں کے انخلاء تک حضرت مدنیؒ کی قیادت کا تذکرہ کتاب میں درج کیا گیا ہے۔

واللہ الموفق والمعین

(قاضی) محمد زاھد الحسینی غفرلہٗ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(ج)

حضرت مدنیؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کا تعلق

چونکہ اس کتاب "چراغ محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) میں حضرت مدنیؒ کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ الہندؒ کا ذکر یوں آیا ہے جیسا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی حیات متن تھی اور حضرت مدنیؒ کی حیات اور کارنامے اس متن کی شرح تھی، اس لیے نہایت ضروری ہے کہ کتاب کے شروع میں اس تعلق من المھد الی اللحد کو ذکر کر دیا جائے تاکہ ناظرین حضرات کو حضرت مدنیؒ کے حالات اور واقعات اس معیت کی روشنی میں سمجھنے آسان ہو جائیں، اس تعلق، ربط اور معیت کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

"بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے تلامذہ اور فیضیافتہ حضرات کی تعداد اگرچہ ان کی حیاتِ طبعی کے لحاظ سے کم تھی مگر کیفیت کے لحاظ سے وہ لاکھوں پر بھاری تھے لیکن ان سب حضرات میں سے حضرت نانوتوی (رحمۃ اللہ علیہ) کی جانشینی اور خلافت صرف حضرت شیخ الہند محمود حسن رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو عطا ہوئی"۔

حضرت شیخ الہندؒ نے ویسے تو ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء سے بحیثیت معین المدرسین دارالعلوم دیوبند میں تدریس شروع فرما دی تھی اور ۱۲۹۲ھ سے آپ باقاعدہ مدرس ہو گئے تھے، اس لحاظ سے چوالیس سال خدمتِ تعلیم میں صرف فرمائے اور ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء سے ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء تک تو اڑتیس سال کامل علی الاتصال حضرتؒ نے علمِ دین کی خدمت کی اور بہ حیثیت صدر مدرس و شیخ الحدیث پچیس برس تک فائز رہے، اور آپ کے حلقہ درس سے کابل، قندھار، بلخ، بخارا، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور یمن تک کے ۸۶۰ سعادتمند فیوض سے مالامال ہو کر گئے ان تلامذہ کرام میں محدثِ کبیر حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری مسند نشین حضرت شیخ الھند در زمانہ اسارتِ مالٹا، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، فقیہ عدیم النظیر مفتی کفایت اللہ نور اللہ قبورہم جیسے باکمال علماء کرام تھے مگر جو مقامِ قرب و معیت حضرتِ مدنیؒ کو حاصل ہوا وہ اور کسی کو حاصل نہ ہوا، جیسا کہ حضرت شیخ الھندؒ

کے شاگردِ رشید، بایزیدِ وقت، ولیٔ کامل حضرت میاں سید اصغر حسین نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا ہے :۔

"احقر کے زمانہ قیام جونپور میں حضرت مولانا (شیخ الہندؒ) بھاگلپور سے واپس ہوتے ہوئے ایک روز کے لیے جونپور ٹھہرے، مولانا حسین احمد صاحب[1] ہمراہ تھے، رمضان المبارک کا تیسرا روزہ تھا، شب بیداری کے کسل سے صبح کی نماز کے بعد حضرتؒ نے آرام کرنا چاہا، تنہائی کے لیے مسجد اٹالہ کے بالائی درجہ پر بستر بچھا کر حضرت کو لٹا دیا۔ مولانا حسین احمد (جو اس زمانہ میں "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" کے صحیح مصداق ہو گئے ہیں، ہمیشہ سفر و حضر میں خدمت کے لیے حضرت کو راحت پہنچاتے رہتے تھے) حسبِ عادت پاؤں دبانے لگے، خاکسار محروم الخدمت کو حرص آئی دوسرا پاؤں دبانا شروع کیا اور ہنس کر مولانا حسین احمد صاحب سے کہا "مولوی صاحب آج ہم بھی آپ کے برابر ہو گئے"، حضرت (شیخ الہندؒ) نے سُنکر فرمایا بھائی تم کہاں کہاں ان کی برابری کرو گے"۔

حضرت شیخ الہندؒ کا یہ ایک جملہ اتفاقی نہ تھا بلکہ حضرتِ مدنیؒ کی رفاقت، قُرب اور معیت کی ایک عظیم پیشینگوئی تھی جس کی وضاحت حضرت میاں صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے یوں فرمائی :۔

"اُس وقت تو یہ ایک معمولی فقرہ سمجھا گیا لیکن مولانا حسین احمد کا مدینہ منورہ میں اور پھر اپنی بیش قیمت جوانی کو قربان کر کے خوشی سے نظر بندی میں حضرتؒ کی معیت اختیار کرنا، تمام سفر خصوصاً زندانِ قاہرہ اور اسیری مالٹا میں جان نثاری اور خدمت کرنا اور پھر کلمۃ الحق کے اعلان پر زندانِ کراچی میں اسیر ہونا اور تمام ہندوستان میں بچے بچے کی زبان پر مدحیہ اشعار میں مولانا حسین احمد کا نام ہونا بتلا رہا ہے کہ وہ ایک پُر مغز کلام تھا اور مولانا حسین احمد صاحب کی آئندہ شاندار دینی و قومی زندگی کے لیے ایک معنیٰ خیز اشارہ برکت تھا" (حیاتِ شیخ الہندؒ ص $\frac{198}{199}$)

---

[1] حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی پر منظوم استقبالیہ میں مولانا سراج احمد رشیدی مرحوم نے حضرت مدنیؒ کو وفا کے ساتھ تعبیر کرتے ہوئے فرمایا ؎

حضرت آئیں گے حسین احمد کو بھی لائیں گے ساتھ
شیخ آنے کو ہے ساتھ ان کے وفا آنے کو ہے

اِس سے زیادہ وضاحت حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے، آپ فرماتے ہیں:-

"مولانا حسین احمد صاحب کی شریفانہ جان نثاری اور حبِ شیخ کے متعلق ہم اپنی طرف سے ایک حرف بھی کہنا نہیں چاہتے، لیکن اس وقت کے حالات کو پیشِ نظر رکھ کر خود اندازہ فرمادیں کہ اس زمانہ میں ایسی جان بازی کی نظیر مل سکتی ہے یا نہیں! مدینہ منورہ میں شیخ الحدیث ہونے کی عزت، شرفاءِ بلدہ طلبہ میں رسوخ و وجاہت، ضعیف والد اور بیکس زن و فرزند، اپنی جوانی کی حفاظت اور آئندہ ہر قسم کی امیدِ آرام و راحت، یہ سب ایک طرف ہیں اور حسنِ وفا اور محبتِ شیخ دوسری طرف جس میں جان کا خطرہ ہے اور طرح طرح کے مصائب کا اندیشہ، مگر یہ شخص اس طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اور خطرات کی طرف بے تامل عاشقانہ بڑھا چلا جاتا ہے۔

گذشتہ زمانہ کے فنافی الشیخ اور سرمست لوگوں کی حکایتیں جو آپ نے سنی ہوں گی (کہ عالمِ شوق میں شیخ کے تابدان میں سر گھساتے ہوئے شیخ کی آواز سُنکر محو ہو رہے ہیں، برسات کا پانی صحن میں بھر جاتا ہے اور شیخ بدرو صاف کرنے کے لیے زور سے بانس مارتے ہیں تو سر سے خون کے فوارے جاری ہو جاتے ہیں مگر سر نہیں ہٹتا) اس شخص (حضرتِ مدنی) نے آنکھوں سے دکھلا دی کہ ہاں حالتِ ہوش و حواس میں اس طرح جان فدا کیا کرتے ہیں"[1]

(ق) مولانا محمد جلیل صاحب استاذ دار العلوم دیوبند نے ایک مرتبہ اپنا چشم دید واقعہ بیان فرمایا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے یہاں ایک دفعہ بہت مہمان آگئے، بیت الخلاء صرف ایک ہی تھا، جو دن بھر کی گندگی سے پُر ہو جاتا تھا لیکن مجھے تعجب تھا کہ روزانہ بیت الخلاء صبح صادق سے پہلے ہی صاف ہو جاتا تھا اور پانی سے دُھلا ہوا پایا جاتا تھا، مجھے اس کی جستجو تھی، چنانچہ ایک مرتبہ میں تمام رات اِس راز کو معلوم کرنے کے لیے بیدار رہا، جب رات کے دو بجے تو حضرت شیخ الاسلامؒ لوٹا لے کر پاخانہ میں داخل ہوئے اور ٹوکرہ بھر کر جنگل کا رُخ کیا، فوراً ہی میں نے جاکر راستہ روک لیا تو فرمایا کہ دیکھئے کسی سے تذکرہ نہ کیجئے گا۔[2]

---

[1] حیاتِ شیخ الہندؒ ص ۶۳، ۶۴ [2] ماہنامہ ندائے شاہی مراد آباد (بھارت) بابت فروری ۱۹۹۳ء

استاذ کے ادب واحترام اور جاں فزائی کا حال تو آپ نے دیکھا، خود حضرت شیخ الہندؒ کے قلب میں آپ کے لیے کتنی محبت اور کیسا مقام تھا؟ یہ اس سے بھی عجیب تر ہے، حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں :-

"حضرت مدنیؒ مدینہ منورہ سے تشریف لائے اور درس حدیث میں شریک ہوئے دورۂ حدیث میں قرأت میں خود کرتا تھا، حضرت مدنیؒ نے کتاب مجھ سے لے کر خود پڑھنا شروع کر دیا، میں چونکہ آپ کو پہچانتا نہ تھا اسلئے کچھ ناراضگی کا اظہار کیا تو حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کتاب اسی کو دے دو، آپ نے کتاب قرأت فرمائی، واپسی پر پان کی ڈبیہ میں نے اٹھائی تو حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا یہ بھی ان کو دے دو، خانقاہ میں جب میں نے حضرتؒ کے سر پر تیل ملنا شروع کیا تو حضرتؒ نے فرمایا اس کو ملنے دو، جب حضرت شیخ لیٹے اور ہم نے دبانا شروع کیا تو منع کیا اور فرمایا اس کو دبانے دو، اور پھر اس مہمان سے فرمایا تم لیٹو تاکہ میں تمہارے پاؤں دباؤں، مہمان نے انکار کیا تو فرمایا تم روضۂ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور حدیث پڑھاتے رہے ہو اس لیے تمہارے پاؤں دبانا میری سعادت ہے، میں اور دیگر طلباء حیران تھے کہ یہ کون مہمان ہے، پتہ چلا یہ مولانا حسین احمد مدنیؒ ہیں" (بروایت مولانا محمد امین صاحب مدظلہ (فاضل دیوبند مہتمم دارالعلوم عثمانیہ راولپنڈی)

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا وہ کشفی جملہ سرف تاریخ کے اوراق میں محفوظ نہیں بلکہ عالمِ وقوع میں اس کی صداقت آشکارا ہو گئی کہ حضرت شیخ الہندؒ کے جلیل القدر تلامذہ کو علم و عرفان کے بلند تر مقام تو حاصل ہوئے مگر جس صدیقِ دوران کو اپنے شیخ کے قدموں میں ابدی راحت کی نعمت میسّر ہوئی وہ صرف حسین احمد ہی ہے، یعنی بانی دارالعلوم دیوبند جہادِ حریت کے عظیم علمبردار حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے قدموں میں آپ کے تمام جلیل القدر تلامذہ میں سے صرف محمود حسن ہی کو مقام رفعت حاصل ہوا اور حضرت شیخ الہندؒ کے سینکڑوں تلامذہ میں سے صرف حضرت مدنیؒ کو مقامِ مخلد عطا ہوا، حضرت میاں صاحب (رحمۃ اللہ علیہ)

ہی نے فرمایا :-

"مولانا حسین احمد کے سوانح حیات کو حضرت شیخ الهندؒ کے سوانح حیات سے وہی تعلق ہے جو حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کے سوانح حیات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات سے ہے۔" (حیات شیخ الہند ص ۱۷) وذلك الفوز العظیم

یہ تو حضرت مدنیؒ کے ہم سبق، ہم پیالہ و ہم نوالہ، بایزیدِ وقت حضرت میاں اصغر حسین نور اللہ مرقدہ کی تعبیر بے نظیر تھی مگر یہ تعلق اس قدر آشکارا اور حقیقی تھا کہ ہر ذی فہم اس کو ظاہراً محسوس کرتا تھا۔ جیسا کہ احمد و محمود کے اس جاودانی و لافانی تعلق کو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم نے نہایت ہی جامع اور حسین طریقہ پر بیان فرمایا :-

"جون ۱۹۱۶ء/۱۳۳۴ھ میں شریف مکہ کی بغاوت نے انگریزی ہتھیاروں کی بدولت حج بیت اللہ کا راستہ کھول دیا (جو بوجہ جنگ کے بند ہو چکا تھا) میں مصر میں تھا اور حالات کچھ ایسے تھے کہ انگریزی حکومت مجھے ہندوستان آنے نہیں دینا چاہتی تھی، حج کے بہانے میں حجاز پہنچا اور مقام منیٰ میں حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت ہو گئی۔

سبحان اللہ! آسمان پر بھی کبھی فرش فروش کا کوئی انتظام ہے؟ صوفے بچھے ہیں، شاندار فرنیچر کی سجاوٹ ہے، اِن آنکھوں نے ایک سادہ سی مجلس برپا دیکھی، ایک آفتاب جلوہ گر تھا اور ستارے حلقہ بنائے اس آفتاب جہاں تاب پر نثار ہو رہے تھے، ایک منحنی سا آدمی بیٹھا تھا، صدر میں نہیں تھا لیکن صدر بنا ہوا تھا، غیرتِ حق کی شعاعیں ناتواں شخص سے پھوٹ پھوٹ کر مجلس کو بقعہ نور بنائے ہوئے تھیں۔ عزم حیدری، شجاعتِ فاروقی، استقامتِ صدیقی کے جلوے تھے کہ پڑے برس رہے تھے، وتری الرجل۔ یہ تھی مجلس شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن کی، اور اس بزم ملکوتی میں ایک ستارہ سب سے زیادہ روشن، سورج سے سب سے زیادہ قریب بلکہ سورج پر پروانے کی طرح ٹوٹا پڑتا دکھائی دیا، یہ ستارہ حسین احمد کے سوا کون ہو سکتا تھا۔" (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص ۵۹)

اسی طرح حضرت شیخ الهندؒ کی تحریک آزادیٔ ممالکِ اسلامیہ کے ہمراز اور جاں نثار حضرت مدنیؒ کے بارہ میں سابق امیر امان اللہ خان مرحوم کی بہترین رائے کو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہ

نے یوں بیان فرمایا:۔

"شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ ایک نور تھے تو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اس نور کی ضیاء اور چمک تھے۔" (ماہنامہ دارالعلوم دیوبند جنوری ۱۹۵۸ء ص ۵۱)

اسی نسبت اور تعلق کی وجہ سے حضرت مدنی کے سوانح حیات میں حضرت شیخ الہند (نور اللہ قبورہم) کا تذکرہ ضروری ہے۔

(ف۱) معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے والد ماجد سید حبیب اللہ نور اللہ مرقدہ نے آپ کا جو تاریخی نام **چراغ محمد** رکھا تھا یہ بھی گویا ایک قسم کا منجانب اللہ القاء تھا جس کی تعبیر مندرجہ بالا تعارفی کلمات میں کی گئی ہے، انسانوں کے جلائے ہوئے چراغ تو کسی نہ کسی وقت بجھ جاتے ہیں مگر "سراجاً منیرا" کی طرف نسبت جس سعادتمند چراغ کو حاصل ہو گئی وہ ہمیشہ نور افزا رہے گا، بفضلہ تعالیٰ وکرمہ ؎

اگر گیتی سراسر باد گیرد — چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

اور اس چراغ کو بجھانے والی پھونکیں ناکام رہیں گی ؎

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن — پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

(ف۲) حضرت شیخ الہندؒ کے حالات پر مختصر مگر جامع کتاب "سیرت شیخ الہند" کے مؤلف جناب میاں اصغر حسین صاحبؒ کا مختصر تعارف یہ ہے کہ: "آپ دارالعلوم کے ابتدائی معاونین میں سے حضرت میاں منّے شاہ صاحبؒ کے بھانجے تھے، آپ اپنے ماموں اور حاجی امداد اللہ رحمہم اللہ کے خلیفہ مجاز تھے، دورۂ حدیث کی مشہور کتاب "سنن ابی داؤد شریف" پڑھایا کرتے تھے، (احقر نے بھی ان سے ابوداؤد پڑھی ہے) ۲۱ر محرم الحرام ۱۳۶۴ھ میں ان کا وصال ہوا، آپ کا مزار راندیر ضلع سورت میں ہے۔" (تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد ۲ ص ۹۰) واللہ الموفق والمعین

برصغیر پر دینی اقدار مٹانے کیلئے دو حملے

محمد بن قاسم کی برصغیر میں تشریف آوری ہی سے اسلام کا پرچم برصغیر میں لہرانے لگا اور اس کفرستان میں اسلامی عقائد اور اقدار کو فروغ ہونے لگا، حتیٰ کہ برصغیر میں مسلمانوں نے تقریباً ایک ہزار برس حکومت کی۔ اکبر کے دور اور جہانگیر کے ابتدائی دور کو چھوڑ کر باقی سارے سلاطین شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ کے نہ صرف پیروکار تھے بلکہ دین اسلام خصوصاً فقہ حنفی کو عملی طور پر اپنی حکومتوں میں نافذ کرنے والے تھے۔ برصغیر میں پہلا دینی فتنہ اکبر کے زمانہ میں ظاہر ہوا جس کا بانی خود اکبر تھا، اُس نے حکومت کے نشے میں بے دینی اور دشمنانِ اسلام وزراء اور مصاحبین کے مشورہ اور اُن کی تائید سے **دینِ الٰہی** کے نام سے نیا دین قائم کیا تھا، وہ کہتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانہ سے اب تک ایک ہزار سال ہو چکے ہیں اس لیے وہ دین اسلام بھی ختم ہے، وہ اسلام کے تمام عقائد اور احکام کو نامعقول جانتا تھا، فقہاء کو مفسد سمجھتا اور اہلِ اسلام کو مطعون کرتا تھا اس نے اپنے نام کا خطبہ لا الہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ جاری کیا، اُس نے آتش پرستی کو رواج دیا اور اس کا منتظم ابوالفضل کو مقرر کیا، وہ علی الاعلان مشرکانہ عبادت کرتا تھا اور سورج کو پوجتا تھا، اسلامی عیدوں کو بند کر دیا، شراب اور خنزیر کا گوشت عام کر دیا گیا، اس تمام لادینی میں اُسکے راہنما سو ابوالفضل اور فیضی تھے۔

بعض تاریخوں میں یہ بھی ہے کہ اکبر عیسائیت کی طرف بھی مائل ہو چکا تھا (جیسا کہ اکبر کے زمانہ میں گوا سے عیسائی مشن لاہور آیا اور ایک گرجا بنا کر تبلیغ کی ۱۵۹۷ء سے ۱۶۰۵ء تک ۲۷ آدمی عیسائی ہو چکے تھے جن میں اکثریت جاروب کشوں کی تھی۔ "آئمہ تلبیس ص ۳۴۵") ایسے آدمی سے کچھ مستبعد نہیں جو کہ اپنی ذاتی خواہشات اور اقتدار کے لیے یا ویسے بھی دینِ حق سے دوری کی وجہ سے ہر نئے نظریئے کو قبول کر لے۔

اکبر ۱۰۱۴ھ / ۱۶۰۵ء میں فوت ہوا تو اس کا بیٹا شہزادہ سلیم جس کا لقب جہانگیر تھا تخت نشین ہوا اُس نے پہلے بھی کچھ اہم تبدیلیاں کیں، جیسا کہ وہ خود "تزکِ جہانگیری" میں لکھتا ہے :۔

"ابوالفضل نے میرے باپ کو قرآنِ عزیز کے کتابِ الٰہی ہونے اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت میں شک میں ڈلوا دیا تھا، میں نے اس کافر بے دین کو مروا ڈالا اور اسی وجہ سے میں نے اپنے باپ سے بغاوت کی تھی"

چنانچہ نرسنگھ دیو نے ابوالفضل کا سر کاٹ کر شہزادہ کی خدمت میں بھیجدیا تھا جب شہزادہ سلیم تخت پر بیٹھا تو اُس نے پہلے نرسنگھ دیو کو ایک بڑے رُتبہ پر پہنچایا اور اس پر ہمیشہ مہربانی اور عنایت کرتا رہا۔

مگر جہانگیر نے کئی رسوم ایسی جاری کی تھیں جو شرعاً ناجائز تھیں، علماء وقت اُن کی تردید نہ کر سکتے تھے حضرت مجدد الف ثانی سرہندیؒ نے اکبر اور جہانگیر کے غیر اسلامی عقائد اور رسُوم کے خلاف رسائل لکھے اور علماء سے بھی خط و کتابت کی، اس چیز کو مطلق العنان بادشاہوں کی طرح جہانگیر بھی برداشت نہ کر سکا اِدھر علماءِ سُوء نے بھی اُس کے کان بھرنے شروع کر دیئے، آخر اُس نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کو دو سال قید کا حکم سُنا کر گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا، آپ نے قید خانہ میں تبلیغ فرمائی جس کی وجہ سے کئی کافر مسلمان ہو گئے، اُدھر جہانگیر نے مندرجہ ذیل خواب دیکھا کہ :۔

"دِلّی کی جامع مسجد میں مسلمانوں کا ایک عظیم اجتماع ہے جو کہ سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدم بوسی کے لیے بیتاب ہیں اور باری باری حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل کر رہے ہیں، جہانگیر بھی حاضرِ خدمت ہوا مگر رحمتِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر اسے دُور کر دیا کہ "تُو نے ایک بہت بڑے انسان کو قید کر رکھا ہے"۔ (علماء ہند کا شاندار ماضی مطبوعہ بار اول)

چنانچہ خواب سے بیدار ہوتے ہی جہانگیر گوالیار کے قلعہ میں پہنچا اور حضرت مجدد الف ثانیؒ سے نہ صرف معافی کا خواستگار ہوا بلکہ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوا اور کافی وقت تک حضرتِ مجددؒ سے اپنی افواج اور عساکر میں قیام کرنے کی درخواست کی تاکہ وہ نسبتِ مجددی سے بہرہ ور ہو سکیں۔

جہانگیر اگرچہ اکبر کی نسبت دیندار تھا مگر پھر بھی اس کا حرم مہاراجہ اودھے پور کی بیٹی جودھا بائی تھی جس سے شاہجہان پیدا ہوا، اگرچہ اس کی والدہ غیر مسلمہ تھی مگر اللہ تعالےٰ نے شاہجہان کو دینِ اسلام اور عبادات سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا، وہ تہجد گذار اور پختہ مسلمان تھا۔ بالآخر اسی مجددی نور کی شعاعیں عالمگیر جیسے باعمل اور متقی بادشاہ کی صورت میں پھوٹیں کہ کفر کا سمندر جس جوش سے ابھرا تھا اُسی طرح دب گیا، مسلمان

کے اقتدار کی ساکھ پھر قائم ہو گئی ورنہ اکبر کے بعد ہی ہندوستان میں رام راج کی ندیاں بہتیں۔ اکبر سے لے کر عالمگیر تک "علمائے ہند کا شاندار ماضی" کے الفاظ میں سلاطینِ مغلیہ کے شہنشاہوں کے درجات ملاحظہ فرمائیے۔

"عمل اور ردِّ عمل کی ترتیب زمانہ اکبر سے لے کر عہدِ عالمگیر تک درج ذیل ہے"۔

اکبر ــــــــ لامذہب

جہانگیر ــــــــ مذہبیت اور لامذہبیت میں متوسط

شاہ جہان ــــــــ مذہبیت میں پختہ چشتیت اور مجددیت میں متوسط

عالمگیر ــــــــ مذہبیت میں پختہ اور خالص مجددی

(شاندار ماضی جلد ۱ ص ۵۲۳)

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی محنت سے دینِ حق کی اشاعت اور کافرانہ تدابیر کا دفاع حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرما دیا اور وہی جذبہ اور دفاعی اوصاف دیگر علماء ہند خصوصاً علماء دیوبند میں منتقل ہو گئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فرزند ارجمند شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے دور میں جبکہ عیسائیوں نے ہندوستان پر دھوکہ کے ساتھ حملہ کیا (جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے) تو شاہ عبدالعزیزؒ نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر اس جابر اور ظالم حکومت سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن تدابیر اختیار کرنے کا حکم دیا جس پر اعتقادی، قولی، عملی طور پر عمل کرنے والے علماء کرام میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ممتاز حیثیت رکھتے تھے، جس کی تفصیل آگے آ جائے گی۔

ہندوستان کے مذاہب اور خاص طور پر اسلام پر دوسرا حملہ وسیع اسکیم کے تحت غیر ملکی پرتگیزیوں اور انگریزوں نے حکومت کے زعم اور برطانوی، امریکی اور جرمنی مشنری سوسائٹیوں کے ذریعہ کیا تھا اور پرتگالی و پرتگیزی دَور سے لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدِ حکومت تک پرتگیزیوں اور انگریزوں نے ہندوستان کے مذاہب کو نیست و نابود کرنے اور ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے لیے انتھک کوششیں کیں جنہوں نے ۱۸۵۷ء سے قبل اور بعد کے دور میں کامیابی حاصل کی، مگر روس تو یہ اقدام نہ کر سکا البتہ پرتگیزیوں اور انگریزوں نے ادھر توجہ کی جس کا مختصر سا حال درج ہے:۔

ـــــ "چوتھی صدی عیسوی میں کچھ شامی خاندان کے عیسائی ہندوستان کے ساحل مالابار پر آباد ہو گئے تھے، مالابار کے راجاؤں نے ان سے بہت اچھا سلوک کیا اور

یہاں تک اُن کو مراعات دیں کہ شامی عیسائیوں کے تمام فوجداری اور دیوانی مقدمات کا فیصلہ خود اُن کے بشپ کرتے تھے۔

اُس وقت پرتگالیوں کا یہ دستور تھا کہ وہ جس علاقہ پر قبضہ کرتے اُس کے حاکم اور اس کے اہل و عیال کو اسیر کر کے عیسائی بنا کر لسبن دار السلطنت میں بھیجدیتے تھے، چنانچہ علاقہ پرچول کے حاکم فرمان خاں اور اُس کی بیٹی کو زبردستی نصرانی بنا کر گوا کے پرتگیزی وائسرائے واسکوڈی گاما نے لسبن روانہ کر دیا تھا۔ (تاریخ ہند ذکاء اللہ)

خاص طور پر پرتگیزیوں کے پادریوں کی عجیب حالت تھی، مذہبی جنون میں وحشی بنے ہوئے تھے، وہ کسی کے مذہب میں مداخلت کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے، ہندوستانیوں کو ادائے فرض سے جابرانہ طریقوں سے روکتے تھے، مسلمانوں کی مسجدیں مسمار کر دیتے تھے اور اُن کو پکڑ کر قید میں ڈال دیتے تھے اور مذہب کو تبدیل کرنے کے لیے زور دیتے تھے، اگر وہ مذہب کو تبدیل کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے تو اُن کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے تھے، مروانے کا طریقہ کیا ہوتا تھا وہ گوا کے سیاح وزیر نامی کے صفحات میں پڑھیئے، وہ لکھتا ہے:۔

"میں ایک دن صبح کو اُس مقام پر گیا جہاں پادریوں کا دار القضا بنا ہوا تھا، دار القضا کیا تھا مقتل گاہ تھا، بازار کے بیچ میں ایک بڑا بھاری انجن سُولی کی طرح کھڑا کیا تھا جس پر ایک چرچ لگا ہوا تھا، انجن پر پہنچنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں، اس کو استرا پیڈو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سزا پہنچانے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک بڑا شہتیر بلندی پر لگا ہوا تھا اُس پر انسان کو کھینچ کر چڑھاتے تھے اور وہاں سے اسے گرا دیتے تھے جس کی ضرب سے اُس کی ہڈیاں چُور چُور ہو جاتی تھیں، وہیں تھوڑے فاصلے پر اوپر دار کو جزیرہ تھا جہاں پادری کے فتوے کے مطابق لوگوں کو زندہ آگ میں جلا دیا جاتا تھا، جس کیلئے یہ سزا تجویز ہوتی تھی اُس کو دار القضا سے خوفناک بھتنے اور شیطان کا لباس پہنا کر لاتے تھے اور جلاد کے حوالے کر دیتے تھے، بازار میں علاوہ سُور کے گوشت کے دوسرے گوشتوں کی ممانعت تھی جو مسلمانوں کی پریشانی کا باعث بنی ہوئی تھی۔"[1]

انگریزوں نے اکبر و جہانگیر کے درباروں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا لیا تھا اور اپنے لیے آسانیاں بھی مہیا کر لی تھیں، شاہجہان کے عہد میں انہوں نے ہوگلی کی کھاڑی کی طرف جو پرگنے تھے اس پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور وہاں کی

---

[1] تاریخ بیجاپور جلد ملا

رعایا کو زبردستی اور روپے کا لالچ دے کر عیسائی بنا کر فرنگستان بھیجنا شروع کر دیا، اگرچہ رعایا کے کم ہو جانے سے اجارہ کا روپیہ اُن کو گرہ سے بھرنا پڑتا تھا مگر اس کے باوجود وہ اس فعل سے باز نہیں آتے تھے۔ اُنکی یہ کاروائی دیہات تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ دریا کے کنارے پر جو آدمی بھی ملتا اُس کو پکڑ کر فرنگستان بھیج دیتے تھے۔[1] مرنے والوں کا مال ضبط کرنا، متوفی کے ہندو مسلمان بچوں کو عیسائی بنا کر غلام بنانا، ناواقفیت اور غلطی سے داخل ہونے پر ہندو فقیر کو تکلیف دے کر مار ڈالنا اور مسلمان فقیروں کو قبر میں دفنانا اُن کا شیوہ بنا ہوا تھا۔[2]

اِس ظلم کا انسداد آخر شاہجہاں بادشاہ کو کرنا پڑا، اس نے ان لوگوں کو سخت سزائیں دیں، عالمگیر کے دور میں بھی پرتگیزیوں کا یہی ظالمانہ طور طریقہ جاری تھا۔ منشی ذکاءاللہ نے اپنی "تاریخِ ہند" میں اس کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں:

"پرتگیزی سمندر کے کنارے نیا درہند ہگلی کے قریب رہتے تھے، مسلمانوں کیلئے ایک خدا پورہ آباد کیا تھا، نماز بلاتشویش کے کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ ان کے تعلقہ میں رعایا کا کوئی آدمی مرجاتا اور اس کا کوئی نابالغ لڑکا ہوتا اور بڑا بالغ لڑکا نہ ہوتا تھا تو اُس کے بچوں کو اپنی سلطنت کا بیت المال سمجھ کر اپنے گرجا میں لے جاتے تھے، پادری اُن کو عیسائی مذہب کی باتیں سکھاتا تھا، خواہ وہ ہندو ہوتا یا مسلمان اُس کو عیسائی بنا لیا جاتا تھا اور غلاموں کی طرح اُن سے خدمت لی جاتی تھی ۱۱۰۵ھ ۱۶۹۴ء میں کچھ مسلمان حج کو جا رہے تھے اُن کو گرفتار کیا، واپسی پر گنج سوائی عالمگیری جہاز پر قبضہ کر کے اس کو لوٹا اور جتنے مسلمان جہاز پر سوار تھے ان کو برہنہ کیا اور مستورات کی بے حرمتی کی جس کی وجہ سے مستورات نے سمندر کی تہہ اور خنجر کی دھار کے نذر ہونا منظور کیا"۔[3]

عیسائی مذہب کو پھیلانے کے لیے پرتگیزیوں اور انگریزوں نے بڑے رکیک ہتھکنڈے استعمال کیے، اپنی لڑکیوں کو بادشاہوں کے حرم میں پہنچانے سے بھی گریز نہیں کیا جو وہ بادشاہوں کی بیویاں بنیں۔ چنانچہ اکبر بادشاہ کی بیوی مریم زمانی، عالمگیر کی بیوی مسیح النساء، شاہ عالم کی بیوی مس ہنری اور نصیر الدین حیدر شاہ کی بیوی مخدرہ عالیہ ہوئیں جو عیسائی مذہب پھیلانے کا باعث بنیں۔

مغلیہ دور میں عیسائی اپنے مذہب کی تبلیغ ہندوستان میں بڑی جانفشانی اور تندہی سے کرتے تھے لیکن اس میں

---

[1] بادشاہ نامہ [2] تاریخ خافی خان [3] تاریخ ہند از ذکاء اللہ ہشتم ص ۱۲۱

ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا، چنانچہ ڈاکٹر برنیر اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے :-

"...... کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں اس معاملہ کے شوق میں اس قدر محو ہوگیا ہوں کہ میں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جس قدر حواریوں کے ایک دفعہ کے وعظ سے ایک اثرِ عظیم ہوتا تھا اتنا ہی اس زمانہ کے مشنری لوگوں کے وعظ سے بھی ممکن ہے کیونکہ بُت پرست اور کافر لوگوں کے ساتھ ملتے جُلتے رہنے کے باعث ان کے دلوں کی تاریکی سے مجھے اس قدر واقفیت ہوگئی ہے کہ ہرگز یقین نہیں کہ دو یا تین ہزار آدمی ایک دن میں ایمان لے آئیں خصوصاً مسلمان بادشاہوں اور ان کی مسلمان رعایا سے تو کسی طرح بھی تبدیلیٔ مذہب کی اُمید نہیں، اور چونکہ ممالک ایشیا کے وہ سب مقامات میرے دیکھے ہوئے ہیں جہاں مشنری لوگ مقیم ہیں اس لیے میں اپنے تجربہ کی رُو سے کہہ سکتا ہوں کہ ان لوگوں کی خیرات اور تلقین کا اثر مشرکوں ہی پر ہونا ممکن ہے، اور یقین نہیں کہ دس برس میں بھی ایک مسلمان عیسائی ہو جائے۔ یہ سچ ہے کہ مسلمان انجیل کو مانتے ہیں اور مسیح علیہ السّلام کا ذکر بغیر نہایت ادب و تعظیم کے نہیں کرتے اور بلا لفظ حضرت صرف عیسٰی کبھی نہیں کہتے اور ہماری طرح اس کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ معجزانہ طور پر کنواری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے اور یہ کہ وہ کلمۃ اللہ اور رُوح اللہ تھے لیکن یہ امید کرنا عبث ہے کہ وہ اپنا دین جس میں وہ پیدا ہوئے ہیں چھوڑ دیں اور اپنے پیغمبر کے برحق نہ ہونے کو مان لیں، مگر باوجود ان سب باتوں کے پھر بھی فرنگستان کے عیسائیوں کو چاہیئے کہ مشنری لوگوں کی ہر ایک طرح سے مدد کریں اور اُن کی دُعا، اُن کی طاقت اور دولت اور اپنے نجات دہندہ (عیسٰی علیہ السلام) کے جلال میں بڑھانے میں صرف ہونی چاہیئے مگر اس خرچ کا متحمل اہلِ یورپ کو ہونا چاہیئے"[1]

یہ وہ دور تھا جبکہ مسلمان اقتصادی، اخلاقی، مذہبی، معاشی اور تنظیمی حالت میں بہت مستحکم تھا اور اس کی ایمانی قوت کا لوہا دشمن بھی مانتا تھا لیکن عالمگیر بادشاہ کے انتقال کے بعد مسلمانوں کا ہندوستان میں اقتدار ختم ہوتا چلا گیا، عوام کی اخلاقی، معاشی و تنظیمی حالت بھی گرتی اور خراب ہوتی چلی گئی، مذہب سے وہ لگاؤ نہیں رہا جو ایک مسلمان کو ہونا چاہیئے، ذہن بہت پست ہوگئے اور بے حسّی اور بے بسی طاری ہوگئی۔

انگریزوں کا ۱۱۶۱ھ؁ / ۱۷۴۸ء میں مدراس پر قبضہ ہوگیا تھا، اُن کا طریقہ یہ تھا کہ جس مقام پر قبضہ کرتے وہاں برطانوی،

---

[1] سفرنامہ برنیر جلد ۲ ص ۳۲۳

امریکی اور جرمنی عیسائی مشنریوں کی ٹڈی دل فوج شہروں، قصبوں، دیہاتوں، جنگلوں، پہاڑوں، بازاروں اور محلوں میں پھیل جاتی تھی اور عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتی تھی، سکول کھولے جاتے، ہسپتال قائم ہوتے، طالب علموں اور مریضوں میں نصرانیت کی حقانیت ثابت کی جاتی اور اسلام کی تکذیب و تحقیر کی جاتی تھی اور ان کاموں میں حکمران بھی حصہ لیتے تھے۔

۱۷۵۷ء/۱۱۷۰ھ میں تعلیم کے نام پر حاکم اعلیٰ (گورنر) نے نصرانیت کا پروپیگنڈہ سکولوں میں شروع کر دیا تھا، اس زمانہ میں کلکتہ کے اندر لوٹ مار ہوئی تو میر جعفر سے جرمانہ وصول کیا گیا، اس جرمانہ سے کلکتہ میں فری سکول قائم کیا گیا، اس کے مہتمم گورنر مقرر ہوئے۔ لڑکیوں کی تعلیم کا بندوبست اس سکول میں تھا۔ اس مدرسہ کی تعلیم کی غرض یہ تھی کہ اس میں ہر قوم کا وہ بچہ جس کی عمر پانچ سال سے دس سال تک ہوتی داخل ہو سکتا تھا اور ہر طالب علم کے لیے یہ لازم قرار دیا گیا تھا کہ وہ عیسوی دعاؤں میں شامل ہو اور بائبل کی تعلیم ضرور حاصل کرے۔

اس مدرسہ کے علاوہ اس زمانہ میں جو بھی مدرسہ قائم ہوا اس میں نصرانیت کی تعلیم حاصل کرنا ضروری تھا، چنانچہ بشپ کالج کلکتہ ۱۸۱۹ء/۱۲۲۴ھ میں قائم ہوا اس کے ہر طالب علم کو یہ قسم کھانی پڑتی تھی کہ وہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مشنری کے کاموں میں حصہ لے گا۔

مشن سکولوں میں لڑکوں کو انجیل پڑھا کر ان سے سوال کیا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون ہے اور نجات دلانے والا کون ہے؟ عیسائی مذہب کے مطابق جواب دینے والوں کو انعام دیا جاتا تھا، مشن کے سینکڑوں سکولوں میں داخل ہونے کے لیے حکام ضلع ترغیب دیتے تھے اور سکولوں میں جا کر دیکھتے تھے کہ کون کون شامل ہوا، اگر لوگ بچوں کو شامل نہیں کرتے تھے تو مجبور کیا جاتا تھا اور حکماً داخل ہونا پڑتا تھا۔[1]

انگریزی تعلیم دینے کی غرض ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کرنا تھی، چنانچہ آنریبل مسٹر چارلس گرانٹ ڈائریکٹر کمپنی جو ہندوستان میں انگریزی زبان جاری کرنے کے حامی تھے وہ اس کی غایت یہ بیان کرتے ہیں:[2]

> ...... یہ بالکل انگلستان کے اختیار میں ہے کہ وہ ہندوؤں کو بتدریج ہماری زبان سکھائے اور بعد میں اسی کے ذریعہ ہمارے فنون، فلسفہ، مذہب کی تعلیم دے، مگر بلاشبہ سب سے اہم تعلیم جو ہندوؤں کو ہماری زبان کے ذریعہ ملے گی وہ ہمارے مذہب کی معلومات ہوں گی، مسلمانوں نے اپنی سلطنت کے زمانہ میں ہندوستان کے کیرکٹر میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور ان کو اپنے حال

---

[1] اسباب بغاوت ہند [2] مسلمانوں کا روشن مستقبل

پر چھوڑ دیا ... لیکن ہمیں ہندوستانیوں کو سچے مذہب (عیسوی مذہب) سے اور بہترین اخلاق سے اور علوم وفنون کے اصول سے محروم نہیں کرنا چاہیئے ۔"

سابقہ ہندوستان میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی ہندو عیسائی ہوتا تھا اس کو شاستر کے مطابق ہندو محروم الارث کر دیتے تھے جس سے پادریوں کو آسانی کے ساتھ ہندوؤں کو عیسائی بنانے میں دِقّت کا سامنا کرنا پڑتا تھا، چنانچہ لارڈ ڈلہوزی نے اس پریشانی کا سدِّ باب کرنے کے لیے ایک ایکٹ ۱۸۵۰ء ۱۲۶۶ھ میں نافذ کیا کہ اگر کوئی ہندو عیسائی ہو جائے تو وہ اپنے حقوق اور وراثت سے محروم نہ ہو سکے گا۔

انگریزی حکام نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مخصوص مذہبی نشانوں کو مٹانے کی بھی کوشش کی اور ۱۸۰۶ء ۱۲۲۱ھ میں پہلی بار مقام ویلور مدراس میں سرجان کر اور ایک کمانڈر انچیف نے اپنے فوجی قوانین میں تین باتوں کا اضافہ کیا اور حکم دیا کہ ہندوستانی فوجی ماتھے پر تلک نہ لگائیں، داڑھیاں منڈائیں اور اپنی ہندوستانی وضع کی ٹوپیوں کو چھوڑ کر انگریزی ہیٹ پہنیں۔

اسی پر بس نہیں کیا جاتا تھا بلکہ حکام شہر اور افسرانِ فوج اپنے ماتحتوں سے مذہبی باتیں کرتے تھے، اپنی کوٹھیوں پر بلاکر پادریوں سے مذہب کی تلقین کراتے تھے، اور چھوٹی نوکریوں کے لیے یہ ضروری قرار دے دیا گیا تھا کہ سرٹیفکیٹ پر ڈپٹی انسپکٹروں کے دستخط ہونے ضروری ہیں، یہ ڈپٹی انسپکٹر زیادہ تر مشنری ہوتے تھے جن کو ہندوستانی لوگ کالا پادری کہتے تھے، اگر سرٹیفکیٹ پر ان ڈپٹی انسپکٹروں کے دستخط نہیں ہوتے تھے تو نوکری نہیں ملتی تھی۔

یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور ان کے علاوہ کتابیں، پمفلٹ اور اخبارات بھی شائع ہوتے تھے اور اُن میں جنابِ رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم اور قرآن مجید پر حسب ذیل الزامات عیسائی مشنری علی الاعلان لگاتے تھے:۔

(۱) قرآنِ مجید اصلی نہیں ہے اس میں تحریف و تبدیلی ہوئی ہے۔

(۲) قرآنِ مجید میں کوئی نئی چیز نہیں ہے توریت و زبور سے سرقہ کی گئی ہے اِس کے علاوہ اس میں جو کچھ ہے وہ یہودیوں کی (نعوذ باللہ) خرافات ہے۔

(۳) نبی کی نبوت کے لیے معجزے ضروری ہیں، محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے کسی معجزے کا ظہور نہیں ہوا اس بناء پر وہ (نعوذ باللہ) نبی نہیں تھے۔

(۴) کتابِ مقدس کے مطالب قرآن وحدیث کے خلاف ہیں، اِس لیے قرآن کتابِ الٰہی نہیں ہے۔

(۵) اسلام جھوٹ کی تعلیم دیتا ہے۔

(۶) اسلام جہاد (بزورِ شمشیر) کے ذریعہ پھیلا ہے۔

(۷) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی نہیں آتی تھی بلکہ وہ صرع کی بیماری تھی جس میں (نعوذ باللہ) وہ مبتلا تھے۔

(۸) حضور اقدس کی ذات اقدس پر شرمناک و نازیبا الزامات و حملے۔

(۹) ازواج مطہراتؓ کی ذات پر ناپاک الزامات۔

عیسائی مشنری سرِ بازار علی الاعلان چیلنج کرتے پھرتے کہ ان الزامات کا جواب دو، جواب دینا تو کجا مسلمان ان ناقابلِ برداشت الزامات کو سنتا تھا اور خاموش ہو جاتا تھا، پہلے رسول اللہ کی عزت و آبرو کی خاطر اپنی جان و مال اور آل اولاد کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اس وقت اُس کو اپنی جان زیادہ پیاری تھی اس لیے عیسائی مشنری اُن پر حاوی ہو گئے تھے اور مسلمانوں کے خاندان کے خاندان عیسائی بننے پر آمادہ ہونے لگے تھے۔ چنانچہ عماد الدین پانی پتی مع اپنی اولاد کے عیسائی ہو گیا اور ان کے باپ چراغ الدین اور ان کے بھائی خیر الدین نے بھی عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا اور صفدر علی، رجب علی بھی اسلام کو خیر باد کہہ کر عیسائی بن گئے تھے۔ برتیر نے کہا تھا: "یقین نہیں کہ دس برس میں بھی ایک مسلمان عیسائی ہو جائے" لیکن یہاں اس کے برعکس عمل ہو رہا تھا۔

مگر اس پُر آشوب زمانہ میں اللہ کے نیک بندے اور شمع توحید کے پروانے بھی تھے، مولانا آلِ حسن صاحبؒ نے انہی حالات میں ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۴ء ردِ نصاریٰ میں ایک کتاب "استفسار" شائع کی جس میں پادری فانڈر کی کتاب "میزان الحق" کے اعتراضات کے جوابات بھی تھے۔

اس کے بعد مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے کتب ردِ نصاریٰ لکھیں لیکن انہوں نے اس پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ آگرہ میں پادری فانڈر کی کوٹھی پر اسلام کی حقانیت ثابت کرنے اور عیسائیت کی تکذیب کرنے کے لیے پہنچے اور اس کو مناظرہ کی دعوت دینے گئے، وہ نہیں ملا تو خط و کتابت سے مناظرہ طے کیا، چنانچہ اپریل ۱۸۵۴ء/۱۲۷۰ھ میں دو روزہ تاریخی مناظرہ آگرہ میں پادری فانڈر سے ہوا، جس میں پادری فانڈر کو ماننا پڑا کہ انجیل مقدس میں تحریف ہوئی ہے، اس مناظرہ میں مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کے شریک ڈاکٹر محمد وزیر خان صاحبؒ تھے۔[1]

---

[1] ہندوستان میں اسلام کو ختم کرنے کے لیے جو دوسرا حملہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے ہوا اس کا خاتمہ مولانا رحمت اللہ صاحبؒ اور ان کے حامیوں نے کس طرح کیا؟ اس کی پوری کیفیت مولانا صابری کی تالیف "فرنگیوں کا جال" پڑھئے۔

اس تاریخی مناظرہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ہر قوم میں بیداری پیدا ہوئی حالات نے کروٹ لی اور یہ مناظرہ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء ۱۲۷۳ھ کی ابتداء کا باعث بنا اور مولانا رحمت اللہ صاحبؒ بھی اس جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے ہیرو بنے اور انہوں نے ایک راہنما کے طور پر اس میں حصّہ لیا اور اسی کے ساتھ انہوں نے جبکہ مرکزِ اسلام مکہ معظمہ میں علم کی شمع بجھنے لگی مدرسہ صولتیہ کی بنیاد رکھی جس کا آج سعودی عرب کی مشہور درسگاہوں میں شمار ہوتا ہے اور فضیلت کا درجہ اسی کو حاصل ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا رحمت اللہ صاحب اور ان کے پیروکاروں مولانا محمد قاسم نانوتوی مولانا محمد علی مونگیری، مولانا اشرف الحق صاحب مولانا ابوالمنصور صاحب، مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہم اللہ وغیرہ حضرات کی جدوجہد اور ان کی قلم و زبان نے عیسائی مشنریوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا اور ہندوستان کے مسلمانوں پر جو دوسرا حملہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے کیا گیا تھا وہ بھی ناکام بنا دیا گیا۔ مولانا رحمت اللہ صاحب اور اُن کے حامیوں نے کتابوں کا جواب کتابوں سے، اخبارات کا جواب اخبارات سے، مشنری سوسائٹیوں کا جواب تبلیغی جماعتوں سے دیا اور مناظروں میں مقابلے کر کے دندان شکن جوابات دے کر اُن کے غرور و تمکنت اور مکر و فریب کی قلعی کھولی۔

گارساں دتاسی جو اپنے خطبوں میں مشنریوں کی کوششوں کو بڑا سراہتا تھا اور ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتا تھا وہ مولانا رحمت اللہ صاحبؒ اور اُن کے تبلیغی اثرات کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا چنانچہ اپنے ایک خطبہ میں لکھتا ہے:-

> "یہ بات آسانی سے سمجھ میں آتی ہے کہ ہندو لوگ کیوں زمرۂ اسلام میں شامل ہو رہے ہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بعض عیسائی نامعلوم کیوں اسلام قبول کر رہے ہیں اُردو کے اخبار "چشمۂ علم" میں ان یورپینوں کے اسلام قبول کرنے کے حالات بیان کیے گئے ہیں یہ لوگ مدراس کی ایک مسجد میں جمع ہوئے اور مسلمان ہو گئے اور نماز میں مسلمانوں کے ساتھ شرکت کی، ایک سوئٹزرلینڈ کے باشندے نے کمال کیا نہ صرف یہ کہ اُس نے اسلام قبول کیا بلکہ اب مشرقی لباس زیب تن کیے ہوئے بندیل کھنڈ میں تبلیغ کرتا پھر رہا ہے، مجمعوں میں تقریریں کر رہا ہے اور قرآنِ مجید کے مطالب اردو میں بیان کر رہا ہے"[1]

---

[1] خطبات گارساں دتاسی ۲۰، دسمبر ۱۸۶۹ء صفحہ ۸۱۰

آخر میں دتاسی کو مولانا رحمت اللہ صاحب اور ان کے حامیوں کی مخلصانہ کوششوں کی کامیابی اور مشنریوں کی جدوجہد کی ناکامی کا اعتراف صاف لفظوں میں کرنا پڑا، وہ تحریر کرتا ہے[1]۔

"ہندوستان میں اُن مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے جنہوں نے دینِ مسیحی قبول کیا ہو[2]۔"

ہندوستان جنّت نشان پر انگریزوں کے قبضہ کی مختصر داستان

پہلے گذر چکا ہے کہ پرتگیزیوں نے ہندوستان کو دینی، اخلاقی اور اقتصادی طور پر کس قدر تباہ کیا، یہ مظالم بیشک بے نظیر تھے مگر انگریز نے جس طرح ہندوستان کو سونے کی چڑیا سمجھ کر دھوکہ اور بے وفائی بلکہ غداری سے اس پر قبضہ کیا اُس کی مختصر سی داستانِ دردانگیز حضرت مدنی کے الفاظ میں مندرجہ ذیل ہے۔

"سب سے پہلے ایک مشہور پرتگیز کپتان واسکوڈے گاماں چند جہاز لے کر ۱۴۹۸ء ۹۰۴ھ میں ہند کے مغربی شہر کالی کٹ میں وارد ہوا پھر تجارتی مال کے تبادلے کی شکل میں ۱۶۰۰ء ۱۰۰۸ھ تک تجارت ان کے ہاتھ میں رہی، مگر ساتھ ہی گوا کے مقام پر ایک مضبوط قلعہ بھی بنا لیا، جب انگریزوں نے ہندوستان کی منڈی کا یہ حال سُنا تو چند تاجروں نے مل کر اس وقت کی حکمران ملکہ الزبتھ سے تجارتی پروانہ حاصل کیا اور کچھ تاجر بحری راستہ سے جہانگیر کے زمانہ میں ۱۶۱۲ء ۱۰۲۰ھ کو سورت شہر پہنچے اور کاروبار شروع کر دیا، اس کے بعد جلد ہی ۱۶۱۶ء ۱۰۲۴ھ میں مشرقی ساحل کے مقام سولی پٹم میں کارخانہ کھولا، اور ساتھ ہی ایک قلعہ بھی تعمیر کیا، ۱۶۳۴ء ۱۰۴۳ھ میں شاہجہاں سے اجازت لے کر ۱۶۴۰ء ۱۰۴۹ھ میں ہگلی میں ایک کارخانہ قائم کر لیا جو بعد میں کلکتہ کو منتقل ہو گیا، اس طرح ہندوستان کی تینوں بندرگاہیں کلکتہ، بمبئی، مدراس ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں آگئیں ــــ کمپنی کا یہ پہلا دور ۱۷۵۷ء ۱۱۷۰ھ تک تجارتی دور کہلاتا ہے اس دور میں یہاں سے وہ دولت اکٹھی کی جو اُن کے خواب و خیال میں بھی

---

[1] خطبات گارساں دتاسی، خطبہ ۷، دسمبر ۱۸۶۳ء ص ۴۰۳ [2] گارساں دتاسی کٹر قسم کا عیسائی تھا ہندوستان کے مشنریوں کے کارناموں کو فاتحانہ انداز میں لکھتا تھا اور اس کی بڑی خواہش تھی کہ ہندوستان میں عیسائی مذہب پھیلے، اُس کی قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں۔

نہ تھی، اور ساتھ ہی اخلاقی اور دینی طور پر مسلمانوں میں ایسے اعمال اور اخلاق پیدا کر دیئے جو اُن کے ہاں بھی قابلِ نفرت تھے۔۔۔۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا دوسرا دور یہ تھا کہ اب ہندوستان کو طاقت کے زور سے قابو کیا جائے، یہ دور ۱۷۵۷ء/۱۱۷۰ھ سے لے کر ۱۸۳۲ء/۱۲۴۷ھ تک رہا ہے جس میں مظالم کی تفصیلات بڑی دردناک ہیں۔ اسی دور میں انگریزوں نے میر جعفر جیسے نمک حرام کو خرید لیا، پلاسی کے میدان میں انگریزوں اور مسلمانوں میں جنگ ہوئی، اس جنگ میں کامیابی کے بعد انگریزوں نے قدم بڑھانے شروع کر دیئے اور اب حکمران بن گئے۔ اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا تیسرا دور شروع ہوا جو کہ ۱۸۳۳ء/۱۲۴۸ھ تک رہا، اور اس کی حقیقت مدراس کے بورڈ آف ریونیو کے صدر سر جان سلیور کے الفاظ میں یہ تھی:۔

"ہمارا طرزِ حکومت اسپنج سے بہت مشابہت رکھتا ہے، وہ گنگا کے دہانے سے تمام نعمتیں چوس لیتا ہے اور ٹیمز (انگلستان کے دریا) کے کنارے نچوڑ دیتا ہے۔"

جس کے نتیجہ میں صرف ۹ سال میں ایک کروڑ نوے لاکھ افراد قحط سے ہلاک ہوئے ہیں۔۔۔۔۔

چنانچہ ہندوستانیوں نے خصوصاً مسلمانوں نے اس ظالم اور خونخوار حکومت سے جان چھڑانے کے لیے پوری صدی مقابلہ کیا جس کا خلاصہ حضرت مدنیؒ کے الفاظ میں درج ہے:۔

"۱۷۵۷ء/۱۱۷۰ھ یعنی جنگِ پلاسی سے لے کر ۱۸۵۷ء/۱۲۷۳ھ تک ایک صدی کا زمانہ داخلی ہندوستان میں تمام لڑائیوں اور جنگ سے بھرا ہوا ہے جن میں عموماً ہندوستانی زیادہ تر ہلاک ہوتے رہے اور ہندوستانی سرمایہ ہی لوٹا جاتا رہا۔ اسی صدی میں نواب سراج الدولہ والی مرشد آباد بنگال کی لڑائی، میر قاسم نواب اودھ وغیرہ کی پٹنہ اور بکسر کی لڑائی، روہیل کھنڈ کی طویل و عریض، کرناٹک اور دکن کی لڑائیاں، سلطان ٹیپو مرحوم کی لڑائیاں، مرہٹوں سے لڑائیاں، نیپال اور بھوٹان کی لڑائیاں، پنجاب اور اودھ اور سندھ، بمبئی کی لڑائیاں ہیں جن میں بےشمار جانیں ضائع ہوئیں اور آخر ۱۸۵۷ء/۱۲۷۳ھ کی انقلابی لڑائی ہوئی جس سے تمام ہندوستان انتہائی بربادی کے گھاٹ پر اتار دیا گیا تھا۔" [1]

---

[1] نقشِ حیات، جلد ۱، ص ۲۰۶ تا ۲۵۱

جنگ آزادی میں مجاہدین اُمراء کی قربانی اور علماء کرام کا قائدانہ کردار

انگریزوں نے چونکہ سلطنت مسلمان خانوادوں سے غصب کی تھی اسلئے وہ جانتے تھے کہ جب تک وہ مسلمانوں کو پورے طور پر نہ دبائیں گے اُن کی حکومت مضبوط اور مُستحکم نہ ہو سکے گی، چنانچہ اس تمام عرصے میں انہوں نے مسلمانوں کو سیاسی اور عسکری محاذوں پر پے در پے شکستیں دیں بلکہ تمدنی اور تہذیبی میدانوں میں انہیں ایسا رگیدا کہ وہ مکمل طور پر مسلمانوں کی کمتری اور انگریزوں کی برتری کے قائل ہوتے چلے گئے۔

اورنگزیب کی وفات سے لے کر ۱۸۵۷ء ۱۲۷۳ھ کی ڈیڑھ صدی کے دوران قدرت نے مسلمانوں کو سنبھلنے اور ازسرِنو قدم جمانے کے لیے کم از کم تین بڑے مواقع عطا کیے، ان میں سے پہلا موقع ۱۷۶۱ء ۱۱۷۴ھ میں آیا جب احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں ۷ لاکھ مرہٹہ فوج کو ذلت آمیز شکست دے کر ہندوؤں کی اُبھرتی ہوئی قوت کو پاش پاش کر دیا۔ اس عظیم اور فیصلہ کن تاریخی جنگ کے بعد احمد شاہ ابدالی واپس افغانستان چلا گیا، جس سے مسلمان اس عظیم الشان فتح سے کسی طرح کے فائدے کی بجائے نقصان میں رہے کیونکہ ہندو سامراج کی شکست سے سفید سامراج کے راستے سے ایک بہت بڑی رکاوٹ دور ہوگئی۔ دوسرا موقع دکن میں سلطان حیدر علی اور سلطان فتح علی ٹیپو کے عروج کی صورت میں نمودار ہوا، اگر ہندوستان کے کچھ مسلمان حکمران ہی ان دونوں باپ بیٹے کے مددگار بنتے تو برطانوی سامراج کے بڑھتے پھیلتے ہوئے درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چنداں مشکل نہ تھا مگر کئی مسلمان نوابوں نے ان دونوں مجاہدوں کی حمایت کے بجائے ان کے خلاف انگریزوں کو مدد دی۔ سلطان ٹیپو جب ہندوستانی حکمرانوں سے مایوس ہوا تو اس نے مدد کیلئے اپنے سفیر افغانستان، ایران، ترکی اور نپولین کے پاس بھیجے، نپولین نے جلد از جلد ہندوستان پہنچنے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن وہ عراق سے آگے نہ آسکا، ایران کی طرف سے کوئی جواب ہی نہ آیا اور ترکی کے سلطان نے ٹیپو سلطان کو انگریزوں کے ساتھ صلح صفائی اختیار کرنے کا مشورہ دیا، ایک زمان شاہ والیٔ کابل پہنچا لیکن انگریزوں کی شاطرانہ چالوں کی وجہ سے اس کے اپنے بھائی محمود شاہ نے ایران سے افغانستان پر حملہ کر دیا اور اسی طرح ملک کے دوسرے حصوں میں بھی علماء نے جنگ آزادی میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔[1]

---

[1] محمد علی جناح سیرت و کردار از پروفیسر کرم حیدری صفحہ ۱۶

بالآخر ہندوستان سے اسلامی حکومت کے آخری چراغ کو گل کرنے کے لیے بہادر شاہ ظفر کو ۱۰ر جنوری ۱۸۵۸ء کو مجرم بنا کر رنگون بھیج دیا اور یہ ظالم خود تخت و طاؤس کے مالک بن بیٹھے —— بہادر شاہ ظفر رحمۃ اللہ علیہ کی جلاوطنی اور حسرتناک موت کا مختصر سا حال عنقریب آرہا ہے۔

حضرت مدنیؒ کی مجدّدانہ حیثیّت

کسی شخصیت یا جماعت کی حیثیت اور اس کا مقام معلوم کرنے کے لیے اُس ماحول کا سمجھنا ضروری ہے جس ماحول میں اُس نے اپنی خدمات کا مظاہرہ کیا ہو، جیسا کہ شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کو اُمت نے "مجدد الف ثانی" کا خطاب اس لیے دیا ہے کہ آپ نے برصغیر میں اسلام پر حملہ اور "دینِ اکبری" کے خلاف جہاد کیا اور ہر قسم کی تکالیف برداشت کیں مگر آخر مظفر و منصور ہوئے۔

اسی طرح شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے جن حالات کا بے نظیر مقابلہ کیا وہ صرف آپ ہی کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ انگریز جیسی جابر، ظالم، غاصب قوم کے ساتھ مقابلہ کرنے والے اور اُن کو ملک سے بدر کرنے والے علماء کرام اور دُوسرے محبانِ وطن، ہمدردانِ قوم کافی صاحبِ عزیمت تھے مگر جس مجاہدِ جلیل نے ۴ر مئی ۱۷۹۹ء کو ٹیپو سلطان کی شہادت پر انگریز کے اس متکبرانہ نعرہ (آج ہندوستان ہمارا ہے[1]) کا ۱۹۲۲ء میں پابندِ سلاسل ہوتے ہوئے یہ جواب دیا تھا ؎

پڑا فلک کو ابھی دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں

وہ جلانے والا صرف چراغ محمد حسین احمد مدنیؒ ہی تھا، اسی مضمون کو مفصل طور پر سمجھنے کیلئے انگریز کی مکارانہ، غدارانہ سرگذشت کا مجمل ذکر کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اس بات کو سمجھ جائیں کہ اسلام اور مسلمانوں کا دینی، دنیاوی، اخلاقی، اقتصادی دشمن عیسائی تھا اور اب بھی وہی ہے اور عیسائی ہی ہی یہودیوں اور دوسرے دشمنانِ اسلام کی پشت پناہی کر رہا ہے، آج اگر عیسائی ان کی امداد نہ کریں تو یہ ختم ہو سکتے ہیں۔ (حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل)

---

[1] علماء ہند کا شاندار ماضی جلد ۲ ص ۷۵

آخری مغلیہ فرمانروا بہادر شاہ ظفر کی

ہندوستانیوں کے نام اپیل

ہم وطنوں سے اتحاد کی ضرورت

ہندوستان جنت نشان میں تمام لوگ بلالحاظِ دین و مذہب آرام اور خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ عیسائی درندوں نے غداری کیساتھ اُن کے وطن پر قبضہ کر لیا اور اُن کی جان، مال، عزت ہر چیز کو شیر مادر سمجھ کر پینے لگے مسلمان فرمانرواؤں کی بے خبری، ناجائز رواداری، باہم اختلاف نے میدان صاف رکھا، جب اُن کو احساس ہوا تو وطن کی حفاظت کیلئے کمربستہ ہوئے اگرچہ وقت گذر چکا تھا مگر پھر بھی احساس ہوا، تو سب سے پہلے آخری مغلیہ تاجدار بہادر شاہ ظفر نے ایک اپیل بطور شاہی فرمان کے تمام ہندوستانیوں کے نام جاری کیا جس کا ایک حصہ درج ذیل ہے:-

"...... اب اگر انگریز ملک ہندوستان میں رہیں گے تو کل اس ملک کے آدمیوں کو مار ڈالیں گے اور ہمارے مذہبوں کو مٹا دیں گے، ہر چند کہ بعض آدمی ہمارے ملک کے اب بھی انگریزوں سے موافقت رکھتے ہیں بلکہ اُن کی طرف سے لڑتے پھرتے ہیں، ان کے حال پر بخوبی غور کیا گیا تو یہ ظاہر ہوا ہے کہ انگریز نہ ان کا مذہب چھوڑیں گے اور نہ تم سب کا، بس اس صورت میں ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم نے ایمان اور جان کی سلامتی کے واسطے کیا تدبیر کی ہے، اگر ہماری اور تم سب کی رائے متفق ہو تو بہت آسانی سے انگریزوں کو غارت کر کے اپنے ملک اور ایمان کو بچا سکتے ہیں، چونکہ ہم سب کو ہندو اور مسلمانوں کی بہتری پیشِ نظر ہے اور انگریز دونوں فرقوں کا دشمن ہے لہٰذا تمہارے مذہب کی حمایت کا پاس اور خیال کر کے اور بہ نظر اندفاعِ اعداءِ دین بذریعہ اس فرمانِ مطبوعہ کے اعلان کیا جاتا ہے کہ اہلِ ہنود کو گنگا جی، تلسی اور سالگرام کی قسم ہے اور مسلمانوں کو قرآن شریف کی قسم ہے کہ وہ بالاتفاق شامل ہو کر اپنی جان اور ایمان کی حفاظت کے واسطے انگریزوں کو یہاں سے نکال دیں۔" (مُہر بہادر شاہ)

(کتاب باغی علماء ص ۱۲۶ بحوالہ واقعاتِ دارالحکومت حصہ دوم ص ۱۷۹)

بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی اور حسرتناک موت

دار العلوم دیوبند کا قیام

سراج الدین بہادر شاہ ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳۷ء میں شاہی تخت پر متمکن ہوئے اور ۱۸۶۲ء میں بحالتِ غربت جلاوطنی بروز جمعۃ المبارک ۱۴ جمادی الاول ۱۲۷۹ھ رنگون میں وفات پاگئے اس وقت بادشاہ کی عمر ستاسی ۸۷ سال تھی۔ اس اجمال کی مختصر سی کیفیت یہ ہے کہ:

——— وہ شخص جو بابر، اکبر، شاہجہان اور عالمگیر کا جانشین تھا ایک بے حقیقت مجرم کی طرح قید کرلیا گیا، غلاموں نے اپنے آقا کو گرفتار کرلیا، جو تجارت کرتے آئے تھے وہ بادشاہ بن بیٹھے اور جس نے تجارت کا پروانہ دیا تھا وہ مجرم قرار پایا، اس کے چار بیٹوں کے سر کاٹ کر بادشاہ کو بھیجے گئے اور پھر ان کی لاشوں کو سولی پر چڑھایا گیا۔ (معارف ستمبر ۱۹۹۴ء صـ ۲۱۲)

۱۰ رجنوری ۱۸۵۸ء کو بہادر شاہ ایک فوجی کمیشن کے روبرو لائے گئے جس میں تین سردار ملکہ معظمہ کی طرف سے اور دو ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے تھے۔ اس کمیشن کے ظالمانہ فیصلے کے مطابق بادشاہ کو جلاوطن کرکے رنگون بھیجدیا گیا، جہاں جہاز سے اترتے ہی گوروں کی حراست میں بندگاہ سے صدر بازار کے ایک دو منزلہ بنگلہ میں نظر بند کردیا گیا جس پر موت تک گوروں کا پہرہ رہا اس کے بعد بہادر شاہ کی اہلیہ نواب زینت محل کو بھی اسی طرح رنگون بھیجا گیا کہ چھ سو گوروں اور ایک توپ خانہ کی نگرانی میں شاہی خاندان کے ۱۶ مرد و زن کو ۲۸ مارچ ۱۸۵۸ء کو بھیجدیا گیا اور ادھر دلی میں ۲۷ ہزار مسلمانوں کو پھانسی دی گئی، کچھ دنوں کے بعد ملکہ کا بھی رنگون میں انتقال ہوگیا اور بادشاہ کے پہلو میں دفن ہوئیں[1]

اِس مظلومانہ قید کی داستان کی ایک جھلک خود بہادر شاہ ظفر ہی کے اشعار میں

---

[1] از کتاب باغی علماء صـ ۱۱۱

درج ہے ؎

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
مرا رنگ و روپ بگڑ گیا مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اُسی کی فصلِ بہار ہوں
پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آکے شمع جلائے کیوں میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

؎ نہ دبایا زیرِ زمیں انہیں نہ دیا کسی نے کفن انہیں
نہ ہوا نصیب وطن انہیں نہ کہیں نشانِ مزار ہے

اسی پر بس نہیں ایک یورپین مسٹر ڈاسن نے جہاں اس کی کوٹھی تھی اپنے کھیلنے کے میدان کے لیے اِس قبر کا نشان بھی مٹا دیا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ایک دردمند مسلمان عبدالسلام مرحوم نے بہ مشکل تمام وہ جگہ تلاش کر کے ایک کتبہ انگریزی زبان میں لگوا دیا جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:۔

"دِلّی کا معزول بادشاہ بہادر شاہ ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو مرا اور اس جگہ کے قریب دفن ہوا"

۱۸۹۴ء تک مزار پر جانے کی اجازت نہیں تھی بعد میں ایک معمولی سا قُبہ تعمیر کیا گیا۔ ۱۹۴۴ء میں سبھاش چندر بوس نے وہاں آزاد ہند فوج کی ایک پریڈ کی اور بہادر شاہ ظفر کو تحریکِ آزادی کے پہلے قائد کی حیثیت سے یاد کیا۔ (معارف ستمبر ۱۹۹۶ء ص ۲۲۳)

بہادر شاہ کی جلاوطنی کے بعد اب انگریز اس ملک کے بادشاہ بن گئے اور ہندوستانیوں کو تقریباً ایک سو سال عذابِ الیم میں مبتلا رکھ کر اب کُھلم کُھلا انگریزوں کی حکومت کی عملداری یوں شروع ہو گئی کہ عیسائی ہلاک شدہ گوروں کی یادگاریں قائم کی گئیں۔

۱۸۷۰ء میں ڈیوک آف اڈنبرا ہندوستان آیا۔ ۱۸۷۵ء کے آخر میں ملکہ معظمہ کا دوسرا صاحبزادہ ڈیوک آف اڈنبرا ہندوستان آیا اور امرتسر کے باشندگان شہر اور

دیسی عیسائیوں نے اس کا خیر مقدم کیا، ۱۳ر مارچ ۱۸۷۶ء کو براستہ بمبئی واپس لوٹا۔ اور ۱۸۷۷ء میں دربارِ قیصری منعقد ہوا جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ اب انگریز اس ملک کے بادشاہ ہیں۔

یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو دلی میں ملکہ معظمہ کے شہنشاہِ ہند ہونے کا اعلان کیا گیا۔ ہندوستان کی سلطنت برطانیہ، فرانس، جرمنی کے مجموعہ رقبہ کے مساوی ہے۔

۲۳ر دسمبر ۱۸۷۶ء کو وائسرائے لارڈ لٹن آئے اور دلی میں اُس کا استقبال کیا گیا۔

یکم جنوری ۱۹۰۳ء کو ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کے لیے دلی میں دربار منعقد ہوا۔

اگرچہ بظاہر انگریزوں نے ملک پر قبضہ کیا تھا مگر درحقیقت انہوں نے برصغیر سے اسلام کو بدر کرنے کا عزم کر رکھا تھا، اُن کو علم تھا کہ اس ملک پر مسلمانوں نے تقریباً ایک ہزار سال حکومت کی اور ان ہی کی فیاضی اور غلط اندیشی نے انگریزوں کو اس ملک کا بادشاہ بنایا، اس لیے وہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ کسی بھی وقت یہی مسلمان ان کو اس وطن سے نکال سکتے ہیں، اس لیے انگریزوں نے برصغیر پر اپنی حکومت کے دوام کے لیے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کیے ،۔

(۱) مسلمانوں کی تعلیماتِ اسلامیہ سے جہاد اور جذبۂ جہاد کو ختم کر دیا جائے، اس کے لیے جھوٹے نبی اور ایسے افراد اور طبقات پیدا کیے گئے جنہوں نے جہاد کو منسوخ کرنے پر پورا زورِ قلم اور زورِ بیان صرف کیا، جیسا کہ مرزا قادیانی اور اس کے دوسرے ہم مشرب تھے۔

(۲) جذبۂ جہاد کو ختم کرنے کے لیے اسلامی عقائد سے کفر، اسلام، منافق، مرتد وغیرہ ان امتیازات کو ختم کر دیا جائے جو اسلامی تعلیمات کا طرۂ امتیاز ہیں، جس جہاد کو رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذروۃ سنام الجہاد فرمایا ہے اسے بالکل فراموش کرا دینے کے لیے طریق کار اختیار کیا جائے۔

(۳) جذبۂ جہاد اور اسلام کی صحیح تعبیر کامل اور مکمل طور پر پڑھانے والے اداروں (دینی مدارس) کو یکسر ختم کر دیا جائے اور ان کے مقابلے میں ایسے مدارس کھولے جائیں جو یا تو بالکل علی الاعلان عیسائیت کے ترجمان ہوں (جیسا کہ مشن سکولز) یا ان میں مذہبی اور دینی نصاب کا کچھ وہ حصہ رکھا جائے جس میں اسلام کی عظیم تعلیمات جن سے جذبۂ خودی اور جذبۂ حریت پیدا ہوتا ہو

یکسر خارج کر دیا جائے اور ان برائے نام اسلامی اداروں کے فضلاء کو ملازمتیں مہیا کر دی جائیں تاکہ علمی طبقات میں ان درسگاہوں کی عزت زیادہ ہو۔

(۴) دینی مدارس کی امداد بند کر دی جائے اور ان کی وہ جاگیریں ضبط کر لی جائیں جو ان کے اخراجات کے لیے مسلمان بادشاہوں نے عطا کی تھیں تاکہ یہ مدارس معاشی مشکلات کی وجہ سے ازخود بند ہو جائیں۔

چنانچہ اُس وقت کے حالات کا بچشمِ خود ملاحظہ کرنے والے ایک دردمند عالمِ دین کا بیان ہے کہ:۔

"مجموعہ حال کے دیکھنے سے یوں نظر آتا تھا کہ اب علم دین کا خاتمہ ہے نہ کوئی پڑھ سکے گا نہ پڑھا سکے گا، بڑے بڑے شہر جو کہ مرکز اس دائرہ کے تھے خراب ہو گئے تھے، علماء پریشان، کتب مفقود، جمعیت نہ دارد، اگر کسی قلب میں شوقِ علم اور طلب کی ہمت ہوئی تو کہاں جائے اور کس سے سیکھے؟ اور یوں نظر آتا تھا کہ بیس۲۰ تیس۳۰ برس میں جو علماء بقیدِ حیات ہیں اپنے وطنِ اصلی جنت کو سدھار جائیں گے تب کوئی اتنا بتلانے والا بھی نہ رہے گا کہ وضوء کے کتنے فرض اور نماز میں کیا واجبات؟" (تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد ۱ ص ۱۴۲)

ف:۔ بہادر شاہ ظفر کا انتقال رنگون میں ۷ نومبر ۱۸۶۲ء مطابق ۱۴ جمادی الاول ۱۲۷۹ھ کو جمعہ کے دن ہوا اور دارالعلوم دیوبند کا افتتاح مسجدِ چھتہ میں ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء مطابق ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ بروز پنجشنبہ ہوا جس کے پہلے بانی سید محمد عابد نوّر اللہ مرقدہٗ تھے، ابھی یہ دارالعلوم صرف ایک مکتب کی شکل میں اس قدیم مسجد میں قائم ہوا تھا مگر اس کی اصلی غرض کیا تھی؟ سید محمد عابد نوّر اللہ مرقدہٗ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:۔

"ان بزرگوں کا سب سے بڑا مشغلہ یہی ذکر و فکر ہر وقت رہتا تھا کہ انگریزوں کا جوا کس طرح کندھوں سے اتارا جائے؟ اسی کے بارہ میں پیشگوئیاں اور مکاشفات تھے اور اسی کے بارہ میں عام نظم و انتظام، ایک دن چھتے کی مسجد میں سب بزرگ جمع تھے انگریزوں کا تسلط اور غیر معمولی طاقت کو دیکھ کر حضرت حاجی سید محمد عابد صاحبؒ نے فرمایا کہ انگریزوں نے گھیرے پنجے جمائے ہیں دیکھئے کس طرح اکھڑیں گے! اس پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے (جو مدرسہ کے سب سے پہلے شیخ الحدیث تھے) فرمایا

حاجی صاحب! آپ کس خیال میں ہیں وہ وقت دور نہیں جبکہ ہندوستان صف کی طرح پلٹ جائے گا، کوئی جنگ نہ ہوگی بلکہ بحالتِ امن وسکون یہ ملک صف کی طرح پلٹ جائے گا رات کو سوئیں گے ان کی عملداری اور صبح کریں گے دوسری عملداری میں" (تاریخ دار العلوم جلد ا ص ۲۱۸)

اسی دار العلوم نے سینکڑوں مفسر، محدث، صوفیاء اور مجاہدین پیدا کیے جن کے فیوضات اور برکات سے عالمِ اسلامی بہرہ ور ہو رہا ہے مگر ان کی روایات کا امین اور ان کی خوابوں کی تعبیر جس ذاتِ بابرکات کی مخلصانہ جدوجہد سے ہوئی وہ حسین احمد مدنی ہی ہے جس نے اپنی آنکھوں سے انگریزوں کا ہندوستان سے اخراج دیکھ لیا اور ولسن کے نعرہ کی عملی تردید کی۔

ضروری ذیقعدہ ۱۲۱۳ھ مطابق ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو ٹیپو سلطان نے جامِ شہادت نوش فرمایا اور اپنے باپ کے پہلو میں میسور میں دفن کر دیئے گئے، آپ کی تاریخ وفات ٹیپو بوجہ دینِ محمد شہید شد نکلی۔ ۱۲۱۴ھ جب جنرل ہارس آپ کی لاش پر آیا تو خوشی سے پکار اٹھا کہ "آج ہندوستان ہمارا ہے"۔ مگر وہ دار العلوم دیوبند جس کا افتتاح ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو ہوا، اسی دار العلوم کے ایک مجاہد سپوت سید حسین احمد مدنیؒ نے ۱۹۴۷ء میں اس نعرہ کا عملی جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ:-

"آج سے انگریز ہندوستان سے ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہے اور اب ہندوستان ہمارا ہے"۔ (مکتوباتِ شیخ الاسلام جلد ۴ حاشیہ ص ۱۰)

ف:- دار العلوم دیوبند کا افتتاح بطور دینی مدرسہ ۱۸۶۶ء کو ہوا اور ساتھ ہی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا افتتاح بطور مدرسۃ العلوم ۱۸۷۵ء کو ہوا جس کے بانی سید احمد خان نے لندن کا سفر کیا اور ملکہ معظمہ سے ملاقات کی جس کا منظر ان ہی کے الفاظ میں درج ہے:-

"جب ملکہ معظمہ تشریف لائیں تو میں نے بھی مثل تمام درباریوں کے اپنے نمبر پر جا کر سلام کیا سلام کرنے کا دستور یہ ہے کہ ملکہ معظمہ سے ہاتھ ملا کر اور بایاں گھٹنا ٹیک کر حضور ممدوحہ کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہیں"۔ (مسافرانِ لندن ص ۲۰۴ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور)

ع

نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

ف :- دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کا یہ تفاوت صرف انگریز کی دشمنی اور دوستی کا نہ تھا بلکہ یہ عقیدہ، مسلک اور فکر و عمل کا اختلاف تھا جو دونوں اداروں کے مقاصد، نصاب، ماحول اور ارباب اختیار کے درمیان ایک واضح تضاد کی صورت میں نظر آتا ہے۔
دارالعلوم دیوبند کی بنیاد اکابر اہلسنت کی تصریحات کی روشنی میں خالص اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے لیے رکھی گئی تھی اور دارالعلوم دیوبند حنفی مکتبہ فکر کا ترجمان تھا، شیخ الاسلام حضرت مدنی رح فرماتے ہیں :-
اسی خصوصیت کا احساس کرتے ہوئے غیر مقلدوں، قادیانیوں، شیعہ، آغاخانیوں، بوہروں، رضا خانیوں، نیچریوں وغیرہ نے کبھی اس کی اعانت میں حصہ نہیں لیا۔۔۔۔۔۔
ہاں اہل سنت والجماعت مقلدین احناف اور عام مسلمانوں نے برابر دلچسپی لی اور آج تک لے رہے ہیں۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ فِی الدَّارَيْنِ خَيْرًا۔ (القاسم دارالعلوم نمبر محرم ۱۳۴۷ھ ص ۵۵)
جبکہ علی گڑھ کالج اس خالص مذہبی اور روحانی خصوصیت سے محروم تھا، علی گڑھ کالج کی بنیاد انگریز کے ایماء پر ایک سیکولر ادارہ کے طور پر رکھی گئی تھی جس میں بلاتفریق مذہب و ملت ہر عقیدہ اور مذہب کے اساتذہ اور طلباء کا ایک معجون مرکب تھا۔ خود سرسید کے عقائد اور اس کی دعوت میں الحاد، تاویل اور اسلام کے بنیادی عقائد کو جس طرح تمسخرانہ انداز سے پیش کیا جاتا تھا، اہل حق کے لیے یہ تکلیف دہ اور پریشان کن صورتحال تھی، مشہور مؤرخ شیخ محمد اکرام مرحوم لکھتے ہیں :-
"اور علی گڑھ کالج کے افتتاح سے سات آٹھ سال پہلے سرسید انگریزی تعلیم کی ترویج سے نہیں بلکہ اپنے معاشرتی اور مذہبی عقائد کی وجہ سے مسلمانوں میں "نیچری" اور "کرسٹان" کہلانے لگے۔" (موج کوثر ص ۸۷)
شیخ محمد اکرام مرحوم آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ :-
"جن لوگوں نے سرسید کے حالات بغور نہیں پڑھے وہ سمجھتے ہیں کہ سرسید کی مخالفت اُن دقیانوسی علماء نے کی جو ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے اور سرکارِ انگلشیہ اور انگریزی تعلیم کے مخالف تھے، حقیقت اِس کے

بالکل برعکس ہے، مدرسۃ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے، دونوں معزز سرکاری ملازم یعنی مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر اور مولوی علی بخش سب جج"۔ (موج کوثر ص ۹۲)

علی گڑھ کالج کی انہی بنیادی کمزوریوں کی وجہ سے کالج علم وحکمت کی وہ خدمت نہ کر سکا جس کا چرچا کیا جاتا تھا، سوائے چند انگریز ملازموں کے کالج سے کوئی قابلِ ذکر علمی شخصیت پیدا نہ ہوئی، شیخ محمد اکرام مرحوم لکھتے ہیں:۔

"جن روشن خیالوں نے کالج کی عالی شان عمارتوں میں تعلیم حاصل کی تھی اور جن کی رسائی مغرب کے بہترین اساتذہ اور دنیا بھر کے علم وادب تک تھی، وہ مطمح نظر کی پستی اور کیریکٹر کی کمزوری سے فقط اس قابل ہوئے کہ کسی معمولی دفتر کے کل پرزے بن جائیں یا اپنے بانیوں کے خیالات اور ان کی عظمت کا کوئی اندازہ کئے بغیر جو باتیں اُن کے مخالف کہہ رہے تھے (جو خود مکتبوں اور مسجدوں کے پروردہ تھے) انہی کو زیادہ آب وتاب اور رنگ وروغن دے سکیں"۔ (موجِ کوثر ص ۱۴۸)

دارالعلوم دیوبند کی خدمات کا مختصر تذکرہ

دارالعلوم دیوبند نے ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء تا ۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۶ء تک صرف سو سال میں ۵۳۶ مشائخ طریقت، ۵۸۸۸ مدرسین، ۱۱۶۴ مصنفین، ۱۷۸۴ مفتی، ۱۵۴ مناظر، ۴۸۴ صحافی، ۴۲۸۸ خطیب ومبلغ، ۲۸۸ طبیب، ۴۷۸ ماہرینِ صنعت وحرفت، ۸۹۳۶ مدارس ومکاتب قائم کیے۔

یہ وہ حضرات تھے جو ہر فن میں اعلیٰ علمی اور عملی صلاحیتوں کے حامل تھے اور مذکورہ خاص عنوانات پر ان کی خدمات رہتی دنیا تک امت کے لیے راہنما ہوں گی۔

اس کے برعکس دار العلوم دیوبند نے علم وادب کے ہر شعبے میں وہ نامور ہستیاں پیدا کیں جو اپنے وقت میں اپنے فن کے امام ہیں، دار العلوم دیوبند نے اشاعتِ اسلام میں جو کردار ادا کیا آج دنیا کا کونہ کونہ اور ہر مسلمان کا دل اس عظیم ادارہ کی خدمات پر جذباتِ تشکّر سے لبریز ہے۔

حضرت مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ کا سلسلۂ نسب

اسلام نے جو امتیازی شان مسلمانوں کو عطا فرمائی ہے اس میں نسب اور سند کا خصوصی مقام ہے جو دوسری کسی قوم کو حاصل نہیں، اسلام میں نکاح کے لیے گواہوں کا ہونا بلکہ نکاح کا اعلانِ عام کرنا ضروری ہے تاکہ اس نکاح سے پیدا ہونے والی اولاد کا نسب صحیح رہے اور پھر آگے نکاح اور وراثت وغیرہما کے احکام صحیح طریقے پر حل کیے جاسکیں، جبکہ دوسرے ادیان اور ان کے معاشرہ میں اس قدر جامع اور محتاط کوئی ضابطہ نہیں اس لیے بعض ممالک میں نسب کا خانہ ہی نہیں۔ (الجمعیۃ) —— اسی طرح علمی اور دینی بلکہ روحانی تعلیمات کے لیے سند کا ہونا ضروری ہے۔ استاد اور شاگرد، پیر اور مرید کے درمیان ربط کے لیے سند کا ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے، دینی مدارس اور اسلامی دار العلوم کے سند یافتہ اپنے اساتذہ کا ذکر اور ان کا سلسلہ استناد بتا سکتے ہیں جبکہ کسی بھی یونیورسٹی یا علمی ادارہ میں صرف ڈگری مل جاتی ہے اساتذہ کا سلسلۂ سند مفقود ہے، قرآنِ عزیز نے سورۃ الحجرات میں ارشاد فرمایا:۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ۝

(الحجرات ۱۳)

اے لوگو ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور خاندان بنا دیا ہے تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو بے شک تم میں سے پرہیزگار تر اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز تر ہے، اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا پورا خبردار ہے۔

یعنی انسان اور انسان میں انسانی ضروریات کے لیے کوئی فرق نہیں کہ سب ایک ہی ماں اور باپ کی اولاد ہیں مگر مختلف اقوام اور خاندان بھی اللہ تعالیٰ ہی نے بنائے ہیں۔ خاندانوں کا وجود، اقوام کا تصور یہ بھی نسب کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ منشاء ایزدی ہے، البتہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب اور مغفرت کیلئے جس امر کی ضرورت ہے وہ تقویٰ ہے، کیونکہ سب سے بہتر زادِ راہ تقویٰ ہے، فرمایا:۔

فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۝ (البقرہ ۱۹۷) بے شک سب سے بہتر زادِ راہ (اور سرمایہ) تقویٰ ہے۔

مگر بعض امورِ معاشرت میں نسب کا لحاظ بہت ہی ضروری ہے اور اس میں نسب کا بڑا قوی دخل ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ جب ہرقل نے ابوسفیان سے سیدِ دوعالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے متعلق چند سوالات کیے، تو ان میں سے پہلا سوال یہ تھا: کَیْفَ نَسَبُهٗ فِیْکُمْ قُلْتُ هُوَ فِیْنَا ذُوْ نَسَبٍ (ترجمہ) اس مدعی نبوت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سلسلۂ نسب تم میں کیسا ہے"، تو ابوسفیان نے جواب دیا کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں نسب والے ہیں"۔ ان سوالات وجوابات پر جب ہرقل نے تبصرہ کیا تو یہ کہا کہ اسی طرح تمام رسول علیہم السلام اپنی اپنی قوموں کی نسب میں مبعوث کیے جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نسب کی عظمت کا تعلق بھی افراد اور اقوام سے ہے، یہی حکمت ہے کہ اسلام نے مقتدا کے لیے شریف النسب ہونے کو بہتر قرار دیا ہے، اور نکاح میں جو کہ انسانی معاشرت اور تمدن کا اہم رکن ہے کُفو کو شرط قرار دیا ہے، احادیث کی تمام کتابوں میں کتاب الکفو اور کتاب الاولیاء موجود ہے، تمام مکاتیبِ فقہ میں کُفو کا ذکر پایا جاتا ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نجاتِ اُخروی اور قربِ الی اللہ کیلئے عقیدہ اور عمل کی درستگی اور استواری ضروری ہے، جیسا کہ رحمتِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

مَنْ بَطَّأَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ یُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ۔ (ترجمہ) "جس کا عمل سست ہو اُسے اُس کا نسب تیز نہیں کر سکتا"۔

لیکن اپنی نسب کا پہچاننا اور محفوظ رکھنا بھی بہت ضروری ہے، اس لیے کہ:۔

(الف) قرآنِ عزیز اور احادیث میں صلہ رحمی کا بہت تاکید کے ساتھ حکم آیا ہے۔ تو جب تک اپنے خاندان کو مادری اور پدری نسبت سے نہ پہچانے گا صلہ رحمی کس طرح کر سکے گا۔

(ب) وراثت کے احکام میں رشتہ داروں کا پہچاننا نہایت ہی ضروری ہے۔ والد کے رشتہ داروں کا عصبات کا اور والدہ کے رشتہ داروں کا جن میں اکثریت ذوی الارحام کی ہے، اگر تحفظ نہ ہوا تو مالِ وراثت کس طرح تقسیم ہو سکے گا جس کی تاکید اسلام میں بہت زیادہ آئی ہے "کتاب الانساب" کے عنوان سے کئی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، حضور نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ:۔

"اپنے نسب اور رشتہ داروں کو پہچانو تاکہ ان کے ساتھ صلہ رحمی کر سکو اس لیے کہ صلہ رحمی اہل وعیال میں محبت پیدا کرنے، مال کے بڑھانے اور عمر کے بڑھانے کا ذریعہ بنتی ہے"۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ارشادِ گرامی ہے کہ:۔

"عربی زبان سیکھو کہ اس سے مروت میں اضافہ ہوگا اور رشتوں کو پہچانو اس لیے کہ اس سے بہت سے نامعلوم رشتہ داروں کا تمہیں پتہ چل جائے گا اور تم ان کے ساتھ احسان وسلوک کر سکو گے"۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشادِ گرامی ہے کہ:۔

"اپنے خاندان والوں کا احترام کرو، ان سے ربط رکھو کہ وہ تمہاری قوت اور تمہارے بازو ہیں تم ان کے سہارے سے پرواز چڑھ سکتے ہو، تکلیف کے وقت وہ تمہارے کام آسکتے ہیں، بڑوں کا احترام کرو، بیماروں کی بیمار پرسی کرو، پریشان حالوں کی امداد کرو۔"

اِس عنوان پر تفصیلی بیان حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمودہ درج کیا جاتا ہے:۔

سِلسلۂ نسب

سلسلۂ نسب حسب ذیل ہے:۔
حسین[1] احمد بن سید حبیب[2] اللہ بن سید پیر[3] علی بن سید جہانگیر[4] بخش بن شاہ نور[5] اشرف بن شاہ[6] مدن ابن شاہ[7] محمد ماہ شاہی بن شاہ[8] خیر اللہ بن شاہ[9] صفت اللہ بن شاہ[10] محبت اللہ بن شاہ[11] محمود بن شاہ[12] لدھن بن شاہ[13] قلندر بن شاہ[14] منور بن شاہ[15] راجو بن شاہ[16] عبد الواحد بن شاہ[17] محمد زاہدی بن شاہ[18] نور الحق رحمہما اللہ تعالیٰ

شاہ نور الحق رحمۃ اللہ علیہ وہ مورثِ اعلیٰ ہیں جو کہ اس سرزمین میں الہ داد پور قصبہ ٹانڈہ میں پہلے پہل تشریف لاکر اقامت گزیں ہوئے۔ اس زمانہ میں قوم رجبھر کا ٹانڈہ کے گردونواح میں تمام دیہات وغیرہ پر قبضہ اور تصرف تھا اور وہ مسلمانوں کو ستاتے رہتے تھے، حضرت شاہ نور الحق صاحب مرحوم نے پہنچکر ان کو دعوتِ اسلام دی مگر وہ لوگ اور راجہ مقابلہ پر آئے، آپ نے بزورِ کرامت اُن کو زک دیا، اُن کا راجہ قلعہ چھوڑ کر بھاگ گیا، آپ نے وہیں اقامت فرمائی اور اس موضع کا نام الہداد پور رکھا جس کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے، قلعہ کے آثار اب تک موجود ہیں، شمالی دیوار اور مغربی اور مشرقی برجوں کے باقیماندہ پتھر وغیرہ باقی ہیں، اسی قلعہ میں آپ کا اور آپ کی تمام اولاد کا مزار اب تک بنتا چلا آتا ہے۔

یہ تو شجرۂ نسب کا مختصر تذکرہ تھا شجرۂ طریقت کے متعلق ایک سند آپ کے خاندان میں ملتی ہے اس کے متعلق حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:۔

یہ شجرۂ طریقت بہت پرانے کاغذات میں پایا گیا تھا، اس کا تصنیف کرنے والا والد ماجد مرحوم کے پڑدادا شاہ نور اشرف قدس اللہ سرہ العزیز کا کوئی مرید یا بیٹا ہے، الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

خداوندا کریما کارسازا	کہ ہستی بندہ پرور بے نیازا
بحق راز شاہ نور اشرف	کہ در روشن دلی از نور اشرف
بحق راز حضرت پیر مدن	کہ دلق فقر از وگشتہ مزین

بحق آں محمد ماہ شاہی — کہ در برج فقیری بود ماہی
بحق شاہ خیر اللہ نیکو — نہ بودش ہیچ مطلوبے بجز تو
خدایا ہم بحق آں شہ دیں — پناہ معرفت توحید آئین
کہ صفت اللہ نام نامیش بود — مسمّے درج اسم سامیش بود
خدایا ہم بعز و رفعت شاہ — محبّ اللہ سماء فقر را ماہ
کہ چوں نام خود آں راسخ محبّت — ہمیں بود از رسوخ دل محبت
خدایا ہم بحق شاہ محمود — چہ گویم وصف او جز ایں کہ محمود
خدایا ہم بحق شاہ لدّہن — کز و گشتہ چراغ فقر روشن
شریعت را از و شد خانہ آباد — طریقت را از و معمور بنیاد
خدایا ہم بحق شہ قلندر — کہ چوں دلق فقیری کردہ در بر
عمل بر فقر فخری داشتہ او — فقیری فخر خود انگاشتہ او
بکار فقر عمر خود بسر برد — بجز راہ طریقت کام نسپرد
خدایا از برائے شہ منور — کہ جانش بود از نورت منور
شدہ روشن ز ذات آں یگانہ — چراغ معرفت خانہ بخانہ
خدایا ہم بحق شاہ راجو — کہ در فقر و فنا برد از ہمہ گو
خدایا ہم بآں شاہ ستودہ — کہ عبد الواحد اورا نام بودہ
چو در عبدیت واحد سر آمد — ازاں ایں نام نامیش بر آمد
خدایا ہم بحق شاہ زہاد — محمد زاہدی کو بود زہاد
ازاں وقتیکہ از تمییز دم زد — براہ زہد بس ثابت قدم زد
بزہد اندر چناں او محو خود ساخت — کہ یکدم با خودی خود نہ پرداخت
بحق شاہ نور الحق لاریب — کہ نور حق نمایاں داشت از غیب
ازاں وقتیکہ حق تمییز دادش — نہ بودہ غیر ذات حق مرادش
خدا را از برائے شاہ داؤد — کہ اہل چشت را پیر ھدی بود
چناں بود او براہ شرع و دیں چست — کہ جز تبعیت امرت نمی جست
بحق شہ عتاب الدین چشتی — کہ اندر آتش عشقش برشتی

الٰہی بہر نجم الدین چشتی
کہ ذاتش پاک ز آلائش سرشتی

الٰہی بہر شاہ رومی چشتی
کہ آمد فرد در ظاہر سرشتی

بحق خواجہ قطب الدین کاکی
کہ از قطبیتش خلقے است خاکی

بآں خواجہ معین الدین چشتی
کہ ذاتش دین و دنیاست راپشتی

بحق خواجہ عثمان ہارون
کہ باشد واقف اسرار بیچوں

بحق قدوۂ پیرانِ اعظم
شریف زندنی خواجہ معظم

بحق قطب دیں مودود چشتی
کہ سازی پیروِ اُو را بہشتی

بحق خواجہ یوسف ناصر الدین
کہ ہست از عارفان اہلِ تمکین

خداوندا بحضرت بو محمد
دل او مقتبس از نور احمد

بحق خواجہ بو احمد خدایا
بحال زار ما رحمے بفرما

بحق خواجہ بو اسحٰق شامی
کہ دارد عالمے را در غلامی

بحق خواجہ دیں خواجہ ممشاد
علو دینوری از خویش آزاد

ہبیرۂ بصری آں پیر پیران
کہ باشد دستگیر دستگیراں

بحق آں کہ فخرِ عارفان ست
حذیفہ مرعشی قطب جہان ست

بحق خواجہ ابراہیم ادہم
شہنشاہِ دو عالم شاہِ اعظم

بحق خواجہ فضیل اکرم الخلق
شہنشاہ کریمان اعظم الخلق

بعبد الواحد اے واحدِ حقیقی
کہ یکتا بود در واحد طریقی

بحق اسوۂ اہلِ کمالان
امام و قدوۂ اربابِ حالان

حسن بصری کہ مخدوم جہاں است
رئیس خواجگان اِنس و جان است

بحق آں شہِ ملک و ولایت
معظم نیر برج ہدایت

علی مرتضٰی دروازۂ علم
در دریائے خلق و معدنِ علم

بحق کار فرما شاہِ لولاک
کہ از تحت الثریٰ تا عالمِ پاک

برایش از عدم آمد بہستی
کہ بروئے کس نہ دارد پیش دستی

طراز اول کہ کلک حق رقم زد
شفیعِ امتان یعنی محمد

بحق آل و اصحاب کبارش
بحق راز جملہ دوستانش

مرا دہ پنج چیز از در گہ خویش | یکے علم و ادب زاہد زحد بیش
دویم رزقے کہ می دارم تمنا | عطا فرما مرا در دار دنیا
سویم زیں وقت خود تا آخریں دم | بمانم در جہاں خوشنود و خرم
چہارم دہ فروغ علم ما را | کہ چوں خورشید باشد آشکارا
بہ پنجم چونکہ در گورم رسانند | و دائم کردہ از من باز مانند
سپس با من نکیر و منکر آیند | زمن از دین من پرسش نمایند

محمد مصطفیٰ یادم دہ آں دم
دگر زہرہ و حسنین معظم

اِس سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف حضرت خواجہ جلال الدین کبیرالاولیاء پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ یا حضرت خواجہ شیخ عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر تھے اور ۸۰۰ھ سے پہلے یا قریبی زمانہ میں یہاں تشریف لائے تھے اور اِسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالباً موصوف ہندوستان ہی کے کسی حصہ سے تشریف لائے تھے، اگرچہ ممکن ہے کہ خراسان وغیرہ سے آئے ہوں کیونکہ شاہ داؤد چشتیؒ جو کہ ان کے پیر و مرشد ہیں اُن کی نسبت مشہور ہے کہ وہ سادات میں تھے، چشت کے باشندہ تھے، خاندان کے بڑوں سے سُننے میں آیا ہے کہ موصوف کا سلسلہ نسب حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے (واللہ اعلم) کہا جاتا ہے کہ نسب نامہ شاہ خیراللہ صاحب مرحوم کے ساتھ کاغذات میں چلا گیا، موصوف خانگی منازعات کی وجہ سے ناراض ہو کر وطن سے چلے گئے تھے اور بقیہ عمر پوربی اضلاعِ ہند میں گذاری جس کا کچھ پتہ معلوم نہیں ہوا۔ بعض بزرگوں کا کہنا یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں جبکہ راجہ بھیٹھی نے نانا اکبر علی صاحب مرحوم کے گھرانے کو لوٹا تھا تو اُس نے تمام کاغذاتِ قدیمہ بھی لوٹ لیے یا اُن کو تلف کر دیا، بہر حال آج خاندان میں کسی کے پاس اُوپر کا نسب نامہ موجود نہیں ہے۔

والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ میں جبکہ صفی پور اور بانگرمئو میں ہیڈ ماسٹر تھا اور لوگوں سے تذکرہ آتا تھا کہ میں سادات سے ہوں اور میرا خاندان پیرزادوں کا خاندان ہے تو لوگ تصدیق نہیں کرتے تھے کیونکہ اودھ کے شہروں میں ٹانڈہ کپڑوں کے بُننے والوں (نور بافوں) کی بستی مشہور تھا اور یہاں کے کپڑے واقع میں بہت امتیازی شان رکھتے تھے، ٹانڈہ کی آبادی کا بڑا حصہ اسی برادری کا ہے اِس لیے لوگ یہی سمجھتے تھے کہ یہ بھی اسی قوم میں سے ہوں گے، مگر حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ایک روز بھرے مجمع میں فرمایا کہ "مدرس تو سید اور پیرزادے ہیں" ان کے مورثِ اعلیٰ شاہ نور الحق رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے اولیاء اللہ میں سے ہیں' رات میرے

پاس وہ آئے تھے اور مجھ سے کہتے تھے کہ میرے بیٹے جیب اللہ کا خیال رکھو، بھئی یہ تو بڑے پیرزادے ہیں"۔
(حضرت مولانا قدس اللہ سرہ العزیز والد صاحب مرحوم کو مدرس کہہ کر پکارتے تھے) اس کے بعد سے اُن کی نظرِ التفات مجھ پر بہت زیادہ ہوگئی اور لوگوں کے خیالات میرے نسب کے متعلق بدل گئے اور یہ مقالہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور ہوگیا۔

والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے اوائل عمر میں خواب دیکھا تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک بڑے تالاب کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی چرخہ کات رہی ہیں اور میں اپنے آپ کو بچہ پاتا ہوں اور تالاب کے دوسرے کنارے پر ہوں، میں نے دیکھا کہ میں تالاب میں تیرتا ہوا اُن کی طرف اس طرح جا رہا ہوں جیسے بچہ اپنی ماں کے پاس جاتا ہے، میں خواب ہی میں اُن کو ماں سمجھ رہا ہوں اور وہاں پہنچ گیا ہوں۔
ہجرت کرنے کے بعد انہوں نے مدینہ منورہ میں اس کو ذکر کیا اور فرمایا کہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا مطلب تھا، میں نے عرض کیا کہ تعبیر تو ظاہر ہے آپ سمندر کے دوسرے کنارے پر تھے ہجرت کر کے مدینہ منورہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچ گئے، نسبی سلسلہ میں وہ ماں ہیں ہی۔
نیز ایک مرتبہ فرمایا کہ مجھ کو نسب نامہ کی تلاش تھی تو میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ گھوڑے پر سوار ہو کر جہاد کو جا رہے ہیں اور میں پاس کھڑا ہوں تو مجھ کو فرمایا کہ تُو میری اولاد میں سے ہے۔
یہ جاننا ضروری ہے کہ فخر بالانساب جو کہ مسلمانوں میں ہر جگہ اور بالخصوص ہندوستان میں اور بالاخص سادات اور پیرزادوں اور شیوخ میں پایا جاتا ہے نہایت چھوٹا تکبر اور بہت سی خرابیوں کا باعث ہے، باوجودیکہ اسلام نے اس کی جڑ کھود ڈالنے میں کوئی کمی نہیں کی مگر بدقسمتی سے اس کا قلع قمع نہیں ہوا بلکہ ہندوستان میں آکر برادرانِ وطن کی دیکھا دیکھی اور بڑھ گیا، حقیقی کمال علم و عمل اور عمدہ اخلاق اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں ہی ہے، جس کی بناء پر اسلاف کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کو شرف اور امتیاز اپنے ہمعصروں اور اخلاف پر حاصل ہوا تھا اُن کی اولاد اور احفاد کو بھی اگر اسلاف کا اتباع اور ویسے اعمال و اخلاق وغیرہ حاصل ہوں تو وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کو خلف صدق اور سپوت کہا جا سکے ورنہ مثل پسر حضرت نوح علیہ السلام ناخلف اور کپوت ہی شمار ہوں گے۔
ایسے ناخلفوں اور بدکرداروں کو چاہیئے تھا کہ ہمیشہ خائف رہیں کہ کہیں ان اسلاف کرام سے بداعمالیوں کی وجہ سے غضب الٰہی سلسلہ نسب اور اس کی شرافت منقطع کرتا ہوا پسر حضرت نوح (علیہ السلام) کی طرح إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ہود) کا اعلان نہ کر دے اور اسلاف کرام کی برکتوں سے محرومیت کا عذاب الیم نہ چکھا دے، اُلٹے یہ لوگ کبر اور غرور بلکہ دوسروں کی تحقیر و تذلیل، توہین و تحمیق میں منہمک ہوگئے ہیں ان لوگوں کی ایسی حرکات ناشائستہ کی وجہ سے صرف یہی نہیں ہوتا کہ غریب مسلمانوں اور

پیشہ ور مسلم برادریوں اور نو مسلم خاندانوں کے دل اور دماغ پر سنگین اور دلخراش ٹھیس لگتی ہے بلکہ اشاعتِ اسلام اور اس کی ہمہ گیری میں بھی فرق پڑتا ہے، اسلامی اصول اور اس کا تفوق چکنا چور ہوتا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے حجاب بنتی ہیں، اُمّتِ مرحومہ کی زیادتی میں روڑے اٹکتے ہیں جن کی اسلامی تعلیمات میں انتہائی ممانعتیں وارد ہیں۔ والعیاذ باللہ

انہیں وجوہ سے مجھ کو بہت ڈر لگتا ہے اور شرم معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ اعمال و اخلاق اور اس کم مایگی پر سیدیا پیرزادہ اپنے کو کہوں یا لکھوں اور اپنے اس نسب پر فخر کروں مگر اس میں بھی چونکہ شک نہیں ہے کہ غیر اختیاری نعماءِ الٰہیہ میں سے یہ بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے یعنی جیسے کہ انسان کا پیدا ہونا، تمام اعضاء کا صحیح وسالم ہونا، خوبصورتی اور اعضاء کا تناسب، ذکاوت اور حافظہ وغیرہ اللہ تعالیٰ کی اُن نعمتوں میں سے ہیں جن میں بندہ کے اختیار اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے اور ان پر بندہ کو ہمیشہ شکر گذار رہنا چاہیئے اور تحدث بالنعمۃ کرنا اور دل میں سوچنا اور اللہ تعالیٰ کو شکر گذاری سے خوش کرنا چاہیئے، اسی طرح یہ شرافت نسبی بھی ایک غیر اختیاری نعمت اور عطیہ خداوندی ہے، اس پر شکر گذاری کرنا اور حسبِ ارشاد وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ، تحدیث کرنا ضروری ہے، اس لیے اس مقام پر رسالہ ھٰذا میں یہ ذکر کیا گیا۔ (از نقش حیات جلد ۱)

والدہ ماجدہ کی طرف سلسلۂ نسب یہ تحریر فرمایا:۔

”بنتِ اکبر علی بن مخدوم بخش بن تراب علی شاہ مدن (مرحومین) شاہ مدن کے تین صاحبزادے تھے تراب علی، ہدایت اللہ اور نور اشرف۔ نور اشرف مرحوم کی اولاد میں سے والد صاحب مرحوم تھے اور تراب علی کی اولاد میں سے والدہ مرحومہ تھیں“ ——— (نقش حیات جلد ۱ صفحہ ۲۳)

حضرتؒ کے والد ماجد مولانا حبیب اللہؒ کا مختصر تذکرہ

آپ کی ۱۲۵۲ھ میں قصبہ الہ داد پور میں ولادت باسعادت ہوئی، ٹانڈہ میں قرآن شریف پڑھا اور ساتھ ہی سکول میں اُردو مڈل پاس کیا، مختلف سکولوں میں ملازمت کرتے کرتے قصبہ صفی پور ضلع اناؤں میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے اور پھر بانگرمئو میں تبدیل کر دیئے گئے، ملازمت سے سُبکدوش ہونے پر اپنی ذاتی جائیداد کی کچھ نگہداشت کی۔ چونکہ علماءِ دیوبند کے ساتھ گہرا تعلق تھا اس لیے اپنے سب بیٹوں کو ابتدائی تعلیم کے لیے بھی دارالعلوم دیوبند میں داخل فرمایا جہاں اساتذۂ کرام خصوصاً حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی نظرِ کیمیا اثر سے فیضیاب ہوتے رہے،

چونکہ سلوک اور احسان وراثت میں ملی تھی اس لیے وقت کے ولیٔ کامل حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ سے بیعت کا شرف حاصل کیا۔ ویسے بھی دل دیارِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں مستغرق رہتا تھا مگر جب ۱۳۱۳ھ ۲۲ ربیع الاول بروز جمعہ آپ کے مُرشد کا ایک سو پانچ سال کی عمر میں وصال ہو گیا تو پھر دل بہت ہی بے چین رہنے لگا، آخر مدینہ منورہ بمع اہل وعیال کے ۱۳۱۶ھ کو پہنچ گئے۔ زیادہ وقت روضۂ اطہر کی زیارت یا پھر اپنے ہم عمر مہاجرین کے ساتھ ذکر و شغل میں گذارتے تھے۔ چونکہ فارسی، اُردو، ہندی، بھاشا میں شعر کہنے کا ملکہ راسخ تھا اس لیے اشعار میں زیادہ اشعار وہی ہیں جن میں نعتِ سیّدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہے تبرّکاً ایک قطعہ اُردو نعت کا درج کیا جاتا ہے ؎

چارو ناچار جو محفل سے ترے جاتے ہیں — حسرت و رنج و قلق ساتھ وہ لے جلتے ہیں

جان سے جاتا ہے تیرے پاس سے جانِ جاناں — جیتے جاتے ہیں مگر مُردہ بنے جاتے ہیں

ایک ہم ہی رہے اس بزم میں باقی ساقی — لوگ میخانہ سے پی پی کے چلے جلتے ہیں

اے رسولِ عربی آپ کی فرقت کے قتیل — پُلِ محشر سے سُبک پار اُتر جاتے ہیں

سر رہے یا نہ رہے پر رہے سودا سر میں — عشقِ احمد کا خدایا یہی ہم چاہتے ہیں

اس حبیبِ دلِ خستہ پہ نظر ہو جائے — دردمندوں کی دوا آپ کیے جلتے ہیں

چند قطعاتِ نعت در فارسی

؎
ایں جمال و حُسن عالم سوزِ تُو — ایں رُخِ پُر نُور دل افروزِ تُو
کرد بسمل صد ہزاراں جبرئیل — ناوکِ مژگان سینہ دوزِ تُو

جان و دل را ہمبر دیک آن تو — ایں چہ حسن است اے عجائب شانِ تُو
سوخت از دردِ حبیب از چہ عجب — اے بسا جبرئیل شُد قربانِ تُو

؎
اے بہار باغ رضوان کوئے تُو — بُلبل سدرہ اسیر مُوئے تُو
سجدہ ریزاں آمدہ سوئت حبیب — اے ہزاراں کعبہ در ابروئے تُو

(نقشِ حیات جلد ۱ صفحہ ۳۴-۳۵)

آپ کا دلِ مدینہ منورہ کے لیے کس قدر بے قرار تھا، اس کا اندازہ ان اُمور سے لگایا جا سکتا ہے کہ:۔

(۱) آپ کے بڑے صاحبزادے کی منازلِ سلوک ابھی کچھ باقی تھیں جن کے لیے کچھ عرصہ وطن ہی میں رہنا چاہیئے

تھا تاکہ اپنے مُرشد حضرت گنگوہیؒ سے تکمیل کی جاسکے۔
(۲) خود حضرت مدنیؒ کی کچھ کتابیں فنون کی باقی تھیں جن کو دارالعلوم دیوبند میں پڑھنے کی تمنا تھی۔
(۳) اعزاء اور اقرباء کا اصرار تھا کہ حج و زیارت کے بعد واپس آجائیں۔
(۴) شادی شدہ بیٹوں کے سمدھیا (سسرال) والے اپنی بچیوں کو ہمیشہ کے لیے اتنی دور بھیجنے پر تیار نہ تھے۔
(۵) چونکہ اس سال ہندوستان طاعون کی مہلک اور لاعلاج مرض کی لپیٹ میں تھا اس لیے عام لوگوں نے بھی یہ مشورہ دیا کہ ساری بندرگاہیں بند ہیں اسلئے یہ سفر فی الحال ملتوی کر دیا جائے، مگر،"
یہ سچا عاشق نام کا حبیب اللہ نہ تھا بلکہ حقیقت کا حبیب اللہ اور حبیبِ حبیب اللہ تھا آپ نے فرمایا۔

"جس کو اپنی لڑکی بھیجنے سے عذر ہو وہ طلاق لے لے، صاحبزادوں سے کہا جس کی تعلیم باقی ہے وہ مدینہ منورہ چل کر پوری کرلے، مجھ کو اگر کہا جائے کہ تجھے توپ کے منہ پر باندھ کر گولہ چھوڑا جائے گا اور تو مدینہ پہنچ جائے گا تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں"[1]

غرضیکہ یہ خاندان جو کم و بیش تیسری صدی ہجری میں مدینے سے نکل کر چار پانچ سو برس کے عبوری اسفار کے بعد ترمذ اور لاہور ہوتا ہوا ضلع فیض آباد کے قصبہ ٹانڈہ میں قیام پذیر ہوا تھا اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ مطابق جنوری ۱۸۹۹ء کو اللہ تعالےٰ کے بھروسہ پر دیارِ حبیب کے لیے روانہ ہوا، اور بحری سفر کے بعد جدّہ سے بری سفر کرتا ہوا آج سے تقریباً ایک سو سال پہلے ۲۴ یا ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ کو مکہ مکرمہ پہنچا اور حج مبارک کی سعادت حاصل کرنے کے بعد ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۱۶ھ مطابق ۸ مئی ۱۸۹۹ء کو مدینہ منورہ پہنچ گیا[1]، اور دولتِ دیدار سے مشرف ہوا۔

یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ وہ دور نہ تھا جو آجکل سعودیہ کا دور ہے، یہ وہ دور تھا کہ ہر طرح کی روحانی، ایمانی برکات کے نزول کے باوجود معاشی اور اقتصادی تکالیف اس قدر تھیں کہ جن کا برداشت کرنا بڑا ہی مشکل تھا۔ الحمدللہ اس گنہگار کو حج بیت اللہ اور زیارتِ مدینہ منورہ کی پہلی بار سعادت ۳۰ جنوری ۱۹۳۹ء مطابق ۹ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ کو ہوئی تو اُس وقت یہ حال تھا کہ،

"جب ہم طوافِ وداع سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ جانے لگے تو میں نے اپنے معلم سید جعفر شاہ صاحب مرحوم کے ملازم جناب خلیل صاحب سے پوچھا کہ جب حاجی لوگ اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلے جاتے ہیں تو آپ لوگ کس طرح گذارہ کرتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ جب بھوک ستاتی ہے تو بیت اللہ کا طواف کر لیتے ہیں اور زمزم خوب پی لیتے ہیں بھوک ختم ہو جاتی ہے۔ (اُس وقت چاہِ زمزم کھلا ہوا تھا اور رسّی اور ڈول کے ساتھ پانی

---

[1] شیخ الاسلامؒ مرتبہ فرید الوحیدی ص۴۴ تا ۵۴

نکالا جاتا تھا) — اسی طرح جب مدینہ منورہ سے واپسی ہونے لگی اور ہمارے مزور صاحب (زیارت کرانے والا) (جن کا اسم گرامی اب یاد نہیں) ہمارے قافلہ کو الوداع کرنے کے لیے عنبریہ تک تشریف لائے تو اُن سے بھی میں نے یہی پوچھا کہ ایامِ حج کے بعد آپ حضرات کی بسر اوقات کس طرح ہوتی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ پریشانی کی حالت میں رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور صلوٰۃ وسلام پڑھ لیتے ہیں اور گنبدِ خضراء (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام) کی زیارت کر لیتے ہیں بس سب پریشانی دور ہو جاتی ہے۔"

حرمین کے ان سعادتمند باسیوں کی ایمان اور یقین کی پختگی معلوم ہونے کے ساتھ اس وقت حرمین کی معاشی اور معاشرتی حالت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو ۱۹۳۹ء کی بات ہے تو اس سے چالیس سال پہلے کی حالت کیا ہوگی؟ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اُس زمانہ میں زیارتِ حرمین اور ہجرت الی الحرمین کا اصلی محرک جذبۂ ایمانی اور روحانی تڑپ ہوا کرتی تھی جس کے پیشِ نظر حضرت مدنیؒ کے والد ماجد سید حبیب اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہجرت فرمائی۔ چنانچہ حضرتِ مدنیؒ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"۱۳۱۳ھ بروز جمعہ ۲۲ ربیع الاول والدین ماجدین کے پیر و مرشد حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی قدس سرہ العزیز کا بعمر ایک سو پانچ سال انتقال ہو گیا تو والد صاحب اس قدر زیادہ مغموم ہو گئے کہ فرمایا اب ہندوستان میں رہنے کی جگہ نہیں ہے اب تو مدینہ منورہ چل بسیئے، باغ وغیرہ لگانے کی فکر فضول ہے...... اور یہ جوش اور عشق اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ اس زمانہ میں سفرِ حجاز میں گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے سختیاں بہت زیادہ کی جا رہی ہیں...... اور یہ شوق و اضطراب بڑھ گیا کہ دونوں قصبوں (الٰہداد پور اور جڑاون پور) کا زرعی رقبہ سارے کا سارا نہایت ہی ارزاں قیمت غالباً تین ہزار روپیہ پر فروخت کر ڈالا اور خاندان کے بارہ آدمیوں کا مختصر سا قافلہ اس بابرکت سفر کے لیے شعبان ۱۳۱۶ھ کو روانہ ہو گیا، تین چار ماہ کے برّی اور بحری سفر کے بعد ۲۴ یا ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ کو مکہ مکرمہ پہنچکر محلہ جیاد میں مقیم ہو گیا اور چند ایام قطبِ عالم مولانا الحاج امداد اللہ نوراللہ مرقدہٗ کی خدمت میں حاضری کی سعادت کے بعد ۱۲ محرم الحرام ۱۳۱۷ھ کو مدینہ منورہ شرفِ حضوری سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوا اور باب النساء کے قریب زقاق البدو کے کنارہ پر ایک مکان کرایہ پر لے کر قیام کیا۔" (نقشِ حیات جلد اوّل)

پھر مدینہ منورہ میں مستقل اقامت کے لیے شہر سے باہر ایک قطعہ زمین خرید کر تعمیر شروع فرمائی، اتنی گنجائش کہاں تھی کہ راج وغیرہ لگاتے، مدینہ منورہ کے کچھ پتھر اکھٹے کیے اور کچی اینٹیں اپنے ہاتھوں سے تیار کیں اور سارے خاندان کو لے کر خود ہی تعمیر میں لگ گئے، روزانہ عورتوں و بچوں اور صاحبزادگان کو لے کر جاتے تھے، دیوار خود اپنے

ہاتھ سے چُنتے تھے۔ اینٹیں، چونے اور گارا صاحبزادگان علماء، اتقیاء اور اولیاء، صاحبزادگان مولانا صدیق احمد صاحب (خلیفۂ مجاز مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، تلمیذِ خصوصی شیخ الہند مولانا محمود حسن) مولانا سید احمد صاحب (خلیفہ مجاز شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ) بانی مدرسۃ العلوم الشرعیۃ لیتامیٰ مدینۃ المنورہ اور حضرت شیخ الاسلام، محدثِ جلیل مجاہدِ عظیم مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ڈھوتے تھے۔ سونے کو کُندن بننے کے لیے بھٹی میں سے گذرنا ہی پڑتا ہے۔ کنوئیں سے پانی بھرنا، گارا بنانا، مصالحہ تیار کرنا اور دوسرے کام وہ محترم خواتین کرتی تھیں جنہوں نے زندگی میں کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالے تھے، پانی کی ٹھلیا بھی نہیں اٹھاتی تھیں اور کسی سخت کام کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اب اعضاء اور جوارح محنت اور مشقت میں مصروف رہتے تھے اور زبان پر آیاتِ قرآنیہ اور ذکر اللہ جاری رہتا تھا وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (البقرہ ۱۲۷) مہینہ بیس روز تک شب و روز اسی طرح محنت اور سنتِ ابراہیمی اور سنتِ نبوی علیہما السلام ادا کرتے رہے۔ بظاہر یہ کچا اور معمولی مکان تھا مگر دُنیا کے محلات اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں، سیدِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب میں اپنا مکان ہے

وہ دو تنکے ہی سہی لیکن ہیں اپنے | بڑی راحت ہے مجھ کو آشیاں میں

اسی طرح خورد و نوش کا انتظام بھی اللہ تعالیٰ نے فرمادیا (جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب کا زیادہ تر وقت ذکر و شغل اور اوراد و وظائف میں گذرتا تھا مسجدِ نبوی میں نماز باجماعت کسی حال میں ترک نہیں ہوتی تھی، مدینہ طیبہ میں جاڑوں کے زمانے میں بڑے کڑاکے کی سردی پڑتی ہے فجر کی نماز بھی غلس میں مُنہ اندھیرے ہی ہوتی ہے مگر کوئی بھی نماز آپ کی مسجدِ نبوی سے باہر یا بغیر جماعت کے یا بغیر تکبیرِ اولیٰ کے نہیں ہوتی تھی حرم پاک روزانہ مراقبہ میں بھی کافی وقت گذارتے تھے، عام طور پر لوگوں سے ملاقات، بات چیت یا مجالس سے گریز فرماتے تھے صرف اہل اللہ، اتقیاء، علماء اور صاحبِ نسبت بزرگوں کے پاس کبھی کبھی بیٹھ کر ذکر اللہ اور توجہ الی اللہ کی نعمتیں حاصل کرتے تھے۔

نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ مدینہ منورہ کی اقامت میں بڑی آزمائش ہوتی ہے خصوصاً اُن لوگوں کے لیے جو صرف حبِّ نبوی کے پیشِ نظر اپنے وطن، دیس، خویش و اقارب کو چھوڑ کر صرف درِ اقدس پر ڈیرہ ڈال دیتے ہیں، اُن کو شروع شروع میں بہت تکالیف کا سامنا ہوتا ہے مگر رحمتِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اجر و ثواب بھی بہت ارشاد فرمایا، ارشاد گرامی ہے۔

مَنْ صَبَرَ عَلَىٰ لَأْوَائِهَا كُنْتُ لَهُ شَفِيعًا وَشَهِيدًا	جو مسلمان مدینہ منورہ کے قیام کے دوران یہاں کی تکالیف پر صبر کرے گا میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ | گا اور اس کے ایمان کی گواہی دوں گا۔

چنانچہ مہاجرین حضرات کو شروع شروع میں بہت تکالیف کا سامنا ہوتا ہے، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کو پورا ہفتہ صرف زمزم پر گذارہ کرنا پڑا تھا۔ اسی طرح حبیب اللہ و حبیب الرسول پر آزمائشوں کا ہجوم یوں نازل ہوا کہ حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں:۔

"والد صاحب مرحوم کا آخری حصۂ عمر بالخصوص والدہ مرحومہ کی وفات کے بعد بہت زیادہ مکدّر اور رنج دہ گذرا ہے، ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد اور گھرانے کے نفوس تقریباً چالیس نفر یکے بعد دیگرے وفات پا گئے، خود فرماتے تھے کہ تقریباً چالیس نفر اپنے گھرانے کے میں نے اپنے ہاتھ سے مدینہ منورہ میں دفن کیے ہیں، مگر انتہائی صبر و استقلال پر عمل پیرا ہے۔" (نقشِ حیات جلد ۱ ص ۱۱۱)

ذٰلك تقدير العزيز العليم فللّٰه الحمد على ما قدّر وقضٰى رحمهم الله وعظم الله اجر الجميع وهو ارحم الراحمين ٥

یہ وقت گذر رہا تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ مدینہ منورہ تشریف لائے اور اپنی تحریک کے سلسلہ میں حضرت مدنیؒ ان کی خدمت میں بطور معتمد علیہ اور مشیر با تدبیر حاضر تھے کہ آپ کو اور آپ کے شیخ اور دوسرے تین رفقاء کو مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا۔ ادھر ترکی حکومت نے آپ کے والد ماجد نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ اسیر مالٹا مولانا وحید احمد کے فرزند ارجمند فرید الوحیدی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:۔

ایڈریانوپل کی نظر بندی اور وصال

سنہ ۱۳۳۴/۳۵ھ مطابق سنہ ۱۹۱۴/۱۵ء کی جنگِ عظیم کا زمانہ تھا، ترکی بھی جنگ میں ایک شریک ملک تھا، خلافتِ عثمانیہ اور حکومتِ ترکی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، ہر جگہ بغاوتیں اور شورشیں ہو رہی تھیں، ذرا ذرا سے شک و شبہ پر گھر کے گھر کھود کر پھینک دیئے جاتے تھے، مولوی صاحب کا دولت خانہ ہندوستان کے اہل اللہ، علماء اور سربرآوردہ قائدین کا مہمان خانہ تھا، آپ کے صاحبزادگان حکومتِ برطانیہ کے مخالفین اور مجاہدینِ آزادی کے تربیت یافتہ شاگرد اور تلامذہ تھے، مدینہ طیبہ میں جہاں آپ لوگوں سے محبت، عقیدت اور ارادت عام تھی وہاں ایسے بھی بہت سے افراد و اشخاص تھے جن کو اس خاندان سے حسد و عداوت تھی اور اس کی وجہ ان کی شانِ استغناء، پُر وقار زندگی، سادگی اور کم آمیزی تھی۔

ع ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیب است

یہ لوگ حکومت اور افسران و ذمہ دارانِ حکومت کے یہاں موقع بے موقع شکایتیں پہنچاتے رہتے تھے کہ یہ لوگ خطرناک ہیں، ان کے یہاں ہندوستان کے سیاسی لوگ مہمان رہتے ہیں، ان کے یہاں ہر وقت معتقدین و زائرین کا مجمع رہتا ہے، وقت نازک تھا، زخم ہرا ہو تو ذرا سی ٹھیس بھی لہولہان کر دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تیسرے فرزند

مولانا حسین احمد اور سولہ سالہ پوتے وحید احمد کو شریف حسین نے مکہ میں گرفتار کروا کر اپنے حلیفوں انگریزوں کے حوالے کر دیا، جنہوں نے دونوں حضرات کو پابہ جولاں مالٹا بھیجکر قید کر دیا۔ بوڑھا باپ مدینہ طیبہ میں ایک ایک پل بیٹے اور پوتے کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک لختہائے جگر کی گرفتاری اور حالتِ قید میں جزیرۂ مالٹا کو روانگی کی اطلاع ملی، جرم و سزا کی تفصیل تو معلوم نہیں ہوئی یہ افواہ سُنی کہ دونوں کو پھانسی دی جائے گی۔ مولوی صاحب صبر کی چٹان اور شُکر کا مجسمہ تھے مگر تھے تو گوشت پوست اور مٹی پانی کے بنے ہوئے انسان ہی، دونوں ہاتھ بارگاہِ الٰہی میں شُکر کے لیے تو اُٹھے مگر ساتھ ہی بے اختیار ٹوٹے ہوئے دل سے آہ بھی نکل ہی گئی ؎

یہی ہے سیر فقیروں کی اور یہی فریاد زمیں پہ بیٹھ گئے سوئے آسماں دیکھا

ادھر مدینہ طیبہ کی ترکی پولیس جنگِ عظیم کی وجہ سے اور برطانوی رعایا ہونے کی وجہ سے سارے ہندوستانیوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتی تھی، اور اس خاندان پر تو حاسدین کی ریشہ دوانیوں اور دشمنوں کی کارروائیوں کی وجہ سے خصوصی نگرانی تھی، مزید یہ ہوا کہ انہی دنوں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا خلیل احمد صاحب قدس اللہ سرہما اسی گھر میں رونق افروز ہوئے، ان حضرات کی زیارت، ملاقاتوں اور علمی و روحانی استفادے کے لیے ہر قوم اور ہر ملک کے عوام و خواص پر مشتمل ایک خلقت ٹوٹ پڑی، اس غیر معمولی ہجوم و اجتماع پر بھی پولیس کو شک گذرا ادھر ایک معمولی سا بہانہ اور ہاتھ آگیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے خدام میں بعض حضرات مدینہ طیبہ سے واپس ہوئے تو جدہ سے آنے جانے والوں کے ہاتھ طویل طویل خطوط اور تفصیلات اردو زبان میں حضرت کی خدمت میں روانہ کیں، سرکاری طور پر عربی اور تُرکی زبانوں کے علاوہ کسی زبان میں اور سرکاری ڈاک کے علاوہ کسی اور ذریعے سے رسل و رسائل کی سخت ممانعت تھی، سوءِ اتفاق سے بعض خطوط اور کئی کئی صفحات پر مشتمل تفصیلات حکومت کے ہاتھ لگ گئیں، ان میں کوئی قابلِ اعتراض بات تھی یا نہیں مگر شبہ و بدگمانی کے لیے بہانہ ہاتھ ضرور آگیا تھا، تُرکی حکومت کمزور تو ہو ہی رہی تھی جزیرۂ عرب میں ہر جگہ اس کے پیر اُکھڑ رہے تھے، اسی عالم میں اس نے مولوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے دو صاحبزادوں مولانا سید احمد صاحب اور مولانا سید محمود احمد صاحب کو گرفتار کر لیا، خاندان کے بیشتر افراد پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، ایک جوان بیٹا اور نوخیز پوتا چند دن پہلے قید ہو کر سمندر پار بھیجے جا چکے تھے، اب کسی نہ کسی طرح ٹوٹے ہوئے حوصلے اور زخم خوردہ دل کے ساتھ بوڑھا باپ دو بیٹوں کی مدد سے بچے کھچے بچّوں اور عورتوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا یہ تینوں بھی بے خطا و بے قصور پکڑے گئے تو حضرت شیخ الاسلامؒ کی اہلیہ ثانیہ، ان کا ایک ڈیڑھ سالہ بچّہ اشفاق، پہلی اہلیہ کی گیارہ سالہ بچّی زہرا، مولانا سید احمد صاحب کی دوسری اہلیہ، مولانا سید محمود احمد صاحب کی دوسری اہلیہ اور مولوی صاحب کی چوتھی اہلیہ کل چار بیمار اور ضعیف عورتوں اور دو بچّوں کا اللہ کے سوا کوئی آسرا اور سہارا نہیں رہ گیا تھا، مخلصین اور خیر خواہوں نے بہت دوڑ دھوپ کی،

حکومت کو یقین دلایا کہ یہ غریب الدیار مخلص اور با خدا لوگ ہیں ان کو سیاسیات یا ملکی معاملات سے کوئی دلچسپی یا تعلق نہیں ہے مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی، باپ اور دونوں بیٹے پا بہ جولاں ترکی کے شہر ایڈریانوپل میں نظربندی کے لیے روانہ کر دیئے گئے، مولوی صاحب اپنی سب سے بڑی تمنا پوری ہو جانے پر زندگی کی ساری مصیبتیں صبر و شکر کے ساتھ برداشت کر رہے تھے، سب سے زیادہ عزیز دولت پا کر انہوں نے دنیا کی ساری دولتوں سے نگاہیں پھیر لی تھیں، اسی دیار کے لیے آپ نے اپنا عزیز دیار ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا تھا، جب سے دراقدس پہ جبیں سائی نصیب ہوئی تھی قدم باہر نہیں نکالا تھا کہ کہیں سرکار کے قدموں سے عمر بھر کے لیے دوری نہ ہو جا آج جب آپ کو قید کر کے مدینہ سے لے چلے اور ناخن کو گوشت سے جدا کرنے لگے تو زندگی میں پہلی بار مظلوم دل کا خون ہو گیا اور مجبور روح تڑپ اٹھی۔

ننھے ننھے معصوم بچوں، کمزور بیمار اور ضعیف العمر عورتوں کو بے یار و مددگار کس دل سے چھوڑا، راستے کے لیے کیا انتظام ہوا اور کیا زادِ راہ ملا، دورانِ مسافرت کیا کیا حالتیں پیش آئیں اور سفر کیسے کیسے گذرا، یہ تفصیلات لکھنے اور بتلانے کے بس کی نہیں ہیں مختصر یہ کہ ایڈریانوپل پہنچے تو شدید سردی تھی، رگوں میں خون منجمد اور ہاتھ پاؤں شل ہوئے جاتے تھے، مولوی صاحب گرم ملک میں پیدا ہوئے تھے اور ساری عمر گرم ہی ماحول میں گذاری تھی، عسرت اور تنگدستی کے عالم میں بھی اولاد اور بچے قدم قدم راحت رسانی اور خدمت گذاری کے لیے ایک پاؤں پر کھڑے رہتے تھے، اب جبکہ مصائب و آلام نے جسمانی قوتِ مدافعت بالکل ہی ختم کر دی تھی۔ اس غریب الوطنی، نظربندی، قید و بند اور بے سر و سامانی کو برداشت نہ کر سکے۔ حکومت نے ان قیدیوں کے قیام کا انتظام شہر سے دور خیموں کے ایک کیمپ میں کیا تھا اور تین اشرفی ماہوار فی کس گذارے کے لیے مقرر کی تھی، اول تو یہ رقم مہینہ بھر کے لیے ویسے بھی ناکافی تھی اور پھر زوال پذیر حکومت کے سکے کی قیمت ہی کیا رہ جاتی ہے، ایک اشرفی پیسوں کے بھاؤ میں چلتی تھی، ایسے میں گذر اوقات کس طرح ہوتا ہوگا اس کا علم اللہ ہی کو ہے، اور پھر خیمے تو معمولی سردی گرمی سے بھی بچاؤ نہیں کر سکتے، وہ تو یخ بستہ ہوائیں تھیں، برف سے زیادہ ٹھنڈا پانی تھا اور کھلا ہوا میدان تھا، صبح چار بجے تہجد کے لیے اُٹھنا اور پھر ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا اور ٹھنڈی ہواؤں کے تھپیڑوں میں نفلیں پڑھنا ایک ستر بہتر برس کے بوڑھے بیمار اور کمزور انسان کی طاقت سے باہر ہو گیا اور نمونیہ کا شدید حملہ ہو گیا، حکیم، ڈاکٹر، دوا، علاج تو دور کی باتیں تھیں معمولی آرام اور غذائیں بھی میسر نہ ہو سکیں اور ایڈریانوپل پہنچنے کے ایک ماہ بعد ۱۹۱۷ء میں آپ مالکِ حقیقی سے جا ملے اور وہیں کی خاک میں پیوندِ زمین ہو گئے۔ (رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃ)

حضرت مولانا حبیب اللہ نور اللہ مرقدہٗ کی اولاد

اللہ تعالیٰ نے آپ کو پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں عطا فرمائی تھیں ان سب کے مفصل حالات "نقشِ حیات" اور "حیاتِ شیخ الاسلام" میں مذکور ہیں، یہاں اختصار کے طور پر صرف اسماءِ گرامیہ درج کیے جاتے ہیں :-

(۱) **مولانا سید محمد صدیق صاحبؒ** ولادت ۱۲۸۸ھ میں ہوئی اور وفات ۱۳۳۱ھ میں ہوئی، جنت البقیع میں آسودۂ حال ہیں، آپ کے فرزندان حمید و حید احمد بھی اسیرِ مالٹا تھے۔

(۲) **مولانا سید احمد صاحبؒ** ولادت ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء وفات ۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۰ء میں ہوئی، آپ نے اہلِ مدینہ کی بڑی علمی اور دینی خدمت کی، مدرسۃ العلوم الشرعیہ قائم فرمایا جہاں سے سینکڑوں علماء فضلاء فیضیاب ہوئے، یہ مدرسہ پہلے حرم نبوی کے متصل "باب النساء" کے ساتھ ملحق تھا اب وہ جگہ داخلِ مسجد ہوگئی ہے اور مدرسہ کچھ دور قائم ہے۔

احقر نے ۱۹۳۹ء کے حج میں آپ کی زیارت کا شرف حاصل کیا، آپ کے عطا کردہ ایک خاص کمرے میں جو کہ حرمِ اطہر کے بالکل قریب تھا اقامت کا شرف حاصل ہوا۔ احقر نے کراچی کے سوہن حلوہ کا ایک ڈبہ پیش کیا تو آپ نے فرمایا "حلوہ خوردن را روئے باید"۔ بوقتِ وفات آپ کی صرف ایک دختر عائشہ تھی جس کا نکاح مولانا محمد اسعد سے ہوا، جس سے ایک بیٹا ہوا جس کا نام احمد ہے اور وہ اب بھی مدینہ منورہ میں ہے۔

(۳) **حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ** ولادت ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء وفات ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء، مزار دیوبند کے احاطہ اہل اللہ میں ہے۔

(۴) **مولانا سید جمیل احمد صاحبؒ** ولادت ۱۳۰۲ھ، بحالتِ شباب مدینہ منورہ میں انتقال ہوا۔

(۵) **مولانا سید محمود صاحبؒ** ولادت ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۱ء کو ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں ہوئی احقر نے ۱۹۵۲ء میں ان کی زیارت کا شرف حاصل کیا، حکومت کی طرف سے جدہ میں قاضی مقرر ہوئے، بعد ازاں خرابیٔ صحت کی بنا پر مستعفی ہوگئے، ۱۹۷۳ء میں مدینہ منورہ ہی میں وفات پائی۔ آپ کے صاحبزادہ خاندانِ حبیب اللہ کے چشم و چراغ سید حبیب کا آجکل سعودی عرب کے جلیل القدر شرفاء میں شمار ہوتا ہے۔

نوٹ مولانا سید احمد اور مولانا سید محمود صاحب والد صاحب کے ہمراہ ایڈریانوبل میں اسیر رہے، آپ کی وفات کے بعد مدینہ منورہ آگئے جبکہ مولانا سید محمد صدیق اور مولانا سید جمیل کا پہلے ہی انتقال ہوچکا تھا اور حضرت مدنیؒ اس وقت اسیرِ مالٹا تھے۔ رحمۃ اللہ علیہم

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہ

زباں پہ بارِ خدا یہ کس کا نام آیا
کہ جھک کے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت مولانا سید حبیب اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے پانچ بیٹے عطا فرمائے تھے جن میں سے حضرتِ مدنی درمیانے تھے، آپ کی ولادت اور ابتدائی حالات صرف آپ کی تحریر کردہ کتاب "نقشِ حیات" ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں، چنانچہ حضرتؒ نے "نقشِ حیات" میں تحریر فرمایا ہے جس کا اقتباس درج ذیل ہے:۔

"۱۲۹۶ھ ماہ شوال کی انیسویں تاریخ کی شب میں گیارہ بجے دوشنبہ کا دن گذر جانے کے بعد یعنی شب سہ شنبہ بمقام بانگرمئو ضلع اناؤ میں پیدا ہوا، تاریخی نام چراغ محمد ہے (حضرت والد صاحب مرحوم نے اپنی بیاض میں صرف یہی تحریر فرمایا ہے، تاریخ و سنہ عیسوی نہیں لکھا ہے) حساب سے ۱۸۷۹ء پڑتا ہے، اس زمانہ میں والد صاحب مرحوم قصبہ بانگرمئو میں اردو مڈل کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور کئی سال سے مع متعلقین وہاں ہی مقیم تھے۔" (نقشِ حیات ص ۳)

تعلیم

تین سال آپ اپنے والد صاحب کے ہمراہ بانگرمئو میں مقیم رہے پھر اُن کی تبدیلی اپنے قصبہ ٹانڈہ میں ہو گئی تو آپ بھی ٹانڈہ ہی آگئے اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی، جب آپ کی عمر بارہ برس کی ہو گئی تو آپ کو اوائل صفر ۱۳۰۹ھ تعلیم کے لیے دیوبند بھیج دیا گیا جہاں آپ کے دو بڑے بھائی (مولانا سید محمد صدیقؒ اور مولانا سید احمد صاحبؒ) زیرِ تعلیم تھے، حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد سے مولانا خلیل احمد مرحوم نے علماء کے مجمع میں آپ کو گلستاں اور میزان الصرف شروع کرا دی، اس طرح دارالعلوم دیوبند میں آپ کا داخلہ اس قدر بابرکت ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ اور دوسرے علماء کرام کی موجودگی میں محدثِ کبیر مہاجرِ مدینہ شارحِ ابی داؤد مولانا خلیل احمدؒ نے آپ کے ان اسباق کی ابتداء فرمائی جو آن کے منصبِ تدریسی کے لحاظ سے اس درجہ اور مقام کے نہ تھے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ

آپ ۱۳۰۹ھ سے شعبان ۱۳۱۶ھ تک دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرتے رہے، یہ بھی آپ کی سعادت اور امتیازی شان ہے کہ ابتدائی کتب سے لے کر آخری کتب تک آپ نے دارالعلوم دیوبند ہی کے جلیل القدر اساتذہ سے پڑھیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔ "آپ نے درسِ نظامی اور نصابِ ولی اللّٰہی کے سترہ فنون کی سرسٹھ کتابیں ساڑھے چھ برس میں پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔"

دارالعلوم دیوبند میں خواندہ کتب کا نقشہ

پہلا سال سنہ ۱۳۰۹ھ / سنہ ۱۸۹۲ء

نمبر شمار	اسماء کتب	حضرات اساتذہ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعام	کیفیت
۱	دستور المبتدی	شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ	۱۹	۲۰	سراجی	تقریری
۲	صرف میر	مولانا حکیم محمد حسن صاحبؒ	۲۰	۲۰	قطبی	"
۳	زبدہ	"	۲۰	۲۰	مصباح	"
۴	نحو میر	"	۱۹	۲۰	میر قطبی	"
۵	پنج گنج	"	۱۹	۲۰	مراح الارواح	"
۶	میزان ومنشعب	مولانا صدیق احمد صاحبؒ (برادر اکبر)	۲۰	۲۰	ہدایۃ الصرف	"

نوٹ:۔ اس سال دارالعلوم میں حضرت مدنیؒ کے علاوہ آپ کے دونوں برادران (مولانا صدیق احمد صاحبؒ، مولانا سید احمد صاحبؒ) اور مشہور مناظر اور اہل حدیث عالم مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ زیر تعلیم تھے، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ ھدایہ جلد ثانی اور بعض دوسری کتب پڑھتے تھے۔

دوسرا سال سنہ ۱۳۱۰ھ / سنہ ۱۸۹۳ء

دارالعلوم میں امسال طلبہ کی تعداد ۲۸۸ تھی، حاجی سید محمد عابد صاحب صدر مہتمم اور مہتمم منشی فضل حق صاحب تھے جو عالم نہ تھے، حضرت شیخ الاسلام اپنی عمر عزیز کے چودھویں مرحلہ میں داخل ہو چکے تھے، زیادتی عمر کے ساتھ ساتھ ذہانت اور شوقِ علمی میں بھی قابلِ رشک اضافہ ہو رہا تھا جس کا کچھ اندازہ اس سال پڑھی ہوئی کتابوں میں حاصل کردہ مندرجہ ذیل نمبرات سے بآسانی

لگایا جاسکتا ہے۔

نمبر شمار	اسماء کتب	حضرات اساتذۂ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعامی	کیفیت
۱	فصول اکبری	حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ	۲۰	۲۰	حصن اللہ، فیوض المسلمین	تقریری
۲	مراح الارواح	حضرت شیخ الہندؒ	۲۱	۲۰		″
۳	مفید الطالبین	″	۲۰	۲۰		″
۴	زنجانی	″	۱۹	۲۰		″
۵	کافیہ	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ	۲۳	۲۰		″
۶	ھدایۃ النحو	″	۲۱	۲۰		″
۷	ایساغوجی	حضرت مولانا صدیق احمد صاحبؒ	۱۸	۲۰		″
۸	صغریٰ	″	۲۰	۲۰		″
۹	کبریٰ	″	۱۹	۲۰		″

تیسرا سال (۱۳۱۱ھ ۱۸۹۴ء)

اس سال مادر علمی میں تشنگانِ علومِ نبوی کی تعداد بڑھ کر ۲۹۸ ہوگئی تھی، شوریٰ نے مولانا فضلِ حق کی جگہ مولانا محمد منیر صاحبؒ کو اہتمام کے منصب پر فائز کیا تھا۔ نظامِ تعلیم، اصولِ تربیت میں نمایاں ترقی ہوئی تھی۔ غرضیکہ اس مرکزِ علمی میں علومِ نبوت کی شمعیں آب و تاب کے ساتھ روشن تھیں، اس منور ماحول میں حضرت مدنیؒ ترقی کی شاہراہ پر رواں دواں تھے، اس سال بھی سالانہ امتحان میں اعلیٰ کامیابی نے بڑھ کر آپ کے قدم چومے۔ ملاحظہ فرمائیے آپ کی محنتوں کا پھل!

نمبر شمار	اسماء کتب	حضرات اساتذۂ کرام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعامی	کیفیت
۱	شرح تہذیب	حضرت شیخ الہندؒ	۲۱	۲۰		تقریری
۲	تہذیب	″	۲۲	۲۰		″

نمبر شمار	اسمائے کتب	حضرات اساتذۂ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعامی	کیفیت
۳	نفحۃ الیمن	حضرت شیخ الہند ؒ	۱۹	۲۰	قاضی مبارک، قال اقولی	تقریری
۴	مرقات	//	۱۹	۲۰		//
۵	اصول الشاشی	مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب ؒ	۱۹	۲۰		//
۶	منیۃ المصلی	//	۲۱	۲۰		//
۷	شرح جامی بحث فعل	//	۲۰	۲۰		//
۸	شرح جامی بحث اسم	مولانا حافظ محمد احمد صاحب ؒ	۱۸	۲۰		//
۹	قدوری		۲۰	۲۰		//
۱۰	میزان منطق		۲۰	۲۰		//

چوتھا سال (۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۵ء)

حضرت مدنی ؒ کی عمر اس وقت سولہ برس کی تھی، اب تک پڑھی ہوئی کتابوں کا امتحان تقریری ہوتا تھا جس میں آپ ہمیشہ فائق رہتے تھے، مگر اس سال پہلی مرتبہ اکثر کتابوں میں تحریری سوالات حل کرنے کی نوبت آئی تھی، دار العلوم کے تحریری امتحان کے مشکل ہونے کا رعب دماغ پر طاری تھا، اس لیے سالِ رواں کے امتحان میں آپ کی بعض کتابوں کے نمبرات حدِ امتیاز سے گر گئے، مگر یہ وقتی تخلف آپ کے بلند پایہ عزائم میں جمود پیدا کرنے کی بجائے تلاطم خیزی کا سبب بن گیا، نتیجہ حسب ذیل ہے:-

نمبر شمار	اسمائے کتب	حضرات اساتذۂ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعامی	کیفیت
۱	قطبی تصورات	حضرت شیخ الہند ؒ	۱۸	۲۰	میر زاہد رسالہ - تصریح	تحریری
۲	قطبی تصدیقات	//	۱۶ ۲/۳	۲۰		//
۳	تلخیص المفتاح	حضرت مولانا خلیل احمد شارح ابی داؤد	۱۸	۲۰		تقریری
۴	خلاصۃ الحساب	حضرت مولانا منفعت علی صاحب ؒ	۱۷ ۲/۳	۲۰		تحریری
۵	کنز الدقائق	مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب ؒ	۱۹	۲۰		تقریری
۶	اقلیدس		۱۶ ۲/۳	۲۰		تحریری

نوٹ:۔ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ اس سال دارالعلوم میں بخاری شریف، ترمذی شریف، ہدایہ اخیرین وغیرہ کتابیں پڑھتے تھے، حضرت مولانا محمد شفیع صاحب حضرت شیخ الہندؒ کے بڑے داماد اور موجودہ مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب زید مجدہم کے والد ماجد ملا نا مشیت اللہ صاحب بھی حضرت شاہ صاحب کے ساتھ اکثر کتب میں شریک تھے۔ شوال ۱۳۱۲ھ مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لے آئے، اس سال دارالعلوم کی باوقار مجلس شوریٰ نے مولانا محمد منیر صاحبؒ کی جگہ حضرت مولانا حافظ احمد صاحب خلف الصدق حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو اہتمام کی گرانقدر ذمہ داری سونپی اور موصوف ۱۳۴۱ھ تک ان ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔

پانچواں سال (۱۳۱۳ھ / ۱۸۹۶ء)

پچھلے سال امتحان میں نمبرات کا اوسط گھٹ جانے کی وجہ سے اس سال ابتدا ہی سے آپ نے کتابوں میں محنت تیز کردی تھی، انتہائی دلجمعی کے ساتھ تکرار و مطالعہ میں وقت گذاری کرتے رہے، تاآنکہ سالانہ امتحان کا وقت آگیا، اب آپ نے اپنے راحت وآرام کو تج کر کے امتحان کی رات میں ممتحنہ کتاب شروع سے اخیر تک مطالعہ فرماتے اور اگر نیند کا غلبہ ہوتا تو نمکین چائے کا انتظام فرماتے جس کی وجہ سے نیند پر قابو ہو جاتا، اس طریقہ کو اختیار کرنے سے آپ کو تحریری امتحان کی مشکلات پر غلبہ حاصل ہو گیا اور سالِ گذشتہ کے مقابلہ میں اس سال تحریری امتحان میں اعلیٰ نمبرات آپ کے مقدر میں آئے جن کی ایک جھلک یہ ہے:۔

نمبر شمار	اسماء کتب	حضرات اساتذۂ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعامی	کیفیت
۱	شرح عقائد نسفی	حضرت شیخ الہندؒ	۱۹	۲۰	مینبذی کلاں	تحریری
۲	ہدایہ اولین	مولانا حکیم محمد حسن صاحبؒ	۱۸ ۲/۳	۲۰		″
۳	مختصر المعانی	″	۱۸ ۲/۳	۲۰		″
۴	ملا حسن	″	۱۹ ۱/۳	۲۰		″
۵	سلم العلوم	″	۱۹	۲۰		″

نمبر شمار	اسماء کتب	حضرات اساتذۂ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعامی	کیفیت
۶	شرح وقایہ	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ	۱۹	۲۰		تحریری
۷	نور الانوار	مولانا غلام رسول صاحب بفویؒ	۱۹	۲۰		〃
۸	حسامی	〃	۱۸	۲۰		〃
۹	رشیدیہ	مولانا محمد منفعت علی صاحبؒ	۱۴	۲۰		〃
۱۰	میبذی	〃	۱۳	۲۰		〃
۱۱	ہدایۃ الحکمۃ	〃	۱۲	۲۰		〃

نوٹ:- اس سال ۲۲ ربیع الاوّل کو حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ ۱۰۵ برس کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ دارالعلوم میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ مسلم شریف، ابو داؤد شریف اور صدرا وغیرہ پڑھتے تھے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ بھی بعض کتابوں میں حضرت شاہ صاحبؒ کے ہم سبق تھے۔

چھٹا سال (سنہ ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۷ء)

اس سال حضرت مدنیؒ نے دارالعلوم کے فاضل اساتذہ اور قابلِ فخر ہم سبقوں کے جھرمٹ میں فن حدیث کی ابتدائی منزل میں قدم رکھا، جوں جوں وقت گذر رہا تھا، آپ کی طبیعتِ سلیمہ تمام علوم سے ہٹ کر حدیث اور صاحبِ حدیث (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی طرف راغب ہو رہی تھی، اُستاذِ کُل حضرت شیخ الہندؒ کی عنایتیں بھی روز افزوں تھیں، اس بار بھی آپ نے اپنے روایتی امتیاز کو برقرار رکھا، دیکھئے:-

نمبر شمار	اسماء کتب	حضرات اساتذۂ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعامی	کیفیت
۱	مطول	حضرت شیخ الہندؒ	۵۰	۵۰	شرح ملا جامی	تحریری
۲	میر زاہد رسالہ	مولانا محمد منفعت علی صاحبؒ	۵۱	۵۰		〃
۳	میر زاہد ملا جلال	〃	۲۸½	۵۰		〃
۴	مشکوٰۃ شریف	مولانا غلام رسول بفوی صاحبؒ	۵۰	۵۰		〃
۵	شمائل ترمذی شریف	〃	۵۰	۵۰		〃

نمبر شمار	اسماء کتب	حضرات اساتذۂ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعام	کیفیت
۶	دیوان متنبی	مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب	۴۹ ½	۵۰		تحریری
۷	مقاماتِ حریری	؍؍	۴۲	۵۰		؍؍

نوٹ:۔ اس سال حضرت مدنیؒ کے ساتھیوں میں آپ کے برادر اکبر مولانا سید احمد صاحب اور مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی کتابیں آپ سے کچھ اعلیٰ تھیں، میاں سید اصغر حسین صاحبؒ اس سال نور الانوار، سلّم العلوم وغیرہ پڑھتے تھے، اس سال امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے آخری مرتبہ گنگوہ میں دورۂ حدیث شریف پڑھایا، اس آخری جماعت میں مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ (والد ماجد حضرت شیخ سہارنپوریؒ) شریک تھے، بعض تعلیمی ضرورتوں کی وجہ سے سالِ رواں میں امتحان میں اعلیٰ نمبرات بیس سے بڑھا کر پچاس کر دیئے گئے۔

ساتواں سال (۱۳۱۵ھ ۱۸۹۸ء)

اس سال شروع ہی سے حضرت شیخ الاسلامؒ کے دل و دماغ فرحت و شادمانی، مسرت و انبساط سے معمور تھے۔ یہ غیر معمولی بشاشت محسنِ انسانیت، فخرِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ سے حد درجہ اشتغال کی بدولت تھی، دورۂ حدیث شریف کا یہ مبارک سال دیکھتے ہی دیکھتے گذر گیا تا آنکہ امتحان کا پُر رونق زمانہ آگیا، جبکہ دار العلوم کی فضائیں رات دن بحث و تکرار کی دلنواز آوازوں سے معمور رہتی ہیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے شاندار امتیاز کو برقرار رکھنے کے لیے جی جان سے محنت کی، بالآخر آپ کی محنتوں کا ثمرہ اس صورت میں ظاہر ہوا۔

نمبر شمار	اسماء کتب	حضرات اساتذۂ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعام	کیفیت
۱	بخاری شریف	حضرت شیخ الہندؒ	۴۹	۵۰	تفسیر بیضاوی	تحریری
۲	ترمذی شریف	؍؍	۵۰	۵۰		؍؍
۳	ابوداؤد شریف	؍؍	۵۰	۵۰		؍؍
۴	نسائی شریف	مولانا عبد العلی صاحبؒ	۴۸ ¾	۵۰		؍؍

نمبر شمار	اسماء کتب	حضرات اساتذۂ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعام	کیفیت
۵	موطا امام مالک	حضرت شیخ الہندؒ	۴۹ ۲/۳	۵۰		تحریری
۶	موطا امام محمد	"	۵۰	۵۰		"
۷	حمد اللہ	مولانا عبد العلی صاحبؒ	۴۶ ۲/۳	۵۰		"
۸	جلالین شریف	مولانا حکیم محمد حسن صاحبؒ	۴۰	۵۰		"
۹	قاضی مبارک	مولانا غلام رسول بفوی صاحبؒ	۴۰	۵۰		"

نوٹ: حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا دار العلوم میں یہ آخری سال تھا، حضرت مولانا میاں سید اصغر حسینؒ حسامی، مقامات وغیرہ پڑھتے تھے، اسی سال حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ دوبارہ حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں دیوبند حاضر ہوئے اور حضرتؒ نے انہیں اپنی تحریک سے وابستہ کر لیا، اسی سال حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کانپور چھوڑ کر مستقل طور پر تھانہ بھون میں اقامت گزیں ہو گئے، رمضان المبارک میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کاندھلہ میں پیدا ہوئے اور اسیر مالٹا مولانا وحید احمد مدنیؒ (برادر زادہ حضرت مدنیؒ) کی پیدائش بھی اسی سال ہوئی۔

آخری سال (۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۹ء)

اس سال حضرت مدنیؒ اپنی عمر کی بیسویں منزل میں تھے، صحاح ستہ سے فراغت ہو چکی تھی۔ فنون، اصول، فقہ وغیرہ کی ادق کتابیں زیرِ درس تھیں، اب آپ کے ذہن میں صلابت، فکر میں شستگی اور نظر میں شائستگی آ گئی تھی۔ دار العلوم اپنے مستفیدین کو معرفتِ حق، انابت الی اللہ اور عشقِ نبوی کا جو تبرک جذبہ عطا کرتا ہے اس کے مبارک آثار آپ کی ذات سے عیاں ہونے لگے تھے، علم میں رسوخ اور زیرِ درس کتابوں پر عبور کا یہ حال تھا کہ مدرسہ میں اعلیٰ سے اعلیٰ نمبر ۵۰ ہونے کے باوجود آپ صدرا جیسی مشکل کتاب میں ۵۲ نمبروں کے حقدار سمجھے گئے، ملاحظہ کیجئے اس سال کے امتحان کا نتیجہ:۔

نمبر شمار	اسماء کتب	حضرات اساتذۂ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعام	کیفیت
۱	بیضاوی شریف	حضرت شیخ الہندؒ	۵۰	۵۰		تحریری
۲	خیالی شرح شرح عقائد	"	۴۷	۵۰		"

نمبر شمار	اسماء کتب	حضرات اساتذہ عظام	نمبر حاصل کردہ	نمبر مقررہ	کتب انعام	کیفیت
۳	ہدایہ آخرین	حضرت شیخ الہندؒ	۴۵	۵۰	نسائی شریف، نظام الفواعل	تحریری
۴	صدرا	مولانا عبد العلی صاحبؒ	۴۳	۵۰		〃
۵	سبعہ معلقہ	〃	۵۲	۵۰		〃
۶	ابن ماجہ شریف	〃	۵۰	۵۰		〃
۷	تصریح	〃	۵۱	۵۰		〃
۸	مسلم شریف	〃	۴۹	۵۰		〃
۹	توضیح تلویح	〃	۴۵	۵۰		〃
۱۰	شمس بازغہ	〃	۴۵	۵۰		〃
۱۱	سراجی	مولانا منفعت علی صاحبؒ	۴۰	۵۰		〃
۱۲	نخبۃ الفکر	حضرت شیخ الہندؒ	۴۵	۵۰		〃

فـ۱:- دارالعلوم کے ہزاروں فضلاء میں سے یہ سعادت صرف حضرت مدنیؒ کو حاصل ہوئی کہ علمِ صرف کی بالکل ابتدائی کتاب "دستور المبتدی" استاذ العلماء حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھی اور دورۂ حدیث کی پانچ کتابیں بھی حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھیں۔

فـ۲:- احقر کی کتاب البدر الحل الصدرا پر حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی تقریظ سے حضرتؒ کے معقولات میں بھی رسوخِ کامل کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۶ء ۱۳۵۴ھ میں طبع ہو چکی ہے۔

(فـ۳) اگرچہ آپ فراغت کے بعد اپنے والد ماجد نور اللہ مرقدہٗ کے ہمراہ مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے اور مدرسہ کا جلسہ دستار بندی بھی نہ ہوا تھا مگر ۱۹۱۰ء مطابق ۱۳۲۸ھ مدرسہ کی طرف سے جلسہ دستار بندی کا اعلان کر دیا گیا جبکہ آپ کچھ عرصہ کے لیے دارالعلوم ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء میں تشریف لائے اور دورۂ حدیث میں شرکت بھی فرمائی، مدرسہ کے مہتمم حضرات نے آپ کو بمشاہرہ ۳۴ روپے ماہوار مدرس رکھ لیا، اسی زمانہ میں جلسۂ دستار بندی ہوا جس کا مختصر حال حضرت مدنیؒ کے الفاظ میں درج ذیل ہے:-

ـــــ اور سرپرستِ دارالعلوم صاحبزادۂ قطبِ عالم حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت سے اربابِ اہتمام نے ۱۶، ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۱۰ء

مطابق ۱۳۲۸ھ کو جلسہ کا اعلان کر دیا، مدرسہ کے تالاب میں نہر سے پانی لایا گیا جس کی وجہ سے مجمع کے لیے وضوء وغیرہ میں بہت آسانی ہوگئی، ٹیوب ویل جگہ جگہ گاڑے گئے، پنڈال نہایت وسیع بنایا گیا، علاوہ ظاہری انتظامات کی تکمیل کے باطنی تصرفات اور روحانی برکات کا ہر جگہ ظہور تھا غیر معمولی بات یہ تھی کہ باوجودیکہ ہروقت کئی کئی سو من غلہ اور گوشت پکتا تھا مگر کسی جگہ کتا نظر نہیں آتا تھا باوجودیکہ گرمیوں کا زمانہ تھا مگر مکھیوں کا کہیں اجتماع نہ تھا، غلاظت اور گندگی جو کہ ایسے مجامع میں عموماً پائی جاتی ہے کہیں دیکھنے میں نہیں آتی تھی، اس قدر عظیم الشان مجمع میں کوئی شخص کھانے اور مہمانی کے فرائض سے محروم اور شاکی نہیں پایا گیا، حالانکہ معمولی معمولی باراتوں اور مجامع میں اس قسم کی بے عنوانیاں سینکڑوں پائی جاتی ہیں، اس زمانہ میں اخباروں نے جلسہ کی غیر معمولی کامیابی پر زوردار اور طویل طویل آرٹیکل شائع کیے تھے۔

جلسہ کے پہلے اجتماع میں تقاریر ہوئیں اور اس کے بعد دوسرے اجلاس میں دستار بندی کا سلسلہ شروع کیا گیا سب سے پہلے حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دستار بندی ہوئی اس کے بعد میری دستار بندی ہوئی۔

مجھ کو ایک سبز عمامہ حسب اصول مدرسہ اور دوسرے حضرات کی طرح مدرسہ سے از دست حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بندھوایا گیا اور مجھ کو خصوصی طور پر علاوہ دستار مدرسہ حضرت حکیم مسعود احمد صاحبزادۂ حضرت قطب العالم گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما نے دوسری دستار عطا فرمائی پھر جناب حکیم مولانا احمد صاحب رامپوری رکن مجلس شوریٰ نے تیسری دستار عطا فرمائی"۔

(نقش حیات جلد ۱ ص ۱۴۶، ۱۴۷)

دارالعلوم اور نصابِ دارالعلوم کی جامعیّت

ایک انگریز جاسوس کے دلچسپ مشاہدات

دارالعلوم دیوبند جس زمانہ میں قائم ہوا اُس وقت ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی پر صرف ۹ سال گذرے تھے، چونکہ عام مسلمان اور دارالعلوم کے اکابر جنگِ آزادی میں انگریزوں کے خلاف صف آراء رہ چکے تھے اس لیے انگریزی حکومت مسلمانوں کے سخت خلاف اور اُن سے بدظن اور برگشتہ تھی، مسلمانوں کی حرکات و سکنات پر کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی، اس بناء پر دارالعلوم کی نسبت مدت تک خفیہ و اعلانیہ تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا، چنانچہ ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۵ء میں صوبہ متحدہ (اُتر پردیش) کے گورنر سر جان اسٹریچی نے اپنے ایک معتمد جان پامر کو اس غرض سے دارالعلوم میں بھیجا کہ وہ خفیہ طور پر تحقیقات کر کے رپورٹ پیش کرے کہ دارالعلوم کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ اور مسلمان علماء دارالعلوم کے پسِ پردہ کس فکر و عمل میں مصروف ہیں جان پامر نے دارالعلوم کو دیکھ کر جو رپورٹ تیار کی اور جو تاثرات اُس نے اخذ کیے وہ اُس نے اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے نہایت تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ جان پامر نے دارالعلوم کی تعلیمی کیفیت کا انگریزی یونیورسٹیوں سے موازنہ کرتے ہوئے اپنے مشاہدات و تاثرات کا جس دلچسپ اور عالمانہ انداز میں اظہار کیا ہے وہ دارالعلوم کے علمی مؤقف کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے، یہ واقعہ دارالعلوم کی ابتدائی زندگی کا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی معیار شروع ہی سے کیا رہا ہے۔ یہ خط جہاں دارالعلوم کی تعلیمی اور بعض دوسری جزئیات کی تفصیل اور نقد و تبصرے پر مشتمل ہے وہیں ایک ایسے شخص کی زبان سے جو مخالفانہ نقطۂ نظر رکھتا تھا، دارالعلوم کی تعلیمی خصوصیات اور اس کے خد و خال کا ایک دلچسپ مُرقّع سامنے آجاتا ہے جو نہایت گہرے تاثرات پر مبنی ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خط کا پورا متن پیش کر دیا جائے۔

جان پامر لکھتا ہے کہ "لیفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی کے ساتھ دورے میں ۳۰ جنوری ۱۸۷۵ء کو دیوبند میں قیام ہوا، گورنر نے مجھ سے کہا کہ "یہاں دیوبند میں مسلمانوں نے گورنمنٹ کے خلاف ایک مدرسہ جاری کیا ہے، تم اجنبیانہ طور پر اس مدرسہ میں جاکر پتہ لگاؤ کہ کیا تعلیم ہوتی ہے اور مسلمان کس فکر میں لگے ہوئے ہیں"۔

چنانچہ ۳۱ جنوری کو اتوار کے دن میں آبادی میں پہنچا، قصبہ نہایت صاف ہے، یہاں کے باشندے خلیق اور نیک ہیں مگر غریب اور فلاکت زدہ ہیں، پوچھتے پوچھتے مدرسہ میں پہنچا، یہاں پہنچکر میں نے ایک بڑا کمرہ دیکھا جس میں چٹائی کے فرش پر لڑکے کتابیں سامنے رکھے ہوئے بیٹھے تھے اور ایک بڑا لڑکا اُن کے درمیان میں بیٹھا ہوا تھا، میں نے دریافت کیا کہ تمہارا استاد کون ہے؟ ایک لڑکے نے اشارہ سے بتایا، معلوم ہوا کہ جو شخص درمیان میں بیٹھا ہوا تھا وہی اُستاد ہے، مجھے تعجب ہوا کہ یہ کیا اُستاد ہوگا۔[1] میں نے اُس سے پوچھا آپ کے لڑکے کیا پڑھتے ہیں؟ جواب دیا "یہاں فارسی پڑھائی جاتی ہے"! یہاں سے آگے بڑھا تو ایک جگہ ایک صاحب میانہ قد نہایت خوبصورت بیٹھے ہوئے تھے، سامنے بڑی عمر کے طلباء کی ایک قطار تھی، قریب پہنچکر سنا تو علم مثلث کی بحث ہو رہی تھی، میرا خیال تھا کہ مجھے اجنبی سمجھ کر یہ لوگ چونکیں گے مگر کسی نے مطلق توجہ نہ کی، میں قریب جاکر بیٹھ گیا اور اُستاد کی تقریر سننے لگا، میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ علم مثلث کے ایسے ایسے عجیب اور مشکل قاعدے بیان ہو رہے تھے جو میں نے کبھی ڈاکٹر اسپرنگر سے بھی نہیں سُنے تھے ــــ یہاں سے اُٹھ کر دوسرے[2] دالان میں گیا تو دیکھا کہ ایک مولوی صاحب کے سامنے طالب علم معمولی کپڑے پہنے ہوئے بیٹھے ہوئے ہیں یہاں اُقلیدس کے چھٹے مقالے کی دُوسری شکل کے اختلافات بیان ہو رہے تھے اور مولوی صاحب اس برجستگی سے بیان کر رہے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اقلیدس کی رُوح اُن میں آگئی ہے۔ میں منہ تکتا رہ گیا،

---

[1] یہ مولانا منفعت علی دیوبندی مدرس فارسی تھے جن کا اُسی سال (۱۲۹۱ھ/۱۸۷۵ء) میں تعلیم سے فراغت کے بعد تقرر ہوا تھا۔ یہ ابتداءً مدرس فارسی رہے پھر چند سال کے بعد مدرس عربی بنائے گئے اور ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء تک دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ [2] یہ حضرت مولانا سید احمد دہلویؒ تھے جو ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء میں مدرسِ دوم مقرر ہوئے اور ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی وفات پر صدر مدرس بنائے گئے اور ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء تک مسندِ تدریس پر فائز رہے، علومِ ریاضی میں یگانہ روزگار تھے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ "مولوی سید احمد صاحب کو خداوند کریم نے فنون ریاضی میں وہ استعداد اور مناسبت عطا فرمائی ہے کہ ان علوم کے موجدوں کو بھی شاید اتنی ہی ہو"۔ (روداد ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء ص ۱۳)

اسی دوران میں مولوی صاحب نے جبر و مقابلہ ٹاڈ ہنٹر سے مساوات درجۂ اوّل کا ایک ایسا مشکل سوال طلبہ سے پوچھا کہ مجھے بھی اپنی حساب دانی پر پسینہ آ گیا، بعض طلبہ نے جواب صحیح نکالا۔ یہاں سے اُٹھ کر میں تیسرے دالان میں پہنچا، ایک مولوی صاحب حدیث کی کوئی موٹی سی کتاب پڑھا رہے تھے اور ہنس ہنس کر تقریر کر رہے تھے[1]۔ یہاں سے میں ایک زینے پر چڑھ کر دوسری منزل میں پہنچا اس کے تین طرف مسقّف مکان تھے، بیچ میں ایک چھوٹی سی صحنچی تھی جس میں دو اندھے بیٹھے بڑبڑا رہے تھے، میں یہ سننے کے لیے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں دبے پاؤں اُن کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ علمِ ہیئت کی کسی کتاب کا سبق یاد کر رہے ہیں، اتنے میں ایک اندھے نے دوسرے اندھے سے کہا "بھائی! کل کے سبق میں شکلِ عروسی اچھی طرح میری سمجھ میں نہیں آئی اگر تم سمجھے ہو تو بتلاؤ"۔ دوسرے اندھے نے پہلے دعویٰ بیان کیا اور اس کی ہتھیلی پر لکیریں کھینچ کر ثبوت شروع کیا، پھر جو آپس میں اُن کی بحث ہوئی تو میں دنگ رہ گیا اور مسٹر برنگیہ پرنسپل کی تقریر کا سماں میری آنکھوں میں پھر گیا۔ وہاں سے اُٹھ کر ایک چھپرے میں گیا، چھوٹے چھوٹے بہت بچے صرف و نحو کی کتابیں نہایت ادب سے اُستاد کے سامنے بیٹھے پڑھ رہے تھے، تیسرے درجہ میں علمِ منقول کا درس ہو رہا تھا۔

میں دوسرے زینے سے اُتر کر نیچے آیا، میرا خیال تھا کہ مدرسہ بس اسی قدر ہے، اتفاق سے ایک شخص سے ملاقات ہوئی، میں نے اس سے اپنے خیال کی تصدیق چاہی، اُس نے کہا "نہیں! قرآن شریف دوسری جگہ پڑھایا جاتا ہے"۔ میں نے پوچھا کہاں؟ وہ مجھ کو مسجد میں لے گیا، مسجد کے دالان میں بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے ایک نابینا حافظ[2] کے سامنے قرآن شریف پڑھ رہے تھے، حافظ نے ایک چھوٹے سے بچے کو پکڑ کر بڑی بے رحمی سے پیٹا، بچہ چلّایا، میں نے اپنے راہنما سے کہا کہ ننھے ننھے بچوں سے ایسی سخت محنت لینا بڑا ظلم ہے، اُس نے ہنس کر جواب دیا "بظاہر تو یہ ظلم نظر آتا ہے مگر درحقیقت یہ شفقت ہے، بچوں کو شروع ہی سے

---

[1] غالباً حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ صدر المدرسین کی جانب اشارہ ہے، مولانا موصوف دارالعلوم کے آغاز ہی سے صدارتِ تدریس کی مسند پر فائز تھے۔ [2] یعنی حافظ نامدار خان۔ حافظ صاحب مرحوم بکسی ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے، قیامِ دارالعلوم کے دوسرے سال ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء میں جب درجۂ قرآن کا اجراء عمل میں آیا تو حافظ نامدار خان اس کے معلّم مقرر ہوئے اور ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء تک تقریباً ۵۵ سال درجہ قرآن شریف کی خدمات انجام دیں، ان کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع ہے، ناظرہ پڑھنے والوں کے علاوہ ان کے فیضِ تعلیم نے سینکڑوں بچوں کو حافظِ قرآن بنا دیا جن میں دارالعلوم کے بعض بہت سے اساتذہ بھی شامل ہیں۔ (سید محبوب رضوی)

محنت شاقہ کا عادی بنا دینا اُن کے حق میں عین حکمت اور آئندہ زندگی میں پیش آنے والی مشکلات پر قابو پانے کے لیے بہت ضروری ہے، آجکل مسلمانوں میں یہی تو ایک بات ہمت اور محنت کی رہ گئی ہے اور اسی لیے کچھ ٹوٹا پھوٹا دین ان کے پاس باقی ہے"!

میں نے پوچھا گذشتہ سال اخباروں میں دیکھا تھا کہ چار طالب علموں کے دستارِ فضیلت باندھی گئی تھی[1] اُن میں سے یہاں کوئی موجود ہے؟ وہ بولا کہ "ہاں ایک صاحب ہیں، چلئے میں ملائے دیتا ہوں"۔ وہ مجھے ایک مکان میں لے گیا جہاں ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا، ایک موٹی سی کتاب سامنے رکھی تھی اور دس بارہ طالبعلم بیٹھے پڑھ رہے تھے، ایک طرف دو بندوقیں پڑی ہوئی تھیں میں نے سلام کیا اُس نے کمالِ اخلاق سے جواب دیا، میں نے پوچھا کہ گذشتہ سال آپ ہی کے دستارِ فضیلت بندھی ہے؟ بولے کہ "اساتذہ کی عنایت ہے"! میں نے کہا کہ یہ کیا کتاب ہے؟ فرمایا کہ "عربی زبان میں ایک فنی کتاب ہے، ایک مطبع کے مہتمم نے ترجمے کے لیے بھیجی ہے، اس کی اُجرت ایک ہزار روپے ٹھہری ہے، مجھے ترجمہ کرتے ہوئے تین مہینے ہوئے ہیں اور تین چوتھائی کے قریب ہو چکا ہے، بقیہ انشاء اللہ ایک مہینے میں ہو جائے گا۔ میں نے پوچھا یہ بندوقیں کیسی ہیں؟ کہنے لگے "مجھے شکار کا شوق ہے، سات بجے سے دس بجے تک پڑھاتا ہوں، گیارہ سے ایک بجے تک شکار کھیلتا ہوں (جہاد کے لیے نشانہ پکاتا ہوں) اور دو سے چار بجے تک ترجمہ کرتا ہوں"!

میں نے دریافت کیا آپ نوکری کیوں نہیں کرتے؟ بولے کہ خدائے تعالیٰ گھر بیٹھے بٹھائے ڈھائی سو روپے مہینہ دیئے دیتا ہے، پھر کس لیے نوکری کروں[2]"؟

یہاں سے اُٹھ کر کتب خانہ میں آیا، منتظم کتب خانہ نے میرا خیر مقدم کرتے ہوئے فہرست دکھلائی، میں حیران رہ گیا کوئی فن ایسا نہ تھا جس کی کتاب موجود نہ ہو۔ ایک دوسرا رجسٹر دکھلایا جو طلبہ کی حاضری کا تھا،

---

[1] دارالعلوم کی زندگی کا یہ بالکل ابتدائی زمانہ تھا مگر جان پامر کے اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم کے حالات و کوائف اُس زمانے کے اخبارات میں شائع ہوتے تھے اور اخبارات میں دارالعلوم کی خبروں کو اہمیت دی جاتی تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں اسی وقت دارالعلوم مرکزی اور امتیازی حیثیت سے دیکھا جانے لگا تھا۔ [2] غالباً یہ حضرت شیخ الہندؒ تھے، سنہ ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں فارغ ہوئے تھے اور سنہ ۱۲۹۱ھ میں بلاتنخواہ کے مدرس مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۲۹۰ھ کے فارغ ہونے والے حضرات میں صرف حضرت شیخ الہندؒ ہی دیوبند کے رہنے والے تھے، شکار کا بے حد شوق تھا۔ جان پامر نے جس زیرِ ترجمہ کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے افسوس ہے کہ اس کا پتہ نہیں چل سکا۔

اور نہایت صاف، خوش خط لکھا ہوا تھا، من جملہ ۲۱۰ طلبہ کے ۲۰۸ طلبہ حاضر تھے۔

میں اُٹھنے والا ہی تھا کہ ایک صاحب سبزہ رنگ آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے، میں نے پوچھا آپ کی تعریف؟ بولے کہ "میں مہتمم ہوں[1]"، اور تین بڑے بڑے رجسٹر میرے سامنے رکھ دیئے اور بتلایا کہ "یہ سال بھر کے آمد و صرف کا حساب ہے، ملاحظہ کیجئے"۔

میں نے دیکھا تو تاریخ وار نہایت صحت کے ساتھ حساب لکھا ہوا تھا، گوشوارے سے معلوم ہوا کہ گذشتہ سال کے آخر میں خرچ کے بعد کچھ روپیہ بچ گیا تھا۔

طبیعت چاہتی تھی کہ کتابوں کی کچھ سیر کروں، مگر وقت تنگ ہو گیا اور شام ہونے کو تھی، مجبوراً واپس ہوا۔

میری تحقیقات کے نتائج یہ ہیں کہ یہاں کے لوگ تعلیمیافتہ، نیک چلن اور نہایت سلیم الطبع ہیں، کوئی ضروری فن ایسا نہیں جو یہاں پڑھایا نہ جاتا ہو، جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں کے صرف سے ہوتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپے میں کر رہا ہے، مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر کوئی تعلیم گاہ نہیں ہو سکتی، اور میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی غیر مسلمان بھی یہاں تعلیم پائے تو نفع سے خالی نہیں، انگلستان میں اندھوں کا سکول سنا تھا مگر یہاں آنکھوں سے دیکھا کہ دو اندھے تحریر اقلیدس کی شکلیں کفِ دست پر اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ بایدو شاید! مجھے افسوس ہے کہ آج سرولیم میور موجود نہیں ہیں ورنہ بکمالِ ذوق و شوق اس مدرسہ کو دیکھنے اور طلبہ کو انعام دیتے۔ (تاریخ دار العلوم دیوبند جلد اول ص ۱۷۶ تا ۱۸۰)

دار العلوم دیوبند کا دینی مزاج

دار العلوم دیوبند کو اپنی ابتداء ہی سے یہ سعادت نصیب رہی ہے کہ اولیاء اللہ کی دعائیں، اہلِ حق کی خدمات اور تعاون اس کے ساتھ رہا اور ہر باطل سے اللہ تعالیٰ نے دار العلوم دیوبند کی روحانی فضا کو مسموم ہونے سے بچایا، چنانچہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

---

[1] یعنی حضرت مولانا رفیع الدینؒ مہتمم دار العلوم دیوبند ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۷ء سے ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء تک اور پھر دوبارہ ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء سے ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۸ء تک مسندِ اہتمام پر فائز رہے۔

——— حضرت قطب عالم مولانا الحاج امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں کہ ۵۷ھ کے بعد خیال تھا کہ ایک مذہبی مرکز اور اسلامی دار العلوم قائم ہوگا مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ نعمت بے بہا اہل دیوبند کی قسمت میں تھی۔ الغرض تقادیر الہیہ کے تصرفات اور اہل اللہ کی ہمتوں اور دعاؤں نے چند ایسے باہمت اور پاکیزہ حضرات کو کھڑا کیا جو علم اور عمل کے جامع اور زہد و ریاضت کے معدن تھے وہ اگر ایک طرف معقولات کے امام تھے تو دوسری طرف منقولات میں مجدد وقت بھی تھے وہ اگر ایک جانب نسبت مجددیہ اور سکینہ و وقار کے پہاڑ تھے تو دوسری طرف نسبت چشتیہ و قادریہ عشق و جذب کے بحر ذخار بھی تھے، وہ جس طرح اتباع سنت پر جان دیتے تھے اسی طرح سلوک اور تمکین کے بھی قطب تھے انہوں نے ایسے معجون مرکب نصاب اور طرز تعلیم وغیرہ کو مرتب کیا جو کہ ولی اللہی حدیث و تفسیر اور نظامی معقول کا جامع تھا، اسی طرح حنفی تفقہ کا حامی اور مجددی اتباع سنت کا محافظ اور اہل سنت والجماعت کا رکن تھا اور فرق مبتدعہ اور ان کے عقائد و اعمال سے بچانے والا، یہی وہ امر تقدیری تھا جس کو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے دو سو برس پیشتر اپنی روحانی قوت سے ادراک کیا تھا اور بوقت نظر بندی دیوبند سے گذرتے وقت فرمایا تھا کہ یہاں سے احادیث نبوی کی خوشبو آتی ہے۔

الغرض دار العلوم دیوبند ایک خاص جماعت کا تعلیمی اور قومی انسٹی ٹیوشن ہے جو کہ خاص غرض کے لیے قائم کیا گیا تھا اور انہیں خاص اغراض کو ایک خاص جماعت نے مسلمانان ہند بلکہ مسلمانان عالم کے زمانہ موجودہ میں حقیقی خدمت سمجھی تھی جو کہ واقعیت پر مبنی تھی اور ہے، اور اس خدمت کو اس مدرسہ نے بحمد اللہ بڑے پیمانہ تک انجام دیا۔

اسی خصوصیت کو احساس کرتے ہوئے غیر مقلدوں، قادیانیوں، شیعہ، آغاخانیوں، بوہروں، رضاخانیوں، نیچریوں وغیرہ نے کبھی اسکی اعانت میں حصہ نہیں لیا، الا ماشاء اللہ۔ ہاں اہل سنت والجماعت مقلدین احناف اور عام مسلمانوں نے برابر دلچسپی لی اور آج تک لے رہے ہیں۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ فِي الدَّارَيْنِ خَيْرًا ——— (القاسم دار العلوم نمبر محرم ۱۳۴۷ھ صفحہ ۵۵)

جبکہ ندوۃ العلماء قائم شدہ ۱۸۹۴ء میں مذہبی اساس کو نظر انداز کیا گیا جیسا کہ سر آغاخاں کے بارہ میں کہا گیا ہے (از شبلی)

بہ کیش شیعہ و سنی سر آغاخاں خدا نہ بود ——— ولیکن کشتی اسلامیاں را ناخدا باشد

ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ لکھنؤ ۱۹۱۲ء میں مرزا محمود نے بھی شرکت کی۔ (حیات شبلی از سید سلیمان ندوی صفحہ ۵۰۱، ۵۳۳)

قیامِ مدینہ منوّرہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مشاغل

حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد ماجد کے ہمراہ مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے، اس مقدس بستی میں آپ کے جو مشاغل مبارک تھے اُن کو مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

اِحسان وسلوک آپ کے والد ماجد قدس سرہٗ نے جب ہجرت کا ارادہ کیا تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے والد ماجدؒ سے ارشاد فرمایا۔

"ان دونوں (مولانا سید احمدؒ اور حضرت مدنیؒ) کو حضرت گنگوہیؒ سے بیعت کرا دو خدا جانے یہاں سے جانے کے بعد کس کے پلّے پڑ جائیں، کہیں کسی بدعتی سے وابستہ نہ ہو جائیں۔" (نقش ص۸۰)

چنانچہ آپ کو حضرت گنگوہی نوراللہ مرقدہٗ نے شرفِ بیعت سے نوازا اور پھر ارشاد فرمایا کہ۔

"میں نے بیعت تو کر لیا اب تم مکہ معظمہ جا رہے ہو وہاں حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ موجود ہیں اُن سے عرض کرنا وہ ذکر تلقین فرمائیں گے۔" (نقش)

حضرت مدنی نے اپنے والد ماجد کے ہمراہ مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی صاحب سے شرفِ زیارت کا ذکر یوں فرمایا۔

"اواخر ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۹ء میں حاضری مکہ مکرمہ نصیب ہوئی، موصوف اُس وقت بہت ضعیف ہو گئے تھے، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا سلام و پیام سُنکر بہت خوش ہوئے اور دیر تک نہایت محبت سے تذکرہ فرماتے رہے اور فرمایا تمنّا ہے ایک مرتبہ پھر زندگی میں ملاقات ہو جاتی، اور مجھے پاس انفاس کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ روز صبح کو یہاں آکر بیٹھا کرو اور اس ذکر کو کرتے رہو۔" (نقش ص۸۹)

چند دنوں کے بعد مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے تو اس پاکیزہ تر سرزمین میں اپنے احسان وسلوک کے اسباق کو یوں ذکر فرمایا۔

"چنانچہ حرم محترم میں بیٹھ کر پاسِ انفاس کیا کرتا تھا، تھوڑے ہی عرصہ میں سلسلہ چشتیہ قدس اللہ اسرارہم کی نسبت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور گریہ کی حالت طاری ہونی شروع ہو گئی، اس اثناء میں رؤیائے صالحہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت باسعادت خواب میں بکثرت ہونے لگی، نیز ذکر کی

وجہ سے جسم میں بے اختیاری حرکات بھی ہونے لگیں، مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام میں چونکہ لوگوں کا مجمع ہر وقت رہتا تھا اس لیے ایسا وقت مقرر کیا جس میں کم سے کم مجمع رہے اور وہ وقت آفتاب نکلنے سے ایک گھنٹہ بعد کا تھا، مگر جب آثارِ ذکر جسم پر زیادہ ظاہر ہونے لگے تو لوگوں سے شرم کی وجہ سے شہر کے باہر جنگل میں جانے لگا، مسجد شریف کی مشرقی جانب جدھر بقیع شریف ہے آبادی نہیں ادھر نکل جاتا تھا اور کبھی مسجد الاجابہ میں، یہاں پر بعض ادعیہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقبول ہوئی ہیں، اور کبھی اس کے قریب کھجوروں کے جھنڈوں میں تنہا بیٹھ کر ذکر کرتا رہتا تھا کئی بار سیدِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارتِ منامی کا شرف حاصل ہوا، ایک دن اشعار کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا جس میں نعتِ رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ایک مصرع

ع ہاں اے حبیب رُخ سے اُٹھا دو حجاب کو

بہت بھلا معلوم ہوا، میں مسجد شریف میں حاضر ہوا اور مواجہہ شریفہ میں بعد ادائے آداب وکلمات مشروعہ انہیں الفاظ کو پڑھنا اور شوقِ دیدار میں رونا شروع کیا، دیر تک یہی حالت رہی جس پر یہ محسوس ہونے لگا کہ مجھ میں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کچھ حجاب دیواروں اور جالیوں وغیرہ کا حائل نہیں ہے اور آپ کرسی پر سامنے بیٹھے ہوئے ہیں آپ کا چہرہ مبارک سامنے ہے اور چمک رہا ہے"
(نقشِ حیات جلد ۱ صفحہ ۱۰۷)

چنانچہ آپ کو یہ سعادت حاصل رہی کہ اس سرزمین میں جو کہ مہبطِ انوارِ وحی ہے جہاں سیدِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں، جہاں انبیاء علیہم السلام کے بعد بہترین سعادتمندوں کے مزارات ہیں، جس کی فضاء میں اب بھی وہی انوار اور برکات موجود ہیں جو آج سے چودہ سو سال پہلے تھیں۔ اگرچہ مدینہ منورہ کی زمینی حیثیت میں تبدیلی آچکی ہے اور آتی رہے گی مگر اُحد تو وہی ہے، جبلِ سلع تو وہی ہے، ثنیۃ الوداع تو وہی ہے بلکہ ساری فضاء وہی ہے جو زیارتِ سیدِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار سے مشرف ہو چکی ہے اور اب بھی اس حرم پر انوار کی لاتناہی بارش ہو رہی ہے، اس فضا میں جس سعادتمند نوجوان نے احسان وسلوک کے مراتب طے کیے اس کی عظمت کا کیا ٹھکانا! چنانچہ صرف دو سال بعد آپ کو قطب الارشاد حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ نے مجازِ طریقت فرما دیا۔

(ف) حضرت مدنی مدینہ منورہ سے گنگوہ شریف حاضر ہوتے رہے، جب دوسری بار حاضر ہوئے تو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے شوال ۱۳۱۸ھ میں گنگوہ شریف آنے کا حکم دیا، چنانچہ آپ جب حاضر ہوئے تو آپ کے برادرِ بزرگ بھی آپ کے ساتھ تھے، حضرت گنگوہیؒ نے خانقاہِ قدوسیہ کے دو حجروں میں آپ کو قیام کی سعادت بخشی اور مراقبہ پر دلجمعی کی ہدایت فرمائی حضرتِ مدنی نور اللہ مرقدہٗ ارشاد

فرماتے ہیں :۔

"میں نے تعلیم شدہ مراقبہ پر عمل کرنا شروع کر دیا، عصر کے بعد جب مجلس عمومی فرماتے تھے تو اسی مراقبہ میں حجرۂ قدسیہ کے برآمدہ میں ستونوں کے پیچھے تقریباً دو تین گز کے فاصلہ سے میں مشغول ہو جاتا تھا، مغرب کے وقت تک وہاں ہی مشغول رہتا تھا، اس مراقبہ سے مجھ کو نہایت قوی اور بہت زیادہ فائدہ پہنچتا تھا" (نقش حیات جلد ۱ صفحہ ۱۰۴)

اسی قیام کے دوران آپ نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص یہ کہہ رہا ہے کہ چالیس دن گذرنے کے بعد مقصود حاصل ہو گا، چنانچہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ٹھیک اسی تاریخ کو آپ کو خلافت سے نوازا۔ آپ نے سلسلہ نقشبندیہ کے سلوک بھی طے کرنے کی خواہش کا اظہار فرمایا تو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا :۔

"جو تعلیم دی ہے وہ سب کی بالکل آخری تعلیم ہے یہاں پر تمام سلاسل مل جاتے ہیں، اسی کی مشق کرو"

حضرت مدنیؒ نے ایک مکتوب گرامی میں فرمایا :۔

"میرے مرشد و آقا حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز نے اگرچہ مجھ کو چاروں طریقوں میں بیعت فرمایا تھا جن میں سے طریقہ نقشبندیہ مجددیہ بھی ہے مگر اصلی طریقہ اور عام تعلیم حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی چشتیہ صابریہ تھی" (الاحسان نمبر)

تعلیم و تدریس

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کا دوسرا مشغلہ تعلیم اور تدریس تھا۔ مدینہ منورہ میں تعلیم اور تدریس کا آغاز تو خود سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ قرآنِ کریم کی تلاوت اور اس کی تعلیم و تشریح آپ کے منصبِ رسالت میں سے تھی، آپ کا رات دن اسی پاکیزہ عمل میں گذرتا، رسمی طور پر اصحابِ صُفّہ کی تعلیم کا خصوصی اہتمام فرمایا۔ صُفّہ رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی درس گاہ تھی، اسی مسجدِ نبوی میں جبریل امین علیہ السلام نے حاضرِ خدمت ہو کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے چندہ سوالات کیے تھے جن کا تعلق سارے دین کے ساتھ ہے یعنی اسلام، ایمان اور احسان، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جوابات ارشاد فرمائے، ان کے تشریف لے جانے پر ارشاد فرمایا: ھٰذا جبریل اتاکم یعلمکم دینکم (ترجمہ) "یہ جبریل تھا جو تمہارے پاس آیا تاکہ تم کو تمہارے دین کی تعلیم دے جائے"

(ف) سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں درس و تدریس کا اہتمام ہجرت سے پہلے فرما دیا تھا، جیسا کہ بیعتِ عقبہ اولیٰ کے موقع پر بارہ اہلِ مدینہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہمراہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیجا تاکہ ان لوگوں کو قرآنِ عزیز پڑھائے اور اسلام کی تعلیم دے اور ان کو دین کے

احکام سمجھائے۔" (وفود القبائل ص۲۱۷)

غزوۂ بدر میں بعض جنگی قیدیوں سے یہ فدیہ لیا گیا تھا کہ وہ اہلِ مدینہ کے کم از کم دس دس آدمیوں کو پڑھائیں۔ ان تمام واقعات سے ظاہر ہے کہ مدینہ منورہ میں درس و تدریس کا اہتمام سیّدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور نہایت ہی اہم اور ضروری تھا چنانچہ مدینہ منورہ میں علوم دینیہ کی درسگاہ زمانہ عنبر شمامہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک ہے اور بفضلہ تعالیٰ وکرمہٖ قیامت تک رہے گی۔

حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ جب مدینہ منورہ تشریف لے جانے لگے تو حضرت شیخ الہندؒ نے خود ان کو الوداع کیا جس کی کیفیت حضرتؒ کی زبانی عرض ہے:۔

"اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں جبکہ ہم تینوں بھائی دیوبند سے آخری طور پر روانہ ہوئے تو منجملہ رخصت کرنے والوں کے خود حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز ساتھ ساتھ اسٹیشن دیوبند تک پیدل تشریف لائے تھے راستے میں پر زور طریقہ پر ہدایت فرمائی کہ پڑھانا ہر گز نہ چھوڑنا خواہ ایک ہی دو طالب علم ہوں' اس لیے تعلیمی مشغلہ کا خیال بہت زیادہ ہو گیا تھا، مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد بعض طلبہ ہندوستانی اور بعض عرب کتابوں کی تدریس کے خواستگار ہوئے۔" (نقشِ حیات جلد ۱ صفحہ ۵۹)

اگرچہ مدینہ منورہ میں دوسرے اشغال بھی بہت زیادہ ہو گئے تھے مگر قطبِ عالم حضرت حاجی امداد اللہ نور اللہ مرقدہ نے ارشاد فرمایا: "پڑھاؤ اور خوب پڑھاؤ۔" (نقشِ حیات جلد ۱ ص۱۴)

چنانچہ آپ نے اسارتِ مالٹا (۱۳۳۵ھ) تک مسجدِ نبوی میں تعلیم و تدریس کا مبارک سلسلہ جاری رکھا، درمیان میں کچھ اوقات کے لیے دیوبند اور گنگوہ شریف کی حاضری رہی مگر مجموعی طور پر ۱۵ سال تک حرمِ اطہر میں آپ کو یہ سعادت میسر ہوئی جو شاید ہی کسی عجمی عالم کو حاصل ہوئی ہو، آپ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"علوم میں جدّ و جہد کرنے والے طلبہ کا ہجوم اس قدر ہوا کہ اور علماء مدرسین کے حلقہ ہائے دروس میں ان کی مثال نہیں ملتی۔" (نقشِ حیات جلد ۱ ص۱۱۵)

آپ سے پہلے بھی ہندی علماءِ کرام درس جاری فرماتے تھے مگر آپ کا درس نہایت ہی مقبول رہا، حضرت میاں صاحب نے فرمایا:۔

"مولانا محمد اسحٰق صاحب امرتسری ایک با خدا عالم نمونۂ انقیائے سلف اور مصداق علیٰ دین العجائز نے مدینہ منورہ میں جا کر درس جاری فرمایا، ان کی وفات کو زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ مولانا صدیق احمد اسی مقدس دار الہجرت میں مخصوص طور سے اپنے مکان پر اور مسجدِ نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں اشاعتِ علم کرنے لگے اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا حسین احمد کا حلقہ درس خاص مسجدِ نبوی

بین سید العرب والعجم کے روضۂ منورہ کے سامنے ایسی عظمت و برکت سے جاری ہوا کہ بڑے بڑے کامل الفن اساتذہ کے حلقے مختصر رہ گئے اور شرفاء مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد مولانا موصوف کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کرنے لگے، ذٰلک فضل اللّٰہِ یؤتیہ من یشاء۔"
(حیات شیخ الہندؒ صـ۲۲)

"سنہ ۱۳۲۰ھ سے سنہ ۱۳۲۶ھ تک مسلسل طور پر میرا مشغلۂ علمی مدینہ منورہ میں جاری رہا جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے تمام مشاغل معاش وغیرہ سے دستبردار ہو کر میں سفرِ گنگوہ سے واپس ہوتے ہی مسجد نبوی میں تعلیمی مشاغل میں تدریجاً منہمک ہو گیا حتیٰ کہ روزانہ چودہ چودہ کتابیں مختلف فنون کی پڑھاتا تھا اور مدینہ منورہ میں منگل اور جمعہ کو تعطیل ہوتی ہے تو ان تعطیل کے ایام میں بھی خصوصی دروس چار پانچ ہوتے تھے۔ بہت سی ایسی کتابیں جن کو ہندوستان میں پڑھا یا نہیں جاتا ہے اور مدینہ منورہ، مصر، اسلنبول کے نصاب میں داخل ہیں پڑھانی پڑیں مثلاً اجرومیہ، دحلان، کفراوی، الفیہ ابن عقیل، شرح الفیہ ابن ہشام وغیرہ۔ نحو میں شرح عقود الجمان، رسالہ مستعارات، رسالہ وضعیہ للقاضی عضد وغیرہ معانی و بیان میں بدیعیہ ابن حجہ۔ بدیع میں نور الایضاح ملتقی الابحر وغیرہ (فقہ میں) شرح جمع الجوامع للسبکی و شرح مستصفی الاصول ورقات و شرح منتہی الاصول وغیرہ (اصول شافعیہ و مالکیہ میں) مسامرہ شرح مسایرہ، شرح طوالع الانوار، جوہرہ وغیرہ (عقائد میں) الفیہ اصول الحدیث۔ اسی طرح فرائض اور منطق وغیرہ کے متعدد رسائل اور کتابیں جن کو یہاں سنا بھی نہ تھا پڑھانا پڑا چونکہ نفسِ فن میں اِن فنون سے مناسبت تھی اس لیے کچھ دشواریاں پیش نہیں آئیں، جن کتابوں کو یہاں پڑھا تھا خواہ تفسیر کی یا حدیث کی، معانی کلام، فقہ یا اصول وغیرہ کی، ان کی بھی بارہا نوبت آئی اور بحمد اللہ نہایت کامیابی کے ساتھ یہ دروس جاری رہے۔ اکابر اساتذہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی برکتیں اور دعائیں اور فضلِ خداوندی شاملِ حال تھا اس سے علمی ترقی ہوتی گئی اور افاضہ اور استفاضہ کا حلقہ روز افزوں ہوتا رہا۔" (نقشِ حیات جلد ا صـ۱۱۳)

کسی معلم کے لیے کتب ناخواندہ پڑھانا مشکل ہے مگر مہبطِ انوارِ وحی میں خلوص اور عقیدت کے ساتھ تعلیم و تدریس آسان ہو جاتا ہے جہاں خود معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ حضرت مدنیؒ کو علمی اور تدریسی مشکلات بھی آئیں مگر وہ کیسے حل ہوئیں؟ آپ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"ایک مرتبہ ہدایہ اخیرین میں ایک مسئلہ ایسا آگیا کہ بہت غور و فکر اور حواشی و شروح کے مطالعہ سے بھی حل نہ ہو سکا، سخت عاجز ہو کر حجرۂ نبویہ پر حاضر ہوا اور بعد سلام و درود عرض کیا، تھوڑی دیر میں سمجھ میں آگیا۔" (نقش حیات جلد ا صـ۱۱۳)

آپ کے درس مدینہ منورہ کا چشم دید حال مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں بیان فرمایا:۔

"مولانا حسین احمد صاحب کا درس حرم نبوی میں الحمد للہ بہت عروج پر ہے اور عزت و جاہ بھی حق تعالیٰ نے وہ عطا فرمایا ہے کہ ہندی علماء کو کیا معنیٰ یمنی و شامی بلکہ مدنی علماء کو بھی وہ بات حاصل نہیں ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ۔ آپ سرتاپا خلق، مہمان نواز، غیور، باحیاء اور بعض اُن صفات حمیدہ سے متصف ہیں جن پر دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے۔" (تذکرۃ الرشید جلد ۲ ص ۱۵۹)

کچھ زمانہ آپ نے علوم و فنون کی کتب کا درس دیا مگر بعد میں جلد ہی شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہو گئے اس زمانہ میں حرمین شریفین میں جو بھی طالب علم مقامی یا بیرونی ہوتا تھا وہ علم دین کو دین کی غرض سے حاصل کرتا تھا اور مدرسین حضرات بھی صرف رسمی عالم نہ ہوتے تھے بلکہ وہ عارف باللہ ہونے تھے جن کی راہنمائی کتابوں کے حواشی اور شروح نہ کرتے تھے بلکہ اُن پر حرمین مکرمین کی برکتیں اور رحمتیں نازل ہوتی تھیں جن کا مختصر حال حضرت شاہ ولی اللہ نور اللہ مرقدہ کی مرتبہ کتاب فیوض الحرمین اور الدر الثمین میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اس شرف عظیم سے مشرف رہے اور ساتھ تدریس و تعلیم کے پہلے مدینہ منورہ کے کتب خانوں سے استفادہ کرتے رہے جن میں اکثر قلمی کتابیں تھیں بلکہ آپ نے کچھ زمانہ ان کو نقل کرنے کا مشغلہ بھی اختیار فرمایا تھا اس لیے وسعت مطالعہ کا ایک اور قوی ذریعہ آسانی سے میسر ہو گیا —— جیسا کہ آپ نے فرمایا:۔

"میں نے سلسلۂ کتابت علی الاجرت شروع کر دیا، عربی نسخ میں کتابیں نقل کرتا تھا اور اُجرت حاصل کرتا تھا، مدینہ منورہ میں اُس وقت دو کتب خانے منتظم تھے، ایک کتب خانہ شیخ الاسلام اور دوسرا محمودیہ، ان دونوں میں قلمی کتابیں نایاب بکثرت تھیں، مجاورین مدینہ (باہر کے باشندے جو مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہیں) اور اہالی شہر اور زائرین کو بسا اوقات کسی کتاب کی اِن کتب خانوں سے ضرورت پڑتی تھی تو وہ ان کو نقل کرواتے رہتے ہیں کبھی مصر یا مغربی افریقہ وغیرہ سے بھی لوگ کسی کتاب کی نقل چاہتے ہیں تو وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے سے یہاں سے نقل حاصل کرتے ہیں، مگر ہر دو کتب خانوں میں اس کی اجازت نہیں تھی کہ کتاب کتب خانہ سے باہر نکالی جائے، البتہ یہ انتظام تھا کہ جو شخص کسی کتاب کو نقل کرنا یا مطالعہ کرنا چاہے تو وہ کتب خانہ میں آکر استفادہ کرے۔" (نقش حیات جلد ۱ ص ۵۸)

چنانچہ اسی علمی اور تحقیقی مطالعہ کے دوران آپ نے اسلام کے بنیادی عقیدہ ظہور مہدی علیہ السلام پر ایک کتاب قلمبند فرمائی جس کے مقدمہ میں اس کی حیثیت، ضرورت و جامعیت کو یوں بیان فرمایا:۔

"قیامت کی علاماتِ کُبریٰ ہی میں سے مہدی آخرالزمان کا ظہور، ان کی خلافت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اُن کی اِقتدا میں ایک نماز یعنی فجر کا پڑھنا وغیرہ بھی ہے۔"

"احادیث میں امام مہدی کا نام، ولدیت، حُلیہ وغیرہ بھی بیان کیا گیا ہے، نیز آپ نے زمانۂ خلافت میں عدل وانصاف کی ہمہ گیری اور مال و دولت کی فراوانی کا تذکرہ بھی ہے۔ غرضیکہ امام مہدی کے متعلق اس کثرت سے احادیث مروی ہیں کہ اصولِ محدثین کے اعتبار سے وہ حدِ تواتر کو پہنچ گئی ہیں۔"

"امام مہدی سے متعلق جن حضرات صحابہؓ سے حدیثیں منقول ہیں اُن میں حسب ذیل اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم شامل ہیں، خلیفۂ راشد حضرت عثمان غنی، حضرت علی مرتضیٰ، طلحہ بن عبید اللہ، عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عبداللہ بن عباس، اُمّ المومنین اُمّ سلمہ، اُمّ المومنین اُمّ حبیبہ، ابوہریرہ، ابوسعید خدری، جابر بن عبداللہ، انس بن مالک، عمران بن حصین، حذیفہ بن یمان، عمار بن یاسر، جابر بن ماجد صدفی، ثوبان مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عوف بن مالک رضی اللہ عنہم اجمعین۔"

یہ جامع اور اہم مضمون کتابی شکل میں مکتبۃ الحرم مکہ معظمہ میں محفوظ ہے، بعض اہلِ علم نے اس کا عکس حاصل کیا ہے۔

حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ نے جس طرح مہبطِ انوارِ وحی میں احسان وسلوک کی منازل طے فرمانے کی سعادت حاصل کی اور علومِ نبوت کی تدریس سے حرمین اور ایشیاء کے اُن سعادت مندوں کو مالامال فرمایا جو مدینہ منورہ صرف حصولِ برکاتِ روحانیہ اور علومِ اسلامیہ کے لیے قیام پذیر تھے، اسی طرح آپ نے مدینہ منورہ میں مقیم علماءِ کرام سے اکتسابِ فیض کی سعادت بھی حاصل کی، آپ کی سند اس لحاظ سے بھی دوسرے علماءِ کرام سے عالی اور جامع ہے کہ علماء حجاز خصوصاً بلدۂ طیبہ کے علماء کرام سے اجازتِ روایت حاصل ہے، چنانچہ حضرتِ مدنیؒ کی خصوصی سند میں مرقوم ہے کہ:۔

"واروی عن مشیخۃ اعلام من اھل الحجاز اجازۃً وّ قراءۃً لاوائل بعض الکتب اجلھم شیخ التفسیر حسب اللہ الشافعی المکی، مولانا عبدالجلیل برادہ المدنی ومولانا عبدالسلام الداغستانی مفتی الاحناف بالمدینۃ المنورۃ ومولانا السید احمد البرزنجی مفتی الشافعیۃ بالمدینۃ المنورۃ رحمھم اللہ تعالیٰ وارضاھم۔"

اس تدریس میں بھی آپ کی نظر یہود و نصاریٰ کی اسلام دشمنی پر مرکوز رہتی تھی، اپنے حلقۂ درس کے شرکاء کو زیادہ طور پر ادھر ہی متوجہ فرماتے تھے جس کا اندازہ کرنے کے لیے مندرجہ ذیل واقعہ بطور شہادت کے درج ہے:۔

"الجزائر کے سپہ سالار و مجاہدِ آزادی اور اس ملک میں روحِ حریت کے بانی الشیخ عبدالحمید بن بادیس اُس وقت حضرت کے حلقۂ فیضانِ برکات میں شامل تھے، ان کے سوانح نگار جناب ترکی رابح لکھتے ہیں کہ مدینہ طیبہ میں شیخ ابن بادیس کے سابق شیخ الاستاذ حمدان مونیسی نے ان کو الجزائر سے ہمیشہ کے لیے ہجرت اور حجازِ مقدس میں مستقل قیام کا مشورہ دیا لیکن جناب شیخ حسین احمد الہندی نے اس مشورہ کے خلاف اُن کو الجزائر واپس جانے کی نصیحت کی اور فرمایا کہ تمہارا واپس جانا ضروری ہے کیونکہ الجزائر تمہارے علم و عمل کا زیادہ مستحق و محتاج ہے، چنانچہ وہ شیخ موصوف (حضرت مدنیؒ) کی حکمت آمیز نصیحت پر عمل پیرا ہو کر واپس چلے آئے اور حجاز میں قیام کا ارادہ ترک کر دیا۔ خود شیخ بن بادیس نے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"مجھے یاد ہے کہ جب میں مدینہ طیبہ گیا تو اپنے اُستاذ حمدان مونیسی سے اور اپنے دوسرے شیخ حسین احمد الہندی سے ملا، متقدم الذکر نے وطن سے قطع تعلق کر کے ہجرتِ مدینہ طیبہ کا مشورہ دیا اور مؤخر الذکر نے جو بڑے عالم ہونے کے ساتھ صاحبِ رائے بھی تھے انہوں نے مشورہ دیا کہ وطن واپس جاؤ اور جس قدر ممکن ہو اسلام اور وطن کی خدمات انجام دو، اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ حسین احمد الہندی ہی کے فرمانے کو پورا کیا۔" (شیخ الاسلام مدنی ص ۱۶۸)

جنگِ عظیم کی ابتداء اور حضرت مدنیؒ کی ترغیبِ جہاد

آپ ۱۳۳۰ھ کے اوائل میں ہندوستان تشریف لائے اور پھر جلد ہی واپس مدینہ منورہ لوٹے جب کہ جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی مگر ترکی اور برطانیہ کے درمیان میں اعلانِ جنگ نہیں ہوا تھا، اگرچہ خبریں گرم تھیں، اسٹیمر میں رات کو روشنی نہیں کی جاتی تھی اور آبدوزوں اور جنگی جہازوں کے خطرات ہمیشہ ظاہر کیے جاتے تھے۔ بہرحال دسویں یا بارہویں دن جدہ پہنچنا ہوا اور پھر مکہ معظمہ میں ایامِ حج میں قیام کر کے اونٹوں کی سواری سے مدینہ منورہ ۱۳۳۲ھ محرم میں پہنچنا ہوا، اسی زمانہ میں ترکی کا اعلانِ جنگ بھی ہو گیا اور فوج کشی کے سامانوں اور جنگی تحفظات وغیرہ کا اثر حجاز میں اور بالخصوص حرمین شریفین میں شروع ہو گیا۔ میں متعلقین کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچکر مشاغلِ تعلیمیہ وغیرہ میں حسبِ سابق مشغول ہو گیا۔ اسی اثناء میں جبکہ ترکی فوجیں حدودِ مصر کی طرف بھیجی جا رہی تھیں اور مجاہدین متطوعین (والنیٹروں) کو بھرتی کیا جا رہا تھا تو

ترغیب جہاد کے لیے مناخہ مدینہ منورہ میں (جو کہ غلہ بازار مدینہ منورہ میں وسیع میدان ہے اور وہیں قافلے ٹھہرا کرتے تھے) ایک بڑا جلسہ کیا گیا اور مجھ کو بھی تقریر کرنے کی نوبت آئی، مگر یہ تقریر اردو میں تھی، اور دوسرے حضرات نے بھی تقریریں کیں۔ مشہور خیری برادران بھی اس زمانہ میں وہاں پہنچ گئے تھے، اُن کی بھی تقریریں ہوئیں، اور ایک مجمع مجاورین اہلِ ہند وغیرہ کا متطوع (والنٹیر) کور میں داخل ہو گیا جن میں مولانا محمد جان قازانی اور مولانا رحمت اللہ قازانی بھی تھے، یہ ہر دو صاحبان روس کے باشندے تھے اور بغرض تحصیل علوم دینیہ اولاً مدینہ منورہ پھر دیوبند آگئے تھے اور کتب درسیہ سے فراغت حاصل کر کے اسی سال مدینہ منورہ پہنچ گئے تھے۔ جمال پاشا کے زیرِ کمان جو حملے اور کارروائیاں قنال سویز اور بیئر سبع وغیرہ پہ میدانِ تیہہ میں واقع ہوئیں اُن میں یہ جماعت شریک رہی اور بہت کچھ دادِ شجاعت و جوانمردی دیتی رہی۔ (نقش حیات ج ۲ ص ۲۱۲)

چنانچہ آپ کے اس حلقۂ درس[1] سے کئی عرب ممالک کے طلباء بعد میں اپنے اوطان کے علمی اور سیاسی راہنما بنے جن کی تشریح کو کسی دوسرے وقت عرض کیا جائے گا۔ حضرت مدنیؒ کے اس زمانۂ درس و تدریس کی افادیت کا ذکر مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے:۔

"عہدِ شباب کی بات ہے کہ وہ مردِ حق آگاہ سید المرسلین رحمۃ للعالمین کے حرمِ اطہر میں درس و تدریس کے ذریعے قال اللہ و قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمات انجام دیا کرتا تھا اور مشرقِ اوسط، افریقہ، چین اور جزائر شرق الہند کے تشنگانِ علوم اور راہ نوردانِ طریقت و سلوک اس کے ظاہری و باطنی کمالات و ملکات سے فیضیاب ہوا کرتے تھے مگر اس کی نگاہِ حقیقت آگاہ نے جب یہ دیکھا کہ حیاتِ ملی کس طرح مظلومیت کی قربان گاہ پر بھینٹ کی جا رہی ہے اور انسانیت کس طرح درد و کرب میں مبتلا ہے تب وہ خدماتِ ملی کے تنہا اس گوشہ پر قانع نہ رہ سکا، اس نے نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ عالمِ اسلامی پر گہری نظر ڈالی، وہ نظر جو رحمۃ للعالمین کے جوار کے طفیل میں رحمت و شفقت، محبت و رافت اور ہمدردی و غمخواری کے جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی جس کی وسعت فرقہ واریت کی تنگنائیوں سے آزاد اور تحزب و گروہ بندی کے گرد و غبار سے پاک تھی۔" (نقش حیات جلد ۱ ص ۳)

---

[1] آپ کے شاگردوں میں سے بہت سے تعلیم، تدریس، قضا اور انتظامی محکموں کے بڑے بڑے منصبوں پر فائز ہوئے، کچھ وفات پا چکے ہیں (رحمۃ اللہ علیہم) اور کچھ حضرتؒ کے وصال کے وقت زندہ تھے، ان میں سے مولانا عبد الحفیظ کردی رکن مجلس کبریٰ، مولانا احمد بساطی نائب قاضی مدینہ منورہ، محمد عبد الجواد صدر بلدیہ مدینہ منورہ، الجزائر کی تحریکِ آزادی کے مشہور مجاہد شیخ محمد البشیر الابراہیمی وغیرہم۔ (ماہنامہ "المنہل" مکہ مکرمہ)

آپؒ نے مدینہ منورہ سے دیوبند کا چار بار سفر کیا مگر پھر واپس چلے گئے، قیام مدینہ منورہ میں تدریس اور ترغیب جہاد کی طرف زیادہ توجہ فرمائی۔ آپؒ کے قیام مدینہ منورہ کا مختصر نقشہ درج ذیل ہے:۔

پہلا قیام	ابتداء سنہ ۱۳۱۷ھ	انتہاء سنہ ۱۳۱۸ھ	دو سال
دوسرا قیام	″ سنہ ۱۳۲۰ھ	″ سنہ ۱۳۲۶ھ	سات سال
تیسرا قیام	″ سنہ ۱۳۳۰ھ	″ سنہ ۱۳۳۱ھ	دو سال
چوتھا قیام	″ سنہ ۱۳۳۲ھ	″ سنہ ۱۳۳۵ھ	چار سال

قیام مدینہ منورہ میں آپؒ کے مشاغل (۱) تکمیل اسباق سلوک و احسان (۲) تدریس و ترغیب جہاد کے علاوہ مسلک حقہ کا دفاع بھی تھا جس کا مختصر مگر جامع تذکرہ اسی کتاب کے ص ۱۱۱ پر کیا جا رہا ہے۔

مختصر تذکرۂ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

اگرچہ دار العلوم دیوبند کا بطور عربی مدرسہ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو اجراء ہوا اور اُس نے ہزاروں علماء، صلحاء پیدا کیے، مگر ان سب میں ممتاز اور دار العلوم کی دینی، علمی، روحانی، سیاسی شہرت جس ذاتِ بابرکات سے ہوئی وہ حضرت شیخ الہندؒ ہیں، پھر اس کتاب کے مضامین کی مرکزی حیثیت آپ ہی کو حاصل ہے، اس لیے عام ناظرین کی معلومات کے لیے حضرتؒ کا مختصر مگر جامع تذکرہ درج کیا جاتا ہے:۔

"دیوبند میں مسلمانوں کے دو معزز خاندان شیوخ کے قدیم الایام سے آباد ہیں، شیوخ صدیقی اور شیوخ عثمانی، اسی عثمانی خاندان کے ایک عالم حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ کے ہاں ایک بلند اختر بیٹا ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء کو عالم ظہور میں آیا جس کا نام محمود حسن رکھا گیا۔ خاندانی رواج کے مطابق قرآن مجید اور ابتدائی کتب درسِ نظامی بعض علماء وقت سے پڑھیں، جب عربی مدرسہ کا افتتاح دیوبند کے اولیاء کرام کے ہاتھوں ۱۲۸۳ھ کو ہوا اور ایک مدرس مولانا ملا محمد محمود کو مقرر کیا گیا جس کے سامنے سب سے پہلے شاگرد محمود حسن نے زانوئے تلمذ تہ کیے، اس طرح اُستاذ محمود اور شاگرد محمود کی نسبت سے دار العلوم دنیا بھر میں محمود رہا اور انشاء اللہ عاقبت بھی محمود ہوگی، عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (بنی اسرائیل ۷۹) کا ظہور ہوگا۔ ۱۲۹۰ھ میں فراغتِ علوم کے بعد اسی دار العلوم میں مدرس ہوگئے، یہاں بہت جلد آپ شیخ الحدیث کے مقام پر فائز ہوگئے۔ ۱۲۹۴ھ میں پہلا حج کیا اور حاجی امداد اللہ قدس سرہ سے نہ صرف شرف بیعت عطا ہوا بلکہ خلافت و اجازتِ بیعت سے بھی نوازے گئے۔ دار العلوم دیوبند میں ۱۳۲۳ھ تک تدریس حدیث کے ساتھ ساتھ دار العلوم کی اساسی غرض (استخلاصِ وطن) کیلئے نہایت گرمجوشی مگر حزم و احتیاط سے کام کرتے رہے جس کی کچھ تفصیل آئندہ اوراق میں آرہی ہے۔ اسی غرض کی تکمیل کیلئے ۱۳۳۳ھ میں سفرِ حجاز کیا اور وہاں اپنے شاگرد باوفا سید حسین احمد مدنیؒ کی وساطت سے آزادیٔ برصغیر کیلئے ترکی حکومت سے مذاکرات کے بعد عملی اقدام کی تیاری فرما رہے تھے کہ جنگِ عظیم چھڑ گئی، انگریزوں کی سازش سے آپ کو مالٹا میں اسیر کردیا گیا۔ ۱۳۳۸ھ میں رہائی کے بعد وطن تشریف لائے، علالت اور بدنی ضعف کے باوجود اپنی تحریک کو دوسری حکمتِ عملی سے جاری فرمایا کہ چند ماہ بعد آپ علیل ہوگئے، آخر ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ / ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو رحلت فرماگئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط مزارِ پُرانوار دیوبند میں حضرتِ نانوتویؒ کے قدموں میں ہے۔ نوّر اللہ قبورھم

مسلکِ حقہ کے خلاف عظیم سازش کا دفاع

پس منظر اور مختصر تذکرہ

یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ جب قوم میں سے کسی کے خلاف محاذ بنانا ہو تو اس کے نظریات اور عقائد میں ایسی موشگافیاں کی جائیں جو عام لوگوں کی نظر میں معیوب اور معتوب ہوں اور اس مذموم مقصد کیلئے اکثر اوقات دین، مذہب کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں جتنے فتنے کھڑے ہوئے اُن سب نے دینی لبادہ اوڑھ کر شر و فساد پھیلایا۔ خوارج نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر جلیل القدر صحابۂ کرامؓ کے خلاف جو محاذ قائم کیا تھا اسکی بنیاد بھی ارشادِ قرآنی اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ پر رکھی تھی اور امت کو ایسا بھڑکایا کہ فتنۂ عظیم برپا ہوا جس کے بُرے اثرات آج تک موجود ہیں۔ یہی صورتحال دارالعلوم دیوبند کے خلاف اختیار کی گئی، اگرچہ اس میں دوسرے علمی، دینی مدارس جیسا کہ مدرسہ عالیہ رامپور وغیرہ بھی تھے مگر دارالعلوم دیوبند کی علمی، دینی اور روحانی ترقی نے بہت ہی جلد نہ صرف عالمِ اسلامی بلکہ ایشیا میں ایک عظیم مقام حاصل کر لیا تھا جس کی اس ترقی کو شاید عیسائی حکومت برداشت کر لیتی مگر اس کی روحانی ترقی جس میں مجدّدی جوہر پنہاں تھا نہ حکومتِ وقت برداشت کر سکتی اور نہ ہی وہ افراد اور طبقات جن کا وقار صرف علمی وجاہت کی بنا پر تھا، برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے خلاف ایک ایسی سازش اختیار کی گئی جس کی اساس دینی عقائد خصوصاً سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پر رکھی گئی اور یہ مذموم سعی کی گئی کہ علماء دیوبند جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخ اور بے ادب ہیں۔

چونکہ حرمین میں محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیروکاروں خصوصاً قبیلہ خطفط اور دخنہ نے بہت ظلم کیا تھا اور ۱۲۲۰؁ھ تا ۱۲۳۳؁ھ تیرہ سال لگاتار خونریزی کرتے رہے تھے، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے فرمایا:۔

"جیسا کہ ہمارے زمانہ میں محمد بن عبدالوہاب نجدی کے متبعین سے پیش آیا کہ انہوں نے نجد سے خروج کیا اور حرمِ مکہ اور حرمِ مدینہ پر تسلط جمایا اور اس کے مدّعی رہے کہ حنابلہ کے مذہب کے پابند ہیں لیکن اُن کا اعتقاد یہ تھا کہ مسلمان صرف وہ لوگ ہیں جو ہمارے ہم مشرب ہیں اور جو ہمارے اعتقاد کے مخالف ہیں وہ سب مشرک ہیں، اور اس فاسد عقیدہ کی وجہ سے اہلِ سنت والجماعت کا قتل کر دینا اور ان کے علماءِ حق کو مار ڈالنا مباح سمجھا اور ان کا تسلط قائم رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے غلبہ کو فنا کر دیا اور اُن کے شہروں کو ویران کر دیا اور اسلامی شہروں کو ان کے مقابلہ میں (۱۲۳۳؁ھ میں) کامیابی عطا فرمائی"۔

اور خود نجدیوں میں جو دو قبیلے بہت متشدد تھے آخر ابن سعود کے ہاتھوں وہ خود ہی ختم کر دیئے گئے، جیسا کہ حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں:-

"اور جو فتنہ ابن سعود کے تسلط کے وقت میں غطغط اور دخنہ نے مسلمانوں کو قتل اور ان کے اموال کے لوٹنے کی صورت میں ہویدا کیا تھا اور بالآخر ابن سعود نے تنگ آ کر ان قبیلوں کی قوت کا قلع قمع کیا۔" (مکتوبات ج ۳ ص ۷۹)

اسلئے حجاز میں کسی عالم یا کسی جماعت سے عوام کو متنفر کرنے کے لیے یہی حربہ استعمال کیا جاتا تھا کہ یہ لوگ وہابی ہیں چنانچہ اکابر علماء دیوبند کے خلاف بھی یہی حربہ استعمال کیا گیا اور اس کی تائید کے لیے بریلی کے رئیس اعظم مولانا احمد رضا خان نے حرمین کا سفر کیا جس کا دفاع اللہ تعالےٰ نے حضرت مدنیؒ سے کرایا۔ حضرتِ مدنیؒ کے الفاظ میں اس کا مختصر تذکرہ پیش کیا جاتا ہے:-

مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا فتنہ

۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۴ء کے ابتداء میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز بعد از فراغتِ حج مدینہ منورہ تشریف لائے اور تقریباً پندرہ روز قیام فرمایا، چونکہ موصوف میرے اساتذہ کرام میں سے تھے اس لیے طلباء مدینہ منورہ کا اُن کی طرف بہت ہجوم ہوا اور عموماً علماء مدینہ بھی ان کی زیارت اور دست بوسی کے لیے حاضر ہوتے رہے اور بہت بڑے مجمع نے اوائل کتب احادیث سنا کر مسجد شریف کے اندر بڑے حلقہ میں اجازت کتبِ حدیث وعلوم لی۔ یہ امر متعدد اُن ہندوستانیوں کو نہایت شاق گذرا جو خود یا اُن کے اکابر حضرات علماء دیوبند اور اُن کے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ سے کسی قسم کا خلاف رکھتے تھے، نیز جاہل ہندوستانیوں کو بھی ان کے حسد نے اس پر مجبور کیا۔ ہم پر تو اُن کا داؤ اس لیے اب تک نہ چلا تھا کہ اہل مدینہ اور وہاں کے عمائد وغیرہ سے ہمارے تعلقات قوی ہو گئے تھے، وہ خود یا اُن کے لڑکے اور احباب ہم سے پڑھتے تھے یا دوستی وغیرہ کا تعلق تھا، نیز ہماری کوئی تصنیف بھی جس سے اُن کو غلط افواہ پھیلانے کا موقعہ ملے موجود نہ تھی۔ ہر قسم کی کتب درسیہ اہلسنت والجماعت کی زیرِ تدریس تھیں اس لیے اُن کی غلط بیانیوں کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی تھی، مگر حضرت مولانا مرحوم کی یہ عظمت اور شوکت دیکھ کر ان کے کلیجوں پر سانپ لوٹنے لگا، کتاب "براہین قاطعہ" حضرت مولانا مرحوم کی اہل بدعت کے لیے جس قدر سیف قاطع اور دلوں کو زخمی کرنے والی ہے اُس کو اہل بدعت کا کلیجہ ہی جانتا ہے۔

چونکہ حضرت مولانا مرحوم قافلہ کی واپسی پر مجبور تھے اس لیے پندرہویں دن مع اپنے رفقاء کے واپس ہو گئے مگر مخالفین کے سینوں میں زخم کر گئے۔ حضرت مولانا موصوف مرحوم کی واپسی کے بعد میں نے خواب دیکھا کہ میں مسجد شریف میں بیٹھا ہوا ہوں اور میرے ایک طرف حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز تشریف فرما ہیں اور دوسری طرف دغالباً داہنی جانب) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی کتاب لیے ہوئے

تشریف لائے ہیں، بیداری پر مجھ کو فکر ہوئی کہ کیا بات ہے کہ سرور آقا میری امداد فرما رہے ہیں، دو تین دن کے بعد مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی مدینہ منورہ پہنچے، وہ مکہ معظمہ میں بعد از حج اپنے ایک رسالہ "حسام الحرمین" پر دستخط کرانے کے لیے کچھ ٹھہر گئے تھے، اُن کی آمد پر یہ زمی جماعت (مخالف ہندستانیوں وغیرہ کی) ان کے ارد گرد جمع ہو گئی، اور ہماری بڑھتی ہوئی وجاہت اور رفعت سے جو خطرات ان کو اپنے عقائد اور خیالات کے متعلق اور اپنی اپنی پوزیشنوں کے بارہ میں نظر آ رہے تھے پیش کیا، نیز یہ کہا کہ رسالہ "حسام الحرمین" کے خلاف اگر حسین احمد نے کوشش کی تو کامیابی نہ ہو سکے گی اور یہی عظیم الشان مقصد مولوی احمد رضا خان صاحب کا تھا یعنی یہ کہ اس رسالہ کی تصدیق علماء مدینہ کر دیں، اس لیے مشورہ ہوا کہ بڑے بڑے حکام سیاسی اور مذہبی سے ملاقات اور تعارف کرایا جائے اور ان کی خدمات میں نذرانے پیش کیے جائیں، وسائط مہیا کیے جائیں، متعدد رسائل مولوی صاحب موصوف کے پیش کر کے ان کی علمیت سے مرعوب کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ اس فیض آبادی خاندان کو شہر بدر اور جلاوطن کر دیا جائے، ایسا پہلے بہت مرتبہ ہو چکا تھا کہ کسی آفاقی عالم کا شہرہ علمی ہوا اور اس سے علماء یا اکابر مدینہ منورہ کو نفسانی یا واقعی خلاف پیش آیا تو اس کو بذریعہ حکومت جلاوطن کرا دیا۔ چنانچہ علامہ شیخ محمود شنقیطی اور حجری وغیرہ سے ایسا معاملہ پیش آیا تھا کہ نفسانی اغراض مذہبی رنگ میں ظاہر ہوتی تھیں جیسا کہ عموماً دیکھا جا رہا ہے، چنانچہ اس پر عملدرآمد شروع کیا گیا اور بہت بڑی تعداد نقود کی خرچ کی گئی، دوڑ دھوپ شروع ہو گئی اور سازشوں کا جال پوری طرح بچھا دیا گیا۔ ہم بالکل بے خبر تھے کہ خبر پہنچی کہ کسی رسالہ پر دستخط لیے جا رہے ہیں اور ہمارے اور اساتذۂ کرام کے متعلق وہابیت کا ہر بااثر شخص سے پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ چونکہ سلطان عبد المجید خان مرحوم کے اوائل زمانۂ حکومت میں نجدیوں کا حجاز پر غلبہ ہو چکا تھا اور انہوں نے دس برس مکہ معظمہ میں اور تین برس اخیر کے مدینہ منورہ میں حکومت کی تھی، یہ لوگ محمد بن عبد الوہاب نجدی کے پیرو تھے اور اپنے عقائد و اعمال میں نہایت سخت غالی تھے، انہوں نے اہالی حرمین پر بہت زیادہ تشددات کیے تھے اور اپنے مخالف عقائد و اعمال والوں کو بہت زیادہ ستایا تھا اس لیے اہل حرمین کو ان سے بہت زیادہ بغض اور تنفر تھا۔ بالآخر سلطان عبد المجید خان مرحوم نے خدیوی محمد علی پاشا مرحوم والی مصر سے بوقت صلح شرط کی کہ وہ اہل نجد کو حجاز سے نکالے، چنانچہ خدیوی مرحوم نے اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کو جرار فوج کے ساتھ بھیجا اور اس نے نجدیوں کے قبضہ سے حجاز کو واگذاشت کیا، اس زمانہ سے حجاز میں یہ طریقہ جاری ہو گیا تھا کہ جس شخص سے تنفر پھیلانا منظور ہو اُس کو وہابیت کی طرف

نسبت کر دیا جائے، اہلِ حجاز کو وہابیت سے اس قدر نفرت مظالم مذکورہ کی وجہ سے ہو گئی تھی کہ عیسائیت اور یہودیت وغیرہ سے بھی اتنی نفرت نہ تھی۔ یہی طریقہ انگریزی حکومت نے بھی ہندوستان میں اپنے مخالفین کے ساتھ جاری کیا۔

بڑی مشکلوں سے رسالہ "حسام الحرمین" بعض اُن شخصوں کے پاس سے جن کے پاس تصدیق کے لیے گیا ہوا تھا دیکھنے کو مل گیا جس پر ہم نے فوراً اُس کی غلط بیانی اور افترا پردازی کا پول کھولنے کا تہیہ کر لیا۔ اور مولوی رضا خاں صاحب اور ان کے ہمنوا یان مجاورینِ اہلِ ہند (مجاور عرفِ اہلِ مدینہ میں اُن غیر ملکوں کے باشندوں کو کہتے ہیں جو کہ مدینہ میں نہ پیدا ہوئے ہوں اور باہر سے آکر اقامت پذیر ہو گئے ہوں) نے اِس رسالہ کو (جو کہ باسم حسام الحرمین علیٰ عنق اھل الکفر والمین کے نام سے موسوم کر کے بعد میں شائع کیا گیا) تصدیق اور مہر و دستخط کے لیے وہاں کے اہلِ علم اور مذہبی رؤسا پر پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ ان عنوانات سے ہر ناواقف مسلمان پورے غیظ و غضب میں آ جائے گا اور جو کچھ بھی اس سے ہو سکے گا کر گذرے گا اور جہاں تک ممکن ہو گا بُرا بھلا لکھ دے گا۔ چنانچہ یہی ہوا، بعض بیوقوفوں نے تو غیظ و غضب میں آ کر بلا شرط و استثنا تکفیر و تصدیق کر دی اور اکثر سمجھدار اور محتاط لوگوں نے شرط لگائی کہ اگر واقع میں ان اشخاص کے ایسے ہی اقوال و عقائد ہیں تو اُن کا یہی حکم ہے مگر حرمین شریفین کے جلیل القدر علماء کرام نے "حسام الحرمین" کی تصدیق سے انکار کیا۔ مکہ مکرمہ کے جن جلیل القدر علماء کرام نے انکار کیا وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) مولانا الشیخ عبد اللہ مکی شافعی (۲) مولانا الشیخ شعیب مالکی (۳) مولانا الشیخ احمد (۴) مولانا شیخ عبد الجلیل آفندی حنفی (۵) الشیخ احمد رشید مکی حنفی (۶) شیخ محب الدین حنفی مہاجر مکی (۷) الشیخ محمد صدیق افغانی مہاجر مکی۔

علماء مدینہ منورہ میں سے جن علماء کرام نے اس کتاب پر دستخط کرنے سے انکار فرما دیا تھا اُن کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:۔

(۱) حضرت مولانا شیخ لیسین مصری شافعی (۲) مولانا شیخ عبد اللہ نابلسی (۳) مولانا شیخ عبد الحکیم بخاری حنفی (۴) الشیخ سید ملا سنقر بخاری (۵) مولانا شیخ سید محمد امین رضوان شافعی (۶) مولانا شیخ آفندی ماموں بری (۷) مولانا شیخ فاتح طاہری مالکی (۸) صدر محکمہ عدل شیخ آفندی ترکی۔

(حیات و کارنامے ص ۱۴۶)

چونکہ یہ کارروائی نہایت جدوجہد اور اختفاء کے ساتھ ہو رہی تھی ہم کو صرف اس قدر معلوم ہو سکا تھا کہ یہ اشخاص علماء اور مفاتی اور اہلِ اثر کے پاس دوڑ دھوپ کر رہے ہیں مگر کس مقصد کیلئے یہ کارروائی ہو رہی ہے بالکل پتہ نہیں چلتا تھا اور صرف یہ خیال تھا کہ چونکہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم ابھی تشریف لائے تھے اور اُن سے یہاں کے اعاظم علماء اور اکثر طلباء ملے تھے اور سندِ حدیث اور اجازت وغیرہ حاصل کی تھی، اہلِ علم میں اُن کی بہت مقبولیت ہوئی تھی اِس لیے حاسدوں اور دشمنوں کو ان کے خلاف اور اسی ذریعہ سے ہمارے خلاف پروپیگنڈا کرنا منظور ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ اگر کوئی بات ہمارے یا ہمارے اکابر کے خلاف ہوگی تو کم از کم ہم سے پوچھا تو جائے گا۔ اسی حالت میں کئی روز گذر گئے، پھر تجسس پر معلوم ہوا کہ کسی تحریر پر تصدیق کرائی جا رہی ہے، تو اس کی تلاش ہوئی کہ وہ تحریر کیا ہے؟ بالآخر شیخ عبد القادر شلبی طرابلسی کے پاس جب وہ تحریر پہنچی تو انھوں نے مجھ کو بلا بھیجا اور یہ رسالہ دکھلایا، میں نے اُن کو حقیقۃ الامر سے مطلع کیا اور پھر میں امین الفتویٰ شیخ عمر حماد مرحوم کے پاس گیا اور "تحذیر الناس" اور "فتاویٰ رشیدیہ" وغیرہ کی عبارتیں دکھلائیں تو انہوں نے بہت افسوس کیا اور مفتی احناف افندی تاج الدین الیاس مرحوم کے پاس پہنچے اور اُن سے تمام حقیقت بیان کی اُنھوں نے بھی افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم کو تو حقیقت کا علم نہ تھا تو نے ہم کو پہلے کیوں نہ مطلع کیا؟ چونکہ میرے تعلقات اُن لوگوں سے پہلے سے بہت گہرے تھے، مفتی صاحب موصوف کا نواسہ میرے پاس پڑھتا تھا نیز دوسرے اہلِ مدینہ نوجوان بڑے خاندان والے یا احباب تھے اس لیے میں نے اُن سے کہا کہ مجھ کو اعتماد تھا کہ اگر میرے مشائخ اور اساتذہ یا میرے متعلق آپ کے پاس کسی قسم کی کوئی خبر پہنچے گی تو آپ ضرور بالضرور مجھ سے اس کو دریافت کریں گے، انہوں نے جواب دیا کہ ہم کو بالکل علم نہیں کہ یہ حضرات تیرے اساتذہ اور مشائخ ہیں، بہر حال اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ہم نے تصدیق میں کافی احتیاط کر لی ہے اور لکھ دیا ہے کہ اگر واقع میں ان اشخاص کے یہی اقوال اور عقائد ہیں اور رجوع ثابت نہیں ہے تو مؤلف رسالہ کا قول صحیح ہے۔ اگر پہلے سے اس کا علم ہوتا تو ہم ہرگز اتنی بھی تصدیق نہ کرتے۔ اسی طرح اور دوسرے اشخاص نے جواب دیا۔ اِسی اثناء میں یہ بھی پیش آیا کہ افندی سید احمد برزنجی مرحوم مفتی شافعیہ کے پاس مولوی احمد رضا خان صاحب پہنچے اور رسالہ مذکورہ کے ساتھ "رسالہ علم غیب" بھی پیش کیا، مفتی صاحب نے بالشروط پہلے رسالہ کی تصدیق تو کر دی تھی مگر مسئلہ علمِ غیب میں مخالفت کی، آخر میں کچھ بحث ہوئی، مفتی صاحب ناراض ہو گئے اور خفا ہو کر کہا کہ میری تصدیق واپس بھیج دو، مگر مولوی

احمد رضا خاں صاحب چلے آئے، اس کے بعد مفتی صاحب نے رسالہ غایۃ المامول فی علم غیب الرسول (علیہ السلام) لکھا جو کہ ہندوستان میں چھپ کر شائع ہوا تھا، مولانا منور علی صاحب مرحوم رامپوری کی سعی و کوشش جو کہ اس زمانہ میں وہاں موجود تھے اس کی اشاعت میں زیادہ کارگر ہوئی۔

اس فتنہ پر یہ کوشش بڑے زور سے عمل میں لائی گئی تھی کہ انہیں حضرات کے تلامیذ اور متبعین حسین احمد اور اس کے برادران وغیرہ ہیں، لوگوں نے کہا کہ آج تک ہم نے کوئی بات ان سے خلافِ طریقہ اہلِ سنت والجماعت نہیں دیکھی، تو یہ جواب دیا کہ وہ چھپاتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ سب لوگوں کو گمراہ کر دیں گے، اس پروپیگنڈہ کو سید یٰسین مرحوم کابلی کے ذریعہ سے، جو کہ عثمان پاشا والئی مدینہ کے یہاں رسوخِ کامل رکھتا تھا، عثمان پاشا تک پہنچایا گیا، مگر پول کھل جانے اور عنایتِ ایزدی کے شامل ہو جانے اور جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات نے ان کو ناکام کیا اور بحمداللہ ہمارا کوئی بال بیکا نہ کر سکے۔ کچھ عرصہ تک ہندوستانی مجاورین اور بعض اُن کے ہمنواؤں میں کھچڑیاں پکتی رہیں، مخالفتیں بھی لوگ کرتے رہے مگر میرا حلقۂ درس بڑھتا ہی رہا، قبولیت عامہ اہلِ مدینہ اور اہلِ علم و فضل میں روز افزوں ہوتی رہی اور مخالف اشخاص کو ناکامی کے ساتھ ذلت کا بھی سامنا ہوتا رہا، اگرچہ ہم نے کبھی کسی سے انتقام اور توہین کا معاملہ نہیں کیا مگر منتقمِ حقیقی کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، دو تین ہی سال میں تمام مخالفین کا قلع قمع ہو گیا۔ وللہ الحمد والمنہ (نقشِ حیات جلد اول)

اگرچہ حضرت شیخ الہند ۱۳۳۳ھ میں اپنی انقلابی دعوت کو اُس وقت کی ترکی حکومت کے سامنے پیش کرنے اور اُن سے امداد طلب کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے جبکہ رئیسِ بریلی مولوی احمد رضا خاں صاحب اس سے کچھ پہلے ۱۳۲۴ھ میں یہ فتویٰ حاصل کرنے کے لیے حرمین پہنچے تھے۔ مگر معمولی غور و فکر سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ اس فتویٰ کے پس منظر میں حضرتؒ کی اس انقلابی تحریک کو اس طرح ناکام کرنا تھا کہ آپ کے حجاز آنے سے پہلے ہی ترکی حکومت کو بدظن کر کے حضرتِ مدنیؒ کو حجاز سے نکال دیا جائے، اس طرح انگریزی حکومت کو بھی اِدھر سے بے فکری ہو جائے۔ اس بات کی دلیل دینے کی کوئی ضرورت نہیں کہ انگریزی حکومت نے دارالعلوم دیوبند پر کڑی نظر رکھی ہوئی تھی اور وہ مجاہدِ جلیل حضرت شیخ الہندؒ کی تمام کارروائیوں اور ارادوں سے اپنے خفیہ مخبروں کے ذریعہ سے پوری طرح واقف تھی، حضرتِ مدنیؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

"جب ہم مالٹا پہنچے اور ہم سے بیانات لیے گئے تو ہمارے سامنے ایک بہت بڑا رجسٹر پیش کیا گیا جس میں بہت کچھ لکھا ہوا تھا یعنی حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کی ساری رُوداد تھی۔"

ان ہی افتراءات کا مدلل جواب دیتے ہوئے حضرت مدنیؒ نے ایک کتاب بنام "الشہاب الثاقب علی المسترق الکاذب" لکھی جو اُسی وقت طبع ہوگئی، اس کتاب میں اُن عبارات کے جوابات کے علاوہ آپ نے اہلِ بدعت کے اس مشہور مشاغبہ کا جواب بھی دیا ہے جو اس وقت بھی کیا جاتا ہے اور آج تک جاری ہے اور بفضلہٖ تعالیٰ اس کا کوئی اثر نہیں مگر اُن کا طریق کار وہی ہے کہ دیوبندی لوگ وہابی ہیں، اِن کے عقائد وہی ہیں جو کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور اُس کے پیروکاروں کے ہیں، حضرت مدنیؒ نے مختصر طریقہ پر تقابل فرمایا، جیسا کہ:۔

یہ کہا گیا کہ دیوبندی علماء انبیاء علیہم السلام کی حیاتِ جسمانی اور علاقہ بین الروح والجسم کے بعد وفات ظاہری کے منکر ہیں، حالانکہ یہ صرف اس کے قائل ہی نہیں بلکہ مثبت بھی ہیں اور بڑے زور شور سے اس پر دلائل قائم کرتے ہوئے متعدد رسائل اس بارہ میں تصنیف فرما کر شائع فرما چکے ہیں، رسالہ "آبِ حیات" مؤلفہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ صرف اسی موضوع پر مدلل کتاب ہے جو آپ نے ۱۲۹۴ھ میں اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ نور اللہ مرقدہٗ کے حکم سے سفرِ حرمین کے دوران میں مرتب فرمائی، آپ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"دل میں یہ ٹھان کر قلم اٹھایا اور ٹھہرائی کہ شروع تو خدا کے گھر سے کیجئے اور بن پڑے تو بوسہ گاہ عالم سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر اختتام کو پہنچا دیجئے تا کہ ابتدا اور انتہا، دونوں مبارک ہوں ورنہ جس قدر بن پڑے غنیمت ہے کیونکہ اس وسیلہ سے اس ظلوم و جہول کو امیدِ صحت اور حُسنِ ظن قبول ہے۔" (رحمت ص۱۳۱)

تعجب ہے کہ فاضل بریلوی نے حضرت "نانوتویؒ" کی مرتبہ اور مؤلفہ کتاب "تحذیر الناس" جو کہ آپ نے ۱۲۹۰ھ میں مرتب فرمائی تھی مطالعہ فرمائی مگر عقیدہ حیات النبی پر آپ کی کتاب "آبِ حیات" کے مطالعہ کا ذکر نہیں کیا حالانکہ اس وقت آپ کی عمر ۲۵ سال تھی۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔ (رحمت ص۱۳۱ بحوالہ الجمعیۃ)

اسی طرح کے دوسرے مسائل "سفرِ مدینہ منورہ برائے زیارت سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم، توسل بالانبیاء علیہم السلام والاولیاء بعد الوفات" وغیرہ وہ عقائد جو کہ علماء دیوبند کے ہاں بنیادی عقائد ہیں اور وہابیوں کے خلاف ہیں، ان سب عقائد کو تفصیل کے ساتھ اپنی اسی کتاب میں درج فرما کر شائع فرما دی جس سے وہ پروپیگنڈہ بالکل زائل ہوگیا، اللہ تعالیٰ نے حضرتِ مدنی نور اللہ مرقدہٗ کو اپنی حکمت اور رحمت کے ساتھ مدینہ منورہ پہلے پہنچا دیا تھا۔ فللہ الحمد

ضروری فائدہ:۔ پاکستان میں بعض لوگوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ حضرتِ مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے بعد

میں ان عقائد میں ترمیم فرمادی یا رجوع کرلیا تھا، حالانکہ یہ بات بالکل غلط اور اہلِ بدعت کی طرح افتراء ہے، حضرت مدنیؒ کے وہی عقائد تھے جو تمام اکابر کے تھے جن کا ذکر "المہند" میں ہے۔ ملک کے نامور صاحبِ قلم عالمِ دین مولانا ریاض احمد اشرفی مرحوم نے اس افتراء کے بارہ میں حضرت مدنیؒ کی خدمت میں یہ عریضہ ارسال کیا تھا:۔

بخدمت شیخ الحدیث مولانا سید حسین احمد مدنی مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

"کیا کتاب الشہاب الثاقب علی المسترق الکاذب وہابیوں اور بریلویوں کے خلاف آپ ہی کی تصنیف ہے؟ کیا آپ اب بھی وہی مسلک رکھتے ہیں یا اس سے رجوع فرمالیا ہے؟"

اس کا جواب حضرت مدنیؒ نے یہ فرمایا:۔

محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

امورِ مسئولہ عنہا کا جواب ذیل ہے:۔

"بے شک کتاب "الشہاب الثاقب علی المسترق الکاذب" میری ہی پہلی تصنیف ہے جو کہ مولوی احمد رضا خان بریلوی کے رد "حسام الحرمین" کے خلاف میں لکھی گئی تھی، وہابیوں کا تذکرہ اس میں ضمناً آیا ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ ہمارے اسلاف افراط و تفریط دونوں سے علیحدہ ہیں، ان کا مسلک معتدل اور بین بین ہے اور اہلِ السنۃ والجماعۃ اسلاف کرام کے سچے متبع ہیں۔

اب بھی میرا وہی مسلک ہے جو اس کتاب میں اظہار کیا گیا ہے اور یہی مسلک میرے اسلاف کرام کا ہے۔"

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہ،
دیوبند ۴ ربیع الاول سنہ ۱۳۷۰ھ

(از مکتوبات جلد ۲ ص ۲۹۷ بنام حافظ ریاض احمد قاسمی صاحب)

آپ ان ہی مشاغل میں مصروفِ عمل تھے کہ حضرت شیخ الہندؒ اپنی تحریکِ آزادی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حجازِ مقدس پہنچ گئے جس کا ذکر آئندہ اوراق میں آرہا ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی روانگیٔ حجاز کے وجوہ

● پہلی وجہ تو یہ تھی کہ حجاز پر اُس وقت ترکی کی حکومت تھی اور ترکی حکومت دارالعلوم دیوبند کے دینی، علمی بلکہ روحانی کمالات سے پوری طرح واقف تھی، ترکی حکومت کو اس امر کا اعتراف تھا کہ ترکی پر عیسائیوں کی ابتدائی یلغار کے دوران دارالعلوم نے مالی اور اخلاقی طور پر جو ترکی حکومت کی امداد کی ہے وہ بے نظیر ہے جیسا کہ ترکی حکومت نے بواسطہ سفیرِ دولتِ عثمانیہ وہ رومال دارالعلوم دیوبند کو مقدس تحفہ کے طور پر عطا کیا تھا جس میں رحمتِ دوعالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا جُبّہ مبارک لپیٹا ہوا تھا۔ ماہنامہ "القاسم" رقمطراز ہے کہ:۔

"حضرت سفیر دولتِ عثمانیہ جب دیوبند اس بابرکت وعظمت ہدیۂ سلطانی کو لے کر تشریف لائے تھے تو فرماتے تھے کہ یہ مبارک غلاف سلطان المعظم کے نزدیک بہت ہی بیش قیمت ہدیہ ہے جو سلطان المعظم نے آپ کے دارالعلوم کے لیے عطا فرمایا ہے اور آپ انشاء اللہ اس کی برکات کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ خرقہ مبارک کا یہ غلاف ایک نہایت مہین جالی دار کپڑے کا بنا ہوا ہے، ہر سال خرقۂ مبارک پر سے بدلا جاتا ہے، اس میں سے خرقہ مبارک نہایت صاف طور سے نظر آتا ہے، سال بھر میں ایک مرتبہ حضرت سلطان المعظم مع اراکینِ دولت کے نہایت اہتمام وعقیدت، ادب واحترام کے ساتھ اس خرقہ مبارک کی زیارت فرماتے ہیں اور مستعمل غلاف اس کو عطا فرتے ہیں جس کو اس کا اہل سمجھتے ہیں۔"

(القاسم دارالعلوم نمبر ص۷ بابت محرم الحرام ۱۳۴۷ھ)

● دوسری وجہ: جہادِ شاملی کے امیر حضرت حاجی امداد اللہ نور اللہ مرقدہٗ کی روحانی برکات سے بھی ترکی منوّر ہو رہا تھا، طریقہ صابریہ چشتیہ کی اشاعت آپ کی وجہ سے ہوئی جو بفضلہٖ تعالیٰ آج تک قائم اور جاری ہے۔

● تیسری وجہ: حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی تردیدِ عیسائیت کے سلسلے میں ترکی میں آمد ورفت بلکہ ترکی کی حکومت کے ہاں عزّت واحترام دارالعلوم دیوبند کے علمی، دینی اور مجاہدانہ حالات کا قوی ذریعہ اور سبب تھا۔

ان وجوہ کے علاوہ ترکی سے اسلحہ اور دوسری ضروریاتِ جنگ کا حاصل کرنا آسان تھا کہ دوسرے ممالک تو خود بے دست و پا تھے، مگر ایسے خطرناک وقت میں اتنی بڑی حکومت سے رابطہ قائم کرنا اور اس کو امداد پر آمادہ کرنے کے لیے ایک مستحکم، باوفا، جان نثار واسطہ کی ضرورت تھی اور وہ صرف حسین احمد ہی ہو سکتا تھا، اس لیے حضرت شیخ الہندؒ نے سفرِ حجاز اختیار فرمایا، جیسا کہ حضرتِ مدنیؒ نے فرمایا:۔

"نیز حضرت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تواریخ سلاطینِ ماضیہ خصوصاً شہنشاہانِ ہند اور ان کے واقعات و انتظامات پر نہایت زیادہ عبور رکھتے تھے۔ ہندوستان کی اقتصادی، معاشی، سیاسی، تجارتی، صنعتی و تعلیمی، انتظامی، جنگی و صحتی وغیرہ معلومات بھی اس قدر تھیں کہ بڑے سے بڑا ڈاکٹر اور اکانومک پروفیسر اُن تک نہیں پہنچ سکتا تھا، اخبار بینی اور واقعاتِ عالم پر اطلاع کا بہت شوق تھا، بہرحال اُن کو انگریزی حکومت اور ہندوستان کے مندرجہ ذیل واقعات نے مجبور کیا کہ اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر انگریزی استبداد اور مظالم کا مقابلہ کیا جائے اور اس کو جڑ سے اکھاڑ دینے کی پوری جد و جہد عمل میں لائی جائے اور کسی قسم کے خطرہ سے بھی ڈرنے کو راہ نہ دی جائے، اگرچہ ان اسباب کی تفصیل بہت وسیع ہے جس کو ہم انشاءاللہ مستقل تالیف میں دکھلائیں گے۔"

حضرت شیخ الہندؒ کا یہ سفر ایک عظیم انقلابی منصوبہ کی تکمیل کے لیے تھا جس کے لیے ترکی حکومت کا تعاون ضروری تھا، مگر تقدیرِ الٰہی سے یہودیوں اور عیسائیوں نے اس خلافت ہی کو ختم کر دیا جس کے لیے ترکوں پر کفر کا فتویٰ ہندوستان کے بعض "علماء" سے حاصل کیا گیا اور اس کی تصویب کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کو استعمال کرنا چاہا۔ حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں کہ "حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف انکار کیا بلکہ بھرے مجمع میں پھینک کر لکھنے والوں کو بہت برے الفاظ کہے۔" (نقشِ حیات ج ۲ ص۲۱۲)

چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے اس پروگرام میں ہندوستان کے بعض مجاہد علماءِ کرام اور غیر مسلم انقلابیوں کو بھی شریک فرما کر ان کو آمادہ فرما لیا، حضرت مدنیؒ تحریر فرمایا۔

"حضرت شیخ الہندؒ نے ایک مستقل مکان اپنے مکان کے قریب کرایہ پر لے رکھا تھا جس کو کوٹھی کے نام سے مشہور کیا جاتا، اس میں حضرتؒ کے غیر مسلم ہم خیال دوست اور رفقائے انقلاب ٹھہرا کرتے تھے، ان کو نہایت رازداری کے ساتھ خدام خاص ٹھہراتے تھے اور ان کے کھانے پینے کے انتظامات کرتے رہتے تھے، اکثر

تنہائی کے اوقات میں یارات کو ان سے حضرت شیخ الہندؒ کی باتیں ہوتی رہتیں، یہ لوگ سکھ یا بنگالی، ہندو انقلابی (بنگال پارٹیشن والے) ہوتے تھے، چونکہ رازداری کا بہت زیادہ خیال رکھنا پڑتا تھا اس لیے ان کے نام اور پتے معلوم نہیں ہوسکے اور نہ حضرتؒ سے پوچھنے کی نوبت آئی، علاوہ مذکورہ بالا حضرات کے غیر مشہور حضرات اس تحریک کے ہم خیال اور مشنِ آزادی کے ممبر بے شمار تھے جن کی تفصیل تطویل چاہتی ہے اور نہ ان کے ذکر کرنے کی ضرورت ہے۔ پانچ برانچیں علاوہ مرکز دیوبند کے ہمارے علم میں آسکی ہیں (۱) دین پور شریف، (۲) امروٹ شریف (۳) کراچی کھڈہ (۴) دہلی (۵) چکوال ــــ ہر جگہ کام کرنے والے حضرات اپنی تیز تر مساعی اور انتہائی اخلاص کی بناء پر صدر کہلانے کے مستحق ہوتے تھے ورنہ باقاعدہ تقرر صدر اور سیکرٹری وغیرہ کا مقتضاء وقت اور احوالِ گردوپیش کی بناء پر ناممکن تھا اور نہ وقوع میں آیا۔ ہم نے جس جگہ پر بھی صدر یا ناظم وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں ان میں عملی استحقاق موجود ہے رسمی کاروائی مراد نہیں" ــــ (نقشِ حیات جلد ۲ ص ۲۰۸، ۲۰۹)

ف :۔ اندرونِ ملک کے ان مراکز کے علاوہ بیرونِ ملک ٹوکیو، چین، پیرس اور واشنگٹن میں بھی ایسے ہی مراکز قائم کر کے باقاعدہ اخبارات وجرائد شائع ہوتے تھے۔ ان سب امور کے نگرانِ اعلیٰ حضرت شیخ الہندؒ ہی تھے، اس ساری جدوجہد کا خلاصہ جناب پروفیسر کرم حیدری مرحوم کے مندرجہ ذیل مضمون سے ظاہر ہے :۔

ــــ "۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد بیسویں صدی کے آغاز میں تحریکِ آزادی کیلئے ایک تنظیم قائم ہوئی جسکے علمبردار علمائے دیوبند کے نامی گرامی سرخیل مولانا محمود الحسن دیوبندی تھے۔ اس تنظیم کا نام "غدر پارٹی" تھا، اور اس نام کے ذریعے گویا یہ اعلان کرنا مقصود تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اگر غدر تھا تو یہ "غدر" ہمارے لیے باعثِ فخر تھا۔ غدر پارٹی میں کئی نامی گرامی علماء شامل تھے جن میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مقبول الرحمٰن کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس پارٹی میں بعض بڑے بڑے ہندو سیاسی لیڈر بھی شامل تھے جن میں ایم کے گاندھی، موتی لال نہرو، لالہ جیت رائے، بابو راجندر پرشاد اور مسٹر ہر دیال آگے چل کر تاریخی شخصیتیں بن گئے لیکن پارٹی کی سیادت اور پالیسی مسلمان علماء کے ہاتھ میں تھی اور یہ بڑے بڑے ہندو لیڈر محض ورکروں کی حیثیت رکھتے تھے۔

پارٹی کا اسلامی مزاج اس بات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس نے اپنی نشر واشاعت کیلئے بیرونی ممالک میں جو اخبارات اور جرائد جاری کیے وہ خالصتاً اسلامی انداز کے تھے۔ مثلاً ٹوکیو سے ایک رسالہ جاری کیا گیا تھا جو انگریزی اور جاپانی ہر دو زبانوں میں شائع ہوتا تھا اس کا نام "اسلامک فریٹرنٹی سوسائٹی" تھا اور یہ اسی نام کی سوسائٹی نے

جس کے بانی پروفیسر برکت اللہ تھے جاری کیا تھا۔ ایک جریدہ چین سے بھی نکالا جاتا تھا جس کا نام "الیقین" تھا، پیرس میں غدر پارٹی کے زیرِ اہتمام ایک انجمن قائم کی گئی تھی جس نے وہاں سے "انقلاب" نامی اخبار جاری کیا۔ اسی طرح واشنگٹن سے بھی دو اخبار نکالے گئے جن کے نام "غدر" اور "انقلاب" تھے۔

اسی پارٹی نے ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء کا دن بھی مقرر کر دیا تھا کہ اس دن عملی طور پر بغاوت شروع کر دی جائے گی لیکن جنگِ عظیم کی وجہ سے حکومتِ ہند بہت چوکس تھی اور بغاوت کی کامیابی ممکن نہ تھی، چنانچہ تحریک کے بڑے بڑے لیڈروں کو جو ملک سے باہر گئے تھے دوسری حکومتوں کی وساطت سے گرفتار کر لیا گیا ان میں کئی لیڈروں کو قید و بند کی سخت سزائیں دی گئیں اور انہیں بحیرۂ روم کے جزیرۂ مالٹا میں محبوس کر دیا گیا جہاں سے وہ طویل عرصہ تک سخت سزائیں کاٹنے کے بعد رہا ہوئے"۔[1]

دارالعلوم دیوبند اور مذکورۃ الصدر مراکز کے علاوہ قبائل وغیرہ میں باقاعدہ انقلابی کاروائی ہوتی تھی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اگرچہ یہ ساری کاروائی راز میں رکھنے کی کوشش کی گئی مگر حکومت کو مطلع کر دیا گیا کہ اگر شیخ الہندؒ کو اسی طرح آزاد چھوڑا گیا تو بہت جلد حکومت کے خلاف ایسا انقلاب آجائے گا جو بڑا خطرناک ہوگا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ نے تحریک کو باقاعدہ رکھنے اور کامیاب بنانے کے لیے حجاز جانے کا فیصلہ فرما لیا تاکہ ترکی حکومت کی وساطت سے تحریک کو آگے بڑھایا جا سکے۔ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے آپ کے سفرِ حجاز کی اجمالی کیفیت یوں بیان فرمائی ہے:۔

حضرت شیخ الہندؒ کا سفرِ حجاز

حضرت شیخ الہندؒ کے پاس برابر کیفیاتِ جہاد کی خبریں آتی رہتی تھیں، ابتدائی کمزوریوں میں کارکنانِ مرکز کا پیغام آیا کہ ہم رسد اور کارتوسوں کے ختم ہو جانے کی وجہ سے سخت مجبور ہیں، جب تک ان دونوں کا انتظام نہ ہو جہادِ حریت جاری نہیں رہ سکتا، بحمد اللہ ہمارے پاس بہادر آدمیوں کی کمی نہیں ہے اسلحہ اور رسد کے بغیر ہم بالکل بے دست و پا ہیں، ساتھ کی لائی ہوئی روٹیوں کے ختم ہو جانے پر مجاہد کو اپنے گاؤں جانا پڑتا ہے اور مورچہ خالی ہو جاتا ہے اور کارتوسیں ختم ہو جانے پر مجاہد بے ہتھیار ہو جاتا ہے، اگر کارتوس اور رسد کافی تعداد میں ہو تو توپوں، مشین گنوں اور ٹینکوں وغیرہ کا ہم بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں آپ جلد از جلد کسی حکومت کو ہماری پشت پناہی اور امداد کے لیے تیار کیجئے۔ چنانچہ اس امر کی بنا پر حضرت شیخ الہندؒ کا ارادہ بدلا اور مولانا عبید اللہ صاحب کو کابل اور خود کو استنبول پہنچانا ضروری

---

[1] (محمد علی جناح، سیرت و کردار از پروفیسر کرم حیدری مرحوم ص ۱۸)

قرار دیا۔ مولانا عبید اللہ صاحب کے کابل جانے کی تفصیل ہم ان کی ذاتی ڈائری سے ناظرین کے سامنے پیش کر چکے ہیں، اور حضرت شیخ الہندؒ کے حجاز جانے کی تاریخی تفصیل ہم سفرنامہ مالٹا میں لکھ چکے ہیں اُن کے اعادہ کی ضرورت نہیں، ہاں سیاسی کارکنوں کو بتقاضائے وقت اس میں چھپایا اور ذکر نہیں کیا اور بعض امور کے اظہار سے احتراز کیا تھا کیونکہ ماحول اس وقت میں اسی کو چاہتا تھا۔ اب چونکہ موانع زائل ہو گئے ہیں اس لیے صرف ان ہی کو ناظرین کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، چونکہ اس وقت سرحد کے واقعات ہو رہے تھے، حکومتِ ہند گھبرائی ہوئی تھی اور وہ معمولی شبہ پر بھی گرفتار کر کے نظر بند کر رہی تھی، حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق سی آئی ڈی کی اطلاعات خود ہندوستان میں اور سرحد یاغستان میں بہت خطرناک تھیں اس لیے بڑی نگرانی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اسی وجہ سے زور دیا تھا کہ آپ جلد از جلد انگریزی عملداری سے نکل جائیں، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حجاز جانے کا ارادہ کر لیا، پہلے سے کوئی تذکرہ نہ تھا فوراً روانہ ہو گئے، اب حکومت کا شبہ اور قوی ہو گیا کہ چونکہ ترکی حکومت جنگ کر رہی ہے، حضرت شیخ الہندؒ وہاں جا کر ساز باز کر لیں گے، اس لیے اُن کو روکنا اور گرفتار کر لینا چاہیئے مگر وہ ملک کے اندرونی ہیجان اور گڑبڑ سے اُس زمانہ میں بہت بچتی تھی اس لیے احکام اُن کی گرفتاری کے جاری کیے گئے مگر اس طرح کہ ہیجان کی نوبت نہ آئے۔

حضرتؒ کے سفر کی خبر معمولی نہ تھی ہر جگہ تار چلے گئے تھے، ہر جنکشن پر آدمیوں کا جمگھٹا ہو جاتا تھا اسی لیے راستہ میں کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی، بمبئی پہنچے تو وہاں بھی پورا انتظام تھا لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا، گرفتاری کے لیے گورنمنٹ بمبئی کے نام گورنر یوپی کا تار پہنچا تو جہاز روانہ ہو چکا تھا، پھر گورنر یوپی نے بواسطہ مرکزی حکومت عدن کے گورنر کو تار دیا کہ مولانا محمود الحسن کو جہاز سے اتار دو، مگر یہاں بھی لوگ ڈاکٹر انصاری صاحب کے لگے ہوئے تھے اُنہوں نے تار میں اس قدر تاخیر کر دی کہ جہاز عدن سے روانہ ہو گیا، پھر تار جدہ میں جہاز کے کپتان کو دیا گیا کہ ان کو جہاز میں گرفتار کر لو، اُترنے نہ دو، مگر اُس وقت گورنر حجاز کا انتظام یہ تھا کہ جدہ سے پہلے حجاج کو "جزیرہ سعد" میں اتار کر مکہ معظمہ پہنچایا جائے، اس لیے وہ تار کپتان کو اُس وقت ملا جبکہ تمام حجاج "جزیرہ سعد" میں اُتر چکے تھے، البتہ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ متعدد سی آئی ڈی بمبئی بلکہ پہلے سے کر دیئے گئے تھے تاکہ وہ تمام حرکات و سکنات کی نگرانی رکھیں اور نوٹ کرتے رہیں مگر جزیرہ سعد میں اُترتے ہی بعض لوگوں نے ترکی پولیس کو اطلاع کر دی کہ فلاں فلاں شخص انگریزوں کے سی آئی ڈی ہیں، اُن کو ترکی پولیس نے گرفتار کر لیا اور اپنی حفاظت میں حج کرا کر ہندوستان واپس کر دیا تاہم کچھ مخفی لوگ باقی رہ گئے۔ بہرحال گرفتاری

کی کوششیں پیچھے تھیں اور حضرت شیخ الہندؒ اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے آگے اس طرح محفوظ ہو کر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔"

(نقش حیات ج ۲ ص ۲۱۲، ۲۱۳)

مکہ مکرمہ پہنچتے ہی حضرت شیخ اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے اور مختلف با اثر اور مقتدر افراد اور جماعتوں سے ملاقات کر کے ان کو اپنے مشن کی اہمیت سمجھائی، آخر میں سلطنتِ عثمانیہ کے گورنرِ حجاز غالب پاشا سے ملاقات کی اور ان کو اپنے کام کا نقشہ اور تحریک کی اہمیت سمجھا کر فرمایا کہ میں ترکی جانا اور انور پاشا سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں آپ مجھے اس سلسلے میں ضروری سہولتیں اور اعانت مہیا کریں، غالب پاشا نے مسئلہ کے ہر پہلو پر غور کر کے اور مکمل طور پر تبادلۂ خیال کر کے عرض کی کہ ہم ہر طریقے سے تحریک کو بقدر امکان تقویت بہم پہنچائیں گے، اس نے ایک خط مدینہ منورہ کے گورنر بصری پاشا کو لکھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کا پورے احترام کے ساتھ استقبال کیا جائے اور ممکنہ سہولتیں مہیا کر کے ان کو ترکی روانہ کیا جائے، دوسرا خط ترکی کے ڈیفنس منسٹر انور پاشا کو لکھا جس میں حضرت کا مکمل تعارف کرا کے لکھا کہ تحریک کو پوری تائید اور مدد ملنی ضروری ہے اسکے علاوہ غالب پاشا نے حضرت شیخؒ سے کئی ملاقاتیں کیں اور ہندوستان کی جنگِ آزادی کا پورا نقشہ سمجھا کر اس نکتہ پر زور دیا کہ تمام ہندوستان کو من حیث المجموع آزادیٔ کامل کا نعرہ لگا کر اُٹھ کھڑا ہونا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ ہندوستانی عوام لیڈرانِ برطانیہ اور سامراجی طاقتوں کے فریب میں مبتلا ہو کر ڈومینین اسٹیٹس وغیرہ قسم کی ناقص خود اختیاری پر مصالحت کر لیں، آپ ملک کے اندر رہ کر قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کریں ہم باہر سے جس قدر بھی ممکن ہو گی مدد کریں گے۔

مکہ مکرمہ کی اس مہم سے فارغ ہو کر حضرتؒ مدینہ منورہ تشریف لائے، یہاں آپ کے ساتھ صرف وہ رفقاء ہمرکاب تھے جن سے ان ممالک میں کام لینا تھا، باقی حضرات کو آپ نے مختلف مراکز کے لیے ہدایات و تعلیمات دے کر واپس ہندوستان کے لیے روانہ کر دیا۔ مدینہ منورہ میں آپ نے اپنے علمی و روحانی فرزند حضرت شیخ مولانا مدنیؒ کے مکان پر قیام فرمایا اور پہلی فرصت میں حضرتؒ کو تنہائی میں طلب فرما کر تحریک کی پوری تفصیلات سے مطلع کیا، اس آخری بیعت کی تفصیل بھی حضرت مدنیؒ ہی کے قلم سے ملاحظہ کرنی ضروری ہے:۔

"میں اس وقت تک نہ مشن آزادیٔ ہند میں شریک ہوا تھا نہ حضرت شیخ الہندؒ کی عملی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا، مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ایک

خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا خلیل احمد صاحب کو طلب فرما کر اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع فرمایا۔ میں اُس وقت تک فقط علمی جد و جہد میں مشغول تھا اگرچہ مدینہ منورہ میں اس سے پہلے جبکہ محاذ سوئیز کے لیے متطوعین (والنٹیرس) کو بھیجنا شروع کیا گیا تھا ترغیب جہاد پر تقریر کرنے کی نوبت آئی تھی اور اس سے متاثر ہو کر کچھ لوگ اس محاذ پر جہاد کے لیے مدینہ منورہ سے گئے تھے مگر اس کے علاوہ عملی جد و جہد کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اب حضرت شیخ الہندؒ کے خیالات سن کر میں بھی متاثر ہوا اور مولانا خلیل احمد صاحب بھی، یہ وقت میری سیاسیات کی ابتداء اور بسم اللہ کا وقت ہے اور یہی وقت مولانا خلیل احمد صاحب کی ابتدائی شرکت کا ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ۔"

اس گفتگو اور افہام و تفہیم کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ شیخ الہندؒ کی تحریک کے گویا باضابطہ ممبر ہو گئے اور جد و جہد میں عملی طور پر شریک ہو گئے۔ سب سے پہلے حضرتؒ نے مدینہ طیبہ کے با اثر اور صاحب اختیار حلقہ میں حضرت شیخ الہندؒ اور ان کی جماعت اور تحریک کے لیے تائید، ہمدردی اور شرکت کے لیے فضا ہموار کی، اس کے بعد مدینہ کے گورنر بصری پاشا سے ملاقات کر کے ان کو جماعت کی اہمیت اور تفصیل سمجھائی، غالب پاشا کے خطوط دیئے اور حضرت شیخؒ اور ہمراہیوں کے لیے ترکی کے سفر کے لیے سہولتوں کا مطالبہ کیا۔ پہلے تو بصری پاشا نے اس بناء پر تردد کیا کہ جنگ کا زمانہ ہے، ہندوستان اور وہاں کی حکومت سلطنتِ عثمانیہ کی دشمن ہے ممکن ہے ہندوستانیوں کا ترکی جانا مضر ثابت ہو، مگر غالب پاشا نے مکہ مکرمہ سے دوبارہ تاکید لکھی اور بتلایا کہ حضرت شیخ الہندؒ اگرچہ ہندوستانی ہیں مگر یہ اور ان کی پوری جماعت برطانیہ اور اتحادیوں کے خلاف برسرِ پیکار ہیں چنانچہ بصری پاشا نے تاخیر اور تعویق کے لیے حضرت شیخؒ سے معذرت چاہی اور کہا کہ جب اور جس وقت آپ ترکی روانہ ہونا چاہیں گے حکومت آپ کے سفر کا پورا انتظام کرے گی، آپ سفر کی تیاری کریں اور پروگرام سے ہمیں مطلع کریں، عین اسی وقت یہ اطلاع ملی کہ سلطنتِ عثمانیہ کے ایک کمانڈر اور ڈیفنس منسٹر جمال پاشا اور انور پاشا زیارت کی غرض سے مدینہ حاضر ہو رہے ہیں، چنانچہ حضرت شیخؒ نے سفر کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دیا تاکہ ان دونوں صاحبان سے پہلے یہیں ملاقات کرلی جائے۔

یہ حضرات جمعہ کے روز نمازِ جمعہ سے کافی پہلے بذریعہ ٹرین حاضر ہوئے، اسٹیشن پر اہلِ شہر کا ایک جمِ غفیر استقبال کے لیے موجود تھا، گورنمنٹ کی طرف سے باضابطہ جلوس کا انتظام تھا اور اُن کی سواری کے لیے مُشکی گھوڑوں

کی گاڑی تیار تھی مگر انہوں نے سواری سے انکار کر دیا کہ ہم سرکارِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فقیر ہیں اور غلاموں کی طرح دربار میں حاضری دیں گے۔ چنانچہ اسٹیشن سے حرم پاک تک دست بستہ نگاہ روبرو باادب با ملاحظہ حاضر ہوئے۔ ہمارے حضرتِ مدنی قدس اللہ سرہ نے راستے ہی میں اپنی تحریر پیش کی جس میں حضرت شیخ الہندؒ سے تنہائی میں خصوصی ملاقات کا وقت مانگا گیا تھا، مقامی افسرانِ بالا پہلے ہی سے تائید و موافقت میں تھے، چنانچہ اسی دن مغرب کے بعد حضرت شیخؒ اور مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے ان حضرات سے ملاقات کی اور پوری تفصیل و شرح کے ساتھ اپنی تحریک، اس کے مقاصد اور لائحہ عمل ان کے سامنے پیش کیے، انہوں نے ہر قسم کی اعانت، امداد اور تائید کا وعدہ کیا اور ایک خط ہندوستانی عوام کے نام اور دوسرا ترکی افسرانِ متعلقہ کے نام حضرتؒ کے سپرد کیا۔

ہندوستانی عوام کے نام خط میں تمام ہندوستانی عوام کو جدوجہدِ آزادی پر مبارکباد دی گئی تھی اور یہ وعدہ تھا کہ ترکی حکومت ہر طرح ہندوستان کی آزادی کے مشن میں اُن کے ساتھ ہے اور جس وقت کسی مدد کی ضرورت ہوگی حتی الامکان حاضر ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ تاکید بھی تھی کہ آزادی کے مطالبہ کے لیے پوری ہندوستانی قوم کو متحد ہو کر صف آراء ہو جانا چاہیئے، اور ترکی افسران کے نام خط میں یہ ہدایت تھی کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پر مکمل اعتماد کیا جائے اور ان کو ہر قسم کی سہولت دی جائے۔ حضرتؒ نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ ہم لوگوں کا افغانستان اور یاغستان پہنچنا بہت ضروری ہے اس کے لیے انتظامات کر دیئے جائیں مگر ان حضرات نے فرمایا کہ روس نے ایران اور افغانستان کے درمیان قبضہ کر لیا ہے اس لیے اس وقت افغانستان جانا مشکل ہے۔

ریشمی رومال کی تحریر

یہ وہی خط اور چند دوسرے وثائق ہیں جو "ریشمی رومال" کے نام سے مشہور ہیں اور جو انڈیا آفس لندن کے محفوظ ریکارڈ میں انتہائی خفیہ کے عنوان سے محفوظ ہیں۔ اِدھر تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ واپس آنے کی تیاری فرما رہے تھے اور اُدھر ان خطوط اور ضروری تحریروں کو تحریک کے مرکز یاغستان پہنچانے کی تجاویز فرما رہے تھے تاکہ مجاہدین اطمینانِ قلب کے ساتھ اپنا کام جاری رکھ سکیں۔ ان تحریرات کے ارسال کرنے اور پھر اس راز کے افشاء ہو جانے کا مختصر حال حضرت مدنیؒ کے

الفاظ میں درج کیا جاتا ہے :۔

تحریرات اور وثائق کا ہندوستان پہنچانا

"چونکہ حضرت شیخ الہندؒ کو دُھن لگی ہوئی تھی کہ جس طرح ممکن ہو میں مرکزِ تحریک "یاغستان" جلد از جلد پہنچ جاؤں، داگرچہ اعلیٰ درجہ کے ترکی آفیسر اس کو پسند نہیں کرتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ آپ ترکی قلمرو میں قیام کر کے یہاں ہی سے اپنی تحریک چلاتے رہیں) اس لیے تجویز فرمایا کہ ان تحریروں کے فوٹو متعدد لیے جائیں اور ہر مرکز اور برانچ پر وہ پہنچا دیئے جائیں، مگر انگریزی عملداری میں جانے والوں کی چونکہ نہایت سخت تفتیش ہوتی تھی، کسی چیز کا نکال کرلے جانا نہایت مشکل ہوتا تھا، اسلیئے یہ تجویز ہوئی کہ لکڑی کا صندوق کپڑوں کے رکھنے کا بنوایا جائے اور اس کے تختوں کو اندر سے کھود کر اس میں کاغذات رکھ دیئے جائیں اور پھر تختوں کو اس طرح ملا دیا جائے کہ جوڑ ظاہر نہ ہو اس وقت ایک نہایت ماہر اور استاد بڑھئی ہمارے مکان میں لکڑی کا کام کر رہا تھا اُس سے کہا گیا، اُس نے اسی طرح جادی لکڑیوں کا صندوق بنا دیا اور کھدے ہوئے تختہ میں کاغذات رکھ کر اس طرح بند کر دیا کہ باہر سے دیکھنے والا کتنا ہی مبصر کیوں نہ ہو شبہ بھی نہ کر سکے، صندوق میں کچھ زائد کپڑے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اور کچھ نئے کپڑے اور شامی تھان ریشمی اور غیر غیر ریشمی مشجر وغیرہ کے بچوں اور عورتوں کے لیے رکھ دیئے گئے اور چونکہ ہر مہینہ میں تجارتی جہاز مغل کمپنی کا غلّہ اور سامان لے کر جدہ آتا تھا اور واپسی پر بقیہ حجاج کو لے جاتا تھا، تجویز ہوا کہ اس میں حضرت شیخ الہندؒ کے بقیہ رفقاء اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ اور اُن کے رفقاء روانہ کر دیئے جائیں، چونکہ زمانہ جنگ کا تھا اس لیے جہازوں کی آمد ورفت عام دستور کے مطابق جاری نہ تھی اس لیے کچھ انتظار کرنا پڑا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے رفقاء میں سے مولانا ہادی حسن صاحب رئیس خانِ جہاں پور ضلع مظفر نگر اور حاجی شاہ بخش صاحب سندھی (جو کہ حیدرآباد سندھ کے باشندے اور مشنِ آزادی کے پہلے سے ممبر تھے) باقی رہ گئے تھے اور جانے کا قصد فرما رہے تھے، اُن کو وہ صندوق دے دیا گیا اور سمجھا دیا گیا کہ اپنے مکان پر پہنچکر ان کاغذات کو نکال لیں اور حاجی نور الحسن صاحب (رئیس موضع رتھیڑی ضلع مظفر نگر) کو دے دیں وہ احمد مرزا صاحب فوٹو گرافر دہلی سے اِن تحریروں کے فوٹو تروا کر چند کاپیاں لے لیں گے اور فلاں فلاں جگہ پہنچا دیں گے۔"

مگر ان تحریرات کا راز فاش ہو گیا اُدھر ترکی خود جنگ میں مبتلا ہو گیا، تقدیرِ الٰہی سے تمام تدابیر

بہ ظاہر ناکام ہوگئیں، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت مدنیؒ نے فرمایا:۔
"یہ تحریرات اور وثائق بہت زیادہ کار آمد ہوتے اور حکومتِ ترکیہ اور اس کے حلفاء پوری طرح مدد کرتے مگر قدرت نے پانسہ ہی پلٹ دیا اور ترکی کی فتح مندی اور کامیابی کے بعد جب امریکہ انگریزوں کا حلیف ہوگیا اور مسٹر ولسن کے پُر فریب نکات سامنے آئے تو یکایک حالت بدل گئی اور کل کی فتح آج کی شکست بن گئی، امریکہ کی بے شمار فوجیں اور لاتعداد ہتھیار جب اتحادیوں (انگریزوں اور فرانس وغیرہ) کی مدد پہ آگئے، اور ادھر شریف حسین نے غدر اور خیانت کر کے انگریزوں کی حمایت میں ترکوں اور ان کی قوت کو ہر قسم کا نقصان پہنچایا، عربوں اور ترکوں میں انتہائی نفرت پھیلادی تا آنکہ سوریا، فلسطین، عراق وغیرہ میں عرب کے عوام ترکوں کو قتل و غارت کرتے تھے اور عرب سپاہی ترکی فوج سے بھاگنے لگے اور جدوجہد سے جان چرانے لگے تو طبعی طور پر ہر جگہ ناکامی ہی ناکامی سامنے آگئی اور جو کچھ نہ ہونا چاہیئے تھا وہ واقع ہوگیا۔ تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے خدا کا ملک ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے"۔
(نقش حیات ج ۲ ص ۲۲۷)

نوٹ:۔ تحریک ریشمی رومال پر جرمنی کی وزارتِ خارجہ کے ایک سابق ڈپٹی سیکرٹری اور برلن یونیورسٹی میں سیاسیات کے استاد پروفیسر اولف شمل ایک تحقیقی کتاب بنام "برلن پلان" مرتب کر رہے ہیں جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ: "یہ پلان در اصل شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ذہن کی ایجاد تھی اگر یہ پلان کامیاب ہو جاتا تو نہ سلطنتِ عثمانیہ ختم ہوتی اور نہ ہندوستان مزید غلام رہتا"؛ بلکہ سارے ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت ہوتی۔ ولٰکِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (از مرتب چراغ)

نوٹ:۔ نمونۂ عرضداشت جمعیۃ حزب اللہ اور نقل فرمان غالب پاشا گورنر حجاز اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں (مؤلف)

(ف) حضرت مدنیؒ نے جو عرضداشت غالب پاشا کے پیش کی اور غالب پاشا نے جو فرمان جاری کیا اسے ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے ——— (مؤلف) ———

نمونہ عرضداشت جمعیۃ حزب اللہ

جو یاغستان کے مہاجرین و انصار حزب اللہ پر مشتمل اور حضرت مولانا سلطان العلماء کی زیر سرپرستی و زیر صدارت قائم ہے

مہر

(سنہ ۱۳۳۱ھ اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْن)

بتوسط مخدوم الانام حامیٔ اسلام سلطان العلماء مہاجر فی سبیل اللہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب صدر اعظم جمعیۃ حزب اللہ عم فیوضہم بلاحظہ غوث السلام خلیفۃ المسلمین امیر المومنین خادم الحرمین الشریفین سلطان ابن سلطان سلطان محمد رشاد خان خامس خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ،

بعد آداب و تسلیمات مسنونہ و فدویانہ اخدمت عالی میں مندرجہ ذیل معروضات پیش ہیں:۔

(۱) ہم خدام اسلام حضرت سلطان العلماء حضرت مولانا محمود حسن صاحب کی زیر سرپرستی مجتمع ہو گئے ہیں ہم نے اپنا نام "حزب اللہ" رکھا ہے اور آتش ظلم کو سرد کرنا ہمارا نصب العین ہے۔

(۲) ہندوستان اور افغانستان کی حدود کے درمیان ایک وسیع علاقہ جو وزیرستان سے لائی کشمیر تک پھیلا ہوا ہے جو آزاد علاقہ ہے، بہادر اور غیرت مند حنفی المذہب افغانوں کا مسکن ہے، ان جری اور غیور بہادروں نے روز اول سے اپنے علاقہ کو حکومت انگریزی کے تسلط سے آزاد رکھا ہے۔ ہم نے سنہ ۱۳۳۱ھ سے مہمند سے لائی تک کے علاقہ میں اپنی جدوجہد کے مراکز قائم کر رکھے ہیں۔

(۳) جیسے ہی دربار خلافت سے انگریزوں کے مقابلہ میں جنگ کا اعلان ہوا جمعیۃ حزب اللہ کے کچھ ارکان حضرت سلطان العلماء کے ایماء پر انگریزی حکومت سے ہجرت کر کے اس آزاد علاقہ میں پہنچے اور یہاں کے لوگوں کو انگریزوں کے خلاف ابھارنے کا کام شروع کر دیا۔

برطانوی حکومت کی طرف سے جو رپورٹ گذشتہ عیسوی سال کے گزٹ میں شائع ہوئی ہے اُس میں ہماری اس جدوجہد کا اقرار موجود ہے۔ ہند اور افغانستان کی تحریک میں بھی ہم نے بھرپور کوشش کی ہے اور کرتے رہیں گے، اگرچہ اب تک اس میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

(۴) ہم خدام اسلام میں انگریزوں سے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے اور خاص طور پر جنگ کے خاتمہ کے بعد،

اس لیے بصد آداب عرض گذار ہیں کہ :-

(الف) صلح عمومی اور مختلف حکومتوں کے درمیان معاہدے کے وقت مذکورہ علاقہ کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے طے کرالیا جائے کہ یہ علاقہ سریرِ خلافت کے زیرِ اثر رہے گا۔

(ب) اس علاقہ کے انتظام اور اصلاح کے لیے دربارِ خلافت سے افسر بھیجے جائیں، اور

(ج) اگر موجودہ جنگ کے دوران ہی کچھ افسر، تھوڑی فوج سامانِ جنگ اور مصارفِ خوراک کے ساتھ یہاں بھیج دیئے جائیں تو یہاں سے لاکھوں جنگ آزمودہ غازی بلا تنخواہ اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے اور یہ اقدام افغانستان کو سرگرم کرنے میں بھی معاون ثابت ہوگا۔ انشاء اللہ اللہ تعالےٰ ہمیں دربارِ خلافت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق و استطاعت بخشے۔ آمین ثم آمین

مؤرخہ ۷ا شوال المکرم ۱۳۳۵ھ تقریباً مطابق ۱۵ راگست ۱۹۱۷ء

نوٹ :- غالب پاشا گورنر حجاز شریف کا فرمان، جس میں جنگ میں شریک ہونے والوں کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے اور جو ہم تک مولوی ابوالحامد انصاری ابوایوبی کے ذریعہ پہنچا ہے اس عرضداشت کے پیش کرنے کا محرک بنا ہے۔ فقط

مُہر جناب حاجی صاحب ترنگزئی مہاجر غازی فی سبیل اللہ صدر جمعیۃ حزبُ اللہ

مُہر غازی معروف جناب مُلا صاحب بابڑہ صدر انصار جمعیۃ حزبُ اللہ

مُہر مولوی فضل ربی مہاجر رُکن جمعیۃ حزبُ اللہ

مُہر مولوی عبدالعزیز صاحب رُکن جمعیۃ حزبُ اللہ

ضروری نوٹ اس عرضداشت میں حنفی المذہب کا ذکر بھی ہے، یاد رہے کہ تحریکِ آزادی کے سب قائدین حنفی مسلک کے پیروکار تھے اور خود خلیفۃ المسلمین ترکی بھی حنفی ہوتا تھا، خلافت ہی تمام اسلامی ملکوں میں مضبوط رشتہ تھا ان سب ملکوں میں فقہ حنفی بطور قانون نافذ تھا خلافت کے خاتمہ سے حنفیت بھی ختم کر دی گئی۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے اپنے کلام میں اس کو یوں ادا فرمایا ہے ؎

بنگلوں سے نماز اور وظیفہ رخصت   کالج سے امام ابوحنیفہؒ رخصت
صاحب سے سُنی اب قیامت کی خبر   قسطنطنیہ سے ہیں خلیفہ رخصت

نقل فرمان غالب پاشا

(گورنر حجاز شریف)

قائم مقام (نمائندہ) اعلیٰ حضرت خلیفہ رسول رب العالمین امیر المؤمنین دام اقبالہٗ

یہ بات کسی پر مخفی نہیں ہے کہ جنگ عمومی گذشتہ ایک سال سے تُرکی کی اسلامی حکومت کا رُخ کیے ہوئے ہے۔ رُوس، فرانس اور انگریز (دشمنانِ اسلام) ممالک عثمانیہ پر برّی و بحری حملے کر رہے ہیں، اس صورتِ حال کے پیشِ نظر حضرت امیر المؤمنین و خلیفۃ المسلمین نے محض اللہ کی نصرت اور خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رُوحانی طاقت کے بھروسہ پر جہادِ مقدّس کا اعلان کر دیا ہے جس کے جواب میں ایشیا، یورپ اور افریقہ کے مسلمانوں نے لبیک کہا ہے اور ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدانِ جنگ میں کود پڑے ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ تُرکی فوج اور مجاھدین کی تعداد دشمنانِ اسلام کی تعداد سے بڑھ گئی ہے اور انھوں نے دشمنوں کی قوت کو مادّی اور اخلاقی طور پر کمزور کر دیا ہے۔

چنانچہ رُوسیوں کی فوج کا ایک بڑا حصّہ قفقازیہ میں تباہ کر دیا گیا ہے اور ایک لاکھ برطانوی اور فرانسیسی فوج اور اُن کے جنگی جہاز درّہ دانیال اور دوسرے مقامات پر برباد کر دیئے گئے ہیں۔ تُرکوں، جرمنوں اور آسٹریلینوں نے مشرق میں رُوسیوں کو اور مغرب میں فرانسیسیوں اور بلجیکیوں کو پیچھے دھکیل دیا ہے ایک تہائی روسی اور فرانسیسی علاقے اور سارے بلجیم اور لاکھوں رائفلوں، بندوقوں اور دوسرے سامانِ جنگ پر قبضہ کر لیا ہے اور ہزاروں فوجیوں کو قیدی بنا لیا ہے۔ اب بلغاریہ بھی مرکزی قوتوں کے ساتھ شریک ہو کر جنگ میں شامل ہو گیا ہے اور اس نے سربیا کے علاقہ میں اندر تک گھس کر وہاں کے لوگوں کو شکستِ فاش دیدی ہے، اسلیئے میرا یہ پیغام میرے سلام کے ساتھ ان مسلمانوں کو پہنچا دیا جائے جو ان حکومتوں کی غلامی میں ہیں کہ وہ اب مکمل طور پر شکست کھا چکی ہیں اور اب بالکل لاچار و بے یار و مددگار ہیں اور اُن کے یعنی مسلمانوں کے سامنے جس قوت و طاقت کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے وہ محض خیالی ہے۔

مسلمانو! آج تمہاری نجات کا دن ہے، اسلیئے اب اپنی ذلّت و خواری اور اپنی غلامی پر راضی و قانع نہ رہو،

بلاشبہ آزادی، کامیابی، فتح و نصرت تمہارے ساتھ ہے۔ اب خوابِ غفلت سے بیدار ہو اور متحد ہو کر اپنے اندر تنظیم و اتحاد پیدا کرو، اپنی صفوں کو درست کرو اور اپنے آپ کو اُن چیزوں سے لیس کرو جو تمہارے لیے ضروری اور کافی ہوں اور پھر اس ظالم و جابر عیسائی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہو جس کی غلامی کا کمزور طوق تمہاری گردنوں میں پڑا ہوا ہے، اس زنجیرِ غلامی کو اپنے مذہب کی طاقت اور دین کی تیز دھار سے کاٹ ڈالو، اس طرح اپنے وجود اور انسانی آزادی کے حقوق کو حاصل کر لو۔ ہم انشاء اللہ عنقریب مکمل فتح اور کامیابی کے بعد معاہدے کریں گے تو تمہارے حقوق کی پوری طرح حفاظت و مدافعت کریں گے۔

اِس لیے اب جلدی کرو اور پختہ عزم و ارادہ کے ساتھ دشمن کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے مُنہ میں پہنچا دو اور اس سے نفرت و دشمنی کا مظاہرہ کرو، ہم تمہاری طرف بھروسہ اور اعتماد کی نظر سے دیکھتے ہیں اس لیے یہ اچھا موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دو، بد دل نہ ہو اور خداوند بزرگ و برتر سے دلی مراد پوری ہونے کی اُمید رکھو۔

تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ مولانا محمود حسن صاحب (جو پہلے دیوبند (ہندوستان) کے مدرسہ میں تھے) ہمارے پاس آئے اور ہم سے مشورہ طلب کیا۔ ہم اس بارہ میں اُن سے متفق ہیں اور اُن کو ضروری ہدایات دے دی ہیں، اُن پر اعتماد کرو، اگر وہ تمہارے پاس آئیں تو روپیہ سے، آدمیوں سے اور جس چیز کی انہیں ضرورت ہو اُس چیز سے اُن کی مدد کرو۔

دستخط غالب (پاشا)
والئ حجاز

اسارتِ مالٹا اور اُس کے وجوہ

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اپنے مختصر قافلہ کے ساتھ جس میں مولانا عزیر گل، حکیم نصرت حسین شریک تھے حسبِ مشورہ غالب پاشا مکہ مکرمہ پہنچے کہ وہاں سے اپنی منزل اور راہِ منزل کا تعین فرمالیں کہ اتنے میں جنگ چھڑ گئی جس کی لپیٹ میں مکہ مکرمہ اور طائف بھی آگیا، حضرتِ مدنیؒ نے اس کا حال یوں بیان فرمایا۔

"ماہ جمادی الثانی ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۶ء کی بارہویں یا تیرہویں کو یہ قافلہ مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر اسی ماہ کے آخر میں مکہ مکرمہ پہنچا، چونکہ گرمی کا موسم تھا اس لیے حضرت شیخ الہند، مولانا مدنی، مولانا عزیر گل اور وحید احمد ۲۴ رجب ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۶ء کو طائف پہنچ گئے، گیارہویں شعبان ۱۳۳۴ھ کی شب کو صبح صادق کے قریب چاروں طرف سے شریفِ مکہ کی فوج نے چڑھائی کی، اِدھر سے ترک افواج جواب دیتی رہیں، یہی حال عید مبارک تک رہا حتّٰی کہ عید کے دن سے بھی شریف کے لوگوں نے جنگ کو موقوف نہیں کیا، یہ سارا زمانہ نہایت ہی بدامنی اور ضعف کی صورت میں گذرا، ۷ شوال بوقت صبح طائف سے روانہ ہو کر دسویں شوال علی الصباح مکہ مکرمہ پہنچکر عمرہ ادا کیا اور اس کے بعد حج بھی کر لیا" (نقشِ حیات ج ۲)

اِدھر جنگ کی شدت نے انگریزوں کو اور ان کے امدادیوں کو مسلمانوں کی نظروں میں اسلام کا مخالف قرار دے دیا تھا، اس لیے یہ رائے ٹھہری کہ علماء ہند اور علماء مکہ مکرمہ سے ایک فتویٰ تیار کیا جائے جس میں ترکوں اور ان کی حکومت اور خلافت کی برائیاں ذکر ہوں اور وہ فتویٰ خصوصی طور پر ہندوستان بھیجدیا جائے چنانچہ ایسا محضر نامہ تیار کیا گیا اور اس پر علماء مکہ مکرمہ نے طوعًا یا کرھًا دستخط کر دیئے مگر انگریزی ایجنٹ خان بہادر مبارک علی اورنگ آبادی حیدرآبادی نے اصرار کیا کہ اس پر شیخ الہند اور ان کے رفقاء کے دستخط بھی ہوں، ان علماء کی کوئی حیثیت نہیں، جب وہ محضر شیخ الہندؒ کے پیش ہوا تو آپ نے پانچ وجہ سے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ (۱) اِس محضر کی سرخی میں من علماء مکۃ المکرمہ ہے اور مولانا تو پردیسی

مسافر ہیں (۲) اس میں قوم ترک کی مطلقاً تکفیر کی گئی ہے جو درست نہیں (۳) اس تکفیر کو بنیاد بنا کر سلطان عبدالحمید خان کا تخت سے اتار دینا لکھا گیا ہے حالانکہ یہ بھی غلط ہے (۴) اس میں خلافت سلاطین آلِ عثمان کا انکار کیا گیا ہے حالانکہ یہ امر مخالف نصوصِ شرعیہ ہے (۵) اس میں اس انقلاب اور حرکت کو مستحسن دکھایا گیا ہے اور یہ بھی شرعاً نہایت قبیح واقع ہوا ہے۔

اس کے بعد شریفِ مکہ جدہ گیا اور وہاں انگریزوں کے معتمد کرنیل ولسن سے مشورہ کے بعد یہ حکم دیا کہ حضرت مولانا اور اُن کے جملہ ہمراہیوں کو زیرِ حراست جدہ بھیجدیا جائے۔ سید امین عاصم صاحب نے کہا کہ تمہاری گورنمنٹ جس کی تم رعایا ہو تم کو طلب کرتی ہے، اس پر مولانا عزیر گل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:۔

"ہم یہاں کسی کافر کی حکومت کو نہیں پہچانتے ہم حرمِ خداوندی میں امان لیے ہوئے ہیں اگر شریف ہم کو یہاں سے نکالتے ہیں تو ہم خوشی سے نہ جائیں گے جب تک تم ہم کو ڈنڈے کے زور سے نہ نکالو"

آخر کار شریفِ مکہ نے حکم دیا کہ ان سب کو گرفتار کر لیا جائے، چنانچہ باقی حضرات کو پس پردہ کر دیا صرف حضرت مدنیؒ موجود تھے اُن کو کمشنر پولیس کے پیش کیا گیا تو اُس نے کہا "تو انگریزی حکومت کو بُرا کہتا ہے اب اس کا مزہ چکھو" اور قید خانے میں حضرت مدنیؒ کو بھیجدیا۔ اس کے بعد مولانا عزیر گلؒ اور حکیم نصرت حسین کو اپنے سکونتی مکان میں مقید کر دیا اور یہ کہا کہ جب تک شیخ الہندؒ نہیں آئیں گے تم سب یہاں ہی رہو گے۔ اس کے بعد شریف کے ملازم حضرت شیخ الہندؒ کی تلاش میں مصروف ہو گئے، شریف نے حکم دیا کہ آج عشاء تک اگر مولانا موجود نہ ہوئے تو دونوں ساتھیوں (مولانا عزیر گلؒ اور حضرت مدنیؒ) کو تو گولی سے مار دو اور مطوف کو اس عہدہ سے معزول کر دو۔ جب حضرت شیخ الہندؒ کو یہ اطلاع ملی تو فرمایا کہ میں کسی طرح یہ پسند نہیں کرتا کہ میری وجہ سے کسی کو کوئی آزار پہنچے، چنانچہ آپ آ گئے اور چند مسلح سپاہیوں کی حفاظت میں ۲۴ صفر ۱۳۳۵ھ / ۱۹ دسمبر ۱۹۱۶ء کو آپ جدہ پہنچ گئے۔

ادھر شریفِ مکہ کی طرف سے حضرت مدنیؒ کو اپنے شیخ سے جُدا کرنے کے لیے ترہیب اور ترغیب سے کام لیا گیا تاکہ اس تحریک کا مرکزی رُکن تحریک سے الگ ہو کر حکومت کے لیے مزید پریشانی کا باعث نہ ہو اور حضرت شیخ الہندؒ سے ایسے مخلص خادم کو جُدا کر کے اُن کی بدنی اور ذہنی پریشانی میں اضافہ کیا جائے، چنانچہ پہلے تو حضرت مدنیؒ کو تہدید آمیز لہجہ میں کہا گیا کہ "ہم آپ سے سمجھ لیں گے"، پھر آپ کو مجرم بنا کر پولیس کمشنر

کے سامنے پیش کیا جس نے آپ سے یہ کہا کہ:۔

"تم شریف کی حکومت کو انگریزی کہہ کر مذمت کیا کرتے ہو اب اس کا مزہ چکھو"

اور آپ کو جیل بھیج دیا، پھر فوراً آپ کو جیل خانہ سے رہا کر کے ترغیب دیتے ہوئے کہا:۔

"تم ترکی رعایا ہو (اس وقت شریف مکہ نے بغاوت کا اعلان نہیں کیا تھا) مدینہ منورہ جانے کی اجازت ہو سکتی ہے خواہ مخواہ ہندی عالم کے ساتھ جا کر کیوں اپنے آپ کو مجرم و مقید بناتے ہو"

مگر یہ سب باتیں بے اثر ثابت ہوئیں، جب حضرت شیخ الہندؒ جدہ روانہ کیے گئے تو حضرت مدنیؒ جیل میں ہونے کی وجہ سے بے خبر تھے، جب باہر آئے تو فوراً جدہ جانے کی تیاری کی اور عرب کی سفید خچر کی تیز سواری پر دو روز کا سفر بارہ گھنٹے میں طے کر کے جدہ حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں پہنچ گئے، اور اب چار مخلص جان نثار خدام اور ایک آقا اور مولیٰ پانچ مبارک افراد ہو گئے، حضرت شیخ الہندؒ نے ان سب جان نثاروں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"گورنمنٹ انگریزی نے مجھ کو مجرم سمجھا تم تو بے قصور ہو، رہائی کی کوشش کرو، مگر سب نے یہی جواب دیا حضرت! جان چلی جائے گی مگر ایسی حالت میں آپ کی خدمت سے جدا نہ ہوں گے" ؎

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

آخر کرنل ولسن کے اس بیان پر کہ "شریف یہ کہتا ہے میری قلمرو میں ان کا چھوڑنا میری مرضی کے خلاف ہے ان کو مصر بھیجنا چاہیئے" اس فیصلہ کے بعد ایک ماہ جدہ میں رہ کر بروز جمعۃ المبارک ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء مطابق ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ جدہ سے آپ کو سوئز خدیوی آگبوٹ کے ذریعہ روانہ کر دیا گیا، چوتھے دن ۱۶ جنوری کو سوئز پہنچ گئے، دوسرے دن بذریعہ ریل تھرڈ کلاس کے ڈبے میں ان حضرات کو سوار کر کے چودہ پندرہ گوروں کی سنگینوں کے پہرہ میں آپ حضرات قاہرہ پہنچ گئے، نمازِ ظہر اسٹیشن ہی پر تازہ وضو کر کے باجماعت ادا کی، بعد از نمازِ عصر آپ کو جیزہ لے گئے، ایک چھوٹے سے کمرے میں جہاں تین نشستیں تین انگریزوں کی تھیں ان میں سے دو تو صاف اردو بولتے تھے، حضرت شیخ الہندؒ کو ایک کرسی پر

بٹھاکر مندرجہ ذیل سوال و جواب ہوئے۔

سوال:۔ آپ کو شریفِ مکہ نے کیوں گرفتار کیا؟

جواب از مولانا:۔ اس کے محضر پر دستخط نہ کرنے کی وجہ سے۔

سوال:۔ آپ نے کیوں دستخط نہیں کیے؟

جواب:۔ مخالفِ شریعت تھا[1]

سوال:۔ آپ کے سامنے مولوی عبدالحق حقانی کا فتویٰ ہندوستان میں پیش کیا گیا تھا مگر آپ نے اُس کو بھی کیوں رَد کر دیا تھا؟

جواب:۔ وہ مخالفِ شریعت تھا۔

سوال:۔ آپ مولوی عبیداللہ (سندھی) کو جانتے ہیں؟

جواب:۔ اس نے دیوبند میں مجھ سے پڑھا ہے؟

سوال:۔ اس وقت وہ کہاں ہے؟

جواب:۔ مجھے علم نہیں۔

سوال:۔ ریشمی خط کی حقیقت کیا ہے؟

جواب:۔ مجھ کو کچھ علم نہیں نہ مَیں نے دیکھا ہے۔

سوال:۔ عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے کہ آپ اس کی سیاسی سازش میں خلاف برطانیہ شریک ہیں اور آپ فوجی کماندار ہیں؟

جواب:۔ وہ اگر لکھتا ہے تو اپنے لکھنے کا وہ خود ذمہ دار ہوگا، بھلا مَیں اور فوجی کمانداری؟ میری جسمانی حالت ملاحظہ فرمائیے اور پھر عمر کا اندازہ کیجئے، مَیں نے تمام عمر مدرسہ کی مدرسی میں گذاری ہے، مجھ کو فنونِ حربیہ اور فوج کی کمان سے کیا مناسبت؟

سوال:۔ غالب نامہ کی کیا حقیقت ہے؟

جواب:۔ غالب نامہ کیسا!

سوال:۔ غالب پاشا گورنرِ حجاز کا خط جس کو محمد میاں لے کر حجاز سے گیا تھا آپ نے غالب پاشا سے اس کو حاصل کیا ہے؟

---

[1] مذکورہ محضر کے خلافِ شریعت ہونے کی پانچ وجوہ کتاب ہٰذا کے صفحہ ۱۳۷ پر درج کی گئی ہیں۔

جواب: مولوی محمد میاں کو میں جانتا ہوں وہ میرا رفیقِ سفر تھا، مدینہ منورہ سے مجھ سے جدا ہوا تھا وہاں سے لوٹنے کے بعد اس کو جدہ اور مکہ میں تقریباً ایک ماہ ٹھہرنا پڑا تھا، غالب پاشا کا وہ خط کہاں ہے جس کو آپ میری طرف نسبت کرتے ہیں؟

سوال: آپ نے انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات کی ہے؟

جواب: بے شک! جب وہ مدینہ منورہ ایک دن کے لیے آئے تھے تو صبح کے وقت انہوں نے مسجد نبوی میں علماء کا مجمع کیا، مجھ کو بھی حسین احمد اور وہاں کے مفتی اس مجمع عام میں لے گئے اور اس مجمع میں ان دونوں وزیروں سے مصافحہ کرایا مگر ہم میں سے صرف مولانا حسین احمد نے تقریر کی[1]

سوال: ان کاغذات میں لکھا ہے کہ آپ سلطان ٹرکی اور ایران اور افغانستان میں اتحاد کرانا چاہتے ہیں اور پھر ایک اجتماعی حملہ ہندوستان پر کرا کے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے ہیں؟

جواب: یہ ساری باتیں غلط ہیں۔

سوال: شریفِ مکہ کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: وہ باغی ہے۔

اس قدر تفصیل سے سوالات کرنے سے معلوم ہوا کہ آپ کی گرفتاری صرف اس وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ حسبِ تحریر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ:

"جیزہ کے سیاسی جیل میں بیان لینے والا شخص انگریز تھا اردو نہایت سلیس اور صاف بولتا تھا، اس کے پاس بڑی بڑی ضخیم کتابیں اور فائلیں تھے جن میں سی، آئی، ڈی کے بیانات اور رپورٹیں مندرج تھیں۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ ہماری گرفتاری فقط شریف کے محضر پر دستخط نہ کرنے اور شریف کی شکایت کی وجہ سے ہوئی ہے، مگر بعد میں بیانات لینے اور سوالات کرنے اور بار بار اس کے ان کتابوں کے دیکھنے اور حوالہ دینے سے ظاہر ہوا کہ یہ گرفتاری تحریکِ آزادی کی اُن جملہ کاروائیوں کی بناء پر ہوئی ہے جو کہ یاغستان، کابل، فرنٹیئر اور دیوبند وغیرہ میں مدتوں سے ہوتی رہی ہیں اور جن کی مخبری اپنوں اور پرایوں دونوں نے کی ہے، بہت سی ایسی باتیں بھی پوچھی گئی ہیں جن کے متعلق یقین تھا کہ کسی کو

[1] مسجد نبوی میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ کی اس تقریر کا موضوع جہاد تھا۔ (تحریک شیخ الہند ص ۲۸۲)

اطلاع نہیں ہے"۔ (نقش حیات ج ۲ ص ۲۲۳)

حسب بیان حضرت مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ رولٹ کمشنر نے اپنی رولٹ کمیٹی رپورٹ کے پیرا ۱۶۴ میں لکھا ہے کہ :-

"اگست ۱۹۱۶ء میں ریشمی خطوط کا انکشاف ہوا اور حکومت کو اس سازش کا پتہ چلا، یہ ایک منصوبہ تھا جو ہندوستان میں اس خیال سے تجویز کیا گیا تھا کہ ایک طرف شمال مغربی سرحدات پر گڑبڑ پیدا کرے اور دوسری طرف ہندی مسلمانوں کی شورش سے اسے تقویت دے کر برطانوی راج ختم کر دیا جائے"۔ (نقش حیات ج ۲ ص ۲۳۸)

ان سوالات اور جوابات کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کو ایسی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا جس کے بارہ میں مشہور ہے کہ اس میں پھانسی کی سزا والے کو بند کیا جاتا ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوا کہ ان سب شرکاء کو سزائے موت دی جائے گی۔ جمعرات کے دن مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۱۷ء کو حضرت شیخ الہندؒ کو کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا اور دوسرے دن بروز جمعہ حضرت مدنیؒ کو کچہری بلا کر بیانات لیے گئے پھر وحید احمد اور مولانا عزیر گل اور حکیم نصرت حسین سے بیان لے کر سب کو حضرت شیخ الہندؒ والی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا، سات آٹھ دن نہ آرام کر سکے نہ نیند آئی اور یہ دن نہایت سخت گذرے، ۱۵ فروری ۱۹۱۷ء کو ان سب حضرات کو گوروں کی گارد کی حفاظت میں مالٹا کے لیے قاہرہ ریلوے اسٹیشن پہنچایا گیا اور وہاں سے بذریعہ ریل یہ حضرات اسکندریہ پہنچائے گئے جہاں سے ۱۶ فروری کی شام کو ایک بحری جہاز کے ذریعہ جس کے آگے آگے جنگی جہاز کروز حفاظت کے لیے ساتھ تھا، یہ جہاز ۲۱ فروری ۱۹۱۷ء کو مالٹا لنگر انداز ہوا اور یہ حضرات اپنے مجوزہ کیمپ کو پیدل روانہ کیے گئے، راستہ میں عیسائی لڑکے اور عورتیں ان حضرات کو دیکھ کر خوشیاں مناتے اور مذاق اڑاتے تھے، حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں مجھے حضرت حاجی امداد اللہ نوّر اللہ مرقدہٗ کا یہ شعر یاد آتا ہے

مرا اک کھیل خلقت نے بنایا　　تماشے کو بھی تو لیکن نہ آیا

اور یہ حضرات بزبان حال یوں بھی کہہ رہے تھے

بجرم عشق توام مے کشند و غوغائے است　　تو نیز بر سر بام آ عجب تماشائے است

آخر آپ سب کو جیل خانہ میں پہنچا دیا گیا جو ایک قلعہ تھا اور وسیع تھا جس میں پہلے سے تقریباً تین ہزار مختلف ممالک کے جنگی قیدی اسیر تھے،

جزیرۂ مالٹا اور اسارت خانۂ مالٹا کا تعارف

از محفوظ ریکارڈ انڈیا آفس لندن

اہلِ ہندوستان کے لیے مالٹا ایک ایسا غیر مانوس مقام اور گمنام شہر تھا کہ ہزار ہا اہلِ ہند نے کبھی اُس کا نام بھی نہ سُنا تھا، خدا تعالیٰ کے عجائباتِ قدرت میں سے یہ بھی ہے کہ جیسے حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے چند روز کے لیے دُنیا کے دارالامتحان میں بھیجدیا تھا جیسا کہ حدیث میں الدُّنیا سجن المؤمن فرمایا گیا ہے، ایسے ہی ترقیٔ درجات کے لیے حضرت مولاناؒ کو نظر بند کر کے وہاں پہنچا یا گیا، اور اسیرِ مالٹا کے فرطِ اعتقاد کی وجہ سے ہر شخص کی زبان پر مالٹا کا نام آنے لگا۔

مالٹا ایک مختصر جزیرہ اور جہازوں کی بندگاہ ہے، عرصہ دراز تک مسلمانوں کے قبضہ میں رہا ہے اب دُوسری غیر اسلامی سلطنتوں کے تصرف میں رہنے کے بعد گورنمنٹ انگریزی کے مقبوضات میں شمار ہوتا ہے، تمام جزیرہ مالٹا کے نام سے مشہور ہے جس میں بہت سے شہر اور قصبے اور دیہات ہیں، سب سے بڑا شہر اور جزیرہ کا دارالحکومت مقام "والیٹہ" ہے۔ خاص شہر مالٹا سمندر سے نہایت قریب اور جہازوں کی بندرگاہ اور نہایت خوبصورت مقام ہے، شہر کے اطراف میں سبزہ زار اور آبِ رواں کے چشمے اور عمدہ تفریح گاہیں موجود ہیں، شہر نہایت آباد ہے اور بہت سے قابلِ دید عمدہ مکانات پر مشتمل ہے اور عام طور سے نہایت صفائی اور رونق نظر آتی ہے، ایک طرف سمندر لہریں مار رہا ہے اور بندگاہ پر جہازوں کے لنگر انداز ہونے اور اموالِ تجارت اتارنے اور بار کرنے کے لیے گودی بنی ہوئی ہے۔

یہاں ایک نہایت وسیع قلعہ ہے جو قدیم زمانہ میں پہاڑ کھود کر بنایا گیا تھا جس کی دیواریں اور خندقیں نہایت مضبوط و مستحکم ہیں، اور علاوہ ایک وسیع میدان کے بہت سی پُر تکلف اور آرام دہ عمارتیں بھی اس میں بنی ہوئی ہیں۔ یہ قلعہ حقیقت میں فوج اور افسروں کے رہنے کے لیے بنایا گیا تھا اور جن کی ضرورتیں بھی اس میں ملحوظ تھیں، بڑی مقدار سپاہیوں اور افسروں کی یہاں مقیم رہتی تھی۔ ایامِ جنگ میں جبکہ خطرناک اسیروں کے لیے زیادہ محفوظ مقام کی ضرورت ہوئی تو گورنمنٹ برطانیہ نے اس خاص مقام کو معزز درجہ کے اسیرانِ جنگ اور سیاسی نظر بندوں کے لیے نہایت مناسب

خیال کر کے فوجی سپاہیوں اور افسروں کو یہاں سے ہٹا کر خالی کرا لیا گیا، کیونکہ اسیر اگر کسی طرح قلعہ سے نکل بھی جائے تو سمندر اس کے لیے سدِ راہ موجود ہے۔

اس قلعہ کو گورنمنٹ نے اسیروں کے لیے خاردار تاروں کے ذریعے سے مختلف حصوں پر تقسیم کر کے ہر ایک حصہ کو مستقل محفوظ کیمپ بنا دیا ہے اور ہر حصہ کا علیحدہ نام تجویز کر دیا ہے، کوئی حصہ "سینٹ کلینٹ" کے نام سے مشہور ہے، کوئی "بلغار کیمپ" ہے، کوئی "روگیٹ کیمپ" ہے، کسی کو "عرب کیمپ" کہتے ہیں، کسی کو "گریک کیمپ" کسی کو "ورداله براکس"۔ ہر ایک کیمپ میں گوروں کا نہایت سخت و سنگین پہرہ رہتا تھا، صرف دس بجے سے بارہ بجے تک ایک کیمپ سے دوسرے میں جا کر نظر بند لوگ باہم ملاقات کر سکتے تھے، البتہ ایک کیمپ کے اسیر باہم ایک دوسرے سے بلا تکلف بلا کسی قید اور پابندی کے مل سکتے تھے۔ پھر قلعے کے دروازے پر سخت گارڈ متعین تھا کہ بلا خاص احکامات اور بدون افسروں کی اجازت کے کوئی اسیر کسی ضرورت سے قلعہ سے باہر شہر میں اور کسی جگہ میں نہیں جا سکتا تھا، قلعہ میں اسیروں کے لیے ہر قسم کی ضروریات نہایت اعلیٰ پیمانہ پر مہیا کی گئی ہیں، بعض کیمپوں میں ایک ایک بڑی دوکان تھی جس پر جملہ ضروریات شہر سے لا کر مہیا کرتے اور ایک سبزی وغیرہ کی دوکان تھی جو ہوٹی ترکاریاں اور میوے لا کر فروخت کرتا تھا۔ بعض کیمپوں میں صرف خیمے ایستادہ تھے اور بعض میں عمدہ کمرے اور کافی مکانات بنے ہوئے ہیں۔ کیمپوں کے درمیان میں ایک بہت بڑا سرکاری دفتر ہے جس میں تمام انتظامات کے لیے بڑا افسر کرنیل اور اس کے ماتحت میجر اور کپتان وغیرہ ملازموں کا بڑا عملہ رہتا تھا۔ اسی قلعہ کے متعلق دو شفاخانے تھے بڑے کیمپ "سینٹ کلمیٹ" میں چھوٹا شفاخانہ تھا اور اس سے ایک فرلانگ پر بہت بڑا فوجی شفاخانہ تھا جس میں تمام ضروریات اور سامانِ راحت کے مکانات اور بیماروں کے بہ تعدادِ کثیر آرام دہ کمرے اور بستر اور صدہا ملازم و خادم موجود تھے۔ ڈاک کا بھی نہایت معقول اہتمام تھا، دو شنبہ اور جمعرات کو ایک کھلا ہوا لفافہ ملتا تھا جس کو کام میں لایا جا سکتا تھا، اور مختلف جگہ سنسر مقرر تھے، سنسروں کے ہاں خطوط جو دیگر ممالک سے آتے تھے سرکاری ڈاکخانہ سے دفتر میں پہنچ جاتے تھے جس کو اہلِ کیمپ خود ڈاک کے انتظام کے لیے قائم کرتے تھے اور وہاں سے بطرزِ مناسب نمبردار تقسیم کر دیتے تھے۔

اسیرانِ مالٹا کا تعارف

از

(محفوظ ریکارڈ انڈیا آفس لندن)

امیرِ قافلہ علمبردارانِ جہادِ حریت حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق

(۱) ۱۲۷۔ محمود الحسن مولانا، حضرت مولانا بھی کہا جاتا ہے۔ ریشمی خطوط کے مکتوب الیہ، مدرسہ اسلامیہ دیوبند کے صدر مدرس، تقدس اور پارسائی کے لیے مشہور، ان کے مُرید جن میں سرکردہ مسلمان بھی ہیں ہندوستان بھر میں ہیں۔ عبیداللہ کے اثر میں آنے سے ان کے خیالات تبدیل ہوئے، دیوبند میں ان کا مکان اتحادِ اسلامی کے سازشیوں کا گڑھ تھا۔ اسی شخص نے سیف الرحمٰن، فضل الٰہی، فضل محمود وغیرہ کو سرحد پار قبائل کو جہاد پر بھڑکانے کے واسطے بھیجا، ایس ایس اکبر جہاز کے ذریعہ وہ خود بھی تیرہ منحرف اشخاص کے ساتھ ۱۸ ستمبر ۱۹۱۶ء کو ہجرت کر کے عرب روانہ ہو گیا، عرب میں قیام کے دوران انہوں نے پے در پے کوشش کی کہ ہندوستان میں جہاد کے لیے حکومتِ ترکی ہمدردیاں حاصل کریں، انور پاشا، جمال پاشا اور غالب پاشا سے ملاقاتیں کیں اور فرمان حاصل کیے جن میں سے ایک فرمان محمد میاں عرف مولوی منصور کے ذریعہ ہندوستان اور آزاد علاقہ کے سازشیوں کو دکھانے کے بعد کابل پہنچایا گیا، ہندوستان میں اتحادِ اسلامی کی سازش میں مولانا کی راہنمایانہ قائدانہ شخصیت بڑی سرکردہ ہے، جنودِ ربانیہ کی فہرست میں وہ جنرل ہیں، ۲۰ ستمبر ۱۹۱۶ء کو شریفِ مکہ کے احکام سے ان کو گرفتار کر لیا گیا اور جدہ بھیج دیا گیا جہاں سے انہیں ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو مصر روانہ کر دیا گیا۔ (تحریک شیخ الهند ص۲۴۲)

(ضروری نوٹ) اس رپورٹ میں اور بعض دوسری سرسری کتابوں میں حضرت شیخ الہندؒ کا مولانا عبیداللہ سندھیؒ یا مولانا ابوالکلام آزادؒ کے "الھلال" سے متاثر ہونے کا ذکر کیا جاتا ہے یہ درست نہیں، حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک تو حضرت نانوتویؒ کی اختیار کردہ تحریک تھی جو دارالعلوم کی بنا کی اصل غرض تھی۔

(۲) ۱۰۴:- جنودِ ربانیہ کی فہرست میں لیفٹیننٹ جنرل ہے، یہ خاندان اصل میں ضلع فیض آباد یُوپی کا ہے لیکن ۱۸۹۹ء کو حجاز ہجرت کر گیا تھا، مولوی حسین احمد مدنی مدینہ کے مفتی تھے، ہندوستان سے جانے سے پہلے وہ دیو بند میں مدرس تھے، مولانا محمود الحسن کا پکا مرید اور جہاد کا زبردست مبلغ ہے، دو سال ہوئے اپنے بھتیجے وحید کے ساتھ جو اس کے مرحوم بھائی ایم صدیق کا لڑکا ہے ہندوستان آیا تھا اور دیو بند میں مولانا محمود الحسن کے مکان میں چند ماہ قیام کرنے کے بعد وحید کو مدرسہ میں طالب علم کی حیثیت سے چھوڑ کر عرب واپس ہو گیا تھا، مدینہ میں مولانا محمود الحسن اس کے مکان میں ٹھہرے تھے شریف مکہ کے حکم سے ۲۰ دسمبر ۱۹۱۶ء کو یا اس کے لگ بھگ اسے مکّہ میں گرفتار کر لیا گیا تھا اور جدہ بھیجدیا گیا تھا جہاں سے اُسے ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو مصر روانہ کر دیا تھا۔

(۳) ۹۶:- عزیز گل پسر شہید گل کا کاخیل پٹھان درگائی شمالی مغربی سرحدی صوبہ میں رہتا ہے، بڑا آتشیں مزاج ہے، جب وہ دیو بند میں طالب علم تھا اُسی وقت سے مولانا محمود الحسن کا پکا مُرید ہو گیا تھا، بڑا اہم سازشی ہے، ہجرت کا بڑا خواہشمند ہے اُن لوگوں میں سے ایک ہے جنھوں نے ہمیشہ مولانا کو اکسایا ہے کہ وہ جہاد کے لیے ہجرت کر جائیں، وہ دیو بند میں خفیہ جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا اور ستمبر ۱۹۱۵ء میں مولانا محمود الحسن کے ہمراہ عرب گیا تھا، اس کے سفرِ حجاز سے قبل مولانا محمود الحسن نے اس کو آزاد علاقہ میں بھیجا تھا کہ حاجی صاحب، سیف الرحمن اور دوسرے منحرف لوگوں کو مطلع کر سکے کہ حضرت مولانا کا ارادہ ہندوستان سے ہجرت کا ہے، نیز لڑائی اور جہاد کی تیاریوں کا مشاہدہ کر سکے، وہ حضرت مولانا کے ہمراہ اس وقت بھی ٹھہرا تھا جبکہ اُن کے اکثر پیرو اور مریدین ہندوستان کو واپس کروائے گئے، یہ کہا جاتا تھا کہ عُزیر گُل انور پاشا، جمال پاشا کے فرمان لے کر عنقریب ہندوستان آئے گا اور اس فرمان کو افغانستان لے جانا ہو گا، لیکن بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مکّہ میں شریفِ مکّہ کے حکم سے ۲۰ دسمبر کو یا اس کے لگ بھگ گرفتار کر لیا گیا اور جدہ بھجدیا گیا جہاں سے ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو اسے مصر روانہ کر دیا گیا، جنودِ ربانیہ کی فہرست میں مولوی عزیر گُل کا نام لے کر اسے کرنل دکھایا گیا ہے۔

(۴) ۲۱۳:- وحید، مولوی عبید اللہ نے واقعات مابعد جدّہ کے بیان میں جو خط لکھا ہے اُس میں یہ نام آیا ہے، وحید ایم صادق احمد مرحوم کا لڑکا ہے جو پہلے فیض آباد یُوپی میں رہتے تھے، ان کا سارا خاندان ۱۸۹۹ء کو عرب ہجرت کر گیا تھا، مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اس کے چچا ہیں دو برس ہوئے

وہ اپنے چچا حسین احمد کے ہمراہ ہندوستان آیا تھا اور آخرالذکر کی واپسی کے بعد بطور طالب علم مدرسہ دیوبند میں ٹھہرا رہا، مولانا محمود الحسن کے ہمراہ ستمبر ۱۹۱۵ئہ میں حجاز کو چلا گیا۔

(۵) حکیم نصرت حسین کا ذکر اس ریکارڈ میں نہیں، یہ اگرچہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک میں عملاً شریک نہ تھے مگر حضرت کے اس قدر جان نثار خادم تھے کہ یہ حج کے لیے گئے تھے، جب حضرت شیخ الہند کو گرفتار کر لیا گیا تو یہ بھی گرفتار کر لیے گئے، انگریزوں کی طرف سے مقرر کردہ سی آئی ڈی کے مسلمان افسر نے ان سے کہا کہ میں آپ کی سفارش کر کے آزاد کرا سکتا ہوں شیخ کا ساتھ چھوڑ دیں، مگر آپ نے انکار کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند کی رفاقت کو ہر تکلیف پر ترجیح دی اور اسیرِ مالٹا ہو گئے، تقدیرِ خداوندی سے مالٹا ہی میں وفات پا گئے، آپ کا مزار مالٹا میں ہے، ان کے کچھ حالات آئندہ صفحات میں آ رہے ہیں۔

ان حضرات کو مالٹا میں مندرجہ ذیل نمبر الاٹ کیے گئے (۱) حضرت مولانا شیخ الہندؒ ۲۲۱۹۔

(۲) حضرتِ مدنیؒ ۲۲۱۷ (۳) حضرت مولانا عزیر گلؒ ۲۲۱۵ (۴) وحید احمدؒ ۲۲۱۸

(۵) حکیم نصرت حسین ۲۲۱۲۔

اسیرانِ مالٹا کے مختصر حالات رہائی کے بعد

حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مدنیؒ کے حالات تو تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں مذکور ہیں، جبکہ حکیم نصرت حسین شہید کے حالات بھی ذکر ہو چکے ہیں البتہ حضرت مولانا عزیر گل صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے:۔

آپ رہائی کے بعد کافی زمانہ آستانہ شیخ الہندؒ پر بطور خادم کے قیام پذیر رہے پھر رڑکی کے دینی مدرسہ میں صدر مدرس کے طور پر رہے۔ اسی قیام میں انگریزی دور کے کمانڈر انچیف لارڈ کچنر کے خاندان کی ایک بیوہ سے، جو دینِ حق کی تلاش میں وہاں مقیم تھی، اس کی خواہش پر نکاح فرمایا۔ پھر آخر اپنے آبائی گاؤں میاں کلے (میاں خاندان کی بستی) میں آکر قیام پذیر ہو گئے، اہلیہ محترمہ نے سب آرام آپ کی خدمت پر قربان کر کے آخر تک خدمت کی سعادت حاصل کی اور قرآنِ عزیز کا انگریزی میں ترجمہ لکھا، آخر اسی گھر میں ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۶ئہ کو انتقال فرمایا، جبکہ حضرت مولانا کی بقیہ زندگی روحانی مقامات کے طے کرنے میں گذری ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ کو وہیں خلد آشیاں ہو گئے۔ نور اللہ قبورھم

مولانا وحید احمد صاحب حضرتِ مدنیؒ ہی کی تربیت میں تھے، ۱۹۲۴ئہ میں حضرتؒ نے آپ کی

شادی اپنے ماموں سید تصدق حسین صاحبؒ کی اکلوتی صاحبزادی سے فرمادی، کچھ مدت کے بعد ضلع پٹنہ کے مدرسہ عزیزیہ میں مدرس ہوگئے مگر تقدیر الٰہی سے جلد ہی بیمار ہوکر ٹانڈہ واپس آگئے، حضرت مدنیؒ حسب معمول سلہٹ میں تھے کہ یکم رمضان کو آپ کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مرحوم کی بیوہ اور تین لڑکوں اور دو لڑکیوں کی تربیت فرمائی اور ان سب کی شادیوں کے مصارف خود برداشت کیے۔ حضرت مولانا وحید احمد مرحوم کے فرزند ارجمند جناب فرید الوحیدی صاحب فاضل دیوبند، ایم اے علیگ مشہور عالم دین اور عالمی سکالر ہیں۔

ف ۱: یہاں یہ بات سمجھنی بھی ضروری ہے کہ خلافت اسلامیہ کا تحفظ صرف ان جلیل القدر علماء ہند نے کرنے کی سعادت حاصل کی، ورنہ دوسرے اسلامی ممالک نہ صرف لاتعلق رہے بلکہ مصر کے علماء مثلاً رشید رضا وغیرہ نے بھی عربوں کی حمایت میں ترکوں کی تکفیر کر دی تھی۔ (از افادات حضرت مدنیؒ)

ف ۲: یورپ کے وسط میں ترکی ہی وہ حکومت تھی (اور اب بھی ہے) جسے ختم کرنے کیلئے یورپ کے تمام ممالک متحد تھے جیسا کہ زار روس پیٹر اعظم نے جو وصایا کی تھیں ان میں وصیت ۱۰ یہ تھی کہ قسطنطنیہ (دار الحکومت ترکی) اور ہندوستان کو لینے کی ہمیشہ کوشش کریں کیونکہ جو ان دونوں ملکوں پر حکومت کرے گا وہ ساری دنیا کا فرمانروا ہوگا۔ (سلطنت عثمانیہ کے مفروضہ مظالم ص ۱۰۲)

اسی طرح ۱۹۱۱ء میں اٹلی کے طرابلس الغرب پر حملہ کے وقت نوپل شاہ اطالیہ نے یہ کہا تھا کہ اب ہمارے ہوائی جہاز مسلمانوں کے کعبہ سے بھی نمٹ سکتے ہیں۔ (انجمن خدام کعبہ ص ۱۲)

روس کو تو اپنے مذموم ارادہ کی تکمیل کی مہلت نہ ملی البتہ یورپ کے دوسرے عیسائی ملکوں نے ترکی کے خلاف سازش کی، پہلے ۱۹۱۲ء میں بلقان کی ریاستوں پر یونان نے اٹلی کے اشارہ پر حملہ کیا مگر ناکام ہوا پھر ۱۹۲۱ء میں زبردست حملہ کیا مگر عصمت پاشا کی مدبرانہ شوکت سے ناکام ہوا مگر حالات کی تبدیلی سے آخر کار خلافت آل عثمان کا چھ سو سال بعد خاتمہ ہوا۔ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۔

ف ۳: جنگ بلقان کے موقع پر سر آغا خان نے ترکوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ یورپ چھوڑ کر ایشیا چلے جائیں مگر عصمت پاشا نے سخت ناگواری کا اظہار کیا۔ (حیات شبلی از سید سلیمان ندوی ص ۵۹۴)

اسارتِ مالٹا میں ابتلاء اور استقلال

اور دیگر مشاغل

آپ اپنے مربی اور شیخ کی خدمت میں تقریباً چار سال رہے، قید تو قید ہی ہوتی ہے خواہ وہ سونے کے پنجرے میں ہو، مگر آپ نے جس استقلال اور جوانمردی سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے یہ قید کاٹی اُس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ آپ کے مشاغل کا مفصل حال تو وہی جانتے تھے جس کا اظہار آپ نے اور آپ کے رفیقِ خاص مولانا عزیر گل نور اللہ قبور ہما نے کبھی نہیں فرمایا بلکہ یہی فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے جو کیا وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کیا ہے، اِس سے زیادہ کچھ نہیں فرمایا۔ اور اجمالی طور پر "نقشِ حیات" اور "اسیرِ مالٹا" میں موجود ہے۔ یہاں اس اجمال کا بھی خلاصہ عرض کیا جاتا ہے:۔

(۱) آپ کی اسارتِ مالٹا کے زمانے میں آپ کے خاندان کے سات افراد فوت ہو گئے۔ اس عظیم حادثہ کی کیفیت الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتی، آپ کے ایک سوانح نگار حضرت فرید الوحیدی نے جو نقشہ کھینچا ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:۔

ایّامِ اسیری میں صدمات

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

حضرت جب مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے تھے تو بھرا پورا خاندان اور بسا بسایا گھر چھوڑ کر نکلے تھے، سفر صرف دو چار دنوں کا اور انتظام مختصر سی جدائی کا تھا مگر مقدر کی بات کہ سفر طویل ہوتا گیا، گرفتاری ہوئی، مصر کی جانب روانگی ہوئی، سزا ہوئی، پھانسی کی خبریں گرم ہوئیں اور مالٹا کی قید و اسارت پیش آئی۔ اُستاذ کی قربت اور اُن کی پدرانہ شفقت نے ہر مشکل آسان اور ہر مصیبت قابلِ برداشت بنادی تھی، قید و بند کی سختیاں صبر و شکر کے ساتھ جھیل رہے تھے، اچانک ایک ایسا حادثہ پیش آیا کہ کوئی معمولی انسان ہوتا تو صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ ہی جاتا، ایک دن بلا اشتباہ و گمان یہ اطلاع ملی کہ بوڑھے ضعیف باپ اور دو جوان بھائیوں کو حکومتِ ترکی نے قید کر کے ترکی روانہ کر دیا اور بچے اور کمزور عورتیں مدینہ طیبہ میں اکیلے اور بے سہارا رہ گئے کیسی عجیب اور طرفہ تماشا بات تھی کہ وہ ترکی حکومت جس کیلئے

یہ لوگ تن من دھن کی بازی لگانے کو تیار تھے اُسی نے حضرتؒ کے بوڑھے باپ اور بھائیوں کو محض اس جرم میں قید کر لیا تھا کہ وہ اصلاً ہندوستانی تھے اور ہندوستان کی حکومت اور ترکی سے لڑائی تھی، بُرا وقت آتا ہے تو روشنی بھی اندھیرا بن جاتی ہے۔

دوست دشمن می شود صائب بوقت عاجزی　　　خون زخم آہواں رہ می دہد صیاد را

حضرتؒ کے والد ماجد تو مدینہ ہی کی خاک میں پیوندِ زمین ہونے کی تمنا میں گھر بار، اعزہ و اقربا اور وطن چھوڑ کر دیارِ حبیب میں آرہے تھے، اب جو اُن کو اس طرح پابند و مجبور کر کے ترکی روانہ کیا گیا تو اللہ ہی جانتا ہو گا کہ اس طرح ناخن کو گوشت سے اور رُوح کو تن سے جُدا کر دینے کی خبر سے حضرت کے دل پر کیا گذری ہو گی۔ مدینہ منورہ میں تنہا اور بے یار و مددگار رہ جانے والوں میں بوڑھی سوتیلی والدہ، دو بیمار بھاوجیں، اہلیہ، ایک خورد سال صاحبزادے اور ایک نو عمر صاحبزادی تھیں جن کا اللہ کے سوا کوئی ظاہری سہارا نہیں رہ گیا تھا تاہم یہ معلوم کر کے کچھ اطمینان ہوا کہ۔

"مولانا عبدالحق صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ جو اُس وقت مدینہ طیبہ ہی میں تھے اور بعد میں ہندوستان آکر مدرسہ شاہی کے مہتمم ہوئے انہوں نے حتی الامکان خبر گیری اور امورِ ضروریہ کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔" (نقشِ حیات)

یوں تو اُمید ہی کے سہارے مصائب کے پہاڑ کٹ جاتے ہیں مگر حضرتؒ صبر و شکر اور راضی برضائے باری تعالےٰ کا نمونہ تھے۔ اس کے علاوہ اُمید کا ایک رشتہ برقرار تھا کہ کبھی تو یہ اندھیرے چھٹیں گے اور اُجالا نمودار ہو گا، ادھر ان چچا بھتیجوں کو رہائی ملے گی اُدھر باپ اور بھائیوں کی بیڑیاں کٹیں گی تو بوڑھے اور کمزور باپ کی آنکھیں روشن اور کلیجہ ٹھنڈا ہو گا۔ نو عمر و نوخیز بھتیجا وحید احمد جس نے آنکھ کھول کر دادا ہی کی ذات میں ماں اور باپ کی شفقت پائی تھی، ایک ایک دن انتظار میں گذار رہا تھا کہ کب وہ لمحہ میسّر ہو کہ اُجڑے ہوئے افرادِ خاندان پھر ایک جگہ مل بیٹھیں، مگر یہ کسے معلوم تھا کہ ابھی عشق کے بڑے بڑے اور کٹھن امتحان باقی تھے۔

سونا ابھی کُندن نہیں ہوا تھا اور کچھ آخری آنچوں کی کسر ابھی باقی رہ گئی تھی، عین اُس وقت جب حضرتؒ کا ایک ایک لمحہ قرآن پاک کے حفظ میں گذر رہا تھا ایک دن کئی ہفتوں کی رُکی ہوئی ڈاک ملی اور اس کے ہر خط میں کسی نہ کسی فردِ خاندان کی وفات کی خبر درج تھی۔ اس طرح ایک ہی وقت میں باپ، جواں سال بچی، ہونہار بیٹے، جاں نثار بیوی، بیمار والدہ اور دو بھاوجوں اکٹھے سات افرادِ خاندان کی موت کی جانکاہ خبر ملی دوسرے لفظوں میں دو بھائیوں کو چھوڑ کر پورا خاندان اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ موت تو برحق ہے، جس نے ماں کی گود دیکھی اُسے قبر کی آغوش دیکھنی ہی پڑتی ہے مگر جن حالات میں اور جس مجبور ماحول میں جس طرح یہ اطلاعیں ملی تھیں اُنہیں برداشت کرنے کے لیے پہاڑ جیسا کلیجہ چاہیئے تھا۔ یہ تو یاد نہیں کہ کس سے مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ گھر میں بزرگوں

سے راقم الحروف نے اس وقت کی چشم دید کیفیت سنی ہے، غالب خیال یہ ہے کہ مولانا وحید احمد نے مالٹا سے واپسی پر اہل خاندان کے سامنے اس واقعے کا تذکرہ ضرور کیا ہوگا کہ ظہر کی نماز کے بعد حضرت حسب معمول حفظ میں مشغول تھے کہ مولانا وحید احمد نے ڈاک لاکر دی، خدا کو ہی علم ہے کہ دل میں کیا خطرہ گذرا ہوگا کہ قرآن بند کیا اور خطوط پڑھنے شروع کیے، ہر خط کے ختم پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ غرض ایک ایک کرکے سارے خطوط ختم کیے، زیر لب اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ پڑھا اور پھر ٹھیک اسی طرح جیسے دس منٹ پہلے مشغول تھے دوبارہ حفظ میں مصروف ہوگئے۔ قرآن پاک کی آیت اِذَآ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِیۡبَةٌ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ کی اس سے اچھی تعبیر صحابہؓ کرام میں تو ضرور ہی ملتی ہوگی، آج کے زمانے میں تو نہ کانوں سے سنی نہ آنکھوں سے دیکھی بھتیجا وحید احمد گھر والوں کی خیریت وحالات اور خوشخبریوں کے شوق وانتظار میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا، مگر خط دیتے تو کیا کہہ کر دیتے اور بتلاتے تو کس کلیجے سے بتلاتے کہ جن پیاری اور شفیق ہستیوں کی خیر وخبر کے تم منتظر ہو وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوئیں اور جس گھر کے حالات تم سننا چاہتے ہو وہ گھر سدا کے لیے اجڑ گیا۔" ؏

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

(۲) علماء حق نے اسیری اور اپنے خاندان، وطن، دیس سے دوری پر بھی قوم کے لیے جو تحفہ پیش کیا وہ دینی خدمات کے خوبصورت اور سدا بہار گلدستے تھے۔ کالے پانی میں اسیر علماء کرام نے امت کو بہترین کتابوں کا تحفہ دیا جن میں "سیرت حبیب اللہ" قابل ذکر ہے۔ سیرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ جامع کتاب جناب مولانا محمد عنایت احمد مرحوم نے ۱۲۷۵ھ میں اس وقت تحریر فرمائی جبکہ آپ انگریزی حکومت کی طرف سے تحریک آزادی کے جرم میں جزیرہ پورٹ بلیر انڈمان میں اسیر تھے، یہ کتاب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور اور دار العلوم دیوبند میں داخل نصاب ہے۔

(۳) مفسر قرآن عزیز مولانا ابو الکلام آزادؒ نے قلعہ احمد نگر میں اسیری کے دوران "ترجمان القرآن" کا کچھ حصہ مرتب فرمایا۔

(۴) شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ قرآن عزیز کی تکمیل مالٹا کی اسارت کے زمانہ میں فرمائی، جبکہ آپ کے پاس تفسیر میں صرف "جلالین" کا ایک نسخہ تھا۔ اس ترجمہ قرآن عزیز میں حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ مذاکرات ہوتے تھے جن میں مولانا عزیر گل نور اللہ مرقدہٗ بھی شریک تھے اور یہ وہ بے بہا تحفہ امت کو دیا جو دارین میں سعادت کا ذریعہ ہے۔

ترجمۃ القرآن میں شرکت

اگرچہ قرآن عزیز کا ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ نے دیوبند ہی میں شروع فرمایا، مگر اس کی تکمیل ۲ شوال المکرم ۱۳۳۶ھ کو مالٹا میں ہوئی اور کچھ حاشیہ مالٹا میں تحریر فرمایا، اس ترجمہ اور حاشیہ کی ترتیب اور تدوین میں حضرت مدنیؒ کے ساتھ باقاعدہ مذاکرات رہتے تھے بلکہ مالٹا میں دوسرے نظر بند علماء بھی اس میں شریک ہوتے جن میں سے زیادہ ترک علماء کرام تھے، حضرت مدنی ترکی علماء کے ساتھ تفسیری مذاکرات فرماکر اردو زبان میں حضرت شیخ الہندؒ کے پیش فرماتے تھے، جیسا کہ

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ استاذ دارالعلوم دیوبند نے فرمایا۔

"قسطنطنیہ کے معمر مفتی صاحب بھی اسیر تھے اور وہ قرآنِ عزیز کا ترکی زبان میں ترجمہ کر رہے تھے، حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے، چونکہ حضرت مدنیؒ نے ترکی زبان سیکھ لی تھی اس لیے اس استفادہ میں آپ ترجمہ کی خدمت ادا کرتے تھے۔"

اسی طرح حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف کے ممتاز اور مخصوص عنوان الابواب والتراجم پر کتاب لکھنے کا ارادہ فرمایا، یہ عنوان نہایت ہی عمیق اور دقیق ہے، ہر عالم اور ہر محدث اسے پوری طرح واضح نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم علماء کرام نے اس طرف توجہ فرمائی ہے، برصغیر میں صرف حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نوّر اللہ مرقدہٗ نے اس پر عربی زبان میں ایک مختصر مگر جامع رسالہ تحریر فرمایا تھا، اسارتِ مالٹا کے زمانہ میں حضرت شیخ الہندؒ نے اس پر قلم اٹھایا، جیسا کہ حضرتِ مدنیؒ نے فرمایا۔

"مصائب و آلام کی اس بارش کے زمانہ میں کہ بڑے بڑے شجیع القلب گھبرا اٹھتے ہیں آپ نے اللہ احکم الحاکمین کے کلام کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا، یعنی اس زمانۂ اسارت میں وحیٔ الٰہی کا وہ ترجمہ مکمل کر دیا جس کو بزمانہ قیامِ ہندوستان شروع کر دیا تھا، اس اہم ذمہ داری سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کے تراجم کے متعلق ایک یادداشت تحریر فرمائی، اس وقت جبکہ آپ اس یادداشت کو تحریر فرما رہے تھے آپ کے پاس بخاری شریف کا صرف ایک نسخہ تھا اور وہ بھی مطبوعۂ مصر، جس پر نہ حاشیہ نہ حلِ لغات، شاید اسی طرح کی ایک دو کتابیں ترمذی شریف وغیرہ تھیں۔"

یہ ترجمہ ابھی چند ابواب کا ہی ہوا تھا کہ آپ ہندوستان واپس تشریف لے آئے اور چند ماہ بعد واصل باللہ ہو گئے، مگر یہ ۲۷ صفحات پر مشتمل رسالہ حسبِ ارشاد حضرتِ مدنیؒ۔

"بالجملہ یہ رسالہ اس ناتمامی کی حالت میں بھی اگر بدرِ کامل کا کام نہ دے گا تو دہ روزہ ضرور ثابت ہوگا۔"

حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عظیم کام میں اپنی شرکت یا مذاکرہ کا ذکر نہیں فرمایا جیسا کہ انکی فطرتِ سلیمہ تھی مگر خود حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس رسالہ کے مقدمہ میں اس عنوان کی اہمیت اور ضرورت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"حسنِ اتفاق سے حجۃ اللہ علی العلمین حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مستقل رسالہ اس کے متعلق حیدرآباد سے شائع ہوا اُس کو دیکھ کر امیدِ مُردہ میں جان محسوس ہونے لگی اور سودائے خام

پکنا شروع ہوا، اس کے مطالعہ سے یہ بات تو خوب دلنشیں ہوگئی کہ مؤلف رحمۃ اللہ کے بہت سے خبایا اس وقت تک زوایا میں مخفی ہیں، رسالہ نہایت عجیب ہے مگر بوجہ اجمال و اختصار اس سے پورا نفع اٹھانا دشوار ضرور ہے مگر شوقِ دیرینہ نے سب دشواریوں سے قطع نظر کرکے اس کام کا تہیہ کرادیا مگر اپنی درماندگی اور بیچارگی چونکہ ایسی نہیں کہ اس سے قطع نظر ہوسکے اس لیے مجبوراً یہ صورت نکالی کہ چند اہلِ علم فہیم ولائق کو منتخب کرکے ان کی شرکت سے یہ خدمت حتی الوسع پوری کی جاوے، حسبنا اللہ ونعم الوکیل" (مقدمہ ص۴)

ظاہر ہے ان اہل حضرات سے وہ حضرات مراد ہیں جو اس قید و بند میں خدمت کی سعادت حاصل کر رہے تھے اور ان میں حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کا مقام ممتاز ہے۔

(۵) آپ کی رسمی بیعت اگرچہ قطب الارشاد حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز سے تھی اور مقاماتِ سلوک کی تکمیل مدینہ منورہ میں فرماکر باقاعدہ حضرت گنگوہی سے مجاز طریقت ہوچکے تھے، لیکن اپنے مربّی اور شیخ سے اکتساب کا ایسا موقع کب ملتا جو مالٹا میں میسر ہوا، آپ نے خوب جی بھر کر روحانی فیض حاصل کیا اور اس کو پردۂ اخفا میں رکھا، شیخ کی طرف سے پوری توجہ اور آپ کا اس کے لیے مستعد ہونا بہت ہی مفید رہا۔ ان مراتب عالیہ کو یہ گنہگار بیان نہیں کر سکتا، البتہ حضرتؒ کے اپنے کلمات میں آپ کے مشاغل مختصراً درج کیے جاتے ہیں:۔

"مجھ کو طالب علمی کے زمانہ سے شوق تھا کہ قرآن مجید حفظ کرلوں، مگر بدقسمتی سے کبھی ایسا فارغ وقت نہیں ملا تھا کہ اس مراد کے حصول کی کوئی صورت ہوتی، مدینہ منورہ میں بڑی بڑی مشکلوں سے سورۂ بقرہ اور آل عمران کئی دفعہ یاد کیں مگر سنبھال نہ سکا اور بھول گیا، جب طائف پہنچا پھر اس کو دہرایا اور سورۂ نساء، المائدہ، الانعام یاد کریں مگر جب مکہ مکرمہ آنا ہوا پھر بھول گیا، کثرتِ اشتغال نے مہلت نہ دی کہ آگے بڑھتا یا ان ہی کی حفاظت کرتا، مالٹا پہنچکر پھر از سرنو شروع کیا چند دن تو وہاں کے انتظامات وغیرہ میں خرچ ہوگئے، اس کے بعد تقریباً نصف جمادی الاول سے آخر شعبان تک بندہ پارے یاد ہوگئے، چونکہ فارغ وقت فقط ظہر کے بعد ۱½ ۲ گھنٹے یا اس سے بھی کم ملتا تھا اسلئے زیادہ یاد نہ ہوسکا، اس رمضان میں مولانا نے فرمایا کہ — "نوافل میں سُنانا چاہئیے" — چنانچہ ہر شب میں تراویح کے بعد (جو کہ الم تر کیف سے ہوا کرتی تھیں) کیونکہ ہمارے پڑوسی (عرب زیادہ دیر تک سب کے سب نہیں کھڑے ہوسکتے تھے) نوافل میں سُنا کرتے تھے۔ رمضان شریف کے بعد پھر آگے یاد کرنا شروع کردیا مگر اس مدت میں مدینہ منورہ میں والد مرحوم کی خبر وحشت اثر اور دیگر کنبہ والوں کے رنج دہ واقعات نے تشویش بہت زیادہ کی، تاہم فضل و کرم خداوندی سے ماہ صفر تک پورا قرآن ختم ہوگیا (تقریباً دس ماہ میں) اور پھر روزانہ دور کرکے محفوظ رکھا اور دوسرے رمضان شریف میں مولانا مرحوم نے سن لیا۔ قرآن شریف یاد کرنے کے بعد مجھ کو بھی ترکی زبان کی طرف توجہ ہوئی کیونکہ یہ بھی ایک دیرینہ آرزو تھی،

آہستہ آہستہ اس میں کچھ شدید ہوگئی، مالٹا میں داخل ہونے کے وقت بلکہ اسیر ہونے کے زمانہ ہی سے میری تین آرزوئیں تھیں ۱۔ ترکی زبان سیکھنا ۲۔ قرآن شریف حفظ کرنا ۳۔ باطنی اشغال میں ترقی کرنا، خدا کے فضل وکرم سے دو اوّل تو ایک درجہ تک حاصل ہوگئیں اور تیسرا مقصد باوجود صحبتِ شیخ کامل اور فراغتِ وقت کے اپنی بدنصیبی سے ناکام رہا ؎

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ مے آرد سکندر را

مگر تاہم مجھ کو افضالِ خداوندی اور بزرگوں کی جوتیوں کے طفیل اس باب میں بہت کچھ اُمیدیں ہیں کہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ارشادِ قرآنی ہے، اہل اللہ کی عنایت اور توجہ کبھی نہ کبھی تو ضرور دستگیری فرمائے گی۔ اُولٰئِكَ قوم لا یشقی جلیسھم (الحدیث)"——— (اسیرِ مالٹا ص۷۹)

(۶) آپ کی سب سے بڑی مراد جو پوری ہوئی وہ حضرت شیخ کی خدمت تھی، اس بے نظیر خدمت کا تصور بھی آج کرنا مشکل ہے، حضرت مدنی رحمہ اللہ ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:۔

——— "ایک ماہ تک روگیٹ کیمپ میں قیام کے بعد ان حضرات کے لیے عرب کیمپ میں منتقلی کے احکام آئے روگیٹ میں عمارتیں نہیں تھیں اور خیموں میں گذر کرنا پڑتا تھا جس کی وجہ سے ——— شدید سردی سے بچاؤ کی کوئی مستقل تدبیر نہ تھی، مالٹا میں دن رات برفیلی ہوائیں چلتی تھیں، رات کو باوجودیکہ ہم اپنے اپنے کپڑوں کو پہنے ہوئے دو دو کمبل اور ایک چادر اوڑھے ہوئے گدوں پر ایک کمبل بچھائے ہوئے سوتے تھے، مگر دو ڈھائی بجے رات کو شدتِ سردی کی وجہ سے نہ نیند آتی تھی اور نہ اٹھنے کی ہمت ہوتی تھی، صبح کے وقت مجبور ہو کر نماز کے لیے اُٹھنا پڑتا تھا تو خیمے سے سر نکالنا ایک عذاب الیم کا سامنا ہوتا تھا، سرد ہوا کے اس زور کے تھپیڑے لگتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ جسم کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

عرب کیمپ میں تشریف آوری کے بعد پختہ کمروں اور مکان میں قیام ہوا اور خیموں سے نجات ملی، تاہم مالٹا کی شدید سردی میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے لیے چوبیس گھنٹے گرم پانی کا انتظام رکھنا ضروری تھا، دن میں تین مرتبہ ناشتے میں اور صبح شام کھانے کے بعد چائے بنتی تھی۔ اس کے علاوہ بعض اوقات ملاقاتیوں اور دوسرے کیمپوں سے حضرت رحمہ اللہ کی زیارت کے لیے آئے ہوئے قیدیوں کے لیے چائے وغیرہ کا انتظام بھی کرنا پڑتا تھا، روزانہ علی الصبح ناشتہ تیار کرنا اور دونوں وقت کھانا پکانا کافی مشقت طلب مشغولیتیں تھیں۔ کھانا نکالنا، لگانا، اشیائے خورد ونوش کی فراہمی کا حساب کتاب اور اسی طرح کے بہت سے کام شدید مصروفیت کے متقاضی تھے، ان سارے کاموں کی ذمہ داری حضرت رحمہ اللہ ہی نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی، دوسرے ہمراہی، ساتھی اور مخلصین بہت اصرار وکوشش کر کے کچھ ہاتھ بٹا دیتے تھے مگر بنیادی طور پر حضرت رحمہ اللہ نے یہ ذمہ داریاں اپنے ہی ذمہ رکھیں وہ چونکہ

دیگر رفقاء کھانا پکانے سے ناواقف تھے علاوہ ازیں اُن کو دیگر مشغولیتیں فرصت بھی نہ دیتی تھیں، پھر وہ مداومت بھی نہ کر سکتے تھے اور میرا ہمراہ ہونا فقط ادائیگی خدمت کی غرض سے تھا اس لیے تمام ضروری خدمتوں کو انجام دینا میرا فرضِ منصبی تھا جس کے لیے مَیں نے مالٹا پہنچتے ہی اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا اور ہر کام کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی تھی، دُوسرے رفقاء نے بسا اوقات معارضہ کیا اور کاروبار کے بعض یا اکثر حصّہ کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا، بعضوں نے نوبت مقرر کرنے کی خواستگاری کی مگر مَیں نے مخالفت کی اور یہی کہا کہ میرے فرضِ منصبی میں آپ لوگوں کو دخل نہیں دینا چاہیئے"۔ اور جب اپنا فرضِ منصبی اور ذمہ داری استاد کی خدمت ہی کو مقرر کر لیا تھا تو خدمتیں صرف کھانے اور اس کے انتظامات ہی تک تو محدود نہ تھیں چھوٹی بڑی بیسیوں ضرورتیں ہر ہر قدم پر پیش آتی رہتی تھیں جن کو حضرتؒ اپنے لیے فخر و سعادت کا باعث سمجھتے تھے اور پوری مستعدی سے انجام دیتے تھے"۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ان اسیرانِ مالٹا کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ مارچ ۱۹۱۹ء میں ایک عمدہ مضمون بعنوان "نظر بندانِ اسلام" شائع کیا، اس میں وہ فرماتے ہیں:۔

"امام العصر، شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے رفقائے کرام ہمارے دوسرے نظر بندوں کے مقابلے میں مختلف حیثیتوں سے ترجیحی پہلو رکھتے ہیں، لیکن ان کے اس شرف اور امتیاز کا کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنی نظر بندی کا آغاز اس سرزمین اور اس آبادی سے کیا جس کے ایک گوشے میں "اسلام کا سب سے پہلا نظر بند" شعب ابی طالب میں تین برس محصور رہا تھا، اور اس لیے کہا جاتا ہے کہ مولانا کو جس طرح اپنے دیگر اعمال میں سُنّتِ نبوی کے کامل اتباع کا ذوق و شوق تھا اللہ تعالیٰ نے اس آخری عمل میں بھی اسوۂ محمدی کا شرف ان کو عنایت فرمایا، سچ ہے اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ ہمارے نظر بندوں کو بایں ہمہ صعوباتِ ترکِ وطن کی تکلیف نہیں اٹھانی پڑی، لیکن اس مردِ راہِ خدا کو یہ مصیبت بھی اٹھانی پڑی، درست ہے: حسنات الابرار سیئات المقربین۔

مولانا اور اُن کے رفقاء نے جدّہ، مصر اور مالٹا میں اپنی قید کا زمانہ بسر کیا، لیکن اُن کے یہ تمام ایام جس ذوق و شوق، ولولہ و جذبات اور مبارک اشغال میں گذر رہے ہیں اور اس پیرانہ سالی میں وطن سے ہزاروں کوس دور جس ثباتِ قدم اور رسوخِ عزم کے ساتھ وہ اس سنگلاخ زمین کو طے کر رہے ہیں وہ گذشتہ ائمہ کرام کے عہدِ ماضی کی یاد زندہ کر رہا ہے۔ ایمان و تلقین، صبر و شکر، تسلیم و رضا کا بھی نظارہ ہماری آنکھوں کے

سامنے ہے، جو تاریخ کی دور بین ہم کو کبھی مکہ کے غاروں میں، کبھی بغداد و دمشق کے قید خانوں میں اور کبھی بلخ و ہرات اور نیشا پور کے زندانوں میں دکھاتی ہے تلقین و ایمان، نشرِ علم اور اشاعت حدیث کا جو فرض وہ دار العلوم دیو بند کے حجروں میں انجام دیتے تھے اب وہ مالٹا کی نمبر ۲۲۱۹ کی کوٹھڑی میں انجام پا رہا ہے۔" "معارف" اعظم گڑھ مارچ ۱۹۱۹ء

(۷) اسیرانِ حرب سے تبادلہ خیال

اگرچہ مالٹا کے اس قید خانے میں عام طور پر آزادی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملاقات کی اجازت نہ تھی کیونکہ یہ سب کے سب اپنے اپنے اوطان اور علاقوں کے ممتاز سیاسی راہنما تھے، انگریز نہیں چاہتا تھا کہ یہ آپس میں آزادانہ طریقے سے ملاقات کریں، گویا اتنا بڑا جزیرہ بھی ایک تنگ و تاریک جیلخانہ تھا مگر پھر بھی کبھی کبھار موقعہ ملتے ہی آپس میں سیاسی امور پر تبادلۂ خیال کیا جاتا تھا، کئی ایسے مسائل مالٹا کی قید میں حل ہوئے جو باہر حل نہ ہو سکتے تھے، جیساکہ مالٹا میں ممتاز جنگی قیدیوں نے حضرت شیخ الہندؒ کو یہ رائے دی کہ آپ اس طرح مسلح تحریک کو اب ختم کر دیں، بیرونی مسلمان ممالک اب خود اپنی آزادی کے لیے غیر مطمئن ہیں تو وہ آپ کی کیا مدد کریں گے، چنانچہ ہندوستان آکر تحریک کا رُخ ادھر موڑ دیا گیا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

(ف ۱) توحید اور رسالت کا علَم لے کر انگریز کے خلاف اٹھنے والے ان مجاہدین سے اللہ تعالیٰ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّتِ اسارت کو بھی مالٹا میں پورا کروانا چاہتے تھے کہ سیّدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم شعبِ ابی طالب میں تین سال نظر بند رہے۔

(ف ۲) اسارتِ مالٹا کے دوران ترجمۃ القرآنِ عزیز اور تراجم الابواب بخاری کی تالیف حضرت شیخ الہندؒ کی یادگار ہے۔

اسارتِ مالٹا میں عرب و ہندوستان کے حالات کا خلاصہ

آپ اپنے شیخ مکرم اور دوسرے احباب باوفا کے ساتھ مالٹا میں تقریباً چار سال اسیر رہے، اس مدت میں خود عرب میں جو حالات رونما ہوئے اُن کا خلاصہ عرض کیا جارہا ہے، تفصیل کے لیے دوسری ان کتابوں کا مطالعہ کیا جائے جو سقوطِ خلافت سے متعلق ہیں۔ خود ہندوستان میں جذبۂ آزادی پوری قوت کے ساتھ آجاگر ہوا اور ترکوں کے خلاف انگریزوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے اُن سے نفرت زیادہ ہوگئی۔

جلیانوالہ باغ کا حادثہ اسی اثنا میں ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر کے اس باغ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا مشترکہ جلسہ ہو رہا تھا کہ بے قصور انسانوں پر بلاوجہ گولی چلادی گئی، ۱۶۵۰ راؤنڈ چلائے گئے جس کے نتیجہ میں ۳۷۹ آدمی ہلاک اور ۱۲۰۰ زخمی ہوئے۔ اس انبوہِ کثیر میں سے کسی نے بچاؤ کے لیے نہ تو لاٹھی چلائی اور نہ ہی پتھر پھینکا، بلکہ بھاگتے ہوئے انسانوں کو بھی گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ اس ظلم و ستم کو خود برطانوی حکومت نے اپنے سیاسی مستقبل کے لیے خطرناک سمجھتے ہوئے اُس وقت کے وزیرِ جنگ مسٹر چرچل کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ اس ظالم ڈائر کی موت ۲۳ جولائی ۱۹۲۷ء کو ہوئی مگر ۱۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو سر مائیکل اوڈائر کو (جو کہ ڈائر کے مربی تھے) اودھم سنگھ نے لندن کے کاکسٹن ہال میں منعقدہ ایک جلسہ میں گولی مار کر ہلاک کر دیا، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے اودھم سنگھ نے لندن کی عدالت میں بیان دیا کہ:

"۱۹۱۹ء میں میری عمر سولہ ۱۶ سال کی تھی اور امرتسر کی فائرنگ ابھی تک مجھے یاد ہے، میں اس شخص (اوڈائر) سے سخت نفرت کرتا تھا یہ قتل کا مستحق تھا میں اپنے ملک کے لیے جان دے رہا ہوں۔"[1]

چنانچہ پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

---

[1] ماخوذ از جلیانوالہ باغ مؤلفہ ابوالہاشم ندوی

اس حادثۂ خونچکان پر علامہ اقبال نے مندرجہ ذیل اشعار کہے تھے، اگرچہ اُن کے یہ اشعار کسی مطبوعہ مجموعہ میں شامل نہیں ہوئے مگر مظفر حسین برنی نے "محبّتِ وطن اقبال" کے ص ۱۱۶ پر شائع کیے ہیں۔[1]

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ پاک
غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

تمام ہندوستان کے قومی خیر خواہوں نے اس کے خلاف احتجاج کیے، جلسے اور جلوس منعقد کیے، مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۳ دسمبر ۱۹۱۹ء کو اس ظلم و ستم کے خلاف امرتسر کانگریس کے اجلاس میں اپنے غم و غصہ اور آئندہ کے لیے اس ظالم اور خونخوار قوم سے نپٹنے کے لیے جو طریق کار ارشاد فرمایا اس کا کچھ حصہ درج کیا جاتا ہے۔

"جلیانوالہ باغ میں جو لوگ جمع تھے گولیاں اُن پر نہیں چلائیں بلکہ ہمارے دلوں پر گولیاں چلائی ہیں، اس نے ایک نئی آگ بھڑکا دی ہے جس میں ہندو مسلمانوں کی ایک نئی قوم پیدا ہو رہی ہے، اس نے ایک ایسی نئی قوم پیدا کی ہے جو انشاء اللہ روئے زمین پر کسی سے خوف نہیں کھائے گی ..... میں کہتا ہوں کہ میرا سب سے اعلیٰ بادشاہ خدا ہے اور خدا نے مجھ کو ایسا ہی آزاد پیدا کیا ہے جیسا کہ جارج پنجم کو۔"[2]

غرضیکہ ہر ہندوستانی بلا امتیاز مذہب و ملت اس ظلم و ستم کے خلاف سراپا احتجاج بن چکا تھا بلکہ خود ظالم بھی اس ظلم پر پشیمان اور شرمندہ تھا مگر اسلام اور مسلمانوں کے دشمن، انگریزوں کے نمک حلال مرزا قادیانی کے پیروکار اسے مرزا کی فتح بتلاتے ہوئے یہ ہانک رہے تھے کہ:۔

"اسی امرتسر میں جہاں اس کے مُرسل پر پتھر برسائے گئے تھے گولیوں کی بارش کرادی اور تاریخی طور پر یہ عزت بخش نظارہ ایک یادگار کے طور پر جلیانوالہ باغ کی صورت میں قائم رہ گیا، احمق اور نادان اس قسم کے واقعات سے سبق اور عبرت حاصل نہیں کیا کرتے

---

[1] بحوالہ باقیات اقبال ص ۲۳۸ [2] ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ مارچ ۱۹۸۵ء ص ۱۹۶

لیکن سُنّتِ الٰہی یہی ہے کہ وہ اپنا عتاب اور عذاب مختلف صورتوں میں نازل کرتا ہے اور خصوصاً ایسے اوقات میں کہ اہلِ قریہ بالکل غافل ہو جاتے ہیں[۱]"

یہ قدرت کی تقسیم ہے کہ انگریزوں کے ان مظالم کے خلاف جب حضرت شیخ الہندؒ اور اُن کے رفقاء علمِ جہاد بلند کر رہے تھے تو مرزا قادیانی کے پیروکار بغلیں بجا رہے تھے مگر مسلمانوں کے کئی ناعاقبت اندیش راہنمایانِ قوم خدا کی ناراضگی سے لاپرواہ ہو کر انگریز کو خوش کرنے کے لیے ان کے قدم چومنے کو تیار تھے، چنانچہ اُسی ظالم جنرل ڈائر کو جس کی فائرنگ سے جلیانوالہ باغ میں سینکڑوں انسان لقمۂ اجل بنے مسلمانوں کی راہنمائی کے دعویداروں نے برطانیہ واپسی کے وقت سپاسنامہ پیش کیا جس میں یہاں تک کہا۔

"ہم حضور سے درخواست کرتے ہیں کہ جب حضور وطن کو واپس تشریف لے جاویں تو اس نامور تاجدارِ ہندوستان کو یقین دلائیں کہ چاہے کیسا ہی انقلاب کیوں نہ ہو ہماری وفاداری میں سرِمُو فرق نہ آیا ہے اور نہ آسکتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہم اور ہمارے پیروان اور مریدان فوجی وغیرہ جن پر سرکارِ برطانیہ کے بے شمار احسانات ہیں ہمیشہ سرکار کے حلقہ بگوش اور جان نثار رہیں گے"۔ (ریاست کے فرعون ص ۴۷)

مصائب و آلام اور کشمکش کے اس دور میں ۱۹۲۱ء میں جب حضرت مدنیؒ پر خالق دینا ہال کراچی میں مشہور مقدمۂ بغاوت چل رہا تھا علامہ اقبال کو انگریز گورنمنٹ کی طرف سے "سر" کے خطاب کی پیشکش ہوئی، آپ سے پہلے گورنمنٹ نے مشہور ہندو لیڈر گوکھلے کو یہ پیش کش کی مگر اس نے جواب دیا "میں گورنمنٹ کے خلاف تحریکِ ترکِ موالات کا آغاز کر چکا ہوں اس لیے سر کا خطاب قبول کرنے سے معذرت خواہ ہوں"۔ گوکھلے کے انکار کے بعد گورنمنٹ نے علامہ اقبال کو یہ پیش کش کی تو انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ مولانا ظفر علی خانؒ نے اس واقعہ کو اپنے اشعار میں اس طرح بیان کیا ؎

گوکھلے سے جب کہا لو گے سَر — دائیں بائیں اُس کا سر ہلنے لگا

---

[۱] سیرتِ مسیح موعود مرتبہ عرفانی، شائع کردہ بک ڈپو قادیان دارالامان ص ۴۲ تاریخ اشاعت ۲۰ نومبر ۱۹۲۷ء

جب کہا حضرتِ اقبال سے　　زیر و بالا اُن کا سر ہلنے لگا
اور لوگوں نے سُنا جب یہ ماجرا　　محوِ حیرت سے گردن پہ سر ہلنے لگا

ان حالات میں انگریز کے وفاشعاروں نے کیا کیا کردار ادا کیا؟ اس بارے میں جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری صاحب لکھتے ہیں:-

عراق و شام پر قبضہ اور ترکی سے فتح مندانہ معاہدۂ صلح کی خوشی میں اکتوبر ۱۹۱۹ء کو برٹش حکومت نے ہندوستان میں جشن منانے کا فیصلہ کیا تھا، ہندوستان کے تمام انگریز پرستوں نے اس جشن کا اہتمام کیا، بے ضمیر شعراء نے سرکارِ عالیہ برطانیہ کی مدح میں قصائد لکھے، منصب و جاہ کے پرستاروں نے سجدہ ہائے تہنیت ادا کئے، علماءِ سُو اور مشائخ دنیا پرست نے برٹش استعمار کے لیے خیر و برکت اور استحکام کے لیے دُعائیں کیں، وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ جنگ کے فساد کے بعد صلح کے یمن و سعادت کا سورج طلوع ہوگا، کاش ان کے قلوب ترکی سے معاہدۂ صلح کی حقیقت سے آشنا ہو سکتے۔ (انجمن خدام کعبہ حاشیہ ۴۲)[۴۶]

انگریزی مظالم سے ہندوستانیوں کو باخبر کرنے اور انگریز دشمنی کا جذبہ تیز کرنے کیلئے "تحریکِ خلافت" کے نام سے ایک تحریک شروع کر دی گئی، جس کا پہلا اجلاس ۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں منعقد ہوا جس میں اتحادیوں اور حکومتِ برطانیہ سے اُن وعدوں کے ایفاء کا مطالبہ کیا گیا جو انہوں نے مسلمانوں سے جنگ کے دوران کیے تھے۔ اس کانفرنس سے فراغت پر علماء کرام نے اس بات کو شدّت سے محسوس کیا کہ علماء کرام کی ایک مستقل جماعت بہ نام جمعیۃ علماءِ ہند قائم کی جائے، چنانچہ ۲۸ نومبر ۱۹۱۹ء ہی کو ایک جلسہ مندرجہ ذیل عنوان سے کیا جس میں ۲۵ جید علماء کرام شریک ہوئے، چند اکابر کے اسماء گرامیہ درج ذیل ہیں:-

مولانا عبد الباری صاحب، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا نور احمد امرتسری، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا نور احمد بمبئی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا لقاء اللہ عثمانی، مولانا عبد الصمد بدایونی، سید جالب صاحب ایڈیٹر اخبار "ہمدم" جناب ابوتراب محمد عبد الحق صاحب، مولانا محمد اکرم خان صاحب (رحمہم اللہ تعالیٰ)
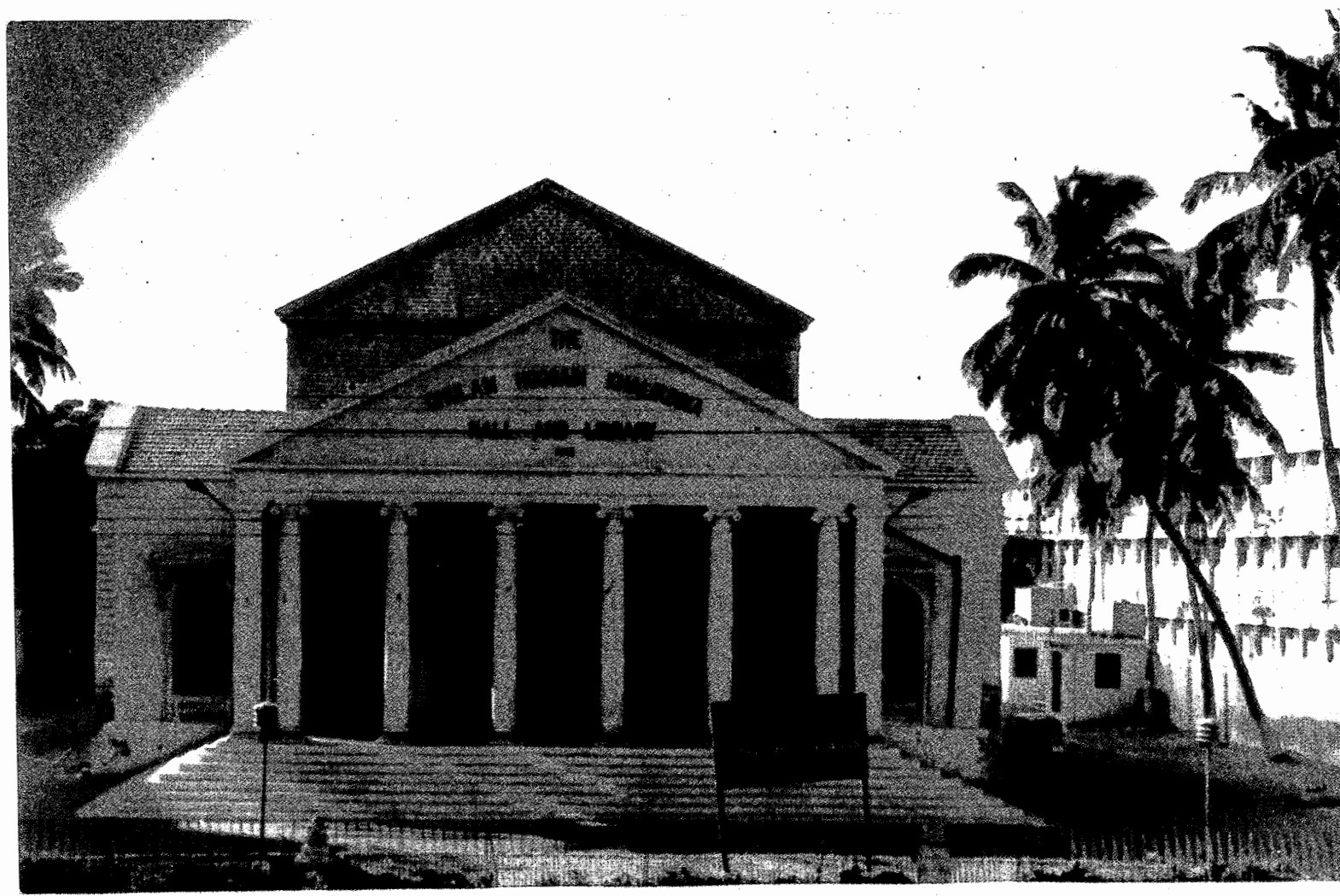
خالقدینا ہال کراچی کا ایک منظر جہاں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ پر انگریزوں کے خلاف بغاوت کے ایک مقدمہ کی کاروائی کی گئی

وغیرہم علماء کرام نے دہلی، سندھ، ممالک متحدہ آگرہ و اودھ، بنگال، بہار، بمبئی، پنجاب سے شرکت فرمائی۔

حجازِ مقدس کا حال

ترکوں سے غداری اور انگریزوں سے وفاداری کی وجہ سے حرمین شریفین پر شریف حسین اور اس کے معاونین انگریزوں نے جو ظلم و ستم کے پہاڑ گرائے اُن کی داستان تو بہت طویل ہے، یہاں اختصار کے ساتھ چند واقعات کو عبرت کے لیے درج کیا جاتا ہے کہ جن یہود و نصاریٰ کے ناپاک قدموں سے جزیرۂ عرب کو محفوظ کرنے اور محفوظ رکھنے کی وصیت سیدِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی اُن کے لیے خود عرب کہلانے والوں نے کس طرح ان مقدس ترین مقامات کی پامالی کے لیے آسانی کے ساتھ دروازہ کھول دیا تھا۔ حضرتِ مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے ان چشم دید حالات کو ایک رسالہ میں جمع فرمایا جو مرکزی خلافت کمیٹی نے شائع کیا تھا، یہاں ہم آپ کے اسیرِ مالٹا ہو جانے کے بعد کے واقعات مولانا وارثی کی کتاب "خونِ حرمین" سے نقل کرتے ہیں۔ مولانا سید غفور شاہ صاحب الحسامی الوارثی نے سفرِ حج و زیارت کے دوران ان مظالم کا ذکر کیا ہے جو آپ نے ۱۴ر جولائی ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۵ر اگست ۱۹۲۰ء تک خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، مولانا وارثی فرماتے ہیں :-

"۱۸ر جولائی کو ایک انگریز میجر کی وساطت سے دار الاعتماد میں شریف حسین کے منجھلے صاحبزادے امیر عبد اللہ سے ملاقات ہوئی جسے برطانیہ نے عراق کا سلطان کرنے کا وعدہ کیا تھا، اُس نے ترکوں پر اپنی فوقیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "ہماری سیادت ترکوں کے مقابلہ میں یقینی مرجح تھی کیونکہ ہم آلِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور خداوند قدوس کا کلام شاہد ہے کہ قُلْ لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ، خلافتِ اسلامی کا وہی مستحق ہے جو احکام الٰہیہ اور سنتِ نبوی کا پیرو ہو، مگر مذہبی نقطۂ خیال سے اُن کی حالت دن بدن بد سے بدتر ہوتی گئی، انور پاشا اور طلعت کی ناعاقبت اندیشیوں نے قوم کو برباد کر دیا"...... لیکن پھر امیر نے معاً تاسف آمیز لہجہ میں کہا کہ دیکھئے حکومتِ برطانیہ اپنے وعدوں کو کہاں تک پورا کرتی ہے اور عراق کا کیا حشر کرتی ہے"۔

اس کے بعد مولانا وارثی نے مدینہ منورہ جانے کے لیے پُر خطر راستے میں امن اور سلامتی کیلئے شاہ حجاز (شریف حسین) سے ملاقات کی، اُس نے امداد کا وعدہ کیا اور پورا بھی کیا، مگر مولانا وارثی فرماتے ہیں کہ اس کا انداز یہ بتا رہا تھا کہ وہ اس کبر سنی میں فرزانگی کی ایک تصویر ہیں۔

جب مدینہ منورہ پہنچے تو خدام روضۂ اطہر اور خطباء ائمہ سے معلوم ہوا کہ چار مہینہ سے تنخواہ نہیں ملی اور نصرانی احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں حتیٰ کہ شریف حسین کے حکم سے تین نصرانی مصری لباس میں مدینہ منورہ (حدودِ حرم توڑ کر) آئے، مسجد نبوی میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں، قیمتی قالین چوری کر لیے گئے ہیں۔

جدہ اور مکہ مکرمہ کے درمیان متعدد تازہ لاشیں ریت پر پڑی ہوئی پائی گئیں جنہیں کتے کھا رہے تھے اور گدھ نوچ رہے تھے اور بعض لوگوں کو اس بادیہ کی ریت نے اپنی آغوش میں لے کر ستر پوشی کر دی تھی۔

جدہ کی عثمانی خندقوں پر بیدردی سے گولہ باری کی گئی اور جدہ ۱۹۱۶ء کو حکومت برطانیہ کے حوالے کر دیا گیا، حتیٰ کہ کعبہ شریفہ میں بھی اس قدر ظلم و ستم کیا گیا کہ غلافِ کعبہ میں چھپنے والے بے کس و مجروح و شکستہ حال ترکوں کو بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا گیا اور مکہ مکرمہ میں بے بس ترکوں کو رسیوں سے باندھ کر مکہ مکرمہ کی گلیوں میں گھسیٹا گیا، پردہ نشین عورتوں کو پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا، جب غلافِ کعبہ میں پناہ لینے والے ترکوں پر گولیاں چلائی گئیں تو اُس وقت غلافِ کعبہ جل گیا، معصوم بچوں کو پادریوں کے حوالے کر دیا گیا۔

شریفِ مکہ کی بغاوت اور ترکوں کے خلاف جنگ و جدال کی وجہ سے اہلِ مدینہ منورہ ایسے ہراساں اور خوفزدہ ہو گئے کہ ہزاروں کی تعداد میں اپنے بال بچوں کو لے کر نقل مکانی پر مجبور ہو گئے، اگرچہ انگریزی درندوں اور ان کے امدادیوں کا نشانہ ان کی زبانی صرف ترک تھے مگر وہ تو نفسِ مسلمان کے مخالف تھے یہ تو ایک بہانہ تھا، چنانچہ غیر ترکوں پر بھی اس قدر ظلم و ستم کیا گیا کہ وہ مدینہ منورہ جیسی بابرکت اور پُر نور بستی کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، حالانکہ اس دور میں ارضِ حجاز میں نہ پٹرول تھا نہ دولت تھی، اکثر لوگ بھوک اور افلاس کے باوجود اس مبارک شہر کو چھوڑنے کے لیے کسی قیمت پر بھی تیار نہ تھے مگر ان ظالموں کے ظلم نے ان کو مجبور کر دیا۔ حضرتِ مدنی نور اللہ مرقدہٗ اس آبادی اور بربادی کو یوں بیان فرماتے ہیں:-

"مدینہ منورہ میں بڑی رونق تھی، شہر کی آبادی کم و بیش ڈیڑھ لاکھ نفوس پر مشتمل تھی، مرفع الحالی اور مالداری کے آثار پورے شہر پر نمایاں تھے، ترکی حکومت کی طرف سے شہریوں اور باشندوں کی دیکھ ریکھ کا پورا خیال رکھا جاتا تھا، نہایت شاندار خوبصورت ریلوے اسٹیشن قائم تھا، دن میں کئی کئی بار ریلیں آتی جاتی تھیں، باب مجیدی کی طرف شہر پناہ کے باہر بڑی آباد سڑکیں، شاندار مکانات اور خوبصورت دوکانیں قائم تھیں۔ جس محلے میں ہمارا مکان تھا صرف اسی محلے کی آبادی کم و بیش تیس ہزار تک پہنچ گئی تھی مگر دوسری جنگِ عظیم اور شریف حسین کی بغاوت کے بعد یہ محلہ تو اُجڑ ہی گیا بلکہ بیرونی بابِ مجیدی، جو کہ قبل از جنگِ عمومی نہایت آباد اور قیمتی متعدد محلات کو مشتمل ہو گیا تھا شریف کی بغاوت سے وہ آفت آئی کہ سارے شہر مدینہ منورہ کی آبادی صرف بارہ تیرہ ہزار رہ گئی" (نقشِ حیات شیخ الاسلام مدنیؒ ص ۶۰)

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (سورۃ ابراہیم آیت ۴۲)

ف: مدینہ منورہ کی آبادی ۱۹۱۴ء میں اسّی ہزار (۸۰)، ۱۹۱۶ء میں تیس ہزار (۳۰)، ۱۹۱۷ء میں پندرہ ہزار (۱۵)، ۱۹۱۸ء میں چند ہزار رہ گئی۔ (المدینۃ المنورہ ص ۲۶ مرتبہ ڈاکٹر صالح لمعی مصطفیٰ استاذ جامعہ بیروت)

الغرض انگریزی فوجوں نے حرمین پر وہ ظلم و ستم کیے کہ جن کے بیان سے زبان قاصر اور قلم عاجز ہے، اس کے بدلے میں شریف حسین کو ۳۰ لاکھ روپیہ ماہانہ دیتی رہی مگر اعلانِ صلح کے بعد (جب انگریز اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب ہو گئے) ساڑھے ترسٹھ ہزار کر دیا۔ آگے جو کچھ ہوا اور اب تک ہو رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ترکوں کا احترامِ حرمین

ترکوں نے حجاز پر رسمی حکومت نہیں کی کہ حجاز سے مال و دولت سمیٹ کر ترکی لے جائیں کیونکہ حجاز میں مادی طور پر کوئی چیز موجود نہ تھی بلکہ ترکوں نے تو عربوں کی خدمت کی، ان کو ہر طرح کی امداد بہم پہنچائی، اس افلاس زدہ قوم کو معاشی طور پر بے فکر بنایا اور اپنے آپ کو "خادم الحرمین" بنانے کی سعادت حاصل کی، حتیٰ کہ ایسے وقت میں بھی جبکہ باغی عرب ترکوں کے خون سے عیسائیوں کو ہولی کھیلنے کے لیے درآمد کر رہے تھے اور ریل کی پٹڑی اکھیڑی جا چکی تھی، تمام خشکی کے راستے خطرناک تھے بلکہ بند کر دیئے گئے تھے سلطنتِ عثمانیہ کے بابِ عالی نے

پانچ لاکھ روپے نقد تقسیم کرنے کے لیے اور شام ویمن سے ہر قسم کی ضروریات خاص کر غلہ کا انتظام کیا جبکہ سلطنتِ عثمانیہ خود جنگ کے بے حساب اخراجات سے دبی ہوئی تھی۔

ترک جیسی بہادر اور مجاہد قوم ان حالات میں بھی انگریزوں اور باغی عربوں کے ساتھ نپٹ سکتی تھی، وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتی تھی، اگر شکست بھی ہوتی تو عربوں کے خون اور عیسائیوں کے ناپاک خون کی بھی ندیاں بہا سکتی تھی، مگر آج دنیا میں ترک قوم کو بھی اسی طرح محرمِ حرمین کے نام سے یاد کیا جاتا جس طرح شریف حسین اور اس کے حامی عربوں کو بُرے نام سے یاد کیا جا رہا ہے اور کیا جائے گا، کیونکہ مشرقِ وسطیٰ میں عیسائیوں اور یہودیوں کے قدم جمانے کے لیے یہی لوگ زینہ بنے، اور آج خود بھی پھنس چکے ہیں، واللہ لا یھدی کید الخائنین۔

مالٹا سے ہندوستان میں تشریف آوری اور مشاغل

جب شریفِ مکہ نے انگریزوں کی حسبِ خواہش ان سربکف مجاہدین کو ۴ ؍جنوری ۱۹۱۷ء مطابق ۱۸ ؍ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ ارضِ حرم سے گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کیا تو اُس وقت حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مدنیؒ، مولانا عزیز گلؒ، مولانا وحید احمد اور حکیم نصرت حسین تھے، لیکن جب مؤرخہ ۸ ؍جون ۱۹۲۰ء کو آپ کو مالٹا سے ہندوستان واپس کیا گیا تو اُس وقت صرف ایک سپہ سالار اور تین مجاہد تھے، حکیم نصرت حسینؒ کا اسارت ہی کے دوران مالٹا میں انتقال ہو گیا تھا۔

"حکیم نصرت حسین کوڑا جہان آباد ضلع فتحپور سہوہ کے تھے حضرت شیخ الہندؒ کے مخلص ساتھی تھے وہ مشن آزادی کے باقاعدہ ممبر تو نہ تھے مگر حضرتؒ کے جان نثار تھے، جدّہ میں سی آئی ڈی کے انسپکٹر بہاؤالدین نے آپ کو مشورہ دیا کہ اگر آپ اعلان کر دیں کہ آپ کا اِس جماعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تو میں آپ کی رہائی کی صورت پیدا کر سکتا ہوں حکیم صاحبؒ نے بکمالِ استقامت جواب دیا کہ میں تو آخرت میں بھی اس جماعت اور شیخ الہندؒ کے زیرِ سایہ رہنا چاہتا ہوں، اور وہ نہایت اطمینان اور استقلال کے ساتھ ثابت قدم رہے، قضاءِ الٰہی سے نمونیہ کی مرض کا شکار ہو گئے اور مالٹا ہی میں انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ ہندوستان آزاد ہو گیا اور مرحوم کی بے چین روح کو اطمینان میسر ہو گیا، اب وہ بفضلہٖ تعالیٰ شاداں اور فرحاں برزخ میں آرام فرما ہوں گے۔"

حضرت شیخ الہندؒ جب ہندوستان تشریف لائے تو اُن کے گھر اُن کی ضعیف والدہ ماجدہ اور دیگر خاندان کے ساتھ تعزیت کے لیے سفر فرمایا ـــ باقی حضرات کے مالٹا سے روانگی کے حالات کو حضرتِ مدنیؒ نے اپنے الفاظ میں یوں بیان فرمایا:۔

"روانگی کے وقت رخصت کرنے کے لیے تمام ترکی آفیسر جو اُس وقت رہا نہیں ہوئے تھے صدرِ اعظم ترکی

سے لیکر نیچے کے عہدوں تک سب کے سب خود جمع ہو گئے تھے اور بہت زیادہ محبت اور شفقت کا اظہار فرماتے رہے، شیخ الاسلام خیر الدین آفندی نے خاص طور سے ہاتھ اٹھا کر آواز سے دعا مانگنی شروع کی اور تمام آفیسروں نے آمین کہی، آمین آمین کی آواز سے فضا گونج رہی تھی، پھر سب نے نہایت تپاک سے آبدیدہ ہو کر رخصت کیا۔ یہ مجمع اور سماں نہایت عجیب و غریب تھا، بہت سے دنیاوی وجاہت اور دولت والے مالٹا سے اس سے پہلے روانہ ہوئے مگر ایسا بڑا مجمع اور اتنے بڑے رتبے والوں کا اجتماع اور اتنی محبت اور اخلاص کا مظاہرہ اور اس ہیئت دعائیہ اور آمین کا اظہار کسی کے لیے نہیں ہوا انگریزی آفیسر بہت سے وہاں موجود تھے اس حالت کو دیکھ کر نہایت تعجب کرتے تھے مگر یہ عزت حقانی تھی جس میں نفسانیت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ وہ شخص جس نے قول و عمل میں کبھی اپنی بڑائی کا مظاہرہ نہ کیا ہو، جس کو اہلِ دولت اور اصحابِ مناصب کے اختلاط سے وحشت ہو، جس کو تکلفِ صوری اور طلب وجاہتِ دنیاوی سے نفرت ہو، جس کی چال ڈھال، بیٹھنا اٹھنا، رفتار گفتار وغیرہ سب سے مسکنت اور تواضع ٹپکتی ہو اس کی یہ عزت اور تمکنت، خلق خداوندی میں عام قبولیت اس کے انتہائی تقویٰ اور للّٰہیت اور بارگاہ خداوندی میں بلند پائیگی کا اثر نہ تھا تو کس چیز کا تھا؟ قبولیت اسے کہتے ہیں، مقبول ایسے ہوتے ہیں ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست　　　گر نہ بخشد خدائے بخشندہ

رحمة الله تعالیٰ وارضاہ وامدنا بامدادہ فی الدنیا والآخرة۔

۲۵ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۰ مارچ ۱۹۲۰ء آگبوٹ اسکندریہ پہنچا اور ۲۶ جمادی الثانی سیدی بشر میں جو کہ قرارگاہ اسرا مصر میں تھا داخل کر دیئے گئے، تقریباً اٹھارہ روز وہاں قیام کرنے کے بعد ۱۳ رجب ۱۳۳۸ھ کو مطابق ۲ اپریل ۱۹۲۰ء کو وہاں سے سویس کو روانہ کئے گئے، سویس میں بھی ہم سنگینوں کے پہرہ میں اسیروں کے کیمپ میں مثل سیدی بشر داخل کیے گئے، یہاں پورے دو مہینے کیمپ میں رہنا پڑا۔ ۵ رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۲ مئی ۱۹۲۰ء اتوار کے دن آگبوٹ پر پہنچایا گیا، ۱۲ رمضان ۱۳۳۸ھ کو جہاز عدن پہنچا، چونکہ عدن میں جہاز ایک دن ٹھہرا تھا تو ہم کنارہ پر گئے اور تین تار ہندوستان کو ایک حضرت حکیم محمد حسن صاحب کو دیوبند میں، دوسرا ڈاکٹر انصاری کو دہلی میں، تیسرا حکیم اجمیری کو بمبئی میں ہم نے دیدیا جس سے تمام احباب کو اطلاع ہو گئی، تار کے الفاظ حسب ذیل تھے: "ہم لوگ ۸ جون تک بمبئی پہنچیں گے" مختصر یہ کہ ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ ۸ جون ۱۹۲۰ء کو ۳ برس ۷ مہینے کے بعد بمبئی پہنچا کر ہم کو رہا کیا گیا۔" (نقش حیات جلد ۲ ص ۲۳۴ تا ۲۳۵)

شیخ آنے کو ہے ساتھ انکے فتا آنے کو ہے

جوں ہی حضرت شیخ الہندؒ اور اُن کے رُفقاء کی رہائی اور ہندوستان میں تشریف آوری کی خبر شائع ہوئی تو معتقدین اور متوسلین نے اپنے اپنے منظوم کلام میں اظہارِ عقیدت ومسرت کیا، یہاں صرف مولانا سراج احمد رشیدی نوراللہ مرقدہٗ (جن سے اس گنہگار نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مشکوٰۃ شریف پڑھی ہے) سابق مدرس دارالعلوم دیوبند اور معتمد المدیر القاسم والرشید کی نظم پیش کی جاتی ہے:۔

مالٹا سے اب نسیمِ جانفزا آنے کو ہے ۔۔۔ دل میں جاں آنے کو ہے عیسیٰ ادا آنے کو ہے
وہ گئے تو زندگانی کا مزہ جاتا رہا ۔۔۔ اب وہ آتے ہیں تو جینے کا مزا آنے کو ہے
اب لبوں پر خیر مقدم مرحبا آنے کو ہے ۔۔۔ قاسمِ خیرات کا وہ لاڈلا آنے کو ہے
بحرِ ہستی کا سفر آسان ہو گا بالیقین ۔۔۔ کشتیٔ طوفان زدہ کا ناخدا آنے کو ہے
ہو مبارک تجھ کو اے دارالحدیث دیوبند ۔۔۔ وہ تیرا شیخِ حدیثِ مصطفیٰ آنے کو ہے
پھر پھلے پھولے گا گلزارِ رشیدی قاسمی ۔۔۔ سالکو گھبراؤ مت تم رہنما آنے کو ہے
استقامت کی تمہیں تصویر دکھلاؤں گا میں ۔۔۔ نائبِ شرعِ شہِ ہر دوسرا آنے کو ہے
صورتِ حسن توکل جس کے چہرہ سے عیاں ۔۔۔ وہ شہِ اورنگ زیبِ اتقیا آنے کو ہے
عاشقِ شیدائے محمودؒ اے شہِ عبدالرحیم[1] ۔۔۔ آپ کا محبوب و یارِ باصفا آنے کو ہے
ہائے افسوس آج تم دنیائے فانی میں نہیں ۔۔۔ جس کے تھے تم منتظر وہ دلربا آنے کو ہے
حضرت آئیں گے حسین احمد کو بھی لائیں گے ساتھ ۔۔۔ شیخ آنے کو ہے ساتھ اُنکے فتا[2] آنے کو ہے

شیخ حسین احمد وحید احمد عزیر باوفا
دوستانِ باصفا کا قافلہ آنے کو ہے

(حیات شیخ الہندؒ ص ۱۳)

---

[1] حضرت شاہ عبدالرحیم قدس سرہٗ کا وصال ۲۰ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ / ۲۹ جنوری ۱۹۱۹ء میں ہو چکا تھا جن کے وصال پر حضرت شیخ الہندؒ نے مالٹا میں ایک مرثیہ تحریر فرمایا جو کہ "مسدسِ مالٹا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

[2] فتا سے مراد فتیٰ ہے، یہ حضرتِ مدنیؒ کی طرف اشارہ ہے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے خادم کو قرآن عزیز میں فتیٰ سے ذکر فرمایا ہے۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ (الکہف ص ۶۰)

معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو سارے راستے میں قیدی ہی کی حیثیت سے لایا گیا اور بمبئی اترنے کے بعد بتایا گیا کہ اب تم لوگ آزاد ہو۔ تاریخ عالم پر نظر ڈالنے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء خصوصاً حضرت مدنیؒ نے اسلامی خلافت کے تحفظ، وحدتِ اسلامی اور خود برصغیر کی آزادی کے لیے جو بے نظیر قربانیاں دی ہیں تاریخ ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپ نے بظاہر بے سروسامانی کے ساتھ جو عظیم منصوبہ بنایا تھا ایسا منصوبہ بڑی سے بڑی حکومت بھی نہیں بنا سکتی، اور وہ منصوبہ اس قدر مضبوط گرفت والا تھا اور چند ایسے مخلص جان نثار اس کو چلانے والے تھے کہ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو برصغیر کی آزادی کے علاوہ آج ممالکِ اسلامیہ باہم دست و گریباں نہ ہوتے اور نہ ہی یہود و نصاریٰ کو ان ممالک کی سرپرستی کا اعزاز ملتا، مگر مَاشَآءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَآءْ لَمْ یَکُنْ۔ وَھُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ۔

اس قافلہ حریت کے سپہ سالار حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کے بارہ میں اس وقت کے ترک گورنر جمال پاشا کے یہ کلمات تاریخ عالم میں سنہری حروف کے ساتھ لکھنے کے قابل ہیں کہ:۔

"شیخ الہندؒ کی مٹھی بھر ہڈیوں اور مختصر سے جثے میں کیا کرامت رکھی ہوئی تھی کہ اس نے پوری دنیائے اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔" (مکمل تاریخ دار العلوم دیوبند ص ۳۱۷)

امیر امان اللہ خان نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت پر آپ کو قافلہ حریت کا قائد تسلیم کرتے ہوئے یہ کہا تھا:۔

"مولانا محمود الحسنؒ یک کار را شروع کردند من اُو را پورا می کنم۔	حضرت مولانا محمود الحسنؒ نے ایک کام شروع فرمایا تھا میں اس کو پورا کروں گا۔"

یہ تو مجدد اعظم حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے جان نثار خدام کے اس جہاد کی مختصر مگر جامع کارروائی اور سرگذشت ہے، مگر شریف حسین کا کیا حشر ہوا؟ اس کی تفصیل کے لیے تو ایک مستقل ضخیم کتاب درکار ہے۔ یہاں اختصار کے ساتھ اس کا اور اس کی اولاد کا حشر درج کیا جاتا ہے:۔

"شریف حسین نے دنیاوی لالچ میں آکر انگریزوں کا ساتھ دیا اور اسلامی ترکی حکومت کو جو کہ اس کے آباؤ اجداد اور اولاد اور خاندان کی ولی نعمت بھی تھی کفرانِ نعمت کر کے برباد کر دیا تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ؎

با بدان یار شد شریف حسین   خاندانِ شرافتش گم شد

گویا یہ سعدی شیرازیؒ کی اس تاریخی حقیقت کا عکس تھا ؎

سگِ اصحابِ کہف روزے چند   پئے نیکاں گرفت و مردم شد

چنانچہ بہت ہی تھوڑے زمانہ کے بعد شرافت کا عہدہ اور امتیاز تمام مکہ معظمہ اور حجاز بلکہ عرب سے ہٹا دیا گیا، شریف حسین کو اُس کے آقاؤں نے ہی نظر بند کر کے جزیرہ سائپرس (قبرص) میں پہنچا دیا اور وہ اسی طرح وہاں بے چارگی کی حالت میں مرگیا، آخرت کی خبر خدا جانے۔ اس کے لڑکے شریف عبداللہ کو شرقِ اُردن کی بے برگ و بے گیاہ وادی کا چھوٹا سا ٹکڑہ اور شریف فیصل کو ماسوپوٹامیا (عراق) کا برباد شدہ اور غیر آباد صوبہ دے دیا، اور پھر جو اس کے قتل وغیرہ کے واقعات پیش آئے اُن کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔ شریف کے ساتھ غدر کرنے والے سوریا اور فلسطین کے عرب باشندوں کا جو حشر فرانس اور اسرائیلی یہودیوں کے ہاتھوں سے کرایا گیا وہ تاریخ کے سیاہ اوراق اور عربوں کے زخمی اور گہرے گھاؤ والے دلوں سے پوچھئے جن پر یورپ کی تیر اندازی آج تک ختم ہونے میں نہیں آتی اور آئے دن قیامت پر قیامت ٹوٹتی رہتی ہے، اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ؎

گندم از گندم بروید جو ز جو از مکافاتِ عمل غافل مشو

تُرک تو اپنے مقامات پر مستقل اور قابض اور حاکم رہے مگر عربوں کی پریشانیاں ختم ہونے میں نہیں آتیں، کہاں عربوں کی مستقل جمہوریت اور تمام عربی بولنے والوں کا صوبائی وفاق اور شریف حسین کی سب پر صدارت، جمہوریت جس کا سبز باغ بلکہ خوش آئند خواب برطانوی ذمہ داروں نے دکھلایا تھا اور کہاں یہ تفرق اور یہودیوں کا یہ تسلط اور ظلم و جبر اور عربوں کے لاکھوں نفوس کی جلا وطنی یہ قدرت کے عجوبات میں سے نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ" (نقشِ حیات جلد ۲ ص ۲۴۶)

اس کی مختصر سی کیفیت عالمِ اسلامی کے معروف مؤرخ حضرت علامہ مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:۔

"اسی سلسلہ کا ایک اہم حصّہ شریفِ مکہ (شریف حسین) کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنا اور ان کو خلافت کے منصب پر فائز کرنے کا وعدہ تھا۔ ۱۹۱۴ء میں جب جنگِ عظیم کا آغاز ہوا تو برطانیہ کے نمائندے اور مصر کے امور کے ذمہ دار لارڈ کچنر نے شریف حسین کے صاحبزادہ شاہ عبداللہ اور دوسرے بااثر لوگوں کے ذریعہ اتحادیوں کا ساتھ دینے اور خلیفہ عثمانی کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کرلیا اور اُن کو منصبِ خلافت پر فائز ہونے اور حجاز کا مطلق العنان حاکم بننے کے سبز باغ دکھا کر اور مؤکد وعدوں اور تحریری دستاویزوں کے ذریعہ اس اقدام پر آمادہ کرلیا جو مسلمانوں کی پچھلی تاریخ میں عرصہ دراز تک ایک بدنما داغ اور ایک شرمناک واقعہ کے طور پر ذکر کیا جاتا رہے گا، ۱۳ راگست ۱۹۱۵ء سے ۱۸ فروری ۱۹۱۶ء

تک حکومتِ برطانیہ کے مؤقر نمائندوں اور شریفِ مکّہ کے درمیان خطوط اور رسائل کا تبادلہ ہوتا رہا اور ان کو یقین دلایا جاتا رہا کہ اُن کو اس اقدام کا پورا صلہ اور انعام ملے گا۔ لیکن جنگِ عظیم کے خاتمہ پر ۱۹۱۸ء میں جب روزِ روشن کی طرح یہ حقیقت سامنے آگئی کہ یہ سب وعدے سیاسی فریب اور نقش بر آب تھے۔ ان کے بلند حوصلہ صاحبزادہ فیصل بن حسین کو شام سے جسے انہوں نے سابقہ وعدوں کی بناء پر اپنے قبضہ میں لے لیا تھا "بیک بینی و دوگوش" نکلنا پڑا، اور فرانس نے اس ملک کا چارج لیا۔ اسی طرح لبنان پر فرانس نے اور فلسطین و بیت المقدس پر برطانیہ نے اپنا انتداب قائم کیا تو ان سب معاہدات کی قلعی کھل گئی جو برطانیہ اور شریف حسین کے درمیان ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں جب عرب پورے اخلاص کے ساتھ خلافتِ عثمانی کے بالمقابل اتحادیوں کے حلیف بن کر ترکوں سے لڑ رہے تھے، روس میں کمیونسٹ انقلاب آیا اور ۱۹۱۷ء میں کمیونسٹ حکومت قائم ہوگئی، اُس وقت وہ تمام خفیہ معاہدے منظرِ عام پر آگئے جو قیصر کی حکومت کے زمانہ میں ہوئے تھے یا جس میں وہ ایک فریق تھے، انہیں معاہدات اور دستاویزوں میں سائیکس پیکو کا وہ معاہدہ تھا جو برطانیہ اور فرانس کے درمیان ۱۹۱۶ء میں ہُوا تھا جس میں فریقین نے جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد مشرقِ وسطیٰ میں سلطنتِ عثمانیہ کو مُردہ آدمی کے ترکہ کی طرح تقسیم کیا تھا اور اس کے حصّے بخرے کر دیئے تھے۔ شریف حسین کو ترکوں کے واسطہ سے جب اس کا علم ہُوا تو انہوں نے سر میکموہن سے اس کی حقیقت معلوم کی، انگریزوں نے اُس وقت بھی یہی کہا کہ وہ اپنے قدیم وعدوں پر قائم ہیں اور وہ عربوں کی آزادی اور عربی وحدت کے اعلان کا بھی عزم کر چکے ہیں، لیکن جلد ہی اس فریب کا پردہ چاک ہوگیا اور ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو برطانیہ اور فرانس نے سائیکس پیکو کے معاہدہ ہی کے مطابق شام و فلسطین و عراق کو تقسیم کر لیا، جس میں شام، صوبۂ بیروت، جبلِ لبنان و کیلیکیا فرانس کے حصّہ میں فلسطین و عراق انگریزوں کے حصّہ میں آئے، اور شریف حسین کو حجاز چھوڑ کر پہلے اپنے صاحبزادہ شاہ عبداللہ کے پاس عمّان پھر قبرص میں پناہ لینی پڑی، جہاں انہوں نے غریب الوطنی اور کسمپرسی کی حالت میں ۱۹۲۱ء میں جان دی۔

عرب فاضل محمد جمیل بیہم اپنے فاضلانہ مقالہ "انتقاضات العرب القومیۃ" شائع شدہ "مجلۃ اللغۃ العربیۃ" دمشق دسمبر ۱۹۴۷ء میں لکھتے ہیں کہ:

"میں شریف حسین سے قبرص میں جو اُن کی جلاوطنی کی جگہ تھی، جب ۱۹۲۱ء میں ملا تو روئی کے ایک تھیلہ میں بندھے ہوئے اُن معاہدات کو انہوں نے مجھے دکھایا، جب میں نے اُن سے

اُن کی یادداشتوں کے ایک سلسلہ میں ترتیب دینے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے کہا: اُترکہا علی برکات اللہ"[1]

راقم سطور جب ۱۹۵۱ء میں بیت المقدس حاضر ہوا تو مسجد اقصیٰ کی ایک حاضری کے موقعہ پر ایک معمر بزرگ سے ملاقات ہوئی جو مفتی سید امین الحسینی صاحب مرحوم کے رفیق اور معتمد رہ چکے تھے، انہوں نے کہا کہ میں ایک مرتبہ مفتی صاحب کی ہمرکابی میں شریف حسین کی عیادت کے لیے عمان گیا۔ ہمیں دیکھ کر شریف مکہ نے کہا کہ مجھے بٹھادو، اُن کو بٹھا دیا گیا، انہوں نے شاہ عبداللہ کو خطاب کرکے کہا۔

"یَا عَبْدَ اللہِ! اِعْتَبِرُ، اُذْکُرُوْا تَعِظُ" (عبداللہ عبرت حاصل کرو، ہوش کی آنکھیں کھولو، سبق لو، یہ انگریز کسی کے نہیں ہیں)

شاہ عبداللہ نے کہا کہ آرام فرمائیے، آرام فرمائیے! اور اُن کو لٹا دیا"۔

وحدت اسلامی اور عظیم تحریک اتحاد و اخوت خلافت کو ختم کرنے کے بعد فلسطین میں مغضوب علیہم یہودیوں کو آباد کرتے ہوئے اُس وقت کے برطانوی وزیر اعظم مسٹر ایٹلی نے لنکا ہاؤس (لندن) میں فلسطین کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے عربوں پر اپنا یہ احسان جتایا کہ:۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ اس امر سے متفق ہوں گے کہ اگر ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ میں برطانوی فوجیں سلطنتِ عثمانیہ کا غلبہ ختم نہ کرتیں تو عرب بہت آہستہ آہستہ قومی ترقی کرتے"۔

(انصاری دہلی ۱۲ ستمبر ۱۹۴۶ء)

عربوں کی ترقی معکوس کا حال اب دُنیا نے دیکھ لیا ہے۔ (از مرتب غفر لہٗ)

ہندوستان میں حضرتِ مدنیؒ کے مشاغل اپنے شیخ حضرت شیخ الہندؒ کے ہمراہ آپ جب ہندوستان تشریف لائے تو یہاں کے حالات اور واقعات کا نقشہ سراسر بدل چکا تھا، حضرت مدنیؒ جب گرفتار ہوئے تو وطن آباد تھا، خاندان پھلا پھولا ہوا آباد تھا۔ باپ، بھائی، بھاوجین، اہل و عیال اور گھربار اطمینان و عافیت سے آباد تھا، زندگی کا چمن سرسبز و شاداب تھا۔ اب ساڑھے تین برس کے بعد رہا ہوئے تو وطن لُٹ چکا تھا، گھر اور خاندان اُجڑ گیا تھا اور ماں باپ اور اہل و عیال ختم ہو چکے تھے، چالیس بیالیس سال کی عمر تھی، گھر تھا نہ در تھا، نہ خاندان باقی رہا تھا، نہ اہل و عیال زندہ بچے تھے ؎

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا بہار تھی نہ چمن تھا نہ آشیانہ تھا

---

[1] مجلہ ص ۲۶۸

حضرتؒ نے مدینہ منورہ جانے کی اجازت کئی بار طلب کی مگر حضرت شیخؒ نے اجازت نہ دی اور اپنے ایک علمی کام "تراجم بخاری شریف" کی تکمیل کے لیے آپ کو ٹھہرنے کا فرمایا، جس کی ابتداء اسارت مالٹا[1] کے زمانہ میں فرما چکے تھے اور وہ صرف پہلے پارہ کے کچھ حصہ تک پہنچ سکا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے آپ سے فرمایا "بخاری کے تراجم الابواب" کی تکمیل کے لیے میرے پاس ٹھہریں، حضرت مدنیؒ نے عرض کیا:-

"جو وقت جناب اس کام کے لیے عطا فرمائیں گے اُس وقت چاہے کیسا بھی بلند مرتبہ شخص آئے اُس کے لیے صرف نہ فرمائیں۔" ——— فرمایا کہ قبول ہے مگر ہماری بھی ایک شرط ہے، میں نے عرض کیا وہ کیا ہے؟ تو فرمایا کہ "پھر کہیں گے۔"[2]

اگرچہ اس شرط کا ذکر صراحت کے ساتھ کہیں بھی نہیں ملتا، مگر حضرت مدنیؒ کا قرب اور ہمراز ہونا، جان نثار ہونا صاف بتا رہا ہے کہ آنے والے واقعات اور اُن سے نبرد آزما ہونے کی ذمہ داری، دارالعلوم دیوبند کی صدارت، حضرتؒ کے مشن کی تعمیل اور تکمیل سب آپؒ ہی پر ڈالی گئی ——— حضرت شیخ الہندؒ کے اعتماد اور قرب کیلئے مندرجہ ذیل واقعہ عرض کرنا ضروری ہے:-

"چونکہ حضرت مدنیؒ نے اپنا بچپن بطور خادم خاص کے حضرتؒ کی حویلی میں گذارہ تھا، جس میں آپ سے پردہ وغیرہ نہ ہوتا تھا، مالٹا سے واپسی پر دیوبند کی حاضری کے وقت حضرت شیخ الہندؒ کی اہلیہ محترمہ رحمۃ اللہ علیہا نے حضرت شیخ الہندؒ سے اجازت طلب کی کہ دل چاہتا ہے حسین احمد کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار کروں، مگر شیخ الہندؒ نے رقت آمیز لہجہ میں جو فرمایا وہ شریعت، محبت، طریقت کا جامع ہے، فرمایا:-

"میرا بھی دل نہیں چاہتا کہ تم حسین احمد سے پردہ کرو، اگر میرا کوئی بیٹا ہوتا تو اتنی خدمت نہ کرتا جتنی انہوں نے کی ہے، مگر بہر حال شرعی طور پر سامنے آنے کی اجازت نہیں ہے۔"[3]

اسی خدمت اور تعلق کی بنا پر آپ کا عالمگیر لقب جانشین شیخ الہند زبان و قرطاس پر مرتسم ہوگیا۔

(۱) دیوبند آنے کے فوراً بعد حافظ زاہد حسن صاحب نے امروہہ کے مدرسہ عربیہ کی صدر مدرسی کے لیے حضرت مدنیؒ

---

[1] حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مالٹا میں بخاری شریف کے پہلے پارہ کے باب من اجاب السائل اکثر مما سالہ کا عنوان ہی تحریر کرنے پائے تھے کہ مالٹا سے ہندوستان تشریف لے آئے، یہاں کی شدید مصروفیات اور علالت نے تکمیل کی مہلت نہ دی، آپ کے اس ارشاد میں اس طرف اشارہ ہے۔

[2] نقش حیات جلد ۲ صفحہ ۲۵۰ [3] شیخ الاسلام مدنیؒ صفحہ ۲۲۱

کی خدمات حاصل کرنی چاہییں، اس کے لیے حضرت شیخ الہندؒ اجازت نہ دیتے تھے، بڑے اصرار کے بعد اجازت دی تو تھوڑے ہی عرصے کے بعد حکم بھیجا کہ مجھ کو تمہاری ضرورت ہے، اور فرمایا کہ تمہارے بغیر میرے لیے کام کرنا دشوار ہے۔ "ذالحرم" مدنی نمبر ص۹۷)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امروہہ کے اس مدرسہ کا مختصر سا تعارف حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں کر دیا جائے:-

"جامع مسجد امروہہ میں ایک دینی عربی مدرسہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے قائم فرمایا تھا ایک طویل عرصہ تک حضرتؒ کے شاگرد مولانا سید احمد حسن امروہوی بحیثیت صدر مدرسین فائز رہے، آپ علوم قاسمیہ کے امین تھے، بالفاظِ دیگر حضرت نانوتویؒ کے مثیل شمار کیے جاتے تھے آپ کے شاگردوں میں مشہور مفسرِ قرآن عزیز جن کا تفسیر بیضاوی پر حاشیہ بھی ہے، عبدالرحمٰن امروہوی بھی تھے۔"

(۲) مولانا ابوالکلام آزادؒ نے کلکتہ میں آل انڈیا قومی مدرسہ بنانے کا ارادہ کیا ہوا تھا جو سرکاری "مدرسہ عالیہ" کے مدمقابل ہو اس کی سربراہی کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت شیخ الہندؒ کافی کمزور اور نڈھال ہو چکے تھے اور حضرت مدنیؒ شاہی مدرسہ امروہہ کی چند ماہ مدرسی سے فقط شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضر باشی کے لیے ترک کر چکے تھے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کو کلکتہ جانے کا حکم فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ یہ خدمت میری خدمت سے زیادہ اہم اور بامقصد ہے، چنانچہ حضرت مدنیؒ حکم پر عمل کرنے پر آمادہ ہو گئے حضرت مدنیؒ کو کلکتہ روانہ کرتے وقت کا چشم دید حال حضرت شیخ الہندؒ کے حقیقی بھتیجے مولانا راشد حسن نے یوں بیان فرمایا:-

"حضرت شیخ الہندؒ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، آپ نے حضرت مدنیؒ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے تمام جسم پر پھیرا اور دعائیں دے کر خدا حافظ کہا حضرت جانے کے لیے مڑے دس پانچ قدم چلے گئے تو اُستاد نے شاگرد کو آواز دی، سینے سے لگایا، سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا جاؤ تم کو اللہ کے حوالے کیا۔ اس وقت ماحول پر عجیب کیفیت طاری تھی اور حاضرین خاص قسم کی برکات و فیوض کا وجود محسوس کر رہے تھے اہلِ تصوف اپنی اصطلاح میں ایسے مواقع کو نسبت خصوصی کی منتقلی کا لمحہ بیان کرتے ہیں۔" (شیخ الاسلام مدنی ص۲۳۸)

حضرت مدنیؒ کی اس وقت جو کیفیت ہے وہ بیان نہیں ہو سکتی کہ جس آقا کی خدمت میں سب کچھ نثار کر دیا تھا اب اُن کو بسترِ علالت نہیں بلکہ بسترِ رحلت پر چھوڑ کر جانا بہت مشکل تھا۔ مگر آپ کے سامنے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا یمن کا سفر تھا ـــــ وہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جن کے شانے پر سیدِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ مبارک رکھ کر یوں فرمایا، "اِنِّیْ لَاُحِبُّکَ یَا مُعَاذ! اے معاذ اس میں شک نہیں کہ میں تجھ سے بڑی محبت رکھتا ہوں" ـــــ اس معاذؓ کو یمن کا عامل بنا کر جب حضورِ انور بھیجنے لگے تو معاذؓ کو رخصت

کرنے کے لیے بنفسِ نفیس مدینہ منورہ سے باہر تشریف لائے اور یہ فرمایا:۔

"اے معاذؓ! یہ ہو سکتا ہے کہ تُو جب یمن سے واپس آئے تو میری یوں زیارت نہ کر سکے بلکہ تیرا آنا میری قبر پر ہو، یہ سُنکر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ زار و قطار رونے لگے۔"

اُن کی اس پریشانی کو دیکھ کر سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ:۔

"قیامت کے دن میرے قریب تر وہی لوگ ہوں گے (جنہوں نے میرا حکم تسلیم کیا تھا) جو بھی ہوں گے اور جہاں بھی ہوں گے ــــ یعنی یہ درست ہے کہ تُو بدنی طور پر مجھ سے دُور ہو جائے گا مگر حقیقی قرب تجھے حاصل رہے گا بلکہ زیادہ قرب حاصل ہو جائے گا اس لیے کہ تُو نے میرا حکم تسلیم کیا ہے۔"

اب ایک طرف تو محبوب آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا یمن جانے کیلئے حکم تھا اور دوسری طرف اسی محبوب آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی رُوح فرسا اطلاع تھی مگر آپ نے سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو واجب العمل سمجھا اور یمن تشریف لے گئے۔

ایسا ہی منظر یہاں بھی تھا کہ جس آقا کی خدمت کیلئے مالٹا جیسے جزیرہ میں تقریباً چار سال اس طرح گذارے کہ رات دن کا اپنا آرام قربان کیا، اسی عرصہ میں آپ کے خاندان کے کئی قریبی افراد موت کا شکار ہو گئے مگر آپ نے شیخؒ کی رفاقت کو نہ چھوڑا اور ایک طرف امروہہ مدارس کیلئے جانے کا حکم تھا آپ نے بادلِ نخواستہ حکم کو ترجیح دی اور کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

(۴) حضرت مدنیؒ جب کلکتہ روانہ ہوئے تو اس وقت امروہہ میں شیعہ سُنی مناظرہ طے ہو چکا تھا، دہلی کے اسٹیشن پر جبکہ آپ کا ٹکٹ کلکتہ کا تھا حضرت شیخ الہندؒ کی طرف سے اسٹیشن سے ایک ردی کاغذ پر کوئلے کے ساتھ جلدی میں یہ لکھا گیا کہ آپ پہلے امروہہ جائیں، چنانچہ حضرت مدنیؒ امروہہ اتر گئے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مرحوم فرماتے ہیں کہ:۔

"جب میں حضرت مدنیؒ کا جوابی رُقعہ (تعمیل شدہ) لے کر حضرت شیخ الہندؒ کی قیام گاہ (ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی) پر پہنچا تو حضرت پر مرض کا شدید حملہ ہو چکا تھا، دوسرے دن صبح وصال ہو گیا (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) حضرت مدنیؒ کو امروہہ کے پتہ پر وفات کی اطلاع بذریعہ تار دی گئی مگر وہ تار دوسرے دن امروہہ پہنچا اور حضرت مدنیؒ تیسرے دن علی الصباح حضرت شیخ الہندؒ کے مکان پر پہنچے۔"

ناظرین اس کیفیت و خدمت کا اندازہ نہیں لگا سکتے جو ایک ایسے جان نثار کو اس وقت پیش آئی ہو گی کہ جس نے اپنی اولاد، اپنا خاندان، اپنا آرام، اپنی جوانی جس ذات کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی نہ تو اس کے آخری غسل میں شریک ہو سکا نہ تجہیز و تکفین اور نہ نمازِ جنازہ میں، بقول شاعر ؎

پس از گل رود بلبل بہ گلشن جائے افتاد است ۔۔۔ بہ آں چشمے کہ گل دیدہ است نتواند خزاں دیدن

اُردو کے ایک شاعر کی مندرجہ ذیل رُباعی ایسی کیفیت کی عکاسی کرتی ہے ؎

چمن کے تخت پر جس دم شہ گُل کا تجمّل تھا
ہزاروں بُلبلوں کی فوج تھی اِک شور تھا غُل تھا
جب آئے دن خزاں کے کچھ نہ تھا جُز خار گلشن میں
بتاتا باغباں رو رو کہ یہاں غنچہ وہاں گُل تھا

یہ شعر بھی مناسب حال ہے ؎

وائے ناکامی نہ پُوچھو عاشقِ دِل گیر سے
ایک دل رکھتا تھا وہ بھی چھن گیا تقدیر سے

اِس فراق کی کیفیت حضرت مدنیؒ کے الفاظ میں یوں ہے:۔

"مَیں صبح کو تقریباً ۹ بجے دیوبند پہنچا حضرت کے درِ دولت پر پہنچا تو دیکھا کہ لوگ دفن سے فارغ ہو کر واپس آرہے ہیں، اپنی بدقسمتی اور بے چارگی پر انتہائی افسوس ہُوا کہ باوجود سالہا سال حاضر باشی کے شرف کے آخری وقت میں نہ وفات کے وقت حاضر رہا اور نہ دفن میں شرکت کر سکا، کلیجہ پکڑ کر رہ گیا۔" (نقشِ حیات جلد ۲ صـ۲۷۲)

(۴) حضرت شیخ الہندؒ کے حقیقی برادر زادہ مولانا راشد حسن ہی کا بیان ہے کہ:۔

"میں نے اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے برادر مولانا حکیم محمد حسن صاحب اور مولانا محمد محسن صاحب نے میرے شیخ الاسلام کو پلنگ پر بٹھایا ایک بھائی ایک طرف اور دوسرے بھائی دوسری طرف، بیچ میں شیخ الاسلام مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔ میں نے اپنے کان سے یہ بات سُنی کہ حضرت مدنیؒ نے فرمایا "اب ہندوستان میں میرا کیا ہے؟ میرے سرپرست اس دُنیا میں نہیں رہے میں بے سہارا ہوں۔" اور ان سے شیخ الہندؒ کے دونوں بھائیوں نے روتے ہوئے فرمایا بے شک! مگر فوراً حکیم محمد حسن صاحب نے فرمایا اب آپ اِس خاندان کے بڑے ہیں اور حضرت شیخ الہندؒ کے جانشین ہیں، تو چھوٹے بھائی مولوی محمد محسن صاحب نے فرمایا یہ مکان آپ کا ہے جس طرح بڑے بھائی رہتے تھے اب آپ اس میں اسی طرح رہیں گے، آپ کا قیام اس خاندان کی خوش نصیبی ہے۔"

ادھر جناب مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند مانع ہوئے اور دیوبند ہی کے قیام کا حکم فرمایا

اگرچہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حجاز تشریف لے جانے سے پہلے بھی عالمی سیاست اور اس وقت کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے اور سیاسیاتِ وقتیہ کے تمام مدوجزر سے پوری طرح واقف تھے مگر تجربہ اور مشاہدہ کی نوبت حجازِ مقدس اور پھر مالٹا کی اسارت کے زمانہ میں آئی، عالمی جنگ نے دوسرے ممالک خصوصاً بلادِ اسلامیہ کو اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ وہ اپنی جان سنبھالنے کی فکر کرنے لگے، اُس ترکی کو "مردِ بیمار" کا عنوان دیا گیا جس کی شجاعت کا سکّہ اس وقت تمام یورپ تسلیم کرتا تھا، اسکے علاوہ اسارتِ مالٹا کے دوران دُوسرے ممالک کے جنگی اسیروں سے بھی بالواسطہ یا بلا واسطہ تبادلۂ خیالات ہوتا رہا، اس لیے وطن آکر آپ نے اپنی تحریک کے لیے دو باتوں کو ضروری قرار دیا۔

(۱) ایک تو یہ کہ آزادی کی تحریک کا مرکز اور دائرۂ عمل صرف وطن ہی تک محدود رکھا جائے جس کے لیے ہندوستان میں بسنے والی تمام اقوام کو انگریزوں کے مقابلہ میں مُتحد کیا جائے کیونکہ دُوسری اقوام خصوصاً ہندوؤں نے جلیانوالہ باغ کے حادثہ کے بعد اپنی عافیت مسلمانوں کے ساتھ الحاق میں سمجھی، تحریکِ خلافت حالانکہ خالص اسلامی تحریک تھی مگر ہندوؤں کے بڑے بڑے لیڈر جیسا کہ مہاتما گاندھی وغیرہ نے اس میں عملاً شرکت کی اور چھوت چھات کے عقیدہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اتحاد کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگرچہ اس وقت حضرت شیخ الہندؒ مالٹا میں قید تھے مگر حالات سے پوری طرح باخبر تھے اس اشتراکِ عمل کے لیے دینِ اسلام کی روشنی میں ضروری شروط اور قیود کا لحاظ رکھنا ضروری قرار دیا گیا، اس لیے آپ نے باوجود شدید علالت کے جمعیۃ العلماء ہند کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹ تا ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء بہ مقام دہلی کی صدارت کو زینت بخشی اور اپنا خطبۂ صدارت پڑھنے کے لیے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو بھیجا، اس اجلاس میں آپ کی جو تحریر پڑھ کر سنائی

گئی اُس کے چند اقتباس ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

.....”جو لوگ اس وقت آپ سے علیحدہ ہیں اُن کو بھی حکمت اور موعظۂ حسنہ سے اپنی جماعت کے اندر جذب کیجئے اور اگر اس میں مجادلہ کی نوبت آئے تو وہ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَن ہونا چاہیئے۔

کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کی ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق و اجتماع کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کیلئے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورتِ حال اگر اس کے خلاف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو آئندہ ہمیشہ کیلئے ناممکن بنا دے گی، ادھر دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقش باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرفِ غلط کی طرح مٹ کر رہے گا، اس لیے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں عنصر بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو اُن اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے شکست کر سکے گی۔

ہاں یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ خوشگوار اور پائیدار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے اور وہ حدود وہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے، جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دُنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دلآزاری مقصود ہو۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے، مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حد سے گذر جاتے ہیں لیکن محکموں اور ابواب معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔

میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری یہ گذارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اُٹھانے والوں کی کثرت اور ریزولیوشنوں کی زبانی تائید سے

دھوکا نہ کھانا چاہیئے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے۔ ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیئے۔ اگر فرض کرو ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پیئے یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے اتفاق کے لیے مہلک نہیں، البتہ ان دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائیاں اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں، اتفاق کے حق میں سم قاتل ہیں، مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورہ کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انسداد کریں گے۔

اب آخر میں میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ جل شانہ، ہم کو اور آپ کو نیکی اور سمجھ دے اور ہمارے دلوں کو سیدھا کرنے کے بعد کج نہ کرے اور ہماری وجہ سے ہمارے مذہب پر دوسروں کو تضحیک کا موقع نہ دے اور ہم کو ہر ایک آسان اور کٹھن منزل میں صبر و استقلال کے ساتھ ثابت قدم رکھے اور اس وقت کے حالات سے بہتر حالات میں پھر ہم کو جمع کرے۔" آمین یا رب العلمین

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و آلہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔

آپ کا دعا گو اور خیر اندیش : محمود حسن غفرلہ

۹ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ / ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء

(۲) دوسری بات جس کو آپ نے تحریک آزادی کی کامیابی کیلئے ضروری سمجھا وہ نوجوانوں کے لیے ایسی درسگاہ کا قیام تھا کہ جس میں ایسے طلباء تیار کیے جائیں جو صرف حکومت کے کلرک بننے کے لیے محنت نہ کریں کیونکہ انگریزوں نے ان تعلیمی اداروں کو صرف اس لیے جاری کر رکھا تھا کہ یہاں سے کلرک پیدا ہوں اور انگریزی حکومت برطانیہ سے معقول مشاہرہ اور دوسری گرانقدر مراعات طلب کرنے والے کلرکوں سے بچ جائے اور ساتھ ہی ان تعلیمیافتہ نوجوانوں کو، جو قوم کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں، رزق کے ذریعہ سے اس قدر ذہنی اور اخلاقی طور پر مفلوج کر دیا جائے کہ وہ انگریزوں کے خلاف اٹھنے والی کسی تحریک کی امداد تو کیا کریں بلکہ اپنے مجازی رزاقوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایسی تحریک کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ اس لیے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی مستقل درسگاہ کی بنیاد رکھنی بہت ضروری سمجھی جس میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان مسلمان عصری تعلیم سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی حریت ضمیر کی حفاظت بھی کریں اور ایسی تحریکات کے لیے ہر قسم کی قربانی

دینے کو سعادت سمجھیں، چنانچہ اس ضرورت کے لیے "جامعہ ملیہ دِلّی" کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا سنگِ بنیاد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دستِ مبارک سے رکھا اور اس کا نام "جامعہ ملیہ اسلامیہ" تجویز ہوا، اس موقع پر مشہور ملّی شاعر حفیظ جالندھری مرحوم نے مندرجہ ذیل نظم پڑھی ۔

جامعہ ملّیہ اسلامیہ

اَدِرْ کَاسًا وَّنَاوِلْہَا اَلَا یَا اَیُّہَا السَّاقِیْ
ابھی اک اور زندہ معجزے کا ذکر ہے باقی

رسالت کے بقیہ معجزوں میں جامعہ بھی ہے
مدینے ہی سے وابستہ یہ طورِ لامعہ بھی ہے

قیامِ جامعہ ان ظلمتوں میں ان فضاؤں میں
چراغِ راہ ایسی تند زہریلی ہواؤں میں

مقابل ساحرانِ مغربی کے اِک یدِ بیضا
خدائی اتنے فرعونوں کی، تنہا جرأتِ موسیٰ

یہ ملت جب کبھی اپنی زیاں کاری کو جانے گی
وجود اس جامعہ کا معجزے سے کم نہ مانے گی

سنا ہے میں نے یہ قصہ بزرگوں کی زبانوں سے
اندھیری رات میں اک نور اترا آسمانوں سے

زمینِ ہند پر طاری تھا خوابِ خود فراموشی
مسلسل ایک سناٹا مسلسل ایک خاموشی

مسلماں سو چکے تھے دامنِ ادبار و ذلت میں
بجز عبرت کوئی پرسانِ ملت تھا نہ ملت میں

یہ عبرت ایک غیر تمند مومن کی بصیرت تھی
اسیرِ مالٹا کی حریت آموز سیرت تھی

یہ بندہ تک رہا تھا دور سے گردش ستاروں کی
نگہبانی اسے مطلوب تھی قسمت کے ماروں کی

سکوتِ مرگ کی اس وادیٔ خاموش میں گویا
اسی کے چشم و دل تھے آسمانی نور کے جویا

یہی آباد گھر دیکھا یہی اک در کھلا پایا
ملا آنکھوں کا زینہ، نور سینے میں اتر آیا

یہ شیخ الہند محمود حسن کا با صفا سینہ
وہ نور اک چاند تھا انوارِ اسلامی کا آئینہ

یہ خورشیدِ رسالت کی طرف سے اک امانت تھی
اسے امت کی آنکھوں میں بسا دینا دیانت تھی

یہ اک تازہ بشارت تھی یہ اک پیغامِ نوری تھا
اسے سینہ بسینہ منتقل ہونا ضروری تھا

جنابِ شیخ نے اس کام کا آغاز فرمایا
جگایا اہلِ دل کو محرمانِ راز فرمایا

امینِ راز تھے بحر و فلک کے بے بہا گوہر — یہ دو آنکھیں تھیں اِک دل، اجمل و انصاری و جوہر[1]
سفارش سوزِ کامل کی تقاضا دردِ بے حد کا — انہیں عہدہ ملا تبلیغِ ارشادِ محمدؐ کا
اِسی دل نے اِنہیں آنکھوں نے مل کر طرح نو ڈالی — یہی تینوں تھے کشتِ جامعہ کے اوّلیں مالی
تمنّا تھی کہ چمکے اس طرح کچھ جوہرِ خاکی — کہ جس کی دید کا مشتاق ہو خود نورِ افلاکی
وہ گرمی جس سے داغِ عشق کا شعلہ ہویدا ہو — مسلمانانِ ہندی کی نگاہوں سے بھی پیدا ہو
تھی خدمت ان کے ذمّے ظلمتِ شب کو مٹانے کی — انہیں ترکیب سوجھی چاند سے سورج اگانے کی

نگاہِ ظلمتِ مغرب نے بھی یہ ماجرا دیکھا — طلسمِ غفلتِ مشرق کا جادو ٹوٹتا دیکھا
اٹھی اندھیر گردی ہر طرف سے سر کے تعزیریں — سزائیں، ابتلائیں، تازیانے اور زنجیریں
تجلّی طورِ سینا کی بسی ہو جن نگاہوں میں — غضب کے امتحاں رکھے گئے ہیں ان کی راہوں میں
نہ سمجھو تربتوں میں اب وہ زیرِ خاک سوتے ہیں — کبھی سوتے نہیں، جو بیج بیداری کا بوتے ہیں
شہیدانِ مقاصد کو کہاں آرام ملتا ہے — بحالِ قید و آزادی، برابر کام ملتا ہے
ابھی جاری ہے اُن رُوحوں کا فیضِ کارفرمائی — طلوعِ جامعہ سے ہے عیاں اُن کی مسیحائی
پسِ مُردن ملا ہوگا انہیں اتنا ہی چین اب تک — کہ وقفِ جامعہ ہے خدمتِ ذاکر حسین اب تک
جوانمردوں نے جھیلی تھی جفا پیرانہ سالی میں — وفا کے بیج آخر بو گئے افکارِ عالی میں
وہ عالی فکر جن کو جامعہ کا باغباں کہیے — دمِ جاری و ساری مانیئے روحِ رواں کہیے
یہی سادہ سے ذاکر یارِ فیقِ کار ہیں ان کے — انہی سے پوچھیے پوشیدہ کیا اسرار ہیں ان کے
کبھی اُن کی نظر پڑتی نہیں لبابِ زینت پر — خدا رحمت کرے ان عاشقانِ پاک طینت پر
اسی اِک دائرے میں کاٹ کر مدت اسیری کی — بساتے جا رہے ہیں بستیاں روشن ضمیری کی
زمینِ شور پر ہل چل رہا ہے خشک سالی میں — کمی کرتا نہیں خونِ جگر دریا نوالی میں
یہی ذاکر جو پیکر تھا کبھی حسن و جوانی کا — ذرا پوچھو تو باعث کیا ہے اس کی ناتوانی کا

---

[1] حافظ حکیم محمد اجمل خان، ڈاکٹر انصاری خادمِ خاص حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہم

لہو کا قطرہ قطرہ وقفِ گلشن کر دیا اِس نے　　جمالِ ذات سے پھولوں کا دامن بھر دیا اِس نے

یہ چہرے نونہالوں کے یہ بازو نوجوانوں کے　　جنہیں اک روز ہونا ہے مقابل قہرمانوں کے
انہی چہروں سے دُنیا میں اُجالا ہونے والا ہے　　یہی بازو ہیں جن کا بول بالا ہونے والا ہے
ظہورِ معجزہ سے کم نہ پاؤ گے ظہور ان کا
جگر کے خون سے سینچا گیا ہے باغِ نور ان کا

اِس موقع پر نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:۔

"میں نے اس پیرانہ سالی اور نقاہت و علالت کی حالت میں آپ کی دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک متاعِ گم شدہ کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں، بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نمازوں کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے لیکن جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس اُمّتِ مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو اُن کے دلوں پر خوف و ہراس طاری ہو جاتا ہے خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب و ضرب کا، آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بیشک کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیّت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اُڑائیں یا حکومتِ وقت کی پرستش کرنے لگیں، تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا اچھا ہے۔"

یونیورسٹی کے طلباء نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ترکِ موالات کی موافقت میں فتویٰ لیا، اس کے خاص خاص نکات درج ذیل ہیں:۔

"ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہی اقتضاء ہونا چاہیئے کہ وہ ۱۔ سرکاری اعزازات اور خطابات واپس کر دے، ۲۔ ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کر دے، ۳۔ صرف اپنی ملکی اشیاء اور مصنوعات کا استعمال کرے، ۴۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے۔"

اس فتوے کو روکنے کے لیے حکومت نے بہت کوشش کی اور مولانا سر رحیم بخش کو حضرتؒ کی خدمت میں

بھیجا کہ کچھ سمجھائیں، کچھ ڈرائیں اور کچھ نتائج سے آگاہ کریں۔ مگر حضرتؒ نے حکومت کی آگاہیوں کو پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہ دی اور یہ فتویٰ خلافت کمیٹی کی طرف سے اور جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے اور پانچسو علماء کے دستخط سے شائع ہو کر ملک کے چپے چپے میں پھیل گیا۔ ان تمام مراحل میں ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے استاذ کے حکم کی تعمیل میں ان کے ساتھ اور شریک رہے ــــــ کلکتہ میں بھی اسی طرز کا ایک نیشنل مدرسہ قائم کیا گیا جس کی صدارت کے لیے شیخ الہندؒ نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو منتخب فرمایا اور اس طرح رخصت فرمایا گویا ۱۸۵۷ء کا علمِ جہاد اور بارِ امانت آپ کے حوالے کر رہے ہوں کہ جب تک دم میں دم ہے اور جب تک آزادی حاصل نہ ہو جائے یہ علم سرنگوں نہ ہونے پائے۔ یہ وہ حالات تھے، وہ ماحول تھا اور وہ احساسات تھے جن کی موجودگی میں حضرتؒ کے قلب میں دبی ہوئی معمولی سی وہ چنگاری جو مشرقِ وسطیٰ اور مالٹا کے قیام کے دوران دنیائے اسلام کی نگوں حالی پر روشن ہوئی تھی بھڑک کر شعلہ جوالہ بن گئی اور آپ نے اپنی زندگی اسلام مسلمانوں اور ملک کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔

ف :۔ جامعہ ملیہ اور کلکتہ کا مدرسہ (مدرسہ عالیہ) دراصل علیگڑھ کالج کی لادینی فضا اور انگریز نواز پالیسی کے مقابل مسلمانوں کی دینی و دنیاوی ترقی، قدیم و جدید علوم سے فائدہ اٹھانے اور جذبۂ جہاد کو نوجوان نسل میں پیدا کرنے کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کے پروگرام کا اہم حصہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ ملیہ کا سنگِ بنیاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے رکھوایا گیا مگر تعجب ہے کہ شیخ محمد اکرام صاحب جیسا مؤرخ جب اس واقعہ کا ذکر کرتا ہے تو حضرت شیخ الہندؒ کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ چنانچہ جامعہ ملیہ کی تاسیس کا ذکر کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں :۔

ــــــ "اسلامی ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں ایک نہایت دلچسپ ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ہے جس کی بنیاد ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی مرحوم نے چند دوسرے بزرگوں کی رفاقت میں ڈالی"۔ ــــــ

(موجِ کوثر ص ۱۴۵)

شیخ محمد اکرام صاحب موجِ کوثر ص ۲۰۳ پر علی گڑھ کالج کی انگریز نواز اور جہاد سوز پالیسی کے مقابل حضرت شیخ الہندؒ کی کوششوں کا ذکر کرتے ہیں، جامعہ ملیہ کے یومِ تاسیس کے موقع پر ان کے خطبہ صدارت کا ذکر کیا ہے مگر وہاں بھی اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ جامعہ ملیہ کی تاسیس میں حضرت شیخ الہندؒ کا کیا کردار تھا۔

آستانہ شیخ الھندؒ پر قیام اور دینی، ملّی خدمات

خلافت کے موضوع پر حضرتِ مدنیؒ کے خُطباتِ صدارت کا خُلاصہ

حضرتِ مدنیؒ اپنے شیخ مکرم کے ہمراہ ۸ رجون ۱۹۲۰ء مطابق ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو قیدِ فرنگ سے آزاد ہوکر بمبئی کے ساحل پر بحری جہاز سے اُترے، چند ماہ کے بعد حضرت شیخ الہندؒ واصل باللہ ہوگئے قوم نے آپ کو اُن کا جانشین سمجھ کر ان کے ارشادات سننے کے لیے کئی جلسے منعقد کیے، ان تمام جلسوں میں حضرتِ مدنیؒ کی تقریر کا موضوع مندرجہ ذیل چھ باتیں تھیں:۔

۱۔ خلافت کی ضرورت اور اہمیت، ۲۔ ترکوں کی شاندار خدمات کی وجہ سے مستحق خلافت ہونا، ۳۔ ترکوں کے خلاف بے دینی کے پروپیگنڈہ کا دفاع، ۴۔ عربوں کی قومیت کے نعرہ کا نقصان دہ ہونا، ۵۔ اس جنگ میں اسلامی ممالک پر مظالم، ۶۔ خود ہندوستانی مسلمانوں کے جانی اور مالی نقصان پر تبصرہ۔

پہلا جلسہ سیوہارہ میں ۲۱ رفروری ۱۹۲۱ء کو منعقد ہوا جس میں آپ کے خطبہ کے منتخب ارشادات یہ ہیں:۔

(۱) خلافت کا مسئلہ کوئی نیا اور کمزور مسئلہ نہیں کہ جس کو لاابالی پن سے ٹال دیا جائے، اس کی طرف دل ودماغ زبان وقلم، قوتِ مادی اور روحی کو متوجہ نہ کیا جائے۔

(۲) خلافتِ عربیہ نے اپنی سطوت وشوکت اور عزتِ اسلام وقوتِ دیانت کو شرق سے غرب تک پھیلایا، مگر جبکہ اقامتِ دین میں سستی اور حفاظتِ اسلام میں کاہلی کرنے لگے، عیش وراحت میں شب وروز گذرنے لگے .... یہ امر خلافت اور امارتِ عرب اور قریش سے نکل گیا اور اس قوم کے سر پر تاج زریں ہوکر چمکا ہے جس نے فقط اپنی سطوت ہی سے اس دین کی حمایت کا

بیڑا نہیں اٹھایا بلکہ اس نے اپنے خون سے بھی ہر نونہالِ اسلام کو سینچا، وہ اس رشک دار گھاٹی میں گھٹنے ٹیک کر سدِ سکندری میں بیٹھی جہاں سے یورپین یاجوج وماجوج ہمیشہ فساد اور مظالم کے سیلاب بہاتے تھے۔

(۳) غازی عثمان کا وصیت نامہ میں اس وقت غازی عثمان موسسِ خلافتِ ترکیہ قدس اللہ سرہ العزیز کے اُن کلمات کو یاد دلاتا ہوں جو کہ انہوں نے اپنی وفات کے وقت اپنے بڑے صاحبزادے ولیعہد غازی آدرخان مرحوم ومغفور کو لکھے تھے، وہ وصیت نامہ اب تک اس سلطنت میں محفوظ چلا آتا ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

"بیٹا شریعت کے عادلانہ قانون کے سوا کسی قانون کی ہوس نہ کرنا، علماء کی رعایت کرنا، اہلِ علم کو اپنی مملکت میں کھینچ لانا، جس طرح میں محض اعلاءِ کلمہ خداوندی کی غرض سے جہاد کرتا ہوا مظفر ومنصور رہا تو بھی میری پیروی کرنا، ملک گیری اور فرمانروائی ہمارا قصد نہیں، رعایا میں عدل وانصاف اور خبر گیری جاری رکھنا، غیر عادل بادشاہ کے لیے بادشاہی محض افسانہ ہے"۔

یہ وصیت نامہ میرے پاس ترکی زبان میں محفوظ ہے۔

دوسرا جلسہ انجمن علماء بنگال کے زیرِ اہتمام ہیما گنج ضلع رنگ پور میں مؤرخہ ۲۵ مارچ ۱۹۲۱ء کو آپ کی صدارت میں منعقد ہوا جس کے خطبۂ صدارت کے چند اقتباسات ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

(۱) علماء کرام کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:۔ "اے علماء کرام! اور اے رہروانِ قافلۂ اسلام! کیا اب بھی آپ کو ان غرق کن تھپیڑوں کا احساس نہیں؟ کیا ایسی صواعقِ محرقہ آپ کو بیدار نہیں کر سکتیں؟ کیا اس سے بھی کسی شدید اور مہلک جھگڑے کا آپ کو انتظار ہے؟ ذرا آنکھیں کھولیے، دائیں اور بائیں نگاہیں دوڑائیے، خوابِ خرگوش سے بیدار ہوجیے، دیکھئے وحشی بھیڑیوں نے عالم میں کیا اودھم مچا رکھی ہے، کس طرح سفاک قومیں عالمِ اسلام اور دنیائے ایشیا وافریقہ کا خون نہایت بیدردی سے پی رہی ہیں، عرشِ خلافت متزلزل ہوگیا، آفتابِ مقاماتِ مقدسہ گہن میں آگیا، اسلام اور مسلمانوں پر ہر طرح کے مصائب کی دھواں دھار بارش ہو رہی ہے، آپ ہیں کہ انہیں نفسانی جھگڑوں میں سرشار، انہیں فروعی اختلافات میں مدہوش، انہیں قدیمی نزاعات اور خیالی مخاصمت میں روز وشب مست"۔

(۲) خلافتِ ترکیہ کی تاریخ مختصراً بیان کرتے ہوئے فرمایا :۔ ”ابتداء میں خلفاء عباسیہ مصر نے شاہانِ تُرک کو ”سلطانِ رُوم“ کا لقب عطا فرمایا اور پھر عہدِ سلیمان یا ورحوم و مغفور میں جملہ تبرکاتِ نبویہ اور حرمین شریفین کی کنجیاں وغیرہ دیتے ہوئے ”ملقب بخلافت“ کیا، مشرق سے مغرب تک کے مسلمان اور غیر مسلم قومیں اب تک ان کی خلافت کی قائل رہی ہیں اور معاہداتِ دول (عالمی معاہدات) میں ہمیشہ ان کا اعتبار ہوتا رہا۔“

(۳) یورپین سفاکوں اور ظالموں پر ترکوں کی ہیبت اور سطوت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا :۔ ”ابھی ابھی کی بات ہے کہ یورپ میں اگر ماں بچے کو رونے سے چُپ کرانی تھی تو کہتی تھی چُپ کر دیکھ وہ ترک آ گئے۔“

(۴) شریفِ مکّہ کی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :۔ ”شریف حسین وہاں پر مثل نواب حیدرآباد اور راجگان مالوہ ایک محکوم حکمران ہے بلکہ ان نوابوں سے اور راجاؤں سے بھی کمزور اور بے دست و پا ہے، اُن کے ملک میں اس قدر اموال اور غلّہ بھی ہے جس سے وہ اپنی بسر اوقات کر سکتے ہیں مگر شریفِ مکّہ کے ملک میں نہ اموال ہیں اور نہ غلّہ کی اس قدر پیدائش کہ جس کے ذریعہ سے وہ اپنی اور اپنی رعایا کی زندگی کا تکفل کر سکے بلکہ اگر برطانیہ اپنی دادودہش بند کر دے تو زندگی بھی دشوار ہو جائے، ان دنوں تو وہاں کی حالت یہ ہے کہ عہدہ داروں کو دو دو تین تین ماہ کی تنخواہ نہیں ملتی، گرانی نہایت سخت ہے، پھر کیا وہ کٹھ پُتلی کے بادشاہ سے زیادہ وُقعت رکھ سکتا ہے۔“

(۵) اسی خطبہ میں آپ نے انگریزوں کی فتوحات کے چراغ میں ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے خون کے جلنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :۔ ”تقریباً تیس یا پینتیس جنگیں ہیں جو کہ ہند اور بیرونِ ہند اس زمانہ میں واقع ہوئیں جن میں نہایت بیدردی کے ساتھ ہندوستانی خون کی ندیاں بہائی گئی ہیں، خواہ وہ کابل کی متعدد جنگیں ہوں یا حدود کے وقائع، بلوچستان کے کارزار ہوں یا مصر اور سوڈان کی لڑائیاں، سومالی لینڈ، افریقہ، مشرقی چین، برما، نیپال، مرہٹہ، سکھوں وغیرہ کی متعدد لڑائیاں تو تھیں ہی، صرف اسی جنگِ عمومی کے ضائعات کے شمار میں آپ ہندوستانی خون کو کئی صدیوں کے خون سے بہت زیادہ پائیں گے، یہ جانیں

فقط ایک میدان میں ضائع نہیں ہوئیں بلکہ افریقہ، مشرقی اور مغربی جرمنی کی نوآبادیوں میں سینا، فلسطین، سویز، سوریا، عراق، یمن، سالونیکا، اٹالیا، فرانس، مصر، اناطول قفقاز وغیرہ میں عموماً ہندوستانی خون بہایا گیا ہے جس کی کثرت کو آپ ہجومانہ حرکت اور مشین گنوں، بڑی بڑی توپوں اور میٹرز بندوقوں وغیرہ کا مقابلہ خیال فرمائیں گے، بخوبی سمجھ سکیں گے۔

اہلِ بصیرت فقط ہندوستانیوں کے ضائعات کا اس جنگ میں ستر اسی لاکھ سے کم کا کسی طرح اندازہ نہیں لگاتے پھر اس پر اگر اُن ضائعات کو بھی اضافہ کرلیں جو جنرل ڈائر اور دیگر مشفقین برطانیہ کی عنایتوں سے ہندوستان، پنجاب، کانپور، دہلی، کلکتہ وغیرہ میں واقع ہوئے تو اُس کی حد وانتہا ہی نہیں رہتی، ذرا ایمانداری سے سوچ کر اندازہ کیجئے۔۔۔۔"

تیسرا جلسہ دہلی میں ۲۳ راگست ۱۹۲۱ء کو آپ کی صدارت میں ہوا جس میں آپ نے مسلمانوں خصوصاً ترکوں کے خلاف عیسائیوں کے مظالم کا کچھ حصہ بیان فرمایا، جس کا مختصر اقتباس درج ذیل ہے:-

"۔۔۔۔۔ اسلامی دنیا پر (مظالم کے) وہ پہاڑ ڈھائے گئے کہ خود عیسوی دُنیا چیخ اُٹھی، بطور مُشتے نمونہ از خروارے کچھ عرض کرتا ہوں:- اُنیسوی صدی کا آنا کیا ہوا کہ اسلام پر یورپ نے ہر طرف سے قیامت برپا کردی، ۱۸۰۷ء میں انگریزی جہازوں نے ناگاہ گیلی پولی کے بیڑہ پر حملہ کر کے ڈبو دیا۔

۱۸۳۱ء میں یورپ نے یونان کو ترکوں سے بغاوت پر ورغلایا، اسکندر البلانٹی بغاوت کے علمبردار تھے جنہوں نے روسی مدد کا پورا یقین یونان کو دلایا تھا، جن کے الفاظ یہ ہیں:"تم (یونانیو) تُرکوں سے ڈرو نہیں کیونکہ ایک بڑی سلطنت تمہاری پُشت پناہ ہے اور دشمنوں کی سرکوبی کے لیے موجود ہے"۔

روسیوں نے جب ڈینیوپ کو عبور کیا تو انہوں نے ہزارہا ترکی عورتوں اور بچوں کو شہر شملا میں جمع کر کے ان کے ساتھ جو برتاؤ کیا اس کا حال سترہ ۱۷ سر برآوردہ یورپین اخبارات کے نامہ نگاروں نے چشم دید بیان کیا ہے۔ ڈیلی ٹیلیگراف، مانچسٹر گارڈین، مارننگ پوسٹ، ٹائمس کے نامہ نگار ان میں شامل ہیں، ان کے بیان کو ترکی وزیرِ خارجیہ نے ۲۱ر جولائی ۱۸۸۷ء کو پیرس روانہ کر دیا تھا اور جس میں لکھا تھا کہ ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اُس بربریت کی اطلاع دُنیا کو کر دیں جو بلغاریوں کے ہاتھوں ہم نے خود دیکھی ہے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے زخمی عورتوں، بچوں اور

بوڑھوں کو دیکھا ہے جن کے جسم سے خون کے فوارے جاری تھے، ان سے معلوم ہوا کہ روسیوں اور بلغاریوں نے ہر ہر گاؤں میں مسلمانوں کو اس طرح ذبح کیا ہے جس طرح بھیڑیں ذبح ہوتی ہیں" ہم نامہ نگار علی الاعلان کہتے ہیں کہ زخمیوں میں اکثر عورتیں اور بچے تھے"۔

یہ تمام جلسے ان تمام جماعتوں کے انفرادی جلسے تھے، جولائی ۱۹۲۱ء میں آل انڈیا کانفرنس کراچی میں خلافت کمیٹی کی طرف سے مقرر ہوئی، جس میں شرکت کے بعد آپ پر اور آپ کے رفقاء پر وہ مقدمہ چلایا گیا جو مقدمہ کراچی کے نام سے مشہور ہے۔

(ف) جمعیۃ العلماء کے کئی اجلاسوں میں مسئلہ خلافت پر کافی زور دیا گیا، یہ صرف ایک سیاسی مسئلہ نہ تھا بلکہ اس کا تعلق اور اصلی محرک جزیرۂ عرب کی یہود و نصاریٰ سے حفاظت تھی۔ اس پر تفصیل کے ساتھ سمجھنے کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی مرتبہ کتاب مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب کا مطالعہ ضروری ہے، یہاں اختصار کے پیش نظر مولانا آزاد کے خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ العلماء منعقدہ نومبر ۱۹۲۱ء لاہور سے صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے، آپ نے فرمایا:۔

"مسئلہ خلافت کے سلسلے میں اس صحبت میں مجھ کو جو کچھ عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مسئلہ خلافت کے متعلق جو ہمارے مطالبات تھے اس میں نہ تو کچھ گھٹا سکتے ہیں نہ بڑھا سکتے ہیں، نہ کوئی قدم پیچھے لے جا سکتے ہیں، نہ داہنے لے جا سکتے ہیں نہ بائیں، اس میں کسی طرح کا سمجھوتہ یا مفاہمت کا سوال نہیں پیدا ہو سکتا، اس بارے میں مسلمانوں کے مطالبات یہ تھے کہ جزیرۃ العرب کو غیر مسلم اثر سے بالکل پاک کر دینا چاہیئے۔ جزیرۃ العرب کے متعلق ہمارا یہ اعلان تھا کہ جزیرۃ العرب صرف حرمین کا نام نہیں ہے بلکہ عراق کا دو تہائی حصہ بھی حسب جغرافیہ اس میں داخل ہے، اس لیے عراق کی زمین، بصرہ کا علاقہ اور بغداد کا علاقہ جزیرۃ العرب میں داخل ہے۔ جس وقت تک انگریزوں کا اثر جزیرۃ العرب کی ایک چپہ زمین پر باقی رہے گا مسلمانان عالم کے لیے ناممکن ہے کہ وہ ایک لمحہ کیلئے بھی صلح و سمجھوتہ کا ہاتھ برٹش گورنمنٹ کی طرف بڑھا سکیں، جس وقت ایک چپہ زمین پر ایک انچ زمین

پر اتنے حصّہ پر کہ جتنے حصّہ پر عراق کے اڑنے والے گرد و غبار کا ایک ذرہ آ سکتا ہے، اگر انگریزی حکومت کا بلا واسطہ ہاتھ باقی رہے، یہ مسلمانوں کے لیے آسان ہے کہ بچھوؤں کے ساتھ، سانپوں کے ساتھ صلح کر لیں، پہاڑوں کے غاروں اور بھٹوں میں چلے جائیں وہاں درندوں کے ساتھ صلح کر لیں مگر یہ ممکن نہیں کہ انگریزوں کے سامنے صلح کا ہاتھ بڑھائیں۔"

ف:۔ یہ تمام محنت اور جد و جہد علماء حق نے اس لیے کی تھی کہ کسی نہ کسی طرح عالم اسلام متحد رہے، خصوصاً ترکی جیسی مجاہد قوم کے خلاف ہر حربے کو ناکام کیا جائے، علماء حق نے اپنی اپنی بصیرت کے پیش نظر کام کیا جیسا کہ فرنگی محل لکھنؤ کے جلیل القدر عالم باعمل مولانا عبدالباری نور اللہ مرقدہٗ نے خُدامِ کعبہ کے نام سے ایک انجمن قائم فرمائی جو خالص دینی اور مذہبی انجمن تھی مگر انگریز نے اس کو بھی اپنی حکومت کے لیے خطرناک سمجھ کر علماء سے فتاویٰ حاصل کیے جن میں رئیس بریلی مولانا احمد رضا خان صاحب کا مفصّل فتویٰ بھی تھا جس پر تنقید کرتے ہوئے مولانا عبدالباری ؒ نے فاضل بریلوی کو ایک مفصل خط لکھا جس کی چند سطور درج ذیل ہیں:۔

"آپ نے جمعیت خدام کعبہ کی تکفیر کی اور اس کی مخالفت کی، اس کو باطل جہاد کہا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ (۱) حرم محترم کی بے عزتی ہوئی (۲) مدینہ طیبہ کی بیحرمتی ہوئی (۳) قرآنِ عثمانی چھن گیا (۴) جزیرۃ العرب پر کفار کا قبضہ ہوا (۵) بغداد میں شرابوں کی دکانیں کھلیں (۶) بصرہ میں بت خانہ بن گیا (۷) شہر بیت المقدس پر صلیب نصب ہوئی (۸) شام پر کفار قابض ہو گئے (۹) قسطنطنیہ نرغۂ اعداء میں ہے (۱۰) خلیفۃ المسلمین قید ہو گئے (۱۱) حرم کے ہر ذرہ ذرہ کی بیحرمتی کا عصیان آپ کے سر پر ہے، قرآن شریف مذکور کی ایک ایک آیت بلکہ ہر ہر لفظ بلکہ تمام حروف کے ساتھ جو بے ادبی ہوئی ہے اس کا پشتارہ آپ کی کمر پر ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہر قطرۂ خون سے آپ کا دامن آلودہ ہے چپہ چپہ جزیرۃ العرب کا آپ کے گریبان میں طوق ہو تو کوئی تعجب نہیں، بغداد کی سرکار آپ کی شاکی ہوں، شہداء کربلا آپ کے فریادی ہوں، امیر نجف

آپکے افعال پر نفرت کریں تو بجا ہے، بصرہ کی رابعہ رحمۃ اللہ علیہا اور امام بصری اور حواری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے نصاریٰ کی موالات سے بیزار ہوں تو حق ہے، یہ صلیب جہاں جہاں لہرا رہی ہے سب آپکے دامانِ بے غیرتی کی حرمانِ نصیبی کا پرچم ہے، ارواحِ صلحاء آپ کے سکوت سے متحیر ہیں، دار الخلافت آپ سے شرمندۂ احسان نہیں ہے، خلیفہ ایسے یزیدوں سے نالاں نہ ہو تو کیا کرے؟"..... الخ (انجمن خدام کعبہ ص۲)

ان سطور سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ترکوں کو متحد رکھنا اُس وقت کی صرف سیاسی ضرورت نہ تھی بلکہ مذہبی ضرورت بھی تھی، عالم اسلام کی نظریں ترکوں پر لگی تھیں، اس کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے ایک ترک قوم اور مؤسس خلافتِ ترکیہ کی مذہبی حمیّت بھی تھی۔ چنانچہ غازی عثمان مؤسس خلافتِ ترکیہ قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے بڑے صاحبزادے ولی عہد غازی آدرخان مرحوم و مغفور کو وصیت فرمائی :۔

"بیٹا شریعت کے عادلانہ قانون کے سوا کسی قانون کی ہوس نہ کرنا، علماء کی رعایت کرنا، اہلِ علم کو اپنی مملکت میں کھینچ کر لانا، جس طرح میں محض اعلاءِ کلمۂ خداوندی کی غرض سے جہاد کرتا ہوا مظفر و منصور ہوا تو بھی میری پیروی کرنا، ملک گیری ہمارا مقصد نہیں (رعایا میں) عدل و انصاف اور خبر گیری جاری رکھنا، غیر عادل بادشاہ کے لیے بادشاہی محض افسانہ ہے۔"[۱]

---

[۱] حضرت مدنی رح فرماتے ہیں "یہ وصیت نامہ میرے پاس ترکی زبان میں محفوظ ہے۔"

(خطبۂ صدارت حضرت مدنی (نور اللہ مرقدہ) سیوہارہ ۱۹۲۱ء ص ۷)

تحریکِ خلافت میں باقاعدہ شرکت

اور

مُقدّمہ کراچی اور آپ کا مُجاہدانہ کردار

اس موضوع کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے مندرجہ ذیل مضامین کا سمجھنا ضروری ہے :-
خلافت کی حقیقت اور اس کی ضرورت ○ خلافت کے خلاف عیسائیوں اور یہودیوں کی سازشیں ○ تحفظِ خلافت کے لیے برصغیر کی خدمات ○ دارالعلوم دیوبند کی خدمات ○ حضرتِ مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ کی ولولہ انگیز قیادت ۔

(۱) حضرتِ مدنیؒ اپنے شیخؒ کے ہمراہ مالٹا میں اسیر کر دیئے گئے اور اسلام کے دشمنوں نے میدان صاف پاکر اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل تو کر لی مگر اس ظلم و ستم سے دنیا بھر کے مسلمانوں خصوصًا ہندوستانی مسلمانوں میں ایک خاص جذبۂ حُریت اور انگریز کو دشمن قرار دینے اور اس سے وطنِ عزیز کو آزاد کرانے کا جذبہ پیدا ہوا اور ایسا پیدا ہوا کہ برصغیر میں خلافت کے نام پر ایک مستقل تحریک شروع کر دی گئی جس کی قیادت علماء کرام اور ہمدرد مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی، شہروں سے لے کر دیہاتوں تک یہ تحریک "خلافت" کے نام سے پھیل چکی تھی، بمبئی سے روزنامہ اخبار "خلافت" کے نام سے جاری تھا۔ اگرچہ اس تحریک کے قائدین جلیل القدر علماء کرام اور دوسرے ہمدردانِ ملت تھے مگر مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی اس تحریک کے نامور قائدین تھے، اُن کی والدہ محترمہ بی اماں کی ہدایت پر یہ تحریک جاری تھی، حضرت بی اماں مرحومہ کی نصیحت محمد علی اور شوکت علی کو جو فرمائی وہ درج ذیل ہے :-

بولی امّاں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
بوڑھی امّاں کا کچھ غم نہ کرنا — کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحان میں اُترنا — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے میرے اگر سات بچّے — کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دینِ احمد کے رستے — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

حشر میں حشر بپا کروں گی | پیشِ حق تم کو لے کر چلوں گی
اِس حکومت پہ دعویٰ کروں گی | جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اس تحریکِ خلافت کی ہمہ گیری کا ایک نقشہ عرض کیا جاتا ہے۔ ہمارا علاقہ چھچھ (ضلع اٹک) جس میں امراء اور رؤسا کافی بااثر تھے اور انگریزی افواج کی بھرتی میں نمایاں حصہ لیتے تھے مگر خلافت کے لیے جو عملی قدم اٹھایا اس کا اختصار درج ہے :-

(۱) انگریزی سکولوں اور کالجوں میں بچوں کا داخلہ بند کر دیا، چھچھ کے مرکزی شہر حضرو میں "آزاد اسلامیہ ہائی سکول" قائم ہوا جس میں باقاعدہ میٹرک تک تعلیم دی جاتی تھی، اس سکول کی عمارت آج بھی موجود ہے، ایک خوبصورت مسجد بھی نماز اور ذکر اذکار اور تعلیمِ قرآنِ عزیز سے آباد رہتی، یہ مسجد اب بھی "خلافت والی مسجد" کے نام سے مشہور ہے اور اس ذکرِ خیر کی یاد اب بھی باقی ہے۔

(۲) سرکاری عدالتوں کا مکمل بائیکاٹ کر دیا گیا اور شہر کے ممتاز عالمِ دین مولانا میاں خدا بخشؒ (جو کہ مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے شاگردِ رشید تھے) کو قاضی مقرر کیا گیا جو باقاعدہ مقدمات کی سماعت فرما کر سمن اور نوٹس جاری فرماتے تھے، مسلمان اپنے منازعات کا ان سے فیصلہ کراتے تھے ــــ اٹک کی سرکاری کچہری بے رونق ہو گئی، وکلاء سارا دن ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہتے تھے۔ کارکن اور رضا کار اپنے سروں پر لال رنگ کی ٹوپیاں پہنا کرتے تھے جن میں سفید کپڑے سے چاند تارا اور نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ٹانکا ہوا ہوتا تھا، افسوس کہ دشمنوں کی سازشوں سے وہ تحریک ناکام ہو گئی ورنہ کبھی کا سارا برصغیر پاکستان بنا ہوتا ــــ اگرچہ بظاہر حضرت شیخ الہندؒ اور اُن کے رُفقاء (جن میں حضرتِ مدنیؒ کا نام نامی سرفہرست تھا اور بالآخر آپ ہی جانشینِ شیخ الہندؒ مقرر ہوئے) اپنی تحریک کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے مگر ان کی جدوجہد نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایسا بیدار کر دیا کہ برصغیر کے مسلمان بالعموم اور علماء بالخصوص عثمانی خلافت کے تحفظ کے لیے فکر مند ہوئے، انہوں نے حکومتِ برطانیہ سے جنگ کے بعد خلافتِ عثمانیہ اور مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں خلافت کانفرنس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس میں مذکورہ بالا مطالبات پیش ہوئے۔ اسی کانفرنس کے دوران علماءِ کرام نے اس امر کو محسوس کیا کہ علماءِ کرام اپنی ایک تنظیم کے ساتھ اپنی مستقل ایک جماعت بنائیں، چنانچہ باتفاقِ رائے جمعیۃ علماءِ ہند کے

نام سے ایک جمعیۃ قائم ہوئی جس کے پہلے صدر جناب مفتی کفایت اللہ صاحب اور ناظم اعلیٰ مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ مقرر ہوئے۔

جمعیۃ العلماء ہند کا پہلا اجلاس عام امرتسر ہی میں ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء سے یکم جنوری ۱۹۲۰ء زیر صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی منعقد ہوا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اسی سال ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ امرتسر میں انگریزوں نے نہتے ہندوستانیوں پر گولی چلا کر تقریباً چار سو ہندوستانیوں کو ہلاک اور بارہ سو کو شدید زخمی کیا تھا، اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے تمام ہندوستانیوں کا مشترکہ جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں مولانا محمد علی جوہرؒ نے وہ تقریر ارشاد فرمائی جس کا کچھ حصہ ص ۱۲۷ پر درج ہو چکا ہے۔

جب حضرت شیخ الہندؒ مالٹا سے واپس تشریف لائے تو اس وقت خلافت کی تحریک زوروں پر تھی آپ اس میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ سرگرمی سے حصہ لیا اور جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹، ۲۰، ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کی صدارت بھی فرمائی جس میں خلافت کے تحفظ اور تحفظ بلاد اسلامیہ کے عنوان سے وہ حقائق بیان فرمائے جو عام انسانوں کی نظروں سے اوجھل تھے، آپ کے خطبہ صدارت کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

معزز ناظرین! دنیائے اسلام میں گذشتہ چند صدیوں سے سلطان ٹرکی کی واحد سلطنت اسلامی شوکت کی ضامن تھی اور حرمین محترمین، بیت المقدس، عراق وغیرہ کے تمام اماکن مقدسہ و مقامات محترمہ کی حفاظت کی کفیل تھی، جمہور اہل اسلام کے اتفاق سے سلطان ٹرکی خلیفۃ المسلمین مانے جاتے تھے اور خلافت کے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیتے تھے۔ ان کا عروج و ترقی اور ان کی سلطنت کی وسعت جابر و غاصب مسیحی سلطنتوں کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی اور وہ ہمیشہ اسی فکر میں لگی رہتی تھیں کہ خلیفۃ المسلمین کا اقتدار گھٹایا جائے اور مستقر خلافت پر قبضہ کر کے یورپ سے اسلام کا نام و نشان مٹا دیا جائے، اگرچہ سلطان ٹرکی پر ان مسیحی بھیڑیوں کے درمیان بالکل بتیس دانتوں میں ایک زبان کی مثل صادق تھی مگر خلیفۃ المسلمین کی اسلام کے لیے جانبازانہ مقاومت ان غاصبوں کی متعصبانہ خواہشیں پوری نہ ہونے دیتی تھی، تاہم ان دشمنان اسلام کے دندان آز غریب ٹرکی کے بدن میں سے گوشت کے لوتھڑے نوچتے رہے اور ۱۸۷۰ء سے تو اس نوچ کھسوٹ کا متواتر ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ مصر جیسا زرخیز علاقہ، جزیرہ قبرص، طرابلس، سالونیکا، یونان، بلغاریہ، سرویا، البانیہ وغیرہ ٹرکی علاقے ان ظالموں کی جوع الذئب کی بھینٹ چڑھ گئے اور یہ ان بڑے بڑے لقموں کو ایسا ہضم کر گئے کہ ڈکار تک نہ لی یہانتک کہ یہ

جنگِ عظیم چھڑ گئی جس کا واحد سبب طمع ملک گیری تھا، کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ ٹرکی کو بھی شریکِ جنگ ہونا پڑا، اور شریک بھی اُس فریق میں جو برطانیہ سے برسرِ پیکار تھا، اس وقت تمام عالم کے مسلمان جس مصیبت میں مبتلا ہوئے اور بالخصوص برطانوی حکومت میں رہنے والے مسلمانوں کو جو مشکلات پیش آئیں اس کو خدائے علیم و حکیم ہی بہتر جانتا ہے۔

برطانوی مدبرین نے اپنی مسلمان رعایا کی تسلی کے لیے وقتاً فوقتاً چند اعلان شائع کیے جن میں مسلمانوں کو اطمینان دلایا کہ اُن کے مقاماتِ مقدسہ پر کوئی آنچ نہ آئے گی اور مستقرِ خلافت پر کوئی معاندانہ قبضہ نہ کیا جائے گا۔ اگرچہ مسلمانوں کا اِن وعدوں پر یقین کر کے مطمئن ہو جانا ایک سخت غلطی تھی جس کا تلخ ترین مزہ آج ان کے رُوحانی فرائض کو تلخ بنا رہا ہے لیکن واقعہ یوں ہی ہوا کہ مسلمان اس وعدے پر مطمئن ہو گئے اور سلطنتِ برطانیہ کی جانی و مالی امداد کر کے شاندار فتح حاصل ہونے کے باعث بنے۔

شاطرینِ برطانیہ نے جیسے ہی ہوا کا رُخ اپنے موافق دیکھا فوراً عیاری کے داؤ چلنے لگے اور تمام دُنیا کی مہذب قوموں کی آنکھوں میں خاک ڈال کر تمام وعدے نَسیاً مَنسیاً کر دیئے۔

مقاماتِ مقدسہ پر قبضہ کر لیا، مستقرِ خلافت یعنی قسطنطنیہ کو فوجی قبضہ میں دبوچ لیا، سمرنا پر یونانیوں کو قبضہ دیا، عرب کو ترغیب اور لالچ دے کر خلیفۃ المسلمین سے باغی بنا دیا، ترکی فوجوں سے ہتھیار رکھوا لیے اور اس غریب کو زمانۂ التوا میں بے دست و پا کر کے نہایت ذلت آمیز شرائطِ صلح پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کیا، شرائطِ صلح میں خاص طور پر اقتدارِ خلافت کو زائل کرنے والی شرطیں لگائی گئیں اور تمام دیگر طاقتوں کی مسلمان رعایا کا خلیفۃ المسلمین سے ذہنی سرپرستی کا تعلق منقطع کر دیا گیا، ولی عہد ٹرکی کو حراست میں کر لیا اور اسی قسم کے ہزاروں غیر منصفانہ سلوک کیے گئے۔

ان لڑائیوں میں شام، عراق، عرب، سمرنا، ٹرکی کے مسلمانوں پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے گئے، لاکھوں مسلمان قتل کیے گئے، لاکھوں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوئے، ہزاروں کلمہ گو خانہ ویران ہو کر وطن سے بھاگ نکلے اور آج غیر ملکوں میں سڑکوں اور میدانوں پر بے یار و مددگار پڑے ہوئے ہیں، سینکڑوں کے بدن پر کپڑا اور جان بچانے کیلئے قوتِ لایموت بھی میسر نہیں، سمرنا میں ہزاروں بے گناہ قتل کر دیئے گئے، عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔

یہ ہیں وہ روح فرسا اور جان سوز واقعات جنہوں نے تمام عالم کے مسلمانوں کو بے چین کر دیا ہے اور جس کے دل میں ذرا سا ایمان بھی باقی ہے وہ سیماب وار بیقرار ہے اور اپنا شرعی، اخلاقی اور قانونی حق سمجھتا ہے کہ اپنے مظلوم بھائیوں کی نصرت و اعانت کے لیے اُٹھ کھڑا ہو اور جس طرح ممکن ہو اپنے بھائیوں کو دُشمن کے نرغہ سے نکالے

اور ان کے پنجۂ ظلم سے نجات دلائے۔

اخوتِ ایمانی کی ایک عالمگیر لہر اٹھی اور طرفۃ العین میں مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک دوڑ گئی، سوتے ہوؤں کو بیدار کر دیا، بیداروں کو اٹھا کر کھڑا کر دیا اور کھڑے ہوؤں کو بے محابا دوڑا دیا۔

حجرہ نشین زاہد، کتاب کے کیڑے طالب علم، مدرسوں میں درس دینے والے برق تقریر عالم، دوکانوں پر بیٹھنے والے تاجر، اسباب ڈھونے والے مزدور سب ایک صف میں آکر کھڑے ہو گئے، یہی نہیں بلکہ دول یورپ اور بالخصوص برطانیہ کی ظالمانہ اور غاصبانہ پالیسی دیکھ کر اکتیس کروڑ برادرانِ وطن بھی ان کے ساتھ ہمدردی کے لیے تیار ہو گئے ——

اسی اجلاس میں جو تجاویز منظور کی گئیں ان میں تجویز ۲ مندرجہ ذیل ہے:۔

جمیعۃ العلماء ہند کا یہ اجلاس کامل غور کے بعد مذہبی احکام کے مطابق اعلان کرتا ہے کہ موجودہ حالت میں گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ موالات اور نصرت کے تمام تعلقات اور معاملات رکھنے حرام ہیں جس کے ماتحت مندرجہ ذیل امور بھی واجب التعمیل ہیں:۔

"(۱) خطابات اور اعزازی عہدے چھوڑ دینا (۲) کونسلوں کی ممبری سے علیحدگی اور امیدواروں کے لیے رائے نہ دینا (۳) دشمنانِ دین کو تجارتی نفع نہ پہنچانا (۴) سکولوں کالجوں میں سرکاری امداد قبول نہ کرنا اور سرکاری یونیورسٹیوں سے تعلق قائم نہ رکھنا (۵) دشمنانِ دین کی فوج میں ملازمت نہ کرنا اور کسی قسم کی فوجی امداد نہ پہنچانا (۶) عدالتوں میں مقدمات نہ لے جانا اور وکیلوں کے لیے ان مقدمات کی پیروی نہ کرنا" (جمیعۃ العلماء ہند مرتبہ پروین روزینہ ص۷۷)

اس کے بعد جولائی ۱۹۲۱ء میں کراچی میں خلافت کمیٹی کی ایک آل انڈیا کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مندرجہ بالا تجاویز کا اعلان کرنا تھا، اس اعلان کے لیے جس مجاہد جلیل کا انتخاب ہوا وہ حضرت مدنیؒ تھے (یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ ۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے جبکہ انگریزی حکومت کا سورج غروب نہیں ہوتا تھا) اس کی مختصر کیفیت درج کی جاتی ہے:۔

——— ۱۹۲۱ء میں جولائی کا مہینہ تھا کہ کراچی میں خلافت کمیٹی کی ایک آل انڈیا کانفرنس منعقد ہوئی اس میں اعلانِ حق، سرفروشی اور جہادِ آزادی کی تجویز پیش کرنے کے لیے حضرتؒ تشریف لائے اور پوری بے جگری اور بے خوفی کے ساتھ ببانگِ دہل یہ اعلان کیا کہ حکومتِ برطانیہ کی فوج میں بھرتی ہونا یا کسی قسم کی فوجی ملازمت کرنا یا کسی کو فوجی خدمات کی ترغیب دینا بالکل حرام ہے اور یہی نہیں بلکہ گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ تعاون اور موالات چاہے وہ کسی درجے

کی بھی، ہو قطعاً حرام ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک فرض بھی بتلایا کہ ہر مسلمان پر ترکِ موالات اور اس کی ترغیب و تحریص فرض ہے، اس تجویز کی تائید اور تائیدی تقریریں اس زمانے کے شیرِ خدا مولانا محمد علیؒ اور دوسرے لیڈروں، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، پیر غلام مجدد صاحب سندھیؒ اور سوامی کرشن تیرتھ شنکر اچاریہ نے کیں۔ یہ ساری کاروائی برطانیہ حکومت سے کھل کر بلکہ للکار کر مقابلہ اور چیلنج کی تھی، چنانچہ گرفتاری اور سزائیں نہ مجوز و مقررین کو کوئی شبہ تھا نہ عام ہندوستانیوں کو کوئی شک تھا بس دیر کاغذی کاروائیوں کی اور انتظار صبح و شام کا تھا، چنانچہ ۱۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو جب حضرت (مدنیؒ) دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ کے آستانے پر مقیم تھے وارنٹ گرفتاری آ پہنچا ؎

قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

بہتر ہے کہ گرفتاری کا آنکھوں دیکھا حال چشم دید گواہ حضرت شیخ الہندؒ کے حقیقی بھتیجے مولانا راشد حسن عثمانی مرحوم کی زبانی ذکر کیا جائے۔

"۱۸ ستمبر سے حضرت کی گرفتاری کی افواہ گرم تھی، لوگوں میں شدید ہیجان تھا اور ہر شخص کی زبان پر یہ تھا کہ ہم کسی حالت میں حضرت کو گرفتار نہ ہونے دیں گے۔ مقامی حکام کہتے تھے کہ ہمارے پاس اس قسم کا کوئی حکم نہیں ہے، اچانک بعد دوپہر ایک انگریز افسر پولیس کچھ مسلح گارد لیکر دیوبند پہنچا اور حاکم تحصیل نیز تھانیدار کو لے کر گرفتاری کے لیے آستانۂ شیخ الہندؒ پر جہاں حضرت قیام فرما تھے حاضر ہوا۔ جونہی شہر میں اطلاع پھیلی کہ پولیس افسران آستانۂ شیخ کی طرف جا رہے ہیں فوراً پورا بازار بند ہو گیا اور پورا شہر، کیا ہندو کیا مسلمان آستانۂ شیخ کی جانب دوڑ پڑا۔ عوام میں اتنا شدید غم و غصہ تھا کہ انگریز افسران کو جان سے مارنے پر تیار تھے۔ آخر کار انگریز ڈپٹی کلکٹر، انگریز انسپکٹر پولیس اور عبدالعزیز سی آئی ڈی انسپکٹر حضرت تک پہنچے، وارنٹ دکھلایا اور کہا کہ آپ اپنے آپ کو گرفتار سمجھئے۔ مجمع میں سے کوئی بولا کہ آپ کو وارنٹ دکھلانے کا حق ہے یا گرفتار کرنے کا بھی، اس نے کچھ کہنے کے لیے زبان کھولی ہی تھی کہ دو چار افراد اس پر حملہ کر بیٹھے اور بچاتے بچاتے بھی اس پر دو چار ہاتھ جڑ دیئے۔ مجمع تھا کہ سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور جوش و خروش بڑھتا ہی جاتا تھا۔ بڑی مشکلوں سے حضرتؒ اور دوسرے بزرگوں نے ان انگریز افسران اور سی آئی ڈی انسپکٹر کو گھیرے میں لے کر بچایا، کمرے تک پہنچایا اور اُن کو اندر کر کے باہر سے تالا بند کر دیا، عوام قابو سے باہر ہو رہے تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ انگریزوں کو ہمارے حوالے کر دو، جب حالت کسی طرح قابو میں نہ آئی تو حضرتؒ نے

عوام کے سامنے تقریر فرمائی جو عصر سے لیکر مغرب تک اور مغرب سے عشاء تک جاری رہی جس میں آپ نے اپیل کی کہ عوام قانون کو ہاتھ میں نہ لیں اور جوش وخروش کو ہنگامہ آرائی اور غلط راستوں میں استعمال نہ کریں، لیکن ظہر سے لیکر عشاء تک بھوکی پیاسی پبلک جو اپنے شیخ پر جانیں قربان کرنے کے لیے دیوار بن کر کھڑی تھی کسی قیمت پر حضرتؒ کو حکومت کے حوالے کرنے پر رضامند نہیں ہوئی۔ آخر میں حضرتؒ نے اپنا عمامہ سر سے اُتارا اور عوام کے سامنے کر کے فرمایا کہ آپ لوگ میری پگڑی کی لاج رکھ لیں اور خاموشی اور صبر کے ساتھ مجھے گرفتار ہو جانے دیں' اس پر مجمع شدّتِ جذبات سے بے قابو ہو گیا، لوگ رونے لگے اور مجبور ہو کر اس معاہدے پر فیصلہ ہُوا کہ اس وقت گرفتاری ملتوی رہے صبح کو ہم لوگ خود جلوس کی شکل میں حضرتؒ کو اسٹیشن پہنچائیں گے مگر پولیس اور انگریز افسران حضرتؒ کو یہاں سے گرفتار کر کے نہیں لے جائیں گے۔ افسران نے یہ شرطیں مان لیں اور تھکی ہاری پبلک خستہ وشکستہ دل برداشتہ ہو کر خاموش ہو گئی۔ تقریباً رات کو گیارہ بجے انگریزوں اور افسران کو آستانۂ شیخ کے پچھلے حصے سے نکال کر بھلانے کی عمارت میں پہنچا دیا گیا۔[1]

اگر کہیں حکومت اپنے معاہدے پر برقرار رہتی تو صبح تک تو مجمع ٹھاٹھیں مارتا ہُوا سمندر ہی ہو جاتا، وہ تو کہئیے خیریت گذری اور حُکام نے پوری طرح وعدہ خلافی کر کے راتوں رات گوروں اور مسلح سپاہیوں کی ایک اسپیشل ٹرین دیوبند اسٹیشن پر لا کھڑی کر دی' اور پہلے پورے شہر کی ناکہ بندی کی کہ باہر کی پبلک نہ پہنچنے پائے، پھر نہایت خاموشی کے ساتھ حضرت شیخ الہندؒ کے آستانے کا محاصرہ کر لیا اور اس طرح قلعہ بندی کر کے دروازے پر دستک دی، حضرتؒ تشریف لائے اور خاموشی سے اُن کے ساتھ ہو گئے، کچھ احباب اور اہلِ خانہ جو پہلے سے گھر میں موجود تھے ریلوے اسٹیشن پر وداع کرنے کے لیے ساتھ گئے، اسپیشل ٹرین پہلے سے تیار تھی جو فوراً حضرت کو لیکر روانہ ہو گئی، ورنہ جہاں جذبہ اور جوش یہ رہا ہو کہ جان لے لیں گے یا دے دیں گے مگر حضرت کو گرفتار نہ ہونے دیں گے' اور خبر جنگل کی آگ کی طرح اطراف وجوانب کی پچاسوں بستیوں اور قرب وجوار کے متعدد اضلاع میں پھیل چکی ہو وہاں صبح ہوتے ہوتے لاکھوں ہی انسان تو جمع ہو جاتے اور نہ جانے کتنی لاشیں گر جاتیں ـــــ قصہ مختصر اسپیشل ٹرین سے حضرت کو کراچی پہنچا دیا گیا۔

مقدمہ کی کاروائی چونکہ مقدمہ حد درجہ سنگین قرار دیا گیا تھا اور حکومت کو اپنی شوکت وحشمت کا مظاہرہ کر کے پبلک کو مرعوب کرنا بھی مقصود تھا لہٰذا فوج اور پولیس کا غیر معمولی انتظام کیا گیا تھا اور کورٹ

---

[1] تذکرۂ شیخ مدنیؒ از مولانا راشد حسن مرحوم

کی عمارت کے بجائے "خالق دینا ہال" مقدمہ کی سماعت کے لیے منتخب کیا گیا تھا اور اعلان کر دیا گیا تھا کہ "پاس" کے بغیر کوئی شخص ہال میں داخل نہ ہو سکے گا۔

۲۶ ستمبر ۱۹۲۱ء کو صبح سویرے پولیس کے ڈیڑھ سو سپاہی ہال میں داخل ہو گئے، ہال کے احاطہ کے گرد خاردار تار لگا دیئے گئے تھے، ہال سے ملحق بندر پر سڑک کے حصہ میں پولیس کا سخت پہرہ تھا اور سڑک کے دونوں طرف پولیس کے سپاہی ڈنڈے لیے کھڑے ہوئے تھے کہ عوام کو ادھر نہ آنے دیں۔

تقریباً دس بجے ڈھائی سو ہندوستانیوں کے مسلح فوجی دستہ نے گولی بارود کے کافی ذخیرہ کے ساتھ ہال کے عقبی حصہ پر قبضہ کر لیا، ٹھیک گیارہ بجے ملزمین کی گاڑی ہال کے احاطہ میں داخل ہوئی، مسلح پولیس کی لاریاں گاڑی کے آگے تھیں، اس احتیاط کے ساتھ ملزمین کو ہال تک پہنچایا گیا۔

پیروی بغیر وکیل صفائی

راہنمایانِ ملت کی جانب سے کوئی وکیل صفائی نہیں کیا گیا تھا، سرکار کی جانب سے سندھ کے پبلک پراسیکیوٹر مسٹر الفنسٹن پیروی کے لیے پیش ہوئے، آپ نے ملزمان کے خلاف مقدمہ کی کاروائی کا افتتاح کرتے ہوئے بیان کیا کہ ملزمان نے کراچی کانفرنس میں ایک ایسے ریزولیشن کی اشاعت میں حصہ لیا ہے جس سے ملکِ معظم کی فوج میں بغاوت کا اندیشہ تھا، ان ملزمان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اس ریزولیشن کی تائید کی ہے۔

اس تحریک کے محرک مولانا حسین احمد صاحب ہیں، جن کے متعلق مزید کسی قسم کا تعارف کرانا چنداں ضروری نہیں معلوم ہوتا، آپ نے اس ریزولیشن کو خاص طور پر پُرزور الفاظ میں پیش کیا تھا۔

مولانا محمد علی مرحوم کا بیان

سب سے پہلے ۲۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی کا بیان ہوا یا بعنوانِ دیگر آپ نے ایک طویل تقریر فرمائی، اس طویل بیان میں ریزولیشن پر بحث کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ گذشتہ خلافت کانفرنس کراچی کا میں صدر تھا اور وہ ریزولیشن بھی جس سے انگریزی گورنمنٹ کے خلاف بغاوت پیدا ہونے کا اندیشہ ہے پیش ہوا تھا، ایسا ہی بلگام ڈسٹرکٹ کانفرنس میں کیا گیا تھا میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے یہ ریزولیشن پڑھ کر سنایا، میں نے اس شخص کی تجویز کو پیش کیا جن کو میں اپنا آقا، سردار اور بزرگ کہنا موجب فخر سمجھتا ہوں وہ مولانا حسین احمد صاحب مہاجر مدنی ہیں، میں نے اس ریزولیشن کو سناتے ہوئے درمیان میں کچھ ریمارک بھی کیے تھے اور میں نے باآوازِ بلند یہ بھی دریافت کیا تھا کہ کون اس کے موید ہیں

اور جو تہہ دل سے اس کی تائید کریں وہ کھڑے ہو جائیں اور اس کا اقرار کریں۔

اِس الزام پر بحث کرتے ہوئے کہ فوج اور پولیس کی ملازمت کے حرام ہونے کے اشتہارات فوجوں میں تقسیم کیے گئے، آپ نے فرمایا:۔

میں اس وقت تک ان اشتہارات سے بالکل ناواقف تھا جو مسلمانوں کی فوج یا افسروں کے پاس بھیجے گئے تھے، مگر مجھ کو نہایت خوشی ہوئی کہ علماء کی جماعت نے ایک عرصہ کی غفلت کے بعد احکام خداوندی کو ہندوستانی فوج میں پہنچانا شروع کر دیا ہے میں اس غلطی کی اِصلاح چاہتا ہوں کہ مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ علماء ان اشتہارات کو ہندوستانی فوج میں پہنچانے کے منکر ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ طریقہ عنقریب واقعات میں تبدیل ہو جائے گا۔

شیخ الاسلامؒ کا بیان

۲۸ ستمبر کو مولانا محمد علی صاحب کا بیان ختم ہونے کے بعد مجسٹریٹ نے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی سے بیان طلب کیا، آپ نے ایسی دقیق اردو میں تقریر فرمائی کہ نہ مجسٹریٹ سمجھ سکا نہ اس کا پیشکار، مجسٹریٹ نے ملزمان سے دریافت کیا کہ کیا کوئی صاحب ان کی اُردو کا ترجمہ کر سکیں گے؟ مولانا شوکت علی صاحب نے جواب دیا کہ وہ تارکِ موالات ہونے کی وجہ سے عدالت کی مدد نہیں کر سکتے، مجسٹریٹ نے کہا کہ اچھا وہ کل دوسرا مترجم لے کر آئیں گے، چنانچہ مولانا کا بیان دوسرے دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ دوسرے روز یعنی ۲۹ ستمبر کو حضرت شیخ الاسلامؒ نے برسرِ عدالت تقریر فرمائی اور بظاہر آپ نے کوشش کی کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بموجب اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ پر پورا پورا عمل کر کے افضل الجہاد کا اجرِ عظیم حاصل کر سکیں۔

مسلمانوں کا فرض

مولانا نے تمہیدی اور ابتدائی سوال و جواب کے بعد ارشاد فرمایا، میں ایک مذہبی آدمی ہوں، آیاتِ کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر میرا پورا اعتقاد ہے، ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو مذہبی فرائض ادا کرنے سے روکے تو وہ اس روک تھام کو خاطر میں نہ لائے اور اپنے راستہ میں حائل نہ سمجھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان اُس وقت تک بادشاہ کی اطاعت کر سکتا ہے جب تک کہ حکمِ خدا کی نافرمانی لازم نہ آئے اور جب نافرمانی لازم آتی ہو تو کوئی اطاعت نہیں، دوسری حدیث میں ہے کہ کسی شخص کی نافرمانی کرنا گناہ نہیں ہے البتہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی تعمیل نہ کرنا گناہ ہے، تیسری حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ ہم کو کسی ایسے حکم کی تعمیل نہ کرنی چاہیئے جو خداوندِ عالم کے ارشادات کے خلاف ہو، نہ ہمیں کسی ایسے شخص کی ماتحتی میں رہنا چاہیئے جو خداوندی احکام کے خلاف حکم دیتا ہو، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سوال

کیا گیا کہ کیا وہ مسلمانوں کے بادشاہ ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا کہ جب تک وہ خداوندی قوانین کے وفادار ہیں اس وقت تک مسلمان انہیں بادشاہ نہیں سمجھ سکتے۔ (یعنی ملوکیت کی حد وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں بارگاہِ خداوندی میں نیازمندانہ اطاعت شعاری کی حد ختم ہو جاتی ہے)

علماء کا فرضِ منصبی

میں ایک عالم دین ہوں، احکام خداوندی کا ماننا میرے اوپر بمقابلہ غیر عالم کے زیادہ ضروری ہے، میرا فرضِ منصبی ہے کہ میں خداوندی احکام دوسروں تک پہنچاؤں۔

قرآن اور مذہب میں بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی بات کو جو اس سے دریافت کی گئی ہو چھپائے گا تو وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

قتلِ مسلم کی سزا

بیشک قرآنِ پاک میں کافر کے لیے بہت خراب سزا ہے لیکن ایسے شخص کے لیے جو دوسرے مسلمان کو قتل کرے پانچ سزائیں ہیں، (۱) دوزخ میں ڈالا جائے گا (۲) دوزخ میں ہمیشہ رہے گا (۳) اللہ تعالٰے کا غضب اُس پر ہوگا (۴) اس پر خدا کی لعنت ہوگی (۵) مختلف طریقوں سے اس کو عذاب دیا جائے گا۔

قرآن حکیم میں یہ بھی لکھا ہے کہ کسی مسلمان کو غلطی سے بھی نہ مارنا چاہیئے، غلطی سے مارنے والے کے لیے بھی سزا ہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جب ایک لاکھ صحابہ کرامؓ کے اجتماع میں عرفات کے موقع پر تقریر فرما رہے تھے تو آپ نے بہت تاکید کے ساتھ مسلمانوں کو وصیت فرمائی کہ احتیاط سے رہو ایسا نہ ہو کہ میرے بعد ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو اور کفر کا طریقہ اختیار کر لو۔ دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے بجز اس کے کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو گیا ہو۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہے کہ تمام دُنیا کا تباہ و برباد ہو جانا آسان ہے لیکن ایک مسلمان کا دوسرے کو قتل کرنا آسان نہیں۔ ایک مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان کو گالی دینا بھی فسق ہے، قیامت کے دن سات چیزیں مسلمان کو تباہ کرنے والی ہوں گی اُن میں سے ایک "قتلِ مسلم" ہے ـــ یہ بھی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ قیامت کے اندر سب سے پہلے قتل و خونریزی کے متعلق باز پُرس ہوگی۔

خونِ مسلم کی قیمت

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک مسلمان کا خون اور اس کا مال و متاع کعبہ شریف سے بھی زیادہ واجب احترام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

فرمایا کہ جہنم کے سات دروازے ہیں اور اُن میں سے ایک اُن مسلمانوں کیلئے ہے جو کسی دوسرے مسلمان پر تلوار اٹھائیں۔

نیز ارشاد ہوا اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کو دھمکی دیتا ہے تو وہ خدا کی دھمکیوں سے محفوظ نہیں رہے گا۔

ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان کی جائیداد یا ملک پر قبضہ کر لینا حرام ہے۔ مذہبی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ایک بے گناہ مسلمان کو قتل کرنا جرم ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مسلمان سے سود کھانے، شراب پینے اور مُردہ کھانے کو کہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو بادشاہ اسے قتل کر دے گا تو شخص مذکور کو ایسا کرنا چاہیئے ورنہ اگر وہ قتل کر دیا گیا تو وہ گنہگار ہوگا۔ لیکن اگر اسے الفاظ ادا کرنے کا حکم بادشاہ کی طرف سے دیا جائے تو اس کو تعمیل نہیں کرنی چاہیئے اگر حکم عدولی پر وہ قتل کر دیا گیا تو گنہگار نہیں ہوگا۔ اور اگر کسی مسلمان کے سامنے یہ صورت ہو کہ اگر اس نے دوسرے مسلمان کو قتل نہ کیا تو وہ خود قتل کر دیا جائے گا، تو اس کے لیے خود قتل ہو جانا بہتر ہے بمقابلہ اس کے کہ کسی دوسرے مسلمان کا ہاتھ قلم کرے۔ علماء کرام نے فتویٰ دیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے گورنمنٹ برطانیہ کی فوج میں ملازمت کرنا حرام ہے[1]۔

---

[1] یاد رہے کہ ترکی کے مقابلہ کے لیے انگریزوں نے ہندوستان سے ۱۵ لاکھ سپاہی بھرتی کیے تھے جن میں غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی یعنی مسلمانوں ہی نے اس مجاہد قوم کو انگریزوں کی خاطر قتل کیا، اس لیے انگریزوں کی عسکری قوت کو ختم کرنے کے لیے یہ فتویٰ بہت ضروری تھا اور اسی سے انگریزوں کو زیادہ خطرہ لاحق ہوا ـــــ سابق متحدہ ہند کی افواج کے انگریز کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک نے حکومتِ برطانیہ کیلئے ہندوستان اور پاکستان کے سپاہیوں کی خدمات کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، اپنے ایک خط میں جو لندن ٹائمز میں شائع ہوا ہے انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ ان ہندوستانی اور پاکستانی سپاہیوں کی مدد کے بغیر نہ تو اطالویوں کو اریٹیریا سے نکالا جاسکتا تھا نہ جنرل رومیل کو مصر پر قبضہ کرنے سے باز رکھا جاسکتا تھا اور نہ ہی برما کو جاپانیوں سے دوبارہ حاصل کیا جاسکتا تھا۔ سر آکنلک نے مزید لکھا ہے کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ کرایہ کے فوجی تھے جو اپنی تنخواہ کے لیے لڑتے تھے لیکن اس سے یہ حقیقت نہیں بدلی جاسکتی کہ انہوں نے برطانیہ کی خاطر جنگ کی اور اپنی جانیں دیں۔ (روزنامہ جنگ راولپنڈی مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۱ء)

مجاہدِ جلیل حضرت مدنیؒ کا یہ بیان انگریزوں کی شہ رگ پر ایسا نشتر تھا کہ ان کی ساری فوجی قوت ایسی ختم ہوئی کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد وہ کسی ملک کو فتح نہ کر سکے بلکہ ان کی وہ عظیم حکومت جس میں کبھی سورج غروب نہ ہوتا تھا سمٹ کر صرف جزیرۂ برطانیہ میں محصور اور محدود ہو گئی ـــــ زبانی طور پر بہت لوگ افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان الجائر کا نعرہ لگاتے ہیں اور اپنے مضامین کی سرخی بھی جماتے ہیں مگر عملی طور پر بیسویں صدی میں جس بطلِ جلیل نے پابندِ سلاسل اور کفن بردوش ہو کر ظالم حاکم کے سامنے گرج کر یہ نعرہ بلند کیا وہ صرف اور صرف حسین احمد مدنی ہی تھا۔ نور اللہ مرقدہٗ

مجسٹریٹ:۔ مجھے فتوے سے کوئی بحث نہیں ہے۔

مولانا محمد علیؒ:۔ آپ کا تو صرف بلاک اسٹون اور کوک کی تفسیروں سے تعلق ہے۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ:۔ یہ امر کہ یہ ریزولیشن کانفرنس میں پاس ہوا تھا کوئی نئی بات نہیں ہے، اس کا پاس کرنا اسی طرح ضروری تھا جس طرح ایک حکیم کے لیے خاص طبی مشورہ دینا۔ جب لائڈ جارج اور چرچل نے اس کا اعلان کر دیا تھا کہ یہ جنگ اسلام اور برطانیہ کے مابین ہے تو اس وقت نہ صرف ضروری بلکہ ہمارا اہم ترین فرض یہ تھا کہ ہم اعلان کردیں کہ ہر مسلمان کا یہ ضروری فرض ہے کہ وہ تمام اُن طاقتوں کے مقابلہ میں جو اسلام کے خلاف ہیں جنگ کرے۔

حکومتوں کے ساتھ وفاداری کی حدود

ایک مسلمان گورنمنٹ کے ساتھ اُسی حد تک وفادار ہو سکتا ہے جہاں تک اس کے مذہب نے اجازت دی ہے۔ اگر گورنمنٹ (ملکہ وکٹوریہ کے) اعلان کی تعمیل کرنا نہیں چاہتی ہے اور اگر مذہبی فرائض و پابندیوں کا لحاظ و احترام نہ کیا گیا تو اس صورت میں کروڑوں مسلمانوں کو اس مسئلہ کا تصفیہ کر لینا چاہیئے کہ آیا وہ مسلمانوں کی حیثیت سے زندہ رہنے کو تیار ہیں یا گورنمنٹ برطانیہ کی رعایا کی حیثیت سے، اور ۳۲ کروڑ ہندوؤں کو بھی یہ خیال کر لینا چاہیئے کہ آیا وہ مذہبی آدمی کی حیثیت سے رہنا چاہتے ہیں یا گورنمنٹ کی رعایا کی حیثیت سے، لیکن اگر گورنمنٹ مذہبی آزادی کو چھیننے پر تیار ہے تو مسلمان اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار ہوں گے اور میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان قربان کروں گا ـــــ اس بیان کے بعد رئیس الاحرار مولانا محمد علی صاحب نے مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے قدم چُوم لیے۔ (موازنۂ مذہب و قانون ص ۵۷ تا ۵۹)

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انگریزی حکومت نے فوجی بھرتی کے خلاف تقریر یا تحریر یا کوئی تجویز پاس کرنے یا پیش کرنے کی سزا رولٹ ایکٹ کی رُو سے موت کی سزا مقرر کر دی تھی ـــــ چنانچہ ۲۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو حضرت شیخ الاسلام اور ان کے رفقاء سیشن سپرد کر دیئے گئے۔

بغاوت کا یہ مقدمہ خصوصی عدالت میں زیرِ سماعت تھا، اس بیان کے بعد کیس سیشن سپرد ہو گیا۔ یہاں بھی حضرتؒ نے پوری بے خوفی کے ساتھ اپنا بیان دیا، اس کی رُوح اور اسپرٹ تو وہی ہے جو عدالتِ خصوصی والے بیان میں گذر چکی ہے، مگر کچھ خاص اجزاء اس کے بھی قابلِ غور ہیں: "جو قرار داد میں نے پیش کی ہے وہ محض ایک قرار داد نہیں بلکہ مسلمانوں کے ایک مذہبی فریضے کا اعلان ہے۔ ہم اپنے اور ہندو اپنے دھرم سے

مجت کرتے ہیں، یہ مذہبی معاملہ ہے اس کا فیصلہ لارڈ ریڈنگ کا نہیں بلکہ مذہبی علماء کا کام ہے۔ الفاظ میں کہا گیا ہے کہ پولیس کی ملازمت کرنا حرام ہے۔ اس استغاثے کے متعلق لارڈ ریڈنگ نے کہا ہے کہ مسلمانوں کے مذہب میں مداخلت نہیں کی گئی ہے، مگر میں یہ معلوم کرکے خوش ہوں کہ سرکاری وکیل اور جج نے کہا ہے کہ احکام قرآنی کو پیشِ نظر نہیں رکھا جائے گا اور اس سے بھی زیادہ خوش ہوں گا اگر لارڈ ریڈنگ، مسٹر مانٹیگو اور لائڈ جارج اس بات کا اعلان کردیں کہ مسلمانوں کو تمام احکام قرآنی پر عمل کی اجازت نہیں دی جائے گی، یہ ہمارے لیے بہتر ہوگا اور سوراج چار ماہ کے بجائے دو ہی ماہ میں حاصل ہو جائے گا۔ آخر میں میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے برطانوی فوج میں ملازمت کرنا حرام ہے"۔

آخر یکم نومبر ۱۹۲۱ء کو حضرت مدنیؒ اور دوسرے رفقاء کو دو دو سال قید بامشقت کی سزا کا حکم سنایا گیا اور حضرت مدنیؒ کو سابرمتی جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔

جیل میں مشقت اور علمی و روحانی مشاغل

چونکہ آپ کو اور آپ کے رفقاء کو دو دو سال قیدِ بامشقت کی سزا دی گئی تھی اس لیے مشقت بھی کرنی ضروری تھی، آپ نے ایک مکتوبِ گرامی میں فرمایا کہ:۔

"پہلے تو پانچ چھ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا مگر اب دو ڈھائی گھنٹے کام کرنا ہوتا ہے اُون کے تاروں کا گولہ بنانا ہوتا ہے، پہلے سُوت کے تاروں کو چرخ پر دوہرا کرنا ہوتا تھا"۔ (مکتوبات جلد ۲ ص ۸۲)

شیخ العرب والعجم سیّد عالی نسب کو یہ مشقت عیسائی حکومت کی طرف سے اس لیے دی گئی کہ وہ مسلمانوں کے مقدس خون کو انگریزوں کے چراغ میں جلنے کو حرام قرار دے رہا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ مولانا محمد علی جوہرؒ نے آپ سے قرآنِ کریم کا ترجمہ پڑھا، آپ کے اصحاب السجن کو آپ کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا جس سے وہ آپ کی روحانیت میں مقامِ رفیع کے قائل اور دلدادہ ہوگئے، چنانچہ مندرجہ ذیل واقعہ اس کی تصدیق کے لیے درج ہے:۔

....."حاجی احمد حسین سکنہ لاہرپور ضلع سیتاپور کے باشندے ہیں، آپ نے ایک کل ہند خلافت کے اجلاس میں (جس میں صوبہ سندھ کے پیرِ طریقت غلام مجدد صاحب نقشبندی بھی تشریف فرما تھے) حضرتِ مدنیؒ سے بیعت ہونے کی درخواست کی، آپ نے حاجی صاحب کو جنا

پیر صاحب سے بیعت ہونے کا مشورہ دیا، جب حاجی احمد حسین صاحب نے جناب غلام مجدد نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی تو آپ نے فرمایا مولانا حسین احمد یہاں موجود ہیں اور تم مجھ سے بیعت ہونے آئے ہو، میرے ہاتھ میں قرآن مجید ہے میں بحلف کہتا ہوں کہ کراچی جیل میں میں نے جو حالات حضرت مدنی کے بچشم خود دیکھے ہیں اُن کی بناء پر میری رائے ہے کہ اس وقت روئے زمین پر بزرگی اور اتباع شریعت کے اعتبار سے مولانا مدنی کا ثانی نہیں ہے"۔ (شیخ الاسلام مدنیؒ ص۲۷۵ بحوالہ حضرت مدنیؒ کے حیرت انگیز واقعات ص۱۵۸)

انگریزی حکومت نے آپ کو اور آپ کے رفقاء کو دو سال قید بامشقت کی سزا دے کر یہ سمجھا ہوگا کہ اب ان کے جذبۂ حریت اور انگریز دشمنی میں کمی آجائے گی مگر وہاں تو اور شدت اور یقین اور اعتماد علی اللہ کا جذبہ بڑھ رہا تھا، چنانچہ حضرت مدنیؒ کے ایک مکتوب کا ایک حصہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ اتنا پیش نظر رہے کہ یہ ۱۹۲۱ء ہے، ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۶ء نہیں کہ ہر ایک لیڈر مجاہدِ جلیل ہونے کا اعلان کر رہا ہے بلکہ یہ وہ ۱۹۲۱ء ہے کہ جاں نثارانِ حریت، علمبردارانِ وحدتِ ممالکِ اسلامیہ سر بکف ہیں اور بعض نوزائیدہ مجاہدوں کو انگریزی حکومت سر (SIR) کے خطاب سے نواز رہی ہے۔ حضرتِ مدنیؒ اپنے مکتوب گرامی میں فرماتے ہیں:۔

——— "میرے عنایت فرما بزرگو! ہم کمزور ہیں، ہم میں اتفاق نہیں، ہم ہتھیار نہیں رکھتے، ہم مال نہیں رکھتے، ہمارا دشمن قوی ہے اُس کے پاس ہر قسم کا سامان ہے، ہم کو اُسے سیدھا کرنا اور اس سے بدلہ لینا ضروری ہے مگر ہمیشہ مقابلہ سمجھ اور طاقت کے ساتھ کرنا ہے، یہی طریقہ قرآن و حدیث اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے، اسی لیے ہم کو جب تک کہ ہمارے مقاصد حاصل نہ ہو جائیں یعنی خلافت کی آزادی، جزیرۃ العرب کی آزادی، ہندوستان کی آزادی، پنجاب (واقعہ جلیانوالہ باغ) کی تلافی، اس وقت تک ہم کو نہ چین سے بیٹھنا ہے اور نہ بیٹھنے دینا ہے۔ آپ یہ سوال کریں گے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ میں کہوں گا آپ پر شرعاً فرض ہے کہ اگر ایک مری ہوئی چیونٹی کی طرح آپ کاٹ ہی سکتے ہیں تو ضرور کاٹ لیجئے، اس کے یہ معنی نہ سمجھئے کہ آپ خلافِ امن کوئی بات کریں، خونریزی کریں، نہیں نہیں اصلاح و مشورہ کے ساتھ جس قدر ممکن ہو نقصان پہنچائیں، دوسروں کو آمادہ کریں، دشمن کی قوت کو کمزور کریں، اس کی تجارت کو گھٹائیں، اُن کی صنعت کو گھٹائیں، ان کی محبت، ان کے خوف کو دلوں سے دور کریں، لوگوں میں جرأت پیدا کریں، سچ کہنے سے نہ جھجکیں، لوگوں کو

نرمی اور حکمت سے سمجھائیں، شدت کو کام میں نہ لائیں، ٹوٹے ہوؤں کو ملائیں، ملے ہوؤں کو نہ توڑیں، اسی دھن میں دن رات لگے رہیں۔ لوگوں میں سپہ گری پھیلائیں۔ بانک، پٹہ، لکڑی، تلوار، گھوڑے کی سواری وغیرہ جو ہمارے بزرگوں کا طریقہ تھا جس کو تمام شریف خاندان کے لوگ سیکھنا اپنا فخر سمجھتے تھے اس کی طرف لوگوں کو ترغیب دیں، کم از کم روزانہ ایک آدھ گھنٹہ اگر یہ عمل جاری رہے تو ہم خرما و ہم ثواب کا کام دے، جسمانی صحت حاصل ہو، ایک فن ہاتھ میں رہے، وقت بے وقت کام آئے، اپنی اور مال و اولاد کی حفاظت ہو۔

میرے پیارے دوستو! اس بامن جنگ نے اس قدر فائدہ دیا کہ ہم سات آدمیوں کے پکڑے جانے کے بعد تمام ملک میں تحریک بہت زور شور پر ہوگئی، لوگوں کے دلوں سے خوف گورنمنٹ کا بہت کم ہوگیا، جس مسئلہ کو ہم مہینوں کی کوشش کر کے سب کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتے تھے وہ دم کے دم میں پہنچ گیا۔ انگورہ کے مجاہدین کا چندہ بہت بڑے پیمانے پر جمع ہوگیا، بہت سے آدمیوں نے اس حرام نوکری سے استعفیٰ دے دیا، اور بھی سینکڑوں فائدے ہوئے، اگر تشدد آمیز کارروائی ہوتی تو یہ فائدہ نہ ہوتا۔

میرے معزز کرم فرماؤ! ہم تو ان شاء اللہ اسی بامن ترکِ موالات سے گورنمنٹ کو شکستِ فاش دیں گے ذرا ملک کو پوری طرح سے تیار تو ہو جانے دو، اور لوگوں میں احساس اور اتفاق پیدا کراؤ، ہاں ایسا سختی سے لوگوں کو نہ پکڑو کہ کل کو گھبرا کر چھوڑ بیٹھیں، شریعت کی پابندی کراؤ، روز روز جلسے ہوتے شاید لوگوں کی ہم نشینی سے مانع ہوں، میرے خیال میں ہفتہ میں ایک دو جلسے یا پندرہ بیس دن میں ایک جلسہ کافی ہے، مگر کام ہمت سے ہونا چاہیئے، جو کام مجمع کے اور بڑے ہوتے ہیں ان میں غلط فہمیاں بہت زیادہ ہوتی ہیں، ہم کو اس وقت ملنے اور ملانے کی زیادہ ضرورت ہے، متوسط طریقہ پر کوشش جاری رہے، نرمی اور خوش کلامی میں فرق نہ ہو۔

میں اب تک بہت آرام سے ہوں، غالباً پرسوں حکم سنایا جائے گا، اگر مجھ پر اور دوسرے رفقاء پر کوئی سخت حکم ہو تو آپ لوگ ہرگز صدمہ نہ کریں اور نہ کوئی ایسی حرکت ظاہر ہو جس سے بے چینی یا قلق اور اضطراب ظاہر ہو بلکہ یہ ہونا چاہیئے کہ دشمنانِ اسلام سمجھیں کہ ان لوگوں کو ذرا بھی پرواہ نہیں ہوئی اور نہ اپنے مطالبات سے ہٹے، ہم ہر روز اپنے مقصد یعنی آزادیٔ ہند اور دیگر مذہبی مقاصد کے قریب ہوتے جا رہے ہیں،

الحمدللہ ملک اور قوم کا قدم نہایت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے، خداوند کریم مددگار ہے، ہم ضعیف ہیں مگر انشاء اللہ العزیز پلیگ کے کیڑے ہوکر گورنمنٹ کے موجودہ طریقہ اور جماعت کو وبا میں مبتلا کرکے ڈھائی گھڑی کی لگا دیں گے، بعون اللہ تعالیٰ ے

پڑا فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں[1]

بھائیو گھبراؤ نہیں، مایوس مت ہو، ایک خدا پر بھروسہ کرو وہ ہمارے ساتھ ہے، کوشش کیے جاؤ، کامیابی دیکھو گے، خدا سے ڈرو اُس کے سوا کسی سے نہ ڈرو، نہ کسی سے جھگڑو، مجھ کو خدا کے حوالہ کرو، اگر اور کوئی عالم، مولوی، لیڈر پکڑا جائے کچھ پرواہ مت کرو، ہمارا خدا ہمارے اور تمہارے ساتھ ہے وہ سب دیکھتا ہے، سُنتا ہے۔ خداوند کریم آپ کی، ہماری، تمام اُمّتِ محمدیہ کی مدد کرے گا، اللہ ہم سب کو نیک عمل اور اخلاص کی توفیق دیوے۔ آمین

میرا بہت بہت سلام سب حضرات اراکین وممبروں اور دوستوں کو اور بزرگوں تک پہنچا دیں"۔ــــــــ

والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ کراچی جیل (مکتوبات شیخ الاسلام جلد ۴ مکتوب ۷۷ ص ۲۴۳ تا ۲۴۵)

ف: تحریکِ خلافت میں برصغیر کے جلیل القدر علماء کرام اور عامۃ المسلمین نے نہایت جرأت اور استقلال سے بے نظیر حصہ لیا، جزاھم اللہ خیر الجزاء مگر حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ کی خدمات سب پر فائق تھیں، عالمِ اسلامی کے جلیل القدر مفکر علامہ سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا ہے کہ:۔

"تحریکِ خلافت نے ہندوستان میں جو جوشِ ایمانی، غیرتِ اسلامی، حمیّتِ دینی، بلند نگاہی اور مصائب ومحن پر صبر واستقامت کی شان پیدا کردی تھی اس کو حمیّت وعزیمت کے الفاظ سے بہتر الفاظ بشرطیکہ ان کے صحیح وزن اور درجہ حرارت کو سمجھا جائے نہیں ملا سکتے اور اس کا مظہرِ اتم اور نمونہ کامل حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ تھے جن کی انگریز دشمنی اور حمیّتِ دینی، فکری واعتقادی حدود سے آگے بڑھ کر قلبی وجذباتی نفرت وعداوت اور قال سے آگے بڑھ کر حال میں تبدیل ہوگئی"۔ (شیخ الاسلام ص ۱۹)

---

[1] حضرت مدنیؒ نے یہ پیشین گوئی ۱۹۲۲ء میں کی تھی جبکہ بعض علماء کرام (مولانا مناظر احسن گیلانیؒ وغیرہ) کو ساری عمر اس پر اصرار رہا کہ انگریز ہندوستان کو کبھی نہ چھوڑیں گے۔ (دیکھئے، جامع المجددین از مولانا عبدالباری ندویؒ ص ۳۰۴ مطبوعہ ۱۹۵۱ء)

اجلاس کوکناڈا کی صدارت

کراچی جیل سے رہا ہو کر حضرت مدنیؒ دیوبند پہنچے، جس طرح دو سال پہلے رات کی تاریکی میں بالکل خاموشی کے ساتھ آستانہ حضرت شیخ الہندؒ سے رخصت ہوئے تھے اُسی طرح رات کی تاریکی میں دو بجے دیوبند اسٹیشن سے ٹانگے میں سوار ہو کر آستانۂ شیخ الہندؒ پر پہنچ گئے، صبح کو آپ کی رہائی کی خبر سُنکر شہر والوں نے جلوس کا اہتمام کیا مگر آپؒ نے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:-

"کیسا جلوس؟ کیا ہم نے برطانیہ کو شکست دے دی ہے؟ مجھے اپنی رہائی کی کوئی خوشی نہیں بلکہ رنج اس بات کا ہے کہ برطانیہ جیتا اور ہم ہارے ہیں، کہیں شکست خوردہ لوگ بھی جلوس وجلسہ کرتے ہیں؟"

حضرت مدنیؒ جب جیل گئے تو جد وجہدِ آزادی کا عروج تھا، پورا ملک نشۂ آزادی میں چُور ہو رہا تھا اور خلافت کمیٹی زندہ و تابندہ تھی مگر جب رہا ہوئے تو تحریکِ خلافت دم توڑ رہی تھی، حکومت برطانیہ کی ریشہ دوانیوں نے ہندو مسلم فسادات تیز کر دیئے تھے، عوام مایوس ہو چکے تھے مگر حضرتؒ نے دُور دراز مقامات کا دورہ فرمایا اور حوصلوں کو بیدار کرنے میں پوری قوت صرف فرمادی۔ چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کا پانچواں سالانہ اجلاس بمقام کوکناڈا مورخہ ۲۰ جمادی الاول ۱۳۴۲ھ/ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۳ء منعقد ہوا جس کی صدارت آپ نے فرمائی اور ایک بلیغ جامع خطبہ ارشاد فرمایا جس میں آپ نے سقوطِ خلافت کے نقصانات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ نے خلافت کے مقدس اور مضبوط رشتہ اتحادِ ممالکِ اسلامیہ کو توڑ کر تمام ممالک کو پُرزے پُرزے کر ڈالا اور یہ تقسیم بلادِ اسلامیہ، جس کا اصلی اور صحیح راز اسلام کو دنیائے وجود میں صرف مضمحل ہی کرنا نہ تھا بلکہ اس کو بالکل نیست و نابود بھی کر دینا ضروری خیال کیا جاتا تھا، اُس نے طرح طرح کی پلٹیاں کھائیں اور نئے نئے رنگ بدلے۔ کہیں مسیحیت کی مدد اور اس کی آواز سے تمام یورپ کو جگایا گیا، پروپیگنڈے پھیلائے گئے، پَر کے کبوتر ہی نہیں بلکہ تنکے کو پہاڑ بنایا گیا اور اس کے لیے جن جن قطعات میں مسیحی آبادی زیادہ تھی ان میں اندرونی طریقہ پر طرح طرح کی سازشیں کی گئیں، ناروا اور خلافِ انسانیت مظالم کے پہاڑ وہاں کی مسلمان رعایا اور حکام پر ڈھائے گئے۔ جرائد اور اخباروں کے ذریعے سے ظالموں کو اعلیٰ درجہ کا مظلوم اور مظلوموں کو انتہاء درجہ کا ظالم

دکھایا گیا۔ حکومات اسلامیہ نے محاسن کے اگر پہاڑ میدان میں لاکر کھڑے کر دیئے تو اُن کو تل بنادیا گیا اور اگر کسی غیر ذمہ دار مسلمان یا معمولی جماعت مسلمین سے کوئی قبائح اور جفا کا تل ظہور میں آگیا تو وہ تمام مسلمانوں بلکہ حکومت اسلام کے قبائح اور جفا کا پہاڑ بنا دیا گیا، کہیں آزادی اقوام ضعیفہ کے خوشگوار راگ اور سُریلی آوازوں سے تمام عالم کو خلاف اسلام برانگیختہ کر دیا گیا، اسلامی حکومتوں نے اگرچہ اُن کو اِن مُدعیانِ تہذیب و مؤیدانِ حُریت سے بدرجہا زیادہ، آزادی دے کر ہر طرح سے امن و امان سے پرورش کر رکھا تھا مگر اُن کے قلوب و دماغ میں غلامی کی بھیانک اور کریہہ المنظر صورت کھینچ دی گئی اور ہر طرح سازشوں، قلق و اضطرابات، بدامنی و بدتہذیبی، وحشت و بربریت، بدعہدی و ستمگری وغیرہ پر آمادہ کر دیا گیا، بیرونی طریقوں سے اُن کو مادی اور فوجی مدد پہنچا کر اسلامی دُنیا پر وہ مظالم کے پہاڑ توڑے گئے کہ الامان والحفیظ! نہ تاتاری مظالم اُن کے سامنے کچھ حیثیت رکھتے ہیں اور نہ صلیبی شنائع اُن کے آگے شنائع شمار ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح پر یونان سے اسلامی اقتدار اٹھایا گیا، سرویہ اور مانٹی نگرو سے اسلامی جھنڈا اکھاڑا گیا، رومانیہ اور پولونیا سے اسلامی اذانوں کی آوازیں بند کر دی گئیں، بغداں اور افلاق میں محمدی روشنی بجھا دی گئی، بوسنیا اور ہرزی گونیا سے احمدی پرچم کی چمک ٹھنڈی کر دی گئی، جبلِ اسود اور مجارستان سے اللہ اکبر اور لا الٰہ اِلّا اللہ کی صدائیں موقوف کر دی گئیں، بلگیریا اور البانیہ پر مسیحی جھنڈا لہرانے لگا، مقدونیا اور تراکیا میں مسجدیں گرجوں اور ہلال صلیبوں کی صورتوں میں ڈھال دیئے گئے، کریٹ اور جزائر مورہ وغیرہ میں روشنی توحید مبدل بہ ظلمت تثلیث کر دی گئی، کاکیشیا اور کریمیا وغیرہ سواحل بحرِ اسود میں مسیحی تاریکی چاروں طرف پھیلا دی گئی، پروٹسٹنٹ ارمنی اقوام کے ہاتھوں سے ہر شہر اور ہر دیہہ و قصبہ میں سفاکانہ کاروائیاں اور درندگانہ مظالم و قلاقل دائمی طور پر جاری کرا دیئے گئے، اسلامی فرقوں اور اقوام کو باہم آپس میں لڑا دیا گیا اُن میں نفاق شقاق کا اِس طرح بیج بویا گیا کہ ارناؤط، ترک، عرب، کُرد ہر ایک دوسرے کی عزت، شوکت، جاہ، مال، سلطنت وغیرہ کو نہایت کراہت کی نظر سے دیکھنے لگا۔

اسی تقسیمِ بلاد نے جس کی کانفرنسیں منعقد ہوتی رہی ہیں اور آپس میں ہمیشہ گوناگوں معاہدات اور بوقلموں تجاویز کو کام میں لاتی رہی ہیں۔ افریقہ اسلامی کے حصوں کو دولِ اربعہ اسپین، فرانس، اٹلی، انگلستان پر اس طرح تقسیم کر دیا کہ اُس کا شمالی اور مغربی کنارہ جس میں مراکش، ریف وغیرہ داخل ہیں اسپین کو۔ ٹونس، الجیریا، فاس اور اس کا تمام داخلی برِ اعظم جس میں تنبکتو، سینیگال، تکرور غربی، سوڈان وغیرہ کے وسیع علاقے سب داخل ہیں فرانس کو۔ طرابلس، بلغاری، درنہ اور اس کے سامنے کا تمام صحرا لیبیا اٹلی کو۔ مصر، سعید، سوڈان، بربرہ شمالی لینڈ وغیرہ برطانیہ کو

مل جائے کسی ایک کو دوسرے کے حصّہ میں نہ طمع ہو نہ مزاحمت، اور نہ کوئی یہاں کے مسلمانوں یا حکام کی کسی قسم کی مدد یا ہمدردی کرے، اِن اقالیم کے سکان اور حکام پر خواہ کتنے ہی مظالم توڑے جائیں تمام یورپ سے کسی قسم کی آواز نہ نکلے، کوئی شخص یا کوئی اسلامی حکومت خواہ کتنی ہی دردناک آواز سے پکارے یا انسانیت کے نام کی دُہائی دے تو کان میں تیل ڈال کر سو رہو، اور یہی نہیں بلکہ ہر ایک پر لازم ہے کہ دوسرے کو ممکن سے ممکن طریقے پر مدد پہنچائے۔ چنانچہ ان جملہ مقامات پر ہر طرح کی نہایت وحشیانہ کاروائیاں ہوئیں اور ہو رہی ہیں مگر کسی کے بدن پر جُوں تک نہیں رینگتی اور نہ رینگی سوائے خدا کے کوئی مسلمانوں اور ان کے جان و مال، عزّت، آبرو، ملک، متاع، مذہب، قوم کا والی وارث خبرگیراں نہیں ہوا۔ وہ نہایت بے رحمی سے، بے کسی اور بے بسی کی حالت میں دَلے گئے اور دَلے جا رہے ہیں مگر کسی مدعیٔ تہذیب، ناصرِ انسانیت، حامیٔ حرّیت، ناشرِ تمدّن کو ادنیٰ درجہ کا بھی خیال اور ذرّہ برابر بھی ہمدردی پیدا نہ ہوئی اور نہ ہوتی ہے، اس طرف اغاثہ کی نظر اٹھانا گناہ کبیرہ خیال کیا گیا اور کیا جاتا ہے۔

اِسلامی دُنیا کو ظالم یوروپین بھیڑیئے پھاڑ ڈالتے ہیں اور پھاڑتے رہے مگر یہ پیکرانِ تہذیب اُن انسانوں کو بچانا یا اُن کی خبرگیری کرنا خلافِ آدمیت ہی خیال کرتے رہے اور کرتے ہیں، غلامی کی سخت سے سخت کڑیوں اور زنجیروں میں وہ جکڑے گئے اور جکڑے جا رہے ہیں مگر کسی مہذب متمدن کے جھوٹے منہ سے نہیں نکلتا کہ غلام انسانیت پر نہایت شنیع ظلم ہے اس سے بچو اور غلاموں کی مدد کرو۔

........وہ عرب جن سے ہر قسم کی مدد لی گئی، جن کو اُن کے خلافِ دیانت و انسانیت بغاوت پر آمادہ کیا گیا، جن کے ذریعہ سے خلافت اور اسلام کو پامال کیا گیا، جن کی مدد اور اعانت سے مقاماتِ مقدسہ اور مرکزِ اسلام کو کچلا گیا، جن کو طرح طرح سے سبز باغ دکھایا گیا، جن سے اٹل اور دائمی عہدنامے کیے گئے، جن کو آزادی اور استقلال بلکہ خلافت کی خوشگوار چاشنی دی گئی، جن کو بادشاہت اور حکومت کی لالچ دلائی گئی اُن ہی کو غلامی کی سخت سے سخت کڑیوں میں قید کیا گیا، اُن کو تمام مخلوقات میں ذلیل تر اور عاجز تر بنایا گیا، اُن کو ہر طرح سے زیر و زبر کیا گیا، اُن میں ہر طرح سے پھوٹ ڈلوا کر ضعیف و ناتواں بنایا گیا، اُن کے عہد و پیمان کو ردّی کی ٹوکری میں پھینک کر بُوٹ سے مَسل دیا گیا۔ سیریا (شام) میں فرانسیسی اقتدار نے اسلامی شعائر پر دھواں دھار تلخ اور زہرآلود بارش برسائی، فلسطین (بیت المقدس) وغیرہ میں یہودی قوّت نے زیرِ اثر برٹش گورنمنٹ اسلامی جھنڈوں پر جلا دینے والی بجلیاں کڑکائیں۔ ماسوپوٹامیہ (عراق) پر انگلستانی قوّت نے اسلامی روشنیوں کو مسیحی اقتدار کی گھٹاٹوپ تاریکیوں سے مٹایا، حجاز اور فقط حجاز پر امیر حسین شریفِ مکّہ کو اگرچہ قابض رکھا مگر اُس کو اس طرح

بے بس اور بے قابو کر دیا کہ وہ حسبِ تحریر مسٹر بلانڈ ہر چیز اور ہر حال میں برطانیہ کا سخت محتاج اور نہایت ہی زیادہ دستِ نگر ہے، اور پھر اس پر ابنِ سعود وغیرہ اعراب کو مسلط کر کے اس کی رہی سہی قوت کو بھی برباد کر دیا جس کی وجہ سے قالبِ بے جان اور سلطان بلا قوت ہے، پادشاہ شطرنج یا کچ پتلی کا راجہ اس کا مصداق ہے۔ سمرنا اور تھریس میں یونانی خونخوار درندوں کو گھسا کر اسلامی شہروں کو خراب آباد بنایا۔

درہ دانیال، چناق قلعہ اور شہر قسطنطنیہ وغیرہ پر متفقہ قبضہ جما کر برٹش سیادت کا جھنڈا چڑھایا، اسلامی قومی اور احکام کی سخت سے سخت توہین کی گئی، خلیفہ کے اقتدارات اور اُس کے شرف پر نہایت بدنما دھبہ لگایا، ترکی حکومت اور عثمانی پادشاہت کے خلاف وعدہ ہائے قویہ کی ذلیل ترا اہانت کی ــــ نیز ایشیا (ایشیائے کوچک) صوبہ اناطولیہ وغیرہ کو اٹکایا، فرانس اور انگلستان میں تقسیم کر دیا گیا۔ گویا بزعم خود اسلام کا جنازہ صرف اٹھایا ہی نہیں گیا بلکہ اس کو زیر زمین دفن بھی کر دیا گیا۔ معاہدہ سیورے (TREATY OF SEVRES) سے پہلے پہلے اور بعد بھی وہ وہ کاروائیاں کی گئیں اور وہ وہ جفاکاریاں ہر حقۂ ٹرکی میں جائز رکھی گئیں کہ جن کے سُننے اور دیکھنے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، غالباً آسمان نے اپنی آنکھوں سے ویسے ویسے دلخراش واقعات نہ دیکھے ہوں گے، زمین نے اپنی پُشت پر ایسے دِل سوز، بے حیائی اور بے دردی کے اعمال نہ سُنے ہوں گے۔ مشتے از خروارے آپ کے سامنے اخباروں میں آچکے ہیں۔

ٹرکی اقتدارات کو زائل کر دیا گیا، اُن کو اُن کے اصلی وطن سے جہاں اُن کی مردم شماری ۲/۳ اور ۳/۴ اور بعض جگہ اس سے بھی زیادہ ہے، محروم کیا گیا۔ آرمینیوں کو استقلال دیا گیا، اُن کے حقوق کی محافظت کی گئی، اُن کو اسلامی زمینیں اور ٹرکی شہر اور ملک عطا کیے گئے۔ اِسی قسم کے واقعات دوسرے قطعات میں بھی ظاہر ہوئے۔ (خدا کا شکر ہے کہ اُس کے بعد اُس نے اپنے فضل و کرم سے مصطفےٰ کمال پاشا کے ذریعہ سے دُشمنوں کی بہت سی آرزوئیں خاک میں ملا دیں)۔

سقوطِ خلافتِ عثمانیہ کا حسرت ناک انجام

بالآخر اُردن اور اسرائیل کے درمیان معاہدہ امن پر دستخط ہو گئے، صدرِ امریکہ کلنٹن نے ۲۶ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو اُردنی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے جو تقریر کی اُس کے متن کے کچھ جملے درج ذیل ہیں، صدر کلنٹن نے کہا :-

"یور میجسٹی آپ حضرات پیغمبر خدا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آل اولاد ہیں، آپ نے اپنے ہمسایہ ملک کے ساتھ امن قائم کر کے اپنے دادا شاہ عبد اللہ کی وصیت کی تکمیل سے کچھ زیادہ ہی کیا ہے[1] — آپ نے پوری عرب دُنیا کو یہ پیغام دیا ہے کہ امن کو روکا نہیں جا سکتا، آپ نے جو راہ پسند کی ہے امریکہ اس کی تعریف اور حمایت کرتا ہے، اور ہم آنے والے مہینوں اور برسوں میں آپ کا ساتھ دیتے رہیں گے۔

اُردن کے ساتھ امریکہ کی وابستگی آج رات بھی اتنی ہی مستحکم ہے جتنی ۳۵ برس پہلے آپ کے اس دورۂ امریکہ کے موقع پر تھی جس کے دوران آپ نے صدر ڈوائیٹ آئزن ہاور سے ملاقات کی تھی، وہ اُن آٹھ صدورِ امریکہ میں سے اوّلین تھے جن کی آپ سے شناسائی رہی" ——

صدر کلنٹن نے مزید کہا :-

"ایک طرف دہشت اور انتہاء پسندی کی قوتیں ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو مذہب اور قوم پرستی کے لبادوں میں چھپا رکھا ہے لیکن اُن کا یہ عمل اُن کے مذاہب کی تعلیمات کے خلاف ہے اور ان کی حُبّ الوطنی ایک مذاق بن کر رہ گئی ہے۔ رجعت پسندی کی یہ قوتیں مایوسی، غربت اور بے چینی میں پروان چڑھتی ہیں، یہ تشدّد کی آگ پر تیل چھڑکتی ہیں، وہ اس نظام کی ترقی کو تباہ کر دینا چاہتی ہیں، میں کہوں گا کہ دہشت گردی اور انتہاء پسندی کی یہ قوتیں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں نہ کبھی کامیاب ہوں گی اور نہ انہیں کبھی کامیاب ہونا چاہیئے، اب یہ ماضی کا قصہ ہیں ہمارا مستقبل نہیں" ——

اس طرح دونوں ملکوں کے درمیان ۴۶ سالہ حالتِ جنگ ختم ہو گئی ہے[2]

---

[1] صدر کلنٹن کا یہ جملہ سمجھنے کے لیے شیخ الہندؒ اور ان کے رفقاء کی گرفتاری کی وجوہات کو دیکھا جائے جیسے کتاب ھٰذا کے ص —— پر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ (از مرتب)

[2] امریکی شعبۂ اطلاعات اسلام آباد کا پندرہ روزہ "خبر نامہ" بابت یکم نومبر ۱۹۹۴ء

حضرتِ مدنیؒ سلہٹ میں

مقدمہ کراچی سے رہائی کے بعد مدرسہ مرکزیہ خلافت بلڈنگ سلہٹ میں آپ بطوراستاذِ حدیث تشریف لے گئے اور چار سال کے عرصہ میں وہاں علوم دینیہ اور علوم معرفت سے نہ صرف سلہٹ بلکہ سارے بنگال کو مالامال فرمایا، پوری تفصیل عرض کرنے سے پہلے بنگال میں تبلیغ وارشاد کا خلاصہ عرض کرنا مفید ہی نہیں بلکہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ قطب الارشاد حضرت عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہٗ کی اولاد میں سے ایک محقق جناب اعجاز الحق قدوسی نے فرمایا ہے کہ :۔

——— ”اگرچہ بنگال میں نورِ اسلام کا طلوع ۴۴۲ھ مطابق ۱۰۵۰ء میں ہوا تھا اور اس کے بعد علماء کرام، صوفیاء عظام اور سلاطینِ اسلام اس ملک میں اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے کام کرتے رہے مگر تیرہویں صدی ہجری کے وسط میں جبکہ بنگال مذہب سے ناآشنا ہوتا جارہا تھا، اخلاقی قدریں ڈھیلی پڑچکی تھیں، مسجدیں ویران، قبر پرستی اور پیر پرستی شباب پر تھی، لوگ ہندووانہ شکل وشباہت کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے، دینی پستی اور اخلاقی ابتری عام تھی۔ اِن بگڑے ہوئے حالات کو ایک مردِ خدا نے محسوس کیا اور بنگال میں رشد وہدایت اپنی زندگی کا عظیم مقصد قرار دیا، وہ اسلام کے جلیل القدر خادم اور مشہور عالم صوفی و درویش مولانا کرامت علی جونپوریؒ تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۸ محرم الحرام ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء کو شہر جونپور کے محلہ ملاٹولہ میں مولانا ابراہیمؒ کے ہاں ہوئی۔ آپ نے اٹھارہ سال کی عمر میں علومِ اسلامیہ سے فراغت حاصل کی، پھر اصلاحِ باطن کے لیے حضرت سید احمد بریلویؒ کی خدمت میں ”رائے بریلی“ حاضر ہوئے، آپ نے صرف اٹھارہ دن کی روحانی تربیت اور تزکیۂ باطن کے بعد آپ کو حضرت شاہ اسمٰعیل شہید نوراللہ مرقدہٗ کی وساطت سے خلافت نامہ اور شجرۂ طریقت عطا فرمایا“ ——— (تذکرہ صوفیائے بنگال ص ۳۳۰، ۳۳۱)

آپ کی تبلیغ اور اشاعتِ علومِ اسلامیہ سے لاکھوں انسان حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے اور کئی ہزار بلکہ کئی لاکھ متزلزل اور ہندوانہ رسم ورواج میں ڈوبے ہوئے انسانوں کو بچاکر مشرف بہ اسلام دوبارہ فرمایا۔ آپ نے

سال اپنی عمرِ عزیز کے اسی کارِ نبوّت پر قربان اس طرح فرمائے کہ آخراسی بنگال میں مورخہ ۸ محرم الحرام ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ئہ بروز جمعہ بوقت صبح صادق خالقِ حقیقی سے جا ملے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ آپ کا مزار پر انوار مشرقی پاکستان حال بنگلہ دیش کے شہر رنگ پور محلہ منشی پاڑہ کی جامع مسجد میں آج بھی مرجع الخلائق ہے۔

آپ کے اس مقدس مشن کو آپ کی اولاد خصوصاً مولانا عبدالاول نے جاری رکھا حضرت مولانا عبدالاول صاحب آپ کے خلف الصدق تھے، ان کے بعد بھی ان کی اولاد نے اس مقدس کام کو جاری رکھا۔

آپ کی دینی، علمی اور روحانی خدمات کا ذکر حضرتِ مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ نے آپ کے پوتے حضرت مولانا عبدالباطن نوّر اللہ مرقدہٗ کے نام اپنے ایک گرامی نامہ میں یوں فرمایا ہے :۔

"محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ——— عنایت ربانیہ نے آپ کے جدِّ امجد حضرت مولانا کرامت علی قدس اللہ سرہ العزیز کے سر پر جو بنگال و آسام میں احیاءِ شریعتِ مصطفویہ کا تاج رکھا اور اُن کی مخلصانہ اور سرفروشانہ مساعیٔ جمیلہ سے وہ اعلیٰ درجہ کی کامیابی ہوئی کہ اُمتِ مرحومہ میں خاص خاص افراد و اکابر میں نظر آتی ہے فشکر اللّٰہ سعاہ ورضی عنہ وارضاہ ۔" (مکتوباتِ شیخ الاسلام جلد ۲ ص ۱۸۰)

مرتب **چراغ محمد** کے لیے یہ امر باعثِ سعادت ہے کہ احقر کے والد ماجد نوّر اللہ مرقدہٗ کو بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کرامت علی نوّر اللہ مرقدہٗ کے اس مقدس مشغلہ کو جاری رکھنے کی سعادت یوں بخشی کہ :۔ آپ نے علومِ عالیہ میں مدرسہ عالیہ رامپور میں جلیل القدر اساتذہ مولانا منور علی محدث وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم سے اکتسابِ فیض فرمایا اور ان ہی کے مشورہ سے مدرسہ عالیہ رامپور میں مدرس تھے کہ حضرت مولانا کرامت علیؒ کے جانشین حضرت مولانا عبدالاول رامپور تشریف لائے اور بنگال میں تبلیغ وارشاد کے لیے کسی بہترین صاحبِ علم ومعرفت کی ضرورت کا اظہار فرمایا، کارکنانِ مدرسۂ عالیہ نے حضرت والد ماجد نوّر اللہ مرقدہٗ کو اس کے لیے نہ صرف مناسب سمجھا بلکہ ضروری سمجھا، جس پر مولانا عبدالاول مرحوم کے شدید اصرار سے حضرت والد صاحبؒ نے تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام کیلئے منظور فرمالیا، آپ کو مولانا عبدالاولؒ نے مندرجہ ذیل سند وتصدیق وتوثیق عطا فرمائی :۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   نحمدہٗ ونصلی علیٰ عبدہ الکریم

فقیر عبدالاول بن حضرت مولانا کرامت علی صاحب جونپوری قدس سرہٗ کی طرف سے تمام

مسلمانانِ ملکِ بنگال کی خدمت میں عموماً اور تمام خلفاء و مریدان کی خدمت میں خصوصاً
بعد سلام مسنون کے واضح ولائح ہو کہ فقیر کے والد ماجد طاب اللہ ثراہ پچاس سال سے
زیادہ ملک بنگال میں ہدایت فرماتے رہے اور خوب دینِ اسلام کی اشاعت کی، فقیر بھی
اُن کی وفات سے کے کراب تک اس ہی شغل میں ہے اور والد ماجد اور برادرِ اعظم
جناب حضرت مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم و مغفور کے مریدان میں وعظ و نصیحت کرتا
پھرتا ہے، چونکہ فقیر کے پاس دیارِ شاسعہ اور اقطارِ بعیدہ سے اکثر لوگ فقیر کے بلانے
کے واسطے آتے اور ہمیشہ خطوط بھی آیا کرتے ہیں اور ہر جگہ فقیر پہنچ بھی نہیں سکتا اور
اس زمانہ میں ہدایت کی بہت ہی ضرورت دیکھی گئی ہے، لہٰذا فقیر نے بعد استخارہ و استشارہ
کے جناب محی الدین مولانا قاضی غلام گیلانی صاحب کو، جو بڑے زبردست عالم باعمل اور
بڑے واعظ و ہادی ہیں، اپنی طرف سے نائب اور خلیفہ کر کے بھیجا ہے، آپ لوگ
مولانا صاحب سے وعظ و نصیحت سنیں اور اُن کی دعوت کریں اور دل و جان سے
تائید اور خدمت کریں ـــــ فقیر نے ان کو رامپور سے بلوا کر ملک بنگال کی سیر کی
اجازت دی ہے اور محی الدین کا لقب دے کر آپ لوگوں کے پاس بھیجا ہے"۔

مُہر مولانا عبد الاوّل قدس سرہ العزیز

فقیر عبد الاوّل جونپوری، ۷ شعبان سنہ ۱۳۲۱ھ

اس تعلق کے بعد مولانا عبد الاوّلؒ اپنی ہر تالیف و تصنیف کو شائع کرنے سے پہلے حضرت
والد صاحب رحمۃ اللہ علیہما سے نظرِ ثانی کروایا کرتے تھے، صرف ایک رسالہ کی تقریظ پر مولانا جونپوریؒ
کے تعارفی کلمات کو ذکر کیا جاتا ہے:۔

"تقریظ المنطقی الفقیہہ، الاصولی النبیہہ، کثیر الورع، سلیم الطبع،
حسن السیرۃ، صافی السریرۃ وحید عصرہ فرید دھرہ المولوی
غلام گیلانی وقاہ اللہ عن المکارہ بالسبع المثانی"

زینۃ الہامۃ بالغدبتہ والعمامۃ صـ۲۸

حضرت والد صاحب نور اللہ مرقدہ نے تقریباً تیس ۳۰ سال بنگال میں جو تبلیغی اور روحانی خدمات

سرانجام دی ہیں اُن میں فرقِ باطلہ کے حملوں کا دفاع، مسلمانوں کی معاشی حالت کی اصلاح اور مرزائیت کا قلع قمع کرنا اوّلیں حیثیت رکھتا ہے۔ بنگال میں اُس وقت کئی فرقے پھیل رہے تھے خصوصاً ایک فرقہ دودیہ تھا جو نمازِ جمعہ کے منکر تھے اور اُن کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ چونکہ ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں اس لیے نمازِ جمعہ فرض نہیں، حضرت والد صاحبؒ نے ایک مبسوط کتاب بہ نام بدیع الکلام تحریر فرمائی اور اسے شائع فرمایا۔

اسی طرح مسلمانوں میں معاشی ابتری کی وجہ سے سُودی کاروبار اس قدر زیادہ تھا کہ مسلمان بھی اس منحوس کام میں شریک تھے، حضرت والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے سُودی کاروبار کی شرعی قباحت کے بارہ میں کئی رسائل تحریر فرمائے جو اردو اور بنگلہ زبان میں شائع ہوئے اور کئی سعادتمندوں نے توبہ کی۔

سب سے زیادہ خطرناک حملہ قادیانیوں کا تھا، اس ملعون قوم نے "برہمن بڑیہ" گاؤں میں ایک نام نہاد مولوی "عبدالواحد" کو قابو کر لیا تھا جو کہ سادہ لوح مسلمانوں میں اس ارتداد کی تبلیغ کرتا تھا، حضرت والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اُس سے زبانی مناظرہ فرمایا اور اسے یادگار شکستِ فاش دی، اور اس کے رَدّ میں ایک مبسوط کتاب بہ نام "جوابِ حقانی دررَدِّ بنگالی قادیانی" تحریر فرمائی جو اُردو اور بنگلہ میں شائع ہوئی ـــــ جیساکہ "قادیانیت کے خلاف قلمی جہاد" نامی کتاب کے صـ ۱۹۲ پر آپ کی تصانیف "تیغِ غلام گیلانی برگردنِ مرزا قادیانی" اور "جوابِ حقانی دررَدِّ بنگالی قادیانی" کا ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ العزیز کی ان علمی، تبلیغی اور روحانی تعلیمات کا مفصل ذکر آپ کے حالات پر مرتبہ "چودھویں صدی کا محیّ الدینؒ" نامی کتاب میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

احقر کی یہ سعادت ہے کہ احقر کے روحانی مربّی حضرتِ مدنیؒ اور جسمانی مربّی حضرتِ والد صاحب نور اللہ قبورہما دونوں بنگال کے ممتاز دینی، علمی اور رُوحانی راہنما ہیں۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ

صوبہ بنگال میں سلہٹ کی رُوحانی عظمت
(۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۸ء)

سلہٹ کو ۷۸۵ھ مطابق ۱۳۸۴ء میں سالار سکندر غازی نے (جو کہ سلطان شمس الدین فیروز شاہ والیٔ بنگالہ کے سپہ سالار تھے) فتح کیا۔ اگرچہ ظاہری طور پر عسکری طاقت سکندر غازی کے ہاتھ میں تھی مگر ضلع سلہٹ کے سرکاری گزیٹیر کے مطابق،

"سکندر غازی کی فوجوں سے زیادہ شاہ جلال کی کرامات نے ہندو راجہ اور اُس کی افواج

کو بے بس کر دیا تھا۔"

فتح اسلام سے پہلے اس کا نام سر ہیٹ تھا جو بعد میں سلہٹ بن گیا۔ یہاں سب سے پہلے شیخ جلال الدین مجرد ترکستانی (اصل اُچ، بہاولپور کے تھے۔ (آب کوثر ص۳۵۵) اپنے تین سو تیرہ خادموں کے ساتھ تشریف لائے اور اس علاقہ کے ہندو حکمران راجہ گوڑ گوبند کی ایک لاکھ پیادہ اور کئی ہزار سوار فوج کا مقابلہ فرما کر فتح حاصل کی۔ شیخ جلال الدینؒ سے مشہور سیاح ابن بطوطہ نے ملاقات کی اور ان کا حال اپنے سفر نامہ میں یوں لکھا ہے کہ:-

"آپ بدن کے ہلکے پھلکے تھے، قد لانبا تھا اور رخسارے لگے ہوئے تھے، ایک غار میں پڑے یادِ الٰہی میں مستغرق رہتے تھے اور چالیس سال سے برابر روزے سے تھے، دس دن میں ایک دفعہ افطار فرماتے تھے، اُن کے ہاتھ پر اس پہاڑی ملک کے اکثر غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے، آپ صرف اپنی گائے کے دودھ پر گذارہ کرتے ہیں، شمال مشرقی بنگال خصوصاً سلہٹ میں اسلام کی اشاعت شاہ جلال ہی کی مرہونِ منت ہے"۔ (آب کوثر از شیخ اکرام ص۳۴۱)

آپ کی وفات ۲۰ ذیقعدہ ۷۴۰ھ / ۱۸ مئی ۱۳۴۰ء کو ہوئی اور آپ کا مزار پر انوار آج بھی سلہٹ میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

حضرت شیخ جلال قدس سرہ العزیز کے بعد بھی سلہٹ میں اولیاء کرام کا وُرُود رہا اور یہ سرزمین ان کے انوار سے مشرف ہوتی رہی، شاید یہی حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چودھویں صدی کے قطب الارشاد والتکوین حضرت مدنیؒ کی برکات سے بھی سلہٹ کو نوازا۔ حضرت مدنیؒ نے اپنے ایک خادم کو سلہٹ میں قیام کو دوسری جگہ کے قیام پر ترجیح دینے کے اصلی سبب کو یوں بیان فرمایا:-

"محترما! اہلِ سلہٹ تقریباً ڈیڑھ سال سے زور دے رہے تھے کہ صوبہ آسام اور بنگال میں باوجودیکہ مسلمانوں کی مردم شماری تقریباً تین کروڑ ہے مگر تعلیمی حالت مسلمانوں کی بہت گری ہوئی ہے، مذہبی تعلیم میں بھی یہاں کے مسلمان بہت کمزور ہیں، خصوصاً علمِ حدیث کا چرچا اور واقفیت تو بے حد کمزور ہے اس لیے تجھ کو لازم ہے کہ تو یہاں آکر کچھ دنوں قیام کر اور ایک دفعہ صحاحِ ستہ کی پوری تعلیم دے، پھر یہاں حدیث ہم

جاری کرلیں گے"۔ (شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ)

چنانچہ آپ ۲۱، ربیع الاوّل کو آسام کے مشہور شہر سلہٹ تشریف لے گئے اور تدریس علمِ حدیث کا افتتاح فرمایا، اس کی ترتیب کو یوں ذکر فرمایا :۔

"۲۱، ربیع الاوّل کو یہاں پہنچا ہوں، پہلے ضروری معلوم ہوا کہ اصولِ حدیث کی کوئی کتاب پڑھا دی جائے تاکہ اصطلاحات سے ان کو پوری واقفیت ہو جائے، چنانچہ گذشتہ جمعہ سے نخبۃ الفکر شروع کرادی ہے جو تقریباً بالنصف ہو چکی ہے، اِنشاء اللہ کل سے ترمذی شریف بھی شروع ہو جائے گی، تقریباً پانچ گھنٹہ روزانہ پڑھائی ہو گی، کچھ وقت قرآنِ کریم کے ترجمہ اور تفسیر کے لیے بھی خرچ کرنا ہو گا جس کے اصولِ تفسیر میں شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ کا رسالہ "الفوز الکبیر فی علوم التفسیر" "نخبۃ الفکر" کے بعد شروع کرا دینے کا ارادہ ہے، مَیں اسی کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ تحریک میں حصہ لیتا رہوں گا اور تقریریں کرتا رہوں گا"۔ (مکتوباتِ شیخ الاسلام جلد ۴ ص ۲۴۵)

اگرچہ بنگال کے مسلمان مذہبی علوم میں کمزور رہتے مگر ان کی ذہانت اور محنت اس قابل تھی کہ اُن کا رُخ عصری علوم سے ہٹا کر دینی علوم کی طرف پھیرا جائے، اس کے لیے کسی ایسے معلّم کی ضرورت تھی جو صرف کتابی علم نہ رکھتا ہو بلکہ روحانی طور پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہو اور اس کے لیے حضرتِ مدنیؒ موزوں ہی نہیں بلکہ فائق تھے، جناب خود سلہٹ میں قیام کو ترجیح دینے کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں :۔

"یہاں پر ایک بڑی جماعت اُن لوگوں کی ہے جنہوں نے مدرسۂ عالیہ کلکتہ، ڈھاکہ، سلہٹ وغیرہ سے اعلیٰ اعلیٰ درجہ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں، اور سمجھدار اور ذی استعداد ہیں، انہوں نے عربی فنون میں استعداد بڑے درجہ تک حاصل کی ہے، بہت سے ان میں انگریزی زبان اور علومِ عصریہ سے بھی واقفیت رکھتے ہیں، یہ لوگ اُن طلباء کی طرح جو ان اطراف میں جاتے ہیں کُند ذہن، بے سمجھ، کم شوق اور کم محنت نہیں ہیں۔ یہ لوگ ہندو بنگالیوں کی طرح جوڑ توڑ کے ماہر ہیں، اُن کو مذہبی جوش اور اسلامی خیال اور ہمدردی بڑے پیمانے تک ہے، اِس جماعت کا مدت سے شوق تھا کہ صحاحِ ستہ کی تکمیل کسی طرح ہوتی اور اپنے مذہبی فنون میں سے علمِ حدیث کا حظِ وافر نصیب ہوتا، اِس غرض سے ان لوگوں نے

اِس خاص سلسلہ جنبانی کی صورت اختیار کی اور احقر کے پہنچنے پر متعدد اطراف سے جمع ہو کر پہنچ گئے اور پہنچ رہے ہیں، ان اطراف میں مسلمانوں کی آبادی بہت کثرت سے ہے بعض بعض اضلاع میں تو نوّے فیصدی مسلمان ہیں اور باقی ہندو ......"

(شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ ص ۲۸۷، ۲۸۸)

سلہٹ میں قیام کے اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ :-

"سلہٹ بلکہ آسام کے اس سارے ہی علاقے میں خدا ترسی، دینداری اور پابندیٔ سُنّت و شریعت کا ذوق بہت عام ہے۔ سلہٹ پورے آسام کا مرکزی مقام تھا یوں تو حضرت کی شہرت پورے ہندوستان میں عام ہو چکی تھی مگر کلکتہ کے قیام کے دوران یہاں معتقدین اور مداحین کی ایک جماعت پیدا ہو گئی تھی، اِن لوگوں کا اصرار روز بروز بڑھتا ہی جا رہا تھا، خلافت کمیٹی کا کام یہاں بھی زوروں پر رہ چکا تھا، بچی کھچی چنگاری اب بھی سُلگ رہی تھی، ان ہی لوگوں کا یہ پروگرام اور اصرار تھا، کام بھی خدمتِ حدیث کا اور قومی خدمت گذاری کا بلکہ یوں کہیئے کہ حضرت کے مشن کے عین مطابق و موافق تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ سے استخارہ اور استعانت کر کے اللہ کا نام لے کر ۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۳ء میں سلہٹ رونق افروز ہو گئے"

(شیخ الاسلام حضرتِ مدنیؒ ص ۲۸۷)

سلہٹ میں قیام کی برکات اور اس کے اثرات

اگرچہ آپ بظاہر تو درسگاہِ خلافت سلہٹ میں بطور شیخ الحدیث کے رونق افروز ہوئے تھے مگر علمی، تبلیغی اور روحانی مساعی کا اندازہ لگاتے ہوئے آپ کے ایک سوانح نگار نے تحریر فرمایا ہے :-

"...... وہی علاقہ جہاں علماء اور مدارس کا وجود شاذ و نادر ہی نظر آتا تھا وہاں بہت سے دینی مدارس، سینکڑوں عالمِ دین اور ہزاروں ذاکر و شاغل انسان تیار ہو گئے اور اس دورِ انحطاط و زوال میں حضرت شیخ الاسلام کے زمرہ میں سب سے زیادہ[1] تعداد صوبہ آسام کے افراد کی جو

---

[1] حضرت کے کل خلفاء مجازین کی تعداد ۱۶۸ ہے جن میں سے بنگلہ دیش (آسام) کے خلفاء ۹۲ ہیں۔

نظر آرہی ہے یہ اسی وقت کے فیوض وبرکات کا اثر ہے، حق تعالیٰ نے ہندوستان کے ہر ہر گوشہ پر آپ کے احسانات مکمل کرنے کے لیے شمال و مغربی ہند سے پہلے اس دُور دراز مشرقی علاقہ کو آپ کی سرگرمیوں کے لیے چُن لیا ورنہ ہو سکتا تھا یہ علاقہ محروم رہ جاتا۔ یہ وہی علاقہ ہے جو ایک عرصہ پہلے امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے بعض خلفاء کرام کی تبلیغی واصلاحی سرگرمیوں کی جولانگاہ رہا ہے اور اُن کی نگاہِ کرم نے یہاں ایسے مجاہدین پیدا کیے تھے جن کے سامنے نہ سرحدی علاقہ کے تنومند قوی ہیکل جوان ٹھہر سکتے تھے نہ شیر پنجاب راجہ رنجیت سنگھ کی توپ وتفنگ سے مسلح فوج کے سپاہی۔ دیکھنے میں یہ لوگ بظاہر نہایت پتلے دُبلے اور بے جان وحقیر سے معلوم ہوتے تھے لیکن میدانِ جنگ میں جرأت اور شجاعتِ اسلامی کے وہ جوہر دکھاتے تھے کہ دشمن توپیں چھوڑ کر شکست کھا کر پسپا ہونے پر مجبور ہوتے تھے، اور اگر اپنوں ہی کی غداریاں نہ ہوتیں تو شاید ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر انگریزی حکومت کے منحوس سائے کے بجائے ان مجاہدین اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی قائم کردہ خلافتِ راشدہ کے نمونے کی اسلامی حکومت کا پرچم ہمایوں لہرا رہا ہوتا مگر ؏ اس گھر کو آگ لگ گئی اس گھر کے چراغ سے

بہرحال آسام کی اس خوش نصیب سرزمین پر علوم ومعارف کی بارش کرنے کے لیے مبدءِ فیاض نے ایک عرصہ کے بعد حضرت سید احمد شہیدؒ کے ایک صحیح جانشین کا پھر انتخاب فرمایا جو دیگر خصوصیات کے علاوہ عزم وحوصلہ، بلند ہمتی، جفاکشی میں بھی یقیناً سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے ثانی تھے، اور اگر حالات وہی ہوتے اور اسباب وضروریاتِ جہاد میں عظیم تغیرات رُونما نہ ہو گئے ہوتے تو کچھ عجب نہ تھا کہ دُنیا اس عظیم مجاہد کے جہاد کی کارگذاریاں اسی حیرت واستعجاب کے ساتھ سُنتی جیسا کہ پہلے سن چکی تھی"۔ (الحرم "مدنی نمبر" ص ۱۰۴)

آپ مدرسہ مرکزیہ خلافت بلڈ نگ میں ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۸ء تقریباً چار سال بحیثیت شیخ الحدیث رونق افروز رہے مگر اس کے ساتھ ساتھ تبلیغ کا کام بھی جاری رہا، حضرتؒ کے جلیل القدر خلیفہ مجاز مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری حضرتؒ کے اِن اسفار کا چشم دید حال یوں بیان فرماتے ہیں:۔

"آپ کے تبلیغی دوروں کی ابتداء ہندوستان کے صوبہ آسام سے ہوتی ہے، آسام ایک

ایسا مقام ہے جس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس کو انسانوں نے اپنے قیام کے لیے کس طرح منتخب کر لیا۔ چاروں طرف پہاڑ، دریا ہیں، آندھی اور زلزلہ کا یہ عالم ہے کہ تصور سے روح کانپتی ہے۔ باسکنڈی کے قیام کے دوران راقم الحروف نے ان لرزہ خیز طوفانوں کے تھپیڑے کھائے ہیں، ان طوفانوں میں حضرت تبلیغی دورے کرتے ہوئے دریاؤں اور پہاڑوں کو کھوندتے پھرتے رہے ہیں۔" (الحرم "میرٹھ مدنی نمبر ص۷)

حضرت مدنیؒ کے رفیق خاص مولانا حافظ زاہد حسن کے خلف الرشید مولانا حافظ سید طاہر حسن مدرس اول مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ نے اسی تبلیغ اور اس کی مشکلات کو یوں بیان فرمایا ہے:۔

"بنگال و آسام کے اس علاقہ میں ہند کے کسی خشک علاقہ کے رہنے والے کیلئے اصلاح و تبلیغ کی سرگرمیوں کا جاری رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے، ندی نالوں اور سیلاب زدہ علاقوں کا ایک سلسلہ ہے جس کا نام آسام و بنگال ہے، قدم قدم پر ندی نالے بہتے ہیں جن کو عبور کرنا اور ایک بستی سے دوسری بستی تک پہنچنے کے لیے ناگزیر ہے۔ ایک غیر آسامی کے لیے وہاں پورے طور پر عملی سرگرمیاں جاری رکھنا تقریباً ایک امر محال ہے لیکن حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ جن کو حضرت حق جل مجدہٗ نے بہت سی فوق العادت حیران کن خصوصیات سے نوازا تھا اُن کی بے نظیر ہمت اور جرأت کے راستے میں یہ نالے، ندیاں کیا رکاوٹ بن سکتی تھیں، آپ نے گلی کوچوں کی طرح اُن کو طے کر کے بستی بستی پہنچکر حق تبلیغ ادا فرمایا۔" (الحرم "میرٹھ مدنی نمبر ص۱۰۴)

ف:۔ حضرتؒ کی روحانی برکات صوبہ آسام پر دارالعلوم دیوبند میں تشریف لانے کے بعد بھی باقی رہیں جن کا ذکر ان شاء اللہ "قیام دارالعلوم دیوبند کے مشاغل" میں آ جائے گا۔

ف:۔ بنگلہ دیش کی دینی اور علمی ترقی کی طرف ہمیشہ اولیاء اللہ کی توجہ رہی ہے، سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء مولانا ولایت علی عظیم آبادیؒ اور مولانا کرامت علی جونپوریؒ کی خدمات یادگار ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے رفقاء اور خاص کر حضرت مدنیؒ نے اس علاقہ میں بہت زیادہ محنت کی، حضرت مدنیؒ ہر سال رمضان المبارک سلہٹ میں گذارتے جہاں صرف اصلاح و ارشاد کا کام ہوتا تھا، اب تک اس کے اثرات موجود ہیں۔

دار العلوم دیوبند میں خلفشار اور حضرت مدنیؒ

استاذِ محترم حضرت شیخ الہندؒ کی مسندِ صدارت پر

پہلے تفصیل سے گذر چکا ہے کہ مالٹا سے رہائی کے بعد حضرت مدنیؒ کو اُن کے اُستاذ شیخ الہندؒ نے ہندوستان ہی میں قیام کا حکم فرمایا جسے آپ نے بسروچشم قبول فرمالیا۔ اسی زمانہ میں کلکتہ کی صدمدرسی اور پھر مقدمہ کراچی میں دو سال قید سے رہائی کے بعد دار العلوم سلہٹ میں شیخ الحدیث کی مسند پر فائز ہوئے اور ساتھ ہی برصغیر کی آزادی کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کے پروگرام پر عمل فرماتے رہے کہ ۱۳۴۵ھ میں دار العلوم دیو بند میں ایک ایسا خلفشار پیدا ہوا جس نے دار العلوم کو ایک مہیب خطرہ میں ڈال دیا۔ ویسے تو ہر ادارے میں گاہ بگاہ کوئی نہ کوئی اختلاف نمودار ہو جاتا ہے پھر اس پر قابو پا لیا جاتا ہے، مگر دار العلوم کا یہ اختلاف بہت شدید نمودار ہوا، اس اختلاف کا اصلی محرک کیا تھا؟ اس کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل کیفیت کو ملاحظہ کیا جائے:۔

دیو بند میں عثمانی خاندان مُدت سے آباد تھا جن کے ایک عظیم فرد مولانا فضل الرحمٰن مرحوم تھے مرحوم نے تین شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی مرحومہ لاولد تھیں اور دوسری محترمہ سے تین فرزند ارجمند اللہ تعالےٰ نے عطا فرمائے تھے، مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا حبیب الرحمٰن، حافظ خلیل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہم۔ جبکہ تیسری محترمہ سے مولوی مطلوب الرحمٰن، علامہ شبیر احمد عثمانی، بابو فضل حق فضلی اور ایک دختر بلند اختر تھیں، رحمۃ اللہ علیہم۔ گویا مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ مہتمم دار العلوم دیو بند اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ آپس میں سوتیلے بھائی تھے اور دونوں لاولد تھے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کے فرزند ارجمند حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم مقرر ہوئے مگر ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۸ء مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نائب مہتمم مقرر کر دیئے گئے، ۱۳۲۶ھ میں مولانا شبیر احمد عثمانی

دارالعلوم دیوبند کے مدرس مقرر ہوئے مگر جلد ہی دہلی کے مدرسہ فتحپوری میں بطور صدر مدرس تشریف لے گئے اور پھر ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۱ئہ میں دارالعلوم دیوبند میں دوبارہ بطور مدرس تشریف لائے جبکہ آپ کے بھائی مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ نائب مہتمم تھے۔ "حیاتِ عثمانی" کے مؤلف پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی نے بروایت جناب قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرمایا ہے کہ:-

"علامہ عثمانیؒ کو اپنے برادر بزرگوار مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ سے مختلف امور میں اختلاف ہو جایا کرتا تھا اور میں (مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ) ان کو منانے کیلئے مامور تھا۔" (حیاتِ عثمانی ص۲۸۶)

اِس اختلاف کی خلیج وسیع تر ہوتی گئی اور بقول مؤلف "حیاتِ عثمانی" :- "کچھ اہم واقعات تھے جن سے وہ پردہ اٹھانا پسند نہیں کرتے۔" (حوالہ مذکور)

اِس مختصر مگر پُر معنیٰ بیان سے یہ بات بخوبی واضح ہو رہی ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں خلفشار کی اصلی وجہ مولانا عثمانیؒ اور اُن کے برادر بزرگ مولانا حبیب الرحمٰن مرحومین کا باہمی نزاع اور اختلاف تھا۔ اگرچہ مؤلف "حیاتِ عثمانی" نے کسی مصلحت کی بناء پر ایک تاریخی حقیقت کو ذکر نہیں کیا مگر ہم ایک تاریخی حقیقت کی بناء پر اس سارے اختلاف کی وجہِ اصلی بزبان مولانا عبدالرحمٰن صاحب سیوہارویؒ رُکن مجلس علماء بھوپال و ممبر مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند عرض کرتے ہیں جو انہوں نے دارالعلوم دیوبند کے عنوان سے اپنے ایک طویل عربی قصیدہ تائیہ میں فرمائی ہے ؎

اَصْلُ الْخِلَافِ لَهُمْ نِيَابَةُ طَيِّبٍ

قَدْ اَوْقَدَتْ بِقُلُوْبِهِمْ جَمَرَاتٍ

(ترجمہ) "اختلاف اور جھگڑوں کی بنا (مولوی) طیب کی نیابتِ اہتمام ہے جس نے ان کے کلیجوں میں آگ بھڑکا دی ہے۔" (القاسم دارالعلوم نمبر محرم الحرام ۱۳۴۷ھ ص۵۲)

مرتب "حیاتِ عثمانی" نے بھی اقرار کرتے ہوئے لکھا ہے:- "عرصہ ہوا علامہ دارالعلوم کے دائرہ اہتمام سے ناراض ہو کر اس کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔" (ص۴۰۴)

وجہ کوئی بھی ہو یہ خلفشار اس حد تک بڑھ گیا کہ بالفاظِ قاری محمد طیب صاحب:-

"گذشتہ سال طلباء کے جس ہنگامے کا آغاز ہوا تھا وہ اگرچہ اس وقت بالکل وقتی حالات کا

نتیجہ معلوم ہوتا تھا مگر طلباء کو بعض منتظمین سے جو شکایات تھیں ان کا بروقت تدارک کر دیا گیا تھا مگر بعد میں بتدریج شکایتوں میں اضافہ ہوتا گیا اور رفتار کے ہر موڑ پر اچانک ایسی تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں جنہوں نے حالات کو شدید سے شدید تر بنا دیا، طلباء کی انجمن "نحبۃ الاتحاد" جس کی بنیاد گذشتہ سال پڑ چکی تھی نہ صرف یہ کہ وہ باقی تھی بلکہ اس کی طاقت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا لیکن اب تک جو کچھ ہوا وہ صرف طلبہ ہی کی حد تک محدود تھا، طلبہ کو اساتذہ کی اعانت حاصل نہ تھی کہ دفعۃً شعبان کے پہلے ہفتے میں حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب نے طلباء کے مطالبات کی تائید میں یکے بعد دیگرے دو مرتبہ مسجد دار العلوم میں تقریر فرمائی، حضرت شاہ صاحب کے ساتھ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب، مولانا سراج احمد صاحب اور چند دوسرے اساتذہ بھی شریک ہو گئے[1]

چنانچہ اہتمام اور تدریس میں شدید اختلاف نے یہ صورت اختیار کر لی کہ ایک طرف حکیم الامت حضرت تھانوی سرپرستِ دار العلوم، مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نائب مہتمم اور چند اساتذہ کرام تھے اور دوسری طرف حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن (برادران مولانا حبیب الرحمٰن صاحب) مولانا سراج احمد رشیدی جیسے جلیل القدر اساتذہ کرام جو کہ حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب برادر زادہ مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا بدر عالم میرٹھی صاحب شاگرد رشید حضرت شاہ صاحب اور چند دیگر اساتذہ کرام تھے۔

طلباء نے بائیکاٹ کر دیا اور اسٹرائک ہو گئی جسکے شرعی عدم جواز پر مولانا اشرف علی تھانویؒ نے (جو اس وقت دار العلوم کے سرپرست تھے) ایک فتویٰ بہ نام تلیین العوائک فی تھجین اسٹرائک لکھا جو امداد الفتاویٰ کی جلد ۶ میں موجود ہے بلکہ آپ نے ایک مفصل مضمون تحریر فرمایا جو کہ ماہنامہ "النور" ماہ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ ۱۹۲۷ء (اکتوبر) میں مذکور ہے اور بعد میں "فتنۂ دیوبند" کے نام سے مستقل بھی طبع ہوا تھا، حضرت تھانویؒ ہی نے مستعفی حضرات کی طرف سے شائع ہونیوالے ہفت روزہ "مہاجر" کے جواب میں شائع ہونیوالے اخبار "الانصار" کے اجراء پر مندرجہ ذیل استقبالیہ نظم مرتب فرما کر جناب قاری محمد طاہر صاحب کو ارسال فرمائی تھی۔

---

[1] تاریخ دار العلوم جلد ۱ ص ۲۷۰ [2] "حیات عثمانی" کے مؤلف پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی نے تحریر کیا ہے: "میں بھی "مہاجر" کے بعض حصوں کی کتابت کر دیا کرتا تھا اس لیے روٹی کھانے کا استحقاق ہو جاتا۔" (ص ۳۸۸)

ایک حقیقی اسلامی دعوت کے ساتھ اخبار "الانصار" دیوبند کے اجراء پر اس کا مشتاقانہ و مشوقانہ استقبال

مرحبا بالانصار

مرحبا اے بلبلِ باغِ کہن — از گلِ رعنا بگو با ما سخن

مرحبا اے قاصد طیار ما — میرسد ہر دم خبر از یارِ ما

مرحبا اے محرم اسرارِ ما — مرحبا اے ہمدم انصارِ ما

منطق الطیر سلیمانی بیا — بانگِ ہر مرغے کہ آید مے سرا

ایہا العشاق السقیا لکم — انتم الباقون والبقیا لکم

ہیں بیایید اے عزیزاں زود زود — کہ بر آمد موجہا از بحرِ جود

سوئے ساحل میفشاند بے خطر — موج موج جوش ہر زمانے صد گہر

ایہا السالون قوموا واشتقوا — ذاک ریح یوسف استنشقوا

ہیں بیا اے طالب دولت شتاب — کہ فتوح است ایں زمان و فتح باب

اے کہ تو طالب نئی تو ہم بیا

تا طیب یابی از آں یارِ وفا

بواسطہ خطاب بہ عزیز مولوی محمد طاہر طہر اللہ باطنہ والظاہر السلام علیکم ورحمۃ اللہ ـــــ اگر اس اخس الانام اشرف برائے نام کو اس جریدۂ فریدہ کے خریداروں میں لکھ لیجئے تو فخر کے ساتھ یہ شعر پڑھنے کا حقیقی موقع ملے گا۔

جمالے چند دادم جاں خریدم

بحمد اللہ عجب ارزاں خریدم

۸ رجمادی الاول ۱۳۴۶ھ / ۳ر نومبر ۱۹۲۷ء، (الطرائف والظرائف ص ۱۰۹، ۱۱۰)

یہ معمولی خلفشار نہ تھا بلکہ بہت ہی خطرناک خلفشار تھا اور یہ خطرہ حقیقت بن کر نظر آرہا تھا کہ مدرسے کی اینٹ سے اینٹ بج کر رہے گی، صدر مدرس اور پھر شاہ صاحب جیسے صدر مدرس اور شیخ حدیث اساتذۂ کرام اور طلباء کی ایک بڑی جماعت الگ ہوئی تو پورے ملک کے عوام و خواص میں بے چینی اور ادارے کے خلاف

اعتراضات و اختلافات کی لہر دوڑ گئی۔ اس وقت کی بڑی شخصیتیں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا محمد علیؒ، مولانا حفظ الرحمٰنؒ اور اس پایہ کے بہت سے اعیان، نیز اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت "تحریک خلافت" شاہ صاحب کی ہمنوا تھی، مختلف قسم کے پوسٹر اور بیانات اخبارات میں چھپتے رہے، حتیٰ کہ حافظ محمد ابراہیم صاحب مرحوم دیوبند پہنچے اور مولانا محمد علی جوہر بھی آنے والے تھے، جب حافظ صاحبؒ نے حضرت مدنیؒ سے ملاقات کے دوران کہا کہ خلافت کمیٹی نے ہمیں تحقیق کے لیے بھیجا ہے، اس پر حضرت مدنیؒ نے برہم ہو کر فرمایا آپ میرے پاس کیوں نہیں آتے؟ میں یہاں موجود ہوں مجھ سے بات کر لیتے پھر تحقیق ہو جاتی، آپ کے اس طرح آنے سے فساد کا خطرہ ہے' حافظ صاحب واپس چلے گئے اور مولانا محمد علی جوہر کو بھی روک دیا ان حالات میں جیسی صورت بھی ہو جاتی کم تھی اور جو کچھ بھی ہو جاتا متوقع تھا مگر خوش قسمتی سے اس وقت مدرسہ کا اہتمام مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی جیسے صاحب فہم و فراست، مردم شناس اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے مالک کے ہاتھوں میں تھا۔ آپ نے بلا کسی تاخیر اور تردد کے یہ فیصلہ کیا کہ اس نازک وقت میں مدرسہ کی گرتی ہوئی ساکھ اور ڈوبتے ہوئے نام کو کوئی ایسا ہی شخص بچا سکتا ہے جو اپنے وقت کا امام، تقویٰ اور شریعت و سنت میں مسلّم اور فنافی العلم ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں معروف و محبوب ہو، ان صفات سے پوری طرح متصف ذات ہمارے حضرت مولانا سید حسین احمد رحمۃ اللہ علیہ ہی کی تھی جس پر اپنوں پرایوں، بڑوں چھوٹوں، عوام اور خواص سب نے اتفاق کیا اور حضرتؒ کو دارالعلوم تشریف لانے کی دعوت دی جس کو حضرتؒ نے منظور فرما لیا، جب حضرت مدنیؒ دیوبند پہنچے تو مولانا حبیب الرحمٰن اور حافظ احمد صاحبان نے دارالعلوم کی چابیاں حضرتؒ کے قدموں میں ڈالتے ہوئے کہا یہ اکابر کی امانت آپ کے سپرد ہے آپ ہی اسے سنبھال سکتے ہیں۔

حضرت مدنیؒ کا دارالعلوم میں تقرر

علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور آپ کے رفقاء کے استعفاء کے بعد حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کا تقرر بعہدہ صدر مدرسی دارالعلوم دیوبند میں حضرت حکیم الامت تھانویؒ سرپرست دارالعلوم دیوبند کے مشورہ سے عمل میں آیا اور حسب ذیل تجویز مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند تحریر کی گئی:۔

"حضرت مولانا مولوی حسین احمد کا تقرر بعہدۂ صدر مدرس بمشاہرہ ما ۱۵۰ ماہوار تاریخ کارکردگی سے مجلس شوریٰ کو منظور ہے۔ حضرت ممدوح کی اعلیٰ شخصیت اور علمی تبحر کے لحاظ سے مشاہرہ مذکور بالکل ناقابل ہے مگر حضرت ممدوح کی اخلاص نیت و خدمت

دارالعلوم کے جذبات سے ہم کو توقع ہے کہ حضرت ممدوح اس کو منظور فرما کر مجلسِ شوریٰ کو شکر گذاری کا موقع دیں گے اور دارالعلوم کی حالت پر اپنی توجہات اور اخلاقِ بزرگانہ سے نظرِ التفات فرما کر حسبۃً للہ پورے طور پر سنبھالنے کی کوشش فرمائیں گے جیسا کہ حضرت ممدوح کے استاد بزرگ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا طریقۂ عمل تھا"

فقط ، اشرف علی ۲۰ رجب ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء

کمترین جمیل احمد، محمد مسعود احمد، محمد حسن مراد آبادی، محمد اشفاق، احقر محمد اسحٰق عفی عنہ، محمد عبدالرحمٰن، مظہر حسن بقلم خود۔

تاہم چونکہ دیوبند اور اُس کے اہتمام کے مزاج سے آپ پوری طرح واقف تھے، اپنے مشن اور جدوجہد آزادی کے تقاضے بھی آپ کے سامنے تھے، نیز ہندوستان میں قیام کا مقصد بھی متعین اور مقرر تھا اس لیے آپ نے دارالعلوم کے اہتمام کے سامنے حسب ذیل شرائط رکھیں۔

(۱) سیاسی مسلک اور نظریات میں پوری آزادی ہوگی اور مدرسہ کو کسی اختلاف و اعتراض کا حق نہ ہوگا۔

(۲) سیاسی سرگرمیوں اور تحریکاتِ آزادی میں شرکت پر مدرسہ کی جانب سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔

(۳) ہر ماہ ایک ہفتہ بلا کسی رخصت اور منظوری کے سفر ہو سکے گا اور اسکی تنخواہ وضع نہ ہوگی، وغیرہ وغیرہ[1]

خود مدرسہ کو بھی ایسے ہی صاحبِ عزیمت و جرأت، حاملِ شریعت و سنت، مجاہدِ آزادی و سیاست کی ضرورت تھی۔ دیوبند والوں سے زیادہ حضرتؒ کے مزاج، طبیعت اور نفسیات سے کون واقف ہو سکتا تھا، انہوں نے ہر پہلو پر غور کر کے ہی آپ کو یہ پیشکش کی ہوگی، چنانچہ پورے انشراح و انبساط کے ساتھ یہ شرائط منظور کر لی گئیں اور حضرت ۱۹۲۸ء میں دیوبند کی مسندِ صدارت و حدیث پر تشریف لے آئے، اور اس کے ساتھ وہ تمام خطرات، انتشار اور اضطراب جو وقتی طور پر پیدا ہو گیا تھا ختم ہو گیا اور موافقین و مخالفین کو جمعیتِ خاطر حاصل ہو گئی۔

ضروری وضاحت

اہتمام نے حضرتِ مدنیؒ کی ان تمام شرائط کو منظور کر لیا اور حضرت تشریف لے آئے، جب ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۲۹ء جنابِ قاری محمد طیب صاحبؒ دارالعلوم کے مستقل مہتمم بنائے گئے تو حضرت مدنیؒ نے اپنی ان ہی شروط کو اس وقت کی مجلسِ شوریٰ اور مہتمم صاحب کے پیش فرما دیا جو کہ سب نے بالاتفاق منظور رکھیں۔

[1] حیاتِ شیخ الاسلام از مولانا محمد میاں صفحہ ۱۳۶

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ حضرت مدنیؒ نے اپنی شرائط میں سیاست میں آزادی اور اس میں اشتراک کی شرط بھی رکھی تھی، آخر ایک علمی اور تعلیمی ادارے میں ملازمت کے لیے اس شرط کی کیا ضرورت تھی؟ اس کی وضاحت کے لیے دارالعلوم کے قیام کی اصل غرض کا معلوم کرنا ضروری ہے جس کو مختصر الفاظ میں درج کیا جاتا ہے :۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے اغراض اسلامی حکومت کے خاتمہ پر عیسائیوں کی ہر قسم کی یلغار کا دوامی مقابلہ کرنے کے لیے دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا مقصد دینی، علمی راہنمائی کے علاوہ ایسے مجاہدین پیدا کرنا تھا جو وقت کے مناسب حکمت عملی اختیار کر کے عیسائی حکومت کا خاتمہ کریں اور اس طرح ۱۸۵۷ء کے مظالم کا نہ صرف انتقام لیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کے ناپاک قدموں سے اس سرزمین کو اس طرح پاک کر دیں کہ ان کی اس قدر طویل اور عریض ظالمانہ حکومت سمٹ کر اپنے جزیرہ میں محدود ہو جائے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے فرمایا :۔

"سنہ ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانانِ ہند کی قومیت کی تخریب کے لیے جو سیلاب تعلیمی رنگ سے میکالے کے روپ میں اُٹھا اور ان کی مذہبی تخریب کے لیے جو دھارا پادریوں کی منظم تبلیغ یا آریوں کے منظم پرچار کی صورت میں بہا اُس پر بند لگانے کا کام صرف اس تعلیمی تحریک نے کیا جو حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے روپ میں نمودار ہوئی"

مگر یہ تعلیمی تحریک صرف ایک درسگاہ نہ تھی بلکہ اُس مسجدِ نبوی علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ سلام کا پرتو تھی جس میں بیک وقت درس و تدریس، ذکر و اذکار، وعظ و تذکیر اور ساتھ ہی بدر اور اُحد کے لیے جان نثاروں کی تربیت کا کام بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ بالفاظ قاری صاحبؒ :۔

"حضرت قاسم العلوم نے اُٹھ کر اسلام کی تعمیر و دفاع کے لیے اپنے آپ کو ظاہری و باطنی کمالات کے ساتھ پیش کیا۔ تلوار کے وقت تلوار سے، قلم کے وقت قلم سے، زبان کے وقت زبان سے اسلام اور ملک و ملت کی نادرِ روزگار خدمت انجام دی"۔ (مقدمہ سوانح قاسمی ۲،۵،۶،۷)

بانیٔ دارالعلوم دیوبند کو انگریزی حکومت اور انگریزوں سے جو نفرت تھی اس کا نقشہ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے یوں کھینچا ہے :۔

"ہندوستان سے مقامی حکومت ختم کر کے بیرونی اقتدار کے سیاسی تسلط کا جو واقعہ

اس ملک میں پیش آیا تھا یعنی انگریزوں کی نئی حکومت جو اس ملک میں قائم ہو گئی ان انگریزوں اور ان کی حکومت سے سیدنا الامام الکبیر (حضرت نانوتویؒ) کے احساس کا جو تعلق تھا مختلف موقعوں پر اس کا ذکر کرتا چلا آیا ہوں، بجائے بٹن کے گھنڈی اور تکمہ کے استعمال پر زندگی بھر جو اس لیے اصرار کرتا رہا کہ بٹن لگانے کا طریقہ انگریزوں کا رواج دیا ہوا ہے، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انگریز اور انگریزیت کے متعلق اس کی نفرت کے جذبات کا حال کیا ہو گا۔" (سوانح قاسمی جلد ۲ صفحہ ۸۲، ۸۳)

اس مختصر مگر جامع تحریر سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ:۔

"دارالعلوم دیوبند، مدرسہ شاہی مراد آباد، مظاہر علوم سہارنپور کو آپ ان سکولوں اور مدرسوں کی طرح نہ سمجھیں جن کو اتفاقیہ طور پر قائم کر لیا جاتا ہے۔" (سوانح قاسمی جلد ۲ صفحہ ۲۲۹)

بلکہ حسب ارشاد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ:۔

"مدرسہ دیوبند ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کیلئے قائم کیا گیا ہے۔" (کتاب مذکور صفحہ ۹۴)

(یہی وجہ تھی کہ) انگریزوں نے اپنے جابرانہ تسلط کے بعد ویسے تو وہ مظالم اور ستم ڈھائے جس کی تاریخ میں مثال نہیں مگر خصوصی طور پر مولانا رحمت اللہ کی بستی کیرانہ، مولانا حافظ ضامن حسنؒ کی بستی تھانہ بھون اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مدرسہ دیوبند پر وہ ظلم کیا جو سب سے زیادہ تھا۔ (ہو تم دوست جس کے صفحہ ۱۴۰)

ان چند مستند حوالوں سے اور بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی انگریز دشمنی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دارالعلوم کا قیام صرف دینی اور دینیات کی تعلیم تک محدود نہ تھا بلکہ اس میں ایسی قیادت کا تیار کرنا تھا جو حسبِ حال مناسب واقعات کے پیشِ نظر اپنی جدوجہد کو اُس وقت تک جاری رکھے جب تک کہ انگریز کے منحوس سائے سے بھی برِصغیر پاک ہو جائے۔

دارالعلوم دیوبند کی رفتارِ کار از حضرت نانوتویؒ تا حضرت شیخ الہندؒ

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۴ جمادی الثانی ۱۲۹۷ھ مطابق ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء کو ہوئی جبکہ آپ کی عمر صرف ۴۹ سال تھی۔ آپ کے بعد مہتمم حضرات اور صدر مدرسین حضرات اپنی اپنی صوابدید کے مطابق حکمتِ عملی کے ساتھ دارالعلوم کے مفاد کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنے استاذ مرحوم کے مشن کو جاری رکھتے رہے یہ زمانہ انگریزی حکومت کے غضب ناک ارادوں کا تھا، انگریزوں کے نزدیک ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے

اصلی محرک وہ مسلمان تھے جن میں علماء کرام کی قیادت سے جذبۂ جہاد بہت عروج پر تھا۔ جیسا کہ ایک انگریز مؤرخ (HENRY MEAD) نے لکھا ہے کہ:۔

"اس سرکشی کو موجودہ مرحلہ میں سپاہیوں کی بغاوت کا نام نہیں دیا جاسکتا، یقیناً اس کا آغاز سپاہیوں سے ہوا لیکن بہت جلد اس کی حقیقت آشکارا ہو گئی کہ یہ اسلامی بغاوت تھی"

اسی طرح جنگِ آزادی کے انگریز فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹس نے ۲۱ جون ۱۸۵۷ء کو اپنی والدہ کو ایک خط میں لکھا کہ "سزائے موت کی سب سے مؤثر صورت یہ ہے کہ مجرم کو توپ سے اُڑا دیا جائے' یہ بڑا ہی خوفناک نظارہ ہوتا ہے، لیکن موجودہ وقت ہم احتیاط پر کاربند نہیں رہ سکتے، ہمارا مقصد ان بدمعاش مسلمانوں پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کی مدد سے اب بھی انگریز ہندوستان کے مالک رہیں گے"

اس لیے اُن کی نظریں پوری طرح دارالعلوم پر مرکوز تھیں اور وہ ہر طریقہ پر دارالعلوم کے تمام حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کر رہے تھے حتیٰ کہ بعض ذمہ دار ارکان سے وہ کام لے رہے تھے، ان حالات میں کام جس قدر مشکل ہوگا اس کا اندازہ ہی مشکل ہے۔ حتیٰ کہ ۱۲۹۱ھ میں حضرت مولانا محمود حسن (شیخ الہندؒ) دارالعلوم کی مسندِ شیخ الحدیث پر رونق افروز ہوئے، آپ نے ۴۰ سال میں ۸۶۰ شاگردانِ رشید کی دینی علمی تربیت فرمائی مگر ساتھ ساتھ اُس انقلابی تحریک کو بھی جاری رکھا جس کا کچھ تذکرہ گذر چکا ہے، آخر ۱۳۳۳ھ میں آپ اس پروگرام کی تکمیل کیلئے حجاز تشریف لے گئے اور وہاں سے اللہ تعالیٰ کی حکمت سے اسیر مالٹا ہو گئے، رہائی کے بعد جب وطن تشریف لائے تو حالات مختلف صورت اختیار کر چکے تھے، آپ نے ۱۳۳۹ھ میں چند ماہ بعد وفات پائی اور حضرتِ مدنیؒ آپ کے حکم سے کلکتہ وغیرہ سے ہوتے ہوئے سلہٹ پہنچ گئے، اِدھر دارالعلوم میں ایک ایسا انقلاب نمودار ہوا کہ حق بحقدار رسید کی صورت میں دارالعلوم تشریف لے آئے۔ آپ نے اس لیے سیاسی اُمور میں آزادی کی شرط رکھی کہ دارالعلوم کے قیام کی غرض وغایت وہی تھی کہ دارالعلوم کے فضلاء اور اس کے متعلقین اسی جہادِ آزادی کو جاری رکھیں ــــــــــ

حضرتِ مدنیؒ کے تقرر کی ضرورت اور افادیت

اِن واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہم نے تحریر فرمایا ہے کہ: "حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہ صاحبؒ نے دارالعلوم چھوڑنے کا فیصلہ فرمالیا، اُس وقت دارالعلوم کی صدارتِ تدریس کے لیے

کوئی شخصیت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی سے زیادہ موزوں نہیں ہو سکتی تھی، یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوا کہ مولانا نے اس ذمہ داری کو قبول فرمالیا[1] ـــــ اس کے ساتھ ہی ایک اور فاضل گرامی مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی مرحوم کی تحریر بھی قابلِ ملاحظہ ہے "جب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم کے زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں عظیم الشان اسٹرائک ہوئی اور مولانا انور شاہ صاحبؒ، مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ وغیرہ نے دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کرلی تو عرصہ تک اخبارات میں ان واقعات کا چرچا رہا، بعض اخبارات تو محض انہی مسائل پر بحث کے لیے نکالے گئے تھے۔ یہ اسٹرائک بڑی خطرناک تھی اور ڈر تھا کہ کہیں بزرگوں کی یہ نصف صدی کی کمائی خاک میں نہ مل جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس نقصان سے بڑی حد تک محفوظ رکھا، ایک طرف مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث کے منصب کو سنبھال لیا اور دوسری طرف بعض اہلِ خیر نے ڈابھیل (گجرات) میں شاہ صاحبؒ، ان کے رفقاء اور شاگردوں کو بلاکر ایک نئے علمی مرکز کی بنیاد رکھ دی"

اس موضوع پر مولانا عبدالحئی صاحبؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ (والد ماجد مولانا علی میاں مدظلہم) کا بیان بھی قابلِ ملاحظہ ہے :-

"۱۳۴۶ھ میں جب حضرت العلامہ انور شاہ کشمیریؒ نے دیوبند کی مسند شیخ الحدیث سے استعفیٰ دیا تو اُن کی جگہ پر مولانا حسین احمد مدنیؒ کا انتخاب کیا گیا، آپ نے اسی قابلیت اور محدثانہ شان کے ساتھ تدریسِ حدیث کی خدمت انجام دی کہ دارالعلوم دیوبند کی شہرت اور مرکزیت بھی باقی و ساری رہی اور مدرسہ پر عوام و خواص کا اعتماد برقرار رہا تعلیم و تدریس کی خدمات کے ساتھ حضرت مدنیؒ سیاسی جدوجہد میں بھی اپنے بے مثال عزم و ہمت کے ساتھ رواں دواں رہے اور مسلمانوں میں غیرت و حمیت نیز عزتِ نفس کی روح بیدار کی"

ظاہری اور سطحی نظر میں تو یہ منصب محض ایک صدر مدرس اور شیخ الحدیث کا تھا جس پر قدرت نے حضرتؒ کو فائز و مامور فرمادیا تھا مگر بنیادی اور حقیقی معنوں میں یہ وہ مقام تھا جس سے پورے ہندوستان بلکہ تمام دُنیا میں صحیح اسلامی اسپرٹ اور عقائد کی تبلیغ اور قیادت ہوتی تھی، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

---

[1] الفرقان لکھنؤ جنوری ۱۹۵۸ء بحوالہ شیخ الاسلام، ایک سیاسی مطالعہ مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہانپوری۔

نے اس بارے میں لکھا ہے کہ:۔

"آپ (حضرت مولانا حسین احمد مدنی) کی شخصیت اس وقت دار العلوم کے جس منصب پر فائز ہوئی وہ روایتی طور پر محض مدرسی، صدر مدرسی کا عہدہ نہیں بلکہ ایک عمومی قیادت کا عہدہ رہا ہے جس کی طرف رجوع عام ہوتا رہا ہے اور جس کے لیے ہمیشہ ایسی ہی ممتاز شخصیتیں منتخب ہوتی رہی ہیں"

دار العلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر مولانا عبد الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ نے اپنے منظوم قصیدہ تائیہ میں حضرت مدنیؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا ؎

فِی حَجْرِهَا دَارُ الْحَدِیْثِ وَشَیْخُهُمْ　　لَحُسَیْنُ اَحْمَدُ جَامِعُ الْحَسَنَاتِ

اسی مدرسہ کے پہلو میں دار الحدیث ہے جس کے شیخ مولانا حسین احمد مجموعہ حسنات ہیں۔

دَارُ الْحَدِیْثِ عَقِیْلَةٌ مِنْ حُسْنِهَا　　تَرْنُوْا اِلَیْهَا النَّاسُ بِالصَّبَوَاتِ

دار الحدیث ایک بدلیعۃ الحسن دوشیزہ ہے جس کی طرف والہانہ نظریں مخلوق کی گڑی ہوئی ہیں۔

وَیَکُوْنُ ذِکْرُ اللّٰهِ فِیْهَا دَائِمًا　　یَاْتِیْ اِلَیْنَا بِالطُّمَانِیْنَاتِ

خدا کا ذکر اس میں ہر وقت جاری رہتا ہے جس سے قلوب کو راحت اور اطمینان حاصل ہوتا ہے

وَعَلَی الرَّسُوْلِ صَلٰوتُهٗ وَسَلَامُهٗ　　فِیْهَا وَظِیْفَتُهُمْ مَدَی الْاَوْقَاتِ

اس کے علاوہ جناب سرورِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود و سلام بھیجنا ہر طالب علم کے لیے وردِ زبان ہے

("القاسم" دار العلوم نمبر، محرم الحرام ۱۳۴۷ھ / جولائی ۱۹۲۸ء صفحہ ۵۱)

دار العلوم دیوبند کے ترجمان ماہنامہ "القاسم" نے بالفاظ قاری محمد طاہر ابن حافظ محمد احمد صاحب مرحوم مندرجہ ذیل تبصرہ فرمایا:۔

"دار العلوم کی موجودہ حالت کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کے تمام شعبے بدستور قائم ہیں کسی قسم کا کوئی خلفشار اب مدرسہ میں باقی نہیں، تعلیم بدستورِ سابق جاری ہے، طلباء برابر آرہے ہیں اور تعدادِ داخلہ جدید پر کوئی اثر نہیں پڑا، شہر دیوبند میں بھی پوری طرح سکون ہے۔ ہم سب کو دار العلوم کے موجودہ اکابر حضرت مولانا اشرف علی صاحب، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب وغیرہم کی ذاتِ گرامی پر کامل اعتماد رکھنا چاہیئے اور انکی مجوزہ

اصلاحات کو کافی سمجھنا چاہیئے، دار العلوم دیوبند اس اختلاف کے بعد اب خدا کے فضل سے اپنی قدیم اصلی حالت پر عود کر آیا ہے۔" (القاسم دار العلوم نمبر ص۴۱)

دار العلوم دیوبند کے ترجمان ماہنامہ القاسم نے دار العلوم نمبر میں آپ کی اس تعلیمی اور تدریسی ممتاز حیثیت کو یوں بیان فرمایا۔

"یہ سعادت کسی اور درس گاہ کے حصہ میں نہیں آئی کہ اس کے کسی طالب علم نے مسجدِ نبوی میں بیٹھ کر حدیث کا درس دیا ہو اور جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سجادۂ درس کو آباد کرنے کا شرف اُس کو حاصل ہُوا ہو، لیکن دار العلوم دیوبند کے لیے یہ کس قدر تحدیثِ نعمت و فضلِ ربانی کے اظہار کا مقام ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ اس درسگاہ کے فارغ التحصیل ہیں جو تقریباً دس سال تک مسجدِ نبوی میں حدیثِ نبوی کا درس دیتے رہے اور جن کے درس کی شہرت یمن و حجاز کے علاوہ عراق، مصر و شام تک پہنچ گئی، حتّٰی کہ ایک موقع پر عباس حلمی پاشا سابق خدیو مصر مولانا ممدوح کے درس میں شریک ہوئے اور رخصت ہوتے وقت جو الفاظ فرمائے وہ دار العلوم کے ہر ہمدرد اور چندہ دینے والے کے لیے مسرت و انبساط کی ایک معتبر سند ہے۔" (القاسم محرم الحرام ۱۳۴۷ھ)

حضرتِ مدنیؒ کے تحفظِ دار العلوم کے بارہ میں ایک عالمِ دین کا خواب

جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن (مرحوم) کے صدر دینیات اور دار العلوم دیوبند کے نامور مصنف مولانا مناظر احسن گیلانی نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت مدنیؒ کے اس خلفشار کو دُور کرنے اور دار العلوم کے استقلال اور استحکام کے لیے کلیدی حیثیت کے بارہ میں کئی سال پہلے ایک خواب دیکھا تھا، وہ خواب اور اس کی تعبیر ان ہی کے کلمات میں درج کی جاتی ہے، آپ نے اپنی مرتبہ کتاب "دار العلوم دیوبند میں بیتے ہوئے دن" میں تحریر فرمایا ہے:۔

"ٹونک سے منطق و معقول پڑھ کر جب دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا تو مولانا محمد زکریا صاحب نے جو ان دنوں میری ہی طرح طالب علم تھے باصرار منطق کی ایک کتاب پڑھانے کا وعدہ لے لیا، پہلی ہی رات جب اس کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ غنودگی طاری ہوگئی، میں نے محسوس کیا کہ میں کسی جنگل میں گھر گیا ہوں اور جنگلی سؤروں نے مجھے گھیر لیا ہے، ہزار کوشش

کرتا ہوں مگر اُن کے نرغہ سے باہر آنے کی کوئی صورت نہیں کہ اچانک ایک آدمی ہاتھ میں پستول لیے آیا اور اُس نے کھٹ کھٹ سب کو مار ڈالا آنکھ کھل گئی، مَیں نے انکار کر دیا کہ میں نہیں پڑھا سکتا۔ جس بزرگ کو دیکھا تھا اُس کی صورت اچھی طرح ذہن نشین تھی مگر میں نے اُن کو کبھی دیکھا نہیں تھا، ان ہی دنوں حضرت مدنیؒ حجاز سے تشریف لائے اور حضرت شیخ الہندؒ کے درس میں اُن پر میری نگاہ پڑ گئی مَیں نے پہچان لیا کہ یہی تھے جن کو میں نے خواب میں اپنی مدد کرتے دیکھا تھا، لڑکوں سے معلوم کیا تو معلوم ہُوا کہ آپ ہی مولانا حسین احمد مدنی ہیں"۔ (الجمعیۃ میرٹھ، مدنی نمبر ص۴۵)

دارالعلوم دیوبند نے ہر لحاظ سے بے نظیر ترقی کی کہ جس عظیم مقصد کے لیے دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں لایا گیا تھا اُس میں منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے حضرت مدنیؒ نے جو جد وجہد کی وہ اس لیے بے نظیر تھی کہ آپ نے اسلام اور مسلمانوں کے دشمن انگریز سے قلبی نفرت پیدا کرنے کے لیے نہ صرف خود عمل کیا بلکہ اپنے حلقۂ اثر میں اس کی خوب اشاعت فرمائی، جیسا کہ جناب قاری محمد طیبؒ صاحب رقمطراز ہیں۔

"آپ ان تعلیمی خدمات کے ساتھ ساتھ اپنی ہمتِ مردانہ سے سیاسی کام بھی پوری تندہی سے انجام دیتے رہے اسی دوران میں آپ جمعیۃ العلماء ہند کے بار بار صدر بنائے گئے، آپ نے جمعیۃ العلماء اور کانگریس کے قائدین میں سے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں نمایاں حصہ لیا اور سر دھڑ کی بازی لگا دی، کئی مرتبہ جیل گئے اور آخر کار ملک کو آزاد کرا یا۔ بہر حال مجموعی حیثیت سے آپ عالم فاضل، شیخ وقت، مجاہد، جفاکش، جری اور اولوالعزم فضلاء دارالعلوم دیوبند میں سے تھے"۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند مؤلفہ قاری محمد طیب صاحب ص۶۶)

حضرت مدنیؒ نے انگریز کے خلاف طلباء، مدرسین اور عامۃ المسلمین کے دلوں میں ایمانی نفرت اور دینی غیرت کو اس قدر اجاگر فرمایا کہ طلباء کرام اور مدرسین عظام کو ہر انگریزی چیز سے نفرت پیدا ہو گئی اور دیسی کھدر کا استعمال اس قدر محبوب ہو گیا کہ اکثر حضرات اور حضرتؒ کے معتقدین و متوسلین نے دیسی کھدر کا استعمال ہر لحاظ سے بہتر سمجھا بلکہ بعض علماء کرام اس کے استعمال کو روحانی بصیرت کے پیشِ نظر استعمال فرماتے تھے، جیسا کہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے برادر بزرگ اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے عم محترم حضرت مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا:۔

"میں محض مولانا کی تکلیف کے خیال سے کھدر پہنتا ہوں ورنہ میں اس کو ضروری نہیں سمجھتا مولانا حسین احمد کا دل جتنا روشن ہے آج کسی کا نہیں، تم یا کوئی اور کیا جان سکتا ہے کہ مولانا حسین احمد کیا ہیں اور ان کا کیا مقام ہے"؟ (ماہنامہ دارالعلوم دیوبند' الاحسان نمبر ص۱۳۳)

حضرتِ مدنیؒ اُس میت کی نماز جنازہ نہیں پڑھایا کرتے تھے جس کا کفن دیسی کھدر کا نہ ہو، ولایتی کپڑے کے لباس کو پسند نہ فرماتے تھے اور بعض مخلص احباب کے ململ وغیرہ کے کُرتے کو پھاڑ ڈالا کرتے تھے۔

آپ نمازِ فجر اپنے مکان کے مُتصل حجم کے لحاظ سے چھوٹی (مگر انوار کے لحاظ سے بڑی) مسجد میں ادا فرمایا کرتے تھے اور امامت خود فرماتے تھے، آپ کا معمول قنوتِ نازلہ پڑھنے کا تھا جو اس قدر رِقت اور ہیبت آموز لہجہ میں ہوتا تھا کہ سخت سے سخت دل بھی انگریز سے نفرت کو محسوس کرتا تھا، حسبِ ارشاد مولانا ابوالحسن علی ندوی :-

"انگریز دشمنی کا مظہرِ اتم اور نمونۂ کامل مولانا سید حسین احمد مدنیؒ تھے جن کی انگریز دشمنی اور حمیت دینی، فکری اور اعتقادی حدود سے آگے بڑھ کر قلبی وجذباتی نفرت وعداوت اور قال سے آگے بڑھ کر حال میں تبدیل ہوگئی، اس کا کسی قدر اندازہ مولانا کی مجلس میں بیٹھنے والوں اور فجر کی نماز میں قنوتِ نازلہ سننے والوں کو ہو سکتا ہے کہ جب مولانا دشمنانِ اسلام کے لیے اَللّٰھُمَّ دَمِّرْ دِیَارَھُمْ وَنَکِّسْ اَعْلَامَھُمْ وَزَلْزِلْ اَقْدَامَھُمْ وَفُلَّ حَدَّھُمْ وَاھْزِمْ جُنْدَھُمْ اَللّٰھُمَّ خُذْھُمْ اَخْذَ عَزِیْزٍ مُّقْتَدِرٍ[1] کے الفاظ ادا کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ محراب میں اس کے اثر سے شگاف پڑ جائیں گے"۔

غرضیکہ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں :-

"حقیقت یہ ہے کہ اگر کہا جائے کہ بیسویں صدی میں انگریز، انگریزیت اور نہ صرف انگریزی سامراج بلکہ ہر ایک سامراج کی سب سے بڑی دُشمن حسین احمد کی شخصیت ہے تو یہ دعویٰ ایسا ہی صحیح ہوگا جیسا کہ آج انگریزی اقتدار کا زوال آفتابِ نیم روز کی طرح ایک حقیقت بن کر سامنے آ چکا ہے"۔ (مقدمہ نقشِ حیات)

---

[1] ان کلمات کا ترجمہ درج ذیل ہے: "یا اللہ! ان کافروں کی بستیوں کو جڑ سے اُکھیڑ دے، ان کے جھنڈوں کو سرنگوں کر دے، ان کے پاؤں کو ڈگمگا دے، ان کے ہتھیاروں کو کُند فرما دے، ان کے لشکروں کو شکست سے دوچار کر دے، یا اللہ! ان کو ایسا پکڑ جیسا کہ غالب اور پوری قدرت والا پکڑتا ہے"۔

۱۹۳۳ء میں مولانا ظفر علی خان مرحوم مسلمانوں میں ایوانِ تجارت قائم کرنے کے لیے رنگون جارہے تھے تو اس سفر میں آپ نے اہتمام دارالعلوم دیوبند کو دیوبند آنے کی اطلاع دی، چنانچہ حضرتِ مدنیؒ اور دیگر جلیل القدر اساتذۂ کرام اور طلباءِ دارالعلوم کے ایک جمِ غفیر نے دیوبند کے ریلوے اسٹیشن پر آپ کا استقبال کیا اور آپ کو دارالعلوم میں حضرت مہتمم صاحب کی خصوصی نشست گاہ پر بیٹھنے کی سعادت بخشی، آپ نے ایک دن رات دارالعلوم میں قیام فرمایا، آپ کے اعزاز میں طلباءِ دارالعلوم دیوبند کی طرف سے استقبالیہ جلسہ ہوا جس میں دیگر طلباءِ کرام کے علاوہ احقر کی مرتبہ استقبالیہ نظم کو جناب مولانا عرض محمد بلوچستانی نے (جو اس وقت دورہ حدیث میں تھے) پیش فرمایا، استقبالیہ کے جواب میں مولانا ظفر علی خانؒ نے مندرجہ ذیل منظوم عقیدت نامہ پڑھا ؎

شاد باش و شاد زی اے سرزمینِ دیوبند
ہند میں تُو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

ملّتِ بیضا کی عزّت کو لگائے چار چاند
حکمتِ بطحا کی قیمت کو کیا تُو نے دوچند

اسم تیرا با مسمّٰی ضرب تیری بے پناہ
دیوِ استبداد کی گردن ہے اور تیری کمند

تیری رجعت پر ہزار اقوام سو جاں سے نثار
قرنِ اوّل کی خبر لائی تیری اُلٹی زقند

تُو علمبردارِ حق ہے حق نگہباں ہے تیرا
خیلِ باطل سے پہنچ سکتا نہیں تجھ کو گزند

ناز کر اپنے مقدر پر کہ تیری خاک کو
کر لیا ان عالمانِ دینِ قیم نے پسند

جان کر دیں گے جو ناموسِ پیمبر پر فدا
حق کے رستے پر کٹا دیں گے جو اپنا بند بند

کفر ناچا جن کے آگے بارہا ننگی کا ناچ
جس طرح جلتے توے پر رقص کرتا ہے سپند

اس میں قاسم ہوں کہ انور شاہ کہ محمود الحسن
سب کے سب دل تھے دردمند اور سب کی فطرت ارجمند

گرمیٔ ہنگامہ تیری ہے حسین احمد سے آج
جن سے پرچم ہے روایاتِ سلف کا سربلند

◎

دار العلوم میں برکات کا نزول

اگرچہ حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے جانے پر دار العلوم کی علمی اور دینی بلکہ روحانی فضا بھی مکدر ہو چکی تھی مگر حضرت مدنیؒ کی تشریف آوری پر برکات کا نزول شروع ہوا جس کی مختصر کیفیت درج کی جاتی ہے:۔

—— طلباء کی روز افزوں ترقی اور دینی تعلیم میں ایسا انہماک پیدا ہوگیا کہ تمام فضا علمی اور دینی انوار سے منور ہوگئی، اساتذہ میں ہم آہنگی اور اتفاق نے ساری کمی دور کر دی بلکہ ایک لحاظ سے پہلے سے بھی زیادہ علمی رونق ہوگئی۔ حضرت مدنیؒ کی جاذب شخصیت نے طلباء کے اذہان اور قلوب کو حضرتؒ کا ایسا شیدا بنا دیا تھا کہ ہر وقت حضرتؒ کی قیام گاہ پر طلباء کا ہجوم رہتا، دورۂ حدیث کے طلبا خصوصیت کے ساتھ حضرتؒ کے سبق میں والہانہ پہنچتے، حالانکہ بعض دفعہ سفر سے واپسی رات کے بارہ بجے ہوتی جبکہ یہ گہری نیند کا وقت ہوتا مگر جونہی مدرسہ کا گھنٹا بجتا طلباء کشاں کشاں دار الحدیث میں پہنچ جاتے۔ دورۂ حدیث کے بعض اساتذہ کبھی کبھی طلباء سے شکوہ بھی فرماتے کہ ہمارے اسباق میں تو تم لوگ دن میں بھی نہیں آتے مگر حضرت مدنیؒ کے سبق میں بے وقت بھی دوڑے جاتے ہو۔ یہ حضرت مدنیؒ کی اپنی جاذب شخصیت تھی اور اُن کی طلباء پر شفقت کا بھی اس میں بڑا دخل تھا۔

جس دن حضرتؒ کا قیام دار العلوم میں ہوتا نمازِ عصر کے بعد جلیل القدر اساتذۂ کرام خصوصاً حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب اور حضرت مولانا عبد السمیع صاحب (جن کو حضرت مدنیؒ استاذ کہہ کر یاد فرماتے تھے) حضرتؒ کی خانقاہ کے صحن میں رونق افروز ہوجاتے اور دل لگی کی ایسی محفل جم جاتی جس سے اساتذۂ کرام کی باہمی محبت کا عجیب نقشہ پیدا ہو جاتا، اساتذہ کا ایسی مجالس میں بیٹھنا صرف وقتی تفریح طبع نہیں ہوتی بلکہ اس سے کسی ادارہ کے نظم و نسق پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ وہ منظر دیدنی ہوتا جب حضرت مدنیؒ خود یا اُن کے اشارہ سے بعض اساتذہ مولانا اعزاز علی، مولانا عبد السمیع رحمۃ اللہ علیہم کی جیب سے پیسے نکالنے کی کوشش کرتے، اُن کی روک تھام کے باوجود یہ حضرات کامیاب ہوجاتے اور فوراً بازار سے بالوشاہی منگوائی جاتی اور طلباء و دیگر حاضرین میں تقسیم کی جاتی۔ کبھی کبھی حضرت مدنیؒ مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے فرماتے کبھی اپنی عینک مجھے بھی عنایت فرمادیں تاکہ مجھ سے طلباء اس طرح ڈریں جس طرح آپ سے ڈرتے ہیں۔ مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ

کی جماعت "قاضی مبارک" کا نتیجہ اچھا نہ نکلا تو حضرت مدنیؒ نے ان سے فرمایا کہ آپ تو امام المعقولات ہیں پھر آپ کے طلباء کیوں فیل ہوئے، آپ نے تبسم کرتے ہوئے فرمایا: "امام المعقولات میں ہوں طلباء تو نہیں ہیں"۔

اتنے بڑے ادارے میں کبھی کبھی کوئی نہ کوئی واقعہ خلافِ توقع پیدا ہو جاتا تھا مگر اسے فوراً حل کر دیا جاتا تھا۔ جو حضرت مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی بصیرت کا نتیجہ ہوتا۔ ایک دفعہ حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کسی وجہ سے دارالعلوم آنا چھوڑ دیا، حضرت مدنیؒ کو جب سلہٹ سے واپس آنے پر علم ہوا تو فوراً مولانا کے مکان پر تشریف لے گئے اور ان سے یوں فرمایا کہ اگر قیامت کے دن حضرتِ استاذ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے پوچھا کہ تُو نے دارالعلوم کو کیوں چھوڑ دیا تھا تو میں عرض کروں گا کہ محمد ابراہیم نے چھوڑ دیا تھا اس لیے میں نے بھی چھوڑ دیا، یہ سنکر حضرت بلیاویؒ آبدیدہ ہو کر اُسی وقت دارالعلوم تشریف لے آئے اور پڑھانا شروع کر دیا۔ (بروایت حضرت مولانا قاری محمد امین صاحب مدظلہ فاضلِ دیوبند مہتمم دارالعلوم عثمانیہ ورکشاپی محلہ راولپنڈی)

اسی طرح دارالعلوم کے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ "اسلام اور نسبی امتیازات" کی اشاعت پر بڑا ہنگامہ بپا ہوا، اس کے جواب میں مولینا حبیب احمد حلیمی صدر مدرس مدرسہ مخزن العلوم سہارنپور نے ایک رسالہ "القول الاسلم" لکھا اور دیوبند میں پیشہ ور طبقات نے مفتی صاحب کے خلاف ایک عظیم الشان جلسہ کیا جس میں حضرت مدنیؒ کو بھی اس لیے دعوت دی کہ مفتی صاحب کے خلاف کہلوائیں گے مگر بقول مولانا محمد تقی عثمانی صاحب: "حضرت مدنیؒ نے اپنی تقریر میں والد ماجد صاحب کے رسالہ کی اوّل سے آخر تک ایسی تائید و حمایت فرمائی کہ والد صاحب فرماتے ہیں کہ میں خود بھی ایسی نہ کر سکتا، تقریباً چار گھنٹے تقریر اور ایک گھنٹہ مسلسل لوگوں کے سوال و جواب کا سلسلہ رہا، حضرت مدنیؒ سب کا جواب اسی رسالہ کی عبارت پڑھ پڑھ کر دیتے رہے۔ (ماہنامہ البلاغ کراچی مفتی اعظم نمبر ص ۱۷۷)

دار العلوم شاہراہِ ترقی پر

حضرت مدنیؒ کے تشریف لانے پر دار العلوم دیوبند میں امن وسکون اور دلجمعی کے ساتھ تمام شعبے گامزن ہوگئے اور وہ جمود جو تقریباً تین سال سے دار العلوم کو روک رہا تھا آہستہ آہستہ دور ہوتا گیا، حضرت مدنیؒ نہ صرف شیخ الحدیث تھے بلکہ صدر المدرسین اور ناظم تعلیمات بھی تھے، آپ نے اہتمام کے ساتھ پوری طرح تعاون فرمایا، اس طرح طلباء اور مدرسین بلکہ دار العلوم کے تمام شعبوں کے سربراہ اور ملازمین اور متعلقین اپنے اپنے کاموں میں صدقِ دل کے ساتھ مصروفِ عمل ہوگئے اگر کبھی کبھار کوئی بات خلافِ معمول پیدا بھی ہوئی تو اس کو باہمی گفت وشنید کے ذریعہ احسن طریقہ سے طے کر لیا گیا جس کی ایک دو مثالیں آگے ذکر کر دی جائیں گی۔

دار العلوم دیوبند کے استحکام کے لیے اہتمام اور تدریس کا اتحاد اور طلباء کی علمی تسلّی وتشفی کے ساتھ ان سے ہمدردی بھی ضروری تھی۔ بفضلہٖ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ میں یہ تینوں اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ ۱۳۴۶ھ میں دار العلوم دیوبند تشریف لائے اور تادمِ واپسیں اسی ادارہ سے وابستہ رہے —— اہتمام کے ساتھ آپ کا تعلق کس قدر مستحکم تھا! اس کی دلیل یہ ہے کہ کسی بھی اہم مسئلہ پر کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ حضرتِ مدنیؒ نے اہتمام اور اہتمام نے حضرت مدنیؒ کا اعتماد ہمیشہ ملحوظ رکھا بلکہ حضرت مدنیؒ نے جناب قاری محمد طیب صاحبؒ کے وجود کو دار العلوم دیوبند کیلئے اس قدر ضروری سمجھا کہ جب تقسیم کے بعد بعض دیگر علماء کرام کی طرح حضرت قاری صاحبؒ بھی پاکستان میں مستقل قیام کی غرض سے تشریف لے آئے اور حکومتِ ہند نے بھی آپ کو تارکِ وطن قرار دے دیا تھا تو حضرتِ مدنیؒ نے آپ کو واپس بلوایا جس کی مختصر سی کیفیت درج ذیل ہے:۔

"حضرت (مدنیؒ) کے مخلص خادم مسعود حسن صدیقی میرٹھی حال انچارج شعبہ جمعیۃ علماء ہند نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں مولانا (مدنیؒ) سے ملنے دفتر جمعیۃ علماء ہند گیا، مولانا سامنے والے کمرہ میں

جہاں آرام فرمایا کرتے تھے بیٹھے تھے، اور بھی کئی حضرات تھے، اتنے میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا محمد میاں صاحب اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب تشریف لے آئے اور انہوں نے وہاں بیٹھے لوگوں سے فرمایا کہ کچھ مشورہ کرنا ہے، چنانچہ سب لوگ اُٹھ کر جانے لگے میں بھی جانے لگا تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے فرمایا حاجی صاحب! آپ بیٹھے رہیں، میں ٹھہر گیا، ان حضرات نے مولانا (مدنیؒ) سے فرمایا کہ آپ قاری صاحب (مولانا قاری محمد طیبؒ) کو پاکستان سے واپس بلانا چاہتے ہیں؟ مولانا نے فرمایا جی ہاں! ان تینوں حضرات نے اصرار کے ساتھ بار بار کہا کہ ان کو واپس نہ بلائیں، لیکن مولانا (مدنی) اپنی رائے پر قائم رہے اور فرمایا کہ دارالعلوم کے مفاد میں ہے کہ وہ اس وقت واپس آجائیں، بالآخر تینوں حضرات ناکام کمرہ سے چلے گئے اور مولانا نے اسی وقت اُٹھ کر پنڈت جواہرلال نہرو کو فون کیا، وقت لیا اور خود تشریف لے گئے اور وزیر اعظم سے ان کی واپسی کی منظوری لے کر آئے۔

نوعمر حضرات کو شاید نہ معلوم ہو کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند پاکستان تشریف لے گئے تھے اور مستقل قیام کے ارادے سے گئے تھے لیکن حالات ناسازگار پاکر وہاں پریشان تھے اور واپس آنا چاہتے تھے مگر قانوناً نہیں آسکتے تھے، چنانچہ قاری صاحب کو واپس بلایا گیا اور دارالعلوم دیوبند کا اہتمام پھر اُنکے سپرد کر دیا گیا، چنانچہ جناب قاری صاحب کو بذریعہ سپیشل ہوائی جہاز دیوبند بلایا گیا، اُن کے استقبالیہ میں حضرت مدنیؒ نے آپ کے کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے بھرائی ہوئی پُرسوز آواز میں جب یہ کہا کہ ؎

اے تماشہ گاہ عالم روئے تو — تو کُجا بہر تماشہ میروی

تو سارا مجمع چیخ اُٹھا اور ہر ایک کی ہچکی بندھ گئی۔

(آئینہ دارالعلوم ۵ رمئی ۱۹۹۴ء)

اور یہ تعاون اور باہمی مشورت حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد بھی جاری رہی، جیسا کہ مندرجہ ذیل اہم مسئلہ کے بارے میں راہنمائی حاصل کی گئی:۔

"حضرت کے وصال کے بعد دارالعلوم کی صدارتِ تدریس کا مسئلہ نہایت پیچیدہ ہو گیا جس کو مولانا محمد نعیم صاحب نے اس طرح بیان کیا ہے کہ کیونکہ بزم محمودی کے دو پروانے
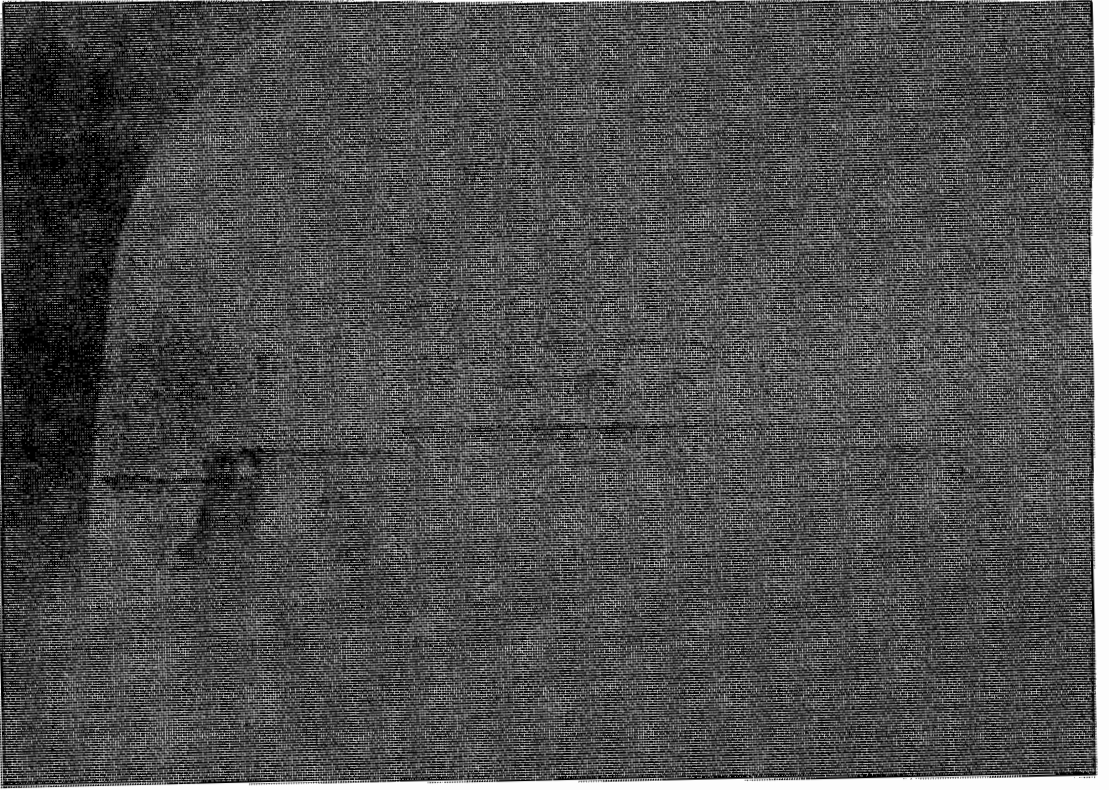
دارالعلوم دیوبند کا دارالحدیث جہاں حضرت مدنیؒ درس دیتے تھے۔

اور بادہ خوار باقی تھے، علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ اور حضرت الاستاذ مولانا سید فخر الدین صاحبؒ دونوں کا استحقاق اور صلاحیت اپنی جگہ مسلّم تھی بالآخر حضرت مہتمم صاحب (مولانا قاری محمد طیب صاحب) کی لطافتِ طبع نے ایک لطیفۂ منامی کی روشنی میں راہنمائی فرمائی، دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کے انعقاد سے پہلے اثنائے سفرِ بہار میں انہوں نے دیکھا کہ دارالعلوم کی بابرکت عمارتِ نو درہ (جو جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے منامی خطوط پر بنائی گئی ہے) کی شمالی درسگاہ میں حضرت شیخ الاسلام (مولانا حسین احمد مدنی) جلوہ افروز ہیں، اساتذہ اور مدرسین کا مجمع سامنے ہے اور حضرت ہر ایک کو علیحدہ پاس بلاکر کچھ مشورہ فرما رہے ہیں جس کی آواز تو نہیں آتی البتہ انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم کی صدارت کے متعلق مشورہ ہے، جب سب کے مشورے سے فارغ ہوئے تو میں (حضرت مہتمم صاحب) تنہا ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا بجائے اس کے کہ مجھے طلب فرماتے خود اٹھ کر میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ اس بارے میں تیری کیا رائے ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ شیخ الحدیث تو مولانا فخر الدین صاحب اور صدر المدرسین مولانا محمد ابراہیم صاحب کو بنا دیا جائے، یہ سنکر کھل گئے اور بشاشت مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا کہ بالکل ٹھیک ہے میرے دل کی بات کہہ دی۔ دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کا فیصلہ دراصل اس خواب کی سچی تعبیر ہے اور اس طرح گویا حضرت مہتمم صاحب کا خواب اصدق الرؤیا اور مبشرات میں سے ثابت ہوا اور علامہ بلیاویؒ کے استحقاقِ صدر نشینی کی ایک تائیدِ غیبی"۔ (ماہنامہ دارالعلوم فروری ۱۹۹۴ء ص ۴۸)

خانقاہی نظام کا فروغ

دارالعلوم دیوبند صرف ایک رسمی علمی درس گاہ نہ تھی بلکہ اس میں تزکیۂ باطن کا خاص اہتمام تھا، اسی تزکیۂ باطن کی ایک برکت یہ بھی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کی مشہور درسگاہ نودرہ کی نشاندہی خود سید دوعالم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خواب میں فرمائی، جب صبح بنیاد رکھنے کے لیے علماء کرام اور دوسرے حضرات تشریف لائے تو زمین پر باقاعدہ بنیادوں کے نشان تھے، چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے ترانہ میں آج بھی یہ ہے کہ ع خود ساقیٔ کوثر نے رکھی میخانے کی بنیاد یہاں

دارالعلوم دیوبند کے دارالعلوم ہونے سے پہلے ایک دینی مدرسہ کا افتتاح مسجد چھتہ میں ہوا جو بہت قدیم مسجد ہے اور دارالعلوم کو اس کا قرب حاصل ہے، اس مسجد میں اس علاقہ کے مشہور صوفیا کرام کا اجتماع ہوا کرتا تھا۔ دیوبند کے سید عالی نسب حضرت سید محمد عابد نے اس مسجد میں تعلیم شروع کی اور مدرسہ کا افتتاح فرمایا۔ حضرت سید محمد عابد صاحبؒ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کے جلیل القدر خلیفہ تھے، آپ احسان وسلوک کے کس قدر مقام رفیع پر فائز تھے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل ارشاد سے کیا جاسکتا ہے :-

"ایک مرتبہ آپ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے فرمایا کہ ایک بات کہتا ہوں میری زندگی میں کسی سے ظاہر نہ کرنا۔ فرمایا حرم شریف میں میں نے حالتِ بیداری میں بعض انبیاء علیہم السلام کی زیارت کی ہے"

سید محمد عابد صاحبؒ کا انتقال ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ مطابق ۲۷ نومبر ۱۹۱۳ء کو ۸۱ سال کی عمر میں ہوا، مزارِ عالی دیوبند میں ہے۔ (مشائخ دیوبند ص ۱۸۹)

بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ (م ۱۳۱۷ھ) کے جلیل القدر خلیفہ مجاز تھے، تمام اکابر علماء تصوف اور احسان وسلوک میں اکابر اولیاء کرام سے مجاز تھے، اور دارالعلوم دیوبند کے بعض

اکابر علماء اور مشائخ نے اپنے اپنے ہاں مستقل عنوان کے ساتھ خانقاہوں کا قیام کیا ہوا تھا، جیسا کہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون، خانقاہ حضرت رائے پوری، خانقاہ حضرت گنگوہی۔ نور اللہ قبورھم

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری سے پہلے دارالعلوم کے اساتذہ کرام، بعض طلباء اور منتسبین دیوبند روحانی اصلاح کے لیے زیادہ طور پر تھانہ بھون رجوع فرمایا کرتے تھے، حضرت مدنیؒ کی تشریف آوری کے بعد بھی زیادہ رجوع تھانہ بھون یا حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی طرف رہا جس کی طرف حضرت مدنیؒ خود توجہ دلاتے بلکہ ترغیب دلاتے تھے، جبکہ حضرت تھانویؒ اپنے معتقدین کو حضرت مدنیؒ کی طرف رجوع کا فرماتے اور بعض دفعہ کسی سالک کو (حضرت مدنیؒ سے) بیعت کرنے کی تاکید فرماتے جیسا کہ مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ کو (حضرت مدنیؒ سے) بیعت کرنے کا حکم فرمایا[۱]

حضرت مدنیؒ کا احسان وسلوک میں مقام رفیع

کیونکہ آپ نے تصوف کے تمام منازل نہایت ہی ریاضت اور محنت سے طے فرمائے تھے

آپ کی جو سب سے ممتاز حیثیت تھی وہ یہ تھی کہ آپ نے مہبط انوار وحی مدینہ منورہ میں مرشد العلماء حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ کی زیر ہدایت اور پھر چار سال مالٹا میں شیخ المشائخ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی زیر تربیت مقامات احسان وسلوک طے فرمائے تھے، آپ کا مقام اس لحاظ سے بھی بہت رفیع تھا۔

دور حاضر کے اکابر اولیاء کرام کی عقیدت حضرت مدنی رحمہ اللہ کے ساتھ کس قدر تھی؟ یہاں صرف ایک حوالہ درج کیا جاتا ہے، حضرت مولانا شاہ عبدالغفور عباسی مہاجر مدنیؒ نے فرمایا:۔

”احقر کی موجودگی میں ایک مرتبہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے ایک معتقد نے حضرت مدنیؒ کی بابت شیخ (حضرت سید فضل علی شاہؒ) کی رائے پوچھی تو فرمایا میں حضرت مدنیؒ کے متعلق کیا عرض کر سکتا ہوں جب کہ میرے شیخ حضرت فضل علی قریشیؒ یوں فرمایا کرتے تھے کہ میں اُن کے چہرے کو دیکھنا عبادت سمجھتا ہوں“[۲]

ف:۔ حضرت قریشیؒ کا ذکر مبارک اسی باب میں آرہا ہے۔

---

[۱] مولانا دریا بادیؒ کو حضرت مدنیؒ نے بیعت کیلئے حضرت تھانویؒ کی خدمت میں پیش کیا مگر حضرت تھانویؒ نے انہیں اصرار سے حضرت مدنیؒ سے بیعت کروایا۔ (ملخصاً نقوش وتاثرات) [۲] تذکرہ شاہ عبدالغفور عباسیؒ ص ۱۴۰

دورِ حاضر کے امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے کئی بار فرمایا :-

"میں نے اپنی زندگی میں چودہ بار حرمین کی زیارت کی ہے، اور مجھے اللہ تعالیٰ نے وہ بصیرت عطا فرمائی ہے کہ اُمت کے اولیاء کرام کو پہچان لیتا ہوں، میں نے چودہ بار حرمِ کعبہ میں موجود اولیاء کرام کو دیکھا مگر میں نے حضرتِ مدنیؒ کے ہم پلہ کسی کو نہ پایا،' اور ساتھ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں نہ شاگرد ہوں نہ مرید ہوں۔"

آپ کی گوناگوں مصروفیات آپ کی روحانی عظمت کو سمجھنے کے لیے ایک حجاب اور پردہ تھا ورنہ عقل مند اور متلاشیٔ حق کے لیے آپ کی اس حیثیت کا سمجھنا آسان تھا۔ مولانا نجم الدین اصلاحی نے اس کا تجزیہ یوں فرمایا :-

"حضرتِ مدنی قدس سرہ العزیز کے بارے میں بہتوں کو یہ فیصلہ کرنے میں مشکل آئی کہ وہ کون سے مرکزی صفات تھے جو آپ کی زندگی میں سب سے نمایاں اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں، چنانچہ کسی نے بہت بڑا مفسر، محدث جانا، کسی نے ایک عالم اور شیخ طریقت سمجھا، کسی نے سیاسی راہنما اور مجاہد قرار دیا، اس میں شبہ نہیں کہ مولانا میں وہ سارے کمالات تھے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے لیکن مولانا مدنیؒ میں ان تمام باتوں سے زیادہ آپ کا "روحانی مقام" تھا جس سے عام طور پر دنیا ناواقف تھی اور ناواقف رہ گئی۔ اس کی زیادہ وجہ یہ ہوئی کہ لوگوں نے تزکیۂ نفس اور تطہیرِ قلوب کو ایک ثانوی حیثیت سمجھا اور صرف تعلیمِ کتاب و حکمت ہی کے اندر ساری تگ و دو محصور کر دی حالانکہ تزکیہ کی کمی اعلیٰ تعلیم کے باوجود محسوس ہوتی ہے اور دین جس چیز کا نام ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم سے بھی نہیں ہوتا بلکہ "دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا"[1]۔"

اس روحانی مقام کی علامت علامہ ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے الفاظ میں :-

"جہاں کوئی تصوف و سلوک کا مسئلہ پوچھ لیتا یا کوئی علمی بحث چھیڑ دیتا یا اہل اللہ کا تذکرہ کرنے لگتا تو فوراً چہرہ پر بشاشت ظاہر ہوتی ایسا معلوم ہوتا کہ دل کا ساز کسی نے چھیڑ دیا ہے[2]۔"

---

[1] الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر صـ۸۵ [2] پرانے چراغ صـ۹۹

یہی ابوالحسن علی ندوی یوں رقمطراز ہیں:۔

——— "ہماری آپ کی بدقسمتی ہے کہ ہم نے جانا نہیں کہ وہ کیسے باطنی مراتب پر فائز تھے، اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو اس کوچہ سے واقف ہوں اور جو اس کا احساس رکھتے ہوں، وقت کے عارفین اور اہل نظر کی زبان سے میں نے ان کے لیے بڑے بلند کلمات سنتے ہیں ان سب کو اُن کی عظمت اور بلندی کا معترف اور اُن کی مدح و توصیف میں رطب اللسان پایا" ——— (ایک سیاسی مطالعہ ص۲۶)

لیکن اولیاء کرام اور عارفانِ وقت اس کی ضرورت محسوس کرتے تھے کہ حضرت مدنیؒ اس حجاب کو دور فرما کر روحانی پیاسوں کی پیاس بجھائیں، مگر ضرورت کا احساس کون دلائے! چونکہ حضرت مدنی اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نوّر اللہ قبورہم کا روحانی تعلق اس قدر عمیق تھا کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی جس کی وجہ ظاہر ہے، دونوں حضرات علومِ دین خصوصاً علمِ حدیث میں یکتائے روزگار تھے، دونوں روحانیت کے ایک ہی چشمۂ صافی (دربارِ رشیدی گنگوہ شریف) سے سیراب تھے اس لیے باوجود اس امر کے کہ حضرت شیخ الحدیثؒ کے ہاں سیاست کا لفظ بھی شجرِ ممنوعہ سمجھا جاتا تھا (جبکہ حضرت مدنیؒ دینی سیاست کے قائد تھے) روحانی اور بدنی تعلق اس قدر قوی اور لازوال تھا کہ حضرت مدنیؒ کا جب بھی سہارنپور کی طرف کوئی پروگرام ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ آپ حضرت شیخ الحدیثؒ کے ہاں رونق افروز ہوئے بغیر تشریف لے جائیں، حضرت شیخ الحدیثؒ ادب اور احترام کی وجہ سے کبھی کھل کر بات نہ فرماتے تھے۔ چنانچہ آپؒ فرماتے ہیں:۔

——— "ایک دفعہ جب حضرت مدنیؒ تشریف لائے تو میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور اُن کا دامن پکڑ لیا اور عرض کیا کہ آج آپ سے لڑنا ہے، حضرتؒ نے فرمایا ہاں ہاں! مجھ بُڈھے سے تم لڑو گے کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت گنگوہیؒ نے جو دولت آپ کو عنایت فرمائی ہے اس کو تقسیم کرنے کی بجائے آپ سیاسی کاموں میں لگے رہیں گے؟ حضرتؒ نے فرمایا "میں وہ کام بھی کرتا ہوں" چنانچہ حضرتؒ کا معمول یہ ہو گیا کہ سہارنپور سے جب بھی گذر ہوتا یہاں اُتر کر میرے غریب خانہ پر تشریف لا کر مسترشدین و متوسلین کے اُونچے اُونچے احوال کی چند سطور میرے حوالے کر دیتے جن کو دیکھ کر میں حیران رہ جاتا کہ یا اللہ ان ظاہری مصروفیات کے باوجود روحانی خدمات کتنے اعلیٰ درجہ کے ساتھ انجام پا رہے ہیں، چنانچہ کوئی صوبہ اور کوئی خطہ ملک کا ایسا نہ تھا جو اُن کے روحانی فیوض سے مالا مال نہ ہوا ہو" ——— (آپ بیتی از شیخ الحدیثؒ)

آپ کے ایک جوہر شناس خادم نے یوں فرمایا ہے ؎

بہ دینِ مصطفٰے دیوانہ بودی — فدائے ملّت جانانہ بودی

سیاست را نقاب چہرہ کردی — وگرنہ عاشقِ مستانہ بودی

ملک کے روحانی طلباء اور سالکانِ طریقت اپنے کئی مسائل حل کرانے کے لیے حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ احقر ایک دفعہ دیوبند جا رہا تھا کہ گاڑی میں میانوالی کے علاقہ کے ایک عالم دین ہم سفر ہو گئے، اُن کے گلے میں حمائل شریف آویزاں تھا، علیک سلیک کے بعد جب اُن کو میرے دیوبند جانے کا علم ہُوا تو فرمایا کہ مَیں بھی دیوبند حضرت مدنیؒ کی خدمت میں جا رہا ہوں کہ مَیں ایک روحانی تکلیف میں مبتلا ہوں میرا تعلق حضرت مولانا حسین علی صاحب کے ساتھ ہے، چند ماہ سے مجھے بڑی روحانی تکلیف لاحق ہے، جنّات کا ایسا تسلط ہے کہ مَیں ہر وقت اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہوں، اسی لیے حمائل شریف گلے میں آویزاں کیا ہُوا ہے مجھے یہ بتایا گیا کہ حضرتِ مدنیؒ کے پاس جا کر بخاری پڑھو، اس لیے مَیں بھی دیوبند جا رہا ہوں۔ چنانچہ جب ہم دیوبند پہنچے تو میں اُن کو اپنے ساتھ لے کر حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور انہوں نے حضرتؒ سے اپنی ساری پریشانی ذکر فرمائی۔

حضرت مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ احسان و سلوک میں کس عظیم مقام پر فائز تھے؟ اس کا اندازہ تو وہی کر سکتا ہے جو خود اس بحرِ ذخّار کا شناور رہا ہو، ہم جیسے کوتاہ بین اور کم علم کیا کہہ سکتے ہیں ؟ مگر اتنا ضرور ہے کہ جس سعادت مند نے عالمِ شباب میں وقت کے قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہی نوّر اللہ مرقدہٗ سے بیعت کا شرف (حاصل) کیا ہو اور اُنکے مُرشد مخدوم العالم حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے احسان و سلوک کی راہنمائی حاصل کی ہو اور پھر مدینہ منورہ کی اس فضا میں جس میں آج بھی انوارِ معرفت جگمگا رہے ہیں جہاں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے انفاسِ قدسیہ نور افزاں ہیں جہاں ہزاروں صحابہ کرامؓ (جن کا مقام انبیاء علیہم السلام کے بعد مسلّم ہے) کی برکات آج بھی جلوہ فگن ہیں، سالہا سال منازلِ سلوک طے کرنے کیلئے ریاضت اور مجاہدات کئے ہوں ان کے مقامِ رفیع کا اندازہ لگانا اگرچہ مشکل ہے مگر ظاہر ہے کہ وہ اپنے وقت کے سید الاولیاء تھے جیسا کہ دورِ حاضر کے امام الاولیاء مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہٗ نے بارہا ارشاد فرمایا کہ :-

——"میں نے چودہ بار حرمین کی زیارت کی ہے اور اپنی باطنی آنکھوں اور رُوحانی نظر سے حرمین میں موجود اولیاء کرام کے مقامات کا مشاہدہ کیا مگر حضرت مدنیؒ کا ہم پلّہ کسی کو نہ پایا"۔ اور ساتھ ہی یہ فرمایا کرتے تھے کہ "میں نہ حضرتؒ کا شاگرد ہوں نہ مرید ہوں ——"

حضرت مدنیؒ اگرچہ اپنے اکابر کے طور وطریقہ پر ظاہراً نقشبندی مجددی تھے مگر باطناً آپ پر چشتیت کا غلبہ تھا وہی سوز وگداز اور شفقت علی الخلق اور محبت آپ کے قلب میں موجزن تھی، یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ مخدوم العالم حضرت حاجی امداداللہؒ کی نسبت سے شیخ اکبرؒ کے نظریے کے زیادہ قریب تھے، حاجی امداداللہ نوراللہ مرقدہٗ کا قیام مکہ مکرمہ میں اسی حجرہ میں تھا جس میں ابنِ عربی کا قیام رہا تھا، مثنوی مولانا رومؒ کے ساتھ شغف بھی اسی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، شیخ اکبر محی الدین صرف ایک صوفی کی حیثیت سے مشہور ہیں جن کے سمجھنے میں کئی لوگوں کو غلطی لگی ہے حالانکہ شیخؒ علومِ دینیہ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور چار سو ۴۰۰ سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے، علمی اور روحانی شغل کے ساتھ عوام وخواص اور سیاسی معاملات میں سلاطینِ وقت کی اصلاح بھی فرماتے تھے، چنانچہ اپنے دور کے سلاطین کے مظالم پر سخت گیر تھے، ایشیائے کوچک کے سلطان عزالدین کیکاؤس کو ایک منظوم خط لکھا جس کا ایک شعر درج ذیل ہے ؎

ایں الی دین النبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان ... بقاء و دین المبطلین یزول

"ترجمہ" میں چاہتا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دین غالب ہو اور باطل پرستوں کا نظام مٹ جائے"

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے صاحبزادہ ملک ظاہر غازی سلطانِ حلب کو ۱۱۸ نصائح لکھیں جو سب اس نے منظور کر لیں ——— حضرت مدنیؒ کی حیاتِ مبارکہ بھی اسی نہج پر تھی۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت مدنیؒ روحانی مدارج کے بلند ترین مقام پر فائز تھے اسلیئے جس طرح دارالعلوم دیوبند میں طلباءِ علومِ دینیہ خصوصاً طلباء دورۂ حدیث کا ہجوم رہتا تھا اسی طرح سلوک اور احسان کے طلباء اور علماء کرام کی بھی آمد ورفت رہتی تھی، میرے زمانۂ قیامِ دارالعلوم دیوبند کا چشم دید واقعہ عرض ہے:۔

———" پنجاب کے مشہور پیرِ طریقت حضرت خواجہ پیر فضل علی شاہ صاحبؒ دیوبند تشریف لائے اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر مراقبہ فرمایا، بعد میں فرمایا کہ جنابِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پُر فتوح ظاہر ہوئی اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی روح بھی وہاں موجود تھی، حضور اکرم صلی اللہ نے مولانا محمد قاسم صاحب اور شاہ ولی اللہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ:۔

"ان دونوں نے ہندوستان میں میرے دین کی اشاعت وتبلیغ کی ہے"

پھر حضرت پیر صاحبؒ نے حضرت نانوتویؒ کا پورا حلیہ بیان فرما دیا، حالانکہ مولانا نانوتویؒ کے وصال کو اُس وقت تریپن ۵۳ برس ہو چکے تھے ——— ناقلِ روایت مولانا محمد اسلم مرحوم نے تحریر فرمایا ہے کہ شہر کے

بوڑھوں سے جنہوں نے حضرتِ نانوتویؒ کو دیکھا تھا معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ حُلیہ بالکل صحیح ہے[1]۔

(مقاماتِ فضلیہ ص۳۷)

حضرتِ مدنیؒ کے ذکراذکار، روحانی تعلق اور عشقِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا برِصغیر میں پھیل گیا اور بعض نادان منتسبینِ دیوبند نے جو بعض عقائد اور اعمال میں نہایت تشدّد کا طریق اختیار کیا تھا جس نے اکابر دیوبند پر اہلِ بدعت کو اعتراضات کے مواقع مہیّا کر دیئے تھے اور ان ہی اعتراضات کے جواب کیلئے "المهند علی المفند" کا تحریر کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ حضرتِ مدنیؒ کے طرزِ عمل اور اتباعِ سلف سے دارالعلوم جس طرح حنفیت کا مرکز بن گیا اسی طرح طریقت کی بھی ایک عظیم خانقاہ بن گئی، چنانچہ ملک کے نامور علماء کرام اور پیرانِ طریقت نے اپنے مریدوں اور خود اپنی اولاد کو حضرت مدنیؒ کی خدمت میں فیضیاب ہونے کے لیے بھیجا، یہاں صرف چار حضرات کے اسماء گرامیہ مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں :۔

(۱) صوبہ سرحد کے مشہور روحانی پیشوا حضرت حاجی صاحب (حاجی مہربان علی شاہ) قدس سرہٗ العزیز زیبِ آستانہ اکوڑہ خٹک نے اپنے فرزندِ گرامی قدر حضرت بادشاہ گل رحمۃ اللہ علیہ کو حضرتِ مدنیؒ کی خدمت میں بھیجا، آپ نے نہ صرف رسمی علوم میں سندِ فراغت دارالعلوم دیوبند سے حاصل کی بلکہ حضرتِ مدنیؒ سے شرفِ بیعت بھی حاصل کیا اور احسان وسلوک پر ایک جامع رسالہ بنام فوائدِ حُسینیہ مرتب فرمایا، جس پر صرف دُعائیہ کلمات لکھانے کے لیے حضرت بادشاہ گُل مرحوم نے ایک طویل سفر کیا، یہ رسالہ طبع ہو چکا ہے۔

---

[1] **خواجہ پیر فضل علی شاہ صاحب کا مختصر تذکرہ**

آپ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اولاد میں سے تھے، آپ کی ولادت ۱۲۷۰ھ میں ہوئی، دینی تعلیم اپنے علاقے کے جیّد علماء کرام سے حاصل کی اور دورۂ حدیث مولانا احمد علی سہارنپوریؒ سے حاصل کیا، تحصیلِ سلوک کے لیے آپ حضرت خواجہ محمد عثمان دامانی نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں اُن کی حیاتِ مبارکہ کے آخری ایام میں حاضر ہوئے جبکہ آپ بیعت بہت کم فرمایا کرتے تھے، آخر آپ نے حضرتؒ کے خلف الصدق سراج الاولیا خواجہ محمد سراج الدین سے بیعت کا شرف حاصل کیا اور جلد ہی آپ کو سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں مجاز بیعت فرمایا گیا۔

آپ نے اپنے علاقہ میانوالی، ملتان وغیرہ میں کافی تبلیغی اسفار کیے، زیادہ قیام دہلی میں رہا، آخر ہدایتِ روحانی کی تبلیغ فرماتے ہوئے چوراسی (۸۴) سال کی عمر میں بروز جمعرات رمضان المبارک ۱۳۵۴ھ مطابق ۲۸ نومبر ۱۹۳۵ء کو وصال فرمایا۔ آپ کا مزار پرانوار مسکین پور ضلع مظفر گڑھ میں ہے۔

(۲) مولوی حافظ محمد اسمٰعیل صاحب مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کے شاگرد اور مرید و خلیفہ تھے اور ان کے مسلک کے زبردست مناد اور مبلغ تھے اور دیوبند کے شدید مخالف تھے، دارالعلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ کی علمیت، احسان و سلوک میں ممتاز حیثیت کا شہرہ سُنا تو اپنے بیٹے ضمیر احمد کو پہلے دارالعلوم دیوبند کی شاخ مدرسہ بدرالاسلام شاہ گنج میں داخل کیا پھر تکمیل کے لیے حضرت مدنیؒ کی خدمت میں پیش کردیا جہاں آپ کو اپنڈکس کا شدید درد اٹھا جسے رشتہ داروں اور متعلقین نے دیوبند کی نحوست قرار دیا اور ان کے والد مولوی محمد اسمٰعیل کو فوراً دیوبند پہنچنے کا مشورہ دیا، چنانچہ مولوی محمد اسماعیل صاحب اپنے بیٹے کی تیمارداری اور واپس لے جانے کی غرض سے دیوبند پہنچے اور صرف اپنے بیٹے ہی کے پاس قیام کو محصور کر دیا، بفضلہٖ تعالیٰ مولوی ضمیر احمد صاحب روبصحت ہونے لگے تو ایک دن آپ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ والد صاحب کو مزار قاسمی پر لے جاؤ کیونکہ آپ اب تک کی زندگی میں ان ہی بزرگوں کو بُرا بھلا کہتے رہے تھے اس لیے بڑی ردّ و قدح اور اصرار کے بعد ان کے مزاروں پر حاضری کے لیے تیار ہوئے وہاں پہنچنا تھا کہ عجیب وارفتگی کا حال ہوا، مراقب ہوئے اور دیر تک بیٹھے رہے، عصر اور مغرب کی نمازیں وہیں مزار سے متصل مسجد میں ادا کیں، مغرب کے بعد واپس آئے تو عجیب حال ہو رہا تھا آنسوؤں کا سیلاب اُمڈا چلا آرہا تھا، استغفار کے کلمات وردِ زبان تھے، توبہ توبہ کی رٹ تھی کہ ہائے ہم نے ان علماء حق اور بزرگانِ دین کو بہت بُرا بھلا کہا تھا مگر یہاں تو ان کی قبریں اس قدر منوّر ہیں اور اس قدر کشش والے یہ انسان ہیں کہ اپنے علماء حتیٰ کہ احمد رضا خان وغیرہ میں بھی یہ بات بالکل نہیں ہے۔ آخر میں حضرت شیخ الاسلام مدنی نوراللہ مرقدہٗ سے بیعت ہوئے۔ (دارالعلوم وفیات نمبر ص۱۱۶ بابت جولائی ۱۹۹۶ء)

جبکہ آپ کے فرزند ارجمند نے دیوبند ہی میں تکمیل فرمائی اور اپنے شیخ حضرت مدنی کے حکم سے بنگال کے ایک مدرسہ میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے تقسیم کے بعد مولانا کرامت علی خلیفہ ارشد حضرت سید احمد بریلوی کے خلف الصدق مولانا عبدالاول جونپوری نوراللہ قبورہم کے قائم کردہ مدرسہ شرقیہ کے مہتمم اور شیخ الحدیث مقرر ہوئے اور نہایت ہی محنت اور استقلال سے دین اور علوم دین کی خدمت کرتے ہوئے ۱۸ رمضان ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۵ اپریل ۱۹۹۰ء کو دلی میں انتقال فرمایا، جنازہ دارالعلوم دیوبند لایا گیا، جانشین شیخ الاسلام مولانا محمد اسعد مدنی مدظلہٗ نے نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت مدنی کے قدموں میں خلد آشیاں ہوگئے۔ نوراللہ قبورھم

(۳) ضلع جہلم پنجاب کے مشہور عالم دین مولانا کرم دین صاحبؒ اپنے علاقہ کے مفتی اور مناظر تھے، قادیانیت اور تردیدِ رفض میں آپ کی تقریری اور تصنیفی خدمات یادگار اور قابلِ قدر ہیں، آپ نے

تردیدِ رفض پر "آفتابِ ہدایت" جیسی جامع اور مفید ترین کتاب تالیف فرمائی جو کئی بار طبع ہو چکی ہے۔ قادیانیت کے خلاف آپ کی قلمی خدمات قابلِ قدر ہونے کے علاوہ آپ نے مرزا قادیانی کے ساتھ کئی مناظرے کیے اور قانونی طور پر اس کے خلاف مقدمات بھی دائر کیے جن میں وہ سزایاب بھی ہوا۔

آپ خواجہ شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی عقیدت مند تھے۔ آپ نے جب حضرت مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ کی علمی، دینی ممتاز حیثیت کے علاوہ روحانیت کے عظیم مقام پر فائز ہونے کا سُنا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بیعت کی درخواست کی، حضرت مدنیؒ نے اپنے شیخؒ کے ارشادات پر عمل کرنے کی تلقین فرماتے ہوئے دُعاؤں سے نوازا۔

آپ نے حضرت مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ کے فضل و کمال سے متاثر ہو کر اپنے بیٹے مولانا قاضی مظہر حسین صاحب کو دارالعلوم دیوبند بھیجا جہاں آپ نے موقوف علیہ کتابیں پڑھ کر نہ صرف دورۂ حدیث حضرتِ مدنیؒ سے پڑھا بلکہ آپ سے بیعت بھی ہو گئے اور نہایت محنت اور ریاضت کے ساتھ طریقۂ عالیہ چشتیہ، صابریہ کی منازل طے فرمائیں، حتّٰی کہ مرتبۂ احسان پر فائز ہونے پر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو خلافت سے بھی نوازا۔ آپ اپنے والد ماجدؒ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ردِّ رفض اور دوسرے فرقِ باطلہ کی تردید میں تقریری اور تحریری طور پر سرگرم ہیں —— آپ تحریک خُدامِ اہلِ سُنّت کے بانی اور اس کے سرپرست ہیں، مدنی مسجد چکوال کے خطیب اور مدرسہ اظہار الاسلام کے مہتمم بھی ہیں، آپ کا حلقۂ ارادت کافی وسیع ہے۔ مدظلہم العالی

(۴) صوبہ پنجاب کے شمال میں ایک سجادہ طریقت قدیم الایام سے مرجع خلائق ہے جس کا حلقہ ارادت صوبہ سرحد تک وسیع ہے۔ اسی خاندان میں مولانا میاں محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مدنیؒ سے غائبانہ ارادت کا اس طرح اظہار فرمایا کہ حضرت مدنیؒ کے انکار کے باوجود آخر کار بیعت سے مشرف ہوئے، حضرت میاں صاحبؒ کے نام حضرت مدنیؒ کا مکتوبِ گرامی مکاتیب شیخ الاسلام کے تذکرہ میں مع پتہ آ رہا ہے، الحمد للہ یہ مکتوبِ سامی پہلی بار "چراغِ محمدؐ" کی زینت ہو رہا ہے۔

جس طرح مسندِ تعلیم و تدریس آباد رہتی تھی اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ مسندِ ارشاد آباد اور پُر انوار رہتی تھی، خانقاہِ مدنی میں تشریف لانے والے سعادتمند ہر وقت خصوصًا رات کے وقت ذکر و اذکار، نوافل،

تلاوت میں ساری رات اس طرح مصروف اور مشغول رہتے تھے کہ خانقاہِ مدنی کا وہ کمرہ انوارِ روحانیہ سے جگمگاتا تھا جس کی کیفیت کی ایک جھلک برِصغیر کے مشہور کمیونسٹ لیڈر محمد اشرف کی زبانی درج کی جاتی ہے:-

"جب میں (۱۹۴۶ء) میں مولانا کی رہائش گاہ پر پہنچا تو اٹھارہ ۱۸ مہمانوں کا قافلہ پہلے سے موجود تھا، چنانچہ میں نے بھی مہمانوں کے ایک بڑے کمرہ میں ایک چارپائی پر بستر لگا دیا، دینداروں کے معمولات سے میں یوں ہی گھبراتا ہوں مگر پہلے دو دن میرے اوپر واقعی بڑے سخت گذرے، نماز پنجگانہ تک تو خیر میں صبر کر لیتا مگر مولانا کے یہاں تقریباً سب قائم اللیل تھے، کیفیت یہ کہ عشاء کی نماز کے بعد میں مشکل گھنٹے بھر سویا ہوں گا کہ کسی کونہ سے تکبیر با جہر بلند ہوئی میں نے دیکھا کہ میرے آس پاس کوئی ذکر خفی میں منہمک ہے تو کوئی تسبیح وظیفہ میں، تھوڑی دیر میں یہ حضرات تہجد کے لیے اٹھ بیٹھے، پھر فجر سے پہلے اور بعد قرآنِ پاک کی تلاوت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب دوسری رات بھی اسی کیفیت کی نذر ہو گئی تو میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضور کے ساتھ رہنے سے میری عاقبت درست ہو نہ ہو مگر میری صحت کو خطرہ ضرور لاحق ہو چکا ہے، حضرتؒ نے تبسم فرمایا اور تیسرے دن مجھے ایک علیحدہ اور آرام دہ کمرہ مل گیا"۔ (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص۲۹)

اکابر علماء دیوبند چاروں سلاسلِ طریقت کے شناور تھے مگر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نوّر اللہ مرقدہٗ کا ممتاز مقام سلسلہ چشتیہ صابریہ تھا، اس لیے بیعت تو تمام طریقوں میں فرماتے تھے اور تربیت بھی فرماتے تھے تاکہ تمام سلاسل کے ساتھ عقیدت قائم رہے مگر خلافت اور مجاز بیعت کے لیے صرف طریقہ چشتیہ صابریہ کو اختیار فرماتے تھے، اور یہی طریق کار بعد میں رہا ہے۔ سلسلۂ قادریہ کے بانی حضرت سید شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بارہ میں حضرت گنگوہیؒ نے ارشاد فرمایا۔ "آپ سید الاولیاء تھے"۔

سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے ساتھ اکابر کا نہایت ہی عمیق تعلق رہا ہے، مزارِ مجدد الف ثانیؒ پر خود بھی حاضری دیتے تھے اور متعلقین کو بھی اجازت دیتے تھے، جیسا کہ قطب الارشاد حضرت گنگوہیؒ نے اپنے ایک مسترشد جناب مولانا محمد صدیق صاحب کو تحریر فرمایا۔

"مزارِ مجدد رحمۃ اللہ علیہ پر قیام بہت عمدہ ہے، مزار مجدد پر حاضر ہو تو کچھ اس ناکارہ کے واسطے بھی خیال کرنا اور زبانی مزارِ مبارک پر بہ نشانِ نام سلام عرض کرنا"۔ (مکاتیب رشیدیہ ص۱۳)

حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں :۔

"میرے مرشد و آقا حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز ہیں، انہوں نے اگرچہ مجھ کو چاروں طریقوں میں بیعت فرمایا تھا جن میں سے طریقہ نقشبندیہ مجددیہ بھی ہے مگر اصلی طریقہ اور عام تعلیم حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی چشتیہ صابریہ تھی" (مکتوبات ج ۱ ص ۳۹۶)

اور آپ اسی میں بیعت فرماتے تھے، تصوف اور احسان میں آپ کے مقامِ رفیع پر احقر کا ایک مفصل مضمون ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند کے "الاحسان نمبر" بابت ماہ مئی تا جولائی ۱۹۹۳ء شائع ہو چکا ہے، یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ حضرتؒ نے بیعت وارشاد کا سلسلہ شروع فرمادیا اور دارالعلوم دیوبند اب باقاعدہ مدنی خانقاہ بن گئی اور عوام و خواص کا رجوع عام ہونے لگا۔ آپ فوراً بیعت نہ فرمایا کرتے تھے بلکہ استخارہ کا بار بار حکم فرماتے اور بعض دفعہ اپنی باطنی بصیرت کے پیشِ نظر انکار فرمادیتے۔ اس گنہگار پر خصوصی شفقت کے باوجود اُس وقت تک بیعت نہ فرمایا جب تک سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی منامی ترغیب کا ذکر پیش نہ کیا جس کی تفصیل مکتوبات جلد ۳ ص ۱۱۹ میں موجود ہے۔

حضرتِ مدنیؒ باہر سے آنے والے سالکین کو مکان کے قریب چھوٹی مسجد میں بعد از نمازِ مغرب بیعت فرمایا کرتے تھے، اور دورانِ سفر بھی بیعت فرمالیا کرتے تھے، سلہٹ کا سفر آپ کا تبتل اور کامل رجوع الی اللہ کا ہوا کرتا تھا اس لیے سلہٹ میں کافی سعادتمند بیعت کا شرف حاصل کرتے تھے، آپ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری سفر میں بانسکنڈی کے مقام پر تقریباً چھ ہزار آدمیوں نے بیک وقت بیعت کی، کثرت اور ہجوم کی وجہ سے لاؤڈ سپیکر پر بیعت کے کلمات کہلوائے گئے، آپ سے بیعت ہونے والے سعادتمندوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔

حضرت مدنیؒ سلوک علیٰ منہاج النبوۃ کے داعی تھے، آپ سلوک کی طویل و عمیق گھاٹیوں کو اِتباعِ سُنّت اور اذکارِ مسنونہ کے ذریعہ عبور کرنے پر زیادہ زور دیتے تھے جس پر آپؒ کی تصانیف، مواعظ اور مکتوبات شاہد ہیں۔

اللہ تعالےٰ نے حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کو وہ مقامِ محبوبیّت عطا فرمایا تھا جو کسی اور کو کم ہی عطا ہوا ہوگا۔ جن سعادتمندوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کی ہے وہ کبھی ان مناظر کو نہیں بھلا سکتے۔

عرب ممالک، پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، افریقہ، یورپ اور دوسرے ممالک میں الحمدللہ آپ کے متوسلین اور عقیدتمندوں کی تعداد کا شمار ممکن نہیں، عمر کے آخری سالوں میں تو آپ کی طرف رجوع خلق اللہ کا شمار نہ تھا جہاں تشریف لے جاتے مخلوقِ خدا انبوہ کے انبوہ آپ کی زیارت کیلئے پکتے تھے، اللہ تعالیٰ بھی اصلاح کے طلبگاروں کے قلوب کو ادھر متوجہ فرما دیتے ہیں[1]، سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ (ترجمہ) ”جب اللہ کی مدد اور فتح آپہنچی اور تم نے دیکھا کہ لوگوں کے قبیلوں کے قبیلے دین میں داخل ہو رہے ہیں“۔

بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ آپ کے پاس کوئی تسخیر کا عمل ہے۔ حالانکہ حضرتؒ نے فرمایا ہے:۔ ”اللہ تعالیٰ سے رو رو کر دُعا کرتا ہوں کہ لوگوں کا رُخ اِدھر سے پھیر دیا جائے“[2] ایک صاحب کے خط کے جواب میں ارشاد فرمایا:۔

”کوئی عمل تسخیر کا ایسا ہوتا تو میں یہاں جیل ہی میں کیوں پڑا ہوتا، سب سے بڑا عمل تسخیر کا تقویٰ ہے، ارشادِ قرآنی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا[3] (مریم ۹۶) اللہ تعالیٰ کو راضی کیجئے، اخلاص اور للہیت و تقویٰ ہر چیز میں نصب العین قرار دیجئے ؎

سیّاں انکھیاں پھیریاں بیری ملک جہان
ٹک جہان کی اک مہر کی لاکھوں کریں سلام

والسلام: ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ ———“

(مکتوبات ج ۱ ص ۳۳۶)

---

[1] جیسا کہ دورِ حاضر کے امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی لاہوری صاحبؒ کو جب انگریز پابندِ سلاسل کر کے لاہور لایا تو آپ کی ضمانت دینے والا کوئی نہ تھا مگر اسی لاہور سے جب آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو دو لاکھ مسلمانوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ [2] مکتوبات جلد ۲ صفحہ ۱۶ [3] اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ”جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں مہربان خدا لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت کو راسخ فرماتے ہیں“۔

شجرۂ طریقت

پہلے گذر چکا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی ممتاز خصوصیات میں سے نسب، سند بھی ہے جو کہ دوسرے کسی مذہب یا سوسائٹی میں اس طرح نہیں۔ اسی طرح روحانی تربیت (جس کا دینی نام تزکیۂ نفس ہے) کا بھی سلسلۂ سند ہے۔ جو ایک لحاظ سے دوسرے تمام سلسلوں سے ممتاز ہے کیونکہ دینِ اسلام کے تمام شعبوں کا اصلی منبع سیدِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی صفات ہے، اسی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے علمِ حدیث کی سند حضور سیدِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔

تزکیۂ باطن جس کا مشہور نام احسان وسلوک اور طریقت ہے، اس کا منبع بھی سیدِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی صفات ہے، اس لیے تمام روحانی سلسلوں کا شجرہ مربوط رکھنا ضروری ہے، خصوصًا جب کسی سالک کو شیخ کی طرف سے مجازِ بیعت کیا جاتا ہے اور وہ اس سلسلہ میں منسلک ہو جاتا ہے ــــ چنانچہ حضرتِ مدنی نور اللہ مرقدہٗ کو قطبِ عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحؒ سے مجازِ طریقت کی سند عطا فرمائی گئی جس کی باقاعدہ گنگوہ شریف میں دستار بندی کی گئی، آپ کا شجرہ طریقت درجِ ذیل ہے:۔

نمبر شمار	نام	مقام اور سن ولادت	سن وفات	مقام دفن
۱	اللّٰھم بجاہ قطب العالم سیدنا ومرشدنا مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز	بمقام بانگرمؤ ضلع اناؤ جہاں آپ کے والد ماجد درس دیا کرتے تھے اور وطن اصلی آپ کا اللہ داد پور قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد — ۱۹ ر شوال ۱۲۹۶ھ ۶ ر اکتوبر ۱۸۷۹ء دوشنبہ اور سہ شنبہ کی درمیانی رات بوقت ۱۱ بجے	۱۲ جمادی الاول ۱۳۷۷ھ مطابق ۵ ر دسمبر ۱۹۵۷ء بروز جمعرات بعد ظہر بعمر ۸۱ سال ۶ ماہ ۲۴ یوم قمری اور ۷۹ سال ۲ ماہ ایک یوم شمسی مع یوم پیدائش ووفات	مقبرہ دارالعلوم دیوبند (مقبرہ قاسمی)
۲	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا قطب الزمان مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز	قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور صوبہ یوپی ولادت ۶ ر ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ بروز دوشنبہ بوقت شب	بروز جمعہ ۸ یا ۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ	قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور صوبہ یوپی
۳	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا الحاج الحافظ الشیخ امداد اللہ المہاجر قدس اللہ سرہ العزیز	تھانہ بھون ضلع مظفر نگر صوبہ یوپی	۱۲ جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ	مکہ معظمہ (جنت المعلیٰ)
۴	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا نور محمد الجھنجھانوی قدس سرہ العزیز	جھنجھانہ ضلع مظفر نگر ولادت ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء	۴ رمضان المبارک ۱۲۵۹ھ	جھنجھانہ ضلع مظفر نگر یوپی

نمبر شمار	نام	مقام اور سن ولادت	سن وفات	مقام دفن
۵	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا عبدالرحیم الشہید قدس اللہ سرہ العزیز	افغانستان	۲۷ ذیقعدہ سنہ ۱۲۴۶ھ	ملک ولایت صوبہ سرحد
۶	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا عبدالباری الامروہوی قدس اللہ سرہ العزیز	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یوپی	۶ محرم سنہ ۱۲۲۶ھ	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یوپی
۷	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا عبدالہادی الامروہوی قدس اللہ سرہ العزیز	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یوپی	یوم جمعہ ۴ رمضان المبارک سنہ ۱۱۹۰ھ	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یوپی
۸	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا عضدالدین الامروہوی قدس اللہ سرہ العزیز	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یوپی	۲۷ رجب المرجب سنہ ۱۱۷۲ھ	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یوپی
۹	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا الشیخ محمد المکی قدس اللہ سرہ العزیز	مکہ معظمہ	۱۱ رجب المرجب سنہ ۱۱۶۲ھ	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یوپی
۱۰	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا الشاہ محمدی قدس اللہ سرہ العزیز	قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد صوبہ یوپی	۴ رجب المرجب سنہ ۱۱۰۷ھ	اکبرآباد موتی گڈھ " "
۱۱	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا محب اللہ الہ آبادی قدس اللہ سرہ العزیز	وطن ولادت وطن پور وطن قیام الہ آباد صوبہ یوپی	۹ رجب المرجب سنہ ۱۰۵۸ھ	الہ آباد " "
۱۲	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی سعید الگنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز	قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور " "	سنہ ۱۰۴۰ھ	گنگوہ ضلع سہارنپور " "
۱۳	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا نظام الدین البلخی قدس اللہ سرہ العزیز	تھانیسر ضلع کرنال صوبہ پنجاب	۸ یا ۲۴ رجب سنہ ۱۰۳۵ھ	بلخ
۱۴	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا جلال الدین التھانیسری قدس اللہ سرہ العزیز	مسکن آپکا تھانیسر ولادت سنہ ۸۹۴ھ	۱۴ ذی الحجہ سنہ ۹۸۹ھ	تھانیسر ضلع کرنال صوبہ پنجاب
۱۵	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا قطب العالم شیخ عبدالقدوس الگنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز	قصبہ رودلی ضلع بارہ بنکی صوبہ پنجاب ولادت سنہ ۸۹۱ھ	یوم سہ شنبہ ۲۳ جمادی الثانی سنہ ۹۴۰ھ یا ۹۲۵ھ	قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور صوبہ یوپی
۱۶	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا محمد الرودلی قدس اللہ سرہ العزیز	قصبہ رودلی ضلع بارہ بنکی صوبہ یوپی	۱۷ صفر المظفر سنہ ۸۹۸ھ	رودلی ضلع بارہ بنکی صوبہ یوپی
۱۷	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا احمد العارف الرودلی قدس اللہ سرہ العزیز	قصبہ رودلی ضلع بارہ بنکی صوبہ یوپی ولادت سنہ ۸۱۹ھ	۱۷ صفر المظفر سنہ ۸۷۲ھ	رودلی ضلع بارہ بنکی صوبہ یوپی
۱۸	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا الشیخ عبدالحق الرودلی قدس اللہ سرہ العزیز	قصبہ رودلی ضلع بارہ بنکی صوبہ یوپی	۱۵ جمادی الثانی سنہ ۸۳۷ھ	رودلی ضلع بارہ بنکی صوبہ یوپی
۱۹	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا جلال الدین کبیرالاولیاء الفانی فنی قدس اللہ سرہ العزیز	پانی پت ضلع کرنال صوبہ پنجاب	۵ ذیقعدہ یا ۱۳ ربیع الاول سنہ ۷۶۵ھ	پانی پت ضلع کرنال صوبہ پنجاب

نمبر شمار	نام	مقام اور سنِ ولادت	سنِ وفات	مقامِ دفن
۲۰	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا شمس الدین الترک الفانی فتی قدس اللہ سرہ العزیز	ترکستان	۱۰ شعبان یا ۱۰ جمادی الثانی سنہ ۷۱۶ھ	پانی پت ضلع کرنال صوبہ پنجاب
۲۱	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا علاؤالدین علی احمد الصابر قدس اللہ سرہ العزیز	اجودھن غالباً؛ ولادت ۱۹ ربیع الاول سنہ ۵۹۲ھ شب پنجشنبہ	۱۳ ربیع الاول سنہ ۶۹۰ھ	پیران کلیر شریف ضلع سہارنپور، یوپی
۲۲	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا فریدالدین شکر گنج الاجودھنی قدس اللہ سرہ العزیز	ملتان، ولادت غرہ رمضان المبارک سنہ ۵۶۹ھ	۵ محرم سنہ ۶۶۸ھ یا سنہ ۶۶۴ھ یا سنہ ۶۷۰ھ یا سنہ ۶۹۰ھ	پاک پٹن شریف
۲۳	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا قطب الدین بختیار الکاکی قدس اللہ سرہ العزیز	اوش توابع فرغانہ ولادت شب دوشنبہ سنہ ۵۸۲ھ	۲۴ یا ۱۴ ربیع الاول سنہ ۶۶۳ھ	دہلی، مہرولی شریف
۲۴	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا مرکز الطریقت معین الدین حسن السنجری قدس اللہ سرہ العزیز	سنجرستان یا سیستان	۶ رجب المرجب سنہ ۶۳۲ھ (اس میں اختلاف بہت ہے)	اجمیر شریف
۲۵	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا الشیخ عثمان الہارونی قدس اللہ سرہ العزیز	قصبہ ہارون توابع خراسان	۵ شوال سنہ ۶۳۳ھ یا سنہ ۵۶۷ھ یا سنہ ۵۹۶ھ	مکہ مکرمہ متصل مکان شریف صاحب
۲۶	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا الحاج السید الشریف الزندنی قدس سرہ العزیز	زندانہ توابع بخارا	۳ رجب سنہ ۶۲۱ھ	زندانہ بلادِ بخارا
۲۷	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا مودود الچشتی قدس اللہ سرہ العزیز	چشت، ولادت سنہ ۴۳۰ھ بعہدِ خلافت القائم باللہ	سنہ ۵۷۷ھ یا سنہ ۵۲۷ھ	چشت
۲۸	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی یوسف الچشتی قدس سرہ العزیز	چشت، ولادت سنہ ۳۷۵ھ	یکم جمادی الاول سنہ ۴۰۰ھ	چشت
۲۹	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی محمد المحترم الچشتی قدس سرہ العزیز	چشت، ولادت محرم شب عاشورہ سنہ ۳۳۱ھ	۴ ربیع الاول سنہ ۴۱۱ھ	چشت
۳۰	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی احمد الابدال الچشتی قدس سرہ العزیز	چشت، ولادت سنہ ۲۶۰ھ	غرہ جمادی الثانی سنہ ۳۵۵ھ بعہدِ خلافت المطیع باللہ	چشت
۳۱	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی اسحٰق الشامی قدس اللہ سرہ العزیز	شام	۱۴ جمادی الاول یا آخر سنہ ۳۲۹ھ	عکہ از بلادِ شام
۳۲	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ممشاد علو الدینوری قدس اللہ سرہ العزیز	قصبہ دینور شہر ہائے جبل سے ہے نزدیک قرمیسین	۱۴ محرم الحرام سنہ ۲۹۹ھ بعہدِ خلافت المقتدر باللہ	قصبہ دینور
۳۳	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا ابی ہبیرۃ البصری قدس اللہ سرہ العزیز	بصرہ، ولادت سنہ ۱۶۷ھ	۷ شوال سنہ ۲۷۵ھ	بصرہ
۳۴	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا حذیفۃ المرعشی قدس اللہ سرہ العزیز	قصبہ مرعش ملکِ شام نواحِ دمشق	۱۴ یا ۲۴ شوال سنہ ۲۵۲ھ بعہدِ خلافت المستعین باللہ	بصرہ نزد بعض

نمبر شمار	نام	مقام اور سنِ ولادت	سنِ وفات	مقامِ دفن
۳۵	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا السلطان ابراہیم بن ادہم البلخی قدس اللہ سرہ العزیز	اصل آپ کی بلخ سے ہے	یکم شوال ۱۶۷ھ یا ۱۶۶ھ	در شام علی الاصح
۳۶	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا فضیل بن عیاض قدس اللہ سرہ العزیز	سمرقند	محرم ۱۷۷ھ	مکہ مکرمہ گورستان جنت المعلیٰ
۳۷	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا عبدالواحد بن زید قدس اللہ سرہ العزیز	مدینہ منورہ	۲۷ صفر ۱۷۶ھ یا ۱۷۸ھ	بصرہ
۳۸	وبجاہ شیخ المشائخ سیدنا امام الاولیاء الخواجہ حسن البصری قدس اللہ سرہ العزیز	مدینہ منوّرہ	یکم رجب یا محرم ۱۱۰ھ	بصرہ
۳۹	وبجاہ امیر المؤمنین باب مدینۃ العلم سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ	مکہ مکرمہ، ولادت ۱۳ رجب بروز جمعہ واقعہ فیل سے ۳۰ سال بعد	۲۱ رمضان المبارک ۴۰ھ	نجف اشرف غالباً
۴۰	وبجاہ سید الانبیاء والمرسلین سیدنا ومولانا محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم	مکہ معظمہ، بروز دوشنبہ ۹ ربیع الاول سالِ فیل موافق ۴۰ حکومت کسریٰ	دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ بوقتِ دوپہر سفر برائے بہترین جہان وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ (الضحیٰ)	مدینہ منوّرہ زاد اللہ نورہا

ف:- اس شجرۂ طریقت کو حضرت شیخ الہندؒ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علیؒ نے عربی میں منظوم فرمایا ہے، اور اسی شجرۂ مبارکہ کو بانیٔ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فارسی زبان میں منظوم فرمایا ہے، جس کی افادیت کے بارہ میں حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا:-

"اگر ممکن ہو تو روزانہ شجرۂ منظومہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ پڑھ لیا کیجئے اور مشائخ طریقت کے لیے ذکر شروع کرنے سے پہلے ایصالِ ثواب کیا کیجئے، درود شریف تین مرتبہ، سورۂ فاتحہ تین مرتبہ، سورۂ اخلاص بارہ مرتبہ، درود شریف تین مرتبہ پڑھ کر دُعا کیجئے کہ پروردگارا! اس کا ثواب میرے مشائخ طریقت کو پہنچا دے اور اُن کی برکت سے، اُن کے طفیل میں میرے دل کو اغیار سے پاک اور اپنی معرفت کے انوار سے منوّر کر دے۔"[۱]

حضرتِ مدنی نوراللہ مرقدہٗ کے زمانۂ اقدس میں اس شجرۂ مبارکہ کو دلکش اردو نظم میں مرتب کیا گیا تھا، حضرتِ گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس شجرہ کو فارسی زبان کی مختصر نظم میں منظوم فرمایا ہے جو تبرکاً

[۱] مکتوبات ج ۳ ص ۱۶۹

درج کیا جاتا ہے

یا الٰہی کُن مناجاتم بفضلِ خود قبول
از طفیلِ اولیائے صابری

بہر امداد و بنور و حضرتِ عبد الرحیم
عبد باری عبد ہادی عضد دینِ مکّی ولی

ہم محمدی و محبّ اللہ و شاہِ بوسعید
ہم نظام الدین جلال و عبد قدوس احمدی

ہم محمد و عارف ہم عبد حق شیخ جلال
شمس دینِ ترک و علاؤ الدین فرید جود ھنی

قطب دین و ہم معین الدین و عثمان و شریف
ہم مودود و ابو یوسف ہم محمد و احمدی

بو سحاق و ہم بہ ممشاد و ہم ہبیرہ نامور
ہم حذیفہ و ابنِ ادہم ہم فضیل مرشدی

عبد واحد ہم حسن بصری علی فخرِ دین
سیّد الکونین فخر العالمین بشری نبی

پاک کُن قلب مرا تو از خیال غیر خویش
بہر ذات خود شفایم دِہ ز امراضِ دلی

تبلیغ و ارشاد

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ علماء حق کی طرح اپنے اکابر کے اتباع میں دین کی دعوت کو ہر ایک تک پہنچانے کے جذبہ سے سرشار ہو کر ہر وقت تبلیغ و ارشاد میں مصروف رہتے۔ دیگر دینی کاموں کی طرح فریضۂ تبلیغ میں بھی آپ کی منفرد اور ممتاز حیثیت تھی، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور عظیم روحانی راہنما ہونے کی حیثیت سے ملک بھر کے دینی مدارس اپنے سالانہ جلسوں اور تقاریب تقسیم اسناد میں آپؒ سے سعادت حاصل کرتے۔ غرض جہاں سے بھی تبلیغ و ارشاد کی دعوت آتی خواہ کتنی تکلیف اٹھانا پڑے آپ ضرور تشریف لے جاتے۔ حضرت مدنیؒ کی عملی زندگی اس قدر جاذب تھی کہ بلا لی نظر سے جن سعادتمندوں نے دیکھا وہ اسی زلف کے اسیر ہو گئے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے امتیازات و خصائص میں کثرت اسفار و رحلات ایسی ممتاز خصوصیت ہے جس میں وہ اپنے تمام اقران و معاصرین میں منفرد نظر آتے ہیں، وہ بھی ایسے پرخطر، دشوار گذار، دور افتادہ اور کور دہ مقامات کے اسفار جو متقدمین علماء اسلام کے رحلات و اسفار کی یاد تازہ کرتے ہیں جن میں انہوں نے تعلیم و تعلم کے لیے دنیا کی خاک چھانی ہے۔ اگر مولانا مدنیؒ کے علمی، دینی، روحانی اور سیاسی اسفار اور اُن کے دُور رس نتائج و ثمرات کو کتابی شکل میں یکجا کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں جو ایک اہم علمی و دینی خدمت ہو گی۔

حضرت مدنیؒ نے کوکن کے علاقہ میں تبلیغ کے لیے دو سفر کیے، پہلا سفر شری وَرْدھن عبد الرشید صاحب کُردی کی دعوت پر ہوا تھا اور دوسرا سفر ۱۹۵۵ء میں ہُوا، اس سفر میں جامع مسجد بمبئی کے امام صاحب (جو کہ عبد الرشید کُردی کے رشتہ دار تھے) بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان دونوں سفروں میں محترم المقام حضرت مولانا سید محمد اسعد صاحب مدنی زید مجدہم بھی ساتھ تھے۔ اس دُوسرے سفر کی داستان (مشہور صاحبِ قلم حضرت مولانا قاضی محمد اطہر صاحب مبارکپوری کے قلم سے) ہدیۂ ناظرین ہے:-

علاقۂ کوکن کا مختصر تعارف

بہت سے قارئین کے لیے علاقۂ کوکن نامعلوم مقام ہے، اس لیے ہم پہلے اس علاقے کی مختصر طور پر جغرافیائی اور تاریخی حیثیت پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ حضرتِ مدنیؒ کی وہاں تشریف ارزانی کے نتیجہ میں کس طرح تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا ہے۔

بمبئی کے آس پاس بحرِ ہند کے ساحل سے ملی ہوئی پہاڑی پٹی جنوب و شمال میں پھیلی ہوئی ہے جس کے ایک طرف مہاراشٹر کا میدانی علاقہ اور دوسری طرف کرناٹک کا میدانی علاقہ واقع ہے، اسی پہاڑی علاقہ کا نام خطۂ کوکن ہے اور اس میں خاص طور سے اضلاع تھانہ قُلّابہ (رائے گڑھ) اور رتناگیری شمار ہوتے ہیں۔ عرب سیّاحوں اور جغرافیہ نویسوں میں ابن خُرداذبہ، اصطخری، یعقوبی اور مسعودی نے اس کا نام "کم کم" بتایا ہے۔ البیرونی نے اس کو "کنکن" کے نام سے یاد کیا ہے۔ عرب تاجر و سیاح خطۂ کوکن کو بلاد الساج (ساگوان کا دیس) اور بلاد الارز (چاول کا دیس) کے لقب سے یاد کرتے تھے، تیسری اور چوتھی صدی میں اس علاقہ میں مسلمانوں کی آبادیاں تھیں جو عرب باپ اور ہندی ماں کی نسل سے تھے۔ اسی علاقہ میں واقع سندان (سنجان) میں ایک عرب ریاست تھی جس میں تین حکمران گذرے ہیں اور سوراشٹر کا علاقہ ان کے زیرِ نگیں رہا ہے۔ یہاں کے راجوں مہاراجوں کی طرف سے مسلمان قاضی مقرر کیے جاتے تھے جو مسلمانوں کے معاملات و مسائل میں راجہ کے نائب کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان ہی عرب تاجروں کی نسلیں اس خطہ میں آباد ہیں جو کوکنی کے نام سے مشہور ہیں، ساحلی تجارت اُن کے ہاتھ میں تھی مگر پُرتگیزیوں کے قبضہ و غلبہ کے بعد عام طور سے لوگ کھیتی باڑی، بحری ملازمت میں لگ گئے۔ چونکہ یہ پورا علاقہ دشوار پہاڑیوں اور سمندری کھاڑیوں میں گھرا ہوا ہے اسلیئے ایک دیہات سے دوسرے دیہات میں آنا جانا بہت کم ہوتا تھا اور گھنٹوں کے راستے دنوں میں طے ہوتے تھے۔

وسطِ کوکن میں ساحل سمندر پر "سیدیوں" کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ "سیدی" ان حبشی فوجوں کو کہتے ہیں جو شاہانِ گجرات و احمد نگر وغیرہ میں ملازم ہو کر یہیں رہ بس گئے تھے، مرہٹوں نے اورنگزیب عالمگیرؒ کے زمانہ میں جزیرہ جنشان کے قلعہ دُندالاج پوری پر ایک رات دھاوا بول دیا، رات بھر جنگ ہوتی رہی اور صبح ہوتے ہوتے قلعہ کی "سیدی" فوج نے اُن کو مار بھگایا اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اس ریاست میں تین تعلقے یا تحصیلیں تھیں، مُرُوڈ، شری وَردھن اور مُہسلہ۔ مرُوڈ میں قلعہ دندالاجپوری اس کا مرکز تھا، تقسیمِ ملک کے بعد نواب سیدی محمد خان صاحب اپنے دوست راجہ اندور کے یہاں چلے گئے اور چند سال ہوئے انتقال کر گئے ہیں، جزیرہ مقامی زبان کوکنی میں جنجیرہ ہو گیا ہے۔ خطۂ کوکن کے دیگر علاقوں کے مقابلہ میں ریاستِ جنجیرہ میں

عصری علوم کا رواج تھا۔ نوابِ جنجیرہ اور ان کے ارکان نے ۱۹۰۷ء میں انجمن اسلام کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا جس کے صدر ریاست کے دیوان سیدی ظفر خانزادہ اور سکریٹری سید یاقوت تھے، اس کے ماتحت ایک زراعتی ہائی اسکول مُروڈ میں جاری ہوا، پوری ریاست میں یہی ایک تعلیمی ادارہ تھا، جس کا مقصد مسلمانوں میں عصری تعلیم کا عام کرنا تھا۔ پورے علاقہ میں کوئی دینی ادارہ یا مدرسہ نہیں تھا۔ اسی حال میں نسیم علم کا ایک ایسا جھونکا آیا جو پورے خطۂ کوکن کے مشامِ جاں کو معطر کر گیا، یعنی حضرتِ مدنیؒ کے ایک دَورہ نے یہاں کی دنیا ہی بدل دی اور ہر طرف قرآنی اور دینی تعلیم کی فضا پیدا ہو گئی۔

شر میں خیر حضرتِ مدنیؒ کے سفرِ کوکن کے ابتدائی محرکات میں ایک "شخصی شر" تھا جو "اجتماعی خیر" کا سبب بنا۔ صورت یہ ہوئی کہ ہمارے مخلص و محترم دوست عالیجناب سید محمد صدیق ابراہیم قادری صاحب (مہر گُھسلائی) انڈر سکریٹری حکومتِ مہاراشٹر کے اعزہ میں شری وردھن کے ایک بزرگ جناب عبدالرشید صاحب کُر دمئے صاحب مرحوم تھے، بڑے خوش قامت اور رعب داب کے آدمی تھے، وہ شیطانی چکر میں پڑ کر شراب نوشی کی علت میں پھنس گئے تھے، بلا کے مے نوش تھے، کوشش کے باوجود "چھٹتی نہیں تھی منہ سے یہ کافر لگی ہوئی"۔ بالکل اخیر میں ایک دن گھر سے نکلے اور سیدھے دیوبند مولانا مدنیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر بلا کم و کاست اپنی داستانِ رندی و سرمستی بیان کر دی اور حضرتِ مدنیؒ کے دستِ اقدس پر توبہ و استغفار کی خواہش ظاہر کی، نہ پہلے سے دید و شنید، نہ خط و کتابت اور نہ ہی درمیان میں کوئی واسطہ، البتہ اتنا سُن رکھا تھا کہ مجھ جیسے گم کردہ راہ اور بھولے بھٹکے لوگوں کو آستانۂ مدنی میں پناہ ملتی ہے، حضرتِ مدنیؒ نے ان کی تمام باتیں سُن کر فرمایا کہ میں خود گنہگار آدمی ہوں اپنی اصلاح نہیں کر سکا ہوں آپ کی اصلاح کیسے کر سکتا ہوں؟ حضرتِ مدنیؒ کے ان جملوں سے عبدالرشید کُر دمئے صاحب کی ندامت و اضطراب کے زخم اور ہرے ہو گئے اور انہوں نے محسوس کر لیا کہ دل کی بے قراری اسی مدنی دارالشفاء میں سکون پا سکتی ہے۔ اور حضرتؒ سے بیعت ہو کر کچھ دنوں مقیم رہے، بعد میں وقفہ وقفہ سے حاضری دیتے رہے۔

اسی درمیان میں شری وردھن کے ایک اور شخص جناب عبدالرحیم بروٹ صاحب حضرتِ مدنیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہوئے۔ یہیں سے خطۂ کوکن میں حضرتؒ کے فیوض و برکات کا سلسلہ جاری ہوا۔ ان دنوں حضرتِ مدنیؒ گجرات اور بمبئی کے علاقہ میں نسبتاً زیادہ تشریف لے جاتے تھے اور کوکن کے یہ دونوں

مُسترشد حاضرِ خدمت ہو کر حضرتؒ سے کوکن تشریف لانے کی خواہش کیا کرتے تھے، نیز انجمن اسلام جنجیرہ کے اراکین نے اس کے لیے کوشش کی اور محترم سید محمد صدیق ابراہیم قادری صاحب کو وسیلہ بنایا جن سے حضرت مدنیؒ بہت مانوس تھے اور ان کے ساتھ کریمانہ برتاؤ فرمایا کرتے تھے، قادری صاحب نے جناب حکیم اعظمی صاحب صدر جمعیۃ علماء مہاراشٹر سے مل کر پروگرام مرتب کرایا، قادری صاحب پانچ دن کا دورہ کوکن چاہتے تھے اور حکیم صاحب مرحوم صرف دو دن رکھنا چاہتے تھے، جب حضرت مدنیؒ کو اس کشمکش کا علم ہوا تو خود ہی فرما دیا کہ میں پانچ دن کے لیے کوکن جاؤں گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا

پروگرام کی اطلاع ملتے ہی بہت سے معتقدین و متوسلین اور خدام حضرتؒ کی ہمرکابی کے لیے تیار ہو گئے، یہ سفر براہ سمندر جہاز سے ہونے والا تھا، روانگی صبح آٹھ بجے تھی، سویرے ہی سے علاقائی بندرگاہ بھاؤ کے دھکے پر بہت بڑا مجمع ہو گیا، آج کوکن جانے والا جہاز ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حجاج کو لے کر ارضِ پاک کی طرف جا رہا ہے، عجیب دینی و روحانی منظر تھا، تقریباً پانچسو مسافروں میں ہر طرف علماء و فضلاء مسترشدین و متوسلین اور معتقدین چلتے پھرتے نظر آتے تھے، جہاز میں بڑی چہل پہل تھی، جہاز کے کیپٹن جن کا نام غالباً عباس تھا دمن دیو کے رہنے والے تھے، آج انہوں نے اپنا جہازرانی کا بحری یونیفارم اُتار کر پائجامہ شیروانی اور سیاہ ٹوپی پہن رکھی تھی اور ایک سچے خادم و معتقد کی طرح اس کاروانِ علم و روحانیت کی راحت رسانی کے لیے جہاز میں چکر کاٹتے تھے، کہتے تھے کہ آج جہاز کمپنی کا نہیں نوابِ جنجیرہ کا چل رہا ہے، کیپٹن صاحب نے حضرتِ مدنیؒ کے اعزاز میں نہایت پُرتکلف دعوتِ طعام کا انتظام کیا جس میں سینکڑوں خدام و متوسلین شریک تھے، جہاز کے عرشہ پر نہایت قرینہ سے میز کرسیاں لگوائیں، حضرتِ مدنیؒ جب اوپر تشریف لے گئے اور یہ تکلفات دیکھے تو فرمایا کہ میں میز کرسی پر نہیں کھاتا ہوں، یہ جملہ سنتے ہی کیپٹن صاحب نے جہاز کے خلاصیوں اور ملازموں کو آواز دی اور میز کرسیاں اٹھوا کر ستر نجیاں (دریاں) بچھا دیں۔

چار گھنٹے کے اس دریائی سفر میں حضرتؒ کے مزاج میں بڑا انشراح رہا اور سینے کے علوم و معارف سفینے میں آتے رہے، اس مدرسۂ بحریہ میں فیوض و برکات کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہا، جہاز ہی میں حضرتؒ کی امامت میں نمازِ ظہر ادا کی گئی۔

جہاز مُروڈ کے ساحل سے دُور سمندر میں کھڑا ہُوا، ساحل سے کئی کشتیاں آکر جہاز سے لگ گئیں اور مسافران میں بیٹھ گئے، واپسی پر سمندری موجوں کی وجہ سے بھری ہوئی کشتیاں بُری طرح ہچکولے کھا رہی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب ڈوبیں، تب ڈوبیں! ہم لوگ سہمے ہوئے بیٹھے تھے اور حضرتؒ اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہو رہے تھے جیسے اُن کو بڑا مزا آ رہا ہے، غالباً اس کا مقصد ہمراہیوں کی ہمت افزائی تھا۔

شراب نوشی چھوڑ دو

ساحل پر مسلم غیر مسلم عقیدتمندوں کا بہت بڑا مجمع استقبال کے لیے موجود تھا اور حضرتؒ کی ناراضگی اور ناپسندیدگی کے باوجود استقبالی نعروں کی گونج میں جلوس روانہ ہُوا، راستہ میں نواب صاحب کے بھائی سُیدی محمد خانزادہ اور چچا سُیدی عبدالقادر خانزادہ (بابا صاحب) کا مکان پڑتا تھا، سُیدی عبدالقادر خانزادہ صاحب نے سُیدی محمد صدیق صاحب قادری کے ذریعہ گذارش کی کہ حضرت میرے مکان پر چل کر ایک پیالی چائے پی لیں، حضرتؒ نے اس گذارش کو فوراً قبول کرکے فرمایا کہ ایک نہیں دو پیالی آپ کی چائے پیئوں گا، خانزادہ صاحب خوش خوش حضرتؒ کو مکان کے اندر لے گئے، ساتھ میں دو چار عقیدتمند بھی تھے، حضرتؒ نے ان کی دلجوئی اور دلداری کرتے ہوئے بڑے ذوق و شوق سے چائے پی اور جب رخصت ہونے لگے تو خانزادہ صاحب کو تنہائی میں لے جاکر آہستہ سے فرمایا کہ شراب پینا چھوڑ دو، خانزادہ صاحب نے فوراً اس کا عہد کیا اور حضرتؒ کے سامنے توبہ کرلی۔ اس کے بعد پھر یہ کافر اُن کے مُنہ سے نہ لگ سکی، باہر نکل کر خانزادہ صاحب نے سید محمد صدیق قادری صاحب سے شکوہ کیا کہ تم نے حضرتؒ کو میری شراب نوشی کی خبر کردی تھی! قادری صاحب نے ان کی غلط فہمی دُور کرتے ہوئے کہا کہ حاشا و کلاّ مَیں نے آپ کے بارے میں ایسا کوئی جملہ نہیں کہا ہے، یہ فراستِ مومن کا اعجاز ہے کہ فقیر نے ایک امیر کی چائے کی پیالی پی کر امیر کو جام نوشی سے نجات دلادی، آپ اس توفیق پر اللہ تعالےٰ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔

مالٹ کا اسیر اور مقدمۂ کراچی کا قیدی کوکن میں

خطۂ کوکن کی ان دشوار گذار پہاڑیوں اور کھاڑیوں میں اس سے پہلے اتنا بڑا کوئی عالم اور بزرگ نہیں آیا تھا، کچھ اہلِ علم یہاں کے انجمنِ اسلام زراعتی ہائی سکول میں آئے مگر وہ دوسرے ذہن و مزاج

کے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں ریاست جنجیرہ کے صدر مقام مُروڈ میں انجمنِ اسلام کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ کھولا گیا جس کا مقصد مسلمانوں میں عصری اور جدید تعلیم عام کرنا تھا۔ اس سلسلہ میں مختلف اوقات میں علامہ شبلی، مولانا راشد الخیری، مولانا عبدالمنان خلافت بمبئی، سروجنی نائیڈو اور ڈاکٹر امبیڈکر وغیرہ یہاں آئے، عطیہ فیضی بیگم کے تعلق سے علامہ شبلی ہفتوں ہفتوں یہاں پھول محل میں قیام کرتے تھے مگر علم وعمل کا جامع کوئی عالم و مُرشد اس دیار میں نہیں آسکا تھا، حضرت مدنیؒ پہلے بزرگ ہیں جو اس خطہ میں آئے اور اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس کو علم دین کا گلشن بنا دیا اور ہزاروں گم کردہ راہ کو راہ پر لگا دیا۔

اس دیار کے ایک معمر بزرگ جناب لالہ میاں سرکھوت مرحوم جنہوں نے نقوشِ ماضی کے نام سے شری وردھن کی تاریخ لکھی ہے، بار بار کہتے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں علاقۂ کوکن میں نہ اتنا بڑا عالمِ دین دیکھا تھا اور نہ کسی آدمی کی مقبولیت ومحبوبیت کا اتنا عظیم مظاہرہ ہی دیکھا، مالٹا کا اسیر اور مقدمۂ کراچی کا قیدی اس خطہ میں آجائے، یہ خداساز بات ہے ورنہ ہم اس کا تصوّر بھی نہیں کرسکتے تھے اور نہ ہی اس کے لیے ظاہری اسباب تھے۔

دو باتوں پر زور حضرت مولانا اس پورے سفر میں وعظ وارشاد کی مجالس میں دو باتوں پر بڑی شدت سے زور دیتے تھے اور سخت تاکید کرتے تھے، ایک یہ مسلمان ڈاڑھی رکھیں تاکہ شکل وصورت سے مسلمان معلوم ہوں، ڈاڑھی مسلمانوں کے عالمی شعائر میں سب سے ضروری اور نمایاں شعار ہے۔ دوسرے قرآن کی تعلیم عام کریں، قرآن پڑھیں پڑھائیں، حافظ وقاری اور عالم ہوں اور قرآنی تعلیمات پر عمل کریں۔ ڈاڑھی کے بارے میں شدت کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی ڈاڑھی منڈا مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتا تو مولانا یہ کہہ کر اپنا ہاتھ کھینچ لیتے کہ سلام ضروری ہے، مصافحہ ضروری نہیں ہے، یا پھر ڈاڑھی رکھنے کا عہد لے کر مصافحہ فرماتے تھے۔

عام جلسوں اور نجی مجلسوں میں دینی تعلیم پر زور دینے کے ساتھ عصری اور جدید تعلیم کی افادیت و اہمیت بیان کرتے تھے، چنانچہ زراعتی ہائی اسکول انجمنِ اسلام مروڈ کی دعوت پر بڑے انشراح کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے، تمام شعبہ جات کا دیر تک معائنہ فرماتے رہے، شعبۂ امورِ خانہ داری پر خاص طور سے خوشی کا اظہار فرمایا، کھیتی باڑی کی عملی تعلیم دیکھنے کے لیے کچھ دور کھیت پر پیدل تشریف لے گئے اور شاندار معائنہ تحریر فرمایا جس میں اسکول میں دینی تعلیم کا شعبہ قائم کرنے پر خاص طور سے زور دیا اس کے نتیجہ میں

وہاں دینی تعلیم کا شعبہ قائم ہوگیا اور راقم نے اس کے لیے "مسلمان" نام کا ایک رسالہ لکھا جو انجمن اسلام جنجیرہ کی طرف سے شائع اور اسکول کے نصاب میں داخل کیا گیا۔

مدرسہ حسینیہ شری وردھن

کوکن کے اس پہلے دورہ میں حضرت مدنیؒ نے متعدد جلسوں کو خطاب فرمایا، ارشاد و تلقین کی مجلسوں میں عوام و خواص کو دینی زندگی اختیار کرنے کی تاکید کی، اسلامی علوم اور دینی شعائر پر زور دیا جس سے پورے علاقہ کوکن کے مسلمانوں میں ذہنی اور فکری انقلاب پیدا ہوگیا اور جس کا فوری ثمرہ شری وردھن میں مدرسہ حسینیہ کا قیام تھا۔

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ بمبئی میں معاصر علماء و مشائخ کی امتیازی خدمات کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مولانا مدنیؒ کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے تلامذہ و متوسلین نے ملک میں مدارس اسلامیہ کا جال بچھا رکھا ہے، ان میں سے تقریباً ہر ایک نے اپنے اپنے علاقہ میں مدرسہ قائم کیا ہے، یہ مولانا مدنیؒ کی دینی علوم کی طرف خصوصی توجہ کا نتیجہ ہے، چنانچہ کوکن میں پہلے مرکزی مدرسہ کا اجراء اسی توجہ کا نتیجہ تھا۔

یہ مدرسہ شری وردھن کی جامع مسجد میں جاری کیا گیا، دیکھتے ہی دیکھتے اس کی شاندار عمارت تیار ہوگئی اور پورے کوکن سے طلبہ آنے لگے۔ یہ اسی مدرسہ کا فیض ہے کہ جہاں کوئی حافظ قرآن نہیں تھا وہاں دیہات دیہات حفاظ و قراء پیدا ہوگئے ہیں، دینی علم کی روشنی ہر طرف پھیل گئی ہے، متعدد علماء دینی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور اس مرکز علم سے خطۂ کوکن گلشن صدا بہار بنا ہوا ہے، یہ سب حضرت مدنیؒ کے حسنات و برکات ہیں ؎

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

تبلیغی جماعت کی سرپرستی

اگرچہ اس عنوان سے ایک خاص جماعت مولانا محمد الیاس نوراللہ مرقدہ کی محنت سے تیار ہوئی جو آج تک سرگرم عمل ہے اللہ تعالیٰ دوام بخشے اور مزید قبولیت سے نوازے، مگر تبلیغ اسلام کا کام تمام علماء کرام خصوصاً جمعیۃ العلماء کا کام رہا ہے۔ حضرت مدنی نوراللہ مرقدہ اپنے تمام تلامذہ اور مریدین کو ادھر متوجہ فرمایا کرتے تھے آپ نے اپنے خلیفہ مجاز حضرت سید احمد شاہ رکن مجلس شوریٰ مدرسہ شاہی مراد آباد کو تحریر فرمایا :-

"تبلیغی خدمات کے انجام دینے اور اس کے لیے مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر ہدایات حاصل کریں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے"۔ (مکتوبات جلد ۲ ص ۶۲)

بلکہ جب جماعت کو کابل میں کام کرنے کے لیے کوئی دشواری پیش آئی تو آپ نے وہاں کے با اختیار اکابر کو بطور صدر مدرس دار العلوم دیوبند اور صدر جمعیۃ علمائے ہند مندرجہ ذیل مکتوب گرامی تحریر فرمایا۔

جناب مولانا فضل ربی صاحب کابل کے نام

بخدمت عالی جناب ذوالجاہ والاکرام مولانا فضل ربی و حضرات علمائے کابل لازالت شموس فیوضکم بازغۃً و بدور معالیکم لامعۃً آمین! بعد ادائے مراسم اسلامیہ و سنن نبویہ علیٰ صاحبہا صلوٰۃ و تحیۃ۔ عرض آنکہ حاملین عریضہ ہمارے چند احباب خدمت عالیہ میں حاضر ہورہے ہیں، ان کا مقصد کوئی سیاسی و ملکی نہیں ہے، فقط خدمات دینیہ اور فرائض تبلیغیہ ادا کرنا اور مسلمانان افغانستان کو وہ کام یاد دلانا جس کو عام مسلمانوں نے بھلا دیا ہے مقصود ہے، امید آنکہ آپ حضرات ان کی امداد اور اعانت میں کوتاہی روا نہ رکھیں گے اور ان پر اعتماد رکھتے ہوئے ممکن تسہیلات سے درگذر نہ فرمائیں گے۔

والسلام۔ آپ کا خیر اندیش ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

صدر مدرس دیوبند و صدر جمعیۃ علمائے ہند

۳ محرم الحرام ۱۳۷۷ھ (جلد ۴ ص ۳۳۲)

(ف) حضرت مدنیؒ کی تبلیغ سے کئی غیر مسلم اسلام لائے جس کی تفصیل بعض اخبارات اور رسائل میں موجود ہے ان ہی میں سے ہندوستان کے انگریزی دور کے سابق کمانڈر انچیف لارڈ کچنر (جو بحیرۂ قلزم میں غرق ہو کر فرعون کے پاس پہنچ چکا ہے) کے خاندان کی ایک بیوہ عورت نے دین حق کی تلاش میں دور دراز کے سفر کیے تھے اور ہندوستان آکر ہندوازم، بدھ مت بلکہ سادھوازم تک کا بھی مطالعہ کیا تھا، مگر اس کی تسلی نہ ہو سکی۔ آخر وہ دار العلوم دیوبند آئیں اور حضرت مدنیؒ کے ساتھ چند گھنٹے سوالات و جوابات میں گذارے اور مشرف بہ اسلام ہو گئیں، پھر آپ کے بیٹے مارس برناڈ کک اور آپ کی بیٹی مس جوزیفن مکلیاڈ نے بھی اسلام قبول کر لیا، اس کے بعد محترمہ کی خواہش پر مولانا عزیر گل مرحوم نے اپنے حرم میں قبول فرما لیا۔ اس محترمہ نے ساری زندگی ایک چھوٹے سے قصبے میاں کلے کے کچے مکانات میں اس طرح بسر کی کہ پھر ایک قدم بھی اس حویلی سے باہر نہ نکالا، قرآن کریم کا انگریزی میں ترجمہ فرمایا، آخر وہیں انتقال فرما گئیں، ان کی قبر اسی قصبہ میں ہے۔ اللہم ارحمہم واغفرلہم (الارشاد، ربیع الاول ۱۳۹۸ھ)

دورۂ حدیث کی اہمیت

جس دارالعلوم کا ابتدائی نصاب اس قدر جامع ہو اُس کی آخری جماعت جسے دورۂ حدیث کہا جاتا ہے وہ کس قدر اہم اور عظیم ہوگی! بہتر ہے کہ دورۂ حدیث میں پڑھائی جانے والی کتابوں کا مختصر سا تعارف کرا دیا جائے۔ دورہ حدیث میں مندرجہ ذیل کتب حدیث پڑھائی جاتی ہیں۔

۱۔ صحیح بخاری ۲۔ صحیح مسلم ۳۔ سنن ترمذی ۴۔ سُنن نسائی ۵۔ سنن ابن ماجہ ۶۔ سنن ابوداؤد

ان کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے، یعنی وہ چھ حدیث کی کتابیں جن کو علماء حدیث نے صحیح مانا ہے ان کے علاوہ موطا امام مالک، موطا امام محمد، شمائل ترمذی، معانی الآثار للطحاوی بھی داخلِ نصاب ہیں ان کا مختصر مگر جامع تعارف درج ذیل ہے۔

① امام بخاریؒ کا نام محمد ہے، آپ کے والد ماجد کا نام اسمٰعیل ہے، ۱۳ شوال ۱۹۴ھ کو بعد از نمازِ جمعہ آپ پیدا ہوئے، بچپن ہی میں آپ کے والد ماجد کا انتقال ہوگیا، ادھر آپ کی بینائی جاتی رہی، آپ کی والدۂ ماجدہ ہمیشہ اسی درد و کرب میں رویا کرتی تھیں، ایک رات حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تو آپ نے بشارت فرمائی کہ اللہ تعالےٰ نے تیری دعا قبول فرمالی اور تیرے بیٹے کو بصارت عطا فرمادی، چنانچہ صبح کو ان کی نظر آچکی تھی، آپ نے طلبِ علم میں دُور دراز کے سفر کیے، سولہ سال کے عرصے میں سب حدیثوں کو علمی اعتبار سے صحیح اور کامل پاکر اس کتاب کو مرتب کیا، ہر حدیث کو لکھنے سے پہلے غسل فرمایا کرتے تھے اور دو رکعت نفل پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے راہنمائی اور قبولیت کی دعا فرمایا کرتے تھے۔

نوّے ہزار خوش بختوں نے امام بخاریؒ سے بخاری شریف سُنی، پڑھی اور سمجھی۔ آپ کے زمانے میں بخارا کا جو امیر تھا اُس نے یہ چاہا کہ امام بخاریؒ اُس کے درِ دولت پر آکر اُس کے بچوں کو حدیث اور تاریخ کا درس دیا کریں، مگر آپ نے اس میں علمِ حدیث کی توہین سمجھی، اس پر آپ کے خلاف سازش کی گئی، بالآخر آپ نے بخارا چھوڑ دیا اور سمرقند کے قریب خَرتَنگ قصبہ میں آکر آباد ہوگئے، تھوڑے ہی عرصے کے بعد

وہ امیر بھی بڑی ذلت کے ساتھ معزول کر دیا گیا۔ امام بخاریؒ اس قصبہ میں ۲۵۶ھ کو عید الفطر کی رات میں انتقال فرما گئے اور اسی قصبہ میں دفن کر دیئے گئے، آپ کی قبر مبارک سے جنت کی خوشبو آتی رہی۔

(۲) **امام مسلمؒ**: آپ کے والد ماجد کا نام حجاج ہے، آپ قبیلہ قشیر سے تھے، نیشاپور میں آپ ۲۰۶ھ کو پیدا ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جس میں نیشاپور محدثین کا پایہ تخت تھا، ابھی بارہ سال کے تھے کہ حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سننا اور یاد کرنا شروع کر دیا، طلب علم کے لیے عراق اور مصر کا سفر کیا، بغداد میں کئی دفعہ آنا جانا ہوا، بصرہ اور بلخ کا بھی سفر کیا۔ جب امام بخاریؒ نیشاپور تشریف لائے تو امام مسلمؒ نے ان سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا، پندرہ برس کی مدت حدیث کی کتاب "صحیح مسلم" کو جمع کرنے میں صرف کی، اس کتاب کو بھی اللہ تعالیٰ نے بہت شرف عطا فرمایا، بعض علاقوں میں تو مسلم شریف کو قرآن مجید کے بعد مرتبہ دیا جاتا ہے ویسے عام طور پر اسلامی تعلیمات میں بخاری کے ساتھ ساتھ مسلم کا درجہ بھی ہے۔ آپ نے پچپن برس کی عمر میں ۲۵ رجب ۲۶۱ھ کو وفات پائی اور نیشاپور کے محلہ نصر آباد میں دفن کر دیئے گئے۔

(۳) **امام ابوداؤدؒ** کا اصلی نام سلیمان اور آپ کے والد ماجد کا نام اشعث ہے، آپ ۲۰۲ھ کو سیستان (جس کو عربی میں سجستان کہا جاتا ہے) میں پیدا ہوئے جو کہ خراسان کا مشہور علاقہ ہے۔ آپ نے سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے لیے دور دراز کا سفر کیا اور علم حدیث میں اپنے دور کے یکتا محدث سمجھے گئے، امام ترمذیؒ اور امام نسائیؒ جیسے محدث آپ کے شاگرد ہیں۔ ۲۷۵ھ کو ۷۳ سال کی عمر میں بروز جمعہ آپ کا انتقال ہوا۔

(۴) **امام ترمذیؒ**: آپ کا نام محمد اور کنیت ابوعیسیٰ ہے، شہر ترمذ میں ۲۰۹ھ کو پیدا ہوئے، علم حدیث کے حاصل کرنے کے لیے دور دراز کا سفر کیا۔ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ جیسے قابل قدر اساتذہ سے علم حدیث حاصل کیا، آپ پر خشیت الٰہی کا اس قدر غلبہ تھا کہ روتے روتے آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ سنن ترمذی نہایت جامع کتاب ہے اس میں حدیث کے کئی علوم جمع کر دیئے گئے ہیں۔ امام ترمذیؒ نے ۲۷۹ھ کو وفات پائی۔

(۵) **امام نسائیؒ**: آپ کا نام احمد تھا، آپ بھی علاقہ خراسان کے قصبہ نسا میں ۲۱۴ھ کو پیدا ہوئے اسی نسبت سے نسائی کہلائے، طلب حدیث کے لیے دور دراز کا سفر کیا، آخر مصر میں مستقل سکونت اختیار کر لی، صوم داؤدی کے پابند تھے (یعنی ایک دن روزہ اور ایک دن افطار کرتے تھے) کئی حج کیے، امیر مصر کے زیر کمان ہو کر جہاد بھی کیا، آپ ۳۰۳ھ کو فوت ہوئے۔

(۶) **ابنِ ماجہؒ:** محمد بن یزید ابن ماجہ ایران کے مشہور شہر قزوین میں ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے زمانہ میں علمِ حدیث عروج پر تھا، آپ نے اپنی عمر کے تیئیسویں سال طلبِ علم حدیثِ نبیٔ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لیے گھر سے باہر قدم رکھا۔ بصرہ، کوفہ، بغداد، مکّہ مکرّمہ، مصر، شام وغیرہا کا سفر کیا اور ان مُلکوں کے جلیل القدر اساتذہ سے حدیث سُنی، اور پھر ساری زندگی اشاعتِ حدیث میں بسر کر دی، ۶۴ سال کی عمر میں بروز سہ شنبہ ۲۲ رمضان المبارک ۲۷۱ھ کو انتقال فرمایا۔

اِن چھ کتابوں میں سے صحیح بخاری اور سُننِ ترمذی پوری پڑھائی جاتی ہیں، باقی کتبِ حدیث کا بھی اکثر یا کچھ حصّہ پڑھایا جاتا ہے۔ اِن چھ کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب بھی دورۂ حدیث میں داخل ہیں جن کا مختصر سا تعارف درج ذیل ہے:۔

(۱) **مؤطا امام مالک:۔** اس کتاب میں امامِ اہلِ مدینہ امام مالکؒ بن انس بن مالک کی اُن روایات کو جمع کیا گیا ہے جو آپ کے شاگرد یحییٰ بن یحییٰ مصمودیؒ نے روایت کی ہیں۔ امام مالکؒ کی ولادت مدینہ منورہ میں ۹۵ھ کو ہوئی اور وفات ۱۷۹ھ کو ہوئی، مزارِ مبارک جنت البقیع میں مزارِ حضرتِ عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قریب ہے۔

مؤطا امام مالک کی مبسوط اور مفصل شرح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نوراللہ مرقدہٗ نے اوجز المسالک کے نام سے مرتب فرمائی جو محدّثینِ کرام کے لیے راہ نما ہے۔ امام مالکؒ کا اپنا ارشاد ہے کہ: "ہر رات زیارتِ سیدِ دوعالم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کا شرف حاصل ہوتا تھا۔" رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً

(۲) **موطا امام محمد:۔** امام محمدؒ کی ولادت ۱۳۲ھ کو ہوئی، طلبِ علم کے لیے کوفہ وغیرہ کا سفر کیا، امام ابوحنیفہؒ کے شاگردِ رشید تھے۔ امام ابو یوسفؒ کی وفات کے بعد ہارون رشید نے آپ کو سلطنتِ عباسیہ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ رَی کے مقام پر ۱۸۹ھ کو وفات ہوئی۔ آپ نے بہت سی کتابیں تالیف اور تصنیف کی ہیں، آپ نے امام مالک سے روایات نقل کی ہیں۔ موطا امام محمد میں مسلکِ احناف کی تائید میں روایات نقل فرمائی ہیں۔

(۳) **شمائلِ ترمذی:۔** یہ ایک ایسی مبارک کتاب ہے جس میں سیّدِ دوعالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حالاتِ مبارکہ کو باسند امام ترمذیؒ نے جمع فرمایا ہے، یہ بھی دورہ حدیث میں شامل ہے۔

(۴) **طحاوی شریف:۔** دورۂ حدیث میں پڑھائی جانے والی تمام کتابوں کے مرتب غیر حنفی محدّثینِ کرام ہیں

صرف موطا امام محمدؒ کے مرتب امام ابوحنیفہؒ کے شاگردِ رشید امام محمدؒ ہیں، اگرچہ ان تمام کتابوں کے درس حدیث میں محدثینِ کرام علمی اور فنی لحاظ سے بحث فرما کر فقہ حنفی کی وجوہ ترجیح بیان فرماتے ہیں مگر بعض حنفی علماء کرام نے اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی تالیف فرمائی ہیں جن میں طحاوی شریف کامیاب اور مفید کتاب ہے، اس کے مؤلف احمد بن محمد مصری ہیں انہوں نے ایک کتاب معانی الآثار مرتب فرمائی جسکے ہر باب میں احادیث نقل فرما کر من وجہ النظر سے حنفی استدلال کی فقہی حیثیت کو ثابت کیا ہے، یہ کتاب چار جلدوں میں ہے مگر اس کی تدریس پوری نہیں ہوتی۔ امام طحاویؒ کی وفات ذیقعدہ ۳۲۱ھ میں ہوئی۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین

دارالعلوم دیوبند کے دورۂ حدیث کی خصوصیات ①

دارالعلوم میں دورۂ حدیث میں شرکاء اگرچہ بظاہر طلباء کی فہرست میں ہوتے تھے مگر ان میں سے اکثر وہ ہوتے تھے جو تمام علوم مروجہ سے فارغ ہوتے تھے بلکہ بعض اوقات وہ علماء کرام استفادہ کے لیے دورۂ حدیث میں شریک ہوتے تھے جو پہلے دوسرے مدارس سے سند یافتہ ہوتے تھے، دارالعلوم دیوبند میں ایسے علماء کرام جو دورۂ حدیث میں شریک ہوا کرتے تھے خارج میں طلباء کو علوم و فنون کی کتابیں پڑھایا کرتے تھے اس لیے دورۂ حدیث کا داخلہ مشکل ہوا کرتا تھا داخلہ کا باقاعدہ امتحان لیا جاتا تھا، ناکام طلباء کو واپس کر دیا جاتا تھا، موقوف علیہ کتب میں ہر فن کی آخری کتب ہوا کرتی تھیں۔

دارالعلوم کے دورۂ حدیث کی دوسری خصوصیت ②

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ اکثر دینی مدارس میں دورۂ حدیث پڑھایا جاتا ہے مگر دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کے دورۂ حدیث کی یہ ایک ممتاز حیثیت ہے کہ ان مدارس کے اساتذۂ حدیث فنِ حدیث کے پورے ماہر ہوتے تھے اور ان کی علامت یہ ہے کہ ان کے ہاں پڑھائی جانے والی کتابوں کی شرحیں تالیف فرمائیں جو ان کی محنت اور کتاب کے مندرجہ مندرجات پر حاوی ہونے کی دلیل ہے، جیسا کہ:۔

● بخاری شریف حضرت شیخ الہندؒ پڑھایا کرتے تھے، آپ کے تلامذہ میں سے حضرت شاہ صاحبؒ، حضرت مدنیؒ جیسے محدثینِ عظام پیدا ہوئے، اور آپ نے بخاری شریف کے الابواب والتراجم کا کچھ حصہ اسارتِ مالٹا کے زمانہ میں تحریر فرمایا۔

● آپ کے شاگردِ جلیل کے درسِ بخاری شریف کے فوائد کو حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگرد مولانا بدرِ عالم میرٹھی مہاجر مدنیؒ نے فیض الباری کے نام سے جمع فرمایا جو مصر سے طبع ہو چکی ہے۔

● ـــــ مسلم شریف دارالعلوم میں حضرت شیخ الہندؒ کے شاگردِ رشید مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (ڈابھیل جانے سے پہلے) پڑھایا کرتے تھے، آپ نے "صحیح مسلم" کی شرح بہ نام "فتح الملہم" لکھی جو تین جلدوں میں مطبوعہ ہے۔

● ـــــ ترمذی شریف حضرت شیخ الہندؒ پڑھایا کرتے تھے، آپ کے افادات بطور حاشیہ کے "ترمذی" مطبوعہ اصح المطابع کے حاشیہ میں مسطور ہیں، حضرت شیخ الہندؒ نے سفرِ حجاز پر "ترمذی" کی تدریس بھی شاہ صاحبؒ کے سپرد فرمائی، شاہ صاحبؒ کی تقریر کو ان کے شاگرد مولانا محمد چراغ نے "العرف الشذی" کے نام سے مرتب کر کے شائع فرمایا اور ترمذی کی مفصل شرح حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگردِ رشید حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے بہ نام "معارف السنن" مرتب فرمائی جو کئی جلدوں میں مطبوعہ اور دستیاب ہے۔ ـــــ حضرت مدنیؒ کے شاگردِ رشید مولانا عبدالحق صاحبؒ بانی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نے "حقائق السنن" کے نام سے ترمذی کی شرح مرتب فرمائی جو طبع ہو رہی ہے۔

● ـــــ حضرت شیخ الہندؒ کے شاگردِ رشید مولانا خلیل احمد مہاجر مدنیؒ نے ابوداؤد کی شرح "بذل المجہود" کے نام سے مرتب فرمائی جو پہلی بار تقطیع کلاں کی سات جلدوں میں طبع ہوئی اور اب کئی جلدوں میں مصر سے شائع ہوئی ہے۔

● ـــــ حضرت مولانا خلیل احمدؒ کے شاگردِ رشید محدثِ وقت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ نے موطا امام مالک بہ نام "اوجز المسالک" تالیف فرمائی جو ۱۵ جلدوں میں طبع شدہ ہے اور عرب و عجم کے علماء حدیث اس سے راہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔

● ـــــ حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگردِ رشید مولانا عبدالرحمٰن کاملپوریؒ سابق صدر مدرس مظاہر علوم سہارنپور نے "طحاوی" کی شرح بہ نام "الحاوی" تحریر فرمائی۔ ظاہر ہے کہ ایسے اساتذۂ کرام کا درس جامع اور مفید ترین ہوگا۔ ـــ پھر ان حضرات نے عمر بھر ان ہی کتابوں کو پڑھایا، حضرت مدنیؒ نے مدینہ منورہ میں ۱۵ سال، سلہٹ میں ۴ سال اور دیوبند میں ۲۹ سال بخاری اور ترمذی کا درس دیا تو ان ۴۸ سالوں میں معلومات میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہوگا، اس لیے حضرتِ مدنیؒ کا درس زیادہ مفید رہا جیسا کہ آئندہ صفحات میں آپ کے درس کی کچھ خصوصیات کا ذکر آرہا ہے۔ ـ یہی وجوہ تھیں کہ برِصغیر اور دوسرے اسلامی ممالک کے طلباء حدیث خصوصیت کے ساتھ ان مدارس میں علمِ حدیث حاصل کرنے کو فضیلت سمجھتے تھے۔

دورۂ حدیث میں

بخاری اور ترمذی کا خصوصی درجہ

دورۂ حدیث میں شیخ الحدیث دو کتابیں پڑھاتے تھے، ایک تو صحیح بخاری شریف اور دوسری جامع ترمذی شریف ــــــ صحیح بخاری کو جمہور اُمت نے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا اعزاز دیا ہے اور یہ درست بھی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جس محنت اور تحقیق کے ساتھ اس کتاب کو مرتب فرمایا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ عالمی تحقیقاتی اداروں نے اس کتاب کی جامعیت اور افادیت پر جو رائے قائم کی ہے وہ بھی تائید کے طور پر ہدیۂ ناظرین ہے:۔

(۱) ہیوز کی مرتبہ "ڈکشنری آف اسلام میں ہے:۔

بخاری اس طبقہ کے اولین شخص ہوئے ہیں جنہوں نے حدیثوں کے مجموعہ کو خوب جانچا اور پرکھا، یہ تنقیدی طریقہ بہت مفید ثابت ہوا اور بخاری کی صحیح کا استناد اُس وقت سے آج تک مُسَلَّم چلا آرہا ہے۔ حدیثوں کے کچھ مجموعے تو بخاری سے قبل بھی تیار ہو گئے تھے لیکن راویوں پر جرح و تنقید اور اسناد کی تحقیق اُن کے زمانہ سے چلی، بخاری کے ابواب (پیراگراف) اور تراجم کے عنوانات سے ظاہر ہے کہ وہ فقہ کی مکمل کتاب تیار کر رہے تھے، ان کی صحیح کی "کتب" میں تقسیم عین ترتیبِ منطقی کے مطابق اور مناسب ہے۔ بحیثیتِ مجموعی ان کی کتاب ابتدائے اسلام اور عربی تمدن کے لیے ایک اہم ترین ماخذ ہے، خود بخاری کی یہ "صحیح" عموماً بڑی احتیاط سے نقل ہوئی ہے ان کی نقل اور اس میں احتیاط میں شدتِ اہتمام کا اندازہ اس روایت سے ہو سکتا ہے کہ یہ ہر حدیث کے نقل کرنے سے قبل حق تعالیٰ کے حضور میں سجدۂ شکر ادا کر لیتے تھے۔ (ص ۴۴)

(۲) انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں ہے کہ:۔

بخاری نے اپنی صحیح کا نسخہ ۲۵۶ھ (۸۷۰ء) سے قبل ہی شائع کر دیا اور مسلم نے بھی اپنی صحیح کا اس کے چند ہی سال بعد! یہ دونوں کتابیں بعد کی ساری فقہی کتابوں کا ماخذ بن گئیں اور انہوں نے (اہلسنت) کے

مذہب کو ایسی تقویت پہنچادی کہ جس کا جواب (شیعہ و معتزلہ) دونوں سے نہ بن پڑا۔ (جلد ۱۱ ص ۴۵۵)

(۳) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے کہ۔

محمد بن اسمٰعیل البخاری حدیث کے مشہور ترین مجموعہ کے مصنف بخارا میں ایک ایرانی خاندان میں ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے، اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ احادیث کی نقل و جمع و تحقیق میں کمال حاصل کر چکے تھے، پھر انہوں نے عالم اسلامی کی سیاحت مصر سے سمرقند تک کی، اور روایت ہے کہ ایک ہزار آدمیوں سے زائد سے انہوں نے تین لاکھ حدیثیں صحیح و موضوع سماعت کیں، وہ عقائد میں جمود پسند تھے اور عقلیت کے قائل نہ تھے اور احمد بن حنبل کے دوست اور محترم تھے، فقہ میں وہ اغلباً شافعی تھے سولہ ۱۶ سال کی سیاحت کے بعد وہ بخارا واپس آئے اور جب اپنی "صحیح" تیار کی جو کہ ۷۲۷۵ مستند حدیثوں کا مجموعہ ہے اور ابواب میں اس طرح مرتب کیں کہ بغیر کسی فقہی مسلک کی ماتحتی کے خود ایک فقہ کی بنیاد ہے، ۲۵۶ھ (۸۷۰ء) میں مضافات سمرقند میں خرتنگ میں حالت جلاوطنی میں وفات پائی، "صحیح" کو مسلمانوں میں قرآن کے بعد تقدس حاصل ہے، ان کی قبر ایک زیارت گاہ ہے۔ (جلد ۴ ص ۳۴۷ طبع چہاردہم)

جب وہ اپنے خاندان کے ساتھ حج کو گئے تو بخارا سے مکہ تک راستہ میں برابر حدیثوں کی سماعت کرتے گئے، اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے فن کے مستند امام ہو گئے، ان کا حافظہ اور استحضار اس غضب کا تھا کہ اُن کے معاصرین کو ایک کرامت نظر آتا تھا، اُن کی تربت پر زائرین جوق در جوق جمع ہوتے ہیں اور یقین یہ کیا جاتا ہے کہ وہاں دعائیں کرنے پر قبول ہو جاتی ہیں۔ (جلد ۴ ص ۱۷۲ طبع یازدہم)

(۴) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں ہے کہ :۔

نام محمد بن اسمٰعیل الجعفی ۱۳ شوال ۱۹۴ھ مطابق ۲۰ جولائی ۸۱۰ء کو شہر بخارا میں پیدا ہوئے، دادا ایک ایرانی بردزبہ جعفی تھا، آپ نے فن حدیث کا مطالعہ گیارہ ۱۱ سال کی عمر سے شروع کر دیا، سولہ ۱۶ سال کی عمر میں حج کے لیے گئے اور مکہ اور مدینہ کے بہترین استاذان حدیث سے علم حاصل کیا، پھر طلب علم ہی میں مصر گئے اور آئندہ سولہ ۱۶ سال سارے ایشیا کے دورے میں صرف کیے، ان میں سے پانچ سال کی مدت بصرے میں قیام کیا اس کے بعد وطن واپس آئے اور ۳۰ رمضان ۲۵۶ھ (مطابق ۳۱ اگست ۸۷۰ء) کو وفات پائی، تربت سمرقند سے دو فرسنگ کے فاصلہ پر خرتنگ میں ہے۔ اُن کی شہرت کا غلغلہ "جامع الصحیح" کے نام سے ان کی ایک کتاب حدیث نے بلند کر دیا، یہ کتاب ابواب فقہ کے مطابق تقسیم ہے، انہوں نے

ایک مکمل خاکہ تیار کرلیا تھا، گو ہر عنوان کے تحت ایسی حدیثیں نہ مل سکیں۔

انتخاب احادیث میں انہوں نے انتہائی تنقیدی قابلیت کا ثبوت دیا ہے اور روایتِ متن میں انہوں نے احتیاط کی حد کر دی ہے، اس کے ساتھ وہ جا بجا اپنی توضیح بھی اور تشریح بھی نفسِ حدیث بالکل الگ پیش کرتے جاتے ہیں، صحیح بخاری کی روایتوں کی نقل میں بڑی صحت و اسناد کا اہتمام شروع ہی سے رہا ہے، تاہم قراتوں کا اختلاف ناگزیر تھا اور شرحوں میں اس کی تفصیل موجود ہے، مستند و متداول نسخہ محمد یونینی (م ۶۵۸ھ) کی روایت سے مرتب کیا ہوا ہے، ابن مالک نحوی (م ۶۷۲ھ مطابق ۱۲۷۳ء) کی املا ہے، صحیح بخاری کا ترجمہ و حواشی فرنچ زبان میں موجود ہے، عربی شروح و تفاسیر مشہور ترین ابنِ حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ) کی "فتح الباری" اور محمود بن احمد عینیؒ (م ۸۵۵ھ) کی "عمدۃ القاری" اور احمد ابوبکر قسطلانیؒ (م ۹۲۳ھ) کی "ارشاد الساری" اور زکریا انصاریؒ (م ۹۲۶ھ) کی "تحفۃ الباری" ہیں۔

بخاریؒ نے اپنی "صحیح" کے مقدمہ کے طور پر پہلی بار زیارتِ مدینہ (منورہ) کے موقع پر رجال کی سیر پر ایک کتاب "تاریخ الکبیر" کے نام سے تیار کی تھی، حدیث کے ایک اور مجموعہ "ثلاثیات" اور ایک مشتبہ تفسیر القرآن کے علاوہ ان کی جانب سے ایک اور رسالہ تنویر العینین فی رفع الیدین فی الصلوٰۃ کے نام سے بھی منسوب ہے۔ (جلد ۱ ص ۸۴، ۸۵)

("صدق" لکھنؤ ۱۵ جنوری ۱۹۴۵ء)

(ف) تمام دینی مدارس میں یہ کتاب پڑھائی جاتی ہے۔ اس کی عربی، فارسی، اردو اور دوسری زبانوں میں کئی شروح ہیں جن میں سے اکثر مل سکتی ہیں۔ اکابر علماءِ کرام نے اس کتاب کی تدریس اور تعلیم کو آسان بنانے کے لیے کافی محنت فرمائی ہے۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری (م ۱۲۹۷ھ) نے اس کتاب کا ایسا جامع حاشیہ تحریر فرمایا ہے جو کہ اس کتاب کی تدریس کے لیے کافی ہے۔ اکابر علماء دیوبند میں سے حضرت نانوتوی، حضرت شیخ الہند، علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہم نے اس کی مختصر اور مفصل شروح بھی تحریر فرمائی ہیں، حضرت شیخ الہندؒ کا رسالہ الابواب والتراجم اگرچہ مکمل نہ ہو سکا مگر بقول حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ:-

"اگر چودھویں رات کا چاند نہ بن سکا تو ۲۹ روزہ ضرور ثابت ہوگا"

اس سے علماءِ کرام نے راہنمائی حاصل کی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر کو استاذِ محترم مولانا

بدرِ عالم مہاجر مدنیؒ نے بہ نام "فیض الباری" مرتب فرمایا جو آپ کی حیات ہی میں مصر سے طبع ہو چکی تھی، حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کا درسِ بخاری آپ کے شاگرد مولانا نعمت اللہ صاحب استاذ حدیث دارالعلوم شائع فرما رہے ہیں۔

دوسری کتاب حدیث کی جو دارالعلوم کے شیخ الحدیث پڑھاتے ہیں **سُنن ترمذی** ہے، یہ کتاب کئی علوم پر مشتمل ہے اور علمِ حدیث کے فنی اور تحقیقی لحاظ سے بہت اہم ہے اور اپنی خصوصیات میں دوسری حدیث کی کتابوں سے ممتاز ہے، جیسا کہ:۔

(۱) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ جس راوی سے حدیث روایت کرتے ہیں اُس راوی کا پورا تعارف کرا دیتے ہیں جس سے اس روایت کی صحت اور ضعف کا پتہ چل سکتا ہے۔

(۲) جن روایات سے علماء کرام نے فقہی استدلال کیا ہے اُس کی تائید اور پھر اس پر دوسرے فقہاء کرام کی جرح کو بھی بیان فرما دیتے ہیں، اِس سے حدیث میں فقیہانہ بحث کا علم ہو جاتا ہے۔

(۳) اگرچہ روایت ایک ہی راوی سے بیان فرماتے ہیں مگر اس کے آخر میں دوسرے راوی حضرات کے اسماء گرامی بھی بیان فرماتے ہیں تاکہ سامع اور قاری کو روایت کی حیثیت کا پورا علم ہو سکے۔

(۴) ہر حدیث کے آخر میں اس کے متن یا سند میں اضطراب یا سقم وضعف کو بھی بیان فرما دیتے ہیں۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کو مرتب فرما کر حجاز، عراق اور خراسان کے علماء کے سامنے پیش فرمایا، سب نے بالاتفاق یہ فرمایا کہ:۔

"اِس کتاب میں دو حدیثوں کے سوا کوئی ایسی حدیث نہیں جس پر اُمت کے فقہاء میں سے کسی نہ کسی نے عمل نہ فرمایا ہو۔"

یعنی ترمذی کی تمام روایات صحیح ہیں، اس لیے کسی نہ کسی فقیہہ نے اس سے استدلال کیا ہے، اگر وہ صحیح نہ ہوتی تو استدلال نہ کیا جاتا۔

مفسر القرآن عبداللہ الہروی انصاریؒ نے اس کو بخاری شریف کے بعد دوسری حیثیت سے تسلیم کیا ہے جو کئی لحاظ سے درست ہے۔ اس کتاب کی تعلیم اور تدریس پر ہمارے اکابر نے خصوصی توجہ دی ہے، قطب الارشاد حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ اس کا باقاعدہ درس دیا کرتے تھے، آپ کی مختصر مگر جامع شرح "الکوکب الدری" کے نام سے مطبوعہ ہے جو علماء کرام کے لیے راہنما ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا درسِ ترمذی بھی ممتاز تھا، آپ کے مختصر مگر جامع فوائد ترمذی شریف مطبوعہ

اصح المطابع کے حاشیہ پر درج ہیں حضرت شیخ الہندؒ نے سفر حجاز کے وقت اپنا قائم مقام حضرت علامہ انور شاہ صاحب کاشمیریؒ کو فرمایا اور بخاری و ترمذی کی تدریس ان ہی کے حوالہ کی (حضرت مدنیؒ اس زمانہ میں مسجد نبوی علیٰ صاحبہا التحیۃ وسلاماً میں درس حدیث دیتے تھے) حضرت شاہ صاحبؒ کے استعفے کے بعد حضرت مدنیؒ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تو یہی دو کتابیں آپ نے پڑھائیں۔

حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ کو حدیث اور علوم حدیث وعلم اصول حدیث و دیگر علوم متعلقہ حدیث پر پورا عبور تھا، آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ حسب بیان مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ کو پوری بخاری شریف سنداً و متناً یاد تھی[۱] حضرت مدنیؒ قسطلانی مطبوعہ استنبول سامنے رکھ کر درس بخاری شریف دیا کرتے تھے ــــ آپؒ کے درس بخاری اور ترمذی کی خصوصیات، برکات اور تاثرات کا خلاصہ آپؒ کے جلیل القدر شاگردوں کے قلم سے ہدیۂ ناظرین ہے۔

(۱) درسِ حدیث میں حضرت مدنیؒ کی پرکشش شخصیت

آپ کے تلمیذ رشید شارح بخاری حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہ صدر وفاق المدارس پاکستان شیخ الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی لکھتے ہیں: "یہ حقیقت ہے کہ مجھے فن حدیث سے تعلق اور مناسبت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ کے تلمذ کے طفیل نصیب ہوئی، حضرتؒ کا ترمذی شریف کا درس روزانہ دو اڑھائی گھنٹے اس شان سے ہوتا تھا کہ نظروں کو پھر وہ خوشگوار منظر کہیں دیکھنا نصیب ہی نہیں ہوا۔ وہ شیخ زمانہ جس کی دینی و ملی، سیاسی وسماجی، اصلاحی اور انتظامی اور درسی خدمات کی کوئی حد نہ تھی وہ استقامت کا جبلِ اعظم تھا مسندِ درس کو جب وہ زینت بخشتا تھا تو چہرے پر شگفتگی کے آثار نمایاں ہوتے، شخصیت اس قدر پرکشش اور دلربا تھی کہ دل اُن کی طرف کھچے جاتے تھے، سال بھر درس میں حاضری دینے والے طالب علموں کے لیے حضرت مدنیؒ کی ذاتِ گرامی میں پہلے دن کی طرح نیا پن اور جاذبیت ہوتی تھی، خیال آتا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقوں کی جب یہ شان ہے تو خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا کیا حال ہوگا؟[۲]"

❀

---

[۱] حقائق السنن از شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ (اکوڑہ خٹک) [۲] کشف الباری جلد ۱ ص ۸۲

شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے درسِ بخاری کی جھلکیاں

(۲)

از مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا محمد برہان الدین اسلامی علوم کے مرکزِ تحقیق و تصنیف ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث ہیں، آپ نے ابتدائی علوم محدثِ جلیل شارح حدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی سے پڑھے اور پھر دورہ کی موقوف علیہ کتب دار العلوم میں پڑھنے کے بعد دورۂ حدیث میں شرکت کی سعادت حاصل کی، آپ نے اس مضمون میں اپنے تاثرات کو بیان فرمایا ہے۔ (از مؤلف)

شوال ۱۳۷۶ھ کا تقریباً پورا مہینہ حضرت کی تشریف آوری کے انتظار میں سراپا شوق بن کر گذرا تا آنکہ وہ روزِ سعید آ ہی گیا جو ہم جیسے مہجوروں کے لیے "عید" سے کم نہ تھا کہ اس ماہتابِ علم و تقویٰ کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کرنے کا شرف حاصل ہوا جس کی دید ہلالِ عید سے کم نہ تھی اور پھر پانچ ذیقعدہ کو وہ مبارک گھڑی بھی آ ہی گئی جس کے لیے گھڑیاں گنی جا رہی تھیں، یعنی شیخ الاسلام استاذ العرب والعجم محدثِ جلیل اور جُنیدِ وقت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے مسندِ درس پر جلوہ افروز ہو کر ہم جیسے تہی دامنوں کو مالا مال کرنے کے لیے علم کے موتی اور تحقیق کے لعل و جواہر لٹانے شروع کیے اور اس علم شریف کے آدابِ تعلیم و تعلّم پر ایک مختصر مگر پُر مغز و جامع تقریر کرنے کے بعد دلوں کو موہ لینے بلکہ دلوں میں اُتر جانے والے مؤثر عربی لہجہ اور مترنّم آواز میں یوں لب کُشا ہوئے وبالسند المتصل منا الی الامام الحافظ الحجۃ امیر المؤمنین فی الحدیث ابی عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراھیم بن المغیرۃ بن بردزبۃ الجعفی البخاری رحمہ اللہ تعالیٰ و نفعنا بعلومہ۔ امین۔ ہر سبق کی ابتداء میں ہر قاری کے لیے خواہ حضرت خود ہوں یا کوئی طالب علم، اس پوری عبارت کا پڑھنا ضروری تھا، اس میں تخلف نہ ہوتا۔ اسی طرح ہر قاری کے لیے یہ ادب بھی ضروری قرار دیا کہ سند کے اختتام پر راویٔ حدیث صحابی کا نام آئے تو رضی اللہ عنہ و عنہم پڑھے تاکہ اس دعا میں صحابی کے ساتھ دوسرے رواۃ بھی شامل ہوں۔ اس کی حکمت

بیان کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اس طرح قاری بھی رحمت و برکت کا مستحق بن جائے گا۔ سبق شروع ہونے سے پہلے دورۂ حدیث کے طلبہ میں سے ایک طالب علم حضرتؒ کے دولت کدہ سے کتابوں کی ایک عظیم تعداد لاکر حضرتؒ کی مسند درس پر لگادیتا، کیونکہ بوقتِ ضرورت دورانِ درس کبھی کبھی موصوف ان کتابوں سے عبارتیں بطور حوالہ واستناد پڑھ کر سُناتے۔

اکثر طلبہ حضرت کی درسی تقریر قلمبند کرتے جن میں یہ راقم آثم بھی تھا، (چنانچہ آگے اس درس سے جو اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں وہ اپنے قلمبند کردہ ذخیرہ ہی سے ماخوذ ہیں)۔

اسلافِ کرام کے طریقۂ تدریس کے مطابق شیخ الاسلام نوّر اللہ مرقدہٗ کتاب شروع کرانے سے پہلے علمِ حدیث کے مبادی ومتعلّقات نیز اس کی فضیلت بیان فرماتے تھے، اسی ذیل میں فضیلتِ حدیث بیان کرتے ہوئے قرآنِ مجید کی آیت اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (آل عمران ۳۱) کی تلاوت وتفسیر کی اور فرمایا کہ ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ پیارے پیغمبر ہیں، آپ کی ہر چال ڈھال اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے، اِسی لیے تو فرمایا اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ..... الخ اس لیے کہ محبوب کی نقل بھی محبوب ہوتی ہے“! مزید فرمایا کہ اُمتِ محمدیہ کو یہ شرف بخشا گیا کہ اللہ تعالیٰ خود ان کا عاشق ہے، عاشق کو معشوق کی خطائیں قابلِ مواخذہ نہیں معلوم ہوتیں، اسی لیے آخر میں وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ فرمایا۔ پھر موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ارشاد ہوا کہ ”: اس تمام شرف وبزرگی کا ذریعہ صرف علمِ حدیث ہے، اس لیے اس کی اہمیت کس قدر بڑھ جاتی ہے، حدیث شریف میں ہے: اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِیْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَکْثَرُھُمْ عَلَیَّ صَلٰوۃً (او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام) اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ اشرف علوم ہے کیونکہ اس میں ذکرِ خیر نبیٔ کریم علیہ التحیۃ والتسلیم ہوتا ہے اور ہر مرتبہ نام آنے پر درود شریف پڑھا جاتا ہے تو اس طرح اکثرھم علیّ صلوٰۃ بھی محدثین ہی ہوئے، ایسلئے کہ کسی اور علم میں اتنا درود نہیں پڑھا جاتا“۔ اس کے بعد کیا خوب اور پتہ کی بات فرمائی ”: اسی سے اندازہ لگائیے کہ دار العلوم دیوبند میں جب ہر وقت حدیث کی کتابیں پڑھی جاتی رہتی ہیں تو کس قدر یہاں بارشِ رحمتِ خداوندی ہوتی رہتی ہے، پھر اسی طرح کثرتِ درود کی بنا پر سب سے زیادہ قرب دار العلوم ہی کو آنحضور سے ہے“! (واضح رہے کہ راقم نے پوری کوشش کی تھی کہ یہ درسی تقریر حضرتؒ ہی کے الفاظ میں قلم بند ہو)

حضرت اقدس نوراللہ مرقدہٗ یوں تو سب ہی کے لیے ہمہ وقت سراپا شفقت و رحمت تھے لیکن دورانِ درس یہ صفت اپنے منتہیٰ کو پہنچتی نظر آتی تھی، بالخصوص طلبہ کے لیے کہ ان کے ہر جا و بے جا سوالات نیز تُک اور بے تُک کے اعتراضات کے جوابات نہایت ہی انبساط اور خندہ پیشانی کے ساتھ دیتے اور بیچ بیچ میں کبھی کبھی کسی خوش نصیب سے مزاح بھی فرمالیتے، خاص طور پر رات کے وقت سبق پڑھاتے ہوئے یہ وصف اتنا بڑھ جاتا کہ تھوڑے وقفہ کے بعد مجلسِ درس قہقہہ زار بن جاتی، خاص طور پر جب کسی طالب علم کے بارہ میں حضرتؒ کو مطلع کیا جاتا یا وہ خود دیکھ لیتے کہ فلاں اُونگھ یا سو رہا ہے تو حضرتؒ نہایت ظریفانہ انداز میں بآوازِ بلند اُس طالب علم کا نام لے کر مخاطب فرماتے اور حکم دیتے کہ اٹھئے، جائیے وضو کیجئے، اگر کوئی زیادہ گہری نیند میں ہوتا تو اُسے صدر النائمین جیسے القاب سے بھی یاد کیا جاتا، اس طرح دوسرے اونگھنے یا سونے والے بھی پوری طرح چوکنا اور بیدار ہو جاتے اور گویا السعید من وعظ بغیرہ کا مصداق بن جاتے۔

حضرتؒ کا یہ اندازِ بے تکلفی بسا اوقات اتنا زیادہ ہو جاتا کہ تھوڑی دیر کیلئے اس بات کے ذہول کا خطرہ ہو جاتا کہ یہی عظیم الشان اور جلیل القدر ہستی ہے جس کی عظمت کے سامنے بڑے بڑے فضلائے روزگار سر جھکاتے ہیں، یہ سب کچھ سُنّتِ نبوی کی پیروی کے جذبہ کے ساتھ! یہ اس لیے بھی تھا تاکہ طلباء میں انبساط رہے اور تکلّف و رعب کا حجاب استفادہ و سوالات سے مانع نہ بن جائے۔

آنحضرت کے خادمِ خاص یعنی صحابیٔ رسول حضرت انسؓ نے اللہ کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے یہ عادات و خصائل بیان فرمائے ہیں کان یمازح اصحابه ویخالطهم ویحادثهم ویداعب صبیانهم (السیرة النبویه للشیخ ابی الحسن علی الحسنی الندوی ص۳۶۶ بحواله الحلیة لابی نعیم)

ایک دوسرے صحابی حضرت عبداللہ بن الحارثؓ فرماتے ہیں ما رأیت اکثر تبسّمًا من رسول الله صلّی الله علیه وسلّم..... فکان اصحابه ینا شدون الشعر ویتذاکرون اشیاء من امر الجاهلیة وهو ساکت وربما تبسم معهم (شمائل ترمذی مع الخصائل ص۱۳۷)

اور خود آنحضرت (صلّی اللہ علیہ وسلّم) سے بطور استشہاد شعر پڑھنا بھی ثابت ہے۔ جیسا کہ خلوت و جلوت کی رازداں ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ نقل فرماتی ہیں کان یتمثل من شعر عبد الله بن رواحة ؎

ویاتیك بالاخبار من لم تزود (الادب المفرد ص۱۲۷ للبخاری)

حضرتِ مدنیؒ بھی بسا اوقات دورانِ سبق بطور استشہاد شعر پڑھا کرتے۔ حضرتؒ کو عمدہ اشعار بہت یاد تھے اور نہایت برمحل سُناتے تھے۔

باب خوف المومن ان یحبط عملہ وھو لا یشعر کے تحت امام بخاریؒ نے مشہور تابعی حضرت ابن ابی ملیکہ کا یہ قول نقل کیا ہے: ادرکت ثلاثین من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلھم یخافون النفاق علی نفسہ (بخاری ۱/۱۲) حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشریح فرماتے ہوئے صحابۂ کرامؓ کے مذکورہ خوف کی توجیہہ کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا ؎

ما می پروریم دشمن و مامی کشیم دوست

کسے را نہ رسد چون وچرا در قضائے ما

حضرتؒ کو مشکل احادیث کی ایسی توجیہہ کرنے کا ملکہ تامہ حاصل تھا جس سے اشکال رفع ہو جائے اور طالب علم کو بھی پورا انشراح ہو جائے، یہاں صرف ایک مثال از راہِ اختصار پیش کی جا رہی ہے:۔

بخاری کی روایت میں آتا ہے کہ بعض صحابۂ کرامؓ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات کی تفصیل جاننے کے بعد ایک خاص پس منظر میں یہ کہا انا لسنا کھیأتك یارسول اللہ اِنَّ اللہَ قَدْ غفر لكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (بخاری ج۱ ص۷) یہ مضمون دراصل قرآنِ مجید کی (سورۃ الفتح کی ابتدائی) آیت سے ماخوذ ہے۔ اس پر مشہور اشکال وارد ہوتا ہے کہ جب اللہ کے رسول معصوم ہیں تو پھر غفر لكَ اور ذنبك کا سوال ہی کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ اس کے جوابات یوں تو بہت سے دیئے گئے ہیں (اور خود حضرتؒ نے بھی کئی جوابات دیئے) لیکن ایک جواب ایسا عمدہ اور انوکھا دیا کہ یہ اشکال بالکل رفع ہو جاتا ہے، وہ یہ کہ "غفران" کے معنی ستر (چھپانے) کے ہیں اور "غفار" کے معنی ستار (چھپانے والا) تو لیغفر لك اللہ کے معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ساتر ہوتا ہے (مانع ہو جاتا ہے) بین الذنب و بین النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی ذنب کو نبی تک نہیں پہنچنے دیتا، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے[1] میں قرآنِ مجید میں ذکر کیا گیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے لیے تو اللہ تعالیٰ بین الذنب والنبی ساتر ہوتا ہے اور غیر نبی کے لیے بین المذنب والجزاء، تو یہاں یہی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو گناہ تک پہنچنے نہیں

---

[1] سورۃ یوسف آیت ۲۴: وَكَذٰلِكَ لنصرف عَنْهُ السُّوْٓءَ والفحشاء اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝

دے گا۔" اس جواب کی لذت اور اطمینانی کیفیت آج بھی تازہ معلوم ہوتی ہے۔

سب واقف جانتے ہیں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بحرِ تصوف و احسان کے کیسے شناور تھے، تو جب کسی حدیث میں ایسا کوئی پہلو نکلتا جس سے تصوف و احسان کا اثبات ممکن ہوتا تو حضرتؒ کی تقریر کی روانی اور طبیعت کی جولانی دیدنی ہوتی، ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے عنبر (مچھلی) کو تیرنے کے لیے دریا مل گیا ہو، یا شاہین کو کھلی فضا۔ چنانچہ ایک مشہور حدیث، جسے اہلِ علم "حدیثِ جبریل" کے نام سے جانتے ہیں، کی تشریح کے وقت طلبہ کو ایسا لگا کہ "بلبل چہک رہا ہو جیسے گلشن میں"۔

نامناسب نہ ہوگا اگر اجتماع کے سامعین تھوڑی دیر اس کوچہ کی بھی سیر کرلیں۔ مذکورہ بالا حدیث کے جزو فان لم تکن تراہ کی توجیہات بیان کرتے ہوئے فرمایا: "تیسری توجیہ یہ ہے کہ لم تکن" میں کان تامہ مراد لیا جائے یعنی فنا کا مرتبہ حاصل ہوجائے تو اللہ کو دیکھ لے گا۔ یعنی قوتِ متخیلہ سے جب تمام چیزوں کا شعور جاتا رہے بلکہ خود اپنی ذات کا بھی شعور جاتا رہے، یعنی کثرتِ ذکر سے وہ مرتبہ حاصل ہو جائے کہ شعور نہ ذکر کا رہے اور نہ ذاکر کا بلکہ صرف مذکور (اللہ تعالیٰ) کا شعور رہے، اسے "فناء الفنا" کہتے ہیں۔ یہی مرتبہ منصور کو حاصل ہو گیا تھا جو انا الحق کا نعرہ لگانے لگے تھے، یہ حقیقتاً نہ تھا بلکہ غلبہ کی کیفیت تھی (اس کی وضاحت کے لیے ایک مثال بھی بیان فرمائی) نیز ایک اور حدیث صحیح اس کی تائید میں ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "اس لیے تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ بندہ نوافل سے ایسی ترقی کرلیتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اتنا قرب حاصل ہوجاتا ہے کہ اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ اس لیے منصور انا الحق کہنے کے باوجود عبادت کرتا تھا اس میں کمی نہیں آتی تھی۔۔۔۔ ایسی حالت آجانے پر اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی اس طرح ناز برداری کرتا ہے جس طرح باپ بچہ کی"۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ دورانِ درس دلچسپ حکایات اور تاریخی واقعات سے بھی محظوظ فرماتے، چنانچہ ایک روز ہارون رشید اور اس کی بیوی زبیدہ سے متعلق ایک دلچسپ تاریخی واقعہ سنایا جو مامون کی پیدائش کا ظاہری سبب بنا کہ پھر زبیدہ کو ساری عمر افسوس رہا۔

درسِ حدیث کی ایک اہم خصوصیت بلکہ ضرورت، مختلف اور بظاہر متعارض احادیث کے درمیان تطبیق و توفیق بھی ہے، کیونکہ اختلاف کو من عند غیر اللہ ہونے کی علامت قرآن مجید ہی میں بتایا گیا ہے (وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (النساء ۸۲)) اس لیے نبوت کی عصمت کا

تقاضا اور وحی کے من اللہ ہونے کا امت کے خواص پر یہ حق ہے کہ تعارض واختلاف اگر نظر آتا ہو تو وہ دور کیا جائے، چنانچہ علمائے امت بالخصوص فقہائے کرام اور شرّاح حدیث نیز اساتذۂ فن نے ہمیشہ اپنی فہم داری سے بطریق احسن عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے اور یہ کہنا غالباً مبالغہ نہیں ہوگا بلکہ حقیقت کی سچی ترجمانی ہوگی کہ دارالعلوم کی تدریسی خصوصیات وامتیازات میں سے ایک یہ ہے کہ یہاں اس امر کا اہتمام سب سے زیادہ ہوتا ہے، چنانچہ حضرت قدس سرہٗ کے درس میں بھی یہ پہلو بہت نمایاں ہوتا تھا، اسکی بابت بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مگر اختصار کی غرض سے یہاں صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

بخاری جلد ثانی کی ایک روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن غزوات میں شرکت فرمائی اُن کی جو تعداد بتائی گئی ہے وہ دوسری معتبر کتب حدیث وسیرت میں بیان کردہ تعداد سے بہت مختلف ہے ــ حضرت علیہ الرحمۃ نے روایات سے رُونما ہونے والے اس اختلاف کو یوں رفع فرمایا، اس حدیث (بخاری ثانی کی روایت) سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۹ غزوات میں شرکت فرمائی اور اس سے پہلے مذکور ہوا کہ ۲۷ غزوات میں آپ نے شرکت فرمائی ــ تو اس میں بظاہر تخالف ہے لیکن حقیقتاً تخالف نہیں، کیونکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ کے لیے نکلے لیکن اس سفر میں کئی کئی غزوات میں شرکت کی، تو بعض لوگوں نے ان سب کو ایک ہی شمار کیا۔ جیسے کہ فتح مکہ کے سال چار غزوات بنی ثقیف، حنین، خیبر، مکہ، یہ چار لڑائیاں ہوئیں لیکن بعض نے اُن کو ایک ہی شمار کیا، تو اس طرح کُل غزوات کی تعداد ۱۹ ہوتی ہے اور جو ان کو چار شمار کرتا ہے (اس کے علاوہ دوسرے مواقع پر بھی اسی طرح کی صورتحال میں ــ یہی طرز اختیار کرتا ہے) تو تعداد ۲۷ ہو جاتی ہے،،

یہ تو اس اختلاف کے رفع کرنے کی مثال ہوئی جو راویوں کی بناء پر پیدا ہوا، اس کے علاوہ ایسے اختلافات بھی روایات، احادیث میں بہت کافی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل یا قول کے بارے میں نقل ہوئے ہیں اُن میں باہم تطبیق وترجیح ہی دراصل ائمہ وفقہاء کے مسالک میں اختلاف کا سبب بنی ہے اور جو محدث وفقیہ یا مدرس واستاذ جس امام کا مسلک اختیار کرتا ہے وہ اسی کو راجح دیانۃً بھی سمجھتا ہے اور دلائل سے ترجیح جبکہ مختلف روایات کے درمیان تطبیق ممکن نظر نہ آتی ہو، دیتا ہے، اس کی مثالیں دینے کی یہاں چنداں افادیت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ وہ عام طور پر معلوم ومشہور ہیں۔ (نور اللہ مرقدہٗ)

ف:۔ سابقہ درسِ حدیث کے روحانی، علمی، ایمانی منظر میں گذر چکا ہے کہ بعض طلباء دورۂ حدیث "ٹُھک بے ٹک" کے سوالات بے تکلف کر دیتے تھے، اس کی ایک مثال درج کی جاتی ہے:۔

بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ شیخ دُور و دراز کے پُرمشقت سفر سے تھکے ہارے واپس آتے اور تھوڑی دیر بھی آرام کیے بغیر دارالعلوم آ جاتے، گھنٹہ بجتا، طلباء جمع ہو جاتے اور سبق شروع ہو جاتا ـــــ حیرت کی کچھ یہ بات نہیں ہے کہ شیخ اس طرح اَنتھک محنت کیونکر کر لیتے تھے اور بسا اوقات ۲۴ گھنٹوں میں صرف ۳ ، ۴ گھنٹے آرام کر کے بقیہ ۲۰ ، ۲۱ گھنٹے مسلسل کام کر لیتے تھے کہ یہ مجاہدہ شیخ کی ذاتی کرامت قرار پائے گا، اور جہاد بالنفس تو اللہ والوں کا کام ہے ہی، حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ وہ طالب علم کس مٹی کے بنے ہوئے تھے جو گرمیوں کے دنوں کی لُو اور جھلسا دینے والی دھوپ کے بعد آنے والی راتوں کی ٹھنڈی ہواؤں کو نظر انداز کر کے اور جاڑوں کے گرم گرم لحافوں کو چھوڑ کر آنکھیں ملتے اور نیند کو بھگاتے ہوئے گھنٹے کی آواز سنتے ہی شیخ کے درس میں حاضر ہو جاتے تھے ـــــ شیخ تو اپنے احساسِ فرض و ذمہ داری سے مجبور ہو کر اپنے آرام کو تجتے تھے لیکن اُن کے شاگردوں کے دل میں کونسا جذبہ کار فرما تھا کہ وہ اپنے شیخ کی آمد کی اطلاع پاتے ہی کچی نیندوں سے جاگ کر دوڑتے بھاگتے درسگاہ میں پہنچ جاتے تھے۔ ایسا ہونا بلکہ بار بار ہوتے رہنا کیا اس بات کی غمازی نہیں کرتا کہ شیخ کے شاگردوں کو اپنی میٹھی میٹھی نیند سے بھی زیادہ اپنے شیخ کی زیارت، اُن کی مصاحبت اور اُن کے درس میں شرکت محبوب تھی۔

اسی طرح ایک دن دن کے بارہ ۱۲ بج چکے تھے اور حضرت کی تقریر جاری تھی، طلبہ گوش بر آواز تھے اور حضرت بھی پورے انہماک کے ساتھ حدیث پر کلام فرما رہے تھے، گھڑی کی سوئیاں جُوں جُوں آگے بڑھ رہی تھیں ہمارے ایک طالقانی ساتھی کی بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی لیکن ہم میں سے کسی کو اس کا احساس نہ تھا۔ جب اس حدیث پر کلام ختم کرنے کے بعد حضرت نے تلاوتِ حدیث کرنے والے طالب علم کو آگے بڑھنے کا حکم دیا تو طالقانی ساتھی نے اپنی گرجدار آواز میں شیخ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "سبق بند کرو"۔ شیخ کے ساتھ تمام طلباء کی نگاہیں بھی طالقانی کے چہرے پر جم گئیں، ایک طرف طلباء کے چہروں سے طالقانی کی اس گستاخی اور حد سے بڑھی ہوئی جرأت پر ناگواری کے آثار نمایاں تھے تو دوسری طرف حضرت شیخ الاسلام کا چہرہ ہر قسم کی ناگواری و گرانی کے تاثر سے پاک، بلکہ ردّ عمل یہ کہ

شیخؒ نے مسکراتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں طالقانی سے سوال کیا "سبق کیوں بند کروں"؟
طالقانی ناسمجھ نہ تھا وہ اپنے شیخ کی عظمت سے بھی بے خبر نہ تھا نہ ہی اُس کی اس "جرأت رندانہ" کے پس پردہ گستاخی کا کوئی جذبہ کارفرما تھا بلکہ وہ اپنے شیخ کا مزاج آشنا تھا، اسی لیے اُس نے طلبہ کی گھورتی ہوئی نگاہوں کی پرواہ کیے بغیر شیخ کے استفسار کے جواب میں اسی کرٹک کے ساتھ کہا "ہم بھوکا ہے"۔
شیخ نے اپنی مسکراہٹ کچھ اور گہری کرتے ہوئے فرمایا "میں بوڑھا آدمی ہوکر بھوکا بیٹھا پڑھا رہا ہوں، تم جوان ہوکر بھوکے نہیں پڑھ سکتے"؟
طلبہ نادم و شرمسار مگر شیخ کے لحاظ میں طالقانی کو روک بھی نہیں سکتے تھے ___ لیکن طالقانی کو بھی حال دل سُنانے کا بہترین موقع ملا تھا، پھر بھلا وہ طلبہ کی برہمی کو خاطر میں لاکر "شیخ کی عنایتوں" سے اپنے کو محروم کیوں کرتا؛ طالقانی نے شیخ کے جواب میں کہا "تم صبح اچھا اچھا ناشتہ کرکے گھر سے آتا ہے ہم صبح سے بھوکا پڑھتا ہے"، طالقانی کا جواب سُنکر شیخ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، کتاب بند ہوگئی اور سبق ختم ہونے کا اعلان کردیا گیا ___ پھر شیخ اپنے ساتھ اس طالقانی طالب علم کو مدنی منزل لے گئے، اس کو اپنی خصوصی نگرانی میں کھانا کھلایا اور تاکید کے ساتھ یہ حکم فرمایا کہ کل سے تم صبح کا ناشتہ میرے ساتھ ہی کروگے"۔ (حیات و کارنامے ص۴۴۰)
شبانہ درس بخاری شریف کا ایک اہم واقعہ از قلم مولانا سیّد محمد انظر شاہ کاشمیری تلمیذ رشید حضرت مدنیؒ کے قلم سے ملاحظہ ہو۔
"بخاری شریف کا سبق سال کے آدھے حصے میں شب میں بھی ہوتا اگرمیوں کی مختصر راتیں اور شب کی مشغولیت کی بناء پر کچھ طلبہ مصروف خواب ہوتے، قریب کا کوئی طالب علم حضرتؒ کو مطلع کرتا تو ایک خاص لہجے میں رئیس النائمین کو ارشاد ہوتا کہ اُٹھئے اُٹھئے مٹکے میں غوطہ لگا کر آئیے، غریب طالب علم اپنی جگہ سے اٹھتا تو اس کے عقب سے مزید یہ جملہ ہوتا کہ ہائے کیا بھری مجلس میں رسوائی ہوئی اس پر پوری درسگاہ زعفران بن جاتی۔
اتفاقاً ایک روز ایسا ہی خود حضرت والا کو بھی پیش آگیا۔ ہوا یوں کہ ایک طویل سفر سے واپسی کے بعد فوراً ہی درسگاہ میں تشریف لے آئے، سفر کی صعوبتوں کی بناء پر نیم جان ہو رہے تھے (جبکہ عمر مبارک بھی ستر سال سے زیادہ کی تھی) چند ہی منٹ اس قرینے و سلیقے سے بیٹھے بیٹھے مصروف خواب ہوگئے کہ جسم

میں جُنبش کا نام و نشان نہ تھا، معمول یہ تھا کہ حدیث پر کچھ ارشاد فرمانا ہوتا تو تقریر شروع ہو جاتی اور اگر سابق میں یہ مضمون گذر چکا ہوتا تو فرماتے "چلئے" اور اس روز حدیث ہوتی رہی اور حضرتؒ کا مسلسل سکوت! طلبہ محسوس کر گئے کہ حضرتؒ مصروف خواب ہیں، قرأت روک دی گئی تاکہ آپ کے آرام میں خلل نہ آئے، پھر اس سکوت پر حضرتؒ بیدار ہو گئے، طلباء کا بھی اصرار تھا کہ حضرت والا ابھی اُٹھ کر وضو فرمائیں، بہت دیر ردّ و قدح ہوتی رہی بالآخر کھانے کی دعوت پر اس دلچسپ جنگ کا اختتام ہوگیا" (حیات و کارنامے صـ۲۴۲)

از مؤلف ① یعنی حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے سب طلبائے دورۂ حدیث کی کھانے کی دعوت فرمائی۔

② اس قصّہ میں ایک طالقانی طالب علم کا ذکر آتا ہے، طالقان تہران کے قریب ایک چھوٹے سے قصبے کا نام ہے۔

روایاتِ حدیث میں طالقان کا ذکر ملتا ہے۔

سنن ابی داؤد کے باب فیمن لم یوتر کی پہلی روایت یوں ہے: حدثنا ابن المثنیٰ حدثنا ابو اسحٰق الطالقانی حدثنا الفضل بن موسیٰ بن عبید اللہ بن عبد اللہ العتکی عن عبد اللہ بن بریدہ عن ابیہ رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول الوتر حق فمن لم یوتر فلیس منا (ثلٰثۃ مرۃ) الحدیث۔[1]

---

[1] سنن ابی داؤد صـ۲۰۸

حضرت شیخ الاسلام مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی

تدریسی خصوصیات

(۳)

از قلم مولانا الحاج حافظ محمد عبدالقدوس صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ

صاحبِ مضمون کا مختصر سا تعارف

حضرت مولانا عبدالقدوس صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے علم و عمل کی اس دولت سے نوازا ہے جس سے ہم جیسے گنہگار تہی دامن ہیں علوم اسلامیہ میں فاضل دیوبند ہیں اور اپنی خداداد ذہانت اور بے نظیر قابلیت کی بناء پر علوم عصریہ میں اعلیٰ سندات حاصل کیں اور ملک کی عظیم یونیورسٹی (پشاور یونیورسٹی) میں شعبۂ اسلامیات کی بھی صدارت کو زینت بخشی، مولانا کے تبحر علمی، تقویٰ اور انتظامی صلاحیت کے پیشِ نظر حکومتِ پاکستان نے آپ کو وفاقی شرعی عدالت کا جسٹس مقرر فرمایا اور اسی عہدہ پر فائز رہ کر ملی اور قومی خدمات سرانجام دیتے ہوئے مورخہ ۲۷ رمضان ۱۴۰۸ھ ۱۴ مئی ۱۹۸۸ء کو واصل باللہ ہوئے۔ آپ کا یہ گرانقدر مضمون ماہنامہ "الارشاد" اٹک شہر کے مدنی نمبر (ربیع الاول ۱۳۹۸ھ مطابق فروری ۱۹۷۸ء) طبع ہوا تھا، اس کی افادیت کے پیشِ نظر "چراغ محمد" میں درج کیا جاتا ہے۔

سیدی و شیخی حضرت شیخ الاسلام و شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ بابرکات مجمع کمالات تھی، ان کی شخصیت تاثر و مشاہد کے قلب و بصر پر ان کے کمالات کا سکہ بٹھا دیتی تھی، ان کے تلامذہ اور متوسلین میں کافی صاحبِ استعداد ہستیاں ایسی ہیں جنہوں نے ان کے اثرات بوجہ اتم قبول کر لیے تھے اور انہی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ حضرتؒ کی خصوصیاتِ درس کا ایک عمدہ خاکہ کھینچ لیں، مجھ جیسے کم سواد اور بے بضاعت کا یہ منصب نہیں کہ وہ حضرتؒ کے درس کی خصوصیات کا استقصاء کر سکے تاہم حضرت قاضی صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں یہ سطور حوالہ قرطاس ہیں کہ مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ۔

حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ دورۂ حدیث میں سے صحیح بخاری اور جامع ترمذی کا درس دیا کرتے تھے۔ ہماری قدیم درسگاہوں میں ان دو کتابوں کو حدیث کی دوسری کتابوں کے درس پر فوقیت حاصل ہے کہ اس کے بارے میں اہلسنت

کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ھُوَ اَصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابِ اللہ (دنیا بھر کی تمام کتابوں میں قرآنِ کریم کے بعد صحیح ترین کتاب صحیح بخاری ہے) فوقیت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے احادیث سے مسائل کے استنباط و استدلال کی جو دقیق راہیں پیدا کی ہیں اُن کی وجہ سے اس کتاب کو پڑھنے والا فقاہت سے بھی کافی مناسبت پیدا کر لیتا ہے ان کے علاوہ بھی اور کئی وجوہ ہیں جن کی بناء پر صحیح بخاری کی فوقیت مُسلّم ہے۔

جامع ترمذی صحتِ اسانید کے لحاظ سے سُنن ابو داؤد اور سُنن نسائی کے بعد شمار ہوتی ہے لیکن مذاہبِ فقہیہ کا بیان جس واضح انداز میں امام ترمذیؒ نے کیا ہے صحاحِ ستہ میں سے کسی دوسری کتاب کے مؤلف نے نہیں کیا، اس لیے مذاہبِ فقہیہ کے دلائل و شواہد کے بیان کے لیے اکابر نے جامع ترمذی کا درس زیادہ مفید سمجھا ہے۔ حنفی مسلک کے علماء یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ایسے مواقع پر جہاں کہ مصنف کی روایت کردہ احادیث سے حنفی مسلک ثابت نہ ہوتا ہو وہ احادیث اور دلائل بھی دیئے جائیں جن کی بناء پر حنفی مسلک کو ترجیح حاصل ہے اور یہ کام ماہر عالم اور استادِ فن کا ہوتا ہے اس لیے ہر درس گاہ کے شیخ الحدیث کا یہ منصب ہوتا ہے کہ وہ جامع ترمذی کا درس دے اور حنفی مسلک کے نقطۂ نظر کے مطابق اس کتاب کی مشکلات حل کر دے۔

دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث کے منصب پر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ، اُن کے بعد حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے بعد شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فائز رہے ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کا طرزِ تدریس (مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کے تتبع میں) یہ تھا کہ کتاب ہموار پڑھائی جائے حدیث کی مناسب تشریح ہو جائے اور حنفی مسلک کے مطابق احادیث کی مختصر توجیہیں بیان کی جائیں اس کا اندازہ حضرت قطب الارشاد مولانا گنگوہیؒ کی اُس تقریر سے ہو سکتا ہے جو حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی نے ضبط کی تھی یعنی الکوکب الدُّری جو حضرت شیخ الحدیث کاندھلوی مد اللہ ظلالہم کے حواشی کے ساتھ چھپ چکی ہے) اور ایک اندازہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی اس تقریر سے بھی ہو سکتا ہے جو جامع ترمذی مطبوعہ اصح المطابع کے ساتھ بطور ضمیمہ کے چھپ چکی ہے۔

حضرت کشمیریؒ نے طرزِ درس کو بدل دیا تھا جن مسائل میں فقہی مسالک متعدد ہوتے ہیں اور ہر فریق اپنی سند میں احادیث بطور استدلال پیش کرتا ہے اور جو حدیث اس مسلک کے مخالف پیش ہو سکتی ہو اس کی توجیہہ یا تضعیف کرتا ہے وہاں مسئلہ طویل الذیل ہو جاتا ہے، ایسے طویل الذیل مسائل میں حضرت شاہ صاحب حوالوں کی کثرت کے ساتھ مسائل اسناد پر بھی بحث فرماتے اور حنفی مسلک کی تائید میں دلائل و شواہد جمع فرما دیتے تھے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں درس کی یہ دونوں خصوصیتیں موجود تھیں، اس اجمال کی

تفصیل حسب ذیل ہے :۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "انفاس العارفین" میں (بہ ذیل حالاتِ شیخ حسن عجمی) فرماتے ہیں کہ علماء حرمین درسِ حدیث تین طریق پر دیا کرتے تھے :۔

اولاً طریقِ سَرد کہ شیخ مُسمِع یا تلامذہ کتاب کی تلاوت کرتے رہیں اور مباحث لغویہ و فقہیہ و مباحثِ سند کی طرف کوئی تعرض نہ کیا جائے۔

ثانیاً طریق بحث و حل کہ قرأتِ حدیث کے بعد مشکل لفظ یا مشکل ترکیب پر اور سند کے ایسے راوی پر جس کا ذکر کم آتا ہو بحث کی جائے، جو سوال خود بخود پیدا ہو تا نظر آتا ہو اس کا جواب دیا جائے، اس طرح متوسط درجہ کے حل کے ساتھ درس کو آگے بڑھا دیا جائے۔

ثالثاً طریق امعان و تعمق کہ ہر کلمہ کے مالہا و ماعلیہا و مایتعلق بہا پر بہت کچھ کہا جائے مثلاً مشکل لفظ یا مشکل ترکیب کیلئے شعراء کے کلام سے شواہد پیش کیے جائیں، لفظ کے ہم مادہ دوسرے الفاظ اور ان کا محلِ استعمال ذکر ہو۔ (وغیرہ وغیرہ)

حضرت الشیخ المدنی رحؒ نے سالہا سال مسجدِ نبوی میں درس دیا تھا اور برخلاف دیگر مدرسین حرم کے آپ کے حلقۂ درس میں خواص یعنی علماء کی کثرت ہوتی تھی۔ چنانچہ الجزائر کی جمعیۃ العلماء کے صدر اور حضرت الشیخؒ کے تلمیذِ مکرم مولانا البشیر الابراہیمی مرحوم کا ایک مضمون راقم الحروف نے غالباً مکہ مکرمہ کے مجلّہ الحج میں پڑھا تھا، لکھا تھا کہ جب میں نے علم کی تلاش میں الجزائر سے مصر و حجاز کا سفر اختیار کیا تو میں نے ان بلاد میں صرف دو عالم ایسے پائے جن کے علم کی گہرائی سے میں متاثر ہوا اور جن سے میں نے استفادہ کیا، ایک مصر میں شیخ سید خضر حسین جو بعد میں شیخ الازہر بھی بنے تھے اور دوسرے مدینہ منورہ میں سید حسین احمد فیض آبادی۔ (مدینہ منورہ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ فیض آبادی کی نسبت سے معروف تھے)۔

مدینہ منورہ میں حضرت الشیخؒ کا طرزِ تدریس امعان و تعمق کا ہی ہوا ہوگا، یہی طرز دار العلوم دیوبند میں حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ نے اختیار کیا تھا، اس کے برعکس حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان کی روایت کے مطابق درسِ حدیث کا سلسلہ بحث و حل کے انداز میں جاری رہتا تھا۔

حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ سال کے ابتداء میں (تقریباً چھ ماہ تک) الطریق امعان و تعمق حدیث کا درس دیا کرتے تھے، پھر سال کے آخری تین چار مہینوں میں بحث و حل کے طرز پر اکتفاء کیا کرتے تھے بلکہ بالکل آخری دنوں میں تقریباً

سَرد کے طرز پر صحیح بخاری شریف کو اختتام تک پہنچا دیا کرتے تھے۔

حدیث کے سماع کے دو طریقے محدثین کے ہاں رائج تھے۔ سماع عن الشیخ اور قراءۃ علی الشیخ جن کا باہمی فرق محدثین حدثنا اور اخبرنا کے صیغوں سے کیا کرتے ہیں۔ حضرتِ مدنیؒ کے ہاں یہ دونوں طریقے رائج تھے، سال کی ابتداء میں عموماً تلامذہ میں سے کوئی تلمیذ حدیث پڑھتا اور حضرتِ مدنیؒ حدیث کی تشریح فرمادیا کرتے تھے اور اواخر سال میں خصوصاً بعد العصر اور بعد العشاء کے اوقات میں حضرتِ مدنیؒ خود قراءتِ حدیث کرتے اور شاگرد سُنتے رہتے اور اپنی اپنی کتابوں پر نظر جما کر حضرتؒ کے ساتھ ساتھ چلتے۔

اب میں حضرتِ مدنیؒ کے درس کی چند وہ خصوصیات درج کرتا ہوں جن کی وجہ سے حضرتؒ کا درس تلامذہ پر عمیق اثر چھوڑ جاتا تھا اور جو خصوصیات اُن کی ذات کے ساتھ ختم ہوگئیں۔

(۱) حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات میں وقار اور تواضع دونوں کا اجتماع تھا اس لیے اُن کے درس میں شاگرد ادب و احترام کے ساتھ ہمہ تن متوجہ بھی رہتا تھا اور اگر اُس میں یہ ہمت ہوتی کہ تلامذہ کے عظیم مجمع (تقریباً دو سو کے مجمع) میں زبان کھول سکے تو حضرتؒ کی ہیبت تشفّی طبع کے لیے سوال کرنے میں اُس کے لیے مانع نہ تھی، اس لیے کہ حضرتؒ کا تواضع طالب علم کو ہر قسم کے مناسب یا نامناسب سوال کرنے کی جرأت دلا دیتا تھا۔

(۲) حضرتؒ کا چہرہ نہایت بارعب اور لباس نہایت سادہ اور اس کے باوجود نہایت باوقار تھا، بہت موٹے کھدر کا لباس اور عربی جبّہ زیبِ تن ہوتا لیکن لباس کی صفائی بارعب چہرے کو چار چاند لگاتی تھی اور تلمیذ کی خواہش رہتی تھی کہ پُرجلال چہرے کے نظارۂ جمال میں مصروف رہے اور لبِ مبارک سے جو موتی نکلیں اُن کو سمیٹتا رہے۔

(۳) حضرتِ مدنیؒ نے عمر کا ابتدائی حصہ مدینہ منورہ میں گذارا تھا اس لیے عربی زبان کا لہجہ ایسا فصیح تھا کہ جس کی نظیر علماءِ ہند میں نہیں ملتی تھی، جو حدیث حضرتؒ کی زبان سے سُننے میں آتی وہ اپنے عربی لہجہ کے ساتھ عرصہ تک تلامذہ کے کانوں میں گونجتی رہتی تھی۔[1]

---

[1] جس سال راقم الحروف شریکِ درس تھا اُس سال مصر سے ایک عرب مہمان تشریف لائے تھے جن کا نام تو مجھے یاد نہیں تاہم اُن کا تعارف طلبہ کے سامنے حاکم الاسکندریہ سابقاً (اسکندریہ کے سابق گورنر) کے نام سے کیا گیا تھا، حضرتؒ نے اپنے معمول کے مطابق اُن کی مہمانداری کا خوب اہتمام فرمایا تھا، مجلس میں گفتگو کے وقت ہم حضرتؒ کی زبان سے بے تکلف عربی کلام سن کر ہم نے بڑا لطف اٹھایا، پھر حضرتؒ نے اُن کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا اور طلبہ کے اجتماع میں ان کو خوش آمدید کہنے کی تقریر عربی زبان میں ارشاد فرمائی، ابتداء اس شعر سے فرمائی ؎

لاخیل عندك تهديها ولامال　　فليسعد النطق ان لم يسعد الحال

یہ شعر اس وقت سے راقم الحروف کی زبان پر چڑھا ہوا ہے، تقریر کا مضمون تو اب یاد نہیں لیکن لہجہ کی گونج اب بھی یاد پڑتی ہے۔

(۴) حضرتؒ کی تقریر بہت صاف اور اس کی رفتار بہت آہستہ ہوتی تھی، ایک ایک کلمہ اور ہر کلمہ کا ایک ایک حرف نہایت متین آواز میں زبان مبارک سے نکلتا اور سامع تواز ہو جایا کرتا تھا، مشکل مقامات کو نہایت سادہ طرز بیان میں مثالیں دے کر حل فرماتے تھے اس لیے اُن کے درس سے ذہین اور متوسط بلکہ غبی طالب علم بھی اپنی اپنی استعداد کے مطابق مستفید ہو جاتا۔

(۵) حضرتؒ جب کسی مسئلہ میں حدیث کی توجیہ بیان فرماتے اور توجیہات متعدد ہوتیں تو اُن کو شمار کر کے بیان فرمایا کرتے تھے اسلیئے ضبط کرنے والا اس کا اہتمام کرتا کہ کوئی نمبر درمیان میں چھوٹنے نہ پائے اسلیئے پوری تقریر منضبط ہو جاتی تھی۔

(۶) سال کے ابتداء میں صحیح بخاری وجامع ترمذی میں سے ہر کتاب کو شروع کرتے وقت مصنف کتاب تک اپنی سند پوری بیان کر دیتے تھے (یہ اکابر کا طریقہ تھا) اس سند کے تین حصّے تھے، (۱) حضرتِ مدنیؒ سے شاہ محمد اسحٰقؒ تک (۲) شاہ محمد اسحٰقؒ سے شیخ عمر بن طبرزد بغدادیؒ تک جو اصح المطابع کے نسخہ کی ابتداء میں درج ہے (۳) عمر بن طبرزدؒ سے امام ترمذیؒ تک جو جامع ترمذی کی ابتداء میں درج ہیں۔

پھر جب حضرتؒ روزانہ کے اسباق میں احادیث سُناتے تو مندرجہ ذیل طریقے سے فرمایا کرتے تھے:۔

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمدٍ صلی اللہ علیہ واٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین ــــ (اور کبھی خطبۂ مسنونہ الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ... الخ ارشاد فرماتے) ــــ اما بعد فان اصدق الحدیث کتاب اللہ واحسن الھدیٰ ھدیٰ سیدنا محمدٍ صلی اللہ علیہ وسلم وشرّ الامور محدثاتھا وکل محدثۃٍ بدعۃ وکل بدعۃٍ ضلالۃ وکل ضلالۃٍ فی النار وبالسند المتصل الی الامام الحافظ الحجۃ امیر المؤمنین فی الحدیث ابی عبد اللہ محمد ابن اسمٰعیل بن ابراھیم بن المغیرۃ بن بَرْدِزْبَۃَ الجعفی البخاری رحمھم اللہ تعالیٰ ونفعنا بعلومہٖ۔ اٰمین۔ قال (اس کے بعد صحیح بخاری کی حدیث بیان فرماتے) اور جب اس کے بعد دوسری حدیث کی سند کی نوبت آتی تو ابتداء میں وَبِہٖ قَالَ کے الفاظ بڑھاتے۔

جامع ترمذی کے سبق میں ابی عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل... الخ کی جگہ ابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن موسیٰ بن سورۃ الترمذی رحمھم اللہ تعالیٰ.... الخ بیان فرماتے۔

(۷) حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ رضوان اللہ عنہم اور ائمہ رحمہم اللہ کے تذکرہ کے ساتھ دُعائیہ کلمات ضرور شامل فرماتے۔
حضرتؒ "نقشِ حیات" میں فرماتے ہیں ــ "میں نے اپنی عادت ہمیشہ سے یہ کر رکھی تھی کہ جب کسی پیغمبر کا اسم گرامی آئے تو علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام یا علیہ السلام کہوں، اور اگر کسی صحابی کا نام تنہا آئے تو رضی اللہ عنہ کہوں، اور اگر سندِ حدیث میں دوسرے اکابر کے ساتھ آئے تو رضی اللہ عنہ وعنہم کہوں، اور اگر ائمہ مذاہب اور علماء و اولیاء سلف کا نام آئے تو اگر تنہا ایک کا نام آئے

تو رحمہ اللہ تعالیٰ اور اگر چند کا نام آئے تو رحمہم اللہ تعالیٰ کہوں خواہ وہ اپنے مذہب کے ہوں یا شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ ہوں بشرطیکہ وہ اہلِ سُنّت والجماعت ہوں"۔۔۔ یہ عادتِ مبارکہ حضرتؒ سے راقم الحروف اور دیگر اکثر تلامذہ نے اخذ کرلی ہے)۔

(۸) حضرتِ مدنیؒ کے فیوض علمی بھی تھے روحانی بھی اور سیاسی بھی۔ علمی فیوض کا خصوصی میدان درسِ حدیث تھا، روحانی میدان کے مخصوص اوقات ذکر و شغل اور رمضان المبارک، اور سیاسی میدان میں جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس اور اسفار، تاہم ہر میدان میں دوسرے دائروں کی کچھ باتیں بھی آجایا کرتی تھیں ۔۔۔ حضرتؒ کے درس کی علمی خصوصیات کے متعلق "الجمعیۃ" "شیخ الاسلام نمبر" سے مولانا قاسم علی بجنوری کے ایک مضمون کا کچھ اقتباس درج کرتا ہوں:۔

۔۔۔۔۔ "قرأتِ حدیث کے بعد اسنادِ حدیث کے متعلق تحقیق فرماتے، رواۃ پر فن اسماء الرجال کی حیثیت سے بحث فرماتے اور جرح و تعدیل فرماتے، مناسب مواقع پر رواۃِ حدیث کے حالات بیان فرماتے، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے جب کسی صحابی کا ذکر آتا تو اُن کی خصوصیات ذکر فرماتے، اس کے بعد متنِ حدیث کا مفہوم اس طرح سمجھاتے کہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتا تھا، حدیث میں جو مشکل الفاظ آتے تھے اُن کی لغوی تحقیق فرماتے، حدیث کے مراتب صحیح، حَسَن وغیرہ بیان فرماتے، اس حدیث پر اگر کوئی اعتراض وارد ہوتا تو اُس اعتراض کو بوضاحت بیان فرماتے اور اس کے چند قوی جوابات جو مستند ہوں بیان فرماتے تھے۔ تراکیبِ نحویہ، تشریحِ مقامات، خصائصِ کُتب، فنِ حدیث کے اصطلاحات کی تشریح، احادیثِ منسوخہ کی مکمل بحث، فرضیتِ احکام کی تواریخ و شانِ نزول، فرقِ حقہ و فرقِ باطلہ کے عقائد کی تشریح مع دلائل، تفسیرِ آیات، تشریحِ معجزات، مستند قصصِ انبیاء، ابحاث متعلقہ ایمان، وجہِ تسمیہ سورِ قرآنی، عصمتِ انبیاء، احوالِ ائمہ حدیث، شرائط معمول بہا محدّثین، تراجمِ ابواب سے احادیثِ مرویہ کی مطابقت، شعبِ ایمان وغیرہ کو بالتفصیل بیان فرماتے، اگر کوئی حدیث اختلافی مسئلہ سے متعلق آتی تو تفہیمِ حدیث کے بعد اختلافِ ائمہ بیان فرماتے اور پھر ہر امام کے جملہ دلائل بالتفصیل بیان فرماتے اور سب سے آخر میں مذہبِ حنفیہ کو حدیث سے مطابق فرماتے تھے، اُس وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ حنفی مذہب احادیثِ نبویہ کے بالکل مطابق ہے اور امام ابوحنیفہؒ کو تفقہ فی الدّین میں دستگاہِ کامل حاصل ہے۔ اسی طرح مراتبِ صحابہؓ و تابعینؒ و تبع تابعینؒ، مذاہبِ محدّثین، اسامی محدّثین، بلدان رواۃِ حدیث، انسابِ محدّثین، کُنیاتِ صحابہؓ و تابعین واتباعھم، قبائل رواۃ، اعمارِ محدّثین وولادتہم ووفاتہم، القابِ محدّثین فی الاسانید، اولادِ صحابہؓ، عللِ حدیث، رواۃ شاذہ، طبقاتِ محدّثین، ذکر مدلسین، مغازیِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ جملہ لوازم درسِ حدیث کا آپ دورانِ درس التزام فرماتے تھے"۔۔۔۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہ طریق امعان و تعمق ہے۔ حضرتؒ کے طرزِ امعان و تعمق کا اندازہ اس سے لگائیے کہ صحیح بخاری کے

درس کی تقریر کا کچھ حصہ مولانا کفیل احمد صاحب نے ضبط کر کے چھاپ دیا ہے اِس میں وہ تمہیدی مباحث جو حضرتؒ نے کتاب کی ابتداء سے پہلے بیان فرمائے تھے ۲۴ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، اسکے بعد پہلی حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتُ ... الخ کی تشریح ۲۰ صفحات میں ہوگئی ہے۔ ایک دفعہ مسئلہ قلتین میں شوافع کے استدلال پر آپ نے ۵۱ اعتراض کر دیئے ا رفع الیدین کے مسئلہ میں تین دن (دو ڈھائی تین گھنٹے) اور فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں ایک ہفتہ صرف ہو جاتا تھا۔

غیر حنفی مذاہب کے دلائل کا جواب کبھی اِس انداز میں آجاتا کہ وہ دلیل غیر حنفی اور حنفی مذہب دونوں کے منافی نظر آتی اُس وقت حضرتؒ یہ شعر ارشاد فرماتے ؎

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی　　گو مشتِ خاکِ ما ہم برباد رفتہ باشد

کتاب المغازی کے درس کا خاص لطف یہ تھا کہ حضرتؒ عرب کے جغرافیہ سے واقف تھے اسلیئے جغرافیائی مواقف بھی خوب واضح ہو جاتے تھے، اور کتاب التفسیر کے درس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ آیت جہاں الآیۃ یا الی کیتسا مختصر ہوتی وہاں حضرت پوری آیت سنا دیتے تھے۔

(۹) دوران درس تصوف کے بہت سے مسائل بھی حل ہو جاتے تھے، حضور کے غارِ حرا میں تشریف لیجانے کے بارے میں فرماتے ہیں: (منقول از تقریر ضبط کردہ مولانا عبدالدیانؒ ــــ یہ حصہ مولانا کفیل احمد صاحب کی تقریر میں نہیں) جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں تشریف لاتے تھے اور لوگوں سے نفرت تھی اور نفرت کرائی تھی، کیونکہ جب کسی کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو اس کو تمام اطراف سے موڑ لیتے ہیں اور ایک طرف اس کا طبعی میلان کر دیتے ہیں، تو جناب باری تعالیٰ جب کسی سے محبت کرتا ہے تو اپنی محبت اُس کے دل میں ڈال دیتا ہے اور تمام مادیات سے ہٹا کر اُس کی توجہ اپنی طرف کر دیتے ہیں، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ تمام چیزیں عالم رؤیا میں دکھائی گئیں اور عالمِ مجردات اور عالمِ علویہ کی طرف اُن کی توجہ اٹھائی گئی"۔

اگر کسی شخص کو یکبارگی حمام میں داخل کر دیں تو دم گھٹ جاتا ہے کیونکہ اس میں درجے ہوتے ہیں، ایک میں گرمی کم دوسرے میں زیادہ تیسرے میں اس سے زیادہ، وعلیٰ ھذا القیاس، جب کسی شخص کو حمام میں داخل کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اگر یہ شخص اچانک حمام سے باہر نکل آئے تو بیمار ہو جائے گا اسلیئے اس کی بہت حفاظت کرتے ہیں، جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ تدریجاً آپ کے مرتبے بڑھائے گئے، اگر ابتداء میں عالمِ علوی کی چیزیں دکھائی جائیں تو اس میں خوف کا خطرہ ہوتا ہے اسلیئے تدریجاً ترقی دی گئی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی تدریجاً تمام چیزیں دکھائی گئیں، چنانچہ قرآن مجید کی آیت فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ اِس پر شاہد ہے۔

پہلے پہلے اگر کسی فن میں داخل ہو تو اس کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ ڈوبا ہوا ہے، جیسے بچے کو کھیل کود میں لایا جاتا ہے جب کھیل کود سے پکڑ کر اُس سے کوئی عادت چھڑواتے ہیں تو ایسا ہوتا ہے کہ ڈوبے ہوئے شخص کو نکالو، کیونکہ شیطانی باتوں کو چھڑانے میں بہت تکلیف ہوتی ہے اور ایمانی باتوں میں آنے کی طرف طبیعت دیر سے مائل ہوتی ہے ــــ یہ دوسرا مرتبہ ہے ایسی

حالت ہوتی ہے کہ نشاط سی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا کہ فن میں مہارت تیراکی کی طرح پیدا ہو جاتی ہے) پھر چوتھا مرتبہ کمالِ معرفت ہو گیا تو اوروں سے آگے جانے لگے (فَالسَّابِقَاتِ سَبْقًا) زیادہ مہارت پیدا ہو جاتی ہے اور اپنے ساتھیوں سے آگے نکل جاتے ہیں (آگے پانچواں مرتبہ آتا ہے کہ) وہ فن جس میں آپ داخل ہوئے ہیں اُس کو اوروں کو سکھلانے لگے۔ (فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا)

تدریجاً کسی کمال کو حاصل کرنے کیلئے یہ چیزیں پیش آتی ہیں، بعض چیزوں میں نفس تنبہ ہوتا ہے اور بعض میں نہیں مگر یہ پانچوں مرتبے پیش آتے ہیں، جب انبیاء علیہم السلام بھی فطرتِ انسانیہ پر پیدا کیے گئے ہیں تو اُن کو بھی تدریجاً ترقی دی گئی ہے اور کمال تک پہنچائے گئے ہیں (اسکے بعد خواجہ باقی باللہ کی تربیت کا ایک واقعہ جس کا مفاد یہ ہے کہ جو ترقی تدریجاً نہ ہو وہ مضر ثابت ہوتی ہے، وغیرہ)۔

اِسی طرح حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پہلے عالمِ علوی سے رُوشناس کرایا گیا اور رؤیائے صادقہ کی شکل میں یہ معاملہ ہوا اور چھ مہینے تک ایسا رہا..... الخ

(۱۰) حضرتِ مدنیؒ اخلاقی اور معاشرتی درس بھی مناسب مواقع پر دیا کرتے تھے کیونکہ حضرتؒ کے پیشِ نظر طلبہ کی اخلاقی تربیت اور اُن کے واسطے سے معاشرہ کی اِصلاح اہم ترین ضرورت تھی، مثلاً حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے زفاف کے قصہ میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ولیمہ کا انتظام یُوں فرمایا کہ صحابہ کرامؓ سے ارشاد فرمایا کہ "من کان عندہ شیٔ فلیجیٔ بہ" جس کے پاس کوئی چیز ہو تو اُسے لے آئے، حضرتؒ نے پہلے تو بطور لطیفہ فرمایا کہ شوافع کی نماز کی طرح تھا کہ اجتماع ہے لیکن ہر ایک اپنے اپنے طور سورۃ فاتحہ پڑھ رہا ہے، ضمناً اس مسئلہ کی توجیہہ فرمانے کے بعد فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بے تکلفی کے ساتھ صحابہؓ کی لائی ہوئی چیزیں اکٹھی کیں اور اُس سے حَیْس (کھجور، گھی، پنیر اور گرم آٹے وغیرہ سے ایک خاص قسم کا طعام جو لذیذ اور تمام عرب میں مقبول ہے) تیار کیا، یہی ولیمہ ہُوا۔۔۔ اس کے برعکس یہاں بہار، یُو پی، سرحد وغیرہ تمام اطراف میں ولیمہ پر نہایت اسراف سے کام لیا جاتا ہے۔ مظفر نگر کے ایک صاحب نے ولیمہ کے لیے مکان گروی رکھا جسے بعد میں قرض ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے بیچ دیا، بہتر یہ ہے کہ زیادہ اسراف کرنے کی بجائے اس رقم سے اولاد کے لیے مکان یا کوئی اور چیز خریدو۔

(۱۱) سیاست کے میدان میں حضرتِ مدنیؒ کو ہمیشہ تمام عالمِ اسلام کی حُرّیت اور آزادی ملحوظِ خاطر رہتی تھی اسلئے وہ اپنے شاگردوں کو یہ تعلیم بھی دینا چاہتے تھے کہ وہ تمام عالمِ اسلام کے مفاد پر نظر رکھیں، کرمکِ کتابی نہ بنیں بلکہ عالمی مسائل کو سمجھ کر عالمِ اسلام کے استحکام کی راہ میں جد وجہد کے قابل بھی بنیں، ایک واقعہ اس ضمن میں پیشِ خدمت ہے:۔

۔۔۔۔۔ تلامذہ کا معمول تھا کہ اگر اپنے کسی بیمار یا متوفی کے حق میں دعا کرانی ہوتی تو ایک پرزہ لکھ کر شرکاءِ درس کی وساطت سے حضرتؒ تک پہنچاتے تھے، حضرت اختتامِ درس پر یہ پرزے پڑھ کر اعلاناً دعا کرا دیتے تھے، ۱۹۳۵ء/۱۳۵۴ھ میں راقم الحروف شریکِ درس تھا، اس سال مشہور مصنّف اور شیخ محمد عبدہٗ کے شاگرد رشید رضا صاحبِ "المنار" فوت ہوئے، میں نے یہ خبر پڑھی مصری اخباروں کی وساطت

سے رشید رضا کی تعریف میں بہت کچھ سنا تھا اس لیے میں نے ایک پُرزہ لکھ کر درخواست کی کہ عالمِ اسلام کے بطلِ کبیر رشید رضا فوت ہوئے ہیں اُن کے حق میں دُعا کی جائے۔ پُرزہ پڑھ کر حضرتؒ نے ایک لمبی تقریر فرمائی اور ہمیں سمجھا دیا کہ رشید رضا صاحب نے پہلی جنگِ عظیم میں عربوں کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر کے عالمِ اسلام کو بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ یہ حقیقت سمجھا دینے کے بعد فرمایا کہ بہر حال اب اُن کے حق میں دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی لغزشیں معاف فرما دے"۔۔۔۔ برسوں بعد رشید رضا صاحب کی تفسیر "المنار" کا مطالعہ کیا تو دو باتیں بہت کھٹکتی رہیں، ایک تو یہ کہ وہ ابن القیمؒ کی طرح بیک وقت سلفی بھی ہے اور تجدد پسند بھی، اور سلفیت کے جوش میں نہایت تنگ نظر بن جاتا ہے اور دوسری یہ کہ اُسے اُمّتِ اسلامیہ سے زیادہ اُمّتِ عربیہ عزیز ہے۔ پھر مراکش کے رسالہ "دعوۃ الحق" ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ و محرم ۱۳۹۲ھ کے شماروں میں امیر شکیب ارسلان مرحوم کا ایک خط نظر سے گذرا اور اس پر استاد سیّد افغانی[1] کی تعلیمات نظر سے گذریں، اس خط میں رشید رضا کا ذکر ہے اور اس پر تنقید ہے۔ اس سے پورا علم حاصل ہوا کہ اغیار کی سازشوں نے جنگِ عظیم سے پہلے اور اس کے دوران بڑا جال پھیلایا تھا جس میں مصر و شام کے عیسائی دانستہ اور دوسرے عرب ادیب دانستہ یا نادانستہ شریک تھے، یہ تمام لوگ اجنبی طاقتوں کے آلۂ کار تھے اور صیہونیت کے دشمن خاص سلطان عبدالحمید خان مرحوم کے خلاف بغاوت میں حصہ لیکر صیہونیت کیلئے راہ ہموار کر رہے تھے، رشید رضا بھی اس گروہ میں شامل تھے۔

(۱۲) حضرتؒ کے درس میں سالہا سال یہ معمول رہا کہ شعبان کی آخری تاریخوں میں یا بعض اوقات رمضان کی ابتدائی تاریخوں میں رات کے بارہ بجے کے قریب قریب ریل کے وقت سے کچھ پہلے صحیح بخاری اختتام پر پہنچتی، پھر حضرتؒ مکان پر پہنچتے اور تانگہ میں سوار ہو کر ریل پر پہنچتے تاکہ رمضان شریف سلہٹ میں گذاریں۔ ختم کی رات جب حضرتؒ رات کے سناٹے میں علماء کے مجمع میں صحیح بخاری کی تلاوت بلند آواز میں فرماتے تو نہایت پُر لطف سماں بندھتا تھا اور پھر جب ختم کے وقت حضرتؒ اپنے پُر ترنم لہجے میں صحیح بخاری کی آخری حدیث روایۃ قال) حدثنا احمد بن اشکاب قال حدثنا محمد بن فضیل عن عمارۃ بن القعقاع عن ابی زرعۃ عن ابی ھریرۃ (رضی اللہ عنہ وعنھم) قال قال النبیّ صلی اللہ علیہ وآلہ و صحبہ وسلم کلمتانِ خفیفتانِ علی اللسان ثقیلتانِ فی المیزانِ حبیبتانِ الی الرحمٰن ط سبحان اللہِ وبحمدہٖ سُبحانَ اللہ العظیم ط پڑھ کر کتاب ختم کرتے تو مجمع پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی جس میں خشوع اور انابت و توجہ کے آثار نمایاں نظر آتے تھے اور اس کے بعد تاثیر میں ڈوبی ہوئی دُعا ہوتی تھی۔ اللّٰھم نوّر مرقدہٗ۔ آمین

---

[1] سلطان عبدالحمید نے اپنی ڈائری میں ۳/۱۷-۱۸ میں تحریر فرمایا کہ "اسی زمانہ میں میرے سامنے ایک منصوبہ تیار کردہ جمال الدین افغانی اور ایک انگریز کا تھا کہ ترکوں سے خلافت کی قبا لے لی جائے اور مکہ کے شریف حسین کو مسلمانوں کا خلیفہ بنانے کا اعلان کر دیا جائے"۔ جمال الدین افغانی بہت خطرناک آدمی تھا، مہدی ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ (اردو ڈائجسٹ لاہور نومبر ۱۹۷۲ء ص ۱۰۰)

سیاسی مصروفیات میں بھی درسِ حدیث کی امتیازی شان

۴

ممتاز سکالر، مشہور مصنف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہٗ لکھتے ہیں کہ (میں) بخاری و ترمذی کے درس میں شرکت کرتا تھا، مولانا (مدنیؒ) کا استحضار اور مسئلہ کی مبسوط تقریر اُن لوگوں کیلئے نئی بات ہے جو مولانا کی سیاسی مصروفیتوں اور سفروں کی کثرت سے واقف ہیں، ایک مسئلہ پر بعض اوقات تین تین چار چار دن مسلسل (۶۰ منٹ کے تعلیمی گھنٹہ میں) تقریر جاری رہتی اور مسئلہ کا "مالہٗ وماعلیہ" آئمہ کے اختلاف و مذاہب اور ان کے دلائل و مآخذ، متن و اسناد و رجال کی بحثیں، برجستہ، اس سب پر مولانا کی قرأتِ حدیث، مولانا کا مخصوص دلکش لہجہ اور دارالحدیث کی رُوحانی و پُر سکینت فضا ابھی تک آنکھوں میں ہے اور گویا اس وقت بھی بالسند المتصل الی امیر المؤمنین فی الحدیث..... کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے، درمیان میں طلبہ کے سوالات کا (جن میں غیر متعلق بھی ہوتے تحمّل کے ساتھ جوابات دیتے۔ آخر سال میں درس کی مصروفیت اتنی بڑھ جاتی کہ عصر کے بعد بھی درس، عشاء کے بعد دیر رات تک درس، صبح کی نماز کے بعد درس، اچھے اچھے مستعد طالب علموں کی ہمت جواب دے جاتی، لیکن مولانا کی مستعدی، نشاط اور قوت میں فرق نہ آتا۔

دارالحدیث کو آمدورفت کا منظر

یوں تو حضرتِ مدنیؒ کی شان الگ الگ رہتی تھی، رفتار و گفتار کی شان الگ، اسی طرح درس و تدریس کی شان بھی الگ تھی، کپڑے انتہائی صاف اور عطر سے معطر دارالحدیث میں تشریف لے جاتے تھے، احتراماً اکثر دوزانو ہوکر تشریف رکھتے تھے، احترامِ حدیث کے پیشِ نظر حرکت بھی زیادہ نہیں کرتے تھے، جب دوزانو ہوکر تشریف رکھتے تو توجہ سامنے کی طرف ہوتی، درس کے وقت انتہائی بے تکلف ہوجاتے تھے، بیچ بیچ میں ہنسی مزاح بھی فرماتے تھے، مقصد یہ ہوتا تھا کہ طلباء بے تکلف استفادہ کرسکیں اور اشکالات پیش کرنے میں جھجک محسوس نہ کریں، رات کے سبق میں خصوصاً بہت زیادہ بے تکلف ہوجاتے تھے۔

درس گاہ میں داخلہ

درس گاہ میں داخل ہوکر آپ پہلے سلام فرماتے تھے اور طلباء بھی اس نعمت کے منتظر رہتے تھے مگر جواب آہستہ دیتے، حضرتؒ نے رعب کو دور کرنے کے لیے ایک دن فرمایا دیکھو! سلام کرنا سنّت ہے اور جواب دینا واجب ہے، تم لوگ جواب نہیں دیتے، میرا کیا نقصان؟ لڑکے مقصد سمجھ گئے اور اُسی دن سے بآوازِ بلند وعلیکم السلام کہنے لگے، اس میں حضرتؒ بہت خوش ہوتے تھے۔

دارالحدیث میں حضرتؒ کی نشستگاہ

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز شاگرد مولانا نجم الدین اصلاحی نے ارشاد فرمایا:

——— ”جن لوگوں کو دارالعلوم دیوبند جانے کا اتفاق ہُوا ہوگا اور انہوں نے دارالحدیث دیکھا ہوگا تو انہیں معلوم ہوگا کہ دارالحدیث میں ایک چوکی ہے جس پر چٹائی بچھی ہوئی رہتی ہے اور سامنے ایک معمولی مگر مضبوط ڈیسک رکھا ہوا ہے۔ آج دُنیا کی درسگاہوں کی خاک چھان جائیے آپ کو کہیں یہ سادگی نہیں ملے گی، مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ کافی کمزور ہوچکے تھے اس لیے طلباء کو احساس تھا کہ اس چٹائی پر بیٹھنے سے مولانا کو تکلیف ہوتی ہوگی، خصوصاً جب موسم سرما آیا تو یہ احساس اور زیادہ شدید ہوگیا، چنانچہ بعض لڑکوں نے قالین

بچھادی، مولانا تشریف لائے اور آہستہ آہستہ چوکی کی طرف بڑھے، قالین پر جوں ہی نظر پڑی تیوریوں پر بل آگئے اور اسے ہٹانے کا اشارہ کیا، تعمیلِ ارشاد میں تاخیر ہوئی تو مولانا محترم خود ہی آگے بڑھے اور قالین کو کھینچنا شروع کر دیا فوراً چند طلباء نے اسے ہٹا دیا، اس کے بعد مولانا بیٹھے مگر کبیدگی کے آثار مولانا کے روئے مبارک پر بڑی دیر تک باقی رہے۔ بوریہ نشین علماء سے ہمارے کان تو واقف تھے اور کتابوں میں بھی دیکھا تھا مگر ابھی اس چودھویں صدی کی نگاہوں نے ان میں سے کسی ایک کو نہ دیکھا تھا اگر دیکھا تو ایسے شخص کو دیکھا جو بوریہ تو بوریہ ایک باریک اور سخت بید کی چٹائی پر بیٹھتا تھا"۔

(ماہنامہ الخیر مدنی نمبر ص۸)

عام طور پر سبق کے بعد کچھ طلبہ مکان تک حضرتؒ کے پیچھے پیچھے چلے جاتے تھے، اکثر اوقات آپ تنبیہ فرما دیتے کہ میرے ساتھ کیوں آتے ہو؟ کیا میں ڈرتا ہوں؟ جاؤ جاؤ اپنے کمرے میں، مگر طلباء کہاں مانتے، کچھ دیر ٹھہرتے پھر آہستہ آہستہ چل دیتے۔

علم کے احترام کا یہ عالم تھا کہ راستہ میں کاغذ کا کوئی ٹکڑا مل جاتا تو فوراً اٹھا لیتے، فرماتے اس کاغذ کے ذریعہ علم کی حفاظت ہوتی ہے۔ ایک روز مسجد سے تشریف لا رہے تھے کہ کسی کے جوتے پر کاغذ کا پرزہ پڑا ہوا تھا اس کو اٹھایا، پھر جوتے والے کو تنبیہ فرمائی ____ (ایسے) بے شمار واقعات ہیں جن کا اندراج دشوار ہے، مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ حضرتؒ کو اپنی نعمتوں سے نوازے اور ہم ناکاروں کو حضرتؒ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔

ختمِ بخاری شریف کا ایمان افروز منظر

اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری شریف کے ختم کے موقع پر جب آپ اپنے مخصوص لہجہ میں آخری حدیث حدثنا احمد بن اشکاب قال حدثنا محمد بن فضیل عن عمارة بن القعقاع عن ابی زرعة عن ابی هريرة رضی اللہ عنهم قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کلمتان حبیبتان الی الرحمٰن خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان سبحان اللہ وبحمده سبحان اللہ العظیم کی تلاوت شروع فرماتے تو قلوب پر رقت طاری ہونے لگتی تھی اور آپ حاضرین پر روحانی توجہ فرماتے تو تمام لوگ زار و قطار رونے لگتے تھے اور دل کانپ جاتے تھے اور لوگ توبہ و استغفار اس طرح سے کرتے تھے گویا کہ دربار خداوندی میں حاضر ہیں اور رو رو کر اپنے گناہوں سے معافی چاہ رہے ہیں، اور اس موقعہ پر جو دعاء مانگی جاتی تھی وہ مقبول ہوتی تھی۔ آنکھیں اشکبار، دل تڑپتا ہوا، زبان لڑکھڑاتی ہوئی، رونگٹا رونگٹا کانپتا ہوا، غرض مجمع ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتا تھا اور توبہ و استغفار اور دعا کرتا تھا، عجیب منظر ہوتا تھا، اس کا بیان کس طرح سے کیا جائے؟ اس کے اظہار کے لیے الفاظ کہاں سے لائے جائیں؟

خدا گواہ ہے کہ دارالعلوم کے ہر دور میں بخاری ختم ہوئی مگر اس انداز کی ختمِ بخاری کہاں؟ دارالعلوم کی تاریخ میں اس کی نظیر ملنا ممکن نہیں، روحانیت کا یہ عظیم الشان منظر شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ کے ساتھ ختم ہو گیا، آپ کی وفات کے ساتھ تاریخ کا اک دور ختم ہو گیا۔

فائدہ) ختمِ بخاری شریف کی برکات جن دینی مدارس میں دورۂ حدیث ہوتا ہے اُن میں اب بھی ختمِ بخاری شریف کا یوں اہتمام کیا جاتا ہے کہ آخری حدیث کے پڑھانے کے لیے کسی ممتاز محدث کو دعوت دی جاتی ہے اور سماع کے لیے مدرسہ کے اساتذہ، طلباء کے علاوہ دوسرے دیندار مسلمانوں کو دعوت دی جاتی ہے اور یہ امید رکھی جاتی ہے کہ اس پاکیزہ مجلس

میں کی جانے والی دعا کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ بلکہ اُمّت کا معمول رہا ہے اور اب بھی ہے کہ کسی انفرادی یا اجتماعی ملّی یا مُلکی پریشانی کے وقت بخاری شریف کا ختم کرا یا جائے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ اس پریشانی کو دور فرما دیتے ہیں، کیونکہ اس کتاب عزیز میں کئی ہزار ارشادات سیدِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نہایت ہی احتیاط اور علمی تحقیق کے بعد کمال ادب اور احترام کے ساتھ مدینہ منورہ میں جمع کیے گئے ہیں، اور کئی ہزار بلکہ کئی لاکھ صحابۂ کرامؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ خیر القرون کے اسمائے گرامیہ ذکر کیے گئے ہیں، اسی طرح کی دوسری تمام برکات کا یہ کتاب مجموعہ ہے، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ رحم و کرم فرما دیتے ہیں۔

اسی طرح تمام بلادِ اسلامیہ میں صحیح بخاری کو قرآنِ عزیز کے بعد تقدس کا مقام حاصل تھا کہ اس پر ہاتھ رکھ کر حلف کو اسی طرح اہم سمجھا جاتا تھا جس طرح قرآنِ عزیز کی حلف کو۔ چنانچہ الجزائر کی افواج سے حلفِ وفاداری لیتے وقت بخاری شریف پر ہاتھ رکھایا جاتا تھا اور ایسے لشکر کو بخاریہ کہا جاتا تھا۔ (تاریخ الادب العربی از بروکلن جلد ۳ ص ۱۶۳)

حضرتِ مدنیؒ شیخ العرب والعجم

حضرتِ مدنیؒ نے دار العلوم دیوبند میں صحیح بخاری اور جامع ترمذی کا درس ۳۲ سال دیا جبکہ آپ سے بطورِ شاگرد کے سماعِ حدیث کرنے والوں کی تعداد ۳۸۴۳ ہے جن کو دار العلوم اور خود حضرتِ مدنیؒ سے سندِ حدیث ملی ہے، اس سے پہلے سلہٹ کے خلافت آفس میں آپ نے درسِ حدیث ۶ چھ سال دیا اور اس سے بھی پہلے مدینہ منورہ (علی منورہا الف الف صلوٰۃ و سلام) میں ۱۲، ۱۳ سال کے درسِ حدیث کے شاگردوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے، گویا آپ نے ۵۰ سال درسِ حدیث دیا اور آپ کے شاگردوں کی تعداد تقریباً چھ ہزار ہے جن میں برصغیر، افغانستان، چینی ترکستان، جاوا، یورپ کے بعض شہروں کے شاگرد شامل ہیں، عرب و عجم میں ان کئی سالوں میں آپ سے زیادہ کسی محدث کے شاگرد نہیں ہوئے اسلئے آپ اس دور کے شیخ العرب والعجم کہلائے جانے کے صحیح مستحق ہیں۔

بقول شاعر ؎ عرب میں جس کی تنویریں عجم میں جس کی تابانی

اسی طرح آپ کے دو تین سعادتمند شاگردوں کے تاثرات اور درسِ حدیث کی جامعیت پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کی علوم و فنون، اصول فقہ، احسان و سلوک وغیرہا پر کس قدر عمیق نظر تھی اور اسی سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کس قدر قوی حافظہ سے نوازا تھا، آپ کے درسِ حدیث سے جو انوار سامعین اور قارئین کے دل و دماغ کو منور اور معطر کر رہے ہیں وہ سارے کے سارے عشق محبوبِ رب العٰلمین کے اُن حقوق و آداب کی عکاسی کر رہے ہیں جو صحیح معنوں میں آپ کو حاصل تھے۔ یہ تو چند شاگردوں کے تاثرات ہیں اگر ان سالہا سال کے دروس، تقاریر، مواعظ پر نظر کی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کو دربار سید الانبیاء صلّی اللہ علیہ وسلّم کا وہ قرب حاصل تھا جو اور کسی کو کم حاصل ہوگا۔ بارك الله فيه

اعطاءِ سندِ خصوصی

حضرتِ مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے تلامذہ کو خصوصی سند سے نوازا ہے جو کئی لحاظ سے سندِ عالی کا درجہ رکھتی ہے کہ اس سند میں حضرتؒ کے دار العلوم کے اساتذہ کے سوا مدینہ منورہ کے اُن اساتذہ کا بھی ذکر ہے جن کا سلسلۂ سند حضرت مدنیؒ ہی کے ساتھ خاص ہے۔ حضرت مدنیؒ نے دورۂ حدیث میں بخاری اور ترمذی پڑھنے والے ۴۸۳ سعادتمندوں کو خصوصی سند سے نوازا ہے اُن میں یہ گنہگار بھی ہے جو ہر لحاظ سے ان علماء کرام سے کمتر ہے، عمر بھی بیس سال تھی اور یہ بھی حُسنِ اتفاق ہے کہ حضرتِ مدنیؒ کی فراغت کے وقت بھی عمر بیس سال تھی۔ ع

بلبل ہمیں کہ قافیہ گُل شود بس است

تبرکاً اس بابرکت سند کو نقل کیا جاتا ہے:۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مُسْنَدَاتُ الْمَحَامِدِ الْعَالِیَۃِ لَا تُعْتَمَدُ اِلَّا عَلَیْہِ وَمُسَلْسَلَاتُ الْمَدَائِحِ الْفَائِحَۃِ لَا تَتَوَاتَرُ اِلَّا اِلَیْہِ اَجَازَ الْخَلَائِقَ بِنِعَمِہِ الَّتِیْ لَا تُحْصٰی طُرُقُہَا فَھُمْ عَنْ اَدَاءِ تَشَکُّرَاتِہَا ضُعَفَاءُ عَاجِزُوْنَ وَاَنْبَأَ الْمُسْلِمِیْنَ یَجْتَنُوْنَ الْاَحَادِیْثَ اللَّدُنِّیَّۃَ لِذِیْ فِقْھِہَا وَالرِّوَایَاتِ وَاقِفُوْنَ وَصِحَاحُ صَلٰوتِہِ الْغَرِیْبَۃِ لَمْ تَدُرْ اِلَّا الْاُصُوْلَ مَرْکَزَ النُّبُوَّاتِ وَسُنَنُ تَسْلِیْمَاتِہِ الْعَزِیْزَۃِ لَمْ تُرْفَعْ اِلَّا اِلٰی عَرْشِ مَفْخَرِ الرِّسَالَاتِ اَللّٰھُمَّ فَادِمْ دِیَمَ رَحْمَتِكَ الْمَشْھُوْرَۃَ ھَطَّالَۃً عَلٰی اٰحَادِ اُمَّتِہِ وَاَئِمَّتِھِمْ فِی الرِّوَایَۃِ وَالدِّرَایَۃِ وَعَلَی الْمُجْتَھِدِیْنَ مِنْھُمْ سِیَّمَا مَنْ نَالَ الدِّیْنَ الْقَوِیْمَ مِنَ الثُّرَیَّا الدِّرَایَۃِ اَمَّا بَعْدُ فَقَدِ استجازنی الاخ فی اللہ محمد زاہد شمس آبادی عن کتب السنن المتداولۃ وما تجوز لی روایتہ من کتب الاصول والفنون الفرعیۃ بعد ما قرأ الذی بعض الامہات الستۃ الحدیثیۃ ولم یکن ذلک منہ الا بظنہ الحسن فانی لست

من فرسانها ولا رجالتها السنیة فقد استسمن ذا ورم ونفخ فی غیر ضرم والح علی الحاحاً غیر معتاد والجانی الی اسعاف ما اراد ولما لم اجد بداً استخرت اللہ تعالیٰ ثم اجزتہ بالصحاح الست وغیرہا من المنقول والمعقول واسفار الفروع والاصول حسبما اجازنی بہا الائمۃ الفحول اجلہم وامجدہم بدر المحققین وامام المعرفۃ والیقین العارف باللہ شیخ الہند مولانا ابو میمون محمود حسن العثمانی الدیوبندی موطناً والحنفی مسلکاً الجشتی النقشبندی القادری السہروردی مشرباً قدس سرہ العزیز عن ائمۃ اعلام اجلہم شمس الاسلام والمسلمین العارف باللہ مولانا ابو احمد محمد قاسم العلوم والحکم النانوتوی موطناً الحنفی مسلکاً والجشتی النقشبندی القادری السہروردی مشرباً قدس اللہ اسرارہما وہما قد اخذ اسائر الفنون والکتب الدرسیۃ خلاء علم الحدیث عن ائمۃ اعلام اجلہم مولانا الثبت الحجۃ ابو یعقوب مملوک العلی النانوتوی الحنفی والمفتی صدر الدین الدہلوی قدس اللہ اسرارہما وغیرہما من اساتذۃ الفنون بدہلی المعاصرین لہما ائمۃ اعلام اجلہم مولانا رشید الدین الدہلوی عن الامام الحجۃ مولانا العارف باللہ الشاہ عبد العزیز الدہلوی الحنفی ویروی الشمسان المومیٰ الیہما سابقاً کتب الحدیث والتفسیر قراءۃً واجازۃً عن ائمۃ اعلام اجلہم شیخ مشائخ الحدیث الامام الحجۃ العارف باللہ الشیخ عبد الغنی الدہلوی المجددی ثم المدنی وعن الشیخ احمد سعید المجددی الدہلوی ثم المدنی ومولانا الامام الحجۃ مولانا احمد علی السہارنفوری قدس اللہ اسرارہم کلہم عن الشہیر فی الآفاق مولانا الامام الحجۃ محمد اسحاق الدہلوی ثم المکی قدس اللہ سرہ العزیز عن جدہ لابی امہ مولانا العارف باللہ امام الائمۃ الشاہ عبد العزیز الدہلوی قدس سرہ العزیز عن امام الائمۃ فی المعقول والمنقول مرکز دوائر الفروع والاصول مولانا العارف باللہ الشاہ ولی اللہ الدہلوی النقشبندی واسانیدہ الی المحقق الدوانی والسید الجرجانی والعلامۃ التفتازانی مذکورۃ فی القول الجمیل وغیرہ کذلک اسانیدہ الی اصحاب السنن ومصنفی کتب الحدیث مذکورۃ فی شبۃ

وکذلک فی اوائل الصحاح الست ح ویروی مولانا الشاہ عبد الغنی الدہلوی سایر الکتب لاسیما الصحاح الست عن الامام الحجۃ محمد عابد الانصاری السندی ثم المدنی صاحب التصانیف المشہورۃ واسانیدہا مذکورۃ فی ثبتہ المسمی بحصر الشارد فی اسانید الشیخ محمد عابد وکذلک فی ثبت الشیخ عبد الغنی المشہور بالیانع الجنی ح ویروی شیخنا العلامۃ شیخ الہند المرحوم عن العلامۃ محمد مظہر النانوتوی ومولانا القاری عبد الرحمٰن الفانی فتی کلاہما عن الشیخ محمد اسحاق المرحوم ح واروی ہذہ العلوم والکتب عن الشیخ الاجل مولانا عبد العلی قدس اللہ سرہ العزیز اکبر المدرسین فی مدرسۃ مولانا عبد الرب المرحوم بدہلی وعن الشیخ الاجل مولانا خلیل احمد السہارنفوری ثم المدنی قدس اللہ سرہ العزیز کلاہما عن ائمۃ اعلام لاسیما الشمسان المومی الیہما ح واروی عن مشیخۃ اعلام من اہل الحجاز اجازۃ وقراءۃ لاوائل بعض الکتب اجلہم شیخ التفسیر حسب اللہ الشافعی المکی ومولانا عبد الجلیل برادۃ المدنی ومولانا عثمان عبد السلام الداغستانی مفتی الاحناف بالمدینۃ المنورۃ ومولانا السید احمد البرزنجی مفتی الشافعیۃ بالمدینۃ المنورۃ رحمہم اللہ تعالیٰ وارضاہم واوصی الاخ محمد زاہد المومی الیہ ونفسی بالتقوی فی السر والعلن وترک الفواحش ما ظہر منہا وما بطن عاضا بالنواجذ علی ما کان علیہ السلف الصالحون وائمۃ السنۃ والجماعۃ المتقنون وان یجعل تقوی اللہ تعالیٰ نصب عینیہ خائفا عن القیام یوم المحشر بین یدیہ وان یعرض عن الدنیا الدنیۃ ولذاتہا صارفاً انفاس عمرہ العزیز فی طاعات اللہ تعالیٰ وذکرہ فی غدواتہا وروحاتہا وان لاینسانی ومشائخی الکرام عن الدعوات الصالحۃ فی خلواتہا وجلواتہا۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

امر برقمہ المفتاق الی عفو ربہ الصمد
عبدہ المدعو بحسین احمد غفر لہ ولوالدیہ و
ومشائخہ الرؤف الاحد خادم العلم بدار العلوم دیوبند
۱۷ من شعبان ۱۳۵۲ھ

جمعیۃ العلماء میں عملی شرکت

جیساکہ پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت مدنیؒ اپنے استاذِ مکرمؒ کے ساتھ مالٹا میں اسیر تھے کہ ہندوستان میں خلافتِ عثمانیہ کے توڑنے اور عالمِ اسلامی پر انگریزوں کے بے پناہ مظالم کے خلاف ایک تحریک بہ نام تحریکِ خلافت شروع ہوگئی، جس میں ہندوستان کے جلیل القدر علماء کرام اور دیگر ہمدردانِ ملتِ اسلامیہ نے بھرپور حصہ لیا، مگر جلیانوالہ باغ امرتسر کے خونی حادثہ کے بعد علماء کرام نے اس امر کو شدت کے ساتھ محسوس فرمایا کہ علماء کرام کی اپنی ایک تنظیم ہونی ضروری ہے۔ چنانچہ مؤرخہ ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو بعد از نمازِ عصر امرتسر ہی میں اسلامیہ مسلم ہائی سکول کے وسیع کمرے میں جمعیۃ العلماء ہند کا پہلا جلسہ زیرِ صدارت حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی لکھنوی منعقد ہوا جس میں ۵۲ علماء کرام نے جو مختلف علاقوں سے تشریف لائے اس میں شرکت فرمائی جس میں جناب مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ نے جمعیۃ کی ضرورت اور اغراض و مقاصد کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"جمعیۃ العلماء ہند کے قائم کرنے سے کسی دوسری مذہبی یا سیاسی انجمن سے مصادمت یا مزاحمت مقصود نہیں ہے بلکہ علماء اپنی آواز کو وقیع بنانے کے لیے جمعیۃ منعقد کرتے ہیں، اور دُنیا میں ہمیشہ سے یہ قاعدہ چلا آتا ہے کہ افراد کی آواز اتنی وقعت نہیں رکھتی جتنی کہ متحدہ جمعیۃ اور انجمن کی رکھتی ہے، مسلم لیگ میں جب کبھی مسائل زیرِ بحث آتے ہیں علماء نے برابر اس میں حصہ لیا ہے، مسلم لیگ کا اجلاسِ دہلی اس بیان کا شاہدِ عدل ہے اور آئندہ جمعیۃ العلماء مسلم لیگ کے ساتھ اتفاقِ عمل رکھنے کی کوشش کرے گی، فرق صرف اِس قدر ہوگا کہ اب تک مسلم لیگ میں علماء کی شرکت شخصی اور انفرادی حیثیت سے تھی اور اب جمعیۃ العلماء کا فیصلہ مسلم لیگ میں بہ حیثیت ایک متفق دستور العمل کے پیش کیا جایا کرے گا۔ یہ صحیح ہے کہ علماء کے لیے اقتصادیات و شخصی اصلاح کے وسیع میدان کھلے ہوئے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ

اقتصادیات و شخصیات کی اصلاح کرنے میں علماء کی انفرادی حیثیت ہی مفید ہو اور انعقادِ جمعیۃ اس میں خلل انداز ہو بلکہ میں کہتا ہوں کہ انفرادی حیثیت کے اعتبار سے جمعیۃ العلماء کی متفقہ طاقت زیادہ اصلاح کر سکتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ اقتصادیات و شخصیات کی اصلاح تو علماء کا فرض ہو اور سیاسیات کو مذہبی دائرہ سے خارج سمجھ کر اُن لوگوں کے لیے چھوڑ دیا جائے جو مذہبی معلومات پر چنداں عبور نہیں رکھتے۔"

جمعیۃ العلماء ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس دہلی میں مورخہ ۱۹ تا ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کو منعقد ہوا، چونکہ حضرت شیخ الہندؒ اپنے خدام کے ہمراہ واپس تشریف لا چکے تھے اس لیے اس اجلاس کی صدارت آپ ہی نے فرمائی۔ چونکہ آپ بیمار تھے اس لیے آپ کا خطبۂ صدارت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے پڑھ کر سنایا، جس میں انگریزوں کے عالمِ اسلامی پر بے پناہ مظالم اور خلافتِ عثمانیہ کے ختم کرنے کی مذموم مساعی وغیرہ امور کا ذکر تھا جن کا تذکرہ "شیخ الہندؒ کے سیاسی طرزِ عمل میں تبدیلی" کے تحت عنوان میں ہو چکا ہے۔

(ف) حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے برادرانِ وطن کے ساتھ تحریکِ آزادی میں شرکت کو ضروری قرار دیا مگر اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"استخلاصِ وطن کے لیے برادرانِ وطن سے اشتراکِ عمل جائز ہے مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو، ہندوؤں اور مسلمانوں کے ان تعلقات کا اثر یہ نہ ہونا چاہیئے کہ مسلمان اپنے کسی مذہبی حکم کو بدلیں اور شعارِ کفر و شرک اختیار کرنے لگیں، اگر وہ ایسا کریں گے تو نیکی برباد گناہ لازم کی مثال اپنے اوپر منطبق کریں گے۔" (خطبۂ صدارت مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند ص ۱۶/ نقشِ حیات جلد ۲ ص ۲۹۰)

یہی اعلان حضرت شیخ الہندؒ کے جانشین حضرتِ مدنیؒ نے بار بار فرمایا جیسا کہ ۱۹۳۸ء میں ایک تقریر میں فرمایا:۔

"اگر وطن آزاد ہو جائے اور عقیدہ کو نقصان پہنچے تو ہمیں ایسی آزادی سے کوئی فائدہ نہیں۔" (صدق لکھنؤ، یکم اپریل ۱۹۳۸ء)

جمعیۃ العلماء ہند کا تیسرا سالانہ اجلاس لاہور میں مورخہ ۱۸ تا ۲۰ نومبر ۱۹۲۱ء کو زیرِ صدارت مولانا ابوالکلام آزادؒ منعقد ہوا، آپ نے بھی خطبہ صدارت میں خلافتِ عثمانیہ کے خلاف عیسائیوں کی سازش اور خلافت کی بقاء کی ضرورت پر جامع اور بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں جمعیۃ العلماء کے

طرزِ عمل کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا:۔

"جمعیۃ العلماء نے اور ذمہ دار جماعتوں نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ راستہ لڑائی کا نہیں ہے، جنگ کا نہیں، حرب کا نہیں ہے، قتال کا نہیں ہے، خونریزی کا نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم کو جو راستے اختیار کرنا ہے وہ امن شرعی اور پُرسکون ہے، ان کا یہ فیصلہ کسی شخصی رائے پر نہیں بلکہ فی الحقیقت اس کی بنیاد شریعت کے نظام پر ہے، اس روشنی پر ہے جو شریعت کی رُو سے ہمارے سامنے آتی ہے اور بتاتی ہے کہ ہمارے لیے وہ صحیح راہ ہو سکتی ہے جو ہم نے اختیار کی ہے اور جس کو ہمیں آخر تک پہنچانا ہے۔"

جمعیۃ العلماء ہند کا چوتھا سالانہ اجلاس ۲۴ دسمبر تا ۲۶ دسمبر ۱۹۲۲ء بمقام گیا زیرِ صدارت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند منعقد ہوا جس میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ نے بھی خلافت کی ضرورت اور انگریزوں کے اُن مظالم کو بیان فرمایا جو ان ظالموں نے کیے تھے، جنہوں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ یہ جنگ مذہبی نہیں اور ممالکِ اسلامیہ کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا، اس جھوٹے وعدے کی رُو سے انگریزوں نے ہندوستان سے پندرہ لاکھ سپاہی بھرتی کیے اور ان کی مدد سے ترکی کو فتح کیا۔ صاحبِ صدر نے اپنے خطبۂ صدارت میں چنگیز خان کے ظہور (۶۱۶ھ) سے لے کر آخر تک کے سارے انقلابات کا جائزہ لیا، اور غازی مصطفےٰ کمال پاشا، غازی انور پاشا اور غازی امیر امان اللہ خان کی سیاسی بصیرت کا ذکر فرمایا، آپ نے علماء ہند کو سیاسی جماعت بنانے پر ایک اہم ضرورت کی تعمیل قرار دیا، آپ نے اس مغالطہ کا کہ "مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں"، جواب دیتے ہوئے فرمایا:۔

"اگر سیاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں یا علماء کا ان مسائل میں دخل دینا اُن کے فرائض میں داخل نہیں ہے تو میرے خیال میں کتبِ فقہ ہی سے ابوابِ جہاد و سیر وغیرہ کو نکال دینا چاہیئے، اور جب ایسا نہیں ہو سکتا تو آپ سمجھ لیجئے کہ معاملاتِ سیاست کے اُس حصہ میں جس کا تعلق مذہب سے ہے علماء کی راہنمائی کی زیادہ ضرورت ہے۔"

جمعیۃ العلماء ہند کا پانچواں سالانہ اجلاس بمقام کوکناڈا ۲۹ دسمبر ۱۹۲۳ء زیرِ صدارت حضرتِ مدنیؒ منعقد ہوا جس کی تفصیل عنوانِ خلافت میں گذر چکی ہے۔ اس کے بعد بھی سالانہ اجلاس ہوتے رہے جن کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:۔

جمعیۃ العلماء ہند کا چھٹا سالانہ اجلاس بمقام مرادآباد ۱۱ تا ۱۳ جنوری ۱۹۲۵ء

کو ہوا جس میں خطبہ صدارت ابوالمحاسن محمد سجاد نقشبندی نے ارشاد فرمایا، اس میں دیگر مسائل کے علاوہ آپ نے خلافتِ اسلامیہ پر پوری توجہ مبذول کرنے کے لیے فرمایا:۔

"سب سے بڑھ کر اُمّ المسائل (مسائل کی ماں) مسئلہ خلافت ہے جو ہنوز لاینحل ہے بلکہ حق یہ ہے کہ گذشتہ چند سالوں کے اعتبار سے خلافت اسلامیہ کا مسئلہ اس وقت سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ پہلے صرف اعداءِ دین اس کے تباہ و برباد کرنے کی فکر میں تھے اور اس کے نام و نشان کو تمام دُنیا سے مٹا دینا چاہتے تھے لیکن اب حال یہ ہے کہ خود مسلمان ہی نے اپنے ہاتھوں خلافت کو اُلٹ دیا اور آج دنیائے اسلام اس وقت بلا خلیفہ کے زندگی بسر کر رہی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

اس کے علاوہ آپ نے علماء کو سیاسیات میں دخل دینے کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا سیاست عین دین ہے۔"

جمعیۃ العلماء ہند کا ساتواں سالانہ اجلاس بمقام کلکتہ ۱۱ تا ۱۴ مارچ ۱۹۲۶ء

کو ہوا جس میں خطبہ صدارت مولانا سید سلیمان ندوی نے ارشاد فرمایا۔ آپ نے دیگر مسائل کے علاوہ دُنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے مذہبی پیشوا کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا:۔

"اسلام کا اصول اس بات کا بھی متقاضی ہے کہ تمام دنیائے اسلام میں مسلمانوں کا ایک مذہبی پیشوا اور امام ہو، اُس کا واحد وجود تمام دُنیا کی مسلمان قوموں کیلئے رشتۂ اتحاد اور رابطۂ وحدت کا کام دے اور مذہبی شعار و نگہداشت اور اجراء کا فرض انجام دے، اس کا نام خواہ تم حکم خلیفہ رکھو، امام رکھو یا امیرالمؤمنین رکھو۔"

آپ نے عربوں کی خلافت سے بغاوت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"بعض یورپین اہلِ قلم نے یہ کہا کہ خلافتِ اسلامیہ کو اصولِ اسلام کی حیثیت سے تسلیم تو کر لیا مگر مجدد اسلام بن کر انھوں نے پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں کو اُن کی ایک عظیم الشان غلطی پر متنبہ کیا الائمۃ من القریش تُرک اس کے مستحق نہیں، ان کو ہٹا کر مکہ معظمہ کی چار دیواری میں عربی ہاشمی خلافت قائم کرو اس جماعت کے

سرکردہ مشہور ہمدرد اسلام بلنٹ (BLUNT) تھے، دوسروں نے ترکوں کے شرعی خلیفہ ہونے سے بحیثیت مفتی اسلام انکار کیا، یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور ہم کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے"۔

——— آپ نے مسلمانوں کو ملکی حقوق ادا کرنے اور ان کا تحفظ کرنے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

"ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ دیارِ اسلام کو دشمنوں سے آزاد کرائے اور اس راہ میں اپنی جان تک کی قربانی کو گوارا کرے، وہ جس ملک میں بھی ہو اُس ملک کے حقوق کا ادا کرنا ضروری ہے، صحابہ (رضی اللہ عنہم) حبش کے بادشاہ نجاشی کے سامنے اپنی خدمات پیش کرتے ہیں اور ملک کی حفاظت میں حبشیوں کے ساتھ شرکت کرتے ہیں"۔

جمعیۃ العلماء ہند کا آٹھواں سالانہ اجلاس بمقام پشاور از ۲ تا ۴ دسمبر ۱۹۲۷ء کو ہوا جس میں خطبۂ صدارت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے ارشاد فرمایا جس میں آپ نے علماء کرام کا فرض اور اُمت کا فریضہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

"پس اگر علماءِ اُمت وظیفۂ دماغ کو باحسن وجوہ انجام دیتے رہیں یعنی علوم و معارف کا صحیح نشر و ابلاغ کرتے رہیں اور مہماتِ عمومیہ و خصوصیہ میں صحیح راہنمائی کا فرض انجام دیتے رہیں تو افرادِ خلق بھی اعمالِ صحیحہ بجالانے میں دست و پا کا کام دیتے ہیں اور نظامِ عالم نہایت منظم اور صحیح طور پر قائم رہتا ہے"۔

——— آپ نے مسلمانوں کی ملی وحدت پر زور دیتے ہوئے فرمایا:۔

"حضرات یہ امر مسلم ہے کہ مسلمانوں کی قومیت کی اساس و بنیاد بجز رابطۂ دینی اور اخوتِ مذہبی اور کسی چیز پر قائم نہیں ہے، سوائے قوم عرب اور قوم ترک اور قوم افغان کے جو بحیثیتِ نسل بھی مسلمان ہیں اور کوئی قوم بحیثیتِ نسل یا بحیثیتِ وطن اسلام میں منحصر نہیں بلکہ ہر ملک کی ہر ایک قوم میں مسلم اور غیر مسلم دونوں ہیں، اسلامی قومیت کا مدار اتحادِ نسل یا اتحادِ وطن پر نہیں ہو سکتا تو اس صورت میں اسلامی قومیت کی زندگی اور بقاء صرف دین، مذہب و ملت کے احیاء اور بقاء میں مضمر ہے، اگر رابطہ خدانخواستہ درمیان سے اُٹھ جائے تو مسلم قوم اسی روز تہہ خاک دفن ہو جائے اور اس کا وجود من حیث القوم ہرگز باقی نہیں رہ سکتا"۔

——— اسی ربط کو باقی رکھنے اور مسلمانوں کے رشتۂ اخوت کو اُستوار کرنے کے لیے جمعیۃ العلماء ہند نے جو

خدمات سرانجام دی ہیں حضرت شاہ صاحبؒ نے ان کو ذکر کرتے ہوئے فرمایا :۔

"جمعیۃ علمائے ہند نے ہندوستان کے مسلمانوں کے قلوب میں روحِ ملی تازہ کردی اور ان کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور حقوقِ مذہبیہ اور قومیہ کے حصول کیلئے تحمل مصائب و مشاق کا خوگر بنا لیا یہی وجہ ہے کہ گذشتہ دور ابتلاء میں علماء صادقین کی بہت بڑی جماعت نے قید و بند کی مصیبتیں برداشت کیں، کراچی کے مشہور مقدمے میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا نثار احمد اور مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی و ڈاکٹر سیف الدین کچلو زعمائے ہند کے ساتھ ساتھ شریکِ ابتلاء تھے اور دونوں کو ایک ہی پیالہ سے اقتدار اور استبداد کی شراب کے تلخ ترین گھونٹ پلائے گئے تھے۔"

آپ نے جنگِ آزادی میں مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان ایک ایسے معاہدے پر زور دیا جس میں مسلمانوں کے حقوق کا پورا تحفظ ہو، آپ نے فرمایا :۔

"میں نہایت بلند آہنگی کے ساتھ برادرانِ وطن کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ معاہدہ کریں اور اس معاہدہ کو دیانتداری اور اخلاص کے ساتھ پورا کریں، سیاسی چالوں اور نمائشی پالیسی سے کام نہ لیں تو مسلمانوں کو پورا وفادار اور مخلص ہمسایہ پائیں گے۔"

اس کے بعد آپ نے اس میثاق کا ذکر فرمایا جو حضور سیدِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے ساتھ فرمایا تھا۔

جمعیۃ العلماء ہند کا نواں اجلاس بمقام امروہہ ۳ مئی تا ۶ مئی ۱۹۳۰ء کو منعقد ہوا جس میں خطبۂ صدارت علامہ شاہ معین الدین اجمیریؒ نے ارشاد فرمایا جس میں مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا :۔

"مسلمان نازک دور سے گذر رہے ہیں اس میں اگر انھوں نے حزم و احتیاط اور دور اندیشی سے کام نہ لیا اور بلا امتیاز ہر ایک راہبر کے پیچھے لگ گئے تو نہ صرف یہ کہ ان کو بے حد مشکلات کا سامنا ہوگا بلکہ قوی اندیشہ ہے کہ ان کی ہستی خطرہ میں پڑ جائے اور وہ صفحۂ دہر میں حرفِ غلط کی طرح محو ہو کر رہ جائیں۔"

چونکہ اُس زمانہ میں شارداایکٹ حکومت نے منظور کر لیا تھا اس لیے اس کے خلاف مسلمانوں کو متوجہ کرتے ہوئے اس امر سے آگاہ فرمایا کہ انگریزی حکومت شرعِ محمدی (علیٰ صاحبہا الف الف سلام) میں بتدریج تبدیلیاں کر رہی ہے، اس لیے آپ نے علماء کو سیاسی قیادت سنبھالنے پر آمادہ کرتے ہوئے فرمایا :-

"علماء کی سیاست یا سیاست دانی میں اگر کوئی نقص ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ حکومت غیر ہونے کی وجہ سے کوئی کام اُن کے ہاتھ میں نہ رہا، حکومت نے نہ خود ان کو کسی کام پر لگایا نہ ایسا موقع دیا کہ وہ بطور خود کچھ کام کر سکتے، اس طرح اُن کو مجبور و بے دست و پا کر کے جب سیاسی امور سے پورا نابلد کر دیا تو وہ لوگ جو حکومت کے کل پُرزے بلکہ صحیح معنوں میں حکومت کے مظاہر قدرت ہیں، علماء پر زبانِ طعن دراز کرنے لگے کہ یہ کوچۂ سیاست سے ناآشنا ہیں بلکہ مذہب خود سیاست سے بیگانہ ہے، حکومت کا جو مقصد تھا حکومت کے ان مظاہر قدرت نے پورا کیا اس پر لُطف یہ کہ مشائخ اور علماء کی ایک سادہ لوح جماعت نے اس پروپیگنڈے سے مرعوب اور متاثر ہو کر قولاً اور عملاً اس کی تائید بھی کر دی کہ مذہب کو سیاست سے کوئی علاقہ نہیں گویا انھوں نے اپنے قول اور طرزِ عمل سے مذہب کو غیر مکمل تسلیم کرانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، اور اپنے جمود و تعطّل کو بہترین تقدّس تصوّر کرنے لگے"۔

جمعیۃ العلماء ھند کا دسواں سالانہ اجلاس بمقام کراچی از ۳۱ مارچ تا یکم اپریل ۱۹۳۱ء ہوا جس میں خطبۂ صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے ارشاد فرمایا، آپ نے صوبہ سرحد کی سُرخپوش جماعت کی قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :-

"۲۳ اپریل کو پشاور میں جو خُونی حادثہ پیش آیا اُس نے تمام ہندوستان کا سر بلند کر دیا کہ صوبہ سرحد کے مسلمان کسی سے پیچھے نہیں"۔

آپ نے اس خطبہ میں مسلمانوں کو سیاسیات میں پوری طرح داخل ہونے کے لیے متوجہ کرتے ہوئے فرمایا :-

"تمہارے راہنما کہتے ہیں کہ مسلمان مفلس ہیں، جاہل اور تعلیم میں پیچھے ہیں اس لیے

ان کا سیاست میں شامل ہونا نقصان دہ ثابت ہوگا، لیکن انہوں نے یہ نہ سوچا کہ مسلمانوں کو سیاست سے علیحدہ رکھنے کے لیے خواب آور گھونٹ پینا ان کی خودکشی اور موت ہے، مسلمان حکومت کے ہاتھ میں ایک ایسا پتھر بن کر رہ گئے ہیں کہ جب بھی کوئی آزادی کی تحریک جاری ہو اور احرار میدان میں آئیں تو حکومت اس پتھر سے اُنکے سروں کو پھوڑ دے"۔

اِسی مختصر مگر جامع خطبہ میں آپ نے مسلمانوں کے لیے اپنے شرعی احکام کے تحفظ کی ضرورت پر توجہ دلائی، آپ نے فرمایا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان جیسی قلیل جماعت کے لیے مذہبی احکام کے تحفظ کی ضرورت ہے۔ نکاح، طلاق اور وراثہ کے قوانین مسلمانوں کے لیے محفوظ ہونے چاہئیں، عدالتوں میں جو قوانین مروج ہیں اور جن کو "محمڈن لا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ سخت ناقص اور مسلمانوں کے لیے مُضر ہیں اور ان سے مسلمانوں کا تحفظ نہیں ہوسکتا۔ مسلمانوں میں بعض ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو نہ تو عورتوں کے ساتھ تَسرِیحٌ بِاِحسَان کا سلوک کرتے ہیں (کہ ان کو حق مہر وغیرہ ادا کرکے طلاق کر دیں) اور نہ اُن کے حقوق ادا کرتے ہیں بلکہ ان کو معلق (نہ اِدھر نہ اُدھر) رکھ چھوڑتے ہیں، عدالتوں سے جواب ملتا ہے کہ طلاق کے سوا عورتوں کی بہتری کے لیے کوئی اور صورت "محمڈن لا" میں موجود نہیں، ان وجوہ کی بناء پر عورتوں کی زندگیاں خراب ہو رہی ہیں حالانکہ فقہ حنفیہ میں ان تمام مشکلات کا حل موجود ہے"۔

جمعیۃ العلماء ہند کا گیارہواں سالانہ اجلاس بمقام دہلی از ۳ تا ۵ مارچ ۱۹۳۹ء منعقد ہوا جس میں خطبہ صدارت مولانا عبدالحق مدنی نے ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ کا اصلی متن اُردو زبان میں تھا جو مرتبہ خطبات محترمہ پروین روزینہ کو نہ مل سکا، آپ کے خطبہ کا انگریزی میں جو ترجمہ کیا گیا تھا اس سے اُردو زبان میں کچھ حصے نقل کیے گئے ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا۔

"آپ نے سب سے زیادہ ضرورت مسلمانوں کی تنظیم کو قرار دیا تاکہ مسلمان اپنے دونوں مذہبی و تہذیبی حقوق اور خاص طور پر اسلامی قانون کی حفاظت کر سکیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے تجویز پیش کی کہ ایسی عدالتیں قائم کی جائیں جن کے صدر قاضی ہوں"۔

چونکہ مسئلہ فلسطین نیا نیا پیدا ہوا تھا اس کے بارے میں آپ نے فرمایا :۔
"ہندوستان کے مسلمان اس اہم مسئلہ کو حل کرنے میں مؤثر امداد دے سکتے ہیں بشرطیکہ وہ پہلے غیر ملکی جوئے کو اپنے کندھوں سے اتار پھینکیں ۔"

جمعیۃ العلماء ھند کا بارہواں سالانہ اجلاس بمقام جون پور مورخہ ۷ تا ۹ جون ۱۹۴۰ء منعقد ہوا جس میں آپ کو باضابطہ صدر بنایا گیا اور یہ اعزاز آخر تک آپ کے پاس رہا ۔ (الجمعیۃ دہلی، فروری)

اس بارہویں اجلاس کے خطبۂ صدارت کا ایک حصہ ہدیۂ ناظرین ہے، آپؒ نے فرمایا :۔
"موجودہ تمدن کا سارا لب لباب منافقت ہے لوگ اپنا عقیدہ ظاہر کرتے ہیں لیکن عملاً اپنی جانیں تک مال پر قربان کرتے رہتے ہیں، زبانوں پر آزادی کا دعویٰ رہتا ہے لیکن جو آزادی کے علمبردار ہوتے ہیں ان ہی کو سزائیں ملتی ہیں (دعویٰ مسیح کی پیروی کا ہے اور اطاعت مسولینی وغیرہ کی کی جارہی ہے) عزت کے الفاظ عصمت کے متعلق استعمال کیے جاتے ہیں لیکن عملی زندگیاں حرامکاری اور آتشک کے لیے وقف ہیں، زبانی داد سچائی کی دیتے ہیں لیکن عملاً اقتدار اور اختیار کی کرسیوں پر بددیانتوں ہی کو بٹھائے ہوئے ہیں، زبانوں پر اخوت کے نعرے ہیں لیکن جو بھائی ان کی جنگ یا وطنیت یا قومیت کے بدمستانہ جلوسوں میں شریک نہیں ہوتے ان کیلئے جیل خانہ ہے یا جلاوطنی یا بندوق کی گولیاں ۔"

ہندوستان کی آزادی کو دوسری اقوام کے لیے بھی ضروری قرار دیتے ہوئے فرمایا :۔
"محترم بزرگو! حالاتِ موجودہ اور زیادہ مجبور کرتے ہیں کہ آزادیٔ ہند کیلئے اپنی مساعی میں زیادہ سے زیادہ سرگرمی عمل میں لائی جائے اور تمام خلق خدا کو عموماً اور اہلِ ہند کو خصوصاً اسی ذریعہ سے ہر قسم کے عذابِ الیم سے نجات دلائی جائے، ہماری غلامی نہ صرف ہمارے لیے باعثِ مصائب و آفات ہے بلکہ بہت سی غیر ہندوستانی قومیں بھی اس کی وجہ سے انتہائی تکلیف میں مبتلا ہیں ۔"

چونکہ ان دنوں میں لاہور کی مسجد شہید گنج کا فیصلہ پریوی کونسل نے مسلمانوں کے خلاف کیا تھا، اس پر احتجاج کرتے ہوئے حضرتِ مدنیؒ نے فرمایا :۔
"اس وقت ہم یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ پریوی کونسل نے مسجد شہید گنج

کے متعلق جو فیصلہ قبضۂ مخالفانہ کی بناء پر کیا ہے نہایت ہی غلط اور قابلِ نفرت ہے اور اعلانِ شاہی کوئین وکٹوریہ کے بھی سراسر مخالف ہے، مساجد اور وقف زمینیں کسی طرح بھی قبضۂ مخالفانہ کی بناء پر مملوک نہیں ہو سکتیں، جمعیۃ العلماء نے اپنی گذشتہ تجاویز میں اس کے متعلق پوری روشنی ڈال دی ہے، مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ مساجد اور اوقاف کو قبضۂ مخالفانہ اور تمادی کے قوانین سے مستثنےٰ کرانے کی پوری جد و جہد کریں"

جمعیۃ العلماء ہند کا تیرھواں سالانہ اجلاس بمقام لاہور ۲۰، ۲۱، ۲۲، مارچ ۱۹۴۲ء کو حضرت مدنیؒ ہی کی زیرِ صدارت منعقد ہوا، اس میں آپ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اُس کے ضروری اقتباس اور اس کا چشم دید حال اسی عنوان سے چودھویں اجلاس کے مختصر حال کے بعد آرہا ہے۔

جمعیۃ العلماء ہند کا چودھواں اور متحدہ ہندوستان میں جمعیۃ العلماء کا آخری اجلاس منعقدہ سہارنپور مورخہ ۴، ۵، ۶، مئی ۱۹۴۵ء میں حضرت مدنیؒ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں یہ بھی فرمایا کہ:

"باوجودیکہ ہندوستانیوں نے تمام میدانوں میں انتہائی جرأت اور بہادری سے کام کیا ہے اور بسا اوقات اس قدر جوانمردی سے لڑے ہیں کہ یوروپین اور امریکن، کینیڈین، آسٹریلین، نیوزی لینڈ وغیرہ کے سپاہی اُس کا آدھا تہائی بھی نہیں کر سکے مگر ہندوستانی اب بھی بالائی عہدوں سے محروم ہیں، بڑی بڑی تنخواہیں اور سمندری الاؤنس صرف یوروپین کے لیے مخصوص ہیں، اُن (ہندوستانیوں) کے سپاہیوں اور افسروں کو خواہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں اب بھی یوروپین چھوٹے اور بڑے افسروں کے سامنے جھکنا پڑتا ہے، وہ اب بھی وائسرائے ہند کے غلام کہے جاتے ہیں اور یوروپین سپاہی اور آفیسر شہنشاہی سپاہی شمار ہوتے ہوئے نسلی اور قومی افتخار اور تمیز کے نشے میں سرشار پائے جاتے ہیں۔

صوبہ سرحد میں آزاد قبائل کی سول آبادی پر ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے بمباری کی گئی بلکہ بعض قبائلی علاقوں پر پانچ مہینے تک برابر جاری رہی، حالانکہ مجلسِ اقوام اور اس کے شرکاء نے جس میں سے خود برطانیہ بھی تھی اُس کو وحشیانہ اور سخت قابلِ نفرت اور ناجائز فعل قرار دیا تھا اس پر مرکزی اسمبلی میں جبکہ ہال میں سوال اٹھایا گیا تو وزیر جنگ کا

جواب اس قدر تلخ اور نازیبا اور مستبدانہ تھا کہ بقول نوابزادہ لیاقت علی خان جنرل ڈائر (GENERAL DYER) کی یاد تازہ ہوگئی۔

ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد اور قربانیوں کی اشد ضرورت

میرے محترم بزرگو! وہ وجوہ ہندوستان کی آزادی کی اشد ضرورت اور اس کے انتہائی جدوجہد کی فرضیت کی جو کہ تحریک خلافت کے وقت سے بلکہ اس سے پہلے آپ کے سامنے لائی گئی تھی اور لائی جاتی رہیں وہ سب تو بعینہٖ باقی ہی ہیں اور بار بار آپ کے سامنے دہرائی گئی ہیں، ان کے ساتھ اس تیرہ و تاریک محکومیت کے یہ واقعات جو کہ مشتے نمونہ از خروارے ہیں، پیش کر کے میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا اب بھی کسی صاحب دین و دل اور صاحب غیرت کو اس میں شبہ کرنے یا گفتگو کرنے کا موقع باقی رہ جاتا ہے کہ یہ آزادی کی جدوجہد انتہائی ضروری ہے اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی کے لیے ہر ہندوستانی کو تیار ہونا عقلاً، شرعاً، انسانیۃً فرض ہے۔ ایسی غلامی میں نہ مذہب محفوظ ہے، نہ زندگی رفاہیت و امن کی ہے نہ خوشحالی، نہ جماعتوں کے لیے زندگی ہے اور نہ افراد کے لیے، نہ ہندوستان کے لیے امن و چین ہے، نہ آپ کی بیرونِ ہند کی اسلامی اور انسانی برادریوں کے لیے۔ یہی وہ امور ہیں جن کی بناء پر جمعیۃ العلماء ۱۹۱۹ء سے سر بکف چلی آتی ہے وہ اپنے اصول پر برابر قائم ہے۔

محترم بزرگو! اس غلامی کی لعنتوں سے نکلنا اور آزادی حاصل کرنا مسلمانوں کا فرض اور نصب العین ہے اور ہندو، سکھ، پارسی وغیرہ کا بھی فریضہ اور نصب العین ہے، ہر ایک اپنے لیے جدوجہد کرتا ہے اور کرے گا کسی کا دوسرے پر احسان نہیں ہے تمام باشندگانِ ہند اس ملعون غلامی سے برباد ہو رہے ہیں۔"

(ف) جمعیۃ العلماء ہند کے ان تمام اجلاسوں کی مفصل کاروائی اور علمائے کرام کی تقاریر و خطبہائے صدارت پڑھنے سے سب علماء کرام کی سیاسی بصیرت اور ان کے کردار اور محنت کا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے کس قدر گہری بصیرت سے ہندوستان کے حالات کا مشاہدہ فرما کر امت کی راہنمائی کا فریضہ ادا کیا تھا۔ جزاہم اللہ خیر الجزا

مگر ان سب علماء کرام اور محسنینِ ملتِ اسلامیہ میں سے حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی حیثیت اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ آپ نے قیامِ مدینہ منورہ اور پھر اسارتِ مالٹا کے دوران جہاں اپنے شیخ سے علمی، دینی، روحانی بلکہ سیاسی فیوضات حاصل کیے تھے وہاں آپ نے شدید رکاوٹوں کے باوجود دنیا بھر کے اُن سیاسی اسیروں سے بھی تبادلہ خیالات کیا تھا جو اسی انگریز قوم اور دوسری عیسائی اقوام کے مظالم کا شکار ہو چکے تھے اور انگریز کے اُن مظالم کو بچشمِ خود ملاحظہ فرمایا تھا جو مقدس سرزمین حجاز پر ڈھائے گئے تھے اس لیے انگریز سے نفرت اُن کو طبعاً اور شرعاً تھی، آپ کے نزدیک نہ صرف برصغیر بلکہ کل عالمِ اسلامی کی پریشانیوں کا واحد علاج انگریزی پرچم کا سرنگوں کرنا تھا، اسی جرم کی پاداش میں کراچی کی قید اور پھر مراد آباد کی قید اور طویل نظر بندی صرف آپ ہی نے برداشت کی تا آنکہ انگریز کا پرچم سرنگوں ہوا اور وہ برصغیر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گیا جہاں سے انگریزوں کو چند ٹکوں کے عوض میں وہ سپاہی مل جاتے تھے جو اپنی جان بلکہ کبھی کبھی اپنا ایمان بھی ان دشمنانِ اسلام کے لیے نثار کر دیا کرتے تھے۔ جزاھم اللہ خیر الجزاء عن سائر المسلمین۔ (آمین)

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی معلومات میں منفردانہ حیثیت

اللہ تعالیٰ نے حضرتِ مدنیؒ کو جس طرح علومِ اسلامیہ، احسان و سلوک میں ایک ممتاز حیثیت سے نوازا تھا جس کا کچھ ذکر گذر چکا ہے۔ اسی طرح سیاسی معلومات اور ان کو بیان کرنے کے لیے بھی آپ کو ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی، آپ نے سیاسی پلیٹ فارم پر کبھی بھی صرف سُنی سنائی چند گنی چنی باتوں یا حوالوں پر اکتفاء نہیں فرمایا تھا بلکہ آپ کا عمل سے

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج نہ ہو سکے گا حریفِ سنگ

پر تھا۔ جن لوگوں نے آپ کی سیاسی تقاریر سُنی ہیں یا سیاسی خطبات یا نقشِ حیات کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ حضرتِ مدنیؒ کی سیاسی معلومات سب سے فائق تھیں، آپ کی نظر دنیا کے دیگر ممالک پر تھی، تقریر میں دیگر ممالک کی معاشی، اقتصادی حالت سے ہندوستان کی ابتر معاشی اور اقتصادی حالت کا یوں موازنہ فرماتے تھے کہ انصاف پسند سامعین انگریزی حکومت کو ہندوستانیوں کا خون چوسنے والا یقین کر لیتے تھے، بعض دفعہ سیاسی سٹیج پر ہونے والی تقریروں کی اس طرح اصلاح فرماتے تھے کہ بڑے سے بڑے سیاست دان دم بخود رہ جاتے تھے۔ مشہور عالمی سکالر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مدظلہ العالی نے اپنا مشاہدہ یوں بیان فرمایا ہے :-

"۱۹۲۸ء کی بات ہے لکھنؤ کی مشہور سفید بارہ دری میں آل پارٹیز کانفرنس ہو رہی تھی اور نہرو رپورٹ پیش تھی، شب کی نشست میں مرحوم تصدق احمد خان شیروانی نے کسی تجویز پر تقریر کی اور اس میں کچھ اعداد و شمار پیش کیے، ان کی تقریر کے بعد ایک بزرگ کھڑے ہوئے، جُبّہ و دستار میں ملبوس عربی قبا اور ہندوستانی عمامہ، لیکن عجیب بات یہ کہ شیروانی مرحوم (جو کہ ایک کُہنہ مشق سیاسی لیڈر تھے) کے پیش کردہ اعداد و شمار کی تصحیح فرمائی، متجسس نگاہوں کا جواب تھا "مولانا حسین احمد مدنی"" (پرانے چراغ ص۹۶)

عابد الوحیدی الحسینی نے ارباب سیاست کا ایک قول نقل کیا ہے کہ :-

"گو کھلے کے بعد تاریخی اعداد و شمار کو اس قدر برجستہ بیان کرنے والا مولانا مدنیؒ کے سوا اور کوئی نہیں پیدا ہوا" (سیاسی مطالعہ ص۱۰۹)

سب سے بڑی تعجب خیز بات یہ ہے کہ آپ اس قدر مصروف زندگی میں جس میں چند لمحات بھی آپ کے فارغ نہ ہوتے تھے اتنا وقت کس طرح نکال لیتے تھے اور اس قدر سیاسی لٹریچر کہاں سے مہیا فرما لیتے تھے کہ ناظرین اور سامعین اس کو صرف ایک کرامت ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ آپ کی سیاسی ڈائری کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس سے زیادہ تعجب ہوتا ہے۔

اسی طرح اسلامی تاریخ اور تاریخ عالم پر آپ کی گہری نظر تھی، اس کا اندازہ آپ کے اُن خطبات سے ہو سکتا ہے جو آپ نے تحریکِ خلافت کے زمانہ میں ارشاد فرمائے تھے۔

حضرتِ مدنیؒ کی سیاسی بصیرت

شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کی سیاسی بصیرت کی روداد جمعیۃ العلماء کی سرگرمیوں کے جائزے کے بغیر نامکمل رہے گی۔ برصغیر کے اس صدی کے نصف اول کی تاریخ میں مسلمانوں کی سیاسی تگ و تاز کا جائزہ لینے والے اہلِ نظر کو یہ شکوہ ہے کہ ملکی سیاست میں مسلمانوں کی کوئی معیّن پالیسی کبھی نہیں رہی۔ مگر میرے خیال میں اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی قیادت میں آزادیٔ ہندوستان تک جمعیۃ العلماء بڑی حد تک جس معین پالیسی پر کاربند رہی وہ یہ تھی کہ اس ملک میں الگ سے کوئی تن تنہا اسلامی انقلاب نہیں کر سکتے البتہ ایک برابر کے پارٹنر کی حیثیت سے برادرانِ وطن سے مل کر اگر وہ ملک کی آزادی

کی جد و جہد میں حصہ لیتے ہیں تو ضرور آزادی کے بعد نئے ہندوستان میں ان کو اس ملک میں اپنے مذہبی امتیازات کے ساتھ باوقار زندگی گذارنے کا موقع ملے گا۔

مولانا مدنیؒ کی قیادت میں جمعیۃ نے کانگریس کے ضمیمے کے طور پر کبھی کام نہیں کیا جیسا کہ کچھ لوگ اس کے بارے میں یہ رائے قائم کرتے رہے ہیں۔ ملک کے سیاسی مورخین خواہ اسے تسلیم نہ کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جمعیۃ نے اپنے ساتویں سالانہ اجلاس (بمقام کلکتہ ۱۹۲۶ء) میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صدارت میں آزادی کامل کی تجویز منظور کی تھی، اور جب کانگریس نہرو رپورٹ کے تارِ عنکبوت میں اُلجھی ہوئی تھی، جمعیۃ نے نہرو رپورٹ کو مسترد کر دیا تھا اور یہ ریزولیوشن منظور کیا تھا۔

"چونکہ برادرانِ وطن کے مخالفانہ طرزِ عمل سے منافرت کی خلیج وسیع ہو رہی ہے اس لیے مسلمان اپنی تنظیم کر کے اپنے بل پہ ملک کو آزاد کرائیں البتہ جو غیر مسلم حضرات اس بارے میں اتحادِ عمل کرنا چاہیں اُنکے ساتھ اتحادِ عمل کیا جائے۔" (مسلمانوں کا روشن مستقبل از طفیل احمد منگلوری ص۵۳۱)

اس موقعے پر جو نکات طے کیے گئے تھے وہ یقیناً جمعیۃ العلماء کو شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کی سرپرستی میں مسلمانوں کے سیاسی شعور کی تربیت اور دین کے ایک وسیع و جامع تصوّر سے ملّت کو روشناس کرانے کی سعی مبارک قرار دیئے جائیں گے، وہ نکات یہ تھے:۔

(۱) مسلم قوم عموماً اور علماء بالخصوص سیاسی امور میں غور و خوض کیا کریں۔

(۲) آزادیٔ ہند کے فریضہ ہونے کے وجوہ و اسباب کو نہایت غور و خوض سے دریافت کریں اور لوگوں کو سمجھائیں اور دیگر مذہبی امور کی اشاعت کی طرح اس کو بھی ضروری سمجھیں، آزادی اور دیگر حقوق کے سلب ہونے کی مضرتوں اور مفاسد کی اشاعت نہایت پُر امن طریقے سے کر کے ہر مسلمان کو زندہ کریں۔

۱۹۳۰ء کے نویں سالانہ اجلاس میں جو امروہہ میں منعقد ہوا، جمعیۃ نے کانگریس کمیٹیوں کی مہاسبھائی ذہنیت پر اظہارِ افسوس کیا اور گول میز کانفرنس میں شرکت کو کارِ لاحاصل قرار دیا۔ دسویں اجلاس میں جو بمقام کلکتہ ۱۹۳۱ء میں زیرِ صدارت مولانا ابوالکلام آزادؒ منعقد ہوا، جمعیۃ نے مسلمانوں کی تہذیب و شائستگی اور پرسنل لاء کی حفاظت کا مطالبہ کیا۔ اور اپنے گیارہویں اجلاس میں جمعیۃ نے ۱۹۳۹ء میں گاندھی جی کی واردھا تعلیمی اسکیم کو نامنظور کر دیا اور اس کے ساتھ ودیا مندر کی تعلیمی اسکیم سے اختلاف کیا، کانگریس سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کی حق تلفیوں کی تحقیقات کے لیے کمیٹی مقرر کرے۔ جمعیۃ نے ہندوستانی زبان کو سنسکرت

کے قالب میں ڈھالنے پر بھی اظہارِ افسوس کیا۔ ۱۹۴۰ء کے اجلاس میں جس کی صدارت خود حضرت شیخ الاسلامؒ نے کی اور جس میں مولانا کا خطبۂ صدارت اُن کی جرأت حق گوئی اور اظہارِ بیباکی کی وجہ سے انگریزی حکومت نے ضبط کر لیا، جمعیۃ نے اُن لوگوں کی مذمّت کی جو مسلم پیشہ ور برادریوں کو ذلیل قرار دے کر اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کر رہے ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں لاہور میں جمعیۃ نے مولانا حسین احمد مدنیؒ کی صدارت میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ مختلف فیہ مسائل پر ایک دوسرے کو سب وشتم نہ کریں اور باہمی تعاون کر کے مثل ایک دیوار کے ہو جائیں، جمعیۃ نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ اسلامی ممالک پر کسی اجنبی طاقت کا تسلط برداشت نہیں کرے گی اور ایسی آزادئ کامل کے لیے جدّوجہد کرتی رہے گی۔ اس میں مسلمانوں کے سماجی و تعلیمی مسائل پر بھی کچھ تجاویز منظور کی گئیں۔ سہارنپور کے اجلاس میں جو ۱۹۴۵ء میں شیخ الاسلام کی صدارت میں ہوا جمعیۃ العلماء نے مسلمانوں میں عسکری نظم پیدا کرنے کے لیے انصار اللہ رضا کاروں کو تقویت پہنچانے اور منظم کرنے کا فیصلہ کیا، اسکے علاوہ تنظیم مساجد اور ائمہ مساجد کے ذریعے مسلمانوں میں اصلاحی نظام عمل کی ترویج واشاعت پر زور دیا گیا، مسلمانوں کو تعلیم کے فروغ اور گھریلو صنعتوں کی طرف توجہ دلائی گئی۔ کانگریسی وزارت کے کچھ ارکین کی اردو کے سلسلے میں معاندانہ پالیسی کی مذمّت کی گئی اور مسلمانوں کے لیے ایسی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کا مطالبہ کیا گیا تاکہ غیر مسلم اکثریت مسلمانوں پر تعدّی نہ کر سکے۔ (سیاسی مطالعہ ص ۱۱۴)

ایک مغالطہ اور اس کا ازالہ

جمعیۃ العلماء ہند کے بارہ میں یہ پروپیگنڈہ ہوتا رہا کہ یہ کانگریس کی ذیلی جماعت ہے، حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ کانگریس میں غالب اکثریت ہندوؤں کی تھی، اُس نے بہت زمانہ بعد آزادئ ہند کا مطالبہ کیا اور دُوسرے ان امور میں جن کا تعلق قربانی سے تھا بہت پیچھے رہی۔

حضرتِ مدنیؒ نے جب جمعیۃ العلماء ہند میں عملی طور پر شرکت فرمائی تو حضرتؒ کی سیاسی سرگرمیوں کا اصل مرکز اور پلیٹ فارم شروع سے آخر تک جمعیۃ علماء ہی رہی، فکر اور پالیسی کے اتحاد کا موقع آیا تو حضرتؒ کانگریس کے بھی ممبر ہوئے اور بعض دوسری جماعتوں کے مؤید ومددگار بھی رہے، مگر اساسی اور اصولی طور پر نہ صرف یہ کہ جمعیۃ کے ممبر رہے بلکہ اپنی ابتدائی سیاسی زندگی کے وقت سے اس کی قیادت اور سرپرستی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ہر چند کہ علماء کرام کی یہ جماعت اپنے سیاسی نظریات کی بناء پر کانگریس سے کافی حد تک ہم آہنگ تھی مگر ان دونوں کے درمیان اختلافِ رائے کے نکات بھی موجود تھے۔ ملک کی دوسری جماعتوں

مسلم لیگ، خلافت کمیٹی آل پارٹیز وغیرہ کی طرح کانگریس اور اس کے افراد بھی برطانوی ہندوستان کی اسمبلیوں کی ممبری قبول کرتے تھے حکومت کے ساتھ مشورے اور میٹنگیں کرتے تھے، وزارتیں بناتے تھے، لندن کے سفر اور گول میز کانفرنسوں میں شرکت کرتے تھے، وائسرائے کی اور دوسرے انگریز افسروں کی پارٹیوں میں حاضر ہوتے تھے۔ ان سرگرمیوں کا نقشہ حضرت اکبر الہ آبادی نے بڑے بلیغ انداز میں کھینچا تھا ؎

کام لیڈر کو بہت ہیں مگر آرام کے ساتھ
قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ

اس کے برخلاف جمعیۃ علماء اُن بے غرض، بے نفس اور بے خوف علماء کی جماعت تھی جنہوں نے زندگی کے سارے ہی سکھ چین، دنیا کی سب راحتیں و آرام اور گھر بار کے تمام عیش و عشرت غرض سب ہی کچھ ملک اور قوم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیئے تھے۔ یہ حضرات برطانیہ کے ساتھ ہر قسم کے تعاون کو، اُن کی کونسلوں کی ممبریوں کو اور ان کی حکومتوں کی وزارتوں کو بے فائدہ اور ضیاع وقت بلکہ قومی مصالح کیلئے ناجائز قرار دیتے تھے جمعیۃ علماء ہند نے اپنے چوتھے اجلاس منعقدہ لاہور میں یہ تجویز پاس کردی تھی کہ برطانیہ کی کونسلوں کی ممبری حرام ہے۔

علماء کرام نے اب تک جو جدوجہد کی تھی جو قربانیاں دی تھیں اور جو جہاد کیا تھا وہ محض لوجہ اللہ اور اپنے بل بوتے پر کیا تھا اور اس باب میں کسی کی تائید یا تنقید کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ آزادیٔ وطن کے لیے اتحادِ فکر کے باوجود جس موقع پر اور جہاں بھی ضرورت ہوئی ان لوگوں نے کانگریس سے کھل کر اختلاف کیا۔ نہرو رپورٹ کے مسئلہ پر ایک مدت تک جمعیۃ علماء اور کانگریس میں اختلاف رہا اور جمعیۃ کے صدر مفتی کفایت اللہ نے رپورٹ کے خلاف بیان دیا۔ ۱۹۲۸ء میں ایک مسودۂ قانون شاردا ایکٹ کے عنوان سے پیش ہوا جس کی رُو سے کسی نابالغ لڑکی کا نکاح خلافِ قانون قرار دیا گیا، اس قانون کا مقصد ہندو عورتوں کی حفاظت تھا جن کی شادیاں چار پانچ برس کی عمر میں ہو جاتی تھیں، پانچ چھ برس کا شوہر کبھی کبھی بچپن ہی میں داغ مفارقت دے کر چھ سات برس کی بچی کو بیوہ کر جاتا تھا اور پھر اس بچی کو پہاڑ ایسی زندگی ایک ہندو بیوہ کے قانون کی رُو سے سسک سسک کر گذارنی پڑتی تھی۔ ہندو عورت کے لیے یہ بل مفید تھا مگر اسلامی شریعت میں اس بل سے بے جا دخل اندازی اور مخالفت ہوتی تھی، کانگریس نے اس کی حمایت کی مگر جمعیۃ العلماء نے پوری قوت کے ساتھ مخالفت کی اور اس کے خلاف جلسے اور مظاہرے کیے۔ بعض امور میں کانگریس کی طرف سے کھل کر مسلمانوں کے مفاد پر زد پڑتی تھی، جمعیۃ علماء نے علی الاعلان ایسے معاملات پر نکتہ چینی کی اور کانگریس کے رویہ پر اظہار ناراضگی کیا۔ کانگریس

برطانیہ کے ساتھ گفت و شنید اور اصلاحات کے مراحل میں تھی جب جمعیۃ علماء نے آزادیٔ کامل کا مطالبہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ اگر ہندو مسلمانوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ نہیں کر سکتا تو مسلمانوں کو اپنا راستہ خود تلاش کرنا چاہیئے، ۱۳۴۵ھ ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ نے اپنے اجلاس کلکتہ میں یہ ریزولیشن پاس کیا۔

"چونکہ برادرانِ وطن کے مخالفانہ طرزِ عمل سے منافرت کی خلیج وسیع ہو رہی ہے، اس لیے مسلمان منظم ہو کر اپنے بل بوتے پر ملک کو آزاد کرائیں، البتہ جو غیر مسلم حضرات اس بارے میں اتحادِ عمل کرنا چاہیں اُن کے ساتھ اتحادِ عمل کیا جائے"

جمعیۃ العلماء کی دینی خدمات کے سلسلہ میں ایک دلچسپ سفر

تحریکِ خلافت اگرچہ خالص اسلامی اور مسلمانوں کی تحریک تھی مگر اس میں ہندوؤں نے پوری ہمت سے حصہ لیا اور جلیانوالہ باغ کے ظالمانہ حادثہ کا ہندو مسلمان دونوں ہی شکار ہوئے، اس کے بعد احتجاجی جلسوں میں اتحاد اور یگانگت کا منظر دیکھ کر انگریز کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر اس اتحاد کو باقی رہنے دیا گیا تو یہ اُس کی حکومت کے لیے بہت خطرناک ہوگا، چنانچہ سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک شروع کر دی جس کا مطلب مسلمانوں کو ہندو بنانا تھا۔ جمعیۃ العلماء اگرچہ اتحاد کی حامی تھی مگر مذہب سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جمعیۃ العلماء ہند کا شعبۂ تبلیغ میدان میں اُترا اور اپنے تبلیغی وفود اُن علاقوں میں بھیجنے کا انتظام قائم کیا جو شدھی کی تحریک کے خاص میدان تھے اور ان علاقوں میں مذہبی مکاتیب اور مدارس قائم کرنے کا بھی خاص پروگرام بنایا جس کے لیے آریہ جیسی مالدار اور سرمایہ دار قوم کے مقابلہ میں سرمایہ کی ضرورت تھی۔ رنگون میں دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے مخیر حضرات نے اس سلسلہ میں مالی امداد کا ایک منصوبہ تیار کیا اور جمعیۃ العلماء ہند سے اپنا ایک وفد برما بھیجنے کی درخواست کی۔ اُس وقت برما ہندوستان ہی کا ایک صوبہ تھا۔ یہ وفد رنگون پہنچا۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا احمد سعید صاحب (جو اُس وقت جمعیۃ کے ناظم تھے) اس وفد کے ارکان تھے۔ مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب مرحوم بھی اس وفد کے ساتھ تھے۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے وہ اہلِ رنگون ہی کی دعوت پر دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تبلیغ کی طرف سے تشریف لے گئے تھے۔ (شدھی سنگھٹن کے مقابلہ میں دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تبلیغ کی طرف سے بھی مستقل کام ہو رہا تھا)

بہر حال یہ تینوں حضرات رنگون پہنچے، صوبہ برما کے اُس وقت کے انگریز گورنر نے یا اُس کی ہدایت

پر اس کے ماتحت کسی انگریز حاکم نے یہ حماقت کی کہ رنگون کے جن سورتی تاجروں نے ان حضرات کو دعوت دے کر بلایا تھا اور جو اس سلسلہ میں پیش پیش تھے، ان کو بلا کر اس نے کہا کہ آپ کے یہاں جو یہ تین عالم لوگ آئے ہیں اُن میں ایک آدمی مولانا حسین احمد بہت خطرناک ہیں اور گورنمنٹ کے دشمن ہیں اسلیئے اُن کو ہم یہاں تقریر کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ ان لوگوں نے کہا کہ اس وقت یہ وفد ایک بالکل دوسرے مقصد سے آیا ہے اس لیے اس کا کوئی شبہ بھی نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی گورنمنٹ کے خلاف تقریر کرے۔ لیکن اُس نے کہا نہیں! ہمیں معلوم ہے کہ وہ بہت خطرناک آدمی ہیں، اس لیے ان کو تقریر کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ بالآخر ان سورتی تاجروں نے (جو گورنمنٹ کی نگاہ میں بھی خاص وقار رکھتے تھے) اس کی ذمہ داری لی کہ کوئی تقریر گورنمنٹ کے خلاف نہیں ہوگی، تب اُس نے اجازت دی۔ ان بیچاروں نے یہ ساری بات حضرتؒ کے سامنے بھی ذکر کردی، حضرتؒ نے فرمایا آپ نے اچھا نہیں کیا کہ مجھ سے دریافت کیے بغیر وعدہ کر آئے، یہ صحیح ہے کہ گورنمنٹ کے متعلق کچھ کہنے کا اس وقت میرا ارادہ نہیں تھا لیکن اب مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں تقریر کروں اور گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں، لہٰذا آپ حضرات کیلئے اب یہی بہتر ہے کہ میں تقریر نہ کروں اور واپس چلا جاؤں، لیکن رنگون کے وہ حضرات کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے آخر میں انہوں نے عرض کیا کہ آج حضرت کی تقریر تو ضرور ہوگی اور جو حضرت کا جی چاہے وہی فرمائیں پھر جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ لیکن حضرت مولانا اس خیال سے کہ کہیں یہ بیچارے مشکلات میں مبتلا نہ ہوں برابر انکار فرماتے رہے، آخر میں حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے بھی اُنکی سفارش کی تو بڑی مشکل سے حضرتؒ اس بات پر راضی ہوئے کہ آج تقریر فرمادیں گے لیکن اس کے ساتھ یہ شرط لگادی کہ اس کے بعد میں کوئی تقریر نہیں کروں گا اور پہلے جہاز سے واپس چلا جاؤں گا۔ حضرت مولانا نے (انہیں کی خیر خواہی کیلئے) اس شرط پر اتنا اصرار کیا کہ ان لوگوں کو بادل نخواستہ ماننا پڑا۔۔۔ وقت آنے پر جلسہ شروع ہوا حضرت مولاناؒ نے خطبہ مسنونہ اور چند تمہیدی الفاظ کے بعد تقریر اس طرح شروع فرمائی کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں کے گورنر صاحب نے ہمارے محترم میزبانوں سے میرے بارے میں خطرہ کا اظہار کرکے میری تقریر کو روکنا چاہا تھا اور وہ حضرات اپنی سادگی سے یہ وعدہ کر آئے کہ میں گورنمنٹ کیخلاف کچھ نہ کہوں گا، مجھے انکے اس وعدے کا افسوس ہے لیکن بہرحال اب مجھے انکے وعدے کی لاج رکھنی ہے، اگر وہ یہ وعدہ نہ کر آتے تو میں تفصیل سے بتاتا کہ گورنمنٹ مجھے کیوں خطرناک سمجھتی ہے اور مجھے گورنمنٹ سے کیا شکایت ہے، میں تفصیل سے بتاتا کہ گورنمنٹ نے پوری اسلامی دنیا کو اور ہمارے ملک ہندوستان کو اور ہم ہندوستانیوں کو کتنا تباہ و برباد کیا ہے، اسی طرح آپ نے ڈیڑھ گھنٹہ تک تقریر فرماکر آخر میں چند جملے اصلی مقصد کے بارہ میں ارشاد فرمائے۔ (سیاسی مطالعہ ص ۶۴)

آزادی کے بعد
جمعیۃ العلماء کی سرگرمیاں

تقسیم کے بعد جس طرح دوسری سیاسی جماعتوں نے ملکی حالات کے مطابق اپنے اپنے پروگرام میں تبدیلی کر دی تھی اسی طرح جمعیۃ العلماء نے بھی اپنے لائحہ عمل میں تبدیلی کر دی تھی حضرتِ مدنیؒ سیاسیات سے علیحدگی اور مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں اتباعِ سنّتِ نبوی علیٰ صاحبہا الف الف سلام کی عملاً اتباع پر پوری توجہ فرماتے تھے تاکہ مسلمان اپنے کردار اور اعمالِ حسنہ کی برکت سے بھارت میں اسلام کا چراغ روشن رکھیں اور جس طرح حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ اور دیگر اولیاء کرام نے اپنے روحانی تصرّف سے اسلام کو پھیلایا یہ مسلمان بھی اُن ہی کے پیرو کار بن کر اسلام کی مزید اشاعت کریں۔

آپؒ نے جمعیۃ العلماء کے قیام کو ضروری سمجھا اور اپنی حیاتِ مبارکہ کے ان دس سالوں میں جمعیۃ العلماء کے زیرِ اہتمام پانچ سالانہ اجلاسوں میں بطورِ صدر جمعیۃ العلماء شرکت فرمائی اور جو خطباتِ صدارت ارشاد فرمائے وہ محفوظ ہیں، یہاں ان کے اقتباسات درج کیے جاتے ہیں ـــــ پہلا اجلاس منعقدہ بمقام بمبئی مؤرخہ ۲۷ اپریل ۱۹۴۸ء کے خطبۂ صدارت میں فرمایا :-

ـــــ "آزادی اور تقسیم کے بعد کے فسادات اور قتل و غارت گری کے لیے بھی حضرتؒ نے برطانوی پالیسی ہی کو ذمہ دار ٹھہرایا، حضرتؒ آج بھی اسی نظریہ اور مؤقف پر قائم تھے کہ اپنے مفادات کی خاطر سامراجی ذہن دونوں قوموں میں فساد اور افتراق جاری رکھنا چاہتا ہے.... آپ نے فرمایا: حدودِ پاکستان اور لاہور میں کچھ ایسے اصول اور نکات رکھے گئے کہ اعلانِ تصفیہ ایک ہولناک خانہ جنگی کا الٹی میٹم بن گیا اور ہر فرقہ دُوسرے کی تعداد کو زیادہ سے زیادہ کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مزید برآں بونڈری کمیشن جو کہ اختلافی اور نزاعی حدود کے تصفیہ کے لیے مقرر کیا گیا تھا بدقسمتی سے وہ ایسے فیصلے کی تلاش میں کامیاب ہو گیا جو محسوس طور پر مسلمانوں کے لیے اشتعال انگیز تھا۔ آپ نے ریڈ کلف کی تقسیم کے بارے میں اس طرف اشارہ کیا ہے، اس میں مسلمانوں کیلئے ناقابلِ اطمینان حدود مقرر کی گئیں اور یہ صرف اس لیے کیا گیا کہ مسلمان برطانیہ کے

سایۂ عاطفت میں رہنے پر مجبور رہوں۔ اس کی دلیل حضرت رحؒ نے یہ فرمائی کہ پنجاب خفیہ پولیس کے کمشنر مسٹر جنکنز (MR JENKINS) نے برطانیہ کی خفیہ پولیس کے ایک اعلیٰ افسر کو ۷ اراگست ۱۹۴۷ء کی تحریر میں پنجاب کلب لاہور سے ایک خفیہ خط لکھا جو لندن کے اخبارات میں شائع ہوا اس میں کنز نے لکھا تھا کہ "اُمید یہی ہے کہ حد بندی کمیشن کے فیصلے سے مسلمانوں میں بے چینی بڑھ جائے گی اور اگر ایسا ہوا تو مسلمان برطانوی حفاظت کے زمرہ میں رہنا پسند کریں گے" ـــــ آپ نے مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہوئے فرمایا کہ :-

"جس طرح یہ ضروری نہیں ہے کہ جو معاملہ پاکستان کے لیے مفید ہو وہ انڈیا کیلئے بھی ہو بلکہ بسا اوقات پاکستان اور ہند کے مفاد میں تضاد پیدا ہو سکتا ہے اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جو معاملہ پاکستانی مسلمانوں کے لیے مفید ہو وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بھی مفید ہو بلکہ ممکن ہے کہ کوئی معاملہ پاکستانی مسلمانوں کے لیے مفید ہو مگر ہندوستانی مسلمانوں کے لیے تباہ کن ہو جب مفادات میں ایسا تضاد ہو جائے تو سوال یہ ہے کہ ہمیں ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد کا لحاظ رکھنا ہوگا یا پاکستانی مسلمانوں کے مفاد کا؟ ظاہر ہے کہ ہم پر پاکستانی مسلمانوں کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی بلکہ وہ خود اپنے ذمہ دار ہیں۔ ہم پر ہندوستان کے تقریباً چار کروڑ مسلمانوں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہر صورت میں وہ شکل اختیار کرنی چاہیئے جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مفید ہو۔" (شیخ الاسلام ص ۶۸۳)

اجلاس جمعیۃ علماء لکھنؤ کی صدارت (۱۹۴۹ء)

آزادی ملے کچھ کم دو سال ہو چکے تھے مسلمانوں کے گوناگوں مسائل اور مشکلات روز بروز فزوں تر تھے، تعصب اور عناد کا معاملہ دوسرے صوبوں کے مقابلے میں یُو۔پی میں زیادہ نمایاں تھا۔ اس بار جمعیۃ علماء کا سولہواں اجلاس اسی صوبہ کی راجدھانی یُو۔پی میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زیرِ صدارت منعقد کیا گیا۔ اس میں حضرت رحؒ نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا وہ ہندوستانیوں اور خاص طور پر مسلمانوں کے لیے ایک قیمتی دستاویز ہے جس میں کچھ روشنی گذشتہ سیاست پر بھی ہے اور مستقبل کا لائحہ عمل بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس جگہ صرف اس خطبہ کی تلخیص ہی نقل کی جاتی ہے جس سے اصل کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا :۔

——"یہ برطانیہ کی سیاست بازی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی قومیں آپس میں برسرِ پیکار ہوئیں، برطانیہ نے دو قومی نظریہ کی ایجاد اسی مقصد کے لیے کی تھی کہ ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں اور اسی نظریہ کے ذریعہ سے نواکھالی، بہار، گڈھ مکتیشر، بمبئی، احمد آباد، الہ آباد اور پنجاب وغیرہ کی سرزمین کو ظلم وستم کے خون سے سینچ کر تقسیم کی بنیادوں کو مضبوط کیا گیا جس کے نتیجے میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ کانگریس جیسی قومی جماعت نے بھی تقسیم کو منظور کیا۔ جمعیۃ علماء ہند ایک اکیلی جماعت ہے جس نے آخر تک تقسیم کی پوری طاقت کے ساتھ مخالفت کی، دو سال کی قلیل مُدت میں ملک کے ہر فرد اور ہر طبقہ نے دیکھ لیا کہ تقسیم کے نتیجے میں لاکھوں ہندو مسلمان تباہ و برباد ہوئے اور موت کے گھاٹ اتر گئے، کروڑوں انسان بے در، بے گھر اور خانماں برباد ہو گئے۔ ہزارہا بہنوں، بیٹیوں اور بہوؤں کی عصمت و عفت کا دامن تار تار کر دیا گیا۔ یہ واقعات دل و دماغ میں زخم بن کر چبھ رہے ہیں مگر اس کے ساتھ ہمیں اتنا اطمینان ضرور ہے کہ ہمارے ہاتھ تقسیمِ ہندوستان کے خون سے پاک ہیں"——

اسی خطبہ کے آخر میں آپؒ نے ارشاد فرمایا :۔

——"آج ہر شخص سوال کرتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ یہ سوال وہی قوم کر سکتی ہے جس کے پاس اپنی تاریخ اور اپنا لائحہ عمل موجود نہ ہو، اسلام نے ہماری زندگی اور مستقبل کے لائحہ عمل کو ہمارے اپنے کردار، جدوجہد اور عمل پر موقوف رکھا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (سورۃ الرعد آیت ۱۱) یعنی عزت، ذلت، بلندی، پستی، کامیابی، ناکامی، اقبال مندی و نامرادی کی جو بھی حالت کسی قوم کی ہوتی ہے خدا اس میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے عمل اور کردار میں تبدیلی نہ پیدا کرے۔

اجتماعی اور قومی زندگی میں جو مشکلات اور ناکامیاں پیش آتی ہیں اُن کو لوگ خدا، قسمت یا قدرت پر محمول کر دیتے ہیں، مگر قرآنِ حکیم اس کا ذمہ دار خود ہمارے ہی کردار اور افعال کو قرار دیتا ہے، حق تعالےٰ فرماتے ہیں وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (سورۃ الشوریٰ ۳۰) جو مصیبت تم کو پیش آئی وہ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل اُن کے اپنے کردار، قوتِ عمل، اخلاقِ فاضلہ، صبر و انتظار اور حسنِ تعامل پر

موقوف ہے، اپنے ملک میں اپنا حصہ قوتِ عمل، محنت اور ترقی کی دوڑ میں حصہ لے کر حاصل کیجئے۔ ہندوستان ایک جمہوری اور سیکولر ملک ہے۔ اگر آپ کے پاس اہلیت اور قابلیت ہے تو یہاں آپ کے حقوق کوئی غصب نہیں کر سکتا، لیکن اگر کوئی قوم اپنے حقوق اور حصہ کی بھیک مانگتی ہے تو اس خیراتی زندگی سے موت اچھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں پر بڑا صبر آزما وقت آن پڑا ہے اور آئندہ اس سے بھی زیادہ حوصلہ شکن حالات پیش آئیں گے مگر یہ بھی ایک حقیقتِ ثانیہ ہے کہ آپ کی عظمت اور وقار کا راز حسنِ عمل، اخلاقِ کریمانہ اور اعلیٰ کردار میں مضمر ہے، ملک کی تعمیر و ترقی میں مسلمانوں کا نام سرِ فہرست ہونا چاہیئے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے صبر و اتحاد اور توکل علی اللہ کی ہدایت فرمائی ہے، اصبروا وصابروا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥ (سورۃ آلِ عمران آخری آیت) اور اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ ٥ (سورۃ البقرہ ۱۲۵)

میں آپ کو ایک بنیادی بات بتلاتا ہوں، اگر آپ میں عزم و ہمت اور قوتِ عمل ہے تو دنیا کی ساری ترقیاں اور دائمی سعادت آپ کے ہاتھوں میں ہے، لیکن اگر یہ صفات آپ میں نہیں ہیں تو کوئی تدبیر آپ کو نفع نہیں پہنچا سکتی۔"

صدارتِ اجلاس جمعیۃ علماءِ ہند منعقدہ حیدرآباد ۱۹۵۱ء

اپریل ۱۹۵۱ء کے بالکل آخری تین دنوں تک حیدرآباد دکن میں جمعیۃ علماء کا سترہواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا، یہ وہ ملک یا ریاست تھی جو گذشتہ سو دو سو برسوں سے علماء، فضلاء، مقررین، مصنفین، شعراء، ادباء اور دوسرے اصحابِ فکر و فن کی آماجگاہ تھی۔ شمالی ہند کے چھوٹے بڑے، عالی و عامی، مشہور و گمنام کتنے ہی اصحابِ علوم و فنون دن رات اس ملک اور شہر میں وارد ہوتے اور اس کی سرپرستی اور فراخ دستی سے فیضیاب و مستفید ہوتے تھے، ان میں سے بہت سے ایسے تھے کہ آئے تھے تو تھوڑا بہت درجہ اپنے پاس کا بھی تھا مگر حیدرآباد کی برکت سے ڈاکٹر، پروفیسر، علامہ اور مولانا کے بلند اور مشہور مناصب تک پہنچ گئے اور کئی ایسے بھی تھے کہ آئے تو کچھ بھی نہ تھے اور رہے تو سب کچھ ہو گئے، مگر کچھ بے نیاز اور مستغنی درویش ایسے بھی تھے جنہیں اللہ نے توکل، قناعت اور استغنیٰ کی دولت سے مالا مال کیا تھا، جنہوں نے اپنی زندگی میں کسی مادی وسیلے کی طرف ایک نگاہِ غلط انداز بھی نہیں ڈالی، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ جن کا ایک قدم جیل میں دوسرا ریل میں رہا کرتا تھا اور جنہوں نے ہندوستان کے چپے چپے اور کونے کونے کا دورہ کیا تھا اپنی پچھتر برس کی عمر میں کبھی حیدرآباد نہیں گئے تھے مگر ہندوستان کے پولیس ایکشن اور قتل و غارت کے بعد پہلی بار نکلے

دکھ درد میں شرکت کے لیے حیدرآباد تشریف لے گئے، آپ نے فرمایا:۔

"تقریباً ۲۹ سال پہلے کوکناڈا جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے آپ کے یہاں حاضری کا موقع ملا تھا، اگر اس کو مستثنےٰ کر دیا جائے تو میرا یہ عرض کرنا صحیح ہوگا کہ آپ کے یہاں یہ میری پہلی حاضری ہے، لیکن اس غیر حاضری کے باوجود ایک خاص تعلق آپ حضرات سے ہمیشہ رہا ہے۔"

اجلاس کے خطبۂ صدارت میں حضرتؒ نے جمعیۃ العلماء اور علماء کرام کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس وقت کے اہم موضوع ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلق اور دونوں کے درمیان خوشگوار ماحول کی ضرورت پر زور دیا اور فرمایا:۔

"جس طرح ہندوستان کا دنیا کی سیاست میں ایک مقام ہے اسی طرح پاکستان بھی بین الاقوامی سیاست کا ایک مستقل یونٹ قرار دیا جا چکا ہے، اب گذشتہ قصہ ہائے پارینہ کو دہرا کر مندمل زخموں کو کھرچنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب پورے ملک کا فائدہ اسی میں ہے اور نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا کی مصلحتوں کا تقاضا ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات خوشگوار ہوں، آپس میں ایک دوسرے پر پورا اعتماد ہو، آپس کے قضیوں کو مفاہمت کے ذریعہ طے کریں، دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے کے قریب ہوں، ان کے تجارتی اور اقتصادی تعلقات زیادہ سے زیادہ بہتر اور مضبوط ہوں، آمد و رفت کے راستے کھلے رہیں اور جو تلخیاں اور شکر رنجیاں برداشت کی جا چکی ہیں اُن کو بھول کر محبت اور دوستی کے ترانے دونوں جگہ گائے جائیں۔"

حکومت کی طرف سے حیدرآباد میں پولیس ایکشن کے نام پر جو ظلم اور زیادتیاں کی گئیں اُن کے اخلاقی، اجتماعی، معاشرتی، معاشی اور تمدنی زندگی تباہ و برباد کی گئی اُس پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے وہاں کے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے ہاں بیشمار مشکلات اور پریشانیوں کا ہجوم ہے، بخصوصیت سے حیدرآباد کے مسلمان دوہرے انقلاب کا شکار ہوئے ہیں، ان کا انتظام معیشت درہم برہم ہو گیا ہے، لیکن یہ مصائب آپ کی زندگی میں پہلی بار نہیں آئے ہیں آپ کی

پوری تاریخ مشکلات کی نہ ٹوٹنے والی ایک زنجیر ہے، آپ نے ہمیشہ مصائب و مسائل کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے اور ہمیشہ ہی استقلال، استقامت اور حسنِ اخلاق کے ذریعہ مشکلات کو آسان بناتے رہے ہیں۔

ایک مسلمان کا پہلا فرض ہے کہ اپنی انفرادی اور جماعتی زندگی کا نصب العین معلوم کرے اور اُسے ہر لحہ پیشِ نظر رکھے، یہ نصب العین قرآنِ پاک نے متعین کر دیا ہے،

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط (آل عمران ۱۱۰) (تم بہترین ہو ایسی امت میں جو انسانوں کے نفع کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم اچھی بات کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان و یقین رکھتے ہو)۔

اس اُمت کی بعثت کا اہم مقصد اور نصب العین یہ ہے کہ تمام نسلِ انسانی کو اس سے نفع اور خیر پہنچے، جس طرح آپ کو خیر اُمّۃ ہونے کی سعادت حاصل ہے، اُسی طرح آپ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ آپ ذاتِ پاک رؤف و رحیم سے وابستہ ہیں جس کو دُنیا میں اس لیے مبعوث کیا گیا کہ پوری کائنات پر خدا کی رحمت نازل ہو، وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ۔ خوب سمجھ لیجئے کہ جس طرح سرورِ کائنات سارے عالم کے لیے باعثِ خیر و برکت تھے۔ اسی طرح ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ سارے عالم کے لیے باعثِ راحت و اطمینان ہو مسلمان کی ذات اور اس کی خدمات صرف اس کی ذات، خاندان، قبیلہ اور گروہ تک محدود نہیں ہوتیں بلکہ وہ تمام عالمِ انسانی کو ایک ماں باپ کی اولاد، ایک خالق کی مخلوق اور ایک اللہ کے بندے سمجھ کر اعانت اور خیر خواہی کے جذبات عام کرے گا اور بنی نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود اس کا دائرہ کار ہوگا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: احب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ (اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے اہل و عیال پر احسان کرے اور خدمت کرے)۔ مشکوٰۃ شریف ــــ دوسری جگہ فرمایا: المومن من امنہ الناس علی دمائھم واموالھم "مومن وہ ہے جس کے ہاتھوں تمام

انسانوں کی جان ومال محفوظ رہے"۔ (بخاری شریف)

انسانیت اور اسلام کی روح یہ ہے کہ آپ برائی کا بدلہ بھلائی سے، زیادتی کا بدلہ احسان سے اور ظلم کا بدلہ عفو و درگذر سے دیں، یہی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: صِل من قطعكَ واعف عمن ظلمك واحسن الی من أساءَ الیك "جو تم سے قطع تعلق کرے تم اُس سے تعلق قائم کرو، جو تم پر ظلم کرے تم اُسے معاف کردو، جو تمہارے ساتھ برائی کرے تم اُس کے ساتھ بھلائی کرو"۔ مصائب کے طوفانوں اور مشکلات کے ہجوم میں اللہ تعالیٰ سے لحہ بہ لحہ تعلق مضبوط ہونا چاہیئے اور صبر و ضبط کا دامن نہایت مضبوطی کے ساتھ پکڑنا چاہیئے۔ ضبط، تحمّل، استقلال، عالی حوصلگی اور توجّہ الی اللہ ایسی طاقتیں ہیں جن کے سامنے دُنیا کی ہر طاقت بالآخر سپر ڈال دیتی ہے اور شکست کھا جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے بار بار انہی طاقتوں سے امداد حاصل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے، یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (البقرہ ۱۵۳) اے ایمان والو نماز اور صبر سے مدد حاصل کرو، جذبات اور اشتعال کا تقاضا تو یہی ہے کہ انسان برائی کا بدلہ برائی سے بلکہ ایک برائی کا بدلہ ہزاروں برائیوں سے دے، لیکن یہ کوئی علاج اور مسئلہ کا حل نہیں ہے، اس طرح ممکن ہے کہ آپ گردنوں کو تو جھکا دیں مگر دلوں کو فتح کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے، برائی اس طرح ختم ہو سکتی ہے کہ برائی کا بدلہ نیکی سے دیا جائے اگرچہ یہ بہت مشکل ہے مگر قلوب کو اسی طرح مسخّر کیا جاتا ہے اور حق کا مشن اسی طرح کامیاب ہوا کرتا ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَۃٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ○ وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ○ (حٰمٓ السجدہ ۳۴-۳۵) برائی کا بدلہ ایسے اخلاق سے دیجئے جو بہت بہتر ہو، آپ دیکھیں گے کہ وہ لوگ جن سے آپ کی دشمنی ہے گویا آپ کے مخلص دوست بن گئے، مگر یہ بات صابر و شاکر لوگوں کو اور قسمت والوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

ہاں! یہ ضرور خیال رہے کہ صبر، ضبط اور مکارم اخلاق کا مطلب بزدلی، خوفزدگی اور کمزوری نہیں ہے، صبر و ضبط کا مطلب یہ ہے کہ انتقام کے مواقع ملتے ہوئے بھی شرافت،

اخلاق، مروت اور رواداری کا مظاہرہ کیا جائے۔

مذہبی تعلیم کی اہمیت سب سے اہم اور مقدم مسئلہ مذہبی تعلیم کا ہے، اس فرض کی ادائیگی کے لیے تمام مذہبی حلقوں اور اسلامی اداروں کی یکجہتی اور رہنمائی ضروری ہے۔ ہم ملکی مصالح کے پیش نظر سیکولرازم اور غیر مذہبی حکومت کو خوش آمدید کہہ چکے ہیں، اگرچہ حقیقی امن وامان کی صحیح ضمانت مذہب ہی دے سکتا ہے مگر ایک سیکولر اسٹیٹ سے یہ توقع بے محل اور غلط ہے کہ وہ ملک کے تمام فرقوں کیلئے مذہبی تعلیم کا انتظام کرے، اس لیے اس کی ذمہ داری ہمیں اپنے کاندھوں پر برداشت کرکے آزاد اور زندہ قوموں کی طرح حیاتِ ملی اور ایثار کا ثبوت دینا ہے، اسلام مذہبی تعلیم کو ہر مسلمان پر فرض قرار دیتا ہے......

......میرے اس معروضہ کا خلاصہ یہ ہے کہ دین وملت کی حفاظت اور تبلیغ وترقی کیلئے پورے اخلاص، استقلال اور صبر وشکر کے ساتھ مکمل کوششیں صرف ہونی چاہئیں وطن عزیز کی حفاظت، ترقی اور سربلندی کے لیے اپنے فرائض میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہئیے اتفاق، اتحاد، یکجہتی اور رواداری کو ہر حالت میں پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

میں آپ کو کسی خاص جماعت میں شرکت کا حکم نہیں دیتا، مگر یہ ضرور عرض کروں گا کہ ملک اور اہلِ ملک کی ترقی اور بہبود کے لیے آپ اُسی جماعت میں شریک ہوں جس کو ان مقاصد اور اصولوں کی روشنی میں بہتر سمجھیں، آپ کا نصب العین ملک کی خدمت اور آپ کی زندگی کا سرمایہ، بلند حوصلگی، اولوالعزمی اور انتھک جدوجہد ہونا چاہیئے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝ (حٰم السجدہ ۳۰)

نوٹ ۱۹۴۸ء میں تقسیم کے فوراً بعد حیدرآباد کے ایک وفد کو یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ اگر حکومت سے ٹکراؤ کی پالیسی کی بجائے مصالحت پر آمادہ ہوں تو جمعیۃ حیدرآباد کو بیس سال کیلئے آزادی دلوا سکتی ہے تاکہ اس مدت میں ریاست مستحکم ہوجائے اور آبادی کے تناسب کو بڑھانے کی عملی تدابیر کرے، مگر وفد نے معذوری ظاہر کر دی، آخر حیدرآباد جیسی عظیم ریاست بھی ختم ہوگئی۔

صدارت سالانہ اجلاس جمعیۃ علماء ہند بمقام کلکتہ (۱۱ فروری ۱۹۵۵ء)

آزادی ملے، ہندوستان کو تقسیم ہوئے اور پاکستان بنے سات آٹھ برس گذر چکے تھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی پوری کوشش تھی کہ مسلمانوں کے اُلجھے ہوئے اور مشکل مسائل کسی طرح حل ہو جائیں اور ان کے لیے کوئی مستقل لائحہ عمل مقرر ہو جائے۔ جمعیۃ علماء کے سالانہ جلسوں میں تمام ہندوستان کے نمائندے حضرات کو مل بیٹھنے، گفتگو کرنے اور مشورہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ اس سال کلکتہ میں اجلاس کا مقصد یہی تھا کہ عام ہندوستانی مسلمانوں کے معاملات کے ساتھ وہاں کے خصوصی مسائل بھی زیرِ بحث آئیں اور اُن پر توجہ دی جا سکے۔ اِس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں حضرت مدنیؒ نے ابتدائی کلمات کے بعد فرمایا کہ:۔

"آج مسائل اور مشکلات پر بہت کافی لکھا اور بولا جا سکتا ہے مگر ضروری ہے کہ معاملات کو مختصر طور پر بیان کر کے باتوں سے زیادہ عمل کے دائرے کو وسیع کیا جائے۔

۱۹۴۷ء کا واقعہ ملک کے لیے ایک انقلاب تھا اور اس اعتبار سے دُنیا کا نرالا انقلاب تھا کہ جنگجو فوجیں اور سرکاری حلقے جو انقلاب کا عام نشانہ ہوتے ہیں وہ بالکل محفوظ اور مامون رہے اور جانی و مالی تباہیاں اُن کروڑوں عوام کو برداشت کرنی پڑیں جن کا اگر اس انقلاب سے واسطہ تھا بھی تو بہت دُور کا تھا۔ اس انقلاب میں ہند و پاک کے لاکھوں کروڑوں عوام کو جس طرح جانی، مالی اور عزت و آبرو کی تباہی کا شکار ہونا پڑا، وہ تاریخ انسانیت کا دردناک حادثہ ہے، مسلمان اس سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے، چنانچہ انقلاب نے ان کے جماعتی انقلاب پر کاری ضرب لگائی اور ہندوستان کے مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہو کر رہ گیا۔

مسلمانوں کے لیے خاص طور پر انتہائی ضروری ہے کہ اُن کے بچے ایک طرف دنیاوی تعلیم حاصل کر کے وطن کے بہترین شہری ثابت ہوں دوسری طرف سچی اسلامی تعلیم پا کر توحید کے علمبردار، خدا کے سچے پرستار اور بندگانِ خدا کے حقیقی خدمت گذار بنیں۔

دینی تعلیمی کنونشن

جمعیۃ علمائے ہند کا ایک عظیم الشان اجتماع گذشتہ ماہ بمبئی میں "دینی تعلیمی کنونشن" کے عنوان سے منعقد ہوا، اس میں ہر مکتب خیال کے مقتدر اور صاحب الرائے علماء و فضلاء شریک ہوئے اور ایک مرکزی بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی، اس اجتماع کا روشن اور اُمید افزا پہلو یہ ہے کہ

تمام مکاتبِ خیال کے مسلمان بیدار ہو کر میدانِ عمل میں قدم بڑھانے کے لیے ہم آہنگ ہیں یہ بڑی مبارک فال ہے۔ اب آپ کا فرض یہ ہے کہ چاہے آپ کا تعلق کسی بھی مکتبِ خیال سے ہو مگر ہر قسم کے اختلاف سے اجتناب کرتے ہوئے وحدتِ کلمہ کی اس اساس کو جو "دینی تعلیمی کنونشن بمبئی" نے قائم کی ہے زیادہ سے زیادہ مضبوط و استوار بنائیں۔

بنیادی مذہبی تعلیم اور ہمارے فرائض يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (التحریم) جیسے ارشادات نے ایک کلمہ گو کی نجات کے لیے جس طرح ان فرائض کی ادائیگی ضروری قرار دی ہے، اسی طرح اہل و عیال کی تربیت جو ابدی نجات کا ذریعہ ہو سکے ذاتی فریضہ قرار دیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مشہور ارشاد الا کلکم راعٍ و کلکم مسئول عن رعیتہ میں ہر سرپرست کو اس کے لواحقین کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

اگر ہمارا ہر ایک گھر تعلیم گاہ اور تربیت گاہ نہ بن سکے تو کم از کم ہر ایک مسجد تو تربیت گاہ ہونی ہی چاہیئے، ائمہ مساجد کا تکفل آپ کریں اور بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ائمہ پوری کریں تو یہ سہل و آسان نظام مساجد تعمیرِ ملت کی مشکلات حل کر سکتا ہے۔

ہمیں اپنے پرائیویٹ اسلامی مکاتب و مدارس کا جال پورے ہندوستان میں پھیلانا چاہیئے مگر مفادِ ملت کا تقاضا یہ ہے کہ دینی تعلیم کے ساتھ دُنیاوی تعلیم میں وہ صلاحیت بچوں اور نوجوانوں میں پیدا کریں کہ ترقی کی دوڑ میں وہ اپنے ہم وطنوں سے پیچھے نہ رہیں۔

سرکاری ملازمتیں اور مسلمان مسلمانوں کو ملازمتوں، تجارتوں اور دوسرے پیشوں کے سلسلے میں انتہائی مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ ایک طرف تو ہم حکومت کو توجہ دلاتے ہیں کہ دستور میں اقلیتوں کے جو حقوق رکھے گئے ہیں ان کو پورا کیا جائے، قومی حکومت کے سیکولر نظام کو بروئے کار لایا جائے۔

دوسری طرف مسلمانوں کو اس جانب متوجہ کرتے ہیں کہ صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور ملازمتوں کی طرف سے نظریں ہٹا کر تجارت، صنعت و حرفت کے میدانوں میں سبقت لے جانے کی کوشش کریں، کسی قوم کی ترقی کا دار و مدار ملازمتوں پر نہیں بلکہ تجارت اور صنعت و حرفت پر ہے۔

اُردو زبان اُردو زبان کسی فرقہ یا طبقہ کی زبان نہیں ہے بلکہ لاکھوں کروڑوں ہندؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کی زبان ہے، جیسا کہ انجمن ترقی اُردو ہند کی دستخطی مہم سے ثابت ہوُا ہے، جمعیۃ علماء ہند انجمن کی اس جدّوجہد کی حمایت کرتی رہی ہے اور آج بھی اس کی تائید کرتی ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ اُردو کو جلد از جلد ریجنل سرکاری زبان کا درجہ دے کر انصاف کا حق ادا کرے۔

اُجڑے ہوئے خاندان آخر میں مغربی بنگال اور کلکتہ کے ان ہزاروں خاندانوں سے ہمدردی کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں جو ۵۰ء کے ہنگاموں میں خانہ ویران ہوئے، کسی حکومت کے لیے اس سے زیادہ شرم کی بات اور کیا ہے کہ باشندگانِ ملک کی بڑی تعداد برسوں بے خانماں رہے، یہ درست ہے کہ جو بے خانماں پاکستان سے مغربی بنگال آئے ان کو فوراً آباد کرنا چاہیئے مگر اس طرح نہیں کہ خود مغربی بنگال کے مسلمان اپنے ہی وطن میں خانماں برباد ہو جائیں اور اپنے مکانات میں آباد نہ رہ سکیں"۔

حضرتِ مدنیؒ کی حیاتِ طیّبہ میں آخری جلسۂ جمعیۃ العلماء منعقدہ بمقام شہر سورت صوبہ گجرات کا

خُطبۂ صدارت

۲۷ سے ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۶ء تک تین دن شہر سورت میں جمعیۃ علماء ہند کا انیسواں سالانہ اجلاس ہوُا، صدارت حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ہوئی اور یہ اس عالمِ تکوین میں حضرتؒ کی آخری صدارت تھی۔ وقت اور عمر کا تقاضا بھی تھا اور لوگوں کا خیال بھی تھا کہ دیکھئے آئندہ اس عالم تاب روشنی کے آجانے میں کوئی اجتماع نصیب ہوتا ہے یا نہیں، چنانچہ ہندوستان کے گوشے گوشے سے ہزاروں ہزار بلکہ لاکھوں مریدین، معتقدین، محبّین اور معترفین ٹوٹ پڑے تھے۔ سورت کا چھوٹا سا شہر تین چار دن کے لیے ہندوستان کے مرکزی شہر کا مقابلہ کرنے لگا تھا۔ اِس اجلاس میں حضرتؒ نے اپنے آخری خطبہ صدارت میں ارشاد فرمایا کہ:۔

"شان و شوکت، زیبائش و نمائش اور انجمن آرائی کسی زندہ قوم اور فعال جماعت کے شایانِ شان نہیں ہوسکتی، اسلام ہر قول کے لیے فعل کا مطالبہ کرتا ہے۔ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا

مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (الصف ع ۱۳)

ہم اس ملک میں باعزت بن کر رہیں یا پسماندہ بن کر رہیں! یہ ہمارے فکر و فراست، بیدار مغزی اور کردار پر موقوف ہے۔ اگر ہم مسلسل کوشش اور جدوجہد میں کوتاہی کریں گے تو پسماندگی کو ٹال نہیں سکتے۔ اگر ترقی مقصود ہے تو صراطِ مستقیم پر رہنے کی جدوجہد تیز کر دیجئے، دنیاوی امور ہوں یا دینی مقاصد ہوں حق تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (سورۃ النجم ع ۳۹) انسان کو صرف وہی ملتا ہے جس کیلئے وہ کوشش کرے۔ اللہ رب العالمین کا احسان اور بخشش ہے کہ اس نے انسان کو احسنِ تقویم کا پیکر عطاء فرمایا اور اس کی عظمت کا جھنڈا لہرا کر لَقَدْ کَرَّمْنَا (بنی اسرائیل ع۷) کی سند عطا کی۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ عمدہ کردار اور عملِ صالح سے اس جھنڈے کو سربلند رکھیں۔

علماءِ ہندوستان کا کردار

جمعیتہ علماء ہند کی پچاس سالہ تاریخ شاہد ہے کہ اس کی خدمات اور قربانیاں کبھی بھی مفاد پرستی اور خود غرضی کے غبار سے گرد آلود نہیں ہوئیں اُس نے ہمیشہ ہمہ گیر اور انسانیت نواز مقاصد کو پیش نظر رکھا۔ وہ سینکڑوں ہزاروں علماء جنہوں نے دار و رسن کی عاشقانہ رسم یا قید و بند کی سُنتِ یوسفی زندہ رکھی، ان کے حاشیۂ خیال میں کبھی اقتدار و مناصب اور مادّی دولت و ثروت کا مقصد نہیں آیا، انھوں نے صرف ہندوستان اور بیرونِ ہند کے کروڑوں مظلوموں اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کے لیے قربانیاں دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ ساری مخلوق اللہ کی عیال اور کنبہ ہے، جس کو اللہ سے محبت ہوگی وہ اس کی مخلوق سے بھی محبت کرے گا، جو عشقِ مولا میں سرشار ہوگا وہ اپنی زندگی اُس کی مخلوق کے لیے وقف کر دے گا۔ حدیث شریف کا ارشاد ہے،

الخلق عیال اللہ ان احب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ۔ (مشکوٰۃ) — مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اللہ کو سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ بھلائی کرے۔

دوسری حدیث یہ ہے:۔

الراحمون یرحمھم الرحمٰن، ارحموا علی من فی الارض یرحمکم علی من فی السماء۔ (صحاح) — رحم کرنے والوں پر اللہ رحم کرتا ہے تم زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا رحم کرے گا۔

اسلام کا مستقبل روشن ہے کیونکہ اسلام کسی قوم کا کلچر نہیں ہے، وہ ہمہ گیر اصول کا نام ہے جس کو دُنیا غیر شعوری طور پر اختیار کرتی جا رہی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اگر اسلام کا مستقبل روشن ہے تو اس کے

ساتھ بے عمل مسلمانوں کا مستقبل بھی روشن ہو، اگر ہم اپنا مستقبل بنانا چاہتے ہیں تو شرط یہ ہے کہ ہم اسلام کا دامن مضبوطی سے پکڑیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے راستے پر چلیں، اگر آپ اللہ کے احکام پر عمل کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں تو اللہ کو اپنے دینِ حق کے لیے آپ کی ضرورت نہیں ہے۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (سورۂ محمد آیت ۳۸)

اگر تم منہ موڑو تو اللہ تمہارے سوا کوئی دوسری قوم بدل دے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

تاریخ سے سبق

بدقسمتی سے آج ہمارے اعمال واخلاق شمع اسلام کے لیے حجاب بنے ہوئے ہیں اور پروانوں کو شمع کے قریب آنے سے روک رہے ہیں، آپ اپنے کردار کو نورِ ایمان کا آئینہ دار بنالیں پروانے خود بخود لپکیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام کا اقتدار ختم ہوگیا اسی لیے ترقیٔ اسلام بھی رک گئی۔ میں پوچھتا ہوں کہ مورخین تحقیق کرکے بتائیں کہ کیا محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، شمس الدین التمش، شیر شاہ سوری، بابر و اکبر، جہانگیر و عالمگیر نے اپنے اقتدار وحکومت سے کبھی اسلام پھیلایا ہے، اگر ان کے قومی جھنڈے اشاعتِ اسلام کے علمبردار ہوتے تو اُن کے پایۂ تخت اور ان کی فرمانروائی میں غیر مسلموں کی غیر معمولی اکثریت باقی نہ رہتی۔ جن علاقوں میں ان کج کلاہوں کی سربفلک یادگاریں آج بھی شوکت وعظمتِ رفتہ کا مرثیہ پڑھ رہی ہیں وہاں اور ان کے مضافات میں کبھی بھی مسلمانوں کو اکثریت نہیں نصیب ہوئی، صدیاں گذر جانے کے بعد بھی ان علاقوں دہلی، آگرہ، قنوج، دہلی، سہسرام، فتحپور سیکری، متھرا وغیرہ میں آج بھی مسلمان دس پندرہ فیصد سے زیادہ نہیں ہیں۔

شیخ ابو علی سندھی (متوفی ۲۷۰ھ)، شیخ علی بن عثمان ہجویری ثم لاہوری (متوفی ۴۶۵ھ)، شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی، خواجہ غریب نواز معین الدین حسن السنجری اجمیری، شیخ احمد بن یحییٰ منیری، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت بابا فرید الدین شکر گنج، سلطان الاولیا حضرت خواجہ نظام الدین دہلوی (رحمہم اللہ) وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جن کے روحانی فیوض وبرکات بے لوث ہمدردیٔ خلق خدا اور بے مثال کردار و اخلاق سے اسلام کی اشاعت ہوئی اور ان کے اخلاقِ عالیہ سے غیر مسلم آج تک متاثر ہیں۔

شہاب الدین غوری کی فاتحانہ تلوار کسی ایک متنفس کے دل کو بھی صداقتِ اسلام کے اعتراف کے لیے نہیں جھکا سکی ہوگی، مگر اسی کا معاصر ایک فقیرِ بے نوا خواجہ غریب نواز بغیر کسی شاہانہ طمطراق کے دہلی سے روانہ ہوکر اجمیر پہنچتا ہے تو اسلام کے ایک مخالف مسٹر آرنلڈ مصنف "پریچنگ آف اسلام" کی شہادت یہ ہے کہ

راہ میں سات سو خاندان اس کے ہاتھ پر حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے ہیں۔

خود آپ کے صوبہ گجرات میں نویں صدی ہجری کے شروع سے دسویں صدی ہجری کے آخر تک، دو سو برس اولوالعزم مسلمان بادشاہ حکومت کرتے رہے۔ اُن کی نیک نفسی، ملک پروری، عدل و انصاف اور داد و دہش تاریخ کی ثابت شدہ حقیقت ہے، مگر پھر بھی یہ شاہانِ گجرات اسلام کے داعی اور مبلغ نہیں تھے بلکہ نہروالہ کے مشائخِ کبار مثلاً شیخ حسام الدین عثمان بن داد ملتانی (متوفی ۷۳۶ھ)، شیخ یعقوب بن مولانا خواجگی (متوفی ۷۹۸ھ) قاضی علم الدین شاطبی (متوفی ۸۶۰ھ) احمد آباد کے قطب طریقت گنج بخش شیخ احمد کھٹو (۸۴۹ھ)، سید برہان الدین عبداللہ نبیرہ مخدوم جہانیاں (۸۵۷ھ) شیخ کبیرالدین ناگوری (۸۵۶ھ) مولانا محمد ابن طاہر، شیخ محمد غوث گوالیری، بھروچ کے سید کمال الدین قزوینی (۸۸۱ھ) بڑودہ کے سید یحییٰ ابن علی ترمذی (۸۵۰ھ) نوساری کے شیخ نصیر بن جمال (۸۵۱ھ) راندیر کے شیخ نورالدین محمد بن علی، سورت کے سید محمد بن عبداللہ حضری (۱۰۳۰ھ) وغیرہ رحمہم اللہ و قدس اللہ اسرارہم جیسے علماء و مشائخ کے مقدس چراغ دانوں سے شمع اسلام کی کرنیں پھوٹیں۔

مختصر یہ کہ اسلام اقتدار، حکومت اور طاقت سے نہیں بلکہ اعلیٰ کردار اور بہترین اخلاق سے پھیلتا ہے۔

سب سے پہلے اپنی اصلاح، اپنے قبیلہ اور خاندان کی اصلاح، بچوں اور نوجوانوں کی اخلاقی تربیت، احکامِ شریعت کی پابندی، دین کی اطاعت کیجئے پھر پڑوسیوں اور اہلِ شہر کے حقوق کی حفاظت کیجئے، خدمتِ خلق کے راستے اختیار کیجئے، حبِ وطن کے فرائض انجام دیجئے۔ یہی آپ کے انفرادی اور اجتماعی مستقبل کی ضمانتیں اور کامیابی کی راہیں ہیں۔

دینی تعلیمی تربیتی مرکز پچھلے سال بمبئی میں دینی تعلیمی کنونشن منعقد کیا گیا تھا، اس کے نتیجہ میں دینی تعلیمی بورڈ قائم کیا گیا۔ جمعیۃ علماء ہند نے اسی ماہ ربیع الاوّل کی پہلی تاریخ میں دہلی کی مشہور تاریخی مسجد زینت المساجد عرف گھٹا مسجد میں ایک دینی تعلیمی مرکز قائم کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ایسے امام تیار کیے جائیں جو شہروں، قصبات اور دیہات بالخصوص پسماندہ دیہات میں بچوں کو محدود وقت میں دینی تعلیم دے سکیں، اُن کی دینی تربیت کر سکیں اور بڑوں میں بھی دینی ماحول اور ذوق و شوق پیدا کر سکیں۔

پیشوایانِ مذاہب کا احترام

انسانیت، شرافت، سچائی اور خدا پرستی وغیرہ ایسے اوصاف و خصائل ہیں جن کی قدر بلالحاظ فرقہ و مذہب ہر انصاف پسند کو کرنی چاہیئے وہ برگزیدہ حضرات جنہوں نے اِن اوصاف و صفاتِ حمیدہ کی تعلیم دی ہے یقیناً قابلِ قدر اور واجب الاحترام ہیں، اُن کی تعظیم و تکریم لازم اور توہین پوری انسانیت اور انسانی شرافت پر ظلمِ عظیم ہے۔

مسلمان جو تمام برگزیدہ انسانوں کے احترام کو جزوِ ایمان سمجھتے ہیں، جب اُس ذاتِ اقدس کے بارے میں جس نے تمام پاکبازوں کی حفاظتِ ناموس کا درس دیا ہے گستاخانہ حرکتیں دیکھتے ہیں تو ان کا احساس شدید ہو جاتا ہے اور روح فرسا اضطراب میں مبتلا ہو جاتے ہیں، حالیہ واقعہ میں جس طرح فرقہ پرستوں نے چیرہ دستیوں سے کام لیا ہے اور یوپی، مدھیہ پردیش میں شدید سے شدید تر جانی مالی نقصان پہنچایا ہے یہ ایک ناقابلِ برداشت وحشت و بربریت ہے۔

اس موقع پر میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ملک کے وزیرِ اعظم پنڈت نہرو کو مبارکباد پیش کروں کہ انہوں نے اس نفرت انگیز ماحول کے خلاف فوری قدم اٹھایا اور دہلی کی مشہور تاریخی تقریر کے ذریعے فرقہ پرستوں کے مذموم عزائم کا خاتمہ کیا۔

ہمارا فرض

واضعانِ قانون کا فرض ہے کہ وہ ایسا قانون پاس کریں جس سے فرقہ پرستی اور تعصب کا خاتمہ ہو، مگر صرف قانون ہی کافی نہیں ہے، قانون سزا تو دے سکتا ہے مگر جرم کے رجحانات ختم نہیں کر سکتا، اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم قوم کی اصلاح اور تربیت کریں۔ اس کام کے لیے مختلف زبانوں میں ایسا لٹریچر تیار کرنے کی ضرورت ہے جو نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے پیغامات ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دے اور فلاح وارشاد کا مقدس فریضہ انجام دے۔

جو دعوتِ عمومی رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اس کا مخاطب پوری نوعِ انسانی کو گردانا گیا ہے۔

ایک قابلِ توجہ پہلو

تاریخ، جغرافیہ اور شہریت پر مشتمل مضامین جو پرائمری تعلیم کے لازمی اجزاء ہیں اُن کو صحیح سیکولرازم جذبے کے ساتھ مرتب کیا جانا چاہیئے، اگرچہ ایک خاص فرقہ کے پیشواؤں یادگاروں اور معاشرت کا تذکرہ ان کتابوں میں آتا ہے مگر مسلمان، پارسی اور عیسائیوں کے پیشواؤں اور متبرک یادگاروں کا ذکر ان میں نہیں آتا ہے، یہ یک طرفہ رجحان فرقہ وارانہ شکل اختیار کر لیتا ہے، اس خرابی کو دور

کرنے کیلئے حکومت اور مختلف ادارہ ہائے نشر واشاعت و تعلیمی انجمنوں کو پوری توجہ دینی ضروری ہے۔

اقتصادی مسائل پورے ملک میں لاکھوں گریجویٹ اور اونچے تعلیمیافتہ روزگار کے لیے پریشان ہیں' افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ملازمتوں میں کنبہ پروری اور قبیلہ پروری ہر محکمہ میں کارفرما ہے اس خطرناک پالیسی کا مسلمان خاص طور پر شکار ہیں۔ تقرریوں کی جو رپورٹیں ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں وہ مسلمانوں کی محرومی کا کامل ثبوت ہیں۔

میں احتجاجی ذہنیت کا حامی نہیں ہوں نہ موجودہ حالات میں احتجاج کو کامیاب سمجھتا ہوں، البتہ عملی تدبیریں اختیار کرنے میں کامیابی لازمی ہے۔

مسلمان آج بھی صنعت و حرفت اور گھریلو صنعتوں میں غیر معمولی اکثریت رکھتا ہے، اگر وہ کاروباری دیانتداری، بلند حوصلگی اور محنت کے ساتھ ترقیاتی اسکیموں میں حصہ لے تو نہ صرف یہ کہ اپنے زخموں پر مرہم رکھے گا بلکہ ملک کی تعمیر و ترقی میں بھی قابلِ فخر حصہ لے سکے گا۔

الیکشنوں میں مسلمانوں کا حصہ آزاد جمہوریۂ ہندوستان میں انتخاب تشکیلِ حکومت کے متعلق آخری فیصلہ کا نام ہے، اس فیصلے کے صادر کرنے میں مسلم اقلیت کو ایک خاص مقام اور خاص اہمیت حاصل ہے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے مقام کو پہچانیں اور حُبِ وطن' ملکی احساس اور بیدارمغزی کا پورا ثبوت دیں ہے۔ اس معاملے میں حکومت اور ملک کی قوم پرور جماعتوں کا فرض ہے کہ وہ ہر اقلیت کے مقام اور حیثیت کو تسلیم کرنے کا عملی ثبوت دیں۔

بزرگانِ ملت اور برادرانِ محترم! میں آپ کا کافی وقت لے چکا ہوں اور کوشش کے باوجود دامنِ کلام کسی قدر طویل ہوگیا ہے۔ اب ہمیں دعا کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق دے' ہماری نیتوں میں اخلاص عطا فرمائے اور ہمیں ملک و ملت کی خدمت کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے اور ہم ناکاروں کو اپنے ان باکار بندوں میں شمار فرمائے جن کے متعلق اس کا پختہ وعدہ ہے، وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (سورۃ الحج ۴۰) ۔ ترجمہ: "اور اللہ تعالیٰ اس کی ضرور مدد فرماتا ہے جو اللہ تعالیٰ (کے دین) کی مدد کرتا ہے' یاد رہے بیشک اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور اور غالب ہے"

جمعیۃ العلماء ہند کا تقسیم سے پہلے آخری اجلاس اور اس کا آنکھوں دیکھا حال

منعقدہ ۲ تا ۵ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ مطابق ۲۰ تا ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء

از مرتب چراغ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

جمعیۃ العلماء ہند کا آخری اجلاس لاہور میں ہونا قرار پایا، اُس وقت پنجاب میں سر سکندر حیات کی وزارت تھی، احقر اس اجلاس سے چند روز پہلے دار العلوم دیوبند حضرت مدنیؒ کی کفش بوسی کے لیے حاضر ہوا تھا، نمازِ ظہر کے بعد خانقاہِ مدنی کے بڑے کمرہ میں حضرت مہمانوں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ باہر تانگہ آکر رُکا جس سے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اُتر کر اندر تشریف لائے، آپ لاہور جمعیۃ کے اسی جلسہ کے انعقاد کے لیے تشریف لے گئے تھے اور پنجاب ایکسپریس سے واپس تشریف لائے تھے، اندر آتے ہی علیک سلیک کے بعد حضرت مدنیؒ نے اجلاس کے بارہ میں پوچھا تو آپ نے عرض کیا کہ سکندر حیات اجازت نہیں دیتا، حضرتؒ نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا، چنانچہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ اسی وقت لاہور واپس ہوئے اور حالات کی مخالفت کے باوجود علماء کرام سے مشورہ کے بعد اجلاس کے انعقاد کا فیصلہ کر دیا جس کے انتظام میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے کافی حصہ لیا چنانچہ مؤرخہ ۱۹ مارچ ۱۹۴۲ء کو اکابر تشریف لائے اور مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ میں قیام فرمایا جمعہ کا خطبہ عربی اور نماز حضرتِ مدنیؒ نے پڑھائی مگر تقریر نہیں فرمائی۔ نمازِ جمعہ کے بعد جلوس بڑی شان سے جلسہ گاہ پہنچا اور ابتدائی کاروائی کے بعد نمازِ عشاء تک جلسہ ملتوی کر دیا گیا، چنانچہ نماز عشاء کے بعد کاروائی شروع ہوئی تو حکومت نے بجلی کاٹ دی، لیمپوں کا انتظام کیا گیا اور لاؤڈ سپیکر کے لیے بیٹری لگائی گئی، تلاوتِ کلام پاک کے بعد حضرت مدنیؒ نے خطبۂ صدارت شروع فرمایا، پنڈال سارا کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، سٹیج پر علماء کرام خصوصاً مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا نافع گل مرحومین سٹیج کی نگرانی فرما رہے تھے، جلسہ کی پہلی صف میں بعض شرپسند بیٹھے ہوئے تھے۔ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے

خطبۂ مسنونہ کے بعد یہ شعر پڑھا ؎

فَلَئِنْ نَطَقْتُ بِشُکْرِ بِرِّكَ مُفْصِحًا　　فَلِسَانُ حَالِیْ بِالشِّکَایَةِ اَنْطَقُ

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خطبۂ صدارت میں آزادی ہندوستان کے بعد ملکی نظم ونسق کے بارہ میں تین خیالات پیش کیے اور ان پر تبصرہ فرمایا، جب آپ نے تقسیم کے منصوبہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ جملہ فرمایا کہ "ایک گروہ کا یہ خیال ہے" تو اچانک پنڈال اور سٹیج سے مختلف نعرے شروع کر دیئے گئے، جن کا مقصد جلسہ کو ناکام کرنا تھا، حضرتؒ نے خطاب بند فرما دیا اور اسی طرح کھڑے رہے، پنڈال پر ایک شر پسند کھڑا ہوا تو مولانا نافع گل ؒ نے اس کے سر پر ایسا ڈنڈا مارا کہ وہیں دم بخود ایسا بیٹھا کہ پھر حرکت نہ کر سکا، چونکہ پولیس اسی انتظار میں تھی کہ کوئی بہانہ بنا کر جلسہ کو درہم برہم کر دے اس لیے پنڈال میں پولیس کے کافی آدمی آگئے اور صورتحال خطرناک نظر آنے لگی، وہ منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ امیر شریعت، بطلِ حریت، مجاہد ملت، سید عالی نسب عطاء اللہ شاہ بخاری نے لاؤڈ سپیکر کے سامنے آکر چند نعرے لگوائے اور پولیس کو للکار کر فرمایا کہ میرا اپنا جلسہ ہے فوراً باہر نکل جاؤ ورنہ تمام ذمہ داری تم پر ہوگی۔ چنانچہ پولیس باہر نکل گئی، آپ نے احرار رضا کاروں کو فرمایا کہ اپنی اپنی کلہاڑیاں فضاء میں لہرا دو، چنانچہ سارے پنڈال میں کلہاڑیوں کی چمک نے جہاں فدایان اسلام کو نورِ نبوت سے مشرف فرمایا وہاں بزدل مفسدوں کے لیے بجلی کی کڑک بن گئی، آپ نے فرمایا اگر کوئی مفسد سر اٹھائے تو اسے فوراً کچل دو میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ بس پھر کیا تھا ان کو سانپ نے ایسا سونگھا کہ دم بخود ہو گئے، پھر حضرت مدنیؒ سے درخواست کی کہ اب آپ ارشاد فرمائیں، چنانچہ حضرت مدنیؒ نے جہاں سے خطاب چھوڑا تھا وہیں سے شروع فرمایا اور اجلاس پوری کامیابی سے ہمکنار ہوا ــــ دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نے خطاب فرمایا، آپ کے چند وہ جملے جو اس وقت برِ صغیر کے حال اور مستقبل کی عکاسی کرتے تھے درج کیے جاتے ہیں، آپ نے فرمایا۔

برطانیہ محض انگلستان تک محدود ہو کر رہ جائے گا ــــ انگریز بہادر تمہیں نہیں بچا سکتا اور نہ ہمیں بچا سکتا ہے، اسے بوریا بستر باندھ کر یہاں سے جانا ہوگا ــــ مسلمانوں کی تعداد دس کروڑ ہے، اتنی بڑی آبادی کو اقلیت قرار دینا اور ان کے لیے اقلیتی حقوق اور علیحدگی کا مطالبہ کرنا نہ صرف بزدلی ہے بلکہ ان کے شاندار مستقبل کے لیے تباہ کن ہے ــــ میرا ایمان اور میرا اسلام مجھے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ انگریز کی حکومت کے خلاف جو چولہا دہک رہا ہے اس میں لکڑیاں ڈالتا رہوں۔

جمعیۃ علماء ہند کی جدوجہد آزادی

آپ کو تاریخ کے صفحات دیکھنے بالخصوص علماء ہند کا شاندار ماضی دیکھنے سے پتہ چل جائے گا کہ علماء ہند نے ہمیشہ سے اسی مقصد کی تکمیل کے لیے کوشش کی ہے، حالانکہ "شاندار ماضی" (کتاب میں) انکی جدوجہد کے سمندر میں سے چند قطرے ہی دکھلائے گئے ہیں، مگر وائے بدقسمتی کہ باوجود انتہائی جدوجہد اور بے شمار قربانیوں کے اصل مقصد (اسلامی حکومت کا قیام) حاصل نہ ہو سکا تب موجودہ احوال اور گرد و پیش کی انتہائی مشکلات سے جو کہ داخلی اور خارجی بے حد و بے شمار ہیں ضروری معلوم ہوا کہ اھون البلیتین کو اختیار کیا جائے اور ہندوستان کی آزادی کی مشترکہ جدوجہد میں حصہ لیا جائے۔ اھون البلیتین کو اختیار کرنا شرعی اصول ہے اور ہر زمانہ میں معمول بہ رہا ہے اور اگرچہ مشترکہ جدوجہد سے حاصل ہونے والی آزادی نظام اسلامی نہ کہلا سکے گی تاہم بہت سی مشکلات اور سخت موانع کے رفع ہو جانے سے حقیقی نصب العین کے لیے راستہ کھل جائے گا۔ (ص ۲۱، ۲۲، ۲۲)

(از مرتب) لاہور کے خطبۂ صدارت میں آپ نے جو مخصوص بات ارشاد فرمائی وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت کی وضاحت تھی، جو لوگ یہ کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسلمان ہندوستان میں ایک اقلیتی فرقہ یا جماعت کی حیثیت سے ہیں، یہ بالکل غلط اور حقیقت کے خلاف ہے مسلمان کروڑوں کی تعداد میں اس ملک میں تقریباً ایک ہزار سال سے آباد ہیں، نہ صرف آباد ہیں بلکہ اس سارے ملک پر (برما سمیت) مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو سال حکومت کی، ان کے علماء کرام اور اولیاء عظام کی محنت سے کروڑوں انسانوں نے اسلام قبول کیا، ان کی لاکھوں مساجد، ہزاروں دینی مدارس، ہزاروں خانقاہیں اس ملک میں موجود ہیں، ان کے بزرگوں نے اسی ہندوستان کو اپنا وطن بنایا اور یہیں پیوند خاک ہوئے، بھلا ایسی قوم کس طرح اقلیت کہلائی جا سکتی ہے؟ یہ تصور کر لینا کہ انگریز کے جانے کے بعد ہندو مسلمانوں کو ختم کر دے گا یا تہذیبی اور دینی طور پر ان کی حیثیت بدل دے گا، یہ ہرگز نہ ہو سکے گا۔ جو قوم تقریباً ایک ہزار سال سے اس ملک میں بس رہی ہے اس نے ایک ہزار سال میں اپنی تہذیب، اپنے دینی اعمال، اطوار نہ صرف باقی رکھے بلکہ دوسروں کو بھی اختیار کرنے کی ترغیب دی، جیسا کہ تاریخ گواہ ہے کہ کسی مسلمان نے ہندو دھرم قبول نہیں کیا، کسی نے سر پر چوٹی نہیں رکھی، کسی نے جنجو نہیں پہنا بلکہ اس کے برعکس اس ظالم اور غاصب قوم انگریزوں کے دین عیسائیت کو بعض بدبختوں نے قبول کیا،

اور ان کی تہذیب و تمدّن اور طرزِ معاشرت کو تو بہت سے لوگوں نے عملاً قبول کر لیا اور اب تک کر رہے ہیں۔ مسلمان قوم کی تمام ممتاز اور مخصوص حیثیتوں کو تو انگریز نے اس لیے بدلنے کی کوشش کی کہ اس کی حکومت کو دوام حاصل رہے مگر مجاہدینِ اسلام[1] نے انگریز کو ناکام بنا کر ہندوستان سے آخر نکال دیا۔ افسوس تو یہ ہے کہ جس نے ہم سے حکومت لی، ہماری تہذیب بلکہ بول چال، رفتار، ڈھال، خانگی امور، مجلسی آداب غرضیکہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ پر اپنی چھاپ لگائی اُس سے تو مسلمانوں کو کوئی خطرہ نہیں اور جس قوم کے ساتھ ہزار سال تک رہنا سہنا رہا وہ قوم مسلمانوں کو اپنے مذہب اور تہذیب میں ہرگز مدغم نہیں کر سکتی نہ کر سکے گی مسلمانوں کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اُمت کو یہ مژدہ سُنایا تھا کہ :۔ "ساری زمین میرے لیے مسجد بنادی گئی ہے"

اسی سرمدی پیغام کو علامہ اقبال نے یُوں ادا کیا ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

کیا ایسی مسلمان قوم سکھ قوم سے بھی بُزدل اور کم ہمّت ہے جس کی تعداد مسلمانوں سے کئی گنا کم ہے اور وہ چند سو سال پہلے ہندو ہی تھے۔ ہندو ہزار کوشش کے باوجود نہ تو اُن کو ختم کر سکے اور نہ ہندو ازم میں جذب کر سکے، اس لیے مسلمانوں کا اپنے آپ کو اقلیّت سمجھنا کم ہمتی بلکہ بُزدلی ہے"

چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا :۔

مسلمان اور آئندہ آئینِ حکومت ہندوستان کے داخلی مسائل میں مسلمانوں کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ گذشتہ ایک صدی سے ہندوستان میں برطانیہ کی حکمتِ عملی نے مسلمانوں کو بھی ہندوستان کی اقلیتوں میں داخل کر کے ان کے متعلقہ مسائل کو اقلیتوں کے مسائل سے وابستہ کر دیا ہے، برطانوی سیاسیین اور مدبرین ہمیشہ مسلمانوں کو ایک سیاسی اقلیت کی صف میں شمار کرنے اور ان کے معاملے کو اقلیتوں کے معاملات میں شامل کرنے کے عادی ہو گئے ہیں اور اسی بناء پر ہندوستان کی غیر مسلم قومیں بھی ہندوستان کے سیاسی مستقبل میں مسلمانوں کے متعلقہ مسائل کے ساتھ وہی سلوک کر رہی ہیں جو اقلیتوں کے مسائل کے ساتھ کرنے والی ہیں۔

---

[1] اور آج ۱۹۹۳ء میں بھی جبکہ بھارت میں مسلمانوں کی تعداد ۲۵ کروڑ ہے کسی مسلمان نے ہندو دھرم قبول نہیں کیا بلکہ پہلے سے زیادہ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں۔

یہ خیال انگریزوں اور غیر مسلموں تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ خود مسلمانوں کے ایک طبقہ کے دلوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ وہ ہندوستان میں ایک سیاسی اقلیت ہیں اور اس وجہ سے وہ تمام اندیشے اور وسوسے اور خطرات ان کے دلوں پر چھا گئے جو ایک اقلیت کو اپنی زندگی اور انفرادیت کے متعلق اکثریت کی طرف سے پیش آتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کی مجموعی مردم شماری میں تعداد کے لحاظ سے مسلمان بھی عددی اقلیت میں ہیں لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ بجائے ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد یورپ کے کسی بڑے سے بڑے خطے کی آبادی سے کہیں زیادہ ہے، نیز ہندوستان کی تعمیر میں ان کا حصّہ سب سے زیادہ ہے، ہندوستان میں ان کی تعداد نو اور دس کروڑ کے درمیان ہے، تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے وہ اہم خصوصیت کے مالک ہیں، جغرافیائی حیثیت سے انہیں قدرتی استحکام حاصل ہے، ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار میں وہ اکثریت رکھتے ہیں اور اگر صوبوں کی ازسرِ نو تحدید اور توسیع کی جائے تو وہ تیرہ مجوزہ صوبوں میں سے چھ صوبوں میں اکثریت حاصل کر لیں گے۔ ان تمام حالات میں بھی اگر مسلمانوں کو ایک سیاسی اقلیت قرار دیکر دیگر اقلیتوں میں انہیں شامل کر دیا جائے تو اس سے زیادہ سیاسی غلطی اور کیا ہو سکتی ہے اور اس سے بڑا اور کیا فریب دُنیا کو دیا جا سکتا ہے! اور اگر مسلمان ابھی تک اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ ان کی زندگی بغیر برطانیہ کی سرپرستی کے قائم نہیں رہ سکتی، تو مسلمانوں کی تاریخ میں اس سے زیادہ المناک کوئی دوسری مثال نہیں مل سکتی، مسلمان ہندوستان میں اپنی پوری مذہبی آزادی اور پوری تہذیب اور ثقافت کے ساتھ زندہ رہیں گے اور کسی غیر کی غلامی قبول کرنے سے وہ عزت کے ساتھ مر جانے کو ترجیح دیں گے ؎

هُمَا خُطَّتَا اِمَّا اَسَارٌ وَّ ذِلَّـةٌ
وَ اِمَّا دَمٌ وَالْقَتْلُ بِالْحُرِّ اَجْدَرُ

آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی مقام

آئندہ آزاد ہندوستان میں برطانیہ نے اپنے مقاصد میں استعمال کرنے کی غرض سے مسلمانوں کے لیے کونسا سیاسی مقام تجویز کیا ہے؟ میں اس وقت اس بحث کو چھیڑ کر تلخیوں میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا لیکن خود ہندوستان کے سیاسی مفکرین کے سیاسی تصورات کا جہاں تک تعلق ہے انہیں تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایک گروہ وہ ہے جو ہندوستان کے آئندہ آئینِ حکومت کی تشکیل اس طریق پر کرنا چاہتا ہے کہ فرقہ وارانہ اکثریت کی ایسی مستحکم مرکزی حکومت قائم ہو کہ مسلمانوں کو تمام ہندوستان میں ایک اقلیت کی

جگہ ملے اور ان کی زندگی اور بقاء تمام تر ایک طاقتور اور ناقابلِ تسخیر اکثریت کی مرضی سے وابستہ ہو، لیکن یہ تصور محض ایک پریشان کن خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا، یہ تصور اندھی سیاست ہونے کے علاوہ صائب الرائے مفکرین کے نزدیک ناقابلِ عمل بھی ہے، اس تصور کو جس قدر جلد دماغوں سے محو کر دیا جائے اسی قدر ہندوستان کے مجموعی مفاد کے لیے بہتر اور ہندوستانیوں کے لیے مفید ہوگا۔

(۲) دوسرا گروہ وہ ہے جو پہلے گروہ کے تصور اور اس کے عواقب و نتائج سے گھبرا کر مسلمانوں کی نجات اور خوش عیشی کے لیے صرف یہ راستہ تجویز کرتا ہے کہ ہندوستان کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے اپنا جداگانہ سیاسی منطقہ بنا کر براہِ راست تاجِ برطانیہ کے ساتھ اپنی قسمت کو وابستہ کر دے، اس گروہ نے اپنے تقسیمِ ہند کے مطالبہ کو تو نہایت بلند آہنگی اور شدت کے ساتھ منظر پر لانا شروع کر دیا ہے لیکن اس کے کسی پہلو پر ہلکی سی روشنی بھی نہیں ڈالی، ظاہر ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبے میں مسلمانوں کی آبادی، ان کے مذہبی مقدس شعائر، مساجد، مزارات، علمی ادارے، اوقاف وغیرہ اس قدر کثیر تعداد میں موجود ہیں کہ مسلمان کسی حالت میں اُن کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور تقسیمِ ہند کی صورت میں ان کا حشر کیا ہوگا؟ اس پر مجوزینِ تقسیم بالکل خاموش ہیں۔ اس لیے جب تک یہ نظریہ پوری تفصیل کے ساتھ روشنی میں نہ آئے اُس وقت تک اس پر کوئی بحث بے سود اور بے نتیجہ ہے۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ مجوزینِ تقسیم کے نزدیک بھی اسلامی منطقہ میں قائم ہونے والی حکومت کا دستور اساسی بھی اسلامی اور الٰہی حکومت کا دستور نہ ہوگا، اس کی بنیاد بھی یورپین طرزِ حکومت پر ہوگی اور اپنے تحفظ کے اطمینان ہو جانے پر اسے قبول کرنے میں بھی وہی اھون البلیتین اختیار کرنے کا اصول برتنا ہوگا۔ نیز اس نظریہ کے ماتحت ہندو منطقے اور مسلم منطقے قائم ہو جانے کی صورت میں ہندو منطقوں میں مسلمان جن کی پوزیشن زیادہ سے زیادہ چودہ ۱۴ فیصدی اور اکثری طور پر سات یا پانچ فیصدی تک ہوگی بالکل بے دست و پا اور زندہ درگور ہو جائیں گے اور مسلم منطقوں میں غیر مسلم جن کی تعداد ۴۵ فیصدی تک ہوگی مسلم حکومت کے لیے وبالِ جان ہوں گے۔

پس مسلم منطقے ہندو منطقوں کے تقریباً ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کی تباہی اور ہلاکت کی دستاویز پر خود دستخط کر کے اور اپنی جگہ ایسی حکومت جس میں غیر مسلم متعصب مؤثر اقلیتیں ان کے لیے وبالِ جان ہوں حاصل کر کے کونسی فلاح و بہبود اور اطمینان و مسرت حاصل کر سکیں گے، کیا یہ غضب کچھ کم ہے کہ مسلم اقلیتوں کے مسلمانوں کی حفاظت کے لیے جو کام کیا گیا ہو وہ ایسے طرز پر کیا جائے کہ انہیں غریب، بے کس مسلمانوں کے

ساڑھے تین کروڑ کی تعداد ہلاک و برباد کر دی جائے اور اپنی اکثریت بھی شدید خطرات میں مبتلا ہو جائے۔

(۳) تیسرا گروہ وہ ہے جو ہندوستان کے آئندہ آئین کو وفاقی لامرکزی اصول پر مرتب کرنا ہندوستان کے لیے اور اس کے تمام صوبوں اور قوموں کے لیے مفید اور قابل عمل سمجھتا ہے، وفاق میں شامل ہونے والی حکومتیں اپنی اپنی جگہ کلیتہً آزاد اور خود مختار ہوں گی، مرکزی حکومت ان کی آزادی میں کوئی مداخلت نہیں کر سکے گی، مرکز کو صرف وہ اختیارات ملیں گے جو وفاق کے اجزاء اس کو اتفاق رائے سے سپرد کریں گے اور غیر مصرحہ اختیارات صوبائی حکومتوں کو حاصل رہیں گے ہر حکومت میں اقلیتوں کے تہذیبی، سیاسی، مذہبی حقوق کی حفاظت کی جائے گی اور ان کی صوابدید کے موافق تحفظات دیئے جائیں گے، اکثریت اپنے حقوق اکثریت سے مستفید ہوگی اور اقلیتیں امن و اطمینان کی زندگی بسر کریں گی، غیر مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمان اقلیت کو کسی تکلیف اور بے انصافی کا خوف نہ ہوگا اُن کے تمام سیاسی اور مذہبی حقوق اور مقدس شعائر بجائے خود محفوظ ہو جائیں گے اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں غیر مسلم اقلیتیں امن و اطمینان سے زندگی بسر کریں گی اور ان کے ساتھ کوئی بے انصافی نہ کی جائے گی اور ان کے تمام سیاسی اور مذہبی حقوق اور شعائر محفوظ ہو جائیں گے، ہندوستان کے ذی بصیرت اصحاب رائے اس تجویز کو موجودہ ماحول میں قابل عمل اور ہندوستان کے پیچیدہ مسائل کے حل کرنے کا واحد راستہ سمجھتے ہیں۔ آزاد مسلم کانفرنس منعقدہ دہلی کی تجویز اس رائے کی آئینہ دار ہے جس کا اجمالی خاکہ یہ ہے کہ ہندوستان کے آئندہ دستورِ اساسی میں مندرجہ ذیل اصول کو پیشِ نظر رکھا جائے:۔

(۱) مسلمانوں کے شخصی قانون (پرسنل لاء) اور ان کے مذہب اور تہذیب کی حفاظت۔

(۲) مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور ان کی حفاظت۔

(۳) آئندہ حکومت کی ایسی تشکیل جس میں صوبہ دار کامل خود مختاری کے ساتھ لامرکزیت کے اصول پر وفاق کے لیے ناگزیر وفاقی امور کی تشریح۔

(۴) مسلمانوں کے اقتصادی، معاشرتی، تمدنی حقوق اور ملازمتوں میں تناسب کی تفصیل اور ان کے لیے تحفظات۔

اسی اجلاس میں مندرجہ ذیل تجویز پاس کی گئی:۔

"جمعیۃ العلماء بارہا اس امر کا اعلان کر چکی ہے کہ اس کا نصب العین آزادی کامل ہے اس پر تمام مسلمانانِ ہند متفق ہیں اور اسی کو اپنے لیے ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں، جمعیۃ نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے، ان کا مذہب آزاد ہوگا اور مسلم کلچر اور تہذیب و ثقافت آزاد ہو گی، وہ کسی ایسے آئین کو ہرگز قبول نہ کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔ جمعیۃ علماء ہند ہندوستان میں صوبوں کی کامل خود مختاری اور آزادی کی زبردست حامی ہے جس میں غیر مصرحہ اختیارات بھی صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے اور مرکز کو صرف وہی اختیار ملیں گے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں گے جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔ جمعیۃ العلماء ہند کے نزدیک آزاد صوبوں کا سیاسی وفاق ضروری اور مفید ہے مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب کے مالک نو کروڑ پر مشتمل مسلمان قوم کسی عددی اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو کر ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہ ہو گی یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصول پر مبنی ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں[1]"

ف ۔ حضرت رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ نے اپنے اس خطبہ میں اور دوسری تقاریر میں اھون البلیتین کا کلمہ ارشاد فرمایا ہے، یہاں اس کی تشریح کر دی جاتی ہے تاکہ ناظرین مضمون کی افادیت کو سمجھ لیں، یہ کلمہ ارشاد نبوی کا ایک حصہ ہے جس میں فرمایا ۔

"جب تم دو مصیبتوں میں پھنس جاؤ تو پہلے اُس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرو جس سے نجات آسان ہو"

یعنی اگر کوئی مسلمان دو پریشانیوں کا شکار ایک ہی وقت میں ہو جائے تو دونوں کا بیک وقت مقابلہ کرنے کی بجائے صرف ایک مصیبت کا مقابلہ کر کے اُس سے آزادی حاصل کرے پھر دوسری سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرے، مثلاً ۔

---

[1] از جمعیۃ العلماء ہند مرتبہ محترمہ پروین روزینہ، شائع کردہ قومی ادارہ برائے تحقیق و ثقافت اسلام آباد

"ایک گلی میں رہنے والے دو پڑوسیوں کا ایک دیوار کے بارہ میں جھگڑا ہو رہا تھا ایک کہتا تھا یہ دیوار میری ہے اور دوسرا کہتا تھا یہ دیوار میری ہے، اتنے میں ڈاکو اُس گلی میں آگئے اور اس گلی پر حملہ کر دیا، اب اگر یہ دونوں پڑوسی آپس میں لڑتے رہیں تو چور دونوں کو لوٹ کر چلے جائیں گے، اور اگر دونوں نے تھوڑی دیر کے لیے آپس میں صلح کر لی اور اپنے مشترکہ دشمن حملہ آور کا مقابلہ کر کے اُسے بھگا دیا تو یہ آسان بھی ہوا اور بہتر بھی ہوا۔"

جیسا کہ خود سیّدِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہودِ مدینہ کے ساتھ ایک معاہدہ فرمایا تھا جو تاریخ میں "معاہدۂ مدینہ" کے نام سے مذکور ہے، جس کی اساس یہ تھی کہ: "مسلمان اور یہود دونوں مل کر بیرونی حملہ آور کا دفاع کریں گے خواہ وہ حملہ آور کسی پر بھی حملہ کرے۔"

اِسی کے پیشِ نظر حضرتِ مدنیؒ نے فرمایا کہ ہمارے سامنے انگریز اور ہندو دونوں سے مقابلہ ہے اور دونوں سے بیک وقت مقابلہ تو مشکل ہے اس لیے ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کو ساتھ ملا کر پہلے انگریز کو ہندوستان سے نکالا جائے پھر بعد میں جو مناسب تدابیر ہوں گی اُن پر عمل کیا جائے گا۔

حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ کا تقسیم سے پہلے پاکستان کا آخری سفر

به عنوان

محبوب آقا کی یادیں

آخری دیدار کی ایک جھلک

ہمارے محبوب آقا جن کا تاریخی نام "چراغ محمد" ہے اور "حسین احمد" کے نام سے جلال و صبر کا پرچم چودھویں صدی کے پُرفتن دور میں لہراتے ہوئے ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو محبوبِ حقیقی سے جا ملے۔ آپ نے مغربی پاکستان کا دورہ ۱۹۴۶ء میں فرماتے ہوئے صوبہ سرحد کو اپنے قدوم میمنہ سے شرف بخشا، مجھے ۲۷ جنوری ۱۹۴۶ء کو پتہ چلا تو میں خوشی اور مسرت کے جذبات ساتھ لے کر پشاور کے ارادہ سے جب نوشہرہ سے کچھ آگے گذرا تو برلب سڑک کھڑے ہوئے مشتاقانِ دید سے معلوم ہوا کہ حضرت ابھی نوشہرہ تشریف لا رہے ہیں، میں وہیں بس سے اُتر کر ان جان نثاروں کی صف میں کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کوہ جلال و جمال حسنیت کا پرچم لہراتا ہوا جلوہ افروز ہوا، تقریباً چار میل کا فاصلہ کافی دیر میں طے ہو کر جلسہ گاہ میں تشریف فرما ہوئے جہاں پہلے سے تقریر کا انتظام ہو چکا تھا حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر کے بعد حضرتؒ نے اپنے ارشادات سے نوازا۔ پروگرام ختم ہونے پر میں نے واپسی کا پوچھ لیا، آپ نے حضرت گل بادشاہ صاحبؒ سے فرما دیا کہ وہ پروگرام بتا دیں۔ حضرتؒ تو کسی اور جگہ تشریف لے گئے اور میں سیدھا گھر چلا آیا، یہاں آ کر مشتاقانِ دید کو اطلاع کر دی کہ کل ۲۸ جنوری کو جمالِ احمد کا مظہر اور صبرِ حسینؓ کا علمبردار کیمبل پور سے گذرے گا، چنانچہ اکثر احباب ۲۸ جنوری کو کیمبل پور پہنچ گئے، شام کو حضرتؒ کے استقبال اور زیارت کے لیے مسلمانانِ کیمبلپور کا ایک انبوہ جس کی قیادت میں سید میر حضرت شاہ صاحب مرحوم ایڈووکیٹ پیش پیش تھے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا، گاڑی کے پہنچنے پر حضرتؒ نے سب سے پہلے مصافحہ فرمایا اور پھر اسٹیشن کے برآمدہ میں نماز باجماعت ادا فرمائی جس کے امام وہ خود بنے جو امام الاتقیاء تھے، جب ریل کیمبل پور سے چلی تو یہ سیہ کار بھی ڈبے میں سوار ہو گیا، ٹکٹ پہلے ہی راولپنڈی کا لے رکھا تھا، گاڑی میں ہی کھانا گرم کیا گیا اور اس بدکار نے میز بانوں کے بادشاہ کے ساتھ کھانا کھایا۔ کتنا پُرلطف اور پُرکیف وہ منظر تھا، جب کھانے کے بعد پھل لیے تو ان

سنگتروں کو بہترین قرار دیا جو اس سیہ کار نے پیش کیے، حالانکہ وہ کھٹے تھے مگر دو دفعہ وہی تناول فرمائے۔
غرض تو یہی تھی کہ ایک غیر مخلص خادم کی دلجوئی کی جائے، کھانے کے فوراً بعد آرام اور سکون سے نا آشنا وجودِ پاک اپنے برتھ پر لیٹ گیا، خلافِ معمول لیٹنا بھی کسی رحمت نوازی کا پیش خیمہ تھا، احقر آگے بڑھا اور پاؤں پنڈلیاں دبانے کی سعادت حاصل کرنی شروع کر دی، دل میں ڈر بھی رہا تھا کہ یہ پیکرِ عجز و انکسار مجسّمۂ تواضع فوراً مجھے روک دیں گے مگر اس اُن دلرُبائی کے قربان! کچھ بھی نہ فرمایا، جی کھول کر سعادت حاصل کی حتّٰی کہ گولڑہ کے اسٹیشن پر ریل آ کر کھڑی ہوئی، راستہ میں کسی سٹاپ پر نہ پوچھا یہاں فرمایا کون سا اسٹیشن ہے؟ عرض کیا حضرت! گولڑہ ہے، فرمایا گولڑہ شریف! حاجی صاحب نوراللہ مرقدہٗ و قدس سرہٗ کے گلشنِ صابری کا ایک گلدستہ[1] یہاں بھی محوِ عطر پاشی ہے شاید اس لیے یاد فرمایا۔ راولپنڈی پہنچنے پر پلیٹ فارم پر تشریف لائے اور نماز باجماعت ادا فرمائی، خود ہی امامت فرمائی، میں دل میں بڑا خوش تھا کہ چلو کم از کم یہ دو نمازیں تو دربارِ رب العباد میں مقبول ہوں گی جو فخر العباد کی امامت میں ادا کر رہا ہوں۔ مگر کیا خبر تھی کہ یہ شام اور عشاء کی نماز جس طرح آفتابِ عالمتاب کے غروب کی علامت ہے اسی طرح اس آفتابِ ہدایت، ماہتابِ رُشد و فلاح کے آخری سفر کی ایک وارننگ ہے، نماز کے بعد ڈبے میں تشریف لائے اور اپنی سیٹ کو چھوڑ کر اُس سیٹ پر جلوہ نما ہوئے جو پلیٹ فارم کی طرف تھی، میں باہر آ کر کھڑا ہو گیا، فرمایا قاضی صاحب! چائے تو پلائیے۔ حالانکہ چائے کا سب سامان ساتھ موجود، چولہا موجود، پھر ایک کفش پوش کو یہ فرمانا اگر دلرُبائی نہیں تو کیا ہے؟ میں دوڑا چائے فروش سے کہا، اُس نے کہا چینی تو نہیں البتہ شکر کی چائے مل سکتی ہے (اس زمانہ میں چینی نایاب تھی) پیالی بنا کر لایا، پیش کرتے ہوئے عرض کر دیا کہ حضرت! شکر کی ہے، فرمایا یہ ہی بہتر ہے۔
بڑے مزے سے نوش فرمائی، تھوڑی دیر بعد گاڑی چل پڑی اور آہستہ آہستہ دلوں کو منور کرنے والا محبوب چہرہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ انوار کی بارش سے نوازے۔ آمین

---

[1] اس سے مراد جامع شریعت و طریقت پیر مہر علی شاہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی ذاتِ گرامی ہے، حضرت پیر صاحب حسنی سید تھے، ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۹ء کو ولادت باسعادت ہوئی، ابتدائی تعلیم علاقہ کے مشہور علماء کرام سے حاصل کرنے کے بعد دورہ حدیث مولانا احمد علی سہارنپوری رحؒ سے پڑھا اور ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء کو سند فراغت حاصل کی، آپ کو حرمین شریفین کی زیارت کا بہت شوق تھا، مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحؒ کے حلقہ میں تشریف لایا کرتے تھے۔ ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء میں حضرت حاجی صاحب رحؒ نے آپ کو طریقہ چشتیہ صابریہ میں خلافت سے نوازا اور ہندوستان واپس جا کر فتنۂ مرزائیت کے مقابلہ کی طرف توجہ دلائی، چنانچہ حضرت پیر صاحب رحؒ کے علمی اور روحانی تصرفات سے مرزا قادیانی لاہور ہی میں واصل جہنم ہوا، حضرت پیر صاحب رحؒ ۲۹ صفر ۱۳۵۶ھ / ۱۱ مئی ۱۹۳۷ء کو واصل باللہ ہوئے، مزار گرامی گولڑہ ہی میں ہے۔ (حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحؒ اور ان کے خلفاء)

ایوانِ حکومت میں زلزلہ اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ریشہ دوانیاں

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دارالعلوم پوری شان و شوکت کے ساتھ رواں دواں ہو گیا، خزاں کا موسم جھڑ گیا اور بہار آ گئی، مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا اور حسبِ سابق دارالعلوم کی مالی اعانت پر توجہ دینے لگے مگر حکومت کی نیند اُچاٹ ہو گئی، اُس نے یقین کر لیا کہ وہ دارالعلوم جس کی بنیاد ۱۸۵۷ء کی ناکامی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے رکھی گئی تھی وہ دارالعلوم اپنی حکمتِ عملی کے ساتھ رواں دواں رہا، اگرچہ انگریزی حکومت نے اپنی نظریں اس پر پوری طرح مرکوز رکھیں اور مختلف طریقوں سے دارالعلوم کو اپنے مقصدِ اصلی سے ہٹانے کے لیے کئی سازشیں بھی کیں، جن کا اکثر وہ حصہ جو حضرت شیخ الہندؒ کے خلاف استعمال کیا گیا تھا اور حضرت مرحوم کو بھی اس کا علم نہ تھا مگر اسارتِ مالٹا کے وقت آپ کو وہ سارا رجسٹر دکھایا گیا تھا جس میں کچھ نہ کچھ حکومت کو کامیابی نظر آئی مگر حضرتِ مدنیؒ کی دارالعلوم دیوبند میں اس اہم عہدہ پر سرفرازی سے وہ سارا تار و پود بکھرتا نظر آنے لگا، جس مدنیؒ نے اپنے شیخ کی اقتداء اور اتباع میں مالٹا کی اسارت کو قبول کیا، کراچی کی جیل کاٹی، اور جس کی نظر میں نہیں عقیدہ و عمل میں اسلام اور مسلمانوں کے دشمن انگریزی اقتدار کا خاتمہ کرنا سب سے بڑا مقصد تھا، وہ حسین احمد دارالعلوم دیوبند کا شیخ الحدیث اور صدر مدرس بن گیا۔

ادھر ملک کی عظیم اسلامی سیاسی جماعت جمعیۃ العلماء کا سرگرم رُکن پھر صدر بن گیا، عوام کا رجوع اس طرح ہونے لگا کہ اس سے پہلے کسی مسند نشین کو حاصل نہ ہوا تھا، انگریز نے تو حضرت شیخ الہندؒ کے ایک خادم حسین احمد کو کئی سال جیل میں رکھا، ہر قسم کی امکانی تکالیف پہنچائیں، مگر اب تو ہزاروں ایسے سعادتمند پیدا ہو گئے جو حسین احمد کے اشارہ پر جان کٹانے کو فخر سمجھتے تھے، ان حالات میں انگریز کی نیند حرام ہو گئی اور اس نے کئی ایسے طریقے اختیار کیے کہ جن کے روبکار لانے سے حضرتِ مدنیؒ کا تعلق دیوبند سے پورا پورا کٹ جائے، وہ طریق کار یہ تھا:۔

(۱) دارالعلوم دیوبند کے نظم ونسق پر فائز بعض لوگوں کو حضرت مدنیؒ کے خلاف خفیہ طریقہ پر پمفلٹ، پوسٹرز شائع کرنے، بعض اخبارات مثلاً "الامان" دلّی میں فرضی ناموں سے حضرت مدنیؒ کے خلاف مضامین شائع کرنے کا کام سپرد کیا گیا۔

(۲) حضرتِ مدنیؒ کے تمام حالات پر کڑی نظر رکھنے کے لیے خاص آدمی خاص شعار کے ساتھ مقرر کیے گئے۔

(۳) چونکہ اہتمام اور صدارت میں اتفاق تھا جس کی برکت سے دارالعلوم ترقی پذیر ہو رہا تھا اس لیے اہتمام کو اپنے قابو میں لانے کے لیے حکومت نے اپنے بعض خیر خواہ اور فرمانبردار سرکردہ دنیاداروں سے کام لینے کی تحریک شروع کی۔

(۴) خود حکومت نے آہستہ آہستہ آپ کو پابندِ سلاسل کرنے کی تحریک شروع کر دی، ان سب پر مختصر سا تبصرہ درج کیا جاتا ہے:۔

مفسدوں نے ہفتہ وار قلمی پمفلٹ لکھ کر طلباء کے کمروں میں خفیہ طور پر ڈالنے شروع کیے، جن میں حضرتؒ کی ذاتِ بابرکات پر افتراء اور بہتان ذکر ہوتا، ابھی دو تین پرچے اس طرح کے نکلے تھے کہ چند جان نثاروں نے ان کے جواب میں ایک ہفتہ وار قلمی رسالہ "الاصلاح" کے نام سے اور ایک دوسرا رسالہ شائع کر کے کمروں میں ڈالنا شروع کیا جن میں الزامات یا افتراء نہ تھا بلکہ ان کے بعض رازہائے درون کا افشاء ہوتا، دو تین پرچے نکلے تو وہ مفسد برادرانِ یوسف کی چادر اوڑھ کر حضرت مدنیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت تو سراپا عفو و کرم تھے، اس کے انسداد کا وعدہ فرمایا۔ ایک دن یہ اعلان ہوا کہ آج بعد نمازِ عصر حضرت مدنیؒ دارالعلوم کی مسجد میں خطاب فرمائیں گے، طلباء تو حضرتؒ کے عاشق تھے ایسے موقع کو غنیمت جان کر پہنچ جاتے تھے کہ حضرت کی زیارت ہو جائے گی مگر ساتھ یہ بھی احساس ہو جاتا تھا کہ کوئی خاص بات ہے ورنہ حضرت جیسا عدیم الفرصت انسان اتنا وقت کس طرح دے سکتا ہے۔

بہر حال سب طلباء نے نمازِ عصر مسجد میں ادا کی، حضرت نے طلباء کو خطاب فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "آپ کو میری طرف سے دفاع کا کوئی حق نہیں آپ کا کام پڑھنا ہے آئندہ کے لیے ایسی حرکات بند کر دیں"۔ مگر حضرتؒ کو یہ علم تھا کہ کچھ طلباء جذبۂ حیدری رکھتے ہوئے حضرتؒ کی اس نصیحت پر عمل نہ کریں گے، تو آخری تیر چلاتے ہوئے فرمایا، "اگر باز نہ آئے تو میں بد دعا کروں گا"۔ اور اس شعر پر خطاب ختم فرمایا ؎

؎ مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعتِ ما جز ایں گناہے نیست [1]

اس پر اُن طلباء نے قلم توڑ دیئے مگر مفسدوں کو بھی سانپ سونگھ گیا، البتہ بیرونی اخبارات میں فرضی ناموں سے ایسے مضامین بھیجتے رہے، اس کارِ شر میں مظہر الدین شیر کوٹی کا روزانہ اخبار الامان اور وحدت اپنی عاقبت خراب کر رہا تھا۔ اسی الامان نے حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی ایک تقریر کا اقتباس تحریف کر کے شائع کر دیا تھا، جس کو پڑھ کر علامہ اقبال نے جذبات کی رَو میں بہہ کر بلا تحقیق تین اشعار کہہ ڈالے تھے، جس پر کافی لے دے ہوئے کے بعد علامہ اقبال نے رجوع کر لیا تھا، یہ ساری داستان ایک مستقل عنوان "حضرت مدنیؒ اور علامہ اقبال" میں آرہی ہے۔

الغرض دارالعلوم اپنے مقصد میں رواں دواں رہا، حضرت مدنیؒ کی برکات اور فیوضات ملک گیر ہوتے گئے جس پر انگریزی حکومت کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا رہا تا آنکہ ۱۹۴۲ء میں جبکہ تحریکِ آزادی زوروں پر تھی اور انگریزی حکومت آخری سانس لے رہی تھی حضرت مدنیؒ کو دارالعلوم دیوبند سے علیحدہ کرنے کی سازش کی گئی جس کی وضاحت ضروری ہے، اس کے لیے دو طریقِ کار اختیار کیے گئے:۔

(۱) ایک تو دارالعلوم کے اہتمام میں تبدیلی (۲) اور دوسرا حضرتؒ کو جبراً دارالعلوم سے علیحدہ رکھنے کے لیے حکومت کا اقدام۔

پہلے طریقِ کار کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ دارالعلوم کے شعبہ اہتمام میں (جو کہ فیصلہ کن ادارہ تھا) صدر مہتمم کا عہدہ زیادہ کیا گیا اور اس کے لیے مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کو منتخب کیا گیا اور وجہ یہ بیان کی گئی کہ:۔

"مولانا محمد طیب صاحب کو اہتمام کا صیغہ سپرد کیا گیا تو نو عمری کی وجہ سے عموماً اساتذہ و ملازمین اور طلباء پر آپ کا اتنا اثر قائم نہ ہو سکا جتنا ایک معمر کہن سال آدمی کا ہونا چاہیئے اس لیے مجلسِ شوریٰ نے مختلف پیچیدگیوں کو دیکھ کر دو سال ہوئے کہ صدر مہتممی کا ایک نیا عہدہ بنا کر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صدر دارالعلوم ڈابھیل کا اعزازی طور پر تقرر کیا ہے۔"

(حیاتِ عثمانی ص ۴۱۹)

---

[1] ترجمہ شعر: کسی کو دکھ نہ دے باقی جو چاہے کر تا رہ کیونکہ ہماری شریعت میں اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں۔

جناب قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اس فیصلہ کے وقت حج کو تشریف لے گئے تھے واپسی پر آکر اپنی رائے میں تحریر فرمایا :۔

"احقر کی غیبت (عدم موجودگی) میں بحیثیت قائم مقام مہتمم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کا تقرر کیا گیا تھا اور پھر اجلاسِ شوریٰ منعقدہ ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۷ء میں مولانا ممدوح کا صدارت پر تقرر کیا گیا۔" (حیاتِ عثمانی ص۴۲۱)

یعنی باوجود اس امر کے کہ دارالعلوم کی انتظامیہ میں صدر مہتمم کا کوئی عہدہ نہیں مولانا عثمانی کا شدید ضرورت کے تحت بحیثیت صدر مہتمم تقرر کیا گیا، اور وہ شدید ضرورت یہ تھی کہ قاری محمد طیب صاحب کا دارالعلوم پر مستحکم اثر نہ تھا حالانکہ اسی قاری محمد طیب کو ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۴ء کو نائب مہتمم بنایا گیا، یعنی ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۷ء تک تقریباً تیرہ سال تو دارالعلوم کو سنبھالتے ہی نہیں رہے بلکہ ترقی پذیر رہا اور پھر حضرت مولانا عثمانی کے صدر اہتمام سے ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۴ء کو رخصت ہونے کے بعد بھی ترقی پذیر رہا مگر چند سالوں کے لیے اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی ـــــ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے جو اصول مدرسہ کے لیے اپنے قلم سے تحریر فرمائے ہیں اُن میں سے اصل ۷ یہ ہے :۔

(۷) سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔ (القاسم، دارالعلوم نمبر ص۶)

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے والد ماجد مولانا فضل الرحمٰنؒ تے "ارمغانِ مدرسہ" کے نام سے ایک نظم میں فرمایا ؎

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کیلئے
کوئی سرمایہ بھروسے کا ذرا ہو جائے گا

پھر یہ قندیلِ معلق اور توکل کا چراغ
یہ سمجھ لینا کہ بے نور و بے ضیا ہو جائے گا

ہے توکل پر بناء اس کی تو بس اس کا معین
ایک اگر جائے گا، پیدا دوسرا ہو جائے گا

(ارمغانِ مدرسہ ص۳۳)

مگر شاید شدید ضرورت کی وجہ سے ۱۸۹۳ء کے بعد مولانا شاہ رفیع الدین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے نظام حیدرآباد دکن سے امداد طلب فرمائی تھی اور پھر یہ تعلق بڑھتے بڑھتے یہاں تک آپہنچا کہ دارالعلوم دیوبند کے نظم و نسق میں بھی نظام کا دخل دخیل رہا خصوصاً حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی اُن تقاریر سے جو آپ نے

محرم الحرام کے ایام میں فرمائی تھیں، پہلی ہی بار تاحیات پچاس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر فرمایا۔ دوسرے سفر ۱۳۴۶ھ ہجری ۱۹۲۸ء ملاقات پر نظام[1] نے آپ کی درخواست پر فتح الملہم شرح صحیح مسلم کی کی پانچ جلدوں کی طباعت کے لیے پچیس ہزار روپیہ منظور فرمایا اور دو سال کے لیے کتاب کی تیاری اور تصنیف کے لیے چار سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر فرمایا۔

---

[1] نظام عثمان علی خان مرحوم اور اس کے والد نے دینی علوم اور علماء کی کافی خدمت کی تھی، دائرۃ المعارف العثمانیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس نے کافی قلمی کتابیں شائع کیں، علماء کرام نے نظام کی ان ہی علمی خدمات کی وجہ سے سلطان العلوم کا لقب دے دیا تھا، مگر ان سب خوبیوں کے باوجود حکومتِ انگریزی کا منظورِ نظر اور دلی خیر خواہ تھا، جب ۱۸۵۸ء میں بہادر شاہ ظفر کی جلا وطنی کے بعد دلی میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ نظام حیدر آباد دکن کے بغیر کسی کو یہ تقرب حاصل نہ ہوا۔ اور عقیدہ کے طور پر بھی تفضیلی شیعہ تھا یعنی اگرچہ آپ کا نام تو عثمان علی تھا جس میں عثمان کا اسم گرامی مقدم ہے مگر عقیدہ کے لحاظ سے نظام حضرت علیؓ کی خلفائے ثلاثہ پر فضیلت کے قائل تھے۔ جیسا کہ سید سلیمان ندویؒ نے ایک جلسہ میلاد النبی منعقدہ حیدر آباد دکن کی رُوداد یوں بیان کی ہے:۔

"ایک ایسا وقت آیا کہ جب نظام (عثمان علی خان) پر تفضیلیت کا غلبہ تھا اور اتفاق سے وہ مکہ مسجد میں نماز پڑھنے آئے تھے تو مرحوم مولانا شبیر احمد صاحب نے تقریر فرمائی جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل بہت دلنشیں طریقے سے بیان کیے گئے تھے اُس دن لوگوں کو مرحوم کی تقریر سے بڑی خوشی ہوئی اور انکے بیباکانہ اظہارِ حق کی سب نے تعریف کی۔" (حیاتِ عثمانی ص ۲۷۰)

۱۹۳۲ء میں حضرت مدنیؒ کی گرفتاری

حضرتؒ جس طرح دارالعلوم کی تدریسی خدمات اور احسان وسلوک کے خانقاہی نظام کے روحِ رواں تھے اسی طرح انگریزی حکومت کی مخالفت بھی آپ کے پروگرام کا ایک حصہ تھی تاکہ یہ منحوس قدم اس سرزمین سے نکل جائیں۔ آپ کے ہاں انگریز کی مخالفت صرف سیاسی نہ تھی بلکہ آپ کو عقیدے کے طور پر بھی اس ظالم اور خونخوار حکومت سے نفرت تھی، اس لیے دوسرے سیاسی افراد کی طرح نہ تو حکومت کے ساتھ میٹنگ کرتے تھے نہ اس کی دعوتوں کو قبول کرتے تھے، نہ لندن کا سفر اور انگریز کی گول میز کانفرنسوں میں شرکت فرماتے تھے جبکہ دوسرے سیاسی لیڈروں کا حال بالفاظ حضرت اکبر الہ آبادی ہے

کام لیڈر کو بہت ہیں مگر آرام کے ساتھ
قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حُکام کے ساتھ

حضرتؒ اور حضرتؒ کے رفقاء کار بلکہ پوری جمعیۃ العلماء ہند اُن بے غرض، بے لوث اور بے خوف علماء کی جماعت تھی جنہوں نے زندگی کے سارے ہی سُکھ چین، دُنیا کی سب راحتیں و آرام اور گھر بار کے تمام عیش و عشرت، غرض سب کچھ ملک و ملت پر قربان کر رکھا تھا۔ یہ حضرات برطانیہ کے ساتھ ہر قسم کے تعاون کو، اُن کی کونسلوں کی ممبریوں کو اور ان کی حکومتوں کی وزارتوں کو نہ صرف بے فائدہ اور ضیاعِ وقت بلکہ قومی مصالح کیلئے ناجائز قرار دیتے تھے۔ چنانچہ جمعیۃ العلماء ہند نے اپنے چوتھے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں یہ تجویز پاس کر دی تھی کہ برطانیہ کی کونسلوں کی ممبری حرام ہے، بلکہ ۱۹۲۶ء کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں مسلمانوں کو منظم ہو کر اپنے

لہ چنانچہ دُنیا نے دیکھ لیا کہ جب آزادی کے بعد حکومتِ ہند نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک بڑا اعزاز پدم وبھوشن پیش کرنے کی تجویز کی تو حضرتؒ نے حکومت کو مطلع فرما دیا کہ ہم نے جو کچھ کیا ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کیا ہے اس لیے یہ اعزاز شکریہ کے ساتھ واپس لیا جائے۔

بل بوتے پر ملک کو آزاد کرانے کے لیے حکم دے دیا تھا۔

چنانچہ ایسی ہی سرگرمیوں کے پیشِ نظر ۱۹۳۲ء میں کانگریس کے ساتھ جمعیۃ علماءِ ہند کو بھی حکومت نے خلافِ قانون قرار دے دیا، جمعیۃ نے اس کے خلاف تحریک سول نافرمانی چلائی جس کے لیے مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ ڈکٹیٹر اول اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ ڈکٹیٹر دوم اپنی اپنی باری پر قانون شکنی کرتے ہوئے گرفتار کر لیے گئے جبکہ حضرت مدنیؒ ڈکٹیٹر سوم تھے۔

چنانچہ اسی پروگرام کے مطابق حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سول نافرمانی کے لیے دیوبند سے روانہ ہوئے تاکہ دہلی پہنچکر نمازِ جمعہ کے بعد جامع مسجد میں تقریر کر سکیں۔ گورنمنٹ کی نگاہوں میں حضرتؒ کی سول نافرمانی اور تقریر کی اہمیت بہت زیادہ تھی، خطرہ تھا کہ آپ کی آواز پر لاکھوں مسلمان بلکہ ہندو بھی گرفتاری دینے پر تیار ہو جائیں گے اور صورتِ حالات حکومت کے قابو سے باہر ہو جائے گی۔ آپ کی محبوبیت، مقبولیت اور عظمت وعزیمت کا حکومت کئی بار مشاہدہ وتجربہ کر چکی تھی چنانچہ جیسے ہی ٹرین حضرتؒ کو لے کر روانہ ہوئی، دوسرے یا تیسرے ہی اسٹیشن مظفرنگر پر مسلح گارڈ نے پوری گاڑی کا محاصرہ کر لیا، اُس وقت حضرتؒ کے پیروں میں زخم یا پھنسیوں کی تکلیف تھی اور زیادہ دُور چلنا متعذر تھا مگر اسی حالت میں اپنے پروگرام کی تکمیل اور گرفتاری کے لیے میدانِ جہاد کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ افسرانِ حکومت نے وارنٹ گرفتاری پیش کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ وارنٹ سہارنپور کی کلکٹری سے جاری ہوا اور میں اِس وقت اُس کی حدود سے باہر ہوں اس لیے وارنٹ میرے اوپر تعمیل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ حکومت نے گرفتاری کا فیصلہ کر رکھا تھا اُسی وقت دوسرا وارنٹ گرفتاری جاری کرایا گیا اور حضرتؒ کی گرفتاری عمل میں آئی۔ یہ حضرتؒ کی تیسری قید تھی جو صرف ایک یا ڈیڑھ ہفتہ جاری رہی ہے، پھر حکومتؒ نے سب کو آزاد کر دیا تھا۔

حضرت مدنیؒ کی گرفتاری پر شاہی مسجد مراد آباد میں ایک احتجاجی جلسہ زیرِ صدارت حضرت مولانا عبدالحق مدنی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ منعقد ہوا، اتفاق سے مولانا ظفر علی خان مرحوم اور ملک نصر اللہ خان عزیز نے بھی بریلی سے واپس لاہور جاتے ہوئے مراد آباد کے اس جلسہ میں شرکت فرمائی اور مولانا ظفر علی خان مرحوم نے اس جلسہ میں مختصر تقریر کے بعد مندرجہ ذیل نظم بھی

فی البدیہہ پڑھی ہے

سیادت اُس کو ملتی ہے وہی سردار ہوتا ہے
کہ جو اعدائے دیں سے برسرِ پیکار ہوتا ہے

ہُوا کرتا ہے وصلِ شاہدِ مقصد اسے حاصل
کہ جس کا دل حریص لذتِ آزار ہوتا ہے

عَلَمِ نَصْرٌ مِّنَ اللہ کا جو لے کر ہاتھ میں نکلا
تو اُس پہ سحرِ باطل بالیقیں بیکار ہوتا ہے

گرج سے لرزہ براندام ہوتا ہے عدو جس کی
مبارک ہو وہی شیرِ خدا تیّار ہوتا ہے

حسین احمد کہ جس کا نام روشن ہے زمانے میں
رہا ہے مُدّتوں جو مالٹا کے قید خانے میں

نکل آیا ہے میدانِ عمل میں ہو کے بے پروا
مصائب کا جسے ڈر ہے نہ کھٹکا جورِ دشمن کا

وہ ہے ایسا بہادر غیر ممکن ہے مثال اس کی
شجاعت اور ہمت میں کوئی ثانی نہیں جس کا

وہی مردِ مجاہد شور ہے تقریر کا جس کی
بٹھا یا دشمنوں پر جس نے اپنی بات کا سکّا

سمجھتا ہے ہمیشہ کھیل جو گردن کٹانے کو
اُسے کیا خوف ہو سکتا ہے توپوں کی نمائش کا

وہ ہے شیدائے حُریت وہ ہے دیوانۂ ملت
وہ ہے خواہانِ آزادی وہ ہے دیوانۂ ملت

چلا اس شان سے ہے جانشینِ قاسمِ ثانی
زباں پر نعرۂ تکبیر دل میں جوشِ ایمانی

لکھی ہے لوحِ دل پر ہر حدیثِ سرورِ عالم
مددگار و معین ہر وقت ہے تعلیمِ قرآنی

نظر کے سامنے سب اُسوۂ فاروقِ اعظم ہے
کہ سیکھا جس سے ہے دنیا نے آئینِ جہاں بانی

کرے گا پرزے پرزے دامن ظلم و تعدّی کے
اسی کے ساتھ ہو گی نصرت و تائیدِ ربّانی

یقین ہے دشمنانِ دیں کو پسپا کر کے چھوڑے گا
یہ سر ہر جابر و ظالم کا نیچا کر کے چھوڑے گا

(الارشاد ، مدنی نمبر)

حضرت مدنیؒ کی مُسلم لیگ میں شرکت اور انقطاع

> حضرت مدنیؒ اور پوری جماعت ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ ہوگئی اور الیکشن کے لیے مسلم پارلیمنٹری بورڈ تشکیل دیا گیا جس نے بڑی کامیابی حاصل کی، مگر پھر مسلم لیگ سے تعلق منقطع کرلیا گیا، اس کی وجہ حضرتؒ نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں فرمائی ہے، وہ پورا مکتوب ہدیۂ ناظرین ہے اور پھر اس پر مؤلف کی طرف سے توضیحی فوائد بھی درج ہیں۔ (مؤلف)

محترم المقام زید مجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج شریف، والانامہ ۲۰ ذیقعدہ باعث سرفرازی ہوا تھا، مگر اس مدت میں اس قدر مصروفیت تھی کہ جواب نہ لکھ سکا، خیال تھا کہ کسی فرصت کے وقت میں لکھوں گا۔ ۲۰ نومبر کی شام کو بعد از مغرب جب میں اعظم گڈھ پہنچا تو اس ارشاد کی بناء پر جو کہ پہلے آپ نے فرمایا تھا کہ ان اطراف میں جب بھی آنا ہو تو ہماری ضرور آنا، چاہے تھوڑی مدت کے لیے ہو اور میں نے قبول کرلیا تھا، ارادہ تھا کہ اگر ممکن ہو تو رات کو آپ کے یہاں قیام کروں اور اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو چند منٹ کے لیے حاضر ہی ہو جاؤں، مگر افسوس کہ ایسے واقعات پیش آئے کہ ہر دو میں کامیابی نہ ہوسکی۔ آپ نے جن امور کو دریافت فرمایا ہے اُن کے متعلق تفصیل تو زبانی ہی ہوسکتی ہے مگر اس وقت اجمالی طور پر اتنا عرض کرتا ہوں کہ تحریکاتِ آزادیٔ ہند میں ۱۹۱۴ء سے شریک ہوں اور اس کو مسلمانوں کا مذہبی اور انسانی فریضہ سمجھتا ہوں، پہلے میں تشدد والی انقلاب پارٹی میں شریک تھا اور حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز ہمارے امام تھے اور اسی سلسلہ میں ہمارا مالٹا کی اسیری کا واقعہ پیش آیا، وہاں سے واپسی پر خلافت کمیٹی، جمعیۃ، کانگریس میں شرکت اور عدم تشدد کی پالیسی میں دخول ہوا، اسی زمانہ میں آزاد خیال ترقی پسند مسلمان لیگ سے علیحدہ ہو کر خلافت میں شریک ہوئے اور کانگریس میں بھی رہے، کیونکہ ۱۳۱۶ء سے لیگ اور کانگریس متحد ہو چکے تھے، لیگ میں اُن کے نکل جانے کی وجہ سے

جان باقی نہیں رہی تھی، موجودہ عناصر کا بڑا حصہ تقریباً امن سبھا کا ممبر اور گورنمنٹ کا کلمہ پڑھنے والا تھا۔ ہم نے اسی بنا پر کبھی لیگ کی طرف رُخ نہیں کیا، انقلاب پیش آئے، خلافت کمزور پڑ گئی، بہت سے سرگرم و آزاد خیال ترقی پسند مسلمان رفتہ رفتہ وفات پا گئے۔ ۱۹۳۶ء کے قریبی زمانہ میں مسٹر جناح نے لیگ کو زندہ کرنے کی کوشش کی، رجعت پسند عناصر سے تنگ آ گئے تھے اور انہوں نے جمعیۃ اور احرار اور دوسری ترقی پسند جماعتوں سے اتحاد و اشتراک کیا، خود مسٹر جناح نے بمبئی کرانیکل میں جون ۱۹۳۶ء میں ایک مضمون شائع کیا تھا اور اس کا خلاصہ "مدینہ" بجنور میں ۵ فروری ۱۹۳۷ء میں حسب ذیل شائع ہوا تھا۔

(۱) مسلم لیگ کی پالیسی کا مقصد ایسے نظام کا بروئے کار لانا ہے جس کے ماتحت ترقی پسند اور آزاد خیال مسلمانوں کے ادارے متحد ہو جائیں۔

(۲) مسلم لیگ موجودہ دستور سے بہتر ایسا دستور حاصل کرنے کے لیے جو سب کو پسند ہو گا کانگرس کا ساتھ دے گی اور حکومت پر دباؤ ڈالے گی۔

(۳) مسلم لیگ اس اصول کو برقرار رکھتی ہے کہ بطور اقلیت مسلمانوں کو کافی تحفظ حاصل ہو۔

(۴) اسمبلی میں لیگ تمام قومی معاملات میں کانگرس سے تعاون کرے گی اور اس کے ساتھ رہے گی۔

(۵) لیگ کے صدر کی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ ایسے چالاک لوگوں کو جن کا مقصد حکومت کے ماتحت عہدے حاصل کرنا ہے، اور جنہیں عوام کے حقوق، ضروریات اور مفاد کی مطلق پرواہ نہیں، سیاسی میدان سے نکال دیا جائے۔

مندرجہ بالا مضمون کی لیگ کے مینوفسٹو کی عبارتِ ذیل مندرجہ صفحہ ۸ پوری تائید کرتی ہے۔

مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کے قیام اور عملدرآمد سے کچھ ایسی مختلف قوتیں پیدا ہو گئی ہیں جنہوں نے اپنا اثر صوبوں میں قائم کر لیا ہے اور ان ہی جماعتوں کے ساتھ ایسے اشخاص و افراد کی ٹولیاں بھی بن گئی ہیں جن کا مقصد و غرض سوائے اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ صوبوں میں جہاں کہیں اور جب کبھی ممکن ہو بڑی بڑی سرکاری ملازمتوں اور جگہوں پر دست درازی کریں اور ان پر اپنا قبضہ جمائیں، یہ تجویز چونکہ گورنمنٹ کے مقاصد کے معین ہے لہٰذا ایسی جماعتوں کو ہر طرح کی مدد و حمایت گورنمنٹ سے ملی جس سے یہ لوگ نہ صرف ملک کی اصلی ترقی و بہبود کے مزاحم ثابت ہو رہے ہیں بلکہ سمجھدار اہلِ ملک کو ان کی خود غرضانہ حرکتوں سے نقصان پہنچ رہا ہے، مختصر یہ کہ یہ جماعتیں اور یہ اشخاص گویا ملک میں اپنی ایک شخصی جابرانہ حکومت قائم کیے ہوئے

ہیں اور لیگ کا اصلی مقصد یہ ہے کہ اس جبر و استبداد کا پوری طرح انسداد بلکہ قلع قمع کیا جائے۔

عبارتہائے مذکورہ سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ مسٹر جناح اور لیگ کی پالیسی اُس وقت کیا تھی اور وہ کس قدر آزادی خواہ اور ترقی پسند مسلمانوں کے قریب تر تھی۔ اس وقت اگرچہ وہ مکمل آزادی اور اس کے لیے ڈائریکٹ ایکشن کی مُدعی نہ تھی مگر رجعت پسندوں اور خوشامدی لوگوں سے بالاتر تھی۔

مسٹر جناح نے ۱۹۳۶ء کے الیکشن کے لیے جمعیۃ علماء ہند سے اتحاد و تعاون چاہا، وہ زمانہ ولنگٹن کی حکومت کا تھا اور آزادی خواہ جماعتوں کی ہر قسم کی غیر قانونی جد و جہد پر سخت قانونی پابندیاں عائد تھیں، مسٹر جناح نے چند گھنٹہ ہم سے گفتگو کی اور درخواست پر زور دیا اور کہا کہ میں ان رجعت پسندوں سے عاجز آگیا ہوں اور ان کو رفتہ رفتہ لیگ سے خارج کر کے صرف آزاد خیال ترقی پسند لوگوں کی جماعت بنانا چاہتا ہوں، تم لوگ اس میں داخل ہو جاؤ۔ ہم نے کہا کہ اگر آپ ان لوگوں کو خارج نہ کر سکے تو کیا ہوگا؟ تو فرمایا کہ اگر میں ایسا نہ کر سکا تو میں تم لوگوں میں آجاؤں گا اور لیگ کو چھوڑ دوں گا۔ اس پر مولانا شوکت علی مرحوم اور دیگر حضرات نے اطمینان کیا اور تعاون کرنے پر تیار ہوگئے۔ چنانچہ ہم نے پورا تعاون کیا اور تقریباً پونے دو مہینہ کی رخصت بوضع تنخواہ دارالعلوم سے لی اور اتنی جد و جہد کی کہ اگریکلچرسٹ پارٹی اور دوسرے رجعت پسند امیدواروں کو شکست ہوئی اور تقریباً تیس یا اس سے زائد ممبر لیگ کامیاب ہوگئے، جس پر چوہدری خلیق الزمان نے مجھ کو خط میں لکھا کہ تیس برس کی مردہ لیگ کو تو نے زندہ کیا۔ ہم نے لیگ کا تعارف عام مسلمانوں سے کرایا اور لیگ کی آواز کو ہر جگہ پہنچا دیا، اس وقت مسٹر جناح نے جمعیۃ کا تیار کیا ہوا مینوفسٹو قبول کیا اور اسی کو تبیج میں شائع کیا، جس کی پہلی دفعہ یہ تھی کہ اسمبلیوں اور کونسلوں میں اگر کوئی خالص مذہبی مسئلہ پیش ہوگا تو جمعیۃ علماء ہند کی رائے کو خاص وقعت اور اہمیت دی جائے گی ـــــ مگر افسوس ہے کہ لیگ نے کامیاب ہونے کے بعد پہلے ہی اجلاس لکھنؤ میں اپنے عہود اور اعلانات کو توڑ دیا اور ان رجعت پسند خوشامدی انگریز پرست لوگوں کو لیگ پارٹی میں داخل کرنے کے خواستگار پُر زور طریقہ پر ہوئے جن کو خارج کرنے کا اعلان کیا تھا اور اُن کی پُر زور مذمت کر رہے تھے اور جن کے متعلق ہر شخص کو معلوم تھا کہ ہمیشہ ان کی زندگی قومی تحریکات کی مخالفت اور انگریز پرستی میں گذری ہے۔ ان سے وہیں کہا گیا کہ آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ ان لوگوں کو نکال دیا جائے گا، آج ان کو لیگ میں لانے اور پارٹی میں جگہ دینے کی آپ کوشش کر رہے ہیں

توبگڑ کر کہا کہ ''وہ پولیٹیکل وعدے تھے''۔ علاوہ اس کے اور متعدد اعمال خلافِ اعلان وعہود کیے جس کی بنا پر سخت مایوسی ہوئی اور بجز علیحدگی کے اور کوئی صورت سمجھ میں نہ آسکی، انہوں نے مرکزی اسمبلی میں شریعت بل پاس نہ ہونے دیا، قاضی بل کی سخت مخالفت کی، انفساخِ نکاح کے متعلق غیر مسلم حاکم کی شرط قبول کر لیا، آرمی بل پاس کیا، وغیرہ وغیرہ۔

الحاصل ایسے معاملات اس دس سالہ مدت میں کیے جن سے ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ حضرات مسلمان اور ملک کی مصالح کے لیے نہیں بلکہ سرمایہ داروں، رجعت پسندوں، جاہ پرستوں کے ساتھ ہمدردی اور تعاون کرنے والے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ برطانیہ کے بھی حامی اور مددگار ہیں اور حسب تصریحات بلیو فسٹو گورنمنٹ بھی ان کی حامی ہے، اب آپ ہی غور فرمائیں کہ ان کے ساتھ رہنا اور ان کی مدد کرنا کس طرح پر جائز ہے؟

(نوٹ) جس طرح عام مفسد اور معاند اکابر علماء خصوصاً حضرت مدنیؒ پر الزام لگا دیتے ہیں اسی طرح مسلم لیگ سے آپؒ کی علیحدگی پر بھی یہی پروپیگنڈہ کیا گیا، مگر جس مجاہد فی سبیل اللہ، بطلِ عزیمت و حریت کو انگریز جیسی جابر اور مکار قوم نہ خرید سکی جس نے زندگی بھر سنتِ حیدری پر عمل پیرا رہ کر نانِ جویں پر بسر اوقات تو کر لی مگر کسی نواب، رئیس، کارخانہ دار، سرمایہ دار کے دروازہ پر دستک نہ دی نہ کسی کی شان میں قصیدہ کہا نہ تحریر کیا نہ کسی کا مرثیہ مرتب کیا، اس کے بارہ میں یہ تصور کرنا بھی یا تو اس کی حیاتِ مبارکہ کے اطوار اور ادوار سے ناواقفی یا پھر حسد و بغض کا مظاہرہ کرنا ہے۔ آپ کے دامنِ تقدس کا ایسے الزامات سے بری ہونے کا ثبوت آپ کے شدید ترین سیاسی مخالف بلکہ معاند چوہدری خلیق الزمان کی مرتبہ کتاب ''شاہراہِ پاکستان'' کے صفحہ ۶۲۴ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

(ف) مسلم لیگ پر امراء خصوصاً انگریزوں کے خادموں اور وفاداروں کا شروع سے ہی قبضہ رہا ہے، اس کیلئے ''سیاست کے فرعون'' نامی کتاب شائع کردہ فیروز سنز کا مطالعہ فرما دیں۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

کا مختصر تعارف

چونکہ ہندوستان میں اسلام بحری راستے سے آیا ہے اس لیے بحیرۂ عرب اور بحرِ ہند کے قریبی علاقے علماء کرام اور صوفیاءِ عظام کے انوار سے تقریباً بارہ تیرہ سو سال سے مشرف ہیں، اس علاقے کا چپہ چپہ اُن کے انوار سے مشرف ہے، حتّٰی کہ بعض علماء تاریخ نے سورت شہر کے قریب رانْدیر نامی قصبہ میں بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی قبروں کا تذکرہ بھی فرمایا ہے۔ اس سارے خطّے میں باسعادت گجرات کا صوبہ ہے جس میں اہل اللہ کامل گذرے ہیں، چونکہ وہ زمانہ تحریر و انضباط کا نہ تھا ویسے بھی علماء حق اور صوفیاء کرام خود نمائی و خودستائی سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں اس لیے ان حضرات کا تذکرہ کم پایا جاتا ہے ورنہ اس خطّے میں کامل اولیاء اللہ گذرے ہیں۔ شہر احمد آباد کے متعلق بعض تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ اس قطعہ پر کافی زمانہ پہلے ایک شہر آباد تھا جو زمانہ کی دست برد سے بالکل ملیامیٹ ہوگیا تھا، کافی زمانہ بعد چار ایسے اولیاء کرام نے اس کی بنیاد رکھی جن کے اسماء مبارکہ احمد تھے، چنانچہ احمد آباد کا نام مشہور ہوا۔ اس علاقے میں زیادہ آبادی میمن قوم کی ہے، جو متبع شریعت سیرۃً اور صورۃً بھی ہوتے ہیں۔ حفظِ قرآنِ عزیز اور ضروریاتِ دین کے لیے ہر قصبہ میں ایک ایسا مدرسہ قائم ہوتا ہے جس میں عصری ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کے لیے بھی ایک عالمِ دین کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں بعض قصبات اور شہروں میں زیادہ تعلیم کی بھی درسگاہیں ہوتی ہیں جیسا کہ آج سے تقریباً پون صدی پہلے رانْدیر میں مولانا محمد حسین صاحب راندیری نے جو حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید تھے "مدرسۂ حسینیہ" قائم فرمایا تھا اور وہ اب تک ہے۔ احقر نے بھی ۱۹۲۸ء کے اوائل میں چند روز وہاں قیام کیا تھا اور مولانا موصوف کی زیارت کی تھی۔ مولانا موصوف نے حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۃ القرآن اور حاشیہ کا گجراتی زبان میں ترجمہ فرمایا ہے۔

ضلع سورت کے ایک قصبہ ڈابھیل میں ایک دینی مدرسہ "تعلیم الدین" کی بنیاد ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء میں مولانا محمد علی جوہر کی وساطت سے حاصل کی گئی زمین میں رکھی گئی، مولانا اس وقت راجہ بروڈہ کے معتمد علیہ تھے، اس مدرسہ میں ابتدائی تعلیم ہوتی تھی جس میں شہر کے طلباء کیلئے ایک عالم دین مولانا عبدالجبار سرحدی صاحب متعین تھے۔ ڈابھیل کے ساتھ ملحقہ قصبہ سملک کے محمد بن میاں موسیٰ نے (جو حضرت علامہ انور شاہ کاشمیریؒ کے شاگرد رشید تھے) اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جناب شاہ صاحب اور ساری جماعت کو جامعہ اسلامیہ ڈابھیل لے گئے، جناب شاہ صاحب (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کی برکت سے جامعہ اسلامیہ مشہور و معروف درس گاہ بن گئی۔ جناب شاہ صاحبؒ اور دیگر اساتذہ شعبان میں گھر آجاتے تھے اور شوال میں واپس ڈابھیل تشریف لے جاتے تھے۔ ڈابھیل کیلئے امتحان داخلہ عموماً دارالعلوم دیوبند میں ڈابھیل کا کوئی استاد لے لیا کرتا تھا اور پھر اس زمانہ میں تیرہ ۱۳ روپیہ ریل کا کرایہ دے کر ڈابھیل بھیجدیا کرتا تھا۔ احقر نے ۱۹۳۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا مگر پھر چند احباب کے مشورہ سے ڈابھیل کے لیے امتحان دے دیا (اس وقت تک حضرت مدنیؒ بنگال سے تشریف نہ لائے تھے) یہ ہماری سعادتمندی اور اللہ تعالےٰ کی خصوصی رحمت تھی کیونکہ حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ آخری سال تھا، شعبان میں واپسی کے بعد پھر آپ اس قدر علیل ہوگئے تھے کہ ڈابھیل نہ جاسکے اور چند ماہ بعد آپ کا وصال ہوگیا۔ ہم چند طلباء شوال میں حضرت شاہ صاحب اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہم کے ہمراہ اُن ہی کے ڈبے میں عازم ڈابھیل ہوئے اور مدرسہ میں باقاعدہ پڑھائی شروع کر دی، ہمارے اسباق موقوف علیہ تھے مگر حضرت شاہ صاحبؒ کا دارالحدیث مدرسہ کی بالائی منزل میں ہمارے کمرہ کے بالکل متصل تھا، وقت کافی مل جاتا تھا اس لیے اپنے اسباق سے فارغ ہو کر حضرت شاہ صاحبؒ کے درس میں بیٹھ جایا کرتے تھے، ان کے علمی دقیق مسائل تو سمجھ میں نہ آسکتے تھے مگر ان کے چہرۂ پُر انوار کی زیارت جی بھر کر کر لیا کرتے تھے۔ ڈابھیل میں احقر کے اساتذہ مولانا سراج احمد رشیدی، مولانا بدرِ عالم مہاجر مدنی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن اور مولانا محمد ادریس سکرودھوی تھے

---

[1] اس زمانہ میں ڈابھیل کے مہتمم مولانا سعید احمد بزرگ تھے جو حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور بہت سادہ مزاج تھے مگر انتظامی امور میں بڑے پختہ تھے، حضرتِ مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے خلیفہ مجاز تھے، حضرت کے چند مکتوبات ان کے نام پر بھی ہیں، ۱۳۷۱ھ میں وفات پائی، ان کی وفات کے بعد ان کے خلف الصدق مولانا احمد بزرگ مہتمم ہوئے، بفضلہٖ تعالیٰ جامعہ اسلامیہ پوری طرح آباد ہے۔

اور کتب خواندگی مشکوٰۃ شریف، جلالین، میر زاہد ملا جلال، مقاماتِ حریری وغیرہ تھیں۔ ۱۳۳۳ھ داخلہ دورۂ حدیث دیوبند میں لے لیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی زیارت شاہ منزل میں جو کہ دارالعلوم کے قریب ہی ہے کبھی کبھی بعد از نمازِ عصر ہو جایا کرتی تھی کہ شاہ صاحبؒ بعد از نمازِ عصر اپنی بیٹھک میں تشریف فرما ہوتے تھے اور علماء کرام اور طلباء کو اپنے ارشادات سے نوازتے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی زندگی کا آخری جمعہ دیوبند شہر کی جامع مسجد میں پڑھا اور مرزائیت کے فتنہ سے حاضرین کو آگاہ فرمایا، اپنی منظومہ نعت خود اپنی زبان سے چشمِ پُرنم پڑھ کر سنائی جس کی ابتداء ع

اے آنکہ ہمہ رحمت مہداہ قدیری

اور آخری شعر ؎

کس نیست دریں اُمت تو آنکہ چُوں انور

با روئے سیاہ آمدہ و موئے ضریری

پورا کر دیا ــــــ مرض کا شدید غلبہ تھا، مشکل سے گھر تشریف لائے، آخر ۳ صفر ۱۳۵۲ھ کو انتقال فرما گئے، اِس گنہگار کو آپ کی نمازِ جنازہ میں شرکت کی سعادت میسّر ہوئی۔ نوّر اللہ مرقدہٗ

حضرت شاہ صاحبؒ کے بعد مولانا عثمانیؒ نے بھی ڈابھیل سے تعلق منقطع فرما لیا اور باقی متعلقہ حضرات نے بھی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کو داغِ مفارقت دے دیا جس کی کچھ تفصیل درج کر دی گئی ہے۔

ف :۔ ڈابھیل کے قریب ہی ایک قصبہ کفلیتہ میں جانے کا اتفاق ہُوا، گجرات کے مشہور عالمِ دین مولانا عبدالحی[1] صاحب جو کہ رنگون کی جامع مسجد کے خطیب تھے، وعظ و تذکیر پر ان کی کتاب "البصائر" اور دوسری علمی کتابیں مطبوعہ ہیں وہ اسی قصبہ کے تھے، اس قصبہ کی مسجد میں مولانا مرحوم کا کتب خانہ محفوظ تھا، احقر نے چند قلمی کتابوں کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے۔

---

[1] مولانا عبدالحی کی وفات۔ ۱۰ رجب المرجب ۱۳۳۳ھ مطابق ۲۴ مئی ۱۹۱۵ء کو ہوئی اور رنگون ہی میں سپردِ خاک کر دیئے گئے۔ (البلاغ بمبئی، دینی کنونشن نمبر)

مولانا عثمانیؒ کی ڈابھیل سے واپسی

حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ اور مولانا عثمانیؒ اور دیگر اساتذہ کرام کی اہلیانِ گجرات نے جس قدر پذیرائی کی تھی اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ حضرات اس خطہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے علوم و فیوضات کی نشر و اشاعت کا مرکز بنائے رکھتے، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل جو پہلے مدرسہ تعلیم الدین کے عنوان سے ایک چھوٹی سی دینی درسگاہ تھی بلا مبالغہ لاکھوں روپیہ خرچ کر کے اسے جامعہ کی شکل دی گئی، دار الطلبہ کے لیے کئی کمرے تیار کیے گئے، اساتذہ کرام کے لیے کئی بنگلے بنائے گئے، معقول تنخواہیں مقرر کی گئیں، مگر افسوس ہے کہ حضرت شاہ صاحب اور مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہم کے وصال کے بعد مولانا عثمانیؒ نے بھی ڈابھیل کو داغِ مفارقت دے دیا اور آپ کے ساتھ ہی آہستہ آہستہ اس چمن پر خزاں آنے لگی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن اور مولانا محمد بدر عالم جیسے اساتذہ نے ڈابھیل کو چھوڑ کر دہلی میں "ندوۃ المصنفین" کے نام سے ایک تالیفی ادارہ قائم فرمالیا جس کے ارکان ان دو حضرات کے علاوہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی شریک ہوگئے۔ اس ادارہ نے بہت ہی مفید، علمی، دینی کتب شائع کیں خصوصاً استاذِ محترم مولانا محمد بدر عالم میرٹھی ثم مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی مرتبہ کتاب ترجمان السنۃ کی بہترین اردو زبان میں شرح تحریر فرمائی اور علمی، ادبی اور اصلاحی مضامین کی اشاعت کے لیے ماہنامہ برہان جاری فرمایا۔ افسوس ہے کہ یہ سب حضرات خلدِ آشیاں ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون —— ماشاء اللہ کان وما لم یشاء لم یکن۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ بہترین محدث، مفسر، مبلغ تھے۔ آپ نے حضرت شاہ صاحبؒ کے بعد جس مسند کو سنبھالا آپ واقعی اس کے لائق تھے۔ اگر آپ ڈابھیل ہی میں قیام پذیر رہتے تو یہ حالات رونما نہ ہوتے، آپ کو دار العلوم دیوبند کا صدر مہتمم مقرر کیا گیا اور آپ انجام کار مستقل طور پر اس عہدہ پر فائز ہوگئے، یہ عہدہ آپ کے مناسب نہ تھا، انتظامی امور دردِ سر ہوتے ہیں —— آپ کے

سیرت نگار پروفیسر نور الحسن شیر کوٹی نے بھی آخر اعتراف کر لیا کہ:۔

"راقم الحروف کا خیال ہے کہ وہ (مولانا عثمانیؒ) دُور سے ہی دار العلوم کی خدمت کرتے اور ڈابھیل کے تعلق کو نہ چھوڑتے تو بہتر تھا، لیکن نوشتۂ تقدیر کے سامنے آدمی مجبور ہو جاتا ہے، علّامہ کو دار العلوم کی صدارت سنبھالے اب چھ سال ہو چکے تھے کہ ارباب حل وعقد کے اصرار پر ۱۳۶۱ھ میں آپ نے ڈابھیل سے رختِ سفر باندھا اور اپنے وطن دیوبند میں مستقل قیام کا خیمہ گاڑا"۔ (حیاتِ عثمانی ص۴۸۵)

اور یہی مخلصانہ مشورہ حضرت مدنیؒ نے بھی اپنے رفیقِ محترم مولانا عثمانیؒ کو دیا تھا، آپ نے ایک طویل گرامی نامہ میں یہ مشورہ دیا کہ آپ بجائے صدر مہتمم ہونے کے صدر مدرس بن کر تشریف لے آئیں تو یہ بہت زیادہ مناسب ہے، جیسا کہ آپ نے تحریر فرمایا:۔

"میں قسمیہ کہتا ہوں کہ میں اپنی استعداد اور قابلیتِ علمی اور تقریری و تحریری آپ کے شاگردوں کے پایہ کی بھی نہیں پاتا، میرا پختہ اور صحیح خیال ہے کہ جناب کے شایانِ شان صدارتِ تدریس ہے، اگر آپ کے لیے وہ جگہ تجویز ہو تو میں اپنا علیحدہ ہونا بھی بخوشی و خرمی منظور کر لوں گا اور ماتحت رہ کر خدماتِ مدرسہ بھی بخوشی منظور کروں گا..... ایک مجھ جیسے پردیسی غریب الوطن کی حالت ہی کیا ہو سکتی ہے"۔

ننگِ اسلاف حسین احمد ۱۲ / رجب ۱۳۵۳ھ (حیاتِ عثمانی ص۴۰۶ ــ ۴۰۸)

فرق صرف اتنا تھا کہ شیر کوٹی کی رائے میں مولانا عثمانیؒ ڈابھیل میں رہ کر دینی خدمت کرتے اور وہاں ہی سے دار العلوم پر کنٹرول فرماتے اور حضرت مدنیؒ کا مشورہ یہ تھا کہ آپ بیشک اپنے شہر دیوبند تشریف لے آئیں اور اپنے علمی فیوضات سے طلباء کرام کو بہرہ ور فرمائیں اہتمام اور انتظام کی سر دردی مول نہ لیں۔ مگر وہاں تو معاملہ ہی دگرگوں تھا، بقول شیر کوٹی حسین احمد کو مولانا عثمانی مرحوم کے بھائی مولانا حبیب الرحمٰن نے صدر مدرس بنایا تھا اُس کا تعلق پوری طرح سے دیوبند سے کاٹنا تھا جیسا کہ شیر کوٹی نے اپنے مافی الضمیر کو یوں ادا کیا:۔

"ہم تو جب جانتے کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم ان (مستعفی حضرات) کو منا لیتے اور کسی قیمت، کسی صورت، کسی انداز، کسی حالت میں ان کو دار العلوم سے جانے

نہ دیتے مگر ایسا نہ ہوتا، ان حضرات کے عوض مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے مولانا حسین احمد مدنیؒ رحمۃ اللہ علیہ کو صدر مدرسی پر لا بٹھایا، وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔" (حیاتِ عثمانی ص ۳۹)

پروفیسر انوار الحسن شیر کوٹی نے کس حقیر انداز میں اپنے بغض کا اظہار کیا ہے، وما تخفی صدورھم اکبر (آل عمران ۱۱۸) اسی طرح خود مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے مدیر "طلوع اسلام" کے ایک سوال کے جواب میں یہ تحریر فرمایا:۔

"حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب مرحوم کی صدارتِ تدریس سے علیحدگی کے بعد غالباً دار العلوم کے اربابِ اہتمام کے نزدیک کوئی ہستی مولانا حسین احمد سے زیادہ اس عظیم الشان علمی مسند کو زینت دینے کے لیے موجود نہ تھی یا ہاتھ نہ آسکتی تھی اس لیے انہوں نے مولانا ممدوح کی ممتاز و کار آمد شخصیت اور ان کے کمالات و محاسن کے مقابلہ میں دار العلوم کے عام معمول اور مسلمہ پالیسی سے قدرے اغماض برتنے کو جائز سمجھا اور ایک کُلّی منفعت کی خاطر جزئی مُضرت کی پرواہ نہیں کی، اس نظریہ کے تحت آج تک اُن کا استثناء قائم ہے، فی الحقیقت کسی خاص شخص کو خصوصی حالات کی بناء پر کس حد تک عام قواعد و ضوابط سے مستثنیٰ کرنے یا نہ کرنے کا اختیار صرف مجلسِ اعلیٰ شورائیہ دار العلوم کو حاصل ہے اور وہی اس سلسلے میں مخاطب بن سکتی ہے۔"

والسلام: شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ از دیوبند سہارنپور۔ ۸ شعبان ۱۳۵۸ھ مطابق اکتوبر ۱۹۳۹ء

(حیاتِ عثمانی ص ۴۵۵، ۴۵۶)

حضرتِ عثمانیؒ کے اس خط کو سرسری طور پر مطالعہ کرنے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ مولانا عثمانیؒ کے ہاں بھی حضرتِ مدنیؒ اس مسند کے قابل نہ تھے بلکہ آپ کا وجود دار العلوم کے لیے مضر تھا۔ آپ کے اسی مکتوب کی وضاحت مرتب "حیاتِ عثمانی" یوں کرتا ہے:۔

"علامہ کا یہ مکتوب نہایت محتاط انداز میں لکھا ہوا ہے، علامہ کو بتانا یہ مقصود ہے کہ ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء جبکہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب اور دیگر اساتذہ ڈابھیل چلے گئے تھے اور وہاں جامعہ اسلامیہ قائم

کیا گیا تو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی ؒ نے اپنی سیاسی مصلحت کی خاطر مولانا حسین احمد صاحب مدنی کو مسند درسِ حدیث پر بٹھا دیا تھا۔" (ص ۴۵۶)

اگرچہ شبیر کوثری نے اس وضاحت میں بھی اپنے بُغض کا اظہار کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ عثمانی کے اس اقدام کو "سیاسی مصلحت" قرار دے کر یہ تاثر دینے کی ناپاک سعی کی ہے کہ یہ انتخاب سیاسی تھا اور یہ صرف مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کا اقدام تھا جو مولانا عثمانیؒ کے بھائی تھے، مگر یہ بھی مان لیا کہ جب تک مستعفی حضرات ڈابھیل تشریف نہیں لے گئے تھے دارالعلوم دیوبند میں کسی شیخ الحدیث کا تقرر نہ ہوا تھا کہ شاید معاملہ سلجھ جائے۔ حضرت مدنیؒ کے باقاعدہ تقرر اور اُن کے دیوبند لانے کے لیے مجلسِ شوریٰ کی تجویز اور اصرار پہلے گذر چکا ہے۔

مرتب "حیاتِ عثمانی" نے اگرچہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا مگر اس کا اصل نشانہ اُس وقت کی ساری انتظامیہ (جس کے سرپرست حکیم الامت حضرت تھانویؒ تھے) ہے، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے مستعفی حضرات سے استعفیٰ واپس لینے کیلئے توجہ فرمائی یا نہ فرمائی مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے عرض ہے کہ جب حضرت مدنیؒ سلہٹ سے تشریف لائے تو نمازِ فجر دارالعلوم کی مسجد میں ادا فرما کر کسی سے ملاقات کئے بغیر اس وقت کی خطرناک فضا میں مولانا اعزاز علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو ساتھ لیکر جناب شاہ صاحبؒ کی ملاقات کیلئے شاہ منزل تشریف لے گئے، جناب شاہ صاحبؒ تلاوتِ قرآن فرما رہے تھے، پردہ کروا کر حضرتؒ کو بلوایا، حضرت مدنیؒ نے حضرت شاہ صاحبؒ سے فرمایا کہ کیا اختلافات ہیں؟ شاہ صاحبؒ نے فرمایا مدرسہ کو بجائے وقف کے وراثت بنایا گیا ہے، بہت سی مالی خیانتیں غبن ہیں، مدرسین کے ساتھ معاملات بہت نامناسب ہیں، حضرتؒ (شیخ الہندؒ) کو ان ہی لوگوں نے مالٹا بھیجا وغیرہ وغیرہ۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ باتیں تو حضرت شیخ الہندؒ کے زمانے میں بھی تھیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا مولوی صاحب! وہ تو بہت ظرف والے تھے ہم کہاں سے اتنا ظرف لائیں؟ حضرت مدنیؒ نے فرمایا ہم سب مل کر بھی اتنا بڑا ادارہ نہیں بنا سکتے البتہ بگاڑ سکتے ہیں، حضرت شیخ الہندؒ کے طریقے پر چلو گے تو مدرسہ رہے گا اور ترقی کرے گا، اندر رہ کر لڑو اور اصلاح کی کوشش کرو، اختلافات کو باہر مت لاؤ۔ چنانچہ حضرت

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ آمادہ ہوگئے اور اُسی وقت حضرت مدنیؒ کے ساتھ مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کے پاس پہنچے، مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ نے فرمایا مولوی انور شاہ! یہ سب رجسٹر آپ کے سامنے ہیں جس ملازم، مدرس، طالب علم کو چاہو رکھو جسے چاہو نکال دو لیکن مدرسہ نہ چھوڑو، حضرت شاہ صاحبؒ آبدیدہ ہوگئے اور فرمایا شام کو آکر پڑھاؤں گا، جب گھر تشریف لائے تو سب رفقاء نے آپ کو گھیر لیا، آخر شاہ صاحبؒ کی تحریر پہنچی کہ میں اپنے ساتھیوں کی وجہ سے دارالعلوم آنے سے معذور ہوں [1]

---

[1] افادات مولانا اعزاز علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ

حضرتِ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا استعفاء

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے سرپرست ۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۵ء سے چلے آتے تھے جبکہ ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۷ء میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور چند دوسرے اساتذہ نے حضرت قاری صاحب کے نائب مہتمم ہونے پر اسٹرائک کی تھی اُس وقت بھی حضرت تھانویؒ سرپرست تھے اور اس ساری صورتِ حال سے باخبر تھے، جب مولانا عثمانیؒ دارالعلوم کے صدرِ مہتمم بن کر آئے جبکہ اس سے پہلے اس نام کا عہدہ نہ تھا، تو حضرت تھانویؒ کا ردِّ عمل کیا رہا؟ اس کے لیے ہم "حیاتِ عثمانی" سے حوالہ جات نقل کرتے ہیں، حضرت مولانا عثمانیؒ ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۵ء کو صدرِ مہتمم مقرر ہوئے مگر ڈابھیل سے بھی تعلق قائم رہا، آخر بقول مؤلف "حیاتِ عثمانی" ۱۳۵۴ھ میں دیوبند میں "مستقل خیمہ" گاڑ دیا اور حضرت تھانویؒ نے ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء میں استعفاء لکھ کر ارسال کر دیا، اس کا پس منظر بھی اسی مؤلف "حیاتِ عثمانی" کی زبانی سماعت فرمالیں:۔

"مجھ سے خواجہ فیروز الدین کپور تھلوی ممبر مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے بیان کیا کہ مولانا عثمانی کو ہم چند اراکین مجلسِ منتظمہ جن میں حکیم مقصود علی خان صاحب حیدر آبادی اور مولانا مناظر احسن گیلانی بھی تھے صدرِ مہتمم کی حیثیت سے لانا چاہتے تھے، چنانچہ معلوم ہوا کہ مولانا عثمانی تھانہ بھون تشریف لے گئے ہیں، ہم مجلسِ منتظمہ کے جلسے میں دیوبند گئے ہوئے تھے، حکیم مقصود علی خان اور میں نے سوچا کہ حضرت عثمانی کو وہیں تھانہ بھون راضی کر لیں اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب جو کہ مدرسہ کے سرپرست ہیں اور سیاسیاتِ ملکی کے باعث اُن کے اور مولانا عثمانی کے درمیان اختلاف رہا ہے اس کو دُور کرا دیں، چنانچہ مولانا عثمانی ہمیں سہارنپور کے اسٹیشن پر مل گئے، ہم نے اس بات کا اُن سے تذکرہ کیا اور اُن کو اُن کے سخت انکار کے باوجود مجبور کر کے منوالیا اور حضرت تھانویؒ کی خدمت میں لے جانے پر بھی راضی کر لیا، جب ہم تھانہ بھون پہنچے تو ہم نے حضرت تھانوی کو بھی رضامند کر لیا اور وہ مولانا عثمانیؒ

کی صدارتِ اہتمام پر راضی ہو گئے...... کیونکہ عرصہ ہوا علامہ دارالعلوم کے دائرۂ اہتمام سے ناراض ہو کر اس کو چھوڑ کر چلے گئے تھے"۔ (حیاتِ عثمانی ص ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۴)

ناظرینِ کرام! خط کشیدہ عبارت پر غور فرما کر خود فیصلہ فرمائیں کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ مولانا عثمانیؒ کے اس تقرر پر راضی تھے یا ناراض تھے، اور ناراضگی کی وجہ کیا تھی؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو ۱۳۴۴ھ ۱۹۲۵ء سے ۱۳۵۴ھ ۱۹۳۵ء تک سرپرست تھے جبکہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانویؒ ہی کے زمانۂ سرپرستی میں تمام شروط کے ساتھ دیوبند تشریف لائے، اگر حضرت تھانویؒ کے استعفیٰ کی وجہ وہ تھی جسے "حیاتِ عثمانی" کا مؤلف بیان کرتا ہے کہ مدرسہ میں کانگریس کے نفوذ سے تنفر استعفیٰ کی وجہ تھی، تو یہ پہلے بھی موجود تھی۔ دراصل حضرت تھانویؒ کے استعفیٰ کی وجہ یہ تھی کہ جب مولانا شبیر احمد عثمانیؒ صدرِ مہتمم بن کر تشریف لائے تو کئی امور کا حکم اور اُن کا نفاذ از خود فرمایا، حالانکہ اِن سب امور کو مجلسِ شوریٰ کی منظوری کے بعد سرپرست کے سامنے پیش کرنا ضروری تھا، حضرت تھانویؒ نے آئینِ دارالعلوم کی خلاف ورزی کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا، جیسا کہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:۔

سرپرستی کا مسئلہ

اس سال کے اہم واقعات میں سے ایک واقعہ سرپرستی کا مسئلہ ہے، زمانۂ قدیم سے دارالعلوم کی سرپرستی کی یہ شکل تھی کہ جماعت میں جو شخصیت اپنے علم و فضل، تقویٰ و بزرگی اور اصابتِ رائے کے لحاظ سے زیادہ ممتاز ہوتی اس کو دارالعلوم کے انتظامی امور کا مرجع الامر تصوّر کر کے مجلسِ شوریٰ اپنی تجاویز کے فیصلوں میں سرپرست سے رجوع کرتی تھی، البتہ اس کے لیے کوئی ضابطہ مقرر نہ تھا اور واقعہ بھی یہ ہے کہ دارالعلوم میں نمود و نمائش کی ضابطہ بندیوں کے بجائے درحقیقت دیانت و اخلاق اور خلوص و للّٰہیت پر زیادہ تر کاموں کی سرانجامی کا مدار رہتا آیا ہے، سرپرست کے اختیارات کا حاصل یہ تھا کہ ممبران میں اختلافِ رائے کی صورت میں سرپرست کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوتا تھا اس میں خواہ سرپرست کی رائے قلت ہی کی جانب کیوں نہ ہو، البتہ اگر ممبران متفقہ طور پر کسی چیز کو پاس کرتے اور سرپرست کو اس سے اختلاف ہوتا تو وہ وجوہِ اختلاف کو مدلل تحریر کر کے مجلس (شوریٰ) میں دوبارہ غور و خوض کے لیے بھیج دیتے تھے، اس صورت میں اگر مجلس اپنی سابقہ رائے سے رجوع نہ کرتی تو البتہ مجلس ہی کی رائے برقرار رہتی تھی اور بغیر استرضائے سرپرست

اس کا نفاذ ہو جاتا تھا۔

۱۳۴۵ھ میں جب انتظامی امور کے لیے جب قوانین مدوّن ہوئے تو مندرجہ بالا طریق عمل کو باضابطہ بنا دیا گیا، مگر ۱۳۴۸ھ میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ اس بارے میں مجلس شوریٰ کے اندر اختلاف رائے پیدا ہو گیا، ایک جماعت کی رائے تو اس طریق عمل کی حمایت میں تھی اور دوسری جماعت اس کو مجلس شوریٰ کی بے کسی اور عدم ضرورت سے تعبیر کرتی تھی اور فیصلہ کا مدار کثرت رائے پر رکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ مجلس شوریٰ کے متعدد اجلاسوں میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو ۱۳۴۴ھ سے دارالعلوم کے سرپرست تھے از خود مصلحتاً سرپرستی سے مستعفی ہو گئے رجب ۱۳۵۴ھ میں مجلس شوریٰ نے حسب ذیل الفاظ میں یہ استعفا منظور کر لیا:۔

”مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس پورے غور و فکر اور احترام و تقدیس اور عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت مولانا تھانوی مدظلہٗ کے استعفار کو نہایت افسوس کے ساتھ منظور کرتا ہے اور حضرت ممدوح سے درخواست کرتا ہے کہ آپ اپنی دعوات صالحہ اور توجہات عالیہ سے دارالعلوم پر ہمیشہ ظل گستر رہیں گے“[1]

◎

---

[1] تاریخ دارالعلوم جلد ۱ ص ۲۸۵

حضرت مدنیؒ ابتلاء اور مقام رضا میں

از ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۷ء

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ۱۹۳۹ء کی جنگ نے انگریز کی کمر توڑ دی تھی اسے یقین ہو گیا کہ اب اسے ہندوستان سے نکلنا ہی پڑے گا اس لیے انگریز نے اُن جماعتوں اور ان افراد کو انتقامی کاروائی کا نشانہ بنانے کی کاروائی تیز تر کر دی، تمام اُن جماعتوں کو اور اُن کے سرکردہ راہنماؤں کو پابند سلاسل کر دیا گیا جو انگریز کے دشمن تھے خصوصیت کے ساتھ انگریز کی نظر اُس دارالعلوم دیوبند پر تھی جس کی بنیاد ہی ۱۸۵۷ء کے مظالم کے انتقام پر رکھی گئی ہے مسٹر اسمتھ نے اپنی کتاب "ماڈرن اسلام ان انڈیا" میں لکھا ہے کہ:۔

"دیوبندیت نام ہے برطانویت کی مخالفت کا"۔ (مدینہ بجنور ۲۱ جنوری ۱۹۵۰ء)

اس وقت دارالعلوم دیوبند کے صدر نشین، اکابر کے سچے جانشین مجاہد جلیل حسین احمد ہی سے انگریز کو انتقام لینا تھا جسے نہ کسی نواب کا تقرب حاصل تھا نہ کسی خطاب کا لالچ تھا اور نہ غیر اللہ کا رعب اس کے قریب ہو سکتا تھا، چنانچہ اُدھر تو دارالعلوم کی انتظامیہ میں ردوبدل شروع ہو گیا جس کا کچھ حال گذر چکا ہے، اور ادھر حضرت مدنیؒ کو قانونی بہانے سے انتقام کا نشانہ بنانا شروع کر دیا جس کی ابتداء ۱۹۴۲ء سے یوں کی گئی:۔

سیاسی تحریک اور آزادی کی جدوجہد شباب پر پہنچ رہی تھی، برطانیہ کے قدم ڈگمگا رہے تھے، باہر سے جرمنی اور ہٹلر کا ریلا بڑھتا ہی آ رہا تھا، جاپان آندھی طوفان کی طرح چڑھتا آ رہا تھا اور ملک کے اندر مہینوں سے بغاوت کی تیاریاں تیزی پر تھیں، عوام نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ مکمل اور غیر مشروط آزادی سے کم کسی قیمت پر ہندوستان جنگ میں شریک نہیں ہو سکتا۔ ان حالات سے گھبرا کر سراسیمگی کے عالم میں گورنمنٹ نے ملک کے لیڈروں کی گرفتاری شروع کر دی تھی۔ اسی ضمن میں مہینوں سے حضرتؒ کی گرفتاری کی خبریں بھی آ رہی تھیں مگر حضرتؒ کی سرگرمیوں اور حکومت کے خلاف جدوجہد میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا۔ تقریریں، تحریریں، پکار اور للکاریں پورے جوش و خروش اور عزم و ہمت کے ساتھ جاری تھیں۔ اسی درمیان ۲۵ اپریل ۱۹۴۲ء کو مراد آباد کے قصبہ

بچھراؤں میں ضلع جمعیۃ علماء کی کانفرنس ہوئی، اس میں تقریر کرتے ہوئے حضرتؒ نے فرمایا کہ ملک کے مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد ہی ایک ایسا حربہ ہے جس کے ذریعے ہمیں طوقِ غلامی سے آزادی مل سکتی ہے۔ برطانیہ کی نا انصافیوں اور مظالم کا تذکرہ کیا اور خود انگریز مؤرخین اور مدبرین کے حوالوں اور مقالوں سے ان پر دلیلیں قائم کیں۔ یہی مضامین آپ ہمیشہ بیان فرمایا کرتے تھے مگر اس بار حکومت گرفتاری کی گھات میں تھی چنانچہ اسی تقریر کی بنا پر گرفتاری کا فیصلہ کر لیا گیا۔ مگر حکومت کراچی کے مقدمہ کے موقع پر گرفتاری کا ماحول اور دشواریاں ابھی بھولی نہ تھی، اس لیے ایسے انتظامات کیے گئے کہ کسی کو کانوں کان گرفتاری کی خبر نہ ہونے پائی۔ ۲۴ جون ۱۹۴۲ء کی رات کو ایک بجے صوبہ پنجاب کی ایک اتحاد کانفرنس میں شرکت کے لیے حضرتؒ دیوبند سے جھنگ کے لیے روانہ ہوئے، گاڑی تیسرے اسٹیشن پر پہنچی تھی کہ پولیس آفیسر وارنٹ لیے ہوئے ڈبے میں داخل ہوا اور جب گاڑی چل پڑی تو وارنٹ پیش کر دیا، اگلے اسٹیشن سہارنپور حضرتؒ کو اتار لیا گیا اور پہلی ٹرین سے مراد آباد پہنچا دیا گیا۔ یہ خبر عام ہوئی تو مظاہرات، احتجاجات اور اجتماعات کا ایک سلسلہ چل پڑا، گاؤں گاؤں اور شہر شہر لوگ سڑکوں پر نکل آئے، نعرۂ تکبیر، انقلاب اور آزادی کے نعروں سے فضا گونج اٹھی، جلوس نکلے، جلسے ہوئے، تجویزیں آئیں، تقریریں ہوئیں، غرض مہینوں تک گورنمنٹ کی نیندیں حرام رہیں، ان تمام سرگرمیوں سے حضرتؒ تو رہا نہ ہو سکے اور نہ ملک فوری طور پر آزاد ہوا مگر جذبۂ آزادی کی لہریں دسوں بیسوں گنا اونچی اٹھ گئیں، اُس وقت کے مشہور اور مقبول انقلابی شاعر علامہ انور صابریؒ کا ایک قطعہ آج تک کانوں میں گونج رہا ہے ؎

غلام آباد میں کیا فائدہ بے کیف جینے کا
نہ جینا ہے سلیقے کا نہ مرنا ہے قرینے کا
خدا شاہد ہے اب صحنِ چمن بھاتا نہیں جب سے
قفس میں ہے مراد آباد کے بلبل مدینے کا

موقع کی مناسبت، دلوں کی دردانگیزی، شاعرانہ فنکاری اور اس پہ علامہ صاحبؒ کی کھنکھناتی ہوئی پُرسوز آواز، اشعار سُن کر ایک عظیم الشان مجمع میں لوگوں کی چیخیں نکل گئیں ___ مراد آباد جیل میں حکومت نے حضرتؒ پر مقدمہ چلایا، حافظ محمد ابراہیم جو آزادی کے بعد تاعمر وزیر رہے اُن کی سرکردگی میں وکیلوں اور بیرسٹروں کے ایک پینل نے پیروی کی، یہ سب لوگ بڑے بیدار مغز اور قابل قانون دان تھے۔ گورنمنٹ کا دعویٰ بے جان تھا، جب سی آئی ڈی کے انسپکٹر محمود نے حلفیہ بیان کے بعد مقدمہ پیش کیا اور فاضل وکلاء نے بحث کرتے ہوئے سوالات

قائم کیے تو حکومت کے وکیلوں اور گواہوں کے چھکے چھوٹ گئے، اِدھر حضرتؒ نے خود جو بیان بر سرِ عدالت دیا وہ بھی اس قدر مدلل، مضبوط اور مسکت تھا کہ راتوں رات یہ خبر عام ہوگئی کہ حقائق کے پیشِ نظر خود جج کا رجحان یہ ہے کہ سزا نہیں ہو سکتی۔ بہتر ہے کہ ایک اُچٹتی سی نظر حضرتؒ کے بیان پر ڈالتے چلیں:۔

"ہر شخص کو اپنے وطن سے قدرتی طور پر سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے جو مجھ کو بھی ہے۔ تاریخ، جغرافیہ اور علم دین کے مطالعے، ہندوستان کے باہر آزاد ملکوں میں قیام اور غیر ملکی شخصیات سے تبادلۂ خیالات کے نتیجے میں اپنے وطن کی قدر و منزلت اور محبت میرے دل میں دن بدن فزوں تر ہوتی چلی گئی۔ مالٹا کی قید نے حریت پسندی اور آزادی کے جذبات میں بیش بہا اضافہ کیا، میں جب انڈیا واپس آیا اور میں نے اپنے وطن کو جلیانوالہ باغ، رولٹ ایکٹ اور مارشل لاء ایکٹ میں جکڑا ہوا پایا تو میرا دل غلامی اور غیر ملکی حکومت کے خلاف نفرت سے بھر گیا اور میں نے نان کوآپریشن اور نان وائلنس کی بنیادوں پر آزادی کیلئے جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ میرا عقیدہ ہے کہ جس طرح انگریز، فرانسیسی، جرمن، جاپانی، امریکن اور دنیا کی ہر قوم کو پیدائشی بنیاد پر آزاد رہنے کا حق ہے، اسی طرح آزادی ہندوستان اور ہندوستانیوں کا پیدائشی حق ہے، اسی آزادی کی تبلیغ میں نے نچھراؤں کے اس جلسے میں کی تھی جس کی رپورٹ غلط طریقے سے گورنمنٹ کو پیش کی گئی ہے، میں نے کہا تھا کہ موجودہ جنگِ عظیم کے نتیجے میں اور برطانوی حکومت کی خود غرضانہ اور غلط پالیسیوں کے سبب ہندوستان فلاکت اور ہلاکت کے قریب پہنچ چکا ہے۔ یہ باتیں تخمینی اندازوں اور بے بنیاد دعووں کی بنیاد پر نہیں کہی تھیں، میرے پاس اس کے دلائل اور تاریخی شہادتیں موجود ہیں۔ اپنے وطن کی محبت، آزادیٔ وطن کی تمنا اور اسکی جدوجہد میں میں کسی ہندوستانی سے پیچھے نہیں ہوں۔ مذکورہ اسپیچ ملک کو متحد، منظم اور پُرامن رکھنے کے لیے دی گئی تھی، اس کو وہی لوگ قابلِ اعتراض کہہ سکتے ہیں جو ہندوستان میں ہمیشہ اختلاف و عناد باقی رکھنا چاہتے ہیں، میں اتحاد کانفرنس ہی میں شرکت کے لیے جھنگ جا رہا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ حکومت کو اس اتحاد کی کوشش سے اختلاف ہوا۔ فاضل مجسٹریٹ نے میری تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے مجھ سے کہا ہے کہ آپ کی تقریر کے شروع حصے میں ایسے جملے استعمال کیے گئے ہیں جن سے خیال ہوتا ہے کہ انگریزی سرکار ہندو مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کا سبب ہے اور آپ کی پوری تقریر سے انگریزی سرکار کی طرف سے نفرت پیدا

ہوتی ہے" یہ صحیح ہے اور میرے پاس اس کے دلائل موجود ہیں"۔

اس بیان میں جرأت بے باکی کلمۃ الحق عند سلطانِ جائر کے عناصر بیان سے ظاہر ہیں مگر ان کے علاوہ اس میں قانونی حیثیت سے ایسے مضبوط دلائل موجود تھے کہ جج اور جیوری بھی متاثر اور قائل نظر آئے۔ مگر مقدمہ کا یہ سلسلہ تو محض خانہ پُری کے لیے تھا، گورنمنٹ سزا کا فیصلہ مقدمہ سے پہلے کر چکی تھی۔ چنانچہ اسپیشل مجسٹریٹ درجہ اوّل مسٹر سرپواستو کو ۶ ماہ قید بامشقت اور پانچسو روپیہ جرمانہ کا حکم سنانا ہی پڑا مگر تاہم اُس نے جیل میں حضرتؒ کو اے کلاس میں رکھے جانے کی ہدایت کی۔ عام حالات میں تو اس سزا کی صرف اتنی سی حیثیت تھی کہ ہائی کورٹ میں اپیل کر کے ضمانت پر رہا کرا لیا جائے اور اپیل میں رہائی ہو جائے۔ مگر اس مقدمہ میں جہاں صرف گورنمنٹ ہی نہیں برطانوی سامراج کی پالیسی مُدعی ہو اور مدعا علیہ حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ جیسا علمبردارِ جہاد ہو اِن آسانیوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فیصلے کے فوراً بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جج کو خبردار کر دیا کہ اگر تم نے گورنمنٹ برطانیہ کے ایسے خطرناک دشمن کی ضمانت منظور کر لی تو گورنمنٹ فوراً ان کو ڈیفنس آف انڈیا رولز کی دفعہ ۱۲۹ کے ماتحت گرفتار کرے گی۔

گورنمنٹ کی پالیسی تو واضح ہی تھی مگر جماعت نے بھی یہ طے کر لیا تھا کہ گورنمنٹ کو گھر تک پہنچا کر ہی دم لیں گے، چنانچہ اپیل دائر کی گئی اور ۲۹ جولائی ۱۹۴۲ء کو آصف علی بیرسٹر مرحوم مقدمہ کی پیروی کے لیے دِلّی سے تشریف لائے۔ موصوف تحریکِ آزادی کے صفِ اوّل کے راہنماؤں میں تو تھے ہی حضرتؒ سے اخلاص اور ارادت بھی رکھتے تھے، مقدمہ کی پیشی ہوئی تو مسلسل چار گھنٹے تک ایسی مدلّل، مکمل اور قانونی بحث کی کہ حکومت کے سارے دعوؤں کے تار و پود ہوا میں بکھر گئے، مقدمہ کا ڈھنگ اور عدالت کا رنگ دیکھتے ہوئے عوام کو خیال ہوا کہ آج نہیں تو اگلی پیشی پر تو ضرور ہی رہائی ہو جائے گی، جج نے بھی فیصلے کے لیے ۱۴ اگست کی تاریخ دے دی، مگر اس تاریخ سے پہلے ہی کوئٹ انڈیا والی مشہور تحریک شروع ہو گئی، یہ بڑی یادگار اور فیصلہ کن تحریک تھی، یہی وہ نعرہ تھا جس نے برطانیہ کے قدموں کو ہندوستان سے ہمیشہ کے لیے اکھاڑ دیا، ۱۹۴۲ء کو ہندوستان کا بچہ بچہ مادرِ وطن کے قدموں میں جان کا نذرانہ لے کر حاضر ہو گیا، ان یادگار لمحات کی ایک آنکھوں دیکھی جھلک ملاحظہ کیجیے۔

"۸ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں کانگریس کا تاریخی اجلاس شروع ہوا اور مردانہ جرأت و ہمت کے ساتھ کوئٹ انڈیا کی تجویز

بالاتفاق منظور کی گئی۔ گاندھی جی اور پنڈت نہرو کی تقریروں اور مولانا کے خطبے نے دلوں کو جوش وجذبے سے معمور کردیا، برطانیہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور فوراً کانگریس کو غیر قانونی جماعت قرار دے دیا گیا، پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر اس قدر جوش وجذبات سے پُر تھی کہ عوام کو اپنے اوپر قابو رکھنا مشکل ہو گیا، آدھی رات کے بعد کارروائی دوسری صبح کے لیے ملتوی ہو گئی۔ صبح سے پہلے ہی حکومت نے ٹیلیفون کے کنکشن کاٹ دیئے اور کانگریس کے مولانا آزادؒ، گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو اور ورکنگ کمیٹی کے سارے ممبروں کو گرفتار کر لیا۔[1]"

عوام نے حکومت کے دفتروں، ڈاکخانوں، اسٹیشنوں، تھانوں اور تحصیلوں پر دھاوا بول دیا، کچہریاں لوٹ لیں، عدالتوں میں آگ لگادی، ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ دیں، مال گاڑیاں روک لیں، پُل توڑ ڈالے، لوگ کفن باندھ کر گھروں سے نکلتے تھے اور لاشیں واپس آتی تھیں، جلوس نکلتے تھے، نعرے بلند ہوتے تھے "انقلاب زندہ باد" ۵۷ئہ زندہ باد، حکومت جلوس روکتی تھی اور رائفلیں آگ اُگلتی تھیں، وطن کی دھرتی تازہ اور لال خون سے مالا مال ہو رہی تھی۔ اب حضرتؒ کی رہائی اور مقدمہ کی کارروائی کا سوال ہی ختم ہو گیا تھا۔ ملک کے سارے لیڈران کے ساتھ حضرتؒ پر بھی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ جاری ہوا۔ اِدھر جمعیۃ علماء اور کانگریس کے لیڈر قیدیوں کی نئی کھیپ مولانا حفظ الرحمٰنؒ، حافظ محمد ابراہیم وغیرہ جیل میں پہنچ گئے اور جنگل میں منگل ہو گیا، مگر حضرتؒ کے مشاغل اور گوشہ نشینی جو ابتدائی زندگی سے جاری تھی اس میں کوئی فرق نہیں پڑا، باہر کی دُنیا میں تو کچھ علائق اور ہجوم خلائق حارج بھی ہو جاتا ہو گا یہاں تو فرصت ہی فرصت تھی۔

اس جیل میں ایک مخصوص احاطہ تھا جس میں چار کوٹھڑیاں تھیں، پہلے ان میں پھانسی کے مجرم رکھے جاتے تھے، پھانسی کا تو نام ہی ہولناک ہوتا ہے، اس احاطہ اور خصوصاً کوٹھڑیوں میں بلا کی وحشت برستی تھی، جیل میں مشہور تھا کہ یہاں بدروحوں کا ڈیرہ ہے۔ وارڈن اور ملازمین بھی اس طرف کا رُخ کرتے گھبراتے اور کتراتے تھے ــــــــ حضرتِ مدنیؒ کی گرفتاری پر شاعرِ انقلاب مولانا ظفر علی خاںؒ نے جو پُر اثر نظم لکھی وہ یہاں درج کی جاتی ہے:۔

---

[1] اثر بن یحییٰ انصاری، مولانا آزاد ڈائری

اسیرِ فرنگ حسین احمد نوّر اللہ مرقدہٗ

وہ شیخ الہند محمود الحسن کی آنکھ کا تارا
وہ نورِ عینِ امداد و رشید قطبِ ربّانی

رسول اللہ کا وارث ولی اللہ کا وارث
وہ فخرِ خاندانِ قاسمی وہ شیخ ربّانی

وہ شمسِ علم و حکمت جس سے عالم ہو گیا روشن
عجم میں جس کی تنویریں عرب میں جس کی تابانی

وہ شیرِ بیشۂ اسلام وہ مستانۂ وحدت
وہ جس کی گونج سے دشمن کا پِتّہ ہو گیا پانی

حسین احمد اسی قدسی صفت کا نامِ نامی ہے
اسی پر آج ہے اتمام نعمت ہائے ربّانی

اسیرِ مالٹا وہ یادگار احمد حنبل
اسیرِ قیدِ زنداں ہو گیا وہ یوسفِ ثانی

دبانے سے نہیں دبتے یہ حریت کے متوالے
کہیں روکے سے رکتی ہے سمندر کی بھی طغیانی

کبھی مردانِ غازی غیرِ حق سے ڈر نہیں سکتے
یہی وہ ہیں جو کرتے ہیں فقیری میں بھی سلطانی

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ کی تلوار ہاتھوں میں
نظر آجائے سِیْمَاھُمْ جو کوئی دیکھے تو پیشانی

تَرٰھُمْ رُکَّعًا اور سُجَّدًا فی اللّیل رہبان
شعار زندگانی ابتغاءِ فضلِ ربانی

صحابہ کا نمونہ اور رسول اللہ کا اسوہ
انہیں دیکھو کہ ہیں یہ منظرِ آیاتِ قرآنی

حسین احمد کے حصّے کا "پلاؤ" کھانے والوں کو
تن آسانی تو آسان ہے مگر مشکل ہے قربانی

خدا کی راہ میں مر مٹنے والوں سے کوئی پوچھے
کہ قید و بند میں ہیں کیسی لذتہائے روحانی

(ماہنامہ دار العلوم)

ف حضرت مدنیؒ کی گرفتاری کے بعد مظفر نگر کے ایک سیاسی جلسہ میں ایک بہت بڑے معزز لیڈر نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: "اب وہ دن گذر گئے کہ مولانا مدنی پلاؤ کھایا کرتے تھے اب اُن کے حصّے کا پلاؤ ہم کھائیں گے" اس مصرعہ میں اُدھر اشارہ کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی شان کہ کچھ دنوں بعد پلاؤ کی دیگیں تیار ہو گئیں مقرر موصوف نہایت اطمینان کے ساتھ پلاؤ کھانے کی میز پر پہنچے، ابھی پہلا ہی چمچ منہ میں ڈالنے کے ارادہ سے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ ایک ظالم کی گولی کا نشانہ بن گئے، نہ خود کھا سکے نہ یارانِ محفل کھا سکے بلکہ دیگیں بھی لوٹ لی گئیں، سچ فرمایا ؎

تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ

نظر بندی کی مدّت طویل ہوتی گئی اور رہائی کے آثار نظر نہ آئے تو کچھ مخلصین نے قانونی چارہ جوئی کی کہ نظر بندی خلافِ قانون ہے، درخواست حاجی شیخ ولی محمد صاحب جونپوری مرحوم کے نام سے داخل کی گئی اور صوبائی مسلم لیگ کے لیڈر اور قابل و فاضل وکیل ظہیر الحسنین صاحب لاری نے اس کی پیروی کی، اُن کا اور دوسرے قابل وکلاء کا خیال تھا کہ اس قانونی اعتراض کے نتیجے میں حضرت کی رہائی یقینی ہے۔ مگر اس بنچ کے جج جسٹس اقبال احمد اور مسٹر السپ دونوں کمزور اور حکومت کے اشاروں اور ارادوں کے تابع تھے اور حکومت کسی حالت میں بھی حضرت کو رہا نہیں کرنا چاہتی تھی، حضرت نے اس مقدمہ کے بارے میں تحریر فرمایا:۔

"مقدمہ کے بارے میں لاری صاحب کا بیان اخبار مدینہ میں آچکا ہے، جانب مخالف (حکومت) کی طرف سے اوّلاً مسٹر محمود سابق سب انسپکٹر پولیس کو بھیجا گیا اور ان کا حلف نامہ داخل کیا گیا، بحث میں مسٹر محمود کے بیان کو کنڈم کر دیا گیا اور چیف جسٹس نے ہوم سکریٹری کے بیان پر فیصلہ دے دیا، ہر ایک کی نقل کا ترجمہ ارسال ہے، اس سے آپ نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ لاری صاحب نے نہایت عمدہ بحث کی اور قانونی حیثیت سے ہوم سکریٹری کے حلف نامہ کو غیر قانونی ثابت کر دیا، کاش وہ کلکتہ یا لاہور کے قاضی القضاۃ یا فیڈرل کورٹ کے سامنے اپنی ابحاث کو پیش کرتے تو ضرور کامیاب ہو جاتے۔" (مکتوبات جلد ۴ ص ۸۹)

حلف ناموں اور فیصلے کا تذکرہ آ ہی گیا ہے تو اُن پر ایک نظر بھی ڈال لیجئے:۔

حلف نامہ مسٹر محمود سابق افسر انچارج پولیس سٹیشن دیوبند

(۱) میں اِس وقت رڑکی پولیس اسٹیشن کا افسر انچارج ہوں جو واقعات اِس حلف نامہ میں درج ہیں اُن سے پوری طرح واقف ہوں۔

(۲) یہ کہ مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید خاص ہیں اور اُن میں سے ایک ہیں جو تحریک ریشمی رومال کے بانی مبانی تھے۔

(۳) یہ کہ مولانا حسین احمد مدنی سازش مذکور کے سلسلے میں عرب بھیجدیئے گئے تھے اور وہاں سے لوٹتے ہوئے گرفتار کیے گئے اور مالٹا میں نظر بند کیے گئے تھے۔

(۴) یہ کہ بعد میں مولانا حسین احمد مدنی ۱۹۲۰ء میں ہندوستان واپس آئے اور تحریکِ خلافت کے چلانے میں

خاص حصہ لیا اور وہ ایک امیدوار تھے عہدۂ امیر الہند کے، تاکہ اس کے ذریعے جہاد کا فتویٰ دے سکیں اور ۱۹۲۷ء میں خلافت کمیٹی کی مجلس منتظمہ میں بھی منتخب ہوئے تھے۔

(۵) یہ کہ وہ علی برادران کے ساتھ مقدمہ میں بھی منتخب ہوئے تھے۔

(۶) یہ کہ مولانا مدنی نے ۲۴، ۲۵ کو سہارنپور میں ایک آگ لگانے والی تقریر کی تھی اور خاص تعلق تھا جمعیۃ علماء ہند سے، اس کے ذریعے تبلیغ کرتے تھے، ولایتی مال کے بائیکاٹ کی جس میں انگریزی مال بھی شامل ہے اور کھدّر کے کپڑے کی اشاعت کرتے تھے۔

(۷) یہ کہ مولانا مدنی نے مرادآباد میں ۱۹۲۸ء میں صوبہ جمعیۃ علماء کی صدارت کی اور صوبہ خلافت کمیٹی کے صدر بھی منتخب ہوئے۔

(۸) یہ کہ مولانا مدنی نے مئی ۱۹۳۰ء میں نوجوان بھارت سبھا سہارنپور کے جلسے میں شرکت کی اور گورنمنٹ کے خلاف بہت سخت تقریر کی۔

(۹) یہ کہ مولانا مدنی نے ۱۹۲۸ء میں مجلس احرار کے لیے چندہ کیا اور جمعیۃ علماء ہند کے ڈکٹیٹر مقرر ہوئے جو اس وقت دہلی میں غیر قانونی جماعت تھی اور ان کے اوپر ایک نوٹس اس امر کی تعمیل کی گئی کہ وہ دہلی میں داخل نہ ہوں لیکن انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی اور جیل بھیجے گئے اور بعد میں اگست ۱۹۳۲ء میں رہا ہوئے۔

(۱۰) یہ کہ مولانا مدنی نے ۳۶ء / ۳۷ء میں عام انتخابات کے کانگریس امیدواروں کو کامیاب بنانے کی پوری اور انتہائی کوشش کی۔

(۱۱) یہ کہ مولانا مدنی نے ۳۷ء اور ۳۸ء میں ولایتی مال کے بائیکاٹ کی کوشش کی اور عوام سے اپیل کی کہ وہ آنے والی لڑائی میں اور بادشاہ کے جشن تاجپوشی میں شریک نہ ہوں۔

(۱۲) یہ کہ ۳۷ء اور ۳۸ء میں مولانا مدنی کا داخلہ دہلی بذریعہ تحریری حکم چھ ماہ کیلئے روک دیا گیا۔

(۱۳) یہ کہ مولانا مدنی نے ۳۸ء و ۳۹ء میں ہری پورہ کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی اور آل صوبہ کانگریس کمیٹی کے نائب صدر تھے۔

(۱۴) یہ کہ مولانا مدنی نے آزاد مسلم کانفرنس ۴۰ء جونپور کی صدارت کی اور اس میں انگریزوں کے خلاف زبردست تقریر کی۔

(۱۵) یہ کہ مولانا مدنی نے اگرچہ گاندھی جی کے خاص حکم کے ماتحت ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء میں انفرادی ستیہ گرہ میں حصہ نہیں لیا لیکن اس سال کانگریس کی مجلسِ منتظمہ کے ایک ممبر تھے۔

(۱۶) اپریل ۱۹۴۲ء میں دو تقریریں پھرایوں اور سہارنپور میں بہت سخت کیں اور پھرایوں کی تقریر کے سلسلے میں ۲۴ جون ۱۹۴۲ء کو گرفتار ہوئے اور مقدمہ چلایا گیا اور دفعہ ۲۶ قانون ہند کے ماتحت چھ ماہ کی سزا ہوئی۔

(۱۷) مولانا مدنی کا نام سنٹرل گورنمنٹ کی فہرست الف پر اور صوبائی گورنمنٹ کی فہرست الف پر درج ہے جو کہ کسی وقت تیار کی گئی تھی، اگست ۱۹۴۲ء کی عام گرفتاری سے قبل اس فہرست میں انہی لوگوں کا نام تھا جو خاص طور پر خطرناک سمجھے گئے تھے اور بعد میں پوری تحقیقات کے بعد دفعہ ۲۶ کے ماتحت گرفتاری کا حکم جاری کیا گیا۔

حلف نامہ ہوم سیکرٹری (یوپی)

میں ڈی ایس سیکرٹری صوبہ یوپی ہوم ڈیپارٹمنٹ باحلف بیان کرتا ہوں اور قسم کھاتا ہوں۔

(۱) یہ کہ میں سکریٹری صوبہ متحدہ گورنمنٹ کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ہوں اور حکم مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۴۲ء ۶۷۵۴ سی این میں نے جاری کیا ہے۔

(۲) یہ کہ اس حکم کے جاری ہونے سے قبل مولانا حسین احمد مدنی کا معاملہ اور معاملوں کے ساتھ گورنر کے سامنے رکھا گیا تھا اور ان کی نظربندی کا مذکورہ بالا حکم ہز ایکسیلنسی کے حکم کے مطابق ان کے معاملے پر غور کر کے جاری کیا گیا تھا، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ کے سامنے اس بیانِ حلفی کی تصدیق ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو ہوئی ہے۔

فیصلہ

ہائی کورٹ الہ آباد محکمہ فوجداری نگرانی الہ آباد ۱۶ نومبر ۱۹۴۳ء

باجلاس سر اقبال احمد چیف جسٹس اور آنریبل آلسپ صاحب مقدمہ ۷۸۵ ۱۹۴۳ء

بادشاہ سلامت! بذریعہ سپرنٹنڈنٹ جیل نینی

بنام مولانا حسین احمد مدنی کی طرف سے شیخ ولی محمد

حکم

—— یہ درخواست ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۴۹۱ کے مطابق دی گئی ہے، اس میں یہ استدعا کی گئی ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی جو کہ نینی جیل میں نظر بند ہیں رہا کیے جائیں، مولانا مدنی کو ۲۵ رجولائی ۴۲ء کو قید کی سزا ہوئی تھی اور اپیل کے فیصلے کے مطابق جنوری ۴۳ء میں اُن کی سزا پوری ہو جاتی۔ اسی درمیان میں ان پر دفعہ ۲۶ ڈیفنس آف انڈیا رولز کے مطابق یہ حکم جاری کیا گیا کہ یہ نظر بند کیے جائیں، یہ حکم ۱۵ر اگست ۴۲ء کو جاری ہوا، جنوری ۴۳ء سے مولانا اس حکم کے مطابق نظر بند ہیں۔ دلیل یہ دی گئی ہے کہ حکم طریقے سے جاری نہیں ہوا ہے اور اس حکم کا کوئی قانونی اثر نہیں ہے۔ جہاں تک طریقے کا سوال ہے ہماری سمجھ میں اعتراض یہ ہے کہ حکم صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ کی طرف سے جاری کیا گیا ہے جبکہ وہ گورنر کی طرف سے ہونا چاہیئے تھا۔ ہماری سمجھ میں یہ اعتراض کوئی مضبوط نہیں ہے، خاص طور پر اس وقت جبکہ گورنر گورنمنٹ آف انڈیا کی دفعہ ۹۳ کے مطابق گورنمنٹ کے پورے اختیارات خود کام میں لا رہا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مولانا مدنی کی نظر بندی کے مسئلے پر خود گورنر نے غور نہیں کیا۔ سرکار کے ہوم سکریٹری نے ایک حلفی بیان داخل کیا ہے کہ مولانا کی نظر بندی کا حکم خود گورنر کی ہدایت سے جاری کیا گیا ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ معاملہ گورنر کے سامنے رکھا گیا تھا اور انہوں نے اس پر غور کر کے حکم جاری کیا ہے، اس بیانِ حلفی کے رہتے ہوئے ہمارے لیے یہ کہنا ناممکن ہے کہ گورنر نے حکم جاری نہیں کیا۔ یہ کہا گیا ہے کہ مولانا کی نظر بندی کا حکم گورنر نے جاری کیا ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن بیانِ حلفی میں یہ کہا گیا ہے کہ گورنر کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا اور ان ہی نے حکم جاری کیا ہے تو ہمیں مان لینا چاہیئے کہ گورنر ہی نے یہ حکم جاری کیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس درخواست میں کوئی زور نہیں ہے اور ہم اس کو خارج کرتے ہیں۔

درخواست دہندہ کے وکیل نے فیڈرل کورٹ میں اپیل کرنے کی اجازت طلب کی ہے لیکن چونکہ اس میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی تشریح کا معاملہ نہیں ہے اس لیے ہم ایسی اجازت دینے سے انکار کرتے ہیں ——

الہ آباد جیل کے حالات میں ایک اہم واقعہ حضرت کے ساتھ جیل کے کسی افسر کی دست درازی اور گستاخی کا بھی ہے، یہ قصہ کئی حضرات نے بیان کیا ہے مگر ان حکایتوں میں جذبات، صدمات اور اضطراب بھی شامل ہے، اس لیے صحیح اور واقعی کہانی حضرت ہی کی زبان سے معلوم ہو سکتی ہے :-

——— "جب سے میں یہاں (نینی جیل) آیا ہوں اس واقعے کے پیش آنے تک نہ میں کسی افسرِ اعلیٰ سے یا اُس کے نائب سے ملا ہوں نہ وہ مجھ سے ملے ہیں، انہوں نے مجھے کبھی دیکھا بھی نہیں، میں نے دُور سے دیکھا تھا مگر صورت شناس نہ تھا، حکامِ جیل بالخصوص وہ شخص جو کہ سابقہ جیلوں میں چھوٹے عہدوں سے بڑھا ہو شاذ و نادر ہی نہایت سخت اور بدخو، بدزبان، تند خو ہوتے ہیں، بالخصوص اینگلو انڈین! میں عصر کے بعد اوراد و وظائف میں عموماً مشغول رہتا ہوں اور کمرے ہی کے اندر رہتا ہوں، مغرب کی نماز کے وقت نکلتا ہوں اور کمرے سے باہر ہی کمبل وغیرہ بچھا کر ہم چند مسلمان پنج وقتہ نماز باجماعت پڑھا کرتے ہیں، بعض مسلمان دوسری بارکوں سے آجاتے ہیں اور جو کہ اسی بارک میں رہتے ہیں جس میں میں ہوں یعنی نمبر ۱ ہیں وہ عشاء اور فجر میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ مغرب کے فرض ادا کرنے کے بعد نوافل میں ڈیڑھ دو پارہ پڑھا کرتا ہوں، اس کے بعد بارک کے مسلمان ساتھ کھانا کھاتے ہیں اور پھر عشاء کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں ہو جاتے ہیں، بارکوں کے دروازے گرمیوں میں آٹھ بجے کے بعد بند ہوا کرتے تھے، جاڑوں میں ساڑھے سات بجے سے بند ہونے لگتے تھے۔ شمار اور گنتی ہر بارک کے آدمیوں کی بارک ہی میں ہوا کرتی ہے۔ پولیٹیکل قیدی اپنی اپنی جگہوں پر گنے جاتے ہیں، میں نماز میں مشغول ہوتا تھا گننے والے کمرے میں ہوتے ہوئے گن جاتے تھے اور اب بھی وہی حال ہے۔

افسرِ اعلیٰ نے اہل سرکل ۵ کے جیلر سے کہا کہ تم اپنے سرکل کی بارکوں کو سات بجے بند کرو، اُس نے بعض ذمہ دار اشخاص سے کہا کہ افسر کا حکم سات بجے بند کرنے کا ہے، سرکل ۱ والے جن میں دوسرے پولیٹیکل قیدی ہیں ساڑھے سات بجے بند ہو جاتے ہیں تم بھی اُس وقت بند ہو جایا کرو، اُس نے جواب دیا کہ ہم نے بعض مطالبات سپرنٹنڈنٹ کو بھیجے ہیں ان کا جواب اب تک نہیں آیا، جب تک وہ پورے نہ ہو جائیں ہم اُس مطالبے کو پورا نہیں کریں گے، مگر اس کی مجھ کو اور میرے رفقاء کو کوئی خبر نہ تھی، مجھ کو اور میرے رفقاء کو اس بند ہونے پر نہ کوئی اعتراض تھا اور نہ ان کے متعلق کوئی سوال پیدا ہوتا تھا، کیونکہ مغرب سے پہلے وہ سب بارک میں آجاتے تھے اور صبح تک وہاں رہتے تھے اور بالخصوص میں تو عصر سے تقریباً بند ہی رہتا ہوں بلکہ دوسرے اوقات میں بھی کمرے سے باہر بلا ضرورت نہیں نکلتا۔

افسرِ اعلیٰ کو یہ جواب اُس کا ناگوار گذرا اور اپنی طاقت کے مظاہرے کے لیے اپنی فورس لے کر ساڑھے چھ بجے جبکہ عین مغرب کا وقت تھا بلا خبر اور بلا نوٹس سرکل ۵ میں داخل ہوا اور سب سے پہلے ہماری بارک میں داخل

ہوا کیونکہ بڑا اُسی کا ہے، اُس نے پارک میں جو لوگ موجود تھے کو حکم دیا کہ پارک سے باہر آؤ اور دھکے دے کر لوگوں کو باہر نکلوایا۔

میرا کمرہ پارک کے مشرقی کنارے پر ہے، وہ پہلے مغربی کنارے پر گیا اور جو لوگ اس طرف کمروں میں یا باہر کمروں کے تھے دھکّے دے کر باہر نکالا پھر مشرقی کنارے پر آیا۔ ہمارے رفقاء مغرب کی نماز کی تیاری کر رہے تھے، کمبل اور چادر بچھا رہے تھے، آفتاب غروب ہو چکا تھا، اُن سے جب کہا گیا کہ باہر نکل جاؤ تو انہوں نے کہا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے نماز پڑھ لیں جس میں صرف پانچ چھ منٹ لگیں گے، اس کے بعد نکل جائیں گے۔ چھوٹا افسر جو کہ یورپین تھا اس کو سنکر ساکت ہو گیا، اتنے میں افسرِ اعلیٰ (سپرنٹنڈنٹ) اینگلو انڈین پہنچا اور اس نے مولانا عبدالباری صاحب گورکھپوری کی بنیان میں اوپر سے ہاتھ ڈال کر کھینچا اور زور سے کہا نکل جاؤ، دُوسروں نے پھر ان کو دھکا دیا، اسی طرح مولانا عبدالسمیع صاحب سلطانپوری کو دھکا دیا گیا اور مولوی ماجد صاحب بستوی کو مارنے کیلئے بھی ہاتھ اٹھایا گیا، یہ سب یکے بعد دیگرے باہر نکل گئے میں کمرے میں وظیفہ پڑھ رہا تھا مجھ کو ان معاملات کی کوئی خبر نہ تھی، شور و شغب سُنکر میں کھڑا ہوا تو دیکھتا ہوں کہ کمرے کے دروازے پر سپرنٹنڈنٹ کھڑے ہیں اور اُن کے ساتھ وارڈر اور نمبردار وغیرہ ہیں۔ انھوں نے کہا نکل جاؤ، میں نے کہا اچھا جوتا پہن لوں، میں اُس وقت چمڑے کا موزہ پہنے ہوئے تھا جو کہ سردیوں میں پہنا کرتا ہوں، میں کھڑاؤں لینے کے لیے بڑھنا چاہتا تھا کہ مجھ کو دھکا دیا گیا، میں اُس دروازے کی طرف جو کہ پارک سے نکلنے کا ہے چلا ہی تھا کہ دوسرا دھکا دیا گیا، اس کی وجہ سے عمامہ سر پر سے گرنے لگا میں اس کو سنبھالنا چاہتا تھا کہ تیسرا دھکا دیا گیا میں اس کو سنبھال نہ سکا وہ گر گیا، پھر میں ٹوپی سنبھالنے لگا تو چوتھا زور سے دھکا دیا گیا، یہ اس قدر زور سے دھکا دیا گیا تھا کہ ٹوپی بھی گر پڑی اور اگر میں سنبھل نہ جاتا تو زمین پر گر پڑتا، بہر حال میں ننگے سر اور ننگے پاؤں وہی موزے پہنے ہوئے باہر نکل گیا، اس کے دو منٹ بعد سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سب باہر آ گئے، مجھ سے سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ آپ نے تو کمرے کو ہوٹل بنا رکھا ہے! میں نے کہا کیا بات ہے؟ اُس نے کہا کہ پارک میں چلے جاؤ، ہم لوگ پھر ایک ایک کر کے داخل ہو گئے اور گننے کے بعد پارک بند ہو گئی۔

صبح کو ہم چار آدمیوں نے عرضی لکھی کہ ہمارے ساتھ ایسا ایسا معاملہ کیا گیا ہے ہمیں ہمارے قانونی مشیر لاری صاحب سے ملایا جائے تاکہ اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکیں۔ دو بجے ضلع بہرائچ کے سیاسی قیدی سردار جوگندر سنگھ آئے وہ اس واقعہ پر بہت برہم تھے، انھوں نے کہا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل وسط جیل کی

تین موہانی چوکی میں آیا ہُوا ہے، وہ کہتا ہے کہ کل کے واقعہ کا مجھے بہت افسوس ہے، مَیں مولانا مدنی کو پہچانتا نہیں تھا اُن کو بلا دو مَیں اُن سے معافی مانگوں گا، مَیں نے اُن کو بہت لعنت ملامت کی ہے، میری رائے ہے کہ تُو میرے ساتھ چل کر اُسے معافی دیدے، مَیں نے کہا یہ پوری جماعت کا مسئلہ ہے اس لیے آپ سب سے پوچھئے، انہوں نے ہر بارک سے چیدہ چیدہ لوگ بلائے اور سب سے مشورہ کیا، سب نے رائے دی کہ جب وہ معافی مانگ رہا ہے تو معافی دے دینی چاہیئے، مَیں نے کہا کہ اچھا آپ جا کر اس سے کہہ دیجئے کہ حسین احمد نے معاف کر دیا، مگر چیف وارڈر نے کہا کہ وہیں چل کر معافی دینی چاہیئے، مَیں چلا گیا اُس نے کہا کہ مجھے افسوس ہے اور مَیں معافی چاہتا ہوں"۔۔۔۔۔۔

یکم نومبر ۴۲ء کو یہ واقعہ پیش آیا تھا حضرتؒ نے کسی کو اس کی اطلاع نہیں دی مگر رفتہ رفتہ پورے ملک میں خبر پھیل گئی اور غم و غصّے کی ایک لہر دوڑ گئی، حضرت نے تو معافی دے دی تھی مگر عوام اور معتقدین کے رنج و غم میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا اور نتیجے میں جگہ جگہ احتجاجی جلسے ہو رہے تھے، اخبارات میں آرٹیکل لکھے گئے اور ریزولیشن پاس کیے گئے، ۲۶ نومبر ۴۲ء کو تمام ہندوستان میں احتجاجی اجتماعات کیے گئے، ۲۷ نومبر کو اخبارات میں یوپی کے گورنر کا کمیونک شائع ہُوا کہ سپرنٹنڈنٹ متعلقہ نے معافی مانگ لی ہے اور اب حضرت افسرانِ جیل سے مطمئن ہیں۔ اس پر بھی عوام کا مطالبہ جاری رہا کہ سپرنٹنڈنٹ کو قرار واقعی سزا دی جائے مگر آخر میں حضرت کا پیغام پہنچا کہ ہم نے معاف کر دیا ہے اس لیے اب کوئی مطالبہ نہیں ہونا چاہیئے۔

قصہ مختصر کہ ۱۹۴۳ء ختم ہوتے ہوتے اِدھر تو کوئٹ انڈیا کی تحریک کمزور پڑنے لگی اور اُدھر جنگ کی صورتِ حالات کے ساتھ ساتھ برطانیہ کی پالیسی بھی بدلنے لگی۔ اب کانگریسی اور سیاسی قیدی آہستہ آہستہ چھوڑے جانے لگے اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کی رہائی کی خبریں بھی سُنی جانے لگیں۔ ایک دن ۲۶ اگست ۱۹۴۴ء کو اچانک حضرتؒ کو اطلاع دی گئی کہ آپ کو رہا کر دیا گیا ہے اور اب جلد از جلد باہر چلے جائیے۔ رہائی کے دن کا واقعہ بھی حضرتؒ ہی سے سُنیئے:۔

"۶ رمضان المبارک بروز شنبہ تقریباً ۳ بجے دن حکم پہنچا کہ تجھ کو بلا شرط رہا کیا گیا اور ابھی روانگی ہے، چنانچہ منتشر اشیاء کو جلد از جلد اٹھایا گیا اور تمام کارروائیاں انجام دے کر تقریباً ۶ بجے شام کو نینی جیل سے باہر آنا ہُوا، یہ جگہ شہر الہ آباد سے تقریباً ۶ میل دُور ہے،

سواری کا انتظام کرنا پڑا جس کی وجہ سے کافی دیر ہوگئی، بعد از مغرب تقریباً آدھ گھنٹہ گذر جانے پر روانگی ہوئی، مولانا خادم حسین (ابو الحسن حیدری) موجود نہ تھے، اُن کے صاحبزادے تانگہ لے کر پہنچے اور تقریباً ساڑھے نو یا دس بجے ہم ان کے مستقر پر پہنچ گئے، اسی وقت شب ہی تار سے متعدد مقامات پر اطلاع دی، چنانچہ دہلی میں ناظم اعلیٰ صاحب اور حاجی صاحب کو اطلاع دے دی، مولانا (ابو الحسن حیدری) کے انتظار میں اور بعض احباب سے ملاقات وغیرہ کی غرض سے اتوار کو ٹھہرنا پڑا۔ آج بروز دوشنبہ ۷ بجے کی گاڑی سے روانہ ہو کر جونپور اتروں گا کیونکہ شیخ صاحب جونپوری بہت بیمار ہیں، وہاں چند گھنٹے ٹھہر کر دہرہ دون ایکسپریس سے ٹانڈہ جاؤں گا، پھر وہاں سے دو ایک دن بعد لکھنؤ مراد آباد ہوتا ہوا تقریباً ۱۵ یا ۱۴ رمضان المبارک کو یا اس سے پہلے دیوبند پہنچوں گا۔"

اس بار حضرتؒ کل دو سال دو ماہ اور دو دن جیل میں رہے اور رہائی کے دس دن بعد مختلف جگہوں پر ہوتے ہوئے ۱۴ رمضان شریف کو دیوبند تشریف فرما ہوئے، یہاں عدیم المثال استقبال، جلوس اور تہنیتی جلسہ ہوا اس کے بعد دو دن دیوبند میں قیام کر کے حسب معمول سلہٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔

جیل کے باہر بھی حضرت کے خلاف ایک کارروائی ہو رہی تھی، ایک عرصے سے حضرت کو مدرسہ دیوبند سے الگ کرنے بلکہ نکالنے کی سازشیں جاری تھیں، ان میں حکومت تو پیش پیش تھی ہی بعض علماء، فضلاء اور ذمے داران مدرسہ بھی اس رجحان سے متاثر تھے، حکومت کے حاشیہ برداران، وظیفہ خواران و دلبندان اُن کی پشت پناہی کرتے تھے، حضرت کی موجودگی میں عظمت و عزیمت، مقبولیت و محبوبیت اور جرأت و شہامت کے آگے کوئی وار اور کوئی چال کامیاب ہوتی نظر نہ آتی تھی، گرفتاری کے بعد حکومت کی پالیسی دیکھ کر ان کو یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ جیل سے چھوٹتے چھوٹتے کچھ نہیں تو چار چھ برس تو گذر ہی جائیں گے، چنانچہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بھرپور حملے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ حضرت عام زندگی میں ہمیشہ ہر قسم کی ریشہ دوانیوں سے الگ تھلگ رہنے کے عادی تھے اور اب تو دست بستہ پا بہ زنجیر جیل کی سلاخوں میں بند تھے، کسی قسم کی مقاومت یا دفاع کا بھی اندیشہ نہیں تھا، مخالف جماعت سرکاری حلقوں، بڑی شخصیتوں اور معروف علماء کرام پر مشتمل تھی مگر اللہ کے بھید اللہ ہی جانتا ہے جب ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں، پلان تیار ہو گیا اور کہیں کہیں منہ میٹھا کرنے کرانے کے انتظامات بھی مکمل ہو گئے تو عین وقت پر معلوم نہیں کیا پیچ پڑا کہ حضرتؒ پر تو کوئی حرف نہیں آیا، الٹا ان ہی سارے حضرات کو الگ کر دیا گیا۔

مقدمہ کی اس ساری کارروائی سے مندرجہ ذیل امور واضح ہو جاتے ہیں کہ:۔

(۱) ہندوستان کے ہزاروں علماء اور لیڈروں میں سے جن کو خاص طور پر خطرناک سمجھا گیا تھا اُن میں حضرتؒ کا نام نامی بھی ہے کئی وہ علماء اور لیڈر رہیں جو اخباروں اور رسائل میں انگریزی حکومت کے خلاف بہت لکھتے تھے بلکہ تقاریر میں بھی بہت کچھ کہہ جاتے تھے، مگر ان میں کئی تو سر اور شمس العلماء کے خطابات سے سرفراز کیے گئے تھے اور کئی ویسے ہی مقرب بارگاہِ حکومت تھے۔ حضرتؒ کے ساتھ جیل میں جو گستاخانہ سلوک کیا گیا اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کی یہ قید انتقامی تھی جس کا سب سے بڑا نشانہ صرف حضرت مدنیؒ کی ذات تھی، انگریز جانتے جاتے آپ سے اِنتقام لینا چاہتا تھا ورنہ دُنیائے اسلام کے اس قدر عظیم الشان عالمِ دین سے یہ بدسلوکی کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں سمجھی جاتی۔

(۲) حضرت مدنیؒ کو نظر بند کرنے کا پس منظر یہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ آپ کو اتنا عرصہ نظر بند رکھا جائے کہ دارالعلوم کی انتظامیہ اپنی پوری محنت کے ساتھ آپ کو دارالعلوم سے الگ کرسکے جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں ذکر کی جائے گی۔ حضرت مدنیؒ کے قید اور پھر نظر بند کیے جانے پر دارالعلوم میں آپ کے اسباق خصوصاً بخاری شریف کی تدریس کے لیے مولانا فخرالدین رحمۃ اللہ علیہ کو بلایا گیا، جیسا کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ:۔

"آپ دو مرتبہ حضرت مدنیؒ کی گرفتاری اور رخصت کے زمانے میں دارالعلوم میں صحیح بخاری کا درس دے چکے تھے۔" (تاریخ دارالعلوم جلد ۲ صفحہ ۲۱۴)

حضرتِ مدنیؒ کے اس جیل میں مندرجہ ذیل مشاغل تھے: ذکر اللہ اور عبادات، درسِ قرآنِ عزیز، تبلیغ، خدمتِ خلق۔ چنانچہ اپنے ایک مکتوبِ گرامی میں فرماتے ہیں:۔

"مجھ کو بفضلہٖ تعالیٰ جو اطمینان و سکون یہاں حاصل ہے وہ عقلی مرتبہ میں مجھ کو مجبور کرتا ہے کہ یہاں سے نکلنے کی دُعا تک بھی نہ کروں اور خواہش یا کوشش دوسری بات ہے ہاں رضا بالقضاء ضروری امر ہے، میں خدا کا ہزار ہزار شکر کرتا ہوں کہ اس قید میں مجھ کو ظاہری اور باطنی بہت سے انعامات سے نوازا، اگر میں بدنصیب، نالائق و کاہل نہ ہوتا تو اب تک بہت کچھ الطافاتِ الٰہیہ سے فیضیاب ہو چکا ہوتا۔ مگر اپنی بدقسمتی کا گلہ کس سے اور کیا کروں میں قسمیہ کہتا ہوں کہ میرے لیے یہ قید رحمت ہی رحمت ہے، پھر اگر خداوندِ کریم

قبول فرمائے اور اخلاص ہو تو ہر ہر لمحہ آخرت کے لیے توشہ ہے ؎

خاکیاں بے بہرہ انداز جرعۂ کاس الکرام

ایں تطاول بیں کہ با عشاق مسکین کردہ اند

فَلِلّٰہِ الحمد والمنہ الحاصل ہر طرح افضالِ الٰہی شامل ہیں، اپنے ہر دو بزرگوں مرشدنا و مولانا حضرت گنگوہی اور مولانا دیوبندی قدس اللہ اسرارہما کے الطاف بے عنایات کو خاص طور سے مبذول پاتا ہوں پھر کیا غم ہے اگرچہ ایسی قیدیں سالہا سال کے لیے ہوں خداوند کریم اپنی اور اپنے پیاروں کی رضا عطا فرمائے ؎

اذا صح منہ الود فالکل ھین

وکل الذی فوق التراب تراب

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ کی محبت اگر صحیح ہو تو سب مشکلات آسان ہیں اور جو بھی مٹی پر ہے (ہر ظالم و جابر) آخر مٹی ہو جائے گا۔" (مکتوبات جلد ۲ ص ۳۴)

حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شب و روز کی عبادات کا مختصر حال آپ کے شریکِ سجن ایک خادم کی زبانی درج ہیں:۔

"تین بجے رات کو تہجد و نوافل کے لیے اُٹھ بیٹھتے تھے، اول وقت میں فجر کی اذان دی جاتی تھی اور حضرت معمول کے مطابق جب خوب اُجالا پھیل جاتا تھا تب جماعت کھڑی ہوتی تھی، امامت حضرت ہی کراتے تھے اور طوال مفصل لمبی لمبی سورتیں قرأت فرماتے تھے، نماز کے بعد اپنی کوٹھری میں ورزش کرتے تھے، ورزش کا اہتمام حضرتؒ کو عمر بھر رہا جہاں تک راقم الحروف کو یاد ہے ستر برس کی عمر تک ورزش جاری رہی، اس کے بعد سب حضرات مل کر ناشتہ کرتے تھے۔ اس دوران مختلف علمی، روحانی، سیاسی امور اور معاشرتی مسائل پر گفتگو ہوتی رہتی تھی، چائے ناشتے سے فارغ ہو کر ۱۲ بجے تک قرآنِ پاک کی تلاوت حفظ اور دَور میں مشغول رہتے تھے، کھانے کے بعد حسبِ عادت قیلولہ فرماتے تھے، ظہر کے بعد قرآنِ پاک کی تفسیر و ترجمہ بیان فرماتے تھے، عصر کے بعد مغرب تک ذکر و عبادات میں مصروف رہتے تھے، مغرب کے بعد اوابین نوافل میں ڈیڑھ پارہ پڑھتے تھے پھر ساتھی قیدیوں کے ساتھ

کھانا کھاتے تھے، نمازِ عشاء کے بعد اپنی کوٹھی میں چلے جاتے تھے۔" (حیاتِ شیخ الاسلام ص۵۰۸)

آپ کا اس زمانۂ اسارت میں دوسرا مقدس شغل درسِ قرآنِ عزیز تھا۔ جس طرح آپ بلند پایہ شیخ الحدیث تھے اسی طرح آپ عظیم القدر مفسرِ قرآنِ عزیز بھی تھے، یہ درست ہے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اسارت مالٹا کے زمانہ میں ترجمہ قرآنِ عزیز کی تکمیل فرمائی تھی مگر آپ کے ساتھ آپ کے شاگردانِ جلیل القدر حضرت مولانا عزیر گلؒ اور حضرتِ مدنیؒ بھی شریک تھے۔ جیل میں آپ کے ساتھ ہندوستان کے جلیل القدر علماء کرام قید تھے، تو اُن کی استدعا پر آپ نے القرآن العظیم کا درس دیا جس کی مختصر سی کیفیت آپ کے شریکِ اسارت مولانا محمد میاں صاحب سابق شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی کے کلمات میں درج ذیل ہے:۔

"دریا کو کوزہ میں بند کرنا بظاہر ناممکن اور محال ہے مگر ان آنکھوں نے ۲ دو بزرگ ایسے دیکھے ہیں کہ ان کی مثال اگر سامنے رکھی جائے تو یہ ممکن ہونے لگتا ہے، ایک تو حضرت الاستاذ العلامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند دوسرے شیخ الاسلام مرشدی العلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہا العزیز۔"

چنانچہ آپ نے سُنتِ یوسفی پر عمل پیرا ہو کر مراد آباد جیل میں جو درسِ قرآنِ عزیز دیا اُس میں مولانا حفظ الرحمٰن اور دوسرے جلیل القدر علماء شریک تھے آپ کا یہ مختصر مگر جامع درس مجالس سبعہ کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ (تذکرۃ المفسرین ص۲۰۳)

آپ کا تیسرا مقدس شغل خدمتِ خلق تھا، آپ کی اس بے نظیر وصف کا آپ کا شدید مخالف بھی (بشرطیکہ وہ معاند نہ ہو) قائل ہے کہ آپ انسانیت کے بہت بلند مقام پر فائز تھے، اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کی پریشانی کو دور کرنا سکھ اور آرام پہنچانا آپ کی طبیعتِ ثانیہ تھی، چنانچہ جیل میں آپ کی خدمتِ خلق کا کچھ حال آپ کے شریکِ اسارت ایک غیر مسلم کی زبانی درج کیا جاتا ہے:۔

مولانا مدنیؒ اور اُن کے اخلاق ——— جیل کی زندگی کی چند جھلکیاں

ایک غیر مسلم سیاسی اسیر کی زبانی

شیخ الہند جناب مولانا حسین احمد صاحب مدنی مرحوم کے قدموں پر بیٹھ کر کام کرنے کا مجھے بھی فخر حاصل ہے، نہ صرف قدموں پر بیٹھنے کا بلکہ جیل میں بھی ساتھ رہ کر کام کرنے کا موقع ملا ہے، اس تجربہ کی بناء پر میں

کہہ سکتا ہوں کہ مولانا مدنی کی وفات سے نہ صرف ہندوستان اور ایشیا کا بلکہ دنیا کا بہت بڑا آدمی کھوگیا۔

آپ اُن محبِ وطن افراد میں سے ایک ہیں کہ جنہوں نے ملک کی آزادی کے لیے ۱۹۰۷ء کے پہلے سے ہی ہندوستان کے آزاد کرانے کی کوشش کی، ۱۹۱۴ء میں جب پہلی دُنیا کی جنگ ہوئی تو آپ مالٹا میں نظر بند کر دیئے گئے تھے۔

جیل میں مجھے بڑے بڑے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا لیکن اُن میں سے جنہوں نے میرے دل پر قبضہ کر لیا ان میں مولانا مدنی اور گنیش شنکر ودیارتھی تھے۔ ۱۹۴۳ء کی بات ہے نینی جیل میں جب یہ خبر آئی کہ تحریک فیل ہونے کے باوجود مہاتما گاندھی نے اپنے ۹ اگست والے ریزولیشن کو واپس نہیں لیا تو بڑے بڑے دیش بھکتوں کا چہرہ اداس ہو گیا لیکن مولانا مدنی صاحب مسکرائے اور کہا مہاتما جی نے ٹھیک کیا، کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ کسی جیل میں میری قبر بن جائے گی۔ انہیں دنوں ہم لوگ نینی جیل میں سرکل ۵ میں رہتے تھے، چونکہ سیاسی قیدی بہت سے چھوٹ چکے تھے اور بہت تھوڑے رہ گئے تھے، ان سب کی رائے ہوئی کہ ہم سب نمبر ۱ کے سرکل میں چلے جائیں تو سیاسی قیدیوں کی تعداد بڑھ جائے گی اور دن اچھی طرح سے کٹیں گے، تو مولانا صاحب نے فرمایا ٹھیک تو ہے مگر جیل والوں سے میں استدعا نہ کروں گا، نتیجہ یہ ہوا کہ مسئلہ پر ساتھیوں میں اختلافِ رائے ہوا اور سب لوگ سرکل ۱ میں چلے گئے اور اکیلے مولانا کے رہنے کی نوبت آئی، اُس وقت میں نے کہا کہ میں مولانا کو اکیلا چھوڑ کر بہشت میں بھی جانا پسند نہ کروں گا، نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو سیاسی قیدیوں کے لیے جیل والوں کو سرکل ۵ میں دو سپاہی اور دو نمبر دار رکھنا پڑتے تھے اسلیئے ان جیل والوں نے مولانا سے استدعا کی کہ آپ لوگ سرکل ۱ میں چلے جائیں تو بڑی مہربانی ہوگی تب ہم دونوں آدمی خوشی خوشی سرکل ۱ میں چلے گئے۔

"بھائی بھائی برابر ہیں" یہ کہتے ہوئے بہتوں سے سنا ہے لیکن برابری کا برتاؤ صرف مولانا کو کرتے دیکھا ہے، کھانا پکاتے وقت باورچی باورچی رہتا تھا اور آپ مالک رہتے تھے لیکن کھاتے وقت باورچی اور مالک ایک ہوتے تھے۔ یہی نہیں صرف ایک پاؤ گوشت مولانا کو ملتا تھا لیکن کھانے کے وقت جو بھی آکر کھاتے وقت بیٹھ جاتا اُس کو کھانے میں سے حصہ مل جاتا تھا۔ جیل کی میعاد نہیں تھی، یہ پتہ نہیں تھا کہ جیل میں کب تک رہنا پڑے گا لیکن اگر کوئی معمولی قیدی کھانے کے وقت آگیا تو اس کا کھانا اور اپنا کھانا ملا کر اس کو اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔ تندرستی گرنے لگی تو میں نے جیل کے ڈاکٹر سے کہا کہ مولانا اپنا کھانا تقسیم کر دیتے ہیں اس لیے

تندرستی گرتی جارہی ہے، تو انہوں نے پہلے تو یہ کہا کہ میں کیا کروں! قاعدہ یہی ہے ان کو صرف پاؤ بھر گوشت مل سکتا ہے۔ لیکن دوسرے دن آکر وزن کیا اور تندرستی گرتے ہوئے دیکھ کر پاؤ بھر گوشت اور بڑھا دیا۔ اس کے مطابق مولانا کا خرچہ اور بڑھ گیا اور لوگ بھی کھانے میں شریک ہونے لگے۔

ایک روز ایک قیدی نے آکر فریاد کی کہ نماز پڑھتے وقت فلاں قیدی بھی میرے پاس تھا اس نے میری اٹھنی چرالی (کیونکہ اُس وقت جیل کی اٹھنی آج کل کے تقریباً /۵ روپے کے برابر تھی) مولانا نے کہا کہ میں کیا کروں! میں بھی تو تمہاری طرح قیدی ہوں، لیکن جب اسے زیادہ رنجیدہ دیکھا تو اپنے پاس سے اٹھنی دے کر رخصت کیا۔ اسے دیکھ کر میں نے مولانا سے برجستہ عرض کیا کہ اب میں آپ کے ساتھ اس بیرک میں نہ رہوں گا کیونکہ آپ کا اخلاق اتنا وسیع ہے کہ اگر میں تھوڑے دن اور رہا تو میں بھی مسلمان ہو جاؤں گا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ تم تو بہت دنوں سے مسلمان ہو تم کیا مسلمان ہو گے۔

جیل میں سیاسی قیدی گرمی کے مہینے میں جان بوجھ کر دیر میں بند ہوتے تھے جس سے جیل والوں کو تھوڑی سی پریشانی ہوتی تھی لہٰذا اُن لوگوں نے سیاسی قیدیوں کے بیرک کو دیر میں کھولنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ گرمی کے مہینے میں پائخانہ صاف نہ رہنے کی وجہ سے ۸ بجے صبح تک بھنگی نہیں جانے پاتا تھا جس سے سیاسی قیدیوں کو پریشانی اٹھانا پڑتی تھی۔ اس پریشانی کو دیکھ کر میں نے مولانا سے عرض کیا کہ آج میں اس بیرک میں بند ہوں گا اور سیاسی قیدیوں کا پائخانہ خود صاف کروں گا۔ مولانا نے ارشاد فرمایا کہ میں بھی چلوں گا تم اکیلے کیوں جاؤ! میں نے کہا کہ میرے ہی جانے سے جیل والوں کی عقل ٹھیک ہو جائے گی آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (اخبار الجمعیۃ دہلی، شیخ الاسلام نمبر ص۱۶، ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء)

چونکہ شغل تبلیغ تھا، مگر اس کا انداز ہم جیسے مبلغوں سے انوکھا تھا، آپ نے زبانی طور پر تبلیغ کم فرمائی ہے مگر سلف صالحین اور اولیاء کرام کی طرح آپ نے اپنے حسن کردار سے غیر مسلموں کو ایسا مسخر فرمایا کہ وہ مشرف بہ اسلام ہوئے، ایسے سعادتمندوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جس کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے، ان سب اعمال حسنہ اور اشغالِ اسارت کا خلاصہ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے:۔

"جیل میں تبلیغ، مولانا حسین احمد مدنی صاحب اب تو غالباً الہ آباد جیل میں ہیں کچھ عرصہ قبل ایک مدت تک مراد آباد جیل میں رہے، اس زمانہ کے حالات حال ہی میں ایک بہترین

راوی کی زبانی معلوم ہوئے، مولانا کا بیشتر وقت قرآن خوانی، نوافل وغیرہ میں صرف ہوتا تھا باقی وقت خدمتِ خلق میں، کبھی اپنے رفیقوں کے لیے کھانا اپنے ہاتھ سے پکا رہے ہیں (ایک مستقل باورچی کے باوجود) کبھی کسی حقہ نوش رفیق کے لیے چلم بھر رہے ہیں، غیر اس قسم کی خدمتوں کے تو مولانا بادشاہ ہیں اور آزادی کے زمانہ میں بھی بے تکلف ان خدمتوں میں مصروف رہا کرتے تھے، رہے وہ نوافل و اذکار و اشغال تو اس کا موقع آزادی کے زمانہ میں انہیں کُھل کر صرف رمضان کے مہینے میں مل پاتا اور بھرپوری فرصت جیل میں نصیب ہو جاتی ہے، یہی رنگ دیکھ کر بعض مخلص نیاز مند شروع ہی سے یہ رائے رکھتے ہیں کہ مولانا جیل میں جا کر گھاٹے میں نہیں رہتے کچھ نفع ہی میں رہتے ہیں، کبھی کبھی درسِ قرآن بھی جاری رہا مسلمان تو خیر اس سے مستفید ہوتے ہی تھے بڑی خوشی کی بات ہے کہ غیر مسلم بھی نفع سے محروم نہ رہے متعدد افراد اسلام کے قریب آگئے، ایک صاحب جو کہیں کے سیٹھ یا ساہوکار تھے بحمد اللہ باضابطہ مسلمان ہو کر رہے ۔ دین کا مخلص خادم کہیں بھی ہو اور جن حالات میں بھی ہو بہرحال اپنے لیے جنت کا سامان کر ہی سکتا ہے،،

("صدق" لکھنؤ ۲ اگست ۱۹۴۴ء)

حضرتِ مدنیؒ کی دیوبند تشریف آوری کا منظر

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی غیر متوقع رہائی پر دار العلوم میں خوشی اور مسرّت کا ہلالِ عید سے زیادہ اظہار ہُوا، علماء کرام نے حضرتؒ کے حضور خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے عربی، فارسی اور اُردو میں منظوم استقبالیے پیش کیے۔ دار العلوم دیوبند کے شیخ الادب، استاذ العلماء حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے ۶۵ اشعار پر مشتمل قصیدہ لامیہ پیش کیا جس کے وہ چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں جن میں حضرتؒ کی اسارت اور اس کا پس منظر پوری طرح پیش کیا گیا ہے ؎

تعالوا الی نادٍ رحیبٍ مبارکٍ لمائدۃٍ علمیۃٍ لا التغزل

چلے آؤ اس بابرکت و وسیع محفل میں، ایک علمی دعوت کے لیے نہ کہ مشاعرہ کے لیے

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی گرفتاری اور دار العلوم دیوبند کے حالات کی وجہ سے اپنی پریشانی کو یوں بیان فرمایا ؎

فای لیال لم ابت فیہ ساھراً   وای نھار فیہ لم اتململ

پس وہ کونسی رات ہے جو میں نے جاگتے نہ گذاری ہو، اور وہ کون سا دن ہے جو رنج و ملال میں کٹا ہو۔

اس رنج و ملال اور پریشانی کی وجہ حضرتؒ کا اسیر ہونا اور پھر اس پر صابر رہنا ہے، چنانچہ حضرتؒ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ؎

سُجِنْتَ صُبُوْرًا ثُمَّ اُطْلِقْتَ شَاکِرًا   وَقَلَّدْتَ فِیْ ھٰذَیْنِ ھَدَی ابْنَ حَنْبَلٖ

آپ نے زمانۂ اسارت صبر میں گذارا آزادی پر اللہ تعالیٰ کا شکر کیا، ان دونوں حالتوں میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی زندگی کی پیروی کی۔

مگر یہ قید و اسارت دینِ اسلام کی سربلندی کے لیے ہے اس لیے یہ اسارت باعثِ مبارکباد ہے ؎

اذا کان سجن المرء للمرء رفعۃً   فواھا لمسجونٍ ونعم من ابتُلی

جب اسارت کسی انسان کے لیے دین کی سربلندی کے لیے ہو تو یہ اسیر اور مُبتلا بہت خوش بخت ہے۔

اور وہ زندگی جو دینِ اسلام کی سربلندی کے لیے محنت کے بغیر آرام و آسائش کی ہوئی ہو وہ تو ؎

اذا لم یکن للمرء ذکر مخلدٌ   فطول حیاۃ المرء وحدہ المثقل

جب کوئی آدمی دین کی وجہ سے قابلِ یادگار کام نہ کر سکے تو اس کی ساری عمر بوجھ ہوتا ہے۔

وہ لوگ جو اس بات پر خوش تھے کہ اب حضرتؒ دار العلوم میں نہ آسکیں گے بلکہ مٹھائی بانٹنے کی تیاری ہو رہی تھی، جب اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے حضرتؒ آزاد ہو کر آئے تو وہی استقبال کے لیے پیش پیش تھے، فرمایا ؎

تعجبتُ مِمَّن یَدَّعِی الْوُدَّ اَنَّھُمْ   اتوك علی قُرْبَاھُمْ بِالْمُثْمَلِ

میں نے تعجب کیا کہ وہی لوگ آج آپ کی محبت کے اظہار کے قریب سے قریب تر ہو رہے ہیں۔

حالانکہ وہ تو حضرتؒ کی اسارت پر فخر کرتے تھے اب ان کو یہ لاف زنی چھوڑ دینی چاہیے ؎

الم یان للفجار ترك افتخارھم   علی حبس شیخ زاھدٍ متوکلٖ

کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اللہ تعالیٰ کے ایک ولی کی اسارت پر فخر کرنا چھوڑ دیں اور وہ قیامت کی

باز پرس سے بچنے کا فکر کریں کیونکہ ؎

فان لہم یوم القیٰمۃ موضعًا تزل بہ الاقدام ای تزلزل

کیونکہ ان کو قیامت کے دن ایسی جگہ پیش ہونا ہے جہاں قدم پھسل جائیں گے۔

ان حاسدوں کی ایسی تدبیروں سے ہمارا کچھ نقصان نہیں بلکہ ہم تو دینِ حق میں ایسی تکالیف پر ویسا ہی اجر چاہتے ہیں جو عثمان و علی رضی اللہ عنہم کو ملا ہے ؎

وانا الانجال الکرام فنبتغی باسرٍ وقتل ما لِعُثمان وعلی

اور ہم تو وہ شرفاء ہیں جو راہِ حق میں قید بلکہ شہادت میں بھی اُس اجر کے طالب ہیں جو عثمان و علی کو ملا ہے۔ (رضی اللہ عنہم)

(منقول از رسالہ شریعت نہٹور حسین احمد نمبر ۱۹۴۴ء)

اِسی طرح فارسی زبان میں ایک منظوم استقبالیہ جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) مہتمم دارالعلوم دیوبند نے خود پڑھ کر سُنایا۔ منظوم استقبالیہ سُنانے سے پہلے جناب قاری صاحبؒ نے فرمایا:۔

"ہندوستان اور دنیائے اسلام کی آزادی ہی ہمارے قلوب کو مطمئن کرسکتی ہے جب تک یہ حاصل نہ ہو ہمارا فرض باقی رہے گا اور آزادی کی جنگ جاری رہے گی"[1]

اسی طرح اُردو زبان میں بھی منظوم استقبالیہ پیش کیا گیا جس کا ایک شعر بطور یادگار درج کیا جاتا ہے ؎

آئے ہیں حسین احمد ساون کی گھٹا بن کر
خُدّام ہیں قدموں میں ہم رنگِ حنا بن کر

---

[1] تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد ۱ صـ ۳۱۲

دار العلوم کی تطہیر؟

حضرت مدنیؒ جب اسیرِ فرنگ قرار دیئے گئے تو طلباء میں لازماً اضطراب اور ہیجان پیدا ہؤا، مگر حسبِ تحریر جناب قاری محمد طیب صاحبؒ "کوئی بات خلافِ قانون یا خلافِ قواعد دار العلوم دیوبند ظہور پذیر نہیں ہوئی"، جیسا کہ جناب قاری صاحب نے فرمایا:-

"اس موقع پر نوجوان طلباء کے صبر و ضبط کا اعتراف نہ کرنا یقیناً بے انصافی ہوگی، حضرت مولانا مدنیؒ کے زمانہ اسارت میں کئی مرتبہ احتجاجی جلوس نکالے گئے، مظاہرے اور جلسے کیے گئے مگر باوجودیکہ نوجوان طلباء میں حکومت کے خلاف سخت ہیجان اور انتہائی جوش و خروش پایا جاتا تھا، تاہم ہر موقع پر متانت جوش اور پُرامن مظاہروں کے ساتھ عالمانہ وقار ہی نمایاں رہتا تھا حالانکہ بالعموم ایسے اشتعال انگیز مواقع پر یہ خصوصیت برقرار نہیں رہتی مگر دار العلوم کے طلباء نے ثابت کر دیا کہ وہ نوجوانی اور طالب علمانہ عمر میں بھی جذبات کے اظہار میں کس قدر محتاط اور قابو یافتہ ہیں اور سخت سے سخت موقع پر بھی عالمانہ وقار و متانت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔" (تاریخ دار العلوم دیوبند، جلد ۱، ص ۳۰۷)

یہ تو دار العلوم دیوبند کے اُس وقت کے مہتمم صاحب کا بیان ہے، اب ذرا "حیاتِ عثمانی" کے مرتب شیرکوٹی کا بیان پڑھیں:-

"حضرت مولانا مدنیؒ کی گرفتاری کے بعد دار العلوم دیوبند کے طلباء مولانا سے مراد آباد جیل میں ملنے گئے اور مولانا مدنی کو دیکھ کر رونے لگے، اس پر ناخوش ہوکر مولانا مدنی نے کچھ ایسے الفاظ فرمائے جس سے طلباء یہ سمجھے کہ حضرت کا منشاء یہ ہے کہ طلباء جیل جائیں حالانکہ مولانا کا یہ منشا نہ تھا۔" (حیاتِ عثمانی ص ۴۶۵)

یہی شیرکوٹی تحریر کرتا ہے کہ:-

"بہر حال صدر مہتمم اور مہتمم دونوں طلبہ کی ان ہنگامہ آرائیوں سے جن کا ذکر حافظ محمد یوسف صاحب رکن مجلس شوریٰ نے کیا ہے سخت برہم تھے اور ان ہی وجوہات کی بنا پر اس قسم کے ہنگامہ خیز اُنسٹھ (۵۹) طلباء کو خارج کر دیا گیا۔" (ص ۴۶۷)

اسی کے ساتھ دارالعلوم کے کئی ملازمین کو بھی برخاست کر دیا گیا، حضرت مدنیؒ کو دوسرے ذرائع کے علاوہ جناب قاری صاحب کے خطوط سے بھی صورتحال کا علم ہوا تو آپ نے جناب مہتمم صاحب کو خطوط لکھے جن کا اقتباس درج ذیل ہے اور تمام مجلس شوریٰ کے ممبروں کو بھی خطوط لکھے۔ حضرت مدنیؒ کو طلباء کے ساتھ جو محبت اور تعلق تھا اس کی اصلی وجہ یہ کہ اس لادینی کے دور میں علوم دینیہ پڑھنے والوں کی ہمت افزائی کی جائے اور حتی المقدور ان کی کمزوریوں سے صرفِ نظر کیا جائے، چنانچہ کئی ایسے بے احتیاط طلباء کا جب اہتمام کی طرف سے کھانا بند ہو جاتا تھا تو حضرتؒ اپنے گھر سے کھانے کا انتظام فرما دیا کرتے تھے۔ بیک جنبشِ قلم ۶۰ طلباء کا اخراج اور متعدد ملازمین کو ملازمت سے برخاست کر دینا حضرت جیسا رحم دل کس طرح برداشت کر سکتا تھا! آپ نے اپنے خطوط میں فرمایا:۔

مکتوبؒ کا اقتباس: آپ نے مجلسِ شوریٰ کے ایک ممبر کو ایک طویل خط میں فرمایا:۔

....."یہ مسلمانوں کے نوجوان بچے ہیں، ناتجربہ کار ہیں، کم عقل ہیں، کیا ان کی مذہبی پرورش (جو کہ اس دورِ الحاد و زندقہ میں از بس ضروری اور قابلِ توجہ ہے) کا یہی طریقہ رہ گیا تھا؟ اپنے گھرانوں اور خاندانوں کے بچوں کو دیکھئے کہ ان سے کس قدر نافرمانیاں، نالائقیاں آئے دن صادر ہوتی رہتی ہیں اور آپ طرح بطرح دیتے رہتے ہیں، یہ بھی تو آپ ہی کے بچے ہیں ان پر ایسا نادرشاہی حکم کیوں صادر فرماتے ہیں، اور ہمیشہ کے لیے علوم دینیہ اور معارفِ الٰہیہ سے محروم کر رہے ہیں! بیشک اُن کی تربیت کیجئے، سرد اور گرم معاملہ برتیے مگر نہ اس طرح جیسا کہ کر چکے ہیں اور غالباً آگے بھی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کیا وہ طلبہ جن کو ہمیشہ مہمانانِ رسول علیہ السلام کہا جاتا تھا اور لوگوں کو چندہ اور کھانے کی ترغیب ایسے ایسے الفاظ سے دی جاتی تھی، ان کی یہی گت ہونی چاہیئے جو آپ نے مطبخ بند کر کے دو تین دن کی مہلت سے جرنیلی حکم دے کر اُن کی تمام اشیاء نیلام کرا کے ظاہر فرمائی ہے، ایسا تو کھا حکم نہ ہم نے کسی عربی مدرسہ میں دیکھا اور نہ سنا، نہ انگریزی مدارس میں نہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں نہ ہندوؤں کی درسگاہوں میں! آج ذرا آنکھیں اُٹھا کر اہلِ بنارس کی ہندو یونیورسٹی کو دیکھ لیجئے، انہوں نے

کیا گیا، طلبہ نے کیا کیا، گورنمنٹ نے کیا کیا؟ پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ درسگاہ جو کہ تین لاکھ روپیہ سالانہ گورنمنٹ سے لیتی ہے وہ تو اس قدر بے حواس نہ ہو اور آپ اس قدر مضطرب، فاقد الحواس ہو جائیں، یہ کیا معاملہ ہے؟

کیا یہی طریقہ حضرت شیخ الہندؒ کا تھا، کیا یہی طریقہ حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہم اللہ تعالیٰ کا تھا، کیا یہی طریقہ عام مسلم پبلک اور حضرات اپنی اولادوں اور چھوٹوں سے برت رہے ہیں، اور اگر ایسا نہیں ہے تو دارالعلوم کے نادار، غریب الوطن نوجوان طلبہ کے ساتھ یہ سلوک کیوں روا رکھ رہے ہیں؟ معاف فرمائیں یہ کلمات مخلصانہ شکایات ہیں معاذ اللہ آپ کے وقار اور پرسٹیج پر حملہ نہیں ہے، اگر میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں تو آئندہ کے لیے جلد سے جلد اصلاح فرمائیے اور اگر آپ کے نزدیک میری عرائض گوزِ خر ہونے کے لائق ہیں تو "کالائے بد بریش خاوند"۔ انا للہ وانا الیہ راجعون"۔ (مکتوبات جلد ۱ ص ۳۷۷، ۳۷۸)

دوسرا خط جناب قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے نام ارسال فرمایا۔

"محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج مبارک، مفصل والا نامہ باعثِ سرفرازی ہوا، یاد آوری کا شکر گذار ہوں، آپ نے میری عرائض کی طرف توجہ فرمائی اس کا شکریہ پیش کرتا ہوں۔ جناب کے والا نامہ سے بہت سی غیر معلوم باتیں معلوم ہوئیں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزاء خیر عطا فرمائے اور آپ کی مدد فرمائے اور اپنی خاص نعمتوں سے نوازے۔ آمین

آپ نے طلبہ کے داخلے میں جس اعلیٰ حوصلگی اور وسعتِ قلبی کا ثبوت دیا ہے بلاشک موجب اجرِ جزیل اور شکرِ جمیل ہے۔ میرے محترم! قومی اور اجتماعی کاموں میں ایلوے کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں بلکہ جس قدر زیادہ خدمات انجام دینی ہوتی ہیں اسی قدر زیادہ صبر اور تحمل کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو بہت ہی زیادہ مصائب کا سامنا ہوتا ہے، اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالامثل مثل شاہدِ عدل ہے۔ قرآن میں جس قدر صبر کے لیے آیات ہیں کسی اور خلق اور امر کے لیے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت بڑا منصب دیا ہے اس میں آپ کو بہت زیادہ تحمل اور صبر کی ضرورت اور بہت زیادہ خدمتِ خلق کا موقع ہے۔ جس طرح آپ کے لیے خدماتِ مفوضہ باحسن وجوہ انجام دینے پر بہت زیادہ اجر و ثواب بھی ہے۔ میرے محترم! ان کاموں کو انجام دینے میں اجتماعی فلسفہ ہی کو کام میں لانا پڑے گا، انفرادی اشغال میں

آپ مخلی بالطبع ہو سکتے ہیں اور استبداد کو کام میں لا سکتے ہیں کوئی آپ کا معارضہ نہیں کر سکتا، راحت اور آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں مگر اجتماعی زندگی کا فلسفہ ہی اور ہے، یہاں قدم قدم پر کانٹے ہیں اور دلآزاری ہے۔

بھنورا لو بھی پھول کا، کلی کلی رس لے
کانٹا لاگے پریم کا تڑپ تڑپ جیوے

مت گھبرائیے اور صبر و استقلال اور اعلیٰ ہمّتی اور خوشدلی کے ساتھ اس باغ محمدی علیہ السلام کو سرسبز و شاداب کیجئے، فیوضِ قاسمی کو چار دانگ عالم میں منتشر کیجئے، ٹھوکریں لگیں گی تو آہ مت کیجئے، لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ " (الاحزاب ۲۱)

صبر کن حافظ بسختی روز و شب
عاقبت روزے بیابی کام را

اخلاص و للّٰہیت، تقویٰ اور خشیت کو ہاتھ، دل وجان میں محفوظ رکھیئے، یہی رشیدیت ہے، یہی قاسمیت ہے، یہی امدادیت ہے کان اللہ فی عونکم۔ زمانہ کی تیز و تند ہوائیں چلیں گی، سمندروں کی موجیں تھپیڑے ماریں گی، خواہشات کے زلزلے آئیں گے، اصحاب اغراض جھڑ جھڑائیں گے مگر آپ کو کوہ ہمالیہ بننا چاہیئے، پرواہ مت کیجئے اور سعی پیہم میں مردانہ وار گامزنی کرتے رہیئے، حضرتِ قاسم قدس سرہ العزیز نے لوگوں کی چلمیں بھر بھر کر اور پاؤں دبا دبا کر ان کو راہ پر لانے کا شیوہ اختیار کیا تھا تو ان کے اخلاف صدق کو اس میں عار نہ آنا چاہیئے اور نہ گھبرانا چاہیئے اور ہمّت بلند ہی رہنی چاہیئے، حسن تدبیر اور حکمتِ صدق کو اختیار کر کے سلف صالح اور ان کے فیض کو زندہ کرنا چاہیئے۔ ہم ناکارے بدنام کنندہ نکونامان آپ کے ساتھ ہیں، حسب طاقت خدمات انجام دیتے رہے اور ان شاءاللہ دیں گے۔ واللہ یھدینا وایاکم لما یحب ویرضی۔ آمین

والسلام، ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ (مکتوبات جلد ۲ ص ۱۸۳ تا ۱۹۱)

دوسرا مکتوب گرامی بنام قاری محمد طیب صاحب!

محترما! میں نے جو کچھ لکھا تھا کہ ہم تینوں کا اشتراکِ عمل مدرسہ کے بہبود اور ترقی کے لیے ضروری ہے، اس کا مطلب یہی تھا کہ اپنی انفرادی زندگی کے لیے تو ہر ایک ایسے سامان رکھتا ہے کہ جن کی بناء پر کسی کو کسی کی حاجت نہیں مستقل طور پر گذر بسر کرتا اور کر سکتا ہے مگر دارالعلوم کی بہبود اور ترقی کے لیے ہم تینوں (مولانا عثمانی، قاری صاحب،

اور حضرت مدنیؒ) میں سے ہر ایک کو ایک دوسرے کی حاجت ہے، آپس میں سر جوڑ کر ہم اپنی جدّ و جہد جاری رکھیں، تمام امور میں مشورہ کریں اور یک جہتی سے کام کریں، صاف دلی کے ساتھ دُوسرے کے مشورہ کو قبول کریں، کبھی اپنی رائے پر ہٹ نہ کریں جو مفید اور حق بات ہو قبول کریں خواہ اپنی رائے کے خلاف ہی ہو اپنی بات کی پیچ نہ ہونی چاہیئے جیسا کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ العزیز کی ہدایت ہے، منفرد ہو کر یا آمر و ڈکٹیٹر بن کر کام نہ چلائیں، مَیں نے اپنے آپ کو آج تک امورِ مدرسہ بالخصوص انتظامات میں اسی درجہ کا سمجھا ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے ممبروں نے بھی ہم تینوں کو یہی درجہ دیا ہے، بحیثیتِ اہتمام اگرچہ قوتِ عاملہ آپ کے ہاتھ میں ہے اور تھی مگر یہ قید کہ تینوں کی رائے کا اعتبار ہو اور اختلافِ رائے میں کثرتِ رائے کا اعتبار ہو اسی لیے تھی، ممکن ہے کبھی آپ نے میرے اکھڑ پنے کی وجہ سے یہ خیال فرمایا ہو کہ یہ اپنی بات منوانا چاہتا ہے اور آمریت کو عمل میں لاتا ہے مگر میرے دل میں کبھی مشاورے سے زیادہ کا خیال نہیں رہا ہے اور بسا اوقات مَیں نے اپنی رائے کے خلاف آپ حضرات کی رائے کے سامنے سر جھکایا ہے، ہاں بعض طلبہ کے داخلہ یا امداد کے مسئلہ میں البتہ اتنا زور دیتا رہا ہوں، اور اس مرتبہ بھی جب مجھے یہ معلوم ہُوا کہ آپ دونوں حضرات نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تقریباً اسّی طالب علم مدرسہ سے بالکل خارج کر دیئے جائیں، اس کا مجھے سخت صدمہ ہُوا، اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ موجودہ زمانہ میں جس قدر بھی ہم سے ممکن ہے لوگوں کو مسلمان اور صحیح العقیدہ مسلمان بنائیں اور حسبِ فرمانِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام فاستوصوا بھم خیراً[1] ممکن سے ممکن درجہ تک طلباء کو راہِ راست تک کھینچیں تاکہ یہ نوجوان پڑھ لکھ کر اپنی حالت بھی درست کریں اور اسلام کے سچے مُبلّغ بنیں، اخراج کرنا اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم کر دینا ہے اور ہماری انتہائی سزا ہے جس سے بہت سے خطرات ہیں، شدید ضرورت اور انتہائی معصیت کے وقت میں اس کو استعمال کرنا چاہیئے، اس لیے بطور مشورہ ہر دو عریضہ میں لکھا تھا مجبور کرنا ہرگز ہرگز مقصود نہ تھا، میں ہمیشہ کا خادم ہوں مگر نالائق، آپ حضرات بالخصوص حضرت نانوتوی قدس سرہٗ العزیز کے خاندان کا خیر خواہ مگر اکھڑ دریوزہ گر ہوں، ناکارہ غلام

---

[1] یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ایک طویل ارشاد کا ایک حصّہ ہے جس میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم نے اہلِ مدینہ کو ارشاد فرمایا کہ تمہارے پاس لوگ دین سیکھنے کے لیے آئیں گے تم خود بھی ان کا احترام کرو اور ان کے ساتھ بھلائی کرو اور دوسروں کو بھی بھلائی کرنے کی وصیت کرو۔

ہوں مگر بیوقوف، میری عین خواہش ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاف اُس طریقہ پر مضبوطی سے قائم رہیں جس پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ چلتے رہے اور جس پر ہم دُور اُفتادوں کو چلایا۔ میں جب ان اخلافِ صدق میں سے کسی کو اس طریقہ سے دُور اور خلاف پاتا ہوں تو بہت زیادہ متاثر ہوتا ہوں، چونکہ زور کچھ نہیں اس لیے گُھٹ کر رہ جاتا ہوں اور کنارہ کش ہو جاتا ہوں، نیز چونکہ گوناگوں افکار میں مبتلا رہتا ہوں مشغولیتیں بہت زیادہ رکھتا ہوں اسلئے بھی انتزاع کیاجاتا ہے کہ یہ ہم سے کنارہ کش ہے ورنہ حقیقت یہ نہیں، میرا کبھی بھی یہ خیال نہیں ہے کہ معاذ اللہ خاندانِ قاسمی کو کوئی گزند پہنچے ارادہ اور عمل تو درکنار، اگر کسی بات سے یہ انتزاع کیا جائے تو یہ غیر صحیح ہو گا۔

بہر حال اس اجتماع میں بھی اور آئندہ میں بھی جو صورت حقیقی مفاد دارالعلوم اور ملتِ اسلامیہ کی ہو اُسے اختیار فرمائیں، ہرگز ہرگز شخصی اور بالخصوص حسین احمد کے مفاد پر ترجیح نہ دیں، نہ دارالعلوم حسین احمد پر موقوف ہے اس کے جیسے نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر ہزاروں درجہ بڑھ کر آپ کی جماعت میں جو کہ اسلاف کرام کے دریوزہ گروں کی جماعت ہے، علمائے کرام اور صلحائے عظام موجود ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے تو تنکے سے کام لے لیتا ہے اور پہاڑ رہ جاتا ہے۔ حضرت مولانا فخر الحسن صاحب (محشی کتب احادیث) اور مولانا عبدالعدل صاحب حضرت نانوتوی قدس سرہ العزیز کے شاگردوں میں سب سے زیادہ ذکی حفظ اور ذہن وغیرہ اعلیٰ درجہ رکھنے والے تھے مولانا احمد حسن صاحب امروہوی دوسرے درجہ میں تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عنایت بھی ان پر سب سے زیادہ تھی ہمارے آقا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ان سب میں گرے ہوئے شمار کیے جاتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کے ذریعہ سے جو کام لیا وہ اِن میں سے کسی سے نہیں ہوا اور نہ ہو سکا، آج فیضِ قاسمی عالم میں میزابِ محمودی سے جاری ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں شاہ محمد اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ سب سے زیادہ غبی مشہور تھے مگر خاندانِ ولی اللّٰہی کا فیض ان ہی سے جاری ہوا، بڑے بڑے مشاہیر علماء اور اذکیاء دھرے رہ گئے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ دارالعلوم کا فیض چلانا چاہے گا تو ایک تنکے سے وہ کام لے گا جن کا وہم و گمان بھی کسی کو نہیں ہو سکتا، حسین احمد کی زندگی اور معیشت بھی دارالعلوم پر موقوف نہیں مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا کی بناء پر خالق کہیں نہ کہیں رزق پہنچائے گا، ان شاء اللہ۔ اس لیے میری مشروط ملازمت میں اگر کلام ہے یا میرے عقیدے یا دستور العمل میں کلام ہے تو مفادِ دارالعلوم اور ملت کو سامنے رکھ کر آپ اور ممبران تجویز فرمائیں، مجھ کو جو کچھ اپنے اکابر سے پہنچا ہے اس کو چھوڑ نہیں سکتا نہ چھوڑوں گا (ان شاء اللہ) باقی جو کچھ میری

سمجھ میں بہتری کا ذریعہ آئے گا عرض کرتا رہوں گا، باقی اپنے منشاء پر مجبور کرنا نہ میرا منصب ہے اور نہ کبھی ہوا، تقدیر الٰہی میں نہ تھا کہ میں شریک اجلاسِ شوال ہوتا اور بظاہر اس اجلاس میں بھی شرکت کی کوئی اُمید نہیں ہے اللہ تعالیٰ آپ حضرات کی اعانت فرمائے اور اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائے۔ والسلام

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ (از جیل مراد آباد)

(مکتوباتِ شیخ الاسلام جلد دوم ص۱۹۲ تا ص۲۰۷)

تبصرہ از مرتب "چراغ محمد"

(۱) حضرت مدنیؒ کے ان خطوط کا پس منظر سمجھنے کے لیے اس بات کا سمجھنا ضروری ہے کہ یہ نزاع اور اختلاف صرف طلبہ کے اخراج کے سلسلہ میں نہ تھا بلکہ یہ تو حضرتِ مدنیؒ کے دارالعلوم دیوبند سے علیحدہ کرنے کے لیے پہلا قدم تھا جس کے بعد کے متوقع واقعات کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ:۔

پہلے مرحلہ پر تو تقریباً اسی اُن طلباء کو مدرسہ سے خارج کر دیا جو حضرت مدنیؒ کے جان نثار تھے اور اُن پر الزام یہ لگایا کہ انہوں نے احتجاجی جلسے کیے اور جلوس میں ہلڑ بازی کی۔ چونکہ حضرت مدنیؒ سب صورتحال سے باخبر تھے، خود جناب قاری محمد طیب صاحبؒ[1] آپ سے جیل میں ملاقات کر چکے تھے، لیگی اخبارات اور دوسرے وہ اخبارات جو دارالعلوم کی بربادی کے منتظر تھے ان اطلاعات کو خوب جلی سُرخیوں کے ساتھ شائع کر رہے تھے، اس لیے حضرت مدنیؒ نے طلباء کے اخراج کو دارالعلوم کے لیے اور خود اُن طلباء کے لیے نامناسب سمجھ کر جناب قاری محمد طیب صاحبؒ کو خطوط کے ذریعہ مطلع فرمایا۔

دوسرا مرحلہ یہ ہونا تھا کہ ان طلباء کے اخراج کے بعد اُن اساتذہ کا اخراج تھا جن کا تعلق حضرت مدنیؒ کے ساتھ سمجھا جاتا تھا اُن میں استاذ العلماء حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ خصوصی نشانہ تھے، مرحوم نے ۱۳۴۵ھ کی اسٹرائک میں مستعفی حضرات کا ساتھ دینے کی بجائے دارالعلوم کی خدمت کو ترجیح دی تھی، حضرت مدنیؒ نے ان حضرات کے بارہ میں خصوصیت کے ساتھ حضرت شیخ الہندؒ کے نواسہ مولانا محمد عثمان صاحب کو خط لکھا جو درج کیا جا رہا ہے:۔

"ہم کو دارالعلوم سے نکالا جائے ہم خوش ہیں رکھا جائے ہم خوش ہیں، رزق کا

---

[1] جناب قاری صاحب نے جب حضرت مدنیؒ سے جیل میں ملاقات کی تو حضرت مدنیؒ نے فرمایا، حضور! جس جلسہ میں تقریر کے جرم میں مجھے جیل میں ڈالا گیا ہے اس کی صدارت تو آپ نے کی تھی اور آپ باہر مزے اڑا رہے ہیں۔ حضرت قاری صاحبؒ نے عرض کیا جناب اس وقت تو میں بھی جیل ہی میں ہوں۔

کفیل دار العلوم نہیں اللہ تعالیٰ ہے۔ عزیزم! ان احوال کی وجہ سے پریشان نہ ہو، واقعات اور حقیقت کو تاریخ وار قلمبند رکھو اور صبرِ جمیل اختیار کرو، زبان بند رکھو اور آنکھوں سے دیکھو مگر کچھ نہ بولو پھر دیکھو قدرت کیا کرتی ہے وہ بے نیاز اور بے پرواہ بھی ہے اور سب سے زیادہ رحمت اور رحمت والا بھی ہے، اس کا ظاہری ہاتھ بھی ہے اور خفیہ ہاتھ بھی، کچھ فکر مت کرو، کسی کو مت سناؤ، واللہ معکم اینما کنتم! اور اگر واقعات اور افواہات ستایا کریں تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ (شیخ الہندؒ) کی زندگی یاد کرو اور اگر اس پر بھی قلبی سکون حاصل نہ ہو تو مزار پر جا کر تھوڑی دیر بیٹھ کر ایک دو پارے پڑھ کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے بزرگوں کو بخش دیا کرو، یہی بات مولانا محمد جلیل صاحب اور مولانا اعزاز علی صاحب سے بھی کہہ دو اور اگر مولانا نافع گل صاحب آئیں تو ان سے بھی کہہ دو، یہی میری استدعا مولانا سلطان الحق صاحب اور منشی محمد شفیع صاحب سے بھی ہے۔" (مکتوبات جلد ۱ ص۲۳)

تیسرے مرحلہ پر حضرتؒ کا اخراج تھا جس کے حکم کا انتظار ہو رہا تھا بلکہ مٹھائیوں کا انتظام ہو رہا تھا، حضرت مدنیؒ نے اس کے لیے اپنے معتمدِ خاص اور منتظم امورِ خانگی جناب قاری اصغر علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو مندرجہ ذیل ہدایت نامہ ارسال فرمایا:۔

"میری علیحدگی کا حکم آجانے کے بعد مدرسہ کا مکان خالی کر دیا جائے، سامان ٹانڈہ پہنچا دیا جائے، زیرِ تعلیم بچوں کو مدرسہ قاسمیہ مسجد مراد آباد میں داخل کرا دیا جائے۔" (شیخ الاسلام مدنی ص۵۵۸)

مگر تقدیرِ خداوندی نے یوں حق کا فیصلہ فرمایا کہ صدر مہتمم صاحب کے پہلے آمرانہ حکم پر مجلسِ شوریٰ نے صدر صاحب کے اختیارات محدود کرنے کی تجویز پاس کر دی کہ یہ دار العلوم اکابر کی مقدس امانت ہے جس کے نظم و نسق کے لیے باقاعدہ مجلسِ شوریٰ موجود ہے، اس لیے صدر صاحب کوئی حکم صادر کرنے سے پہلے شوریٰ سے منظوری لے لیا کریں۔ چونکہ شوریٰ کا یہ فیصلہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کیلئے رکاوٹ تھا اس لیے صدر مہتمم نے دار العلوم سے کنارہ کشی فرمالی، جس کا اعتراف "حیاتِ عثمانی" کے مؤلف نے یوں کیا ہے:۔

علامہ عثمانیؒ کا صدارتِ اہتمام سے تنفر اور دارالعلوم دیوبند سے خود علیحدگی کے اسباب

علامہ ان حالات میں گھر کر صدارتِ اہتمام سے بددل ہو گئے، اور اس پر طرّہ یہ کہ آپ کے اختیاراتِ صدارت بھی محدود کر دیئے گئے اس لیے آپ نے خود بخود دارالعلوم میں آنا جانا بند کر دیا، اپنے ۹ رجب سنہ ۱۳۶۲ھ کے بیان میں فرماتے ہیں:۔

"واقعہ یہ ہے کہ شوریٰ کے ریزولیوشن میں اوّلاً تو صدر مہتمم کے جملہ فرائض اور اختیارات سلب کر لیے گئے، یہ تو تعطّل ہوا، آخر میں یہ لکھ دیا کہ "جس وقت مہتمم صاحب موجود نہ ہوں اور کوئی فوری ضرورت تقرر و برخاستگی کی پیش آئے تو صدر مہتمم صاحب عمل میں لا کر جلسۂ انتظامیہ میں پیش کر دیں" یہ ہے وہ اختیار جو صدر مہتمم کو دیا گیا، یعنی تعطّل کے بعد اس کا تنزّل اس طرح کیا گیا کہ اسے صدر مہتمم ہونے کے بجائے فوری معاملات میں نائب مہتمم بنا دیا گیا ہے"

اس تحریر سے واضح ہے کہ تحدیدِ اختیارات کے بعد مدرسہ کے امور میں دخل دینا وہ اپنی بے عزتی سمجھتے تھے اور اس لیے وہ اپنے گھر بیٹھ رہے۔ (حیاتِ عثمانی ص ۴۷۱،۴۷۰)

(۲) یہ خطوط حضرت مدنیؒ کے مکاتیب کے مجموعہ جلد اوّل اور جلد دوم سے نقل کیے گئے ہیں جبکہ حضرتِ مدنیؒ اور حضرتِ قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہم زندہ تھے، حضرت قاری صاحبؒ نے ان خطوط کو ملاحظہ فرما لیا اور ان کی اشاعت میں کمی بیشی یا اور کوئی تنقید نہیں فرمائی جس سے معلوم ہوا کہ جن حالات کو ان خطوط میں بیان کیا گیا ہے وہ بالکل درست تھے۔

(۳) حضرتِ مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ نے پوری وضاحت اور انشراحِ صدر کے ساتھ دارالعلوم کی بقاء کے لیے ہر اُس اقدام کا خیر مقدم فرمایا جس سے دارالعلوم کو فائدہ ہو خواہ اُن کو کوئی بھی نقصان ہو جائے مگر وہ دارالعلوم کو بزرگوں کی مقدس امانت سمجھ کر اس کی بقاء کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہیں۔

(۴) خصوصاً مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے مجاہدانہ کردار کے پیشِ نظر اُن کے خاندان کی ہر ممکن خدمت کو شرف سمجھتے ہیں اور ان کو ہر نقصان والی تجویز کو ناپسند فرماتے ہیں۔

ایک مغالطہ اور اس کا جواب

یہ کہا جاتا ہے کہ مولانا عثمانیؒ دار العلوم سے دار العلوم میں کانگریسی اثر و نفوذ کی وجہ سے کنارہ کش ہو گئے تھے (جیسا کہ حضرت مدنیؒ کے مخالف اکثر یہی الزام بیان کر دیتے ہیں) حالانکہ یہ بات سراسر غلط ہے، بلکہ جب مجلس شوریٰ نے اُن کے اختیارات محدود کر دیئے تو وہ کنارہ کش ہو گئے، جیسا کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے فرمایا ہے:۔

"دستورِ اساسی کی رُو سے کلیتہً علمی اور انتظامی ذمہ داریاں مہتمم صاحب سے متعلق تھیں اس لیے ذی الحج ۱۳۶۱ھ میں مجلس (شوریٰ) نے وقتی حالات کے قدرتی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام ——— اختیارات مہتمم صاحب کی جانب منتقل کر دیئے اس تجویز کی رُو سے صدر مہتمم کی حیثیت صرف ایک آئینی نگران کی پائی اور انتظامی امور سے صدرِ مہتمم کا تعلق منقطع ہو گیا" (تاریخ دار العلوم دیوبند جلد ۱ صفحہ ۳۱۰)

اِس پر مؤلف "حیاتِ عثمانی" کا تبصرہ ملاحظہ ہو:۔

"——— تحدیدِ اختیارات کے بعد مدرسہ کے امور میں دخل دینا وہ اپنی بے عزتی سمجھتے تھے اور اس لیے وہ اپنے گھر بیٹھ رہے، ۷ رجب ۱۳۶۲ھ کی مجلس شوریٰ بروز سہ شنبہ کی نشست زیرِ صدارت حکیم مولانا محمد اسحاق جاری ہوئی جس میں حسب ذیل اراکینِ مجلس شوریٰ نے شرکت کی، اس سے بھی مولانا عثمانیؒ کی خود علیحدگی پر روشنی پڑتی ہے۔

ارکانِ مجلسِ شوریٰ دار العلوم دیوبند

(۱) حکیم مولانا محمد اسحٰق صاحب (۲) مولانا حکیم محمد یٰسین صاحب (۳) مولانا مشیت اللہ صاحب بجنوری (۴) مولانا محمد اشفاق صاحب رائپوری (۵) مولانا محمد ابراہیم صاحب راندیری (۶) مولانا محمد اعزاز علی صاحب (۷) مولانا مناظر احسن گیلانی (۸) نواب عبد الباسط خانصاحب حیدر آباد دکن (۹) خان بہادر شیخ ضیاء الحق صاحب (۱۰) مولانا حافظ محمد یوسف صاحب (۱۱) مولانا محمد طیب صاحب مہتمم (۱۲) خان بہادر حاجی شیخ رشید احمد صاحب

چونکہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب ان دنوں جیل میں تھے اور ان کی جگہ مولانا اعزاز علی صاحب شریک ہوئے۔

رسالہ دار العلوم ماہ رجب و شعبان ۱۳۶۲ھ میں کاروائی اس طرح درج ہے:۔

"۷ رجب کو صبح سے دوسری نشست شروع ہوئی حضرت مولانا مناظر احسن صاحب

نے اعتراض فرمایا کہ چونکہ اس جلسے کا دعوت نامہ مولانا شبیر احمد عثمانی کو باوجود رکن مجلس ہونے کے نہیں بھیجا گیا اس لیے یہ جلسہ غیر آئینی ہے اور اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ اُن کو اب دعوت نامہ بھیجدیا جائے۔ اس اعتراض کے جواب میں مجلس انتظامیہ منعقدہ ۱۸ جمادی الاخری ۱۳۶۲ھ کی تجویز پیش کی گئی کہ چونکہ حضرت مولانا عثمانی کے ایک والا نامہ منسلکہ سے واضح ہے کہ بحیثیتِ صدر ان سے خطاب نہ کیا جائے (اور ان کی رُکنیتِ شوریٰ بحیثیت صدر مہتمم ہی ہے) اسلیئے انہیں دعوت نامہ نہیں بھیجا گیا" (رسالہ دار العلوم رجب و شعبان ۱۳۶۲ھ ص ۳،۲)

علامہ عثمانیؒ کی اس جوابی تحریر سے کہ بحیثیت صدر مہتمم ان سے خطاب نہ کیا جائے، اس امر کی غمازی ہوتی ہے کہ وہ صدارت سے خود یکسو ہو کر دار العلوم سے دستکش ہو گئے اور آپ کی وجہ سے نواب عبد الباسط خانصاحب حیدرآباد دکن ممبر مجلسِ شوریٰ دار العلوم دیوبند اور حکیم مقصود علی خان صاحب حیدرآباد دونوں نے استعفاء دیدیا تھا لیکن مجلسِ شوریٰ نے منظور نہیں کیا تھا اس لیے اصرار کے بعد نواب صاحب نے اپنا استعفاء واپس لے لیا۔

اسی مجلسِ شوریٰ میں خان بہادر حاجی رشید احمد صاحب کی تجویز اور خان بہادر شیخ ضیاء الحق صاحب کی ترمیم حسبِ ذیل پیش ہوئی:-

"شخصیت اور مصلحت کے لحاظ سے ضروری ہے کہ مولانا شبیر احمد صاحب کا تعلق دار العلوم سے کسی مناسب طریقے پر باقی رکھا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ رُکنیت مجلسِ شوریٰ کی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک روز پہلے انتقالِ پُر ملال کے باعث خالی شدہ اسامی پر بحیثیتِ رکنِ مجلسِ شوریٰ کے لے لیے جائیں۔" (دار العلوم بابت رجب، شعبان ۱۳۶۲ھ ص ۴)

لیکن اس تجویز کی حافظ محمد یوسف صاحب نے سخت مخالفت کی اور فرمایا:-

"مولانا عثمانیؒ نے دار العلوم اور مجلسِ شوریٰ کے خلاف اخبارات میں جو بیانات دیئے ہیں وہ ممبرانِ شوریٰ کے لیے باعثِ توہین اور دار العلوم کے لیے موجبِ نقصان ہیں تا وقتیکہ مولانا ممدوح اُن کی تلافی نہ فرمائیں اس رُکنیت کی تجویز کا نفاذ نہ ہوگا"

(دار العلوم بابت رجب و شعبان ۱۳۶۲ھ ص ۴)

اور اگر کانگریس کے نفوذ کا الزام درست مان بھی لیا جائے تو یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ۱۳۴۶ھ میں پہلی سٹرائک کے موقع پر تو حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ سلہٹ میں تھے اور کانگریس کا کوئی بھی ممبر دار العلوم دیوبند میں مدرس

تھا نہ ملازم تھا نہ شوریٰ کا ممبر تھا بلکہ اُس وقت تو سرپرست حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رح تھے پھر کیوں دارالعلوم سے اس قدر جماعت کے ہمراہ تعلق منقطع کیا گیا تھا؟ بات بالکل سیدھی سی ہے جس کو جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب رح فرما چکے ہیں اور اس کو ہم نے اس مضمون کے شروع میں درج کر دیا ہے۔ یعنی "جو تحریک سنہ ۱۳۴۶ھ میں شروع ہوئی تھی وہ سنہ ۱۳۶۲ھ میں (ناکامی کی صورت میں) اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی۔"

سنہ ۱۳۴۶ھ کی طرح اس دفعہ بھی (سنہ ۱۳۶۲ھ میں) آپ کے ساتھ دارالعلوم کے جلیل القدر استاذ حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی بھی تشریف لے گئے مگر جلد ہی اپنے مرکز پر واپس آگئے اور حضرت مدنی رح کے وصال کے بعد آپ تادم واپسیں دارالعلوم کے صدر مدرس رہے۔

دارالعلوم دیوبند کے کانگریسی ہونے کا مشاغبہ اب بھی بعض معاندین کی طرف سے رہتا ہے حالانکہ یہ الزام صرف الزام ہے، دارالعلوم کا کوئی مدرس کانگریس تو بجائے خود جمعیۃ العلماء کا بھی ممبر نہ تھا، نہ کوئی ملازم اور نہ کوئی طالب علم ممبر تھا بلکہ حضرت مدنی رح تو طلباء کو زیادہ طور پر اپنی توجہ صرف تعلیم پر مرکوز رکھنے کا فرمایا کرتے تھے حتیٰ کہ طلباء کو بیعت بھی نہ فرماتے تھے، آپ خود علی الاعلان جمعیۃ العلماء کے ممبر اور پھر صدر منتخب ہوئے، کانگریس کے سرگرم رکن تھے۔

ف :- حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے سیاسی تقریر، اجلاس، جلوس وغیرہ میں کبھی بھی اپنے آپ کو دارالعلوم دیوبند کا نمائندہ نہیں فرمایا بلکہ جمعیۃ العلماء کی نمائندگی فرماتے رہے، جیسا کہ مرتب "حیاتِ عثمانی" کو بھی اعتراف ہے کہ:-

"آپ (ایڈیٹر طلوع اسلام) کو واضح رہنا چاہیئے کہ حضرت مولانا مدنی رح دارالعلوم کی طرف سے کانگریس کی نمائندگی نہیں کر رہے تھے بلکہ جمعیۃ العلماء ہند دہلی کے صدر اور ممبر ہونے کی حیثیت سے کر رہے تھے۔" (حیاتِ عثمانی ص ۴۵۷)

◎

از ۱۹۴۴ء تا ۱۹۴۷ء

حضرتِ مدنیؒ مراد آباد جیل سے رہا ہوکر دیوبند تشریف لائے اور پھر فوراً حسبِ معمول سلہٹ تشریف لے گئے جہاں سے شوّال میں واپس آکر اپنے دینی، علمی، رُوحانی اور سیاسی مشاغل میں حسبِ سابق مصروف ہوگئے۔ بفضلہٖ تعالیٰ دارالعلوم دیوبند نے ان چند سالوں میں تعلیمی، تعمیری خوب ترقی کی، اور ساتھ ہی حضرتؒ کی جمعیۃ العلماء کے پروگرام کے مطابق سیاسی سرگرمیاں بھی تیز تر ہوتی گئیں، کئی اجلاس اور جلسے ہوئے، یہاں صرف ایک جلسہ کی کاروائی درج کی جاتی ہے جس سے حضرت مدنیؒ کی سیاسی بصیرت کا پتہ چلتا ہے کہ حضرت کس قدر اتحادِ ممالکِ اسلامیہ اور آزادئ ہند کے لیے بے قرار رہتے تھے اور اسے کس قدر ضروری سمجھتے تھے :۔

"آزاد ہند فوج کے جنرل شہنواز جب انگریزی حکومت کی مجوزہ پھانسی کی سزا سے قانونی طور پر ۱۹۴۵ء کے آخر میں رہا ہوئے تو یُو۔پی کے مشہور شہر مظفر نگر میں آپ کیلئے خیر مقدمی عظیم الشان جلسہ حضرت مدنیؒ کی صدارت میں منعقد ہُوا، آپ نے رات کو ایک مفصّل تقریر فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے، آپ نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ اسلام کے بنیادی دشمن ہیں، اگر ہندوستان متحدہ کرآزاد ہوگیا تو وہ خود دنیا کی طاقتوں میں صفِ اوّل پر شمار ہوگا اور اس کی دعوت پر تمام دنیا کی مسلم ریاستوں کو اکٹھا کر کے ایک متحدہ محاذ قائم کیا جاسکتا ہے جو یہود و نصاریٰ کے خلاف ایک زبردست چیلنج ہوکر دن بدن ترقی کرکے زینوں پر چڑھتا چلا جائے گا۔ اگر خدانخواستہ یہود و نصاریٰ کا بنایا ہُوا پلان و پروگرام کامیاب ہوگیا اور ہندوستان کی تقسیم عمل میں آگئی تو یہود و نصاریٰ کی طاقت پروان چڑھے گی اور دُنیا کی دوسری اقوام غلامی کی زنجیروں میں جکڑ بند ہوتے چلے جائیں گے، خصوصاً مسلمانوں پر ظلم وستم کی بجلیاں گرتی چلی جائیں گی اور پُرسانِ حال کوئی نہیں رہے گا، مسلمانوں کی پستی اور انحطاط کی کوئی حد نہ رہے

گی ۔" (حیات وکارنامے ص۵۱۲)

(ف) آزادی کی تحریک جاری تھی جس میں کانگریس عدم تشدد کے فلسفہ پر کاربند تھی کہ کانگریس کے ایک رکن سوبھاش چندر بوس نے کانگریس کے اس نظریہ سے بغاوت کرکے "فارورڈ بلاک" قائم کرلیا، اور مسلح طریق کار پر انگریزی حکومت کا تختہ الٹنے کا کام شروع کر دیا، انگریز نے سوبھاش کو گرفتار کرکے سخت سزائیں دیں، اٹک کے قلعہ میں بھی اسے محصور رکھا مگر سوبھاش موقع پاکر وطن سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور ہری پور ہزارہ کے مولانا حکیم عبد السلام صاحب مرحوم (جو کہ جمعیۃ علماء ہند کے صفِ اوّل کے با اعتماد رکن تھے) کی وساطت سے دریائے سندھ کو عبور کرکے آزاد قبائل سے ہوتا ہوا بالآخر حکومتِ جاپان سے جاملا اور انگریزوں کی فوج میں بغاوت کی تبلیغ کرتے ہوئے کئی فوجی افسر اور سپاہی اپنے ساتھ ملا کر آزاد ہند فوج کے نام سے اپنی فوج بنالی۔ کیپٹن شہنواز ضلع جہلم کے رہنے والے تھے اور انگریزوں کی فوج میں ملازم تھے اور اسلامی مجاھدانہ جذبہ رکھتے تھے، وہ بھی آزاد ہند فوج میں آملے، آزاد ہند فوج کا ترانہ اردو زبان میں تھا اس کی ایک رباعی درج ذیل ہے ؎

قدم قدم بڑھائے جا وطن کی لو لگائے جا
وطن ہی سے ہے زندگی وطن ہی پر لٹائے جا

سوبھاش کا نظریہ یہ تھا کہ جاپان کے ساتھ مل کر ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرالیا جائے گا مگر امریکہ کی انسانیت کش تدبیر سے ہیروشیما پر ایٹم بم گرانے کے بعد سارے پروگرام دھرے کے دھرے رہ گئے اور انگریزوں نے ان باغیوں کو گرفتار کرکے ان پر مقدمات چلائے، شہنواز کو جو آزاد ہند فوج میں جنرل کے عہدے پر فائز تھے پھانسی کی سزا دی گئی، بعد میں قانونی چارہ جوئی سے معاف ہوگئی اور شہنواز مظفر نگر پہنچے، جنرل شہنواز نے ہندوستان ہی میں اقامت اختیار کر لی تھی اور آزادی کے بعد حکومتِ ہند کے نائب وزیر ریلوے بھی مقرر ہوئے۔

مکتوباتِ شیخ الاسلام کی جلد ۲ ص۳۰۸ پر جنرل شہنواز کی ٹانڈہ ریلوے اسٹیشن کی منظوری کی مساعی کا ذکر کیا گیا ہے، جنرل صاحب بھارت ہی میں وفات پاگئے ہیں۔ غفراللہ لہٗ

حضرتِ مدنیؒ کی مخالفت اور اس کے اسباب ونتائج

کسی بھی انسان کی سیاسی رائے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور اس کے مفید یا غیر مفید ہونے پر رائے قائم کی جاسکتی ہے، حضرتِ مدنیؒ معصوم عن الخطاء نہ تھے ہوسکتا ہے کہ ان کا نظریہ ملک وملت کیلئے مفید نہ ہو، اس لیے اُن کی نظریاتی مخالفت کوئی معیوب امر نہیں مگر جب کسی معاملے میں اختلاف، مخالفت اور معاندت کا رنگ اختیار کرلیتا ہے تو وہ خطرناک ہوجاتا ہے۔ یہی صورتحال حضرتِ مدنی نوّر اللہ مرقدہ کے معاملہ میں رونما ہوئی تھی، مرحوم کے سیاسی افکار کی مخالفت کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں تاکہ مخالفت اور معاندت میں تمیز کی جاسکے۔

(۱) پہلا طبقہ اُن علماءِ کرام اور صوفیاءِ عظام کا تھا جنہوں نے اپنی اپنی بصیرت سے آپ کے سیاسی نظریہ کی مخالفت کی تھی اُن میں حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا مطلوب الرحمن عثمانیؒ جیسے علماءِ کرام شامل تھے۔ حضرت حکیم الامۃؒ کو آپ کی سیاسی رائے سے اختلاف دیانت کے طور پر تھا اور وہ اسی حد تک محدود تھا ورنہ حضرت تھانویؒ آپ کے علم، تقویٰ اور رُوحانیت کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اپنے دور کا فردِ وحید سمجھتے تھے، جس کی سب سے بڑی دلیل یہ دی جاسکتی ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اور دیگر جلیل القدر اساتذہ کے دار العلوم دیوبند سے مستعفی ہونے کے بعد اس عظیم مسند کے لیے صرف آپ ہی کا انتخاب کیا گیا تھا جبکہ حضرت تھانوی نوّر اللہ مرقدہٗ دار العلوم دیوبند کے سرپرست تھے اور حضرت مدنیؒ کے سیاسی افکار سے پوری طرح واقف تھے اور حضرتِ مدنیؒ کی شرائط (جن میں سیاسی امور بھی شامل تھے) کو آپ نے منظور فرمایا تھا اور مولانا عثمانی مرحوم کے صدر اہتمام تک آپ سرپرست ہی رہے۔ حضرتِ مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے بھی آپ کی روحانی، علمی، دینی وجاہت کو دل وجان سے تسلیم فرمایا ہوا تھا، تھانہ بھون کی آمد ورفت باقاعدہ جاری رہتی تھی، حضرت مدنیؒ خود بھی جلیل القدر روحانی راہ نما تھے مگر

طالبانِ سلوک کو تھانہ بھون جانے کا مشورہ دیا کرتے تھے بلکہ بعض دفعہ خود ساتھ لے کر اور سفارشی بن کر تشریف لے جاتے تھے، جیسا کہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو خود ساتھ لے کر تھانہ بھون تشریف لے گئے تھے۔ جس کی پوری تفصیل مولانا دریابادیؒ کی مرتبہ کتاب "نقوش و تاثرات" میں موجود ہے، یہاں حضرت مدنیؒ کا صرف ایک ارشاد ہدیۂ ناظرین ہے:۔

محبوبِ حقیقی تک رسائی حضرت تھانویؒ کی بارگاہ میں ارجیٰ ہے

تھانہ بھون کی تشریف ارزانی کے متعلق مجھ سے اجازت چاہنا عجیب بات ہے، مَیں تو ناکارہ ہوں اور اس امر کو ہمیشہ عرض کرتا رہا ہوں اور یہ کسرِ نفسی کی بنا پر نہیں بلکہ حقیقۃ الامر کی بنا پر، مگر میری عرض پر التفات نہ کیا گیا، اس سے بڑھ کر کیا چیز خوشی کی ہو سکتی ہے کہ محبوبِ حقیقی کی بارگاہِ اقدس تک رسائی ہو جو کہ حضرت تھانوی دامت برکاتہم کی بارگاہ میں ارجیٰ ہے۔۔۔ .... مَیں نے حسب الارشاد حضرت تھانوی دامت برکاتہم اور آپ حضرات کے اُس وقت بیعت کر لیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ مَیں اپنی سیاہ کاری پر نہایت زیادہ گریہ کناں ہوں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو مولانا تھانوی دامت برکاتہم کے دربار میں پہنچا دیا ہے اور مولانا کو آپ سے اور آپ کو مولانا سے اُنس پیدا ہو گیا ہے، اس لیے مناسب اور ضروری ہے کہ اب آپ مولانا سے بیعت بھی کر لیں، مجھے قوی اُمید ہے کہ اب مولانا آپ کو نہ ٹالیں گے، مَیں نے خود بھی اُن دنوں جب تھانہ بھون حاضر ہوا تھا حضرت مولانا سے عرض کیا تھا کہ آپ جب آئیں اور درخواست کریں تو جناب اُن کو ضرور بیعت کر لیں۔ قواعدِ طریقت کے اصول پر بیعت کر لینا ہی زیادہ تر مفید اور کارآمد ہے اور اس سے فیض کی زیادہ اُمید ہے۔ آپ بھی دعواتِ صالحہ میں یاد رکھیں اور حضرت مولانا سے بھی دُعا کی التجا کر دیں۔ (مکتوباتِ شیخ الاسلام سلوک و طریقت ص ۱۶، ۱۷)

اسی طرح حضرت تھانویؒ کی محبّت اور حضرت مدنیؒ کا روحانی مقام ان کی نظر میں کیا اور کیسا تھا؟ اس کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ۱۹۴۲ء میں حضرتِ مدنیؒ کی گرفتاری کی خبر سُنکر اُس دن خانقاہ کے سارے معمولات ترک کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:۔

"مجھے آج پتہ چلا ہے کہ مولانا مدنی کی میرے دل میں کس قدر محبت ہے!"

حضرت تھانوی جب کبھی حضرت مدنی (نوراللہ قبورہم) کی شان میں گستاخی کی خبر سُنتے تو فرماتے کہ:۔

"مولانا حسین احمد مدنی کی مخالفت کرنے والوں کے لیے سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ہے، جو لوگ حضرت شیخ الاسلام سے فساد و مخالفت رکھتے ہیں وہ اب بھی توبہ کرلیں اور اپنے حُسنِ خاتمہ کی طرف توجہ کریں"۔ (ماہنامہ الصدیق ملتان رجب ۱۳۶۰ھ ص ۳)

بعض ناواقف معاندوں نے حضرت مدنیؒ کی سیاسی سرگرمیوں پر اعتراض کرتے ہوئے جب حدِ ادب سے تجاوز کیا تو حضرت مولانا عبدالمجید صاحب بچھرایونی خلیفہ حضرت تھانوی قدس سرہ العزیز نے اُن سے فرمایا:۔

"شیخ الاسلام سے اس درجہ اختلاف نہ رکھیں کیونکہ میں نے مفتی محمود حسن صاحب امرتسری سے سُنا ہے جو حضرت تھانویؒ کے سب سے بڑے خلیفہ ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ حال میں میں نے دو ایک جواب مسائل سلوک میں پڑھے ہیں جن کی وجہ سے سابقہ اختلاف سے رجوع کرچکا ہوں کیونکہ باطنی دُنیا میں حضرت مدنیؒ کا مرتبہ اور مقام شہنشاہیت کا ہے۔ یہ سُنکر مولانا عبدالمجید صاحب نے فرمایا کہ بھائی یہ تو میں نے کئی بار حضرت تھانویؒ سے سُنا ہے کہ "مجھ کو اپنی موت پر بھی فکر تھا کہ بعد میں باطنی دُنیا کی خدمت کرنے والا کون ہے مگر حضرتِ مدنیؒ کو دیکھ کر تسلی ہوئی کہ یہ دُنیا ان سے زندہ رہے گی"۔ (بحوالہ تکملۃ الاعتدال)

اسی طرح مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو تحریر فرمایا:۔

"کوئی مضمون دینی بدون ملاحظہ مولانا حسین احمد صاحب شائع نہ کیا جائے"۔
(حکیم الامت ص ۱۰۳ بحوالہ تکملۃ الاعتدال)

اسی طرح ایک مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی صاحبؒ کو ہی تحریر فرمایا:۔

"میں نے مدت ہوئی فیصلہ کرلیا ہے کہ جن احباب سے دوستی ہے اُن سے عقائد و احکام میں گفتگو نہ کروں گا، یا تو خیریت کی اطلاع و استطلاع کا تعلق رکھوں گا یا دعا کا یا معالجہ نفسیات کی تحقیق کا، اور ایسے احباب کی فہرست میں جناب کا اور مولانا عبدالباری صاحب کا اور جناب سید سلیمان صاحب کا نام ذہن میں تجویز کیا ہے، ان دو صاحبوں کو بھی اطلاع دے چکا ہوں، ایسی تحقیقات کے لیے

مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا انور شاہ صاحب کی طرف توجہ دلاتا ہوں، اسی میں مصلحت ہے۔" (حکیم الامت ص۱۳۳ بحوالہ تکملۃ الاعتدال)

علّامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سیاسی مسلک کے لحاظ سے اُن حضرات میں سے ہیں جو مسلم لیگ کے ابتدائی ممبر ہی نہ تھے بلکہ قائد اعظم کے (جبکہ وہ صرف محمد علی جینا تھے) بہت بڑے مداح تھے، ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں قائد اعظم پر مندرجہ ذیل نظم پڑھی تھی ؎

اِک زمانہ تھا کہ اسرارِ دروں مستور تھے ۔۔۔ کوہِ شملہ جن دنوں ہم پایۂ سینا رہا
جبکہ داروئے وفا ہر درد کی درماں رہی ۔۔۔ جبکہ ہر ناداں عطائی بُو علی سینا رہا
جب ہمارے چارہ فرما زہر کہتے تھے اسے ۔۔۔ جس پہ اب موقوف ساری قوم کا جینا رہا
بادۂ حُبِّ وطن کچھ کیف پیدا کر سکے ۔۔۔ دَور میں یونہی اگر یہ ساغر و مینا رہا
ملّتِ دیریں کے گو اصلی قوا بے کار ہیں ۔۔۔ گوش شنوا ہے نہ ہم میں دیدہ بینا رہا

ہر مریضِ قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ اُمید
ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا[1] رہا

ناظرین با انصاف ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ علامہ سید سلیمان ندوی مسلم لیگ اور قائد اعظم کے کس قدر معترف تھے مگر ان کی نظر میں اپنے سیاسی مخالف شیخ الاسلام حضرت مدنی نور اللہ مرقدہما کا مقام کیا ہے؟ اس کے لیے مندرجہ ذیل تحریر شاہدِ عدل ہے ۔۔۔ جبکہ آپ ریاست بھوپال کے قاضی القضاۃ تھے آپ کی خدمت میں مولانا ظفیر الدین مفتاح رُکن دارالافتاء دارالعلوم دیوبند نے ایک دینی معاملہ کے سلسلہ میں راہنمائی طلب کی تو حضرت ندویؒ نے مندرجہ ذیل جواب ارشاد فرمایا :۔

"حضرت مولانا مدنی دامت فیوضہم کے مقابلہ میں میرا نام لینا صرف آپ کی چشمِ محبت کا کرشمہ ہے ورنہ میں تو اُن کے جُوتے کا تسمہ کھولنے کے بھی قابل نہیں۔" ع
چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک ، بزرگوں کا مشورہ ہے کہ خاک از تودہ کلاں بردار،

---

[1] اس زمانہ میں بہت سے لوگ اور بعض اخبارات محمد علی جناح کو محمد علی جینا لکھتے تھے۔ (روزنامہ جنگ راولپنڈی)

میرے پاس حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت کے سوا کچھ نہیں ۔"

(مکتوب گرامی ۱۲ نومبر ۱۹۴۶ء از بھوپال "الحرم" میرٹھ مدنی نمبر ص ۴۱)

نوٹ:۔ ڈاکٹر اقبال کے تین اشعار پر حضرت علامہؒ نے جو تنقید فرمائی ہے وہ مدنی اور اقبال کے عنوان میں آ رہی ہے۔

مولانا عظامی صدر مسلم لیگ جالندھر سیاسیات میں حضرتِ مدنیؒ کے شدید مخالف تھے لیکن جب جالندھر کے دو غنڈوں شمس الحق عرف شمسو اور فتح محمد نے اپنی اُس گستاخی کا اُن سے ذکر کیا، جو ۱۹۴۶ء میں جالندھر ریلوے اسٹیشن پر حضرت مدنیؒ کی شان میں کی تھی، تو مولانا عظامی نے اُن سے یہ فرمایا۔

"بڑ ہانک رہے ہو یا واقعی تم نے ایسا کیا اور اس پر فخر کر رہے ہو" جبکہ دونوں نوجوانوں نے تصدیق کی کہ فی الواقعہ یہ کر آئے ہیں، مولانا عظامی نے کہا اپنے ربّ سے معافی مانگو، مدنی اہل اللہ میں سے ہے جس نے مُدتوں روضۂ رسول کی اپنی پلکوں سے جاروب کشی کی اور آستانۂ اقدس کے سامنے بیٹھ کر حدیث پڑھائی ہے، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے وہ پانی میں ڈوب جائیں گے یا انہیں آگ چاٹ لے گی۔ ڈاکٹر اکرام الحق جالندھری راوی ہیں کہ اُن دونوں نوجوانوں میں سے ایک (فتح محمد) تقسیم کے وقت دریائے بیاس کی نذر ہو گیا اور دُوسرا (شمسو) پاکستان میں آکر پولیس کی معرفت ایک لیگی لیڈر ہی کے ہاتھوں آگ (تیزاب) کی بھٹی میں پھینک دیا گیا اور بھسم ہو گیا ۔"

(ہفت روزہ چٹان لاہور ــــ مارچ ۱۹۶۳ء)

اِس (شمسو) کی ہلاکت کی تفصیل بھی "عبرت کی جا ہے تماشہ کہیں جسے" کے عنوان سے آ رہی ہے۔

(۲) حضرتِ مدنیؒ کے سیاسی امور میں مخالفین کا **دُوسرا طبقہ** وہ ہے جو کہ غلط فہمی کی بنا پر پیدا ہو گیا تھا، ان میں علامہ سر محمد اقبال اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی قابلِ ذکر ہیں، ویسے تو کئی سعادت مندوں نے بعض اخبارات کی غلط اطلاعات پر جو معاندت اختیار کی تھی اُس سے اُسی وقت رجوع کر لیا تھا مگر بعض اہلِ علم حضرات نے غور و فکر کے بعد رجوع فرمایا۔

حضرت علامہ اقبال کے اختلاف اور رجوع کی تفصیل تو آنے والے اوراق میں بعنوان "حضرت مدنیؒ اور علامہ اقبال" آئے گی۔ یہاں اختصار کے طور پر عرض ہے کہ اوائل جنوری ۱۹۳۸ء میں حضرت مدنیؒ نے دلّی میں پُل بنگش کے قریب ایک جلسہ میں یہ فرمایا تھا کہ: موجودہ زمانہ میں قومیں وطن سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں۔ اس کو دلّی کے ایک اخبار "الامان" نے یوں شائع کر دیا کہ "ملّت کا انحصار وطن پر ہے"۔ علامہ نے اس سے متاثر ہو کر تین اشعار فارسی میں کہہ ڈالے، مگر پھر حقیقتِ حال پر مطلع ہوتے ہی ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کے اخبارات خصوصاً "احسان" لاہور میں علامہ اقبال کا رجوع شائع ہوا جس کے صرف ۲۳ دن بعد مؤرخہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ کا انتقال ہو گیا، جس کی خبر سنتے ہی مولانا مدنیؒ نے جبکہ آپ میرٹھ میں انجمن اصلاح المسلمین کے جلسہ میں تشریف لے جا رہے تھے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور رات کے جلسے میں تقریر سے پہلے سب حاضرین کے مجمع سے ڈاکٹر صاحب کی مغفرت کی دعا فرمائی۔ (شیخ الاسلام مدنی ص ۴۲۹)

جمعیۃ العلماء ہند نے اپنے گیارہویں سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی (۳، ۴، ۵ مارچ ۱۹۳۹ء) زیرِ صدارت مولانا عبدالحق مدنی ڈاکٹر اقبال کی وفات پر تجویز ۴ یہ پاس کی:-

"جمعیۃ علماء ہند کا یہ جلسہ شاعرِ مشرق جناب ڈاکٹر سر محمد اقبال کی وفات حسرت آیات پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کی وفات کو ایک قومی مفکر اور آزادیٔ وطن کے داعی سے ہندوستان کی محرومی سمجھتا ہے اور یہ دعا کرتا ہے کہ حق تعالےٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، اور آزادیٔ وطن کی جو روح اُن کے قومی ادب کی جان ہے اُس پر مسلمانوں کو چلنے کی توفیق عطا فرمائے، یہ جلسہ مرحوم کے صاحبزادوں کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے"۔ (جمیعۃ العلماء جلد ۲ ص ۴۳۴)

علامہ اقبال کی وفات کے بعد اُن کے مجموعہ کلام "ارمغانِ حجاز" میں وہ اشعار شائع کیے گئے جو آج تک جاری ہے، مگر ہم علامہ کو اس سے بری الذمہ سمجھتے ہیں۔

حضرت مدنیؒ کے دوسرے شدید مخالف پروفیسر یوسف سلیم چشتی تھے جو قائد اعظم محمد علی جناح کے خاص الخاص خادم اور علامہ اقبال کے کلام کے شارح تھے، ان کو جب حضرت مدنیؒ کے علمی، دینی اور روحانی مقام کا پتہ چلا اور ساتھ ہی مسلم لیگ کی حقیقی کاروائی کا علم ہوا تو علی الاعلان توبہ کی اور ایک طویل مضمون لکھا

جو ماہنامہ "میثاق" لاہور میں پہلی بار شائع ہوا اور پھر دُوسرے اخبارات میں، اب تک کئی بار کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے، اس کا کچھ حصہ "مدنی اور اقبال" کے عنوان میں ذکر کر دیا جائے گا۔

(۳) حضرت مدنی کا صرف مخالف ہی نہیں بلکہ معاند تیسرا طبقہ وہ ہے جو اپنے کسی بُغض کا انتقام لیتا تھا اور لے رہا ہے، اس کی کئی وجوہ ہیں۔

پہلی وجہ تو اہلِ بدعت کا وہ انتقام ہے جو کہ مولانا احمد رضا خان صاحب کی اُس تلبیس کی پردہ دری ہے جو آپ نے علماءِ حجاز خصوصاً علماءِ مدینہ منورہ سے فرضی استفتاء کی صورت میں حاصل کیا تھا اور جس کو حسام الحرمین کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اگر حضرت مدنیؒ اُس وقت مدینہ منورہ میں نہ ہوتے تو یہ دروغ کچھ ایسا فروغ پا لیتا کہ اس کے ازالہ کے لیے کافی وقت درکار ہوتا۔ حضرت مدنیؒ نے اس فتنہ کو سر اٹھاتے ہی کچل دیا اور شہاب الثاقب تحریر فرما کر عقائدِ حقہ کا تحفظ فرماتے ہوئے مسلک پر اعتراضات کے دندان شکن جواب دیئے ــــ یہی وجہ ہے کہ تقسیم سے پہلے بھی اس گروہ نے ہر طرح کی الزام تراشی اور ذہنی کوفت پہنچانا کارِ خیر سمجھا، حتیٰ کہ بریلی میں حضرتِ مدنیؒ پر قاتلانہ حملہ بھی کیا گیا، جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچا لیا۔ تقسیم کے بعد بھی یہ گروہ سیاست کی آڑ میں اپنے خبثِ باطن کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے جس میں پاکستان کے ایک مشہور روزنامہ کا ایک کالم نویس یہ منحوس ڈیوٹی ادا کرتا تھا، آخر میں وہ قتل ہو گیا۔

دُوسری وجہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے متعلقین کی وہ جماعت جو ۱۹۳۰ء سے اس کشتی کے ناخدا رکو جس نے اسٹرائک سے پیدا شدہ حالات میں اس ڈولتی بلکہ ڈوبتی ہوئی کشتی کو سنبھالا تھا) کی مخالفت صرف اس لیے کرتی رہی کہ اُن کی تدابیر ناکام ہوئیں اور ان کو دارالعلوم سے ہمیشہ کے لیے خارج کر دیا گیا ہے، اس جماعت کے بعض افراد نے دُور دراز کے منصوبے بنا کر حضرتِ مدنیؒ کو دارالعلوم سے الگ کرنے کی مذموم سعی کی تھی مگر ناکام رہے، تقسیم کے بعد وہ اسی موقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور قریب بعید سے کھینچ تان کر حضرتؒ کو پاکستان کا مخالف بتا کر دل کی بھڑاس نکالتے رہتے ہیں جس کی وضاحت پہلے کی جا چکی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے جن نظریات پر سب سے پہلے حضرتِ مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے تنقیدی نگاہ ڈالی تھی اور اسے مسلمانوں کے لیے مرزائیت سے زیادہ خطرناک قرار دیا تھا،

مودودی صاحب نے خود بھی ساری زندگی حضرت مدنیؒ کے خلاف الزام تراشی اور حدودِ تہذیب سے بھی تجاوز کیا تھا (جس کا ایک ادنیٰ نمونہ احقر کے مرتبہ رسالہ براءۃ المحدث عن افتراء المحدث میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے) اور اب بھی جبکہ یہ داستان پارینہ ہوچکی ہے، یہ جماعت (جماعتِ اسلامی) اور اس کا نیا ایڈیشن "تنظیمِ اسلامی" بلا کسی ضرورت کے علامہ اقبال کے منسوخ شدہ اشعار کی آڑ میں دل کا غبار نکال لیتا ہے۔

مودودی صاحب کی اس معاندت پر شیخ العرب والعجم حضرتِ مدنیؒ کے شاگردِ رشید خطیبِ پاکستان مولانا احتشام الحق تھانوی رحمۃ اللہ علیہم

کا تنقیدی تبصرہ

خاص اہدافِ تنقید گذشتہ صفحات میں علمائے دین کے بارے میں مولانا مودودی کے جو خیالات پیش کیے گئے ہیں اُن میں کسی خاص مکتبۂ فکر کی تخصیص معلوم نہیں ہوتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبیداللہ سندھی اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہم اللہ تعالیٰ پر انہوں نے خاص نظرِ التفات فرمائی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے بارے میں انہوں نے فیصلہ فرمادیا تھا کہ ان کی جگہ اسلام کے دائرے کے اندر نہیں۔ مولانا سندھیؒ کے بارے میں مولانا مسعود عالم ندوی کا سلسلۂ مضامین مطبوعہ "معارف" کتابی شکل میں بھی چھپ چکا ہے اس سے اندازہ کرلیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار و فلاسفی کے نام پر اشتراکیت کی تبلیغ کی ہے، اور یہ کہ اگر وہ سکھ سے مسلمان نہ ہوتے تو شاید اسلام کیلئے اتنے خطرناک نہ ہوتے اور مسلمان ہوکر انہوں نے اسلام کو جو نقصان پہنچایا ہے وہ سکھ رہتے ہوئے نہ پہنچا سکتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ کے بارے میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ دوم و سوم، رسالہ "مسئلۂ قومیت" کئی تحریرات میں جو کچھ نام لیے بغیر لکھا ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں، انہیں

غیرتِ ایمانی سے محروم اور متحدہ قومیت کے بھوت کا مرکب قرار دیا ہے۔ ذیل کی عبارت مودودی صاحب کے قلم سے ہے اور "مولوی صاحب" سے مراد شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ہیں :۔

"اس آزادی کے پروانے کو لے کر جو "مولوی صاحب" پشاور سے مدراس تک ماس کنٹیکٹ کی تبلیغ کرتے پھر رہے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ پروانہ آپ کو اتنی آزادی ضرور دیتا ہے کہ قال اللہ وقال الرسول میں مشغول رہیں، آپ کی داڑھی یقیناً زبردستی نہیں مونڈی جائے گی نہ آپ کی عبا ضبط کی جائے گی نہ آپ کی تسبیح چھینی جائے گی، البتہ اس امر کی ضمانت نہیں کہ آپ کی نسل سے دوسری پشت میں کوئی اودے شنکر اور تیسری پشت میں کوئی دیو کارانی برآمد نہ ہوگی۔" (ترجمان القرآن، جمادی الاولیٰ، ۱۳۵۷ھ)

ہم تو خیر حضرتؒ کے عقیدت کیش اور ارادت مند ہیں، اس لیے اس تحریر کی شدت کو زیادہ محسوس کرتے ہیں، لیکن کیا کسی مسلک کے کسی بھی عالم دین کے لیے اس سے زیادہ تحقیر و توہین آمیز تحریر کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ ـــــ دوسری جگہ کہا ہے :۔

"اسلام کا علم رکھنے والے عبا پوشوں پر متحدہ قومیت کا بھوت سوار ہے، ان کی غیرتِ ایمانی سرد ہو چکی ہے۔" (ترجمان القرآن، ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ)

خاندانِ شیخ الاسلام اور ان کی تین پشتوں کا امتیاز

اب اس دنیا میں نہ حسین احمد مدنیؒ ہیں نہ مودودی کہ جن کی پیشین گوئی پر نصف صدی سے زیادہ مدت گذر چکی ہے لیکن یہ حقیقت دنیا کے سامنے ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی دوسری ہی نہیں تیسری پشت یعنی اولاد کی اولاد میں بھی تمام افرادِ مرد و زن علمائے دین، حفاظ، قراء، محدث، مفسر، دینیات کے مدرس، خطبائے اسلام، مبلغینِ دین، مصنفینِ اسلام، مسند نشینِ شریعت اور اصحابِ طریقت میں سے کسی نہ کسی بلکہ کئی کئی صفات سے بیک وقت متصف ہیں اور ان میں سے ہر کوئی اپنے دائرے میں اپنی بساطِ علم و توفیق کے مطابق علوم و فنونِ اسلامی کے درس و تدریس، تصنیف و تالیف، تبلیغ و اشاعتِ دین، ارشاد و ہدایت، غرضیکہ علم و عمل کے کسی نہ کسی میدان میں امتِ مسلمہ اور ملک و قوم کی خدمت سر انجام دے رہے ہیں۔ ابھی تک تو اس خاندان میں نہ کوئی اودے شنکر پیدا ہوا نہ دیو کارانی، اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ آئندہ بھی

اس خاندان رفیع الارکان کو اپنی خاص عنایات سے نوازے گا اور اپنی حفاظت میں رکھے گا۔

خاکسار کے علم کے مطابق اس خاندان کی تیسری پشت میں ایک درجن سے زائد لڑکیاں حفاظ و قرا موجود ہیں اور متعدد علوم اسلامی میں منتہی بعض خواتین موجود ہیں۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ یہ حضرت مدنیؒ کی تعلیم و تربیت کے برگ و بار ہیں۔ لیکن کیا مودودی صاحب کی اوّلین پشت یعنی اولاد میں بھی کوئی عالم دین، حافظ، قاری، علوم اسلامی کا منتہی نہ سہی مبتدی اور عالم نہ سہی صورتاً ہی حضرت شیخ الاسلام کی تیسری پشت کے کسی فرد کی مثال پیش کر سکتا ہے؟ پھر اگر حضرت شیخ الاسلام کی تعلیم و تربیت کے ثمرات میں آپؒ کے تلامذہ، مریدین، مسترشدین کو جو بلاشبہ حضرتؒ کی مثل اولاد کے تھے اور پھر اگر ان کے سلسلہ ہائے درس و رشد و ہدایت کو بھی شامل کر لیا جائے تو ہندوستان و پاکستان کے ایک ایک شہر میں اتنی تعداد میں وابستگان دامن نکل آئیں گے کہ پورے پاکستان یا کل ہندوستان میں بھی جماعت اسلامی کے اتنے ارکین و متفقین نہ ہوں گے۔ بہر حال حضرت شیخ الاسلام کے خاندان کے بارے میں مودودی صاحب کی پیشینگوئی یا آرزو پوری نہ ہو سکی۔ (مولانا احتشام الحق تھانویؒ کی آپ بیتی ۲۹۵ تا ۳۰۰)

از مرتب

بفضلہٖ تعالیٰ و کرمہٖ حضرت مدنیؒ کے پوتوں اور نواسوں میں اس وقت بیس سے زیادہ حافظ، قاری، عالم اور بعض دینی مدارس کے مدرس ہیں۔ آپ کے بڑے خلف الصدق مولانا سید محمد اسعد مدنی عالم اسلامی کے مقتدر راہنما ہیں اور بھارت کی عظیم دینی و سیاسی جماعت جمعیۃ العلماً کے صدر ہیں جبکہ آپ کے دوسرے صاحبزادہ محترم مولانا حافظ سید محمد ارشد مدنی اپنے گرامی قدر والد محترم کی مسند درس حدیث پر رونق افروز علم حدیث کی تدریس فرما رہے ہیں ــــ اس کے برعکس مودودی صاحب کی اولاد اور ان کی جماعت کا جو حال ہے وہ سب کو معلوم ہے، اُن کی اولاد تو مطرود ہے مودودی صاحب کی مسند اور جماعت پر اُن لوگوں کا قبضہ ہے جن کے سیاسی کردار سے آج ساری دنیا واقف ہے اور مودودی صاحب کی اولاد کا جو حال ہے اس کے بارہ میں جماعت کے سرکردہ لیڈر دن بدن جو انکشافات کرتے رہتے ہیں وہ سب جانتے ہیں۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارُ

چوتھی وجہ عوامی مخالفت کی مسلم لیگ کے جلیل القدر علماء کی وہ تقاریر تھیں جن میں وہ مسلمانوں کو پاکستان کا تعارف کراتے ہوئے یہاں تک کہہ دیتے تھے کہ پاکستان مدینہ نما ملک ہوگا۔ چنانچہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی زیر صدارت جمعیۃ العلمائے اسلام لاہور کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ ۲۵ تا ۲۷ جنوری ۱۹۴۶ء کو اسلامیہ کالج لاہور

کے گراؤنڈ میں منعقد ہوا، مولانا عثمانیؒ کا یہ خطبۂ صدارت **ہمارا پاکستان** کے نام سے موسوم ہے۔
اس جلسہ میں بڑے بڑے مسلمان حکام، بیرسٹر، وکلاء، پروفیسر، علماء اور موافقین اور مخالفین اور عوام بیشمار مسلمان موجود تھے، سب نے متفقہ طور پر تسلیم کیا کہ نظریۂ پاکستان کو صحیح معنوں میں ہم نے آج سمجھا ہے، باوجود پیری و نقاہت کے علامہؒ نے یہ خطبہ خود پڑھا اور رات کے تقریباً دو بجے ختم ہوا، اگلے روز لاہور کے اخباروں میں اس خطبہ کی دھوم تھی، حسب ذیل عبارت اسی خطبۂ صدارت سے پیش خدمت ہے، علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں۔

"مکہ (مکرمہ) میں جہاں کفار کا غلبہ تھا ایسا موقع کہاں میسر تھا کہ اسلامی مرکز قائم ہو سکے آزاد حکومت قائم کرنے کے لیے ایک آزاد مرکز اور مستقر کی ضرورت تھی، اسی نکتہ نگاہ کے ماتحت شہر یثرب کو، جو بعد میں مدینۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) بن گیا، مرکزِ توجہ بنایا گیا اور مشیتِ الٰہی کے زبردست ہاتھ نے آخرکار اپنے رسولِ مقبول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تاریخی ہجرت سے مدینہ طیبہ میں ایک طرح کا پاکستان بنا دیا۔" (ص ۱۲، ۱۳، ۱۴)

(تجلیاتِ عثمانی مرتبہ پروفیسر انوار الحسن شیر کوٹی ص ۶۸۷)

اسی طرح مشائخ عظام نے اپنے اپنے مریدوں کو یہی تلقین فرمائی کہ پاکستان میں وہی اسلام رائج ہوگا جو چودہ سو سال سے مسلمانوں کے ہاں مقبول ہے۔ بنارس کی سنّی کانفرنس میں تمام ہندوستان کے مشائخ نے شرکت فرمائی، جناب پیر امین الحسنات سجادہ نشین مانکی شریف بنفس نفیس تشریف لے گئے اور اپنے معتقدین اور مریدین میں یہی تبلیغ فرمائی، خود قائد اعظم محمد علی جناح نے ۲۶ نومبر ۱۹۴۶ء کو نئی دہلی میں اپنی قیامگاہ پر تحریکِ پاکستان کے سرگرم رکن ڈاکٹر سید بدرالدین احمد کو ایک طویل انٹرویو میں یہ بھی فرمایا کہ۔

"خلافتِ راشدہ نے جو نظامِ مالیات قائم کیا تھا وہ ہر شخص کی خوشحالی اور فارغ البالی کی ضمانت دیتا ہے اور آج بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی نظامِ معیشت اس سے بہتر نہیں، یہی نہیں کہ خلافتِ راشدہ کے عہد میں لوگوں کو اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے پریشان نہ ہونا پڑا بلکہ امیرِ معاویہؓ، محمد بن تغلق، اورنگزیب عالمگیر، شیر شاہ سوری جیسے آمرانِ مطلق کے دورِ حکومت میں بھی لوگ سکھ، چین اور آرام کی زندگی بسر کرتے رہے اور لوگوں کی آزادئ اظہارِ رائے اور بنیادی حقوق

چھیننے کی کبھی کوشش نہ کی گئی ان کے مقابلے میں برطانیہ، امریکہ اور روس کے موجودہ قوانین ہیچ ہیں۔ مسٹر بد! خوب یاد رکھو! دنیا کی تمام مشکلات کا حل اسلامی حکومت کے قیام میں ہے، اس کے قیام کی خاطر میں لندن کی پُرسکون زندگی کو ترک کر کے عظیم مفکر علامہ اقبال کے اصرار پر واپس آگیا، انشاء اللہ تعالیٰ پاکستان کے نظام حکومت کی بنیاد میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہی ہوگا اور اس پر ایک ایسی فلاحی اور مثالی سٹیٹ قائم ہوگی کہ دنیا اس کی تقلید پر مجبور ہو جائے گی!! لہ

اس قدر عظیم القدر علماء کرام، مشائخ عظام اور خود قائد اعظم کے ان بیانات کے مقابلہ میں ان علماء اور راہنماؤں کی اس رائے کی کیا وقعت ہو سکتی تھی جو یہ فرماتے تھے کہ، پاکستان ایک دینی سٹیٹ نہ ہوگی، اس میں اسلامی قانون کو بالادستی حاصل نہ ہوگی، یہ تمام اعلانات وقتی ہیں اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے مستقبل کے بارہ میں خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیئے۔

ان علماء کرام کا جن میں حضرت مدنیؒ کی ممتاز حیثیت تھی، یہی وہ جرم تھا جس کی پاداش میں قوم نے ان کو وہ اذیتیں پہنچائیں جن کی نظیر نہیں ملتی مگر جو انہوں نے فرمایا تھا وہی جلدی ظاہر ہو گیا۔

اکابر علماءِ مسلم لیگ کی اپنی رائے پر نظر ثانی

مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بھی آخر کار دل برداشتہ ہو گئے اور مشائخ عظام نے بھی کنارہ کشی کر لی، جیسا کہ پیر آف مانکی شریف دو سال اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے انتھک کوشش کرتے رہے مگر آخر ناکام ہو کر سیاست سے الگ ہو گئے۔

اسی طرح مولانا احتشام الحق تھانویؒ جیسے عالم دین جنہوں نے اپنی ساری توانائیاں تحریک پاکستان کیلئے وقف فرما دی تھیں مگر قیام پاکستان کے بعد مولانا کی زندگی کے جو ۳۳ سال گذرے ہیں اور سیاست کے دائرے میں جو لیل و نہار انہوں نے دیکھے تھے ان میں وہ اپنے استاذ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی سیاست و اصابت رائے کے بہت قائل ہو گئے تھے۔ مولانا احتشام الحق تھانویؒ کے بارے میں اسی قسم کی بات ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بیان فرمائی ہے۔

”حضرت مولانا شیخ الاسلام حسین احمد مدنی کے ذاتی تقویٰ اور تدین کے اعتراف کے علاوہ اب تو ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو ان حضرات کے سیاسی مؤقف کے بارہ میں اپنی رائے پر نظر ثانی

لہ ”نقوش قائد اعظم“ مرتبہ پروفیسر رحیم بخش شاہین، شائع کردہ شیخ اکیڈمی، بل روڈ لاہور ص ۳۱۶، ۳۱۷

کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں، خود مولانا احتشام الحق تھانویؒ نے آج جون، جولائی ۱۹۷۰ء سے تقریباً تین سال قبل جامعہ اشرفیہ لاہور میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کچھ ایسے الفاظ کہے تھے کہ اب جو حالات پیش آرہے ہیں ان کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کے بارے میں ان حضرات کی رائے زیادہ درست تھی جو یہ کہتے تھے کہ پاکستان میں فروغ اسلام کو نہیں فرقِ باطلہ اور الحاد اور اباحیت کو حاصل ہوگا'۔[1]

اسی طرح علامہ عثمانیؒ نے بھی آخر کار اپنے سیاسی عقائد سے رجوع کرتے ہوئے قرارداد مقاصد کی تجویز سے ڈھاکہ کے خطبہ میں حکومت کو اسی طرح کا چیلنج دیا جیسا کہ علماء حق اپنے اپنے زمانہ میں اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جابر حکومتوں کو دیتے رہے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"خواہ اربابِ اختیار ہمارے ساتھ کچھ ہی برتاؤ کریں ہم اس کوشش سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتے کہ مملکتِ پاکستان میں اسلام کا وہ دستور و آئین اور وہ نظام حکومت تشکیل پذیر ہو جس کی رُو سے اس بات کا مؤثر انتظام کیا جائے کہ مسلم قوم اپنی زندگی اسلام کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق جو قرآن وسنت سے ثابت ہوں مُرتب و منظم کر سکے"۔[2]

چونکہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ صوبہ بنگال سے دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے اور ان مسلمانوں سے مدینہ نما پاکستان کے لیے ووٹ طلب فرماتے تھے۔ جوگندر ناتھ منڈل (جو کہ بنگال کا اچھوت تھا) کی عزت افزائی سے بنگال کے اس وقت کے ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کی ناراضگی کی ابتداء ہو چکی تھی، اس لیے جمعیۃ علمائے پاکستان کا اجلاس ڈھاکہ میں رکھا مگر بنگال اس قدر ناراض ہو چکا تھا کہ اس نے اُردو زبان کے دفتری ہونے پر بھی علامہ سید سلیمان ندویؒ جیسے عالم کو بولنے تک نہ دیا، ادھر ہندوؤں نے موقع پاکر مسلمانوں کے ایک عظیم ملک کو ہم سے بالکل جُدا کر دیا جو کبھی مشرقی پاکستان تھا اور اب بنگلہ دیش بن گیا ہے ؎

نادیدنی کی دید سے ہوتا ہے خونِ دل   بے دست و پا کو دیدۂ بینا نہ چاہیئے

---

[1] جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی، از ڈاکٹر اسرار صاحب ص ۱۷۱ [2] تجلیاتِ عثمانی ص ۳۰

اسی طرح بھارت کی وزارت خارجہ نے یہ رپورٹ شائع کر دی کہ بنگلہ دیش کے قائم ہونے سے یہ تصور ختم ہو گیا ہے کہ ریاست مذہب کی بنیاد پر بن سکتی ہے۔ (ٹائمز نیوز ایجنسی)[1]

یہی حال دوسرے مقررین کا تھا، پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ تو آج تک بعض دیواروں پر لکھا ہوا موجود ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی نعرہ لگایا جاتا تھا کہ : مسلم ہے تو لیگ میں آ، پھر دیکھ وطن آزاد ہو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ جو لوگ پاکستان کے مخالف ہیں وہ اسلام کے مخالف ہیں، عوام اس "مدینہ نما پاکستان" کے حصول کے لیے بے تاب تھے، وہ ان مقدس چہروں کو دیکھ کر اور ان کی مؤثر تقاریر کو سنکر کسی دوسرے خیر خواہ کی کوئی بات سننے کے لیے تیار ہی نہ تھے بلکہ اس کے خون کے پیاسے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ حکومت کے سارے کارندے اور لیگی اخبارات ان کے ہمنوا تھے، کالجز اور سکولز کے وہ طلباء جو سرسید کی روحانی اولاد تھی سب کے سب اس کارِ شر میں برابر کے شریک تھے۔

نوٹ : مگر اس مدینہ نما ملک میں قرآنِ عزیز کا مقام کیا تھا؟ اس کے لیے مندرجہ ذیل چند سطور دل پر پتھر رکھ کر ناظرین پڑھ لیں۔

ایک المناک اور شرمناک واقعہ

پاکستان کے دو وزیر مشتاق گورمانی اور غلام محمد آزاد کشمیر گئے اور ایک اجتماع میں ایک وزیر نے کوٹ کی جیب سے ایک لاکٹ نما سی چیز نکال کر مجمعے کے سامنے لہرائی اور بولے "یہ دیکھو اللہ کا قانون ہے جو چودہ سو پہلے نافذ ہو چکا ہے اور جس پر عمل کرنا ہم سب کا دینی، اخلاقی اور ایمانی فرض ہے"۔ مگر اسی وزیر بدنصیب نے واپسی پر کار میں کہا "جیب سے نکلی ہوئی چیز تو محض سگریٹ کا لائٹر ہے جسے لوگ قرآن سمجھ رہے تھے"۔ (ماہنامہ الحسن لاہور بابت اگست ۱۹۸۹ء بحوالہ شہاب نامہ ص ۴۱۳، ۴۱۴)

نوٹ : آج پاکستان کے حالات جس مدوجزر کا شکار رہیں وہ اسی بے ادبی اور بے دینی کا نتیجہ ہے جسے ساری قوم بھگت رہی ہے، اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

---

[1] مولانا غلام رسول مہر اور پاکستان سکیم ص ۱۰۹

عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے آخری سفر پنجاب کی روح فرسا روداد۔ عبرت انگیز نتائج۔ ثقہ راویوں کی زبانی

از: امام الخطاطین سید انور حسین نفیس رقم صاحب لاہور

پندرہ بیس برس پیشتر حضرت مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف "اسوۂ حسینی" نظر سے گذری۔ یہ کتاب ریحانۃ النبی حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے حالات مبارک اور واقعات شہادت پر مشتمل ہے، آخر میں قاتلانِ جگر گوشۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے انجام نافرجام کا ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ امام زہریؒ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ "جو لوگ قتل حسینؓ میں شریک تھے ان میں سے ایک بھی نہیں بچا جس کو آخرت سے پہلے دنیا میں سزا نہ ملی ہو۔" چند مثالیں پیش کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

"ابن جوزیؒ نے سدیؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک شخص کی دعوت کی، مجلس میں یہ ذکر چلا کہ حضرت حسینؓ کے قتل میں جو بھی شریک ہوا اس کو دنیا میں بھی جلد سزا مل گئی، اس شخص نے کہا بالکل غلط ہے، میں خود ان کے قتل میں شریک تھا میرا کچھ بھی نہیں بگڑا، یہ شخص مجلس سے اٹھ کر گھر گیا، جاتے ہی چراغ کی بتی درست کرتے ہوئے اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور وہیں جل بھن کر رہ گیا، سدیؒ کہتے ہیں میں نے خود اس کو صبح دیکھا تو کوئلہ ہو چکا تھا۔" (اسوۂ حسینی ص ۱۰۱، ۱۰۲)

اللہ کے جو بندے اپنی تکلیف پر اپنا معاملہ اپنے اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دشمنوں سے شدید انتقام لیتا ہے۔ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ (آل عمران آیت ۴)

؎ نہ جا اُس کے تحمل پر کہ ہے بے ڈھب گرفت اُس کی
ڈر اُس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اُس کا

ہمارے عہد کو بھی ایک "حسین" عطا کیا گیا، جس کا نسبی و حسبی رشتہ شہیدِ کربلا سیدنا حسین اوّل رضی اللہ عنہ سے پیوستہ ہے، یعنی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ...... اس حسین ثانیؒ پر مصیبتوں کے بڑے بڑے پہاڑ ٹوٹے لیکن اس کوہِ عزم و استقلال کو جُنبش تک نہ ہوئی، مخالفوں نے کیسے کیسے تیر اُن پر برسائے لیکن اُن کا چہرہ متبسّم ہی رہا، حریفوں نے طرح طرح کی تکلیفیں دیں لیکن اُن کے لب پر حرفِ شکایت تک نہ آیا۔

انہوں نے اپنی عمرِ عزیز استخلاصِ وطن اور سربلندیٔ اسلام کی جدوجہد میں گذار دی، انگریز اور اس کے "رضاکار" ہمیشہ ان کی مخالفت میں زبان دراز رہے لیکن اس مجاہدِ دین و ملت اور غازیٔ سربکف نے آنکھ تک اُٹھا کر نہ دیکھا کہ یہ کوتاہ بین و کور باطن کیا کہہ رہے ہیں، میدانِ عزیمت کا یہ شہسوار محمدی عَلم لہرائے آگے بڑھتا ہی چلا گیا، راستے کی تاریکی اس کے انوارِ شریعت و طریقت سے چھٹ گئی، اس کا راستہ روکنے والوں کو غبار کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا اور کانٹے بچھانے والوں کو خود اسی راستے سے گذرنا پڑا۔ ع

چاہ کن را چاہ درپیش

ایک ہندی دوہا جو غالباً عبدالرحیم خانِ خاناں کا ہے حسبِ حال نظر آتا ہے ؎

جو تو کو کانٹا بوئے تاہی بوئے تو پھول
توکو پھول ہی پھول ہیں واکو ہیں ترسول

(ترجمہ) "جو تیرے لیے کانٹے بوئے تُو اُس کے لیے پھول بو، تیرے لیے تو پھول کے پھول ہیں اور اُس کے لیے تین تین نوک والے کانٹے"۔

حضرتِ مدنی قدس سرہٗ عفو و درگذر کا پیکر تھے، انہوں نے اپنے مخالفوں کے لیے کبھی بددعا نہیں فرمائی بلکہ دُعائے نیم شبی میں سب کے لیے اپنے مالک سے فضل و انعام اور عفو و مغفرت مانگتے رہے۔

حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و واقعات اکثر و بیشتر سننے میں آتے رہے ہیں، راقم سطور نے جناب عطاء الحق و حافظ عبدالرحمٰن جالندھری (حال مقیم محلہ گورونانک پورہ فیصل آباد) جو سیدی و مولائی قطب الارشاد حضرتِ اقدس شاہ عبدالقادر رائپوری قدس سرہٗ (م ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء) سے تعلق بیعت

رکھتے ہیں، کی زبانی بعض ناخوشگوار واقعات کئی مرتبہ سنے، ان واقعات کے وہ ثقہ راوی ہیں، نتائج کے بارے میں ان کی حیثیت عینی گواہوں کی ہے۔ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ میں ان واقعات کو سپردِ قلم کرنے کی نوبت آگئی، بھائی عطاء الحق بیان کرتے گئے اور میں قلمبند کرتا چلا گیا۔ یہ واقعات حقیقت ہیں افسانہ نہیں، قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ جگر گوشۂ رسول کی توہین کرنے والوں کا حشر کیا ہوا؟

◎ تقسیم برصغیر (اگست ۱۹۴۷ء) سے چند ماہ پیشتر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ لاہور سے واپس فرنٹیئر میل میں جا رہے تھے، آپ کے ساتھ مولانا حفظ الرحمٰنؒ اور مولانا حمید اللہ بن حضرت لاہوریؒ بھی تھے، ایک سازش کے تحت امرتسر وغیرہ کے لیگیوں کو بتایا گیا کہ اس گاڑی سے راجہ غضنفر علی بھی آ رہے ہیں۔ (حالانکہ وہ نہیں آ رہے تھے)

جب گاڑی امرتسر ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو مسلم لیگی کارکن راجہ غضنفر علی کو تلاش کرنے لگے، ریلوے گارڈ نے کارکنوں کو بتایا کہ راجہ صاحب کا پروگرام ملتوی ہو گیا ہے، وہ اس گاڑی سے سفر نہیں کر رہے ہیں، لیکن ساتھ ہی اُس نے شرارتاً انہیں بتایا کہ اس گاڑی کے فلاں ڈبے میں مولانا حسین احمد مدنیؒ سفر کر رہے ہیں، اس پر وہ تمام مسلم لیگی کارکن اس ڈبے کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور حضرتؒ کے خلاف نعرہ بازی اور ہلڑ بازی شروع کر دی، ٹماٹر وغیرہ اُن پر پھینکنے لگے۔ اتفاقاً امرتسر کا ایک نوجوان عبدالرشید اپنا مال بک کرانے کی غرض سے اسٹیشن پر آیا ہوا تھا اُس نے ایک ڈبے کے پاس ہجوم دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بزرگ کے ساتھ یہ لوگ نہایت بدتمیزی کر رہے ہیں، وہ حضرت مدنیؒ کو جانتا بھی نہیں تھا۔

بھائی عطاء الحق صاحب کو یہ واقعہ خود عبدالرشید نے راولپنڈی میں سنایا، وہ امرتسر کے بعد راولپنڈی میں مقیم ہوا، یہاں بھی وہ یہی کاروبار کرتا تھا۔ عبدالرشید نہایت صحتمند نوجوان تھا اُس نے جان پر کھیل کر حضرت مدنیؒ کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا۔ مجمع ڈبے کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا، عبدالرشید ڈبے کے دروازے میں پائدان پر ڈٹ کر کھڑا ہو گیا، مسلم لیگی مجمع اُس پر ٹوٹ پڑا اور اس کو بیدریغ زدوکوب کیا، حتیٰ کہ اس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے، لیکن اس مردِ مجاہد نے حضرت مدنیؒ کی طرف ہجوم کو بڑھنے نہ دیا حتیٰ کہ گاڑی چل پڑی اور وہ پلیٹ فارم پار کرنے کے بعد گاڑی سے چھلانگ لگا کر نیچے اُترا۔

◎ جب یہ گاڑی جالندھر ریلوے اسٹیشن پہ پہنچی یہاں کے مسلم لیگی کارکن بھی راجہ غضنفر علی خان کے استقبال کے لیے پلیٹ فارم پر موجود تھے، گاڑی رکتے ہی گارڈ نے انہیں راجہ کے پروگرام کے التوا کی

خبر دی اور حضرت مدنیؒ کی نشاندہی کی، جس پر وہ مجمع حضرتؒ کے ڈبے پر جا پہنچا اور وہی طوفانِ بدتمیزی شروع کر دیا، اس مجمع کے سرغنہ تین مسلم لیگی نوجوان شمس الحق عرف شمّی، فضل محمد اور فتح محمد تھے۔

فضل محمد اور فتح محمد جالندھر کے محلہ پرانی کچہری اور شمس الحق عرف شمّی محلہ عالی کا رہنے والا تھا۔ انہوں نے حضرتِ اقدس مدنیؒ کی توہین میں کوئی کسر نہ چھوڑی، گالیاں دیں، گندی چیزیں پھینکیں، حضرتؒ کا تکیہ چھینا، ٹوپی بھی اتار کر پھینک دی، ریش مبارک نوچی اور شمّی نے تھپڑ بھی مارا۔ حضرتِ مدنیؒ صبر جمیل کی مجسّم صورت بنے بیٹھے تھے، حضرتؒ کے ساتھ ایک خادم بھی تھا وہ اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکا، اُس نے مزاحمت کا ارادہ کیا تو حضرتؒ نے اسے منع فرمایا کہ تم خاموش رہو، اگر تم برداشت نہیں کر سکتے تو دوسرے ڈبے میں چلے جاؤ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، اتنے میں گاڑی چل دی اور مسلم لیگی کارکن اپنے اپنے گھروں کو واپس آ گئے۔

صبح کو ان مسلم لیگی کارکنوں نے فخریہ انداز میں رات کا واقعہ اپنے محلہ پرانی کچہری میں بیان کیا۔ اس محلہ میں خانقاہ عالیہ رائے پور (ضلع سہارنپور) سے تعلق رکھنے والوں کا ایک نہایت با اثر حلقہ تھا، یہاں قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری اور حضرت منشی رحمت علی صاحب قدس سرہما کی تشریف آوری ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے جب حضرت اقدس مدنیؒ کی توہین کا روح فرسا واقعہ سُنا تو اُن پر اس کا نہایت شدید اثر ہوا، عبدالحق بن چوہدری فضل محمد (حال مقیم گلی ۲؍ محلہ گورونانک پورہ فیصل آباد) نے فتح محمد کی زبانی گستاخانہ کلمات سُنے تو وہ برداشت نہ کر سکے، اُنہوں نے موقع پر ہی اس کا گریبان پکڑ لیا اور کہا کہ اب بتاؤ رات کیا قصہ ہوا تھا، اور ساتھ ہی زوردار تھپڑ بھی اسے رسید کر دیئے، جس پر فتح محمد جو فخریہ اپنا کارنامہ بیان کر رہا تھا ساکت ہو گیا اور اسے جرأت نہ ہو سکی کہ وہ کوئی بات کر سکے۔ اتنے میں چوہدری امام الدین صاحب (والد بھائی عطاءالحق صاحب) بھی آ گئے، انہیں جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے اپنا جوتا اتار لیا اور فتح محمد کی خوب پٹائی کی، حتیٰ کہ فتح محمد نے ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگی۔ چوہدری امام الدین صاحب نے یہ تنبیہ عام کر دی کہ اگر کسی نے ہمارے بزرگوں کے خلاف زبان درازی کی تو اس کا حشر بُرا ہو گا ہم اُسے کیفرِ کردار تک پہنچا کر چھوڑیں گے۔

دُوسرے سرغنہ فضل محمد کا حشر یہ ہوا کہ وہ رات کو جب اپنے گھر واپس پہنچا تو اُسے بخار ہو گیا، صبح بیدار ہوا تو اس کی پُشت پر دو پھوڑے (دنبل) ظاہر ہوئے، جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پھر چارپائی سے اٹھنے کے قابل نہ رہا اور سخت تکلیف میں کراہتا تھا، پانچ چھ روز کے بعد چوہدری امام الدین نے اُس کی

والدہ سے (جو دوکان پر سودا خریدنے کے لیے آئی تھی) پوچھا کہ فضل کئی روز سے نظر نہیں آیا، اُس نے بتایا کہ وہ سخت بیمار ہے، اُس کی پُشت پر پھوڑے نکل آئے ہیں۔ بھائی عطاء الحق صاحب کا بیان ہے کہ پھوڑوں میں کیڑے پڑ گئے اور انہوں نے جسم کو کھانا شروع کر دیا، پھوڑے تین انچ قطر سے کم نہیں تھے، ڈاکٹروں نے تجویز دی کہ ان ناسوروں میں روزانہ قیمہ بھر دیا جائے تاکہ کیڑے جسم کو نہ کھائیں۔ چنانچہ روزانہ پاؤ پاؤ بھر قیمہ ان دونوں ناسوروں میں بھرا جاتا تھا دن بھر میں کیڑے اس کو کھا جاتے تھے، دوسرے روز نئے سرے سے قیمہ بھرا جاتا تھا۔ چند ماہ بعد ملک تقسیم ہو گیا اور آبادیوں کا تبادلہ شروع ہوا، محلہ پرانی کچہری کے سب لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر ریفیوجی کیمپ واقع جالندھر چھاؤنی میں منتقل ہو گئے۔ لیکن خدا کی شان کہ فضل محمد اور فتح محمد اپنے اہل و عیال سمیت وہیں رہے، حالانکہ ان کے رشتہ داروں نے ہر چند اصرار کیا کہ تم بھی ہمارے ساتھ آجاؤ لیکن انہوں نے کسی کی نہ مانی۔

دوسرے دن فضل محمد اور فتح محمد نکلنے پر مجبور ہوئے، فضل محمد ایک ہندو کارخانہ دار بھولا ناتھ کا ملازم تھا وہ مع اہل و عیال اُس کے ہاں چلا گیا، فتح محمد بھی پناہ حاصل کرنے کی غرض سے اپنی بیوی اور چھ سات بچوں کے ساتھ نکلا لیکن راستے ہی میں ایک سکھ جتھے کے ہاتھوں ریلوے پھاٹک (نزد اڈا ہوشیار پور) اہل و عیال سمیت بُری طرح سے قتل کر دیا گیا۔

فضل محمد چھ سات روز کے بعد اپنے مالک بھولا ناتھ کی مدد سے ریفیوجی کیمپ (واقع جالندھر چھاؤنی) میں اہل و عیال سمیت پہنچ گیا، فضل محمد مرض سے اس قدر تنگ آچکا تھا کہ وہ موت کی دُعائیں کرتا تھا، چاہتا تھا کہ کوئی اسے مار ڈالے، لیکن قدرت تو اسے نمونۂ عبرت بنانا چاہتی تھی، وہ زندہ سلامت لاہور پہنچ گیا، محلہ پرانی کچہری جالندھر کے تقریباً تمام افراد انجینیئرنگ کالج کے ہوسٹل نزد ریلوے اسٹیشن عقب آسٹریلیا بلڈنگ میں یکے بعد دیگرے آکر مقیم ہوتے رہے، فضل محمد بھی بیوی بچوں سمیت وہاں آگیا، اس کی حالت یہ تھی کہ دن رات بے چین و بیقرار رہتا تھا اور ہر وقت تکلیف سے کراہتا تھا، اس کی نیند حرام ہو چکی تھی، وہ ننگے بدن صرف ایک تہبند باندھے رہتا تھا، اس حالت میں وہ ایک ماہ لاہور میں مقیم رہا، پھر وسط اکتوبر میں وہ فیصل آباد آگیا اور محلہ گورونانک پورہ گلی ۴ جہاں محلہ پرانی کچہری جالندھر کے رہنے والے بیشتر لوگ آباد ہو چکے تھے وہیں آگیا، اس کا مرض لاعلاج ہو چکا تھا، یہاں چند ماہ بعد اُس کا اسی بیماری کی حالت میں انتقال ہو گیا، اس کی میت کی حالت ناگفتہ بہ تھی، اُس کی لاش ایسی متعفن ہو گئی تھی کہ غسل دینے کو کوئی تیار نہیں

ہوتا تھا، بڑی مشکل سے لوگوں نے اپنے ناک منہ پر کپڑا باندھ کر یونہی پانی بہا دیا اور جلد از جلد قبرستان لے جاکر دفن کر دیا۔

◎ اب شمس الحق کا حال سُنیئے! یہ شخص جالندھر سے فیصل آباد آکر آباد ہوا، یہاں آکر بھی مسلم لیگی کارکن کی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر کام کرنا شروع کیا، جلسوں میں بڑے زور شور سے تقریریں کرتا تھا، اس نے ایک اخبار "انصاف" بھی جاری کیا، لیکن اس شخص کو کبھی بھی چین نصیب نہ ہو سکا، راقم سطور نے بھی اس کو اچھی طرح سے دیکھا ہے، وہ بڑا بدمزاج اور زبان دراز شخص تھا۔ بھائی عطاء الحق کا بیان ہے کہ میں ڈی سی آفس میں بطور کلرک ملازم تھا، میرے پاس پریس سے متعلقہ کام بھی تھا۔ شمس الحق اخبار کے سلسلے میں اکثر میرے پاس آتا جاتا تھا، ۱۹۴۹ء کی ابتداء کا واقعہ ہے کہ اخبار کے ڈیکلریشن کے سلسلے میں وہ میرے پاس آیا اور تقریباً آدھ گھنٹہ کاغذات کی تکمیل کے سلسلے میں میرے پاس بیٹھا رہا، کاغذات مکمل کرنے کے بعد مجھے دے کر چلا گیا، آخری دفعہ اسے کچہری کے گیٹ پر دیکھا گیا، اس کے بعد آج تک اس کا پتہ نہیں مل سکا، اس کے اغوا کی خبر آناً فاناً شہر میں پھیل گئی، اخبارات کے ضمیمے شائع ہوئے، پاکستان بھر میں پوسٹر لگے، پتہ دینے والے کے لیے انعامات کا اعلان کیا گیا، انجمن مہاجرینِ جالندھر نے ملک گیر تحریک چلائی، کئی وفود وزیرِاعظم لیاقت علی خان سے ملے، حکومت کی طرف سے یقین دھانیاں بھی ہوئیں، لیکن جگر گوشۂ رسول کی توہین کرنے والے شمسی کا نام و نشان تک نہ مل سکا۔

دیدی کہ خونِ ناحقِ پروانہ شمع را
چنداں اماں ندارد کہ شب را سحر کُند

میاں عبدالغنی قدیم متوطن محلہ عالی جالندھر مسلم لیگ کا سرگرم رُکن تھا، تقسیمِ ملک کے بعد وہ فیصل آباد میں مقیم ہوا، شمس الحق عرف شمسی کے ساتھیوں میں سے تھا، اخبار "انصاف" کا ڈیکلریشن اس کے نام تھا، آخر عمر میں اس کا دماغی توازن درست نہیں رہا تھا، وہ اکثر و بیشتر یہ کہا کرتا تھا کہ میری جو یہ حالت ہے یہ محض حضرت مدنیؒ کی مخالفت کرنے کی وجہ سے ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارُ

(ماہنامہ "النصیحۃ" چارسدہ، رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ)

◎ حضرت مولانا مجاہد الحسینی صاحب حال خطیب فیصل آباد اُن دنوں جالندھر کی مشہور دینی درسگاہ خیر المدارس میں مقیم تھے، آپ نے ان بدبختوں کی تمام کاروائی دیکھی، فرماتے ہیں کہ حضرت مدنیؒ

نے سب کو انتقامی کارروائی کرنے سے منع فرما دیا اور خود ڈبّے کے دروازے پر آکر اُن (مفسدین) کو یہ خطاب فرمایا "آزادئ وطن کی خاطر میری جان حاضر ہے، اگر حسین احمد کی جان لینے سے تمہیں آزادی مل سکتی ہے تو یہ سودا سستا ہے، مَیں حاضر ہوں، اللہ تمہیں ہدایت دے"۔ پلیٹ فارم پر موجود لوگ ان بدبختوں کے مقابلے میں آگئے اور وہ دُم دبا کر بھاگ گئے اور اُس عذاب کا شکار ہو گئے اور ہو رہے ہیں جو ایسے بدکرداروں کو ملا کرتا ہے۔

◎ حضرتِ مدنیؒ کے مخالفین میں (جو حدودِ عناد کو پھاند چکے تھے) حیدرآباد دکن کے نواب یار جنگ بہادر بھی تھے جو بقول مولانا کوثر نیازی مرحوم مہدویہ (فرقہ) کے پیرو کار تھے، جن کے بارہ میں علماءِ اسلام کی متضاد آراء ہیں، بعض اُن کو اولیاء اللہ میں شمار کرتے ہیں اور بعض اُن کی تکفیر کرتے ہیں۔ اِس فرقہ (مہدویہ) کے بانی سید محمد جونپوری تھے جن کا انتقال سنہ ۹۱۱ھ / سنہ ۱۵۰۵ء میں ایران کے ایک قصبہ فراہ میں ہُوا، نواب صاحب انجمن اتحاد المسلمین کے صدر تھے، اس انجمن میں مسلم لیگ کی طرح مرزائی بھی نہ صرف شریک تھے بلکہ کبھی کبھی سیرت کے جلسوں کی صدارت کی تذلیل بھی کرتے تھے۔ نواب یار جنگ نے ایک جلسہ میں حضرت مدنیؒ کے خلاف کچھ کہا، اِس جلسہ میں جناب حکیم فضل الرحمٰن فہیم تھانوی سورتی بھی تھے جن کا مطب مشہور و معروف تھا، علامہ اقبال کے ساتھ بھی ان کے نیاز مندانہ تعلّقات تھے، حکیم صاحب نے اس تقریر پر جلسہ ہی میں احتجاج کیا جو نواب یار جنگ بہادر کو سخت ناگوار گزرا اور حکیم صاحب کو قتل کرنے کا حکم دے دیا، چنانچہ حکیم صاحب احباب کے مشورہ سے ۱۴؍ جون سنہ ۱۹۴۲ء کو مدراس سے امرتسر چلے گئے اور وہیں مقیم ہو گئے۔ مگر ادھر نواب یار جنگ کا حشر کیا ہُوا؟ "۲۵؍ جون سنہ ۱۹۴۴ء کو ایک مقامی جج ان کے ہاں عشائیہ پر مدعو تھے، نمازِ مغرب کی امامت نواب یار جنگ نے کرائی، نماز کے بعد اچانک ملازم نے حُقّہ پیش کیا، نواب مرحوم نے پہلا کش لیا ہی تھا کہ راہئ ملکِ بقاء ہو گئے"۔

(فیملی میگزین نوائے وقت ۸ تا ۱۴؍ جون ۱۹۹۵ء)

سید پور کا اخلاق سوز واقعہ

حضرت مدنیؒ بنگال تشریف لے جارہے تھے راستہ میں احسان الحق آفندی (سونارائی ضلع رنگ پور) کی تعزیت کے لیے سید پور جانے کا ارادہ تھا کوئی سیاسی، مذہبی جلسہ جلوس نہ تھا مگر لیگی غنڈوں کو کسی طرح حضرتؒ کی تشریف آوری کا علم ہوگیا اور اپنی دنیا و عاقبت برباد کرتے ہوئے یہ اخلاق سوز برتاؤ حضرتؒ کے ساتھ کیا جس کا مختصر حال درج کیا جاتا ہے۔

سید پور ضلع رنگ پور میں لیگی غنڈوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ نہایت غیر شریفانہ اور وحشیانہ برتاؤ کیا تھا، یہ ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے، اس واقعہ کی تفصیل میں مولانا کفیل احمد صاحب بجنوری کا مضمون ہدیۂ ناظرین ہے، یہ مضمون روز نامہ "حقیقت" (لکھنؤ) میں شائع ہوا تھا جو بعینہٖ درج ہے:

سید پور اور بھاگل پور میں جس نوعیت سے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند و صدر جمعیۃ علماء ہند کی ذاتِ بابرکات پر قاتلانہ اور وحشیانہ حملے ہوئے وہ ہر سنجیدہ شخص کے لیے انتہائی رنج و قلق کا موجب ہیں۔

حضرت مولانا ریاض الدین صاحب سید پوری جو کہ حضرت شیخ مدظلہ کے میزبان اور سید پور لانے کے باعث تھے وہ کلکتہ تشریف لائے ہوئے ہیں۔ موصوف نے راقم الحروف کو نمازِ جمعہ سے قبل نمازیانِ مسجد کولوٹولہ کی موجودگی میں اپنی درد بھری داستان سنائی کہ حضرتِ مدنی صاحب اپنے خادم احسان الحق صاحب مرحوم کی تعزیت میں قصبہ سونار تشریف لائے ہوئے تھے اور میری درخواست پر شام کا کھانا تناول فرمانے کے لیے سید پور کے اسٹیشن پر اُترے تھے، افسوس کہ موصوف کو میرے غریب خانہ تک پہنچنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ دفعتہً تقریباً سات سو لوگوں کا انبوہ لیگی نعرے لگاتا ہوا اسٹیشن پر آدھمکا اور حضرتِ شیخ کو عریاں دشنام دہی شروع کردی۔ ہاتھوں میں لاٹھیاں، ڈنڈے اور چھریاں تھیں، بے تمیزی سے نام لے لے کر قتل کردو، مار ڈالو، ٹکڑے ٹکڑے کر

ڈالو، یہ غدّار ہے، ایسا ہے، ویسا ہے، جو کچھ منہ پر آرہا تھا بکواس کی۔ ہم بنا بر استقبال صرف دس پندرہ آدمی تھے اور ان لوگوں میں برابر ایک شخص کے ناقوس پر ناقوس بجانے پر زیادتی ہورہی تھی، چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً تین ہزار غنڈے سید پور ورکشاپ اور مضافات سے جمع ہوگئے اور پھر کربلا کا منظر حسین احمد ابن حسین کے سامنے آگیا (انا للہ وانا الیہ راجعون) مار دھاڑ شروع کردی اور ہم چند لوگ جو شیخ مدظلہٗ کو حلقہ میں لیے ہوئے تھے کچھ مجروح اور کچھ مضروب ہورہے تھے اور خدا جانے ہم لوگوں میں آیا فرشتے آگئے تھے یا کیا بات تھی کہ بے انتہاء قوت ہمارے اندر پیدا ہورہی تھی اور ہم کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ بنے ہوئے، اسی اثناء میں ایک فرعونِ بے سامان نے اپنی فرعونیت کا شدید ترین مظاہرہ کیا، اُس نے مدنی صاحبؒ کو زمین پر پچھاڑنے کی کوشش کی، بیدردی سے گریبان پکڑا اور آخر میں سخت مدافعت کے باوجود کُلاہ سرِ مبارک سے اُتار لی، بیہودہ کلمات بکتے ہوئے پاؤں کے نیچے روندا اور پھر اس کو جلا دیا۔ ہم میں سے بعض اشخاص نے ایک مسلمان سب انسپکٹر کو جو قریب ہی تھا امداد کے لیے متوجہ کیا مگر افسوس کہ اُس نے لیگی ذہنیت کی وجہ سے ابتداءً لطائف الحیل سے کام لے کر کچھ دیر بعد صاف و صریح انکار کردیا کہ میں اس بڑے مجمع کو قابو میں لانے سے معذور ہوں، جب اس پولیس افسر نے اپنی شرعی و قانونی ذمّہ داری کا قطعی احساس نہیں کیا تو ہم میں سے بعض مایوسانہ طریقہ پر ورکشاپ کے اینگلو انڈین افسر کے پاس پہنچے، وہ فوراً اسٹیشن پر آیا اور اُس نے فی الواقعہ امن وامان قائم کرنے کی بہت کوشش کی، اپنے ماتحت مزدوروں سے یہاں تک کہا کہ خبردار! یہ تم کیا کرتے ہو؟ ہم جانتے ہیں کہ یہ شخص تمہارا بہت بڑا پوپ ہے، زبردست پادری ہے، نہایت نیک آدمی ہے، کیا تم اسی طرح غنڈہ پن سے شراب پی پی کر پاکستان لینا چاہتے ہو؟ دُور ہوجاؤ! دفع ہوجاؤ! تمہارے منہ سے شراب کی بُو آتی ہے! — غرض اس افسر نے سب کو سمجھایا مگر کچھ اثر نہ ہوا اور مدنی صاحبؒ اسی درمیان میں بمشکل تمام ویٹنگ رُوم میں داخل کیے جانے کے بعد حضرت عثمانِ غنیؓ کی طرح مظلومانہ محصور تھے۔ اس ناکامی کے بعد اسٹیشن افسران وغیرہ کی سعی کے ذریعے غنڈوں سے یہ طے پایا کہ مولانا کو اس صورت میں چھوڑا جاسکتا ہے کہ یہ اسی شب دار جلنگ میل سے واپس ہوجائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، حضرت شیخؒ ۸½ بجے شام سے لیکر ۱½ بجے شب تک پانچ گھنٹے اس مصیبتِ عظمیٰ میں مبتلا رہ کر دار جلنگ میل سے بھاگلپور کیلئے روانہ ہوگئے۔ پھر بھاگلپور پہنچ کر دوبارہ جو مصیبت آئی وہ بھی اخبارات میں مجملاً آچکی ہے، یہ ہے وہ رقت خیز و روح فرسا داستان کہ جس سے سوائے لیگی پریس کے ہر شخص مغموم و متاثر ہے اور اربابِ لیگ کی طرف سے واقعہ کی تکذیب کی جارہی ہے —

افسوس صد افسوس سے

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام　　　وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

مولانا ریاض الدین صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت اپنے دوستوں کو صبر و سکون کے ساتھ تسلّی و تشفّی دیتے رہے اور فرمایا "یہ تو کچھ بھی نہیں، آئندہ ملک کی اس سے بھی زیادہ خراب حالت ہونے والی ہے"۔ حملوں اور سب و شتم کے وقت حضرت شیخ کی کیا حالت تھی؟ مولانا ریاض الدین صاحب فرماتے ہیں کہ چہرے پر قطعاً خوف وہراس نہ تھا اور مدنی صاحبؒ اکثر مراقبہ کی حالت میں ہو جاتے تھے، یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرتِ ممدوح سے دیگر حضرات نے تحریری طور پر اجازت طلب کی کہ ہم غنڈوں کے قلع قمع کے لیے حاضر ہیں، مگر مولانا مدظلہٗ نے بلوہ کے اندیشہ اور اپنے اعتماد علی اللہ کی بنا پر اجازت نہیں دی، غالباً حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ واقعہ جس میں رسول اللہ (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) نے نام الملك ووقع الشيطن فرمایا تھا، ممدوح کے پیشِ نظر تھا۔ یہ تھا عمل بالحدیث ادام اللہ فضلہ وظلہٗ علی المسلمین والمسترشدین۔

مقامِ عبرت ہے کہ جس فرعونِ بے سامان نے زیادہ فرعونیت سے کام لیا تھا وہ تو اگلے ہی دن تالاب میں غرق ہو کر فوت ہو گیا اور جس پولیس افسر نے اپنی اخلاقی اور قانونی ذمہ داری کو محسوس نہیں کیا تھا اور کھڑے ہوئے کلوخ اندازی وغیرہ کا تماشہ دیکھا وہ بھی اپنے نوجوان فرزند کو سپردِ خاک کر کے سراپا تماشا بن گیا۔ پھر خدا کی شان کہ جس خیال سے یہ ہڑبونگ مچائی گئی تھی کہ جمعیۃ علماء کی تبلیغ نہ ہو آج بڑے اہتمام سے اُسی جگہ جمعیۃ قائم کی جا رہی ہے، جو لوگ اب تک غنڈے بنے ہوئے تھے اب وہ تائب ہو کر ایک دوسرے کو متہم کر رہے ہیں اور جس جھنڈے کے تحت یہ سب خرافات کی گئی تھیں اُسی جھنڈے کی اب اعلانیہ مخالفت شروع کر دی گئی ہے، اللہ رے قدرت کیا برعکس معاملہ ہے! صالح صاحب لکھتے ہیں:۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابّا جان! آپ کا خط موصول ہوا، ہم لوگ خدا کے فضل سے خیریت سے ہیں ہم لوگوں کیلئے کسی قسم کی فکر نہ کریں، بے فکر ہو کر کام کاج کریں اور ہم لوگوں کے لیے دعا کرتے رہیں۔

جن غنڈوں نے جناب حضرت قبلہ مولانا مدنی (رحمۃ اللہ علیہ) کے ساتھ گستاخی کی تھی وہ لوگ اب اس کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔ بڑے داروغہ کا بڑا لڑکا دوسرے ہی دن قضا کر گیا، یہ بات شاید آپ کو معلوم نہ ہو۔ اس کے بعد جس شخص نے حضرتؒ کے سرِمبارک سے ٹوپی اتار کر جلا دی تھی دوسرے

دن وہ بھی تالاب میں ڈوب کر مرگیا۔ سید پور میں ہلڑ مچ گیا، شبان ڈاکٹر اور چیتنا سب لوگ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم ا ہم ان غنڈوں کے ساتھ نہیں ہیں، ہم لوگوں سے ایسا ذلیل کام نہیں ہو سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ لیگیوں میں ۲ دو فرقے ہو گئے ہیں، بہت سے لوگ افسوس کر رہے ہیں کہ ایسا کام کرنا لیگیوں کی غلطی ہوئی ہے کہ لوگ لیگ سے ناراض ہو گئے ہیں ـــ کل بعد جمعہ قرب وجوار کے گاؤں کے سردار لوگ ہمارے گھر آگئے اور تبلیغی جماعت قائم کی اور جمعیۃ علماء ہند کی بھی ایک شاخ قائم کی جس کا صدر آپ کو بنایا گیا ہے اور مرحوم مظہر اللہ منڈل کے لڑکے عبد الکریم منڈل صاحب کو اسسٹنٹ سکریٹری بنایا گیا ہے، آس پاس کے لوگوں کے ناموں کی فہرست بھیجی ہے، آپ کے گھر آنے پر تمام سردار لوگ آپ کے پاس آئیں گے۔

فقط: صالح

آپ نے دیکھا کہ سچے لوگوں کو اللہ تعالےٰ کس طرح سچا ثابت کرتے ہیں، گو تفصیلات کا انتظار ہے مگر تاہم حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کی یہ کیسی زبردست اور کھلی ہوئی کرامت ہے ـــ (انتھیٰ بلفظہٖ)

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ حسب معمول ۱۹۴۶ء میں سلہٹ تشریف لے گئے، رمضان المبارک کے دینی اور روحانی معمولات میں مشغول تھے کہ آپ پر قاتلانہ حملہ ہوا جس کا چشم دید حال مولانا عبد الحمید اعظمی رکن مرکزی جمعیۃ العلماء ہند کی زبانی ملاحظہ ہو۔

"حضرتؒ کے اس آخری سفر سلہٹ میں وہ منحوس دن بھی پیش آیا جبکہ پورے ملک کی طرح یہاں بھی ایک مسلم جماعت کے حکم پر ڈائریکٹ ایکشن ڈے منایا گیا جس میں اپنے ایک "خاص مطالبہ" کے ساتھ قوم پرور مسلمانوں پر وحشیانہ حملہ کرنا بھی شامل تھا۔ چنانچہ سلہٹ میں نئی سڑک کی مسجد میں نمازِ جمعہ سے فراغت پاتے ہی اس فتنہ کا آغاز ہوا، پوری مسجد نمازیوں کے خون سے لت پت ہو گئی۔ خدا کی براہ راست نگرانی نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو محفوظ رکھا ورنہ اسباب وعلل کی دنیا میں حضرتؒ کی زندگی کے آثار نہیں تھے۔ میں نے ہنگامہ فرو ہونے کے بعد حضرتؒ سے تنہائی میں عرض کیا" آج تو کربلا کی یاد تازہ ہو جاتی مگر خدا نے خیر کی اور حضرت پر حملہ کرنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ یقیناً اس قوم نے ظلم کی انتہا کر دی ہے، اگر حضرتؒ نے اس پر

صبر کیا تو خدا خود اپنی گرفت میں لے کر اس قوم کو تباہ کر دے گا، خدارا ان کو اللہ کی گرفت سے بچائیے۔" ارشاد ہوا کیا چاہتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ "ان ظالموں کے حق میں بددعا فرما کر ان سے بدلے لیں تاکہ خدا براہِ راست اپنی گرفت میں نہ لے لے"، عجیب لہجہ میں فرمایا "بھائی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدلہ نہیں لیا تو میں ان کا غلام ہو کر کیا بدلہ لوں، اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں وہ اس قوم کو ہدایت دیں، اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔" (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص ۸۳)

اکابر خصوصاً حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اس گستاخانہ طرزِ عمل سے کبیدہ خاطر ہو کر علامہ سید سلیمان ندوی نے مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"مذہب اور دین کی حمایت کا نام لیکر عوام کو جوش دلانا اور اس سے اپنا کام نکالنا غلط انتہائی ہے جس سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچے گا ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمانوں کو ضبط، صبر، ڈسپلن، تنظیم، استقامت، تحمل و برداشت، ایثار، باہمی ہمدردی، عملی وحدت اور اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی جائے جو سیاست کی جنگ کا سب سے کارگر ہتھیار ہیں صرف زبانی جوش و خروش، گرما گرم محفلی اور اخباری بحث اور براہِ راست دست و گریبان ہونا قوم کی طاقت نہیں، ہماری بحثوں کا موضوع مسائل کا صواب و خطا ہونا چاہیئے نہ کہ اشخاص کے محاسن و معائب کا اظہار۔"

(الفرقان لکھنؤ، نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء ص ۱۶)

حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلاف جب کبھی ایسے حملے ہوتے تو اس وقت کے عارف باللہ مولانا عبدالقادر رائپوری اور دوسرے حضرات خبر دینے والوں سے پوچھتے کہ "حضرت نے اُن کے حق میں بددعا کی یا نہیں"؟ جب یہ بتایا جاتا کہ حضرت نے اپنی زبان سے کوئی کلمہ بددعا کا نہیں نکالا، تو آپ فرماتے: "بس ان حملہ آوروں کو اب اللہ تعالیٰ خود تباہ کر دے گا، کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے حملے ہوئے تو آپ نے صبر فرمایا، حملہ آور تباہ اور ہلاک ہو گئے۔" اس کے بعد وہی بنگال جس نے حضرت کی بات اُس وقت نہ مانی تھی آخری ۲۵ برس بعد اُسی پر عمل کیا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فردِ واحد نہ تھے بلکہ لاکھوں انسانوں کے مُرشد اور ہزاروں علماء و طلباء کے استاذِ محترم تھے جن میں ہندوستان، افغانستان، مشرقِ بعید

قبائل کے وہ علماء بھی تھے جو حضرت ؒ کے اشارہ پر جان قربان کرنے کو سعادت سمجھتے ہیں جن کا مقابلہ یہ بزدل ہرگز نہ کر سکتے، مگر حضرت دیگر علماء حق اور اولیاء عظام کی طرح مقام تسلیم و رضا پر فائز تھے، آپ کو قرب رسالت کی نعمت حاصل تھی، آپ مقرب بارگاہِ رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تھے جیسا کہ بعض سعادتمندوں کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سرزنش بھی ہو جاتی تھی، یہاں صرف ایک مصدقہ واقعہ درج کیا جاتا ہے۔

"۱۹۳۹ء کی تحریکِ مدح صحابہ لکھنؤ میں حضرت مدنی ؒ نے قائدانہ حصہ لیا تھا اور احرار کے پر جوش جان نثار رضا کار بے مثال قربانیاں پیش کر رہے تھے، اسی علاقہ کے صوفی محمد ادریس اس تحریک کے سخت مخالف تھے، ایک دن وہ اس حال میں مسجد میں آئے کہ بدن پر سرخ کپڑے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ بھائیو مجھے معاف کر دو میں نے ہمیشہ آپ لوگوں کی مخالفت کی ہے لیکن آج مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ ہی لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے اور دلارے ہیں، یہ کہہ کر روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں اور ارد گرد لوگ جمع ہو گئے، جب ہوش آیا تو کہنے لگے حسب معمول میں کل دن بھر مجلسِ احرار کے خلاف پروپیگنڈا کرتا رہا رات کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ امین آباد لکھنؤ کے ایک بازار میں ایک تخت بچھا ہوا ہے اور ایک سبز پوش بزرگ جن کا چہرہ آفتاب کے مانند چمک رہا تھا تشریف فرما ہیں اور ان کے چاروں طرف ہزاروں نورانی چہروں والے دو زانو بیٹھے ہوئے درود و سلام پڑھ رہے ہیں، اتنے میں میں نے دیکھا کہ مولانا حسین احمد مدنی ؒ دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں نانا جان آپ کی امت شیعوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر مجھ پر طرح طرح کے الزام لگاتی ہے اور ہر طرح کی گالیاں دیتی ہے، اس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کیا حال ہو گا میری امت کا؟ ایک حسین کو کربلا میں شہید کیا اور دوسرے حسین کو ہندوستان میں ذلیل کر رہے ہیں۔ پھر خواب ہی میں دیکھتا ہوں کہ سڑک پر سرخ پوش مسلمان مدح صحابہ پڑھتے ہوئے جا رہے ہیں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلایا اور سب کی پیشانیوں کو چوما، میں بھی دوڑا کہ حضور کی قدم بوسی کروں مگر آپ نے فرمایا کہ اس کو دربار سے نکال دو، یہ شخص جن کو میں پیار کرتا ہوں ان کو گالیاں دیتا ہے اور جو میرے اصحاب کو گالیاں دیتے ہیں انکی تعریف کرتا ہے اور ان کو اپنا سردار بناتا ہے آپ نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جو دو زانو بیٹھے ہوئے تھے اور درود و سلام پڑھ رہے تھے کہ ان کی عزت میری عزت ہے۔"

(حیات و کارنامے ص ۴۳۲ بحوالہ الجمعیۃ دہلی یکم اپریل ۱۹۳۹ء)

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

علماءِ حق کا آخری انتباہ

۲۶ اپریل ۱۹۴۶ء کو اُردو پارک دہلی میں پانچ لاکھ انسانوں کا اجتماع زیرِ صدارت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی منعقد ہوا جس میں عام مسلمانوں اور دیگر لوگوں کے علاوہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو اور برطانوی مشن کے سربراہ لارڈ پیتھک لارنس بھی شریک ہوئے۔ یہ اجتماع سرزمینِ ہند پر بین الاقوامی اجتماع تھا جس میں دیگر مسلمان زعماء کے مختصر بیانات کے بعد امیرِ شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری نوّر اللہ مرقدہٗ نے مفصّل خطاب فرمایا جس کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین ہے:۔

…… تقریباً ساڑھے تین بجے رات حضرت امیرِ شریعتؒ مائیک پر تشریف لائے، آپ نے انسانی سروں کے اس بحرِ بیکراں پر ایک بھرپور نظر ڈالی، ایک مرتبہ دائیں دیکھا اور پھر بائیں دیکھا جیسے لوگوں کی پیشانیوں سے موضوع تلاش کر رہے ہوں۔ پھر خطبۂ مسنونہ سے پہلے آپ نے تقریر کا آغاز یوں فرمایا۔ ”آپ حضرات دُرود شریف پڑھیں“ پھر دوبارہ فرمایا ”دُرود شریف پڑھیں“ تیسری مرتبہ بھی یہی فرمایا“ لوگ حیران تھے کہ آج شاہ جی اتنے بڑے عظیم الشان، عدیم المثال سیاسی اجتماع سے تقریر کا آغاز کس انداز سے کر رہے ہیں اس سے پہلے سیاسی تقریروں میں ایسا نہیں کرتے تھے۔ عوام کی نگاہوں سے اُبھرنے والے اس سوال کے جواب میں حضرت امیرِ شریعتؒ نے خود ہی فرمایا ”آج میں نے یہ اس لیے کیا ہے کہ اتنے بڑے عظیم اجتماع کے باوجود لوگ صبح کے اخبار میں لکھ دیں گے کہ مجمع تو واقعی پانچ لاکھ کا تھا مگر اس میں مسلمان ایک بھی نہ تھا، اس لیے میں نے دُرود شریف پڑھوا لیا ہے تاکہ دوستوں کو معلوم ہو جائے کہ اس اجتماع میں مسلمان ہیں یا یہ اجتماع ہی مسلمانوں کا ہے۔“ اس پر تمام مجمع کشتِ زعفران بن گیا۔ بعد ازاں آپ نے اپنے مخصوص انداز میں قرآنِ کریم کی تلاوت شروع کی، جُوں جُوں وقت گذرتا گیا حضرت امیرِ شریعتؒ کے گلے کی حلاوت اور سوز سے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے آیاتِ خداوندی کا نزول ہو رہا ہے، الفاظ جیسے جیسے پڑھتے قرآنِ کریم اپنے معانی و مطالب خود واضح کرتا چلا جاتا۔ لاکھوں آدمیوں کا یہ اجتماع پتھروں کا ڈھیر معلوم ہوتا تھا، چاروں طرف ہُو کا عالم اور ایک ایسا سناٹا تھا کہ سوئی گرے تو آواز نہ آئے اور عوام تھے کہ مبہوت بیٹھے تلاوتِ کلامِ الٰہی سن رہے تھے

ڈیڑھ رکوع پڑھنے کے بعد حضرت امیرِ شریعتؒ نے تلاوت ختم کی تو پنڈت جواہر لال نہرو اُٹھا اور مائیک پر حضرت امیرِ شریعتؒ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور معذرت خواہانہ انداز میں گویا ہوا، ”بھائیو! میں تو صرف بخاری صاحب کا قرآنِ کریم سننے کے لیے حاضر ہوا تھا اب میں معذرت کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں برطانوی مشن کی آمد کے باعث مصروفیت بہت زیادہ ہے۔“ اس کے بعد جواہر لال نہرو اور لارڈ پیتھک اسٹیج سے اُتر کر چلے گئے۔ حضرت امیرِ شریعتؒ نے خطبۂ مسنونہ کے بعد تقریر کا آغاز یوں فرمایا:۔

”حضرات! آج میں نے کوئی تقریر نہیں کرنی بلکہ چند حقائق ہیں جنہیں بلا تمہید کہنا چاہتا ہوں، آئینی اور غیر آئینی دُنیا میں خواہ اس علاقے کا تعلق ایشیا سے ہو یا یورپ سے، اس وقت جو بحث چل رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی ہندو اکثریت کو مسلم اکثریت سے جُدا کر کے برِّصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، قطع نظر اس کے کہ اس کا انجام کیا ہو گا؟

پاکستان کیا ہو گا؟ مجھے پاکستان بن جانے کا اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات پر کہ صبح کو سورج مشرق ہی سے طلوع ہو گا، لیکن یہ پاکستان وہ پاکستان نہیں ہو گا جو دس کروڑ مسلمانوں کے ذہنوں میں موجود ہے اور جس کیلئے آپ بڑے خلوص سے کوشاں ہیں، ان مخلص نوجوانوں کو کیا معلوم کہ کل اُن کے ساتھ کیا ہونے والا ہے! بات جھگڑے کی نہیں بات سمجھنے اور سمجھانے کی ہے، سمجھا دو مان لوں گا، لیکن تحریکِ پاکستان کی قیادت کرنے والوں کے قول و فعل میں بلا کا تضاد ہے اور بنیادی فرق ہے۔ اور اگر مجھے کوئی اس بات کا یقین دلا دے کہ متقسم پاکستان کے کسی قصبہ کی گلی میں، کسی شہر کے کسی کوچہ میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام اور شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ ہونے والا ہے تو ربِّ کعبہ کی قسم آج ہی میں اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو لوگ اپنے جسم پر اسلامی قوانین نافذ نہیں کر سکتے وہ دس کروڑ افراد کے وطن میں کس طرح اسلامی قوانین نافذ کر سکتے ہیں؟ یہ ایک فریب ہے اور میں فریب کھانے کیلئے ہرگز تیار نہیں ہوں“ — پھر آپ نے اپنی کلہاڑی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر تقسیم کے بعد مشرقی اور مغربی پاکستان کا نقشہ سمجھانا شروع کر دیا، آپ نے فرمایا ”اِدھر مشرقی پاکستان ہو گا اور اُدھر مغربی پاکستان ہو گا، درمیان میں ہندو کی ۴۴ کروڑ آبادی ہو گی، اور وہ حکومت لالوں کی حکومت ہو گی۔

ہندو ذہنیت شاہ جیؒ کی نظر میں کون لالے؟ لالے، دولت والے لالے، ہاتھیوں والے لالے،

لاسے مکار لالے ہندو اپنی مکاری اور عیاری سے پاکستان کو ہمیشہ تنگ کرتے رہیں گے، اسے کمزور کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس تقسیم کی بدولت آپ کا پانی روک دیا جائے گا، آپ کی معیشت تباہ کرنے کی کوشش کی جائے گی اور آپ کی یہ حالت ہوگی کہ بوقتِ ضرورت مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کی اور مغربی پاکستان مشرقی پاکستان کی مدد سے قاصر ہوگا، اندرونی طور پر پاکستان میں چند خاندانوں کی حکومت ہوگی اور یہ خاندان زمینداروں، صنعتکاروں اور سرمایہ داروں کے خاندان ہوں گے۔ انگریز کے پروردہ فرنگی سامراج کے خود کاشتہ پودے، سروں، نوابوں اور جاگیرداروں کے خاندان ہوں گے جو اپنی من مانی کارروائی سے ہر محبِ وطن اور غریب عوام کو پریشان کرکے رکھ دیں گے، غریب کی زندگی اجیرن ہو جائے گی، اُن کی لُوٹ کھسوٹ سے پاکستان کے کسان اور مزدور نانِ شبینہ کو ترس جائیں گے ـــ امیر روز بروز امیر تر اور غریب روز بروز غریب تر ہوتے چلے جائیں گے۔"

رات کافی بھیگ چکی تھی، حضرت امیرِ شریعتؒ اپنی سیاسی بصیرت کے موتی بکھیر رہے تھے اور مستقبل سے ناآشنا مسلمان منہ کھولے انجانے واقعات کو حیرت و استعجاب کے عالم میں سُن رہے تھے، حضرت امیرِ شریعت نے ہندوؤں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "پاکستان کی بنیاد ہندو کی تنگ نظری اور مسلمان دشمنی پر استوار ہوئی ہے۔ دولت سے پیار کرنے والے ہندو نے گائے کی پوجا کی، پیپل مہاراج پر پھول چڑھائے، چیونٹیوں کے بلوں پر شکر اور چاول ڈالے، سانپ کو اپنا دیوتا مانا لیکن مسلمان سے ہمیشہ نفرت کی، اُس کے سائے تک سے اپنا دامن بچائے رکھا، پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ ذات پات کے پجاری بڑے سے بڑے ہندو نے اچھوتوں پر اپنے مندروں کے دروازے کھول دیئے لیکن مسلمانوں کے لیے اپنے دل کے دروازے کبھی وا نہ کیے۔ آج اُسی تعصب، تنگ نظری اور حقارت آمیز نفرت کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان اپنا الگ وطن مانگنے پر مجبور ہوا ہے، اور کانگریس یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اپنی مصلحتوں کی بناء پر خاموش رہی۔ اگر کانگرسی راہنما ہندو مہاسبھائیوں، جن سنگھی انتہا پسندوں اور اسی قسم کی تحریکوں کو اپنے اثر سے ختم کر دیتے اور وہ کر بھی سکتے تھے تو مسلم لیگ کو یہاں پنپنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی۔ مگر کیا کیا جائے کہ یہ کوڑھ کانگرس کے اندر سے پھوٹا ہے۔ جو بیماری جسم کے اندر سے پیدا ہو اُس کا علاج محض باہر کے اثرات کو تبدیل کرنے سے نہیں ہو سکتا۔ کانگرس نے ہمارے ساتھ بھی نباہ نہ کیا، اگر مسلم لیگ سے بگاڑ پیدا کیا تھا تو نیشنلسٹ مسلمان کی بات ہی مان لی ہوتی، لیکن ایسا نہ ہو سکا اور ہوا کیا کہ آج اس قدر قربانیوں کے

باوجود دونوں فرنگی کو اپنا ثالث مان رہے ہیں۔ کون فرنگی؟ جو ہندوستان کے لیے کبھی بھی صحت مند اور انصاف پر مبنی فیصلہ ہرگز نہیں دے سکتا۔ اے کاش! کانگرس نے ہم سے ہی نہیں تو مسلم لیگ سے ہی بنائی ہوتی تاکہ آپس میں مل بیٹھ کر کوئی صحیح حل تلاش کر لیا جاتا۔"

رات کافی گذر چکی تھی، سحر قریب تھی اور حضرت امیر شریعت بے تکان بولے جا رہے تھے، کیا مجال کہ ایک متنفس بھی کہیں سے ہلا ہو، یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ جیتے جاگتے انسان نہیں بلکہ انسانی شکل و صورت کی مورتیاں پڑی ہوئی ہیں۔ آخر میں حضرت امیر شریعتؒ نے زوردار آواز میں کہا کہ:۔

"کانگرس اور مسلم لیگی دونوں سنو! ؎

میر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

شاہ جی کی پیشگوئی

یاد رکھو کہ اگر آج تم باہم بیٹھ کر کوئی معاملہ طے کر لیتے تو وہ تمہارے حق میں بہتر ہوتا، تم الگ الگ رہ کر باہم شیر و شکر رہ سکتے تھے، مگر تم نے اپنے تنازعہ کا انصاف فرنگی سے مانگا ہے اور وہ تم دونوں کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والا فساد برپا کر کے جائے گا جس سے تم دونوں قیامت تک چین سے نہیں بیٹھ سکو گے اور آئندہ بھی تمہارا آپس کا کوئی ایسا تنازعہ باہمی گفتگو سے کبھی بھی طے نہیں ہو سکے گا۔ آج انگریز سامراج کے فیصلے سے تم تلواروں اور لاٹھیوں سے لڑو گے تو آنے والے کل کو توپ اور بندوق سے لڑو گے، تمہاری اس نادانی اور من مانی سے اس برصغیر میں جو تباہی ہو گی، عورت کی جو بے حرمتی ہو گی، اخلاق اور شرافت کی تمام قدریں جس طرح پامال ہوں گی تم اس وقت اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں وحشت و درندگی کا دور دورہ ہو گا، بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو گا، انسانیت اور شرافت کا گلا گھونٹ دیا جائے گا اور کسی کی عزت محفوظ نہیں ہو گی، نہ مال، نہ جان، نہ ایمان، اور اس سب کا ذمہ دار کون ہو گا؟ تم دونوں! (بہت خوب) لیکن اس وقت تم یہ نہیں دیکھ سکتے، تمہاری آنکھوں پر اپنی خود غرضی اور ہوس پرستیوں نے پردے ڈال رکھے ہیں اور تم ایک ایسے شخص کی مانند ہو کہ جو عقل تو رکھتا ہو مگر صحیح سوچنے سے عاری ہو، کان ہیں مگر سن نہیں سکتا، آنکھیں ہیں مگر بصارت چھن چکی ہے، اس کے سینے میں دل تو دھڑک رہا ہے مگر احساسات سے خالی محض گوشت پوست کا ایک لوتھڑا"۔۔۔ ابھی

تقریر جاری تھی کہ صبح کی اذان کی آواز کانوں میں پڑی اور حضرت امیر شریعتؒ نے دہلی والوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: "دہلی والو! سن رکھو! میری یہ باتیں یاد رکھنا، حالات بتا رہے ہیں کہ اب زندگی میں جیتے جی پھر کبھی بھی ملاقات نہ ہو سکے گی ؎

اب تو جاتے ہیں مے کدہ سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

حضرات! یہ تھے وہ چند حقائق جن کو میں بغیر کسی تمہید کے کہنا چاہتا تھا سو آج میں نے کہہ دیئے، اور اب! ؎

مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

(ہفت روزہ ختم نبوت (ملتان) ۲۱ر ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ / ۱۰ر مئی ۱۹۹۶ء)

افسوس ہے کہ مسلمانوں کی واحد نمائندگی کی دعویدار مسلم لیگ نے بھی اسی انگریز کے نمائندہ کو ثالث تسلیم کر لیا جس انگریز کو نکالنے کے لیے مسلمانوں نے بے نظیر قربانیاں دی تھیں، انگریز کے نمائندہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچایا وہ مسلم لیگ کے سرکردہ راہنما اور پاکستان کے سابق وزیرِ دفاع میاں ممتاز دولتانہ کے الفاظ میں درج ذیل ہے:۔

"پاکستان کا اصل نقشہ میں نے قائدِ اعظم کے پاس دیکھا تھا جس میں پنجاب، سندھ، سرحد، بنگال، آسام اور کشمیر کے حصے شامل تھے لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف نے مکاری سے اس نقشہ کی شکل بدل دی — ہندوستان کا گورنر جنرل بننے کے لیے اس نے بہت بری اور گندی سیاست کی اور ہمیں باندھ کر مارا اور ہمارے دریاؤں کا منبع (کشمیر) اس کی سازش کی وجہ سے ہندوؤں نے ہم سے چھین لیا اور یوں مسلمانوں کے اکثریتی علاقے بھی ہمارے حصہ نہ آئے اور دوسری مسلمان ریاستیں بھی ہمیں نہ ملیں"۔

(روزنامہ جنگ راولپنڈی مؤرخہ ۷ر فروری ۱۹۹۶ء)

مشہور مسلم لیگی لیڈر چوہدری خلیق الزمان نے اس پاکستان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے :-

"اکثر سمجھ دار اور فہیم سیاست دان آج اٹھارہ برس بعد بھی یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ مسلمانوں کو مل سکتا تھا وہ مل گیا اور اس سے زیادہ وہ برٹش گورنمنٹ سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے تھے .... اب تقسیم کے بعد تو مسٹر جناح نے پاکستان میں اپنی ایک تقریر میں کہا کہ انگریز نے ہم کو ایک کٹا پٹا مجروح اور پاش پاش پاکستان دیا ہے، پنجاب تقسیم ہو رہا تھا، بنگال بھی تقسیم ہو رہا تھا، کشمیر پر بھی ہمارا قبضہ نہ تھا، لہٰذا اس کو کٹا پٹا پاکستان کہنا بھی غلط تھا کیونکہ "ک" جو کشمیر کی علامت تھی وہ بھی غائب تھی اور ہمیں صرف پاستان مل رہا تھا۔"

(شاہراہِ پاکستان از چوہدری خلیق الزمان ص۱۰۵۱ مطبوعہ اکتوبر ۱۹۶۷ء)

برِصغیر کے مسلمانوں کی قسمت کے فیصلہ کا دن

اور جمعیتہ العلماء ہند کا فارمولا

آخر تقریباً دو سو سال کی اس محنت اور عظیم قربانیوں کے بعد (جس کی ابتداء مسلمانوں نے اپنے علماء کے ہندوستان کو دار الحرب قرار دینے کے بعد کی تھی جبکہ دوسرے برادرانِ وطن نے اس پر کوئی توجہ نہ دی تھی) وہ دن آ پہنچا کہ برِصغیر کے مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کیا جائے۔ آزادئ ہند کے منصوبہ کو عملی طور پر سرانجام دینے کے لیے برطانوی حکومت نے ایک وفد ہندوستان بھیجا جو کہ لارڈ پیتھک لارنس، سر اسٹیفورڈ کرپس اور مسٹر اے وی الگزینڈر پر مشتمل تھا۔ یہ وفد مارچ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان پہنچا اور وائسرائے ہند لارڈ ویول کے ساتھ مل کر ہندوستانی لیڈروں سے مصروفِ گفتگو ہوا۔ وفد کے سامنے تمام سیاسی جماعتوں نے اپنی اپنی تجاویز یا باصطلاح جدید فارمولے پیش کیے، جمعیتہ العلماء ہند نے صدرِ جمعیتہ حضرت مدنیؒ کی سربراہی میں ۱۶ اپریل ۱۹۴۶ء کو شام چار بجے سے سوا پانچ بجے تک اپنے فارمولا کے مختلف پہلوؤں پر وفد کے ساتھ سوالات کے جوابات دیئے۔ بہتر ہے کہ وہ فارمولا ناظرین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے تاکہ آج کے حالات کی روشنی میں مسلمان اس کی افادیت کے بارہ میں خود فیصلہ فرمالیں۔

(۱) ہندوستان کا دستورِ حکومت وفاقی اصول پر مرتب کیا جائے۔

(۲) تمام صوبے یا وفاقی وحدتیں مکمل طور پر آزاد ہوں اور غیر مصرحہ اختیارات انہی کو حاصل ہوں۔

(۳) وفاقی مرکز کو صرف وہی اختیارات حاصل ہوں جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں۔

(۴) وفاقی وحدتوں کے لیے حق خود ارادیت تسلیم کیا جائے۔

(۵) وفاق کی تشکیل ایسے اصولوں پر کی جائے جس میں مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی اور تہذیبی حقوق کا تحفظ اس طرح کیا جائے جو مسلمانوں کے لیے قابلِ اطمینان ہو، جمعیتہ علماء کی رائے میں یہ اطمینان ذیل کے اصولوں سے کسی اصول پر وفاقی حکومت کی تشکیل سے حاصل ہو سکتا ہے:۔

(الف) مرکزی ایوان میں نمائندگی کا تناسب یہ ہو:۔

ہندو (۴۵) مسلمان (۴۵) دیگر اقلیتیں (۱۰)

جمعیتہ علماء نے اس دفعہ کی روح کو بطور اصول پیشِ نظر رکھا ہے۔

(ب) اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکانِ مرکزی کی ۳/۲ اکثریت اپنے مذہبی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی آزادی کے خلاف قرار دے تو قانوناً وہ بل ایوان میں زیرِ بحث نہ آسکے۔

(ج) ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جو مرکز اور صوبوں کے تنازعات، صوبوں کے باہمی نزاعات اور ملک کی قوموں کے اختلافات کا آخری فیصلہ کرسکے اور جس میں مسلم، غیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو، سپریم کورٹ کے ججوں کے تقرر کا اختیار مسلم اور غیر مسلم صوبوں کی ایک ایسی کمیٹی کو دیا جائے جس میں مسلم اور غیر مسلم ارکان کی تعداد مساوی ہو۔

(د) یا اس کے علاوہ اور کوئی اصول جو مسلم اور غیر مسلم جماعتوں کے اتفاق سے طے کیا جائے۔[1]

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس قدر دردناک ہے کہ اس کا نقل کرنا بھی دردناک ہے۔ آخر حکومتِ برطانیہ کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو سرزمینِ ہندوستان پر قدم رکھا، یہ وائسرائے لٹے پٹے، زخمی اور خون آلود ہندوستان سے جان چھڑانے کے لیے آیا تھا مگر وہ ہندوستانیوں کو اس حال میں چھوڑنا چاہتا تھا کہ یہ باہم دست و گریباں ہو جائیں اور حالات اس حد تک جا پہنچیں کہ انگریزی اقتدار کو پھر یاد کریں۔

اگرچہ قائد اعظم محمد علی جناح نے جو واقعتاً تحریکِ پاکستان کے فعال کارکن تھے قیامِ پاکستان سے ایک سال پہلے آزاد پاکستان کے مطالبہ سے دستبرداری اختیار کرلی تھی اور کیبنٹ مشن پلان تسلیم کرلیا تھا جس کے ماتحت ہندوستان ایک مرکزی حکومت کے ماتحت آزاد ہوتا جو تین زون پر مشتمل ہوتا، مشرقی اور مغربی زون میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی اور سنٹرل زون میں ہندوؤں کی اکثریت ہوتی، مستقبل کیلئے اس پلان میں یہ طے کیا گیا تھا کہ دس سال بعد ان میں سے کوئی زون علیحدہ ہونا چاہے تو اسے اختیار ہوگا، گویا کہ ایک علیحدہ ملک کا امکان دس سال کیلئے تو بہرحال مؤخر ہورہا تھا اور قائد اعظم نے اسے تسلیم کرلیا تھا۔"[2]

یہی صورتِ حال اور طرزِ فکر اس کے بعد بھی باقی رہی ___ چنانچہ جب صدر ایوب خان مرحوم نے پنڈت نہرو سے ملاقات کی تو پاکستان اور بھارت کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے مختلف تجاویز پیش کیں جن میں ایک یہ بھی تھی کہ ہمارا دفاع مشترکہ ہونا چاہیے۔[3]

---

[1] خطبۂ صدارت جمعیۃ علماء ہند کانفرنس سہارنپور، ۷ مئی ۱۹۴۵ء [2] ماہنامہ میثاق لاہور بابت اگست ۱۹۹۶ء ص ۸

[3] روزنامہ جنگ راولپنڈی ۱۵ مارچ ۱۹۹۶ء ص ۱

۱۹۴۶ء کا طوفانی سال

مہیب، انسانیت سوز اعمال کا ارتکاب

جوں جوں ہندوستان کی انگریز درندوں سے آزادی کے دن قریب آ رہے تھے توں توں انگریزی کیمپ میں گھبراہٹ اور اضطراب اُبھر رہا تھا کہ سونے کی چڑیا اب ہاتھ سے نکل جائے گی اور جن انسانوں کو چند ٹکوں کے عوض میں خرید کر اُن کے خون سے وہ سورج نما چراغ جلا کرتا تھا کہ انگریز فخر سے کہتا تھا کہ:۔

"انگریزی حکومت کی عملداری میں سُورج غروب نہیں ہوتا"

اب وہ سورج اس قدر تاریکی میں ڈوب جائیگا کہ خود برطانیہ کو بھی اپنی جان بچانی مشکل ہو جائیگی اسلیے متوقع آزادی کے سال ۱۹۴۷ء کی آمد سے پہلے ہی ایک طوفان برپا کرنے کی تحریک شروع کرنے کی تجاویز زیر غور آنے لگیں اور ان تجاویز میں سب سے بڑی تجویز یہ تھی کہ جن مجاہدوں اور جان نثاروں کے اکابر نے انگریزی حکومت سے بغاوت کی تھی اور علم جہاد بلند کیا تھا اُن کے دُنیا سے چلے جانے کے بعد اُن کے مخلص خُدام نے اس بغاوت کو اس وقت تک نہ صرف جاری بلکہ سرگرم عمل رکھا جب تک انگریز کے ناپاک قدم ڈگمگانے نہ لگے، جاتے جاتے اُن سے بدلہ لیا جائے اس طوفان کی خبر ۱۹۴۵ء میں یوں دی گئی:۔

"ہندوستان میں طوفان اُٹھنے والا ہے" ایک امریکن اخبار کا بیان

(نیویارک/۲۶ دسمبر) امریکہ کے مشہور رسالہ "ٹائم نیوز" میں اسکے ذونامہ نگار کی چٹھی شائع ہوئی ہے جس میں یہ پیشینگوئی کی گئی ہے کہ ہندوستان میں جلد ہی طوفان آنیوالا ہے، یہ طوفان یا تو جنرل انتخاب کے فوراً بعد غالباً مارچ ۱۹۴۶ء میں آ جائیگا یہ طوفان ہماری حکومت کے خلاف ہوگا یا اندرونی فرقہ وارانہ کشمکش کا انتہائی عروج ہوگا لیکن ان سوالات کا صحیح جواب آنیوالے واقعات سے ہی ملے گا انہوں نے مزید لکھا ہے کہ ہم اس مرحلہ پر کسی انقلاب یا بغاوت کی پیشینگوئی سے اجتناب کرتے ہیں لیکن واقعات کی رفتار اس امر کی شہادت دے رہی ہے کہ نتیجہ خوفناک نکلے گا، قطع نظر اس بات کے کہ جاوا اور ہند چینی میں ہندوستانی فوجوں کے استعمال کے خلاف ہمہ گیر ناراضگی پائی جاتی ہے، لیبر پارٹی نے بھی ہندوستانیوں کو مایوس اور نا اُمید کر دیا ہے، بہرحال ہمیں اس بات کا پکا یقین ہے کہ ہندوستان میں گڑبڑ ہونیوالی ہے۔ برطانوی حکومت بھی آنے والے طوفان سے بے خبر نہیں۔ (سہ روزہ زمزم لاہور بابت ۳۰ دسمبر ۱۹۴۵ء)

اس خطرہ کا احساس اُس وقت برطانیہ کے وزیر اعظم اٹیلی کو بھی تھا مگر افسوس ہے کہ ہندوستان کے راہنماؤں کو اس کا احساس نہ تھا بلکہ وہ جشنِ آزادی کی خوشیاں منانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ مسٹر اٹیلی نے ۱۰ / دسمبر ۱۹۴۶ء کو اپنی کابینہ کے ارکان کے ساتھ گفتگو میں کہا:-

"شاید صورتحال اس طرح کا رُخ اختیار کر جائے جس کا نتیجہ ہندوستان میں خانہ جنگی اور خون کی ندیاں بہہ نکلیں، ہندوستان کے راہنماؤں کو احساس ہی نہیں کہ امنِ عامہ اور حکومت کے خاتمہ کا خطرہ موجود ہے" (تقسیمِ ہند افسانہ اور حقیقت ص ۹۲)

اس طوفان کا مختصر حال

ماضی کی اس خونی داستان کو تحریر میں لانا زخموں کا کریدنا ہوگا، اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ سات آٹھ لاکھ جانیں یقیناً ضائع ہوئیں، مشرقی پنجاب کے یہ حالات سُن کر مغربی پنجاب میں اس کا بڑا ردِّ عمل ہوا اور کچھ تھوڑا بہت بدلہ مشرقی پنجاب کا یہاں بھی لیا گیا، حالانکہ یہاں نہ اس کے لیے پہلے سے کوئی پیش بندی کی گئی تھی اور نہ ایسے مواقع دستیاب تھے۔ بہر نوع ہندوستان کی سرزمین پر اتنا بڑا کشت وخون ہوا جس کی نظیر دُنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی، انسانیت بہیمیت میں بدل گئی۔ عزّت، آبرو اور جان مال کی کوئی قیمت نہ رہی، منافرت نے دیوانگی کی شکل اختیار کر لی جس میں اچھے بُرے، نیک وبد، عقیل وفہیم سب گرفتار ہو گئے، آٹھ آٹھ لاکھ انسانوں کے قافلے بنے جو منزل بمنزل ہندوستان پاکستان کی طرف پولیس اور فوج کی نگرانی میں خستہ اور پریشان بے یار و دیار بڑھنے لگے اور اس منظر کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہوائی جہاز سے دیکھنے لگے، یہ تمام دہشت و بربریت گاندھی جی کی زندگی میں اس کے دیش میں ہوئی تھی۔ (شاہراہِ پاکستان مصنفہ چوہدری خلیق الزمان ص ۱۰۶۹)

—— "پاکستان اور بھارت دونوں میں لاکھوں افراد کو اپنے آبائی گھر چھوڑنے پڑے، چنانچہ قیامِ پاکستان کے ساتھ اگر لاکھوں غیر مسلم ترکِ وطن کر کے بھارت چلے گئے تو اُن سے کہیں زیادہ لُٹے پٹے مسلمان بھارت کے مختلف حصّوں سے قافلوں کی صورت میں پناہ لینے کے لیے پاکستان میں آنے لگے، دو طرفہ آمد و رفت کا یہ سلسلہ اس نئی مملکت کی سرحدوں کے سرکاری اعلان سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا، پاکستان میں تباہ حال مہاجرین کی آمد کا سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا، ان میں سے اکثر صرف تن کے کپڑوں میں پیدل آئے، بعض نے ریل گاڑیوں سے لے کر بیل گاڑیوں تک ہر ممکن سواری کے ذریعے

اس نئی مملکت کی سرحدوں تک کا سفر کیا تھا، راستے میں ان پر حملے ہوئے اور بہیمانہ قتل و غارت اور سنگدلانہ لوٹ مار کا شکار ہوئے۔ آج تک پاکستان کے سفر کے دوران شہادت کا یہ جام نوش کرنے والے مردوں، عورتوں اور بچوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکی لیکن عام اندازے کے مطابق تقسیم کے بعد چند ماہ میں سوا کروڑ کے لگ بھگ لوگ اپنے آبائی گھر چھوڑنے پر مجبور ہوئے، ایک کروڑ کے قریب مسلمانوں کو مشرقی پنجاب اور دوسرے علاقوں میں بے خانماں ہو کر بے سروسامان قافلوں کی صورت میں پاکستان آنا پڑا تقریباً دس لاکھ مسلمان شہید کر دیئے گئے۔" (تحریکِ پاکستان ص ۲۷)

اس عظیم ترین انسانی ہجرت کا نقشہ پیش کرتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن کے پریس سیکرٹری کیمبل جانسن نے لکھا ہے کہ: "جب ۲۱ ستمبر ۱۹۴۷ء کو (ماؤنٹ بیٹن) گورنر جنرل کے ساتھ طیارہ میں ہجرت کا اندازہ لگانے محوِ پرواز ہوئے تو مسلمانوں کے صرف ایک کارواں پر ۱۵ منٹ تک پرواز کرتے رہے جبکہ ہوائی جہاز کی رفتار ۱۸۰ میل فی گھنٹہ تھی، جس کا مطلب یہ ہے کہ صرف یہ ایک قافلہ ۴۵ میل لمبا تھا۔" (مسلم لیگ کا دورِ حکومت ص ۲۰)

ان فسادات کی مختصر مگر دلسوز کیفیت

اگرچہ نواکھالی، بہار، دلی بلکہ ہر شہر میں فسادات کی ایسی آگ پھیل چکی تھی جس کا ٹھنڈا کرنا ناممکن تھا، مگر مشرقی پنجاب میں جو تباہی ہوئی اس کی تفصیل کے لیے کئی دفتر درکار ہیں، یہاں اجمالی طور پہ دل پر پتھر رکھ کر عرض کیا جاتا ہے کہ:

"پنجاب کے شرنارتھی اور دلی کے مہاجرین اپنے نئے وطن ہندوستان یا پاکستان کی طرف اور اصل میں موت کی طرف ہجرت کر رہے تھے، ہزاروں بلکہ لاکھوں بے گھر و بے در لوگ اسٹیشنوں پر گاڑیوں کے انتظار میں مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے، گاڑی کے رکنے سے پہلے ہی یہ بدقسمت اس پر ٹوٹ پڑتے تھے، جس طرح گڑ کی ڈلی بھنبھناتی ہوئی مکھیوں میں دب جاتی ہے اسی طرح ٹرین آدمیوں کے ہجوم میں چھپ جاتی تھی اور اس میں روئی گٹھوں کی طرح انسان اوپر نیچے پیک ہو جاتے تھے، پھر دروازوں سے لٹکنے، چھتوں پر سوار ہونے اور ڈبوں کے درمیان بمپروں پر چپکنے کی باری آتی تھی۔ راستے میں حملہ آور جتھے ان کے انتظار میں رہتے تھے۔ گاڑیوں کو روکنے کے بہت طریقے تھے، لائن پر پتھر کی چٹان، درختوں کے تنے اور اینٹوں کے انبار بہت آسان اور کامیاب رکاوٹیں تھیں، مگر ان سے بھی اچھا طریقہ یہ تھا کہ مسلمان ٹرین کو ہندو ڈرائیور اور ہندو گاڑیوں کو مسلمان ڈرائیور مناسب موقع پر روک دیتے تھے، ورنہ ٹرین میں چھپے ہوئے سکھ اور

آرایس ایس زنجیر کھینچ لیتے تھے اور پھر حملہ آور درندوں، وحشی کتوں اور بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑتے تھے، کسی طرف سے ست سری آکال کی آواز آتی کہیں اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوتا اور کبھی بجرنگ بلی کی جے گونجتی، درندے سمجھتے تھے کہ ہم ہندو ہیں، سکھ ہیں اور مسلمان ہیں ؎

انسان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں ۔۔۔ نادان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں
لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہ ۔۔۔ شیطان سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں[1]

شملہ سے ایک ٹرین دِلّی کے لیے روانہ ہوئی، اس میں وائسرائے ہاؤس کے ہندو ملازم بھی سفر کر رہے تھے، ٹرین میں سفر کرنے والے وائسرائے ہاؤس کے مسلمان ملازمین پر سکھوں کا حملہ ہوا، ہندو ملازمین نے سکھوں کا ساتھ دے کر اپنے اُن ساتھیوں کو ذبح کر ڈالا جن کے ساتھ وہ برسہا برس سے کندھے سے کندھا ملا کر کام کرتے تھے۔ ان مظالم اور درندگیوں پر دونوں طرف کے لیڈروں کے بھی کلیجے کانپ اُٹھے مگر ایک شخص ایسا بھی تھا جو مطمئن اور پُرسکون تھا، یہ ولبھ بھائی پٹیل تھے، یہ واقعات سُنکر انہوں نے کہا "ارے یہ تو ہونا ہی تھا۔" ایک سڑک پر دو آدمی اپنی راہ چلے جا رہے تھے، اچانک گلی میں سے چھ ہندو نکل کر چلّائے مسلمان! مسلمان! پکڑو! مارو! وہ ہندو سترہ اٹھارہ برس کے چھوکرے تھے اُنہوں نے ان راہگیروں کو دبوچ لیا اور انہیں ننگا کر کے دیکھا تو واقعی اُن کے مسلمانی تھی، لڑکوں نے ان کو باندھ کر ندی میں دھکیلا اور سلاخیں مار مار کر قتل کر ڈالا، ندی کا پانی تھوڑی دیر کیلئے کچھ لال ہو گیا، ہندو لڑکوں نے فتح کا نعرہ لگایا۔ ندی کے کنارے کچھ دھرماتما بڑے اطمینان سے پوجا پاٹ میں مصروف رہے اور کچھ عورتیں پوری لطف اندوزی کے ساتھ اشنان کرتی رہیں، ہاں یہ ضرور ہوا کہ دھرماتماؤں اور عورتوں نے لڑکوں کے نعروں کے جواب میں کالی مائی کی جے تہیں پکاری ۔۔۔ لاہور شہر جس میں کچھ ہی دن پہلے چھ لاکھ ہندو سکھ رہتے تھے اب وہاں صرف ایک ہزار ہندو باقی تھے اور وہ بھی وہ لوگ جو اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کیلئے پاکستانی حکومت کی ذمہ داری میں تھے۔ یہی حال پاکستان کے دوسرے علاقوں کا بھی تھا، پھر بھی مار پیٹ کر پورے پاکستان میں دس بیس ہزار ہندو تو رہ ہی گئے تھے مگر ہندوستانی پنجاب میں لاہور سے

---

[1] پیارے صاحب رشید لکھنوی

لیکر انبالہ تک اور پانی پت کرنال گوڑگاؤں تک ایک بھی مسلمان نہیں بچا تھا، یا تو چن چن کر
قتل کر دیئے گئے تھے یا پاکستان دھکیل دیئے گئے تھے ـــ اسکے آگے سہارنپور اور دلی کی
کی باری تھی مگر یہاں سکھوں کی آبادی نہیں تھی اور ہندوؤں کا ایک طبقہ انسانیت نواز اور صلح پسند
تھا، اسکے علاوہ یہاں کے مسلمانوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنا وطن نہیں چھوڑیں گے اور اپنی
سرزمین کو اپنے خون سے لالہ زار بنا دیں گے۔"

اس میں شک نہیں کہ فسادات میں ہندو، مسلمانوں اور سکھوں نے حصہ لیا مگر سکھوں نے مسلمانوں پر
بہت زیادہ ظلم کیا جس کی کچھ تفصیل گذر چکی ہے حالانکہ سکھوں کو کم از کم اپنی مقدس عبادت گاہ دربار صاحب
امرتسر کا خیال رکھنا چاہیئے تھا جسکی بنیاد مسلمانوں کے ایک ولی اللہ حضرت میاں میرؒ نے رکھی تھی اور ہندو اور سکھو
کو اس امر کا خاص خیال رکھنا چاہیئے تھا کہ مسلمانوں کی تقریباً آٹھ سو سالہ حکومت میں اُن کو کس قدر امن اور آرام
ملا مگر افسوس ہے کہ انہوں نے تمام احسانات کو پس پشت ڈال کر مسلمانوں کی جان، مال اور عزت کو برباد کرنے
میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی، مسلمان بھی اس جرم میں برابر کے شریک ہیں مگر پھر بھی مسلمان طبعاً رحمدل واقع
ہوئے ہیں۔ ان فسادات میں بھی خاص کر نواکھالی کے فسادات میں کئی مسلمانوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر
ہندوؤں کو بچایا جس کا اعتراف خود گاندھی جی نے کرتے ہوئے کہا ہے کہ:۔

"مسلمانوں کی کامیابی صرف اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر غیر مسلموں
کو بچایا۔" (گاندھی جی کا ذاتی اخبار هریجن سیوک یکم دسمبر ۱۹۴۶ء)

ان فسادات کا ذمہ دار کون ؟

ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مولانا ابو الکلام کو یہ یقین دلایا تھا کہ نقل آبادی اور تقسیم وطن وغیرہ بالکل امن کے ساتھ
ہوں گے مگر حسب تحریر ایچ ایم سیروائی :۔

"وہ مولانا آزاد کو دی گئی یقین دہانی سے منحرف ہو گیا حالانکہ اس نے یقین دلایا تھا کہ
تقسیم ہند کی منظوری کے بعد وہ خون بہنے دے گا نہ فساد ہونے دے گا، اور اگر فسادات کو
دبانے کی ضرورت پڑی تو فوج، ٹینک اور ہوائی جہاز استعمال کر کے فسادیوں کو کچل دے گا
لیکن ایوارڈ کی تیاری کے بعد ماؤنٹ بیٹن کا پانچ روز تک بیکار بیٹھے رہنا جبکہ یہ بات
تسلیم شدہ ہے کہ ہر روز کی تاخیر سے شدید بدامنی کا خطرہ بڑھ رہا تھا، دراصل ماؤنٹ بیٹن کی

مولانا آزاد، کانگریس اور پنجاب سب سے غداری کے مترادف ہے۔"

(از کتاب "تقسیم ہند افسانہ اور حقیقت" از ایچ ایم سیروائی۔ ترجمہ ڈاکٹر صفدر محمود صـ ۱۶۹)

یہی مصنف اسی کتاب میں اس کی مزید مدلل وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :۔

"مولانا آزاد اور موزلے دونوں پنجاب کے لوگوں کے دکھ کے لیے ماؤنٹ بیٹن کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، ماؤنٹ بیٹن کی یہ مکمل یقین دہانی کا ذکر کرتے ہوئے آزاد نے لکھا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کے دلیرانہ اعلان کے بعد کیا ہوا، جب تقسیم ہوئی تو ملک کے اکثر حصوں میں خون کی ندیاں بہہ نکلیں معصوم لوگ، خواتین اور عام بچے قتل عام کا نشانہ بنے، ہندوستان کی فوج تقسیم ہو چکی تھی اس لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کو قتل عام سے بچانے کے لیے مؤثر اقدام نہ کیے گئے۔ اس لیے میں نے اپنی کتاب کے گذشتہ باب میں لکھا ہے کہ شاید ویول درست کہتا تھا موزلے نے لکھا ہے کہ آنے والے برسوں میں صرف وہ جنہوں نے ہندوستان میں کام کیا ہے اور وہاں رہتے ہیں اور ہندوستان سے پیار کرتے ہیں خیال کریں گے کہ برطانوی راج کے آخری ایام بے پناہ غیر ضروری خون سے داغدار ہیں۔

جب یہ الفاظ لکھے جا رہے تھے اس وقت موزلے اور آزاد کو ماؤنٹ بیٹن کا غذات اور انڈیا آفس میں پڑی ہوئی دستاویزات تک رسائی حاصل نہ تھی کیونکہ "ٹرانسفر آف پاور" کی جلد بارہ[۱۲] ان کتابوں کی اشاعت کے بہت عرصہ بعد چھپی، اگر جلد بارہ میں شامل دستاویزات ان کی نظر سے گذری ہوتیں تو ان کی ماؤنٹ بیٹن پر تنقید اور بھی شدید اور تیز ہوتی۔ جس انداز سے ماؤنٹ بیٹن نے پنجاب ایوارڈ دیا آزاد اسے عظیم غداری قرار دیتے اور موزلے بلا جواز خون بہنے کا ذمہ دار ماؤنٹ بیٹن اور صرف ماؤنٹ بیٹن کو گردانتے، کیونکہ اس نے ۹ اور ۱۲ اگست کو فیصلے کر کے قتل و غارت پر قابو پانے کے فرائض سے سبکدوشی اختیار کر لی، جو وائسرائے کی حیثیت سے اس کے فرائض منصبی تھے۔

عائشہ جلال نے اپنی کتاب کے آخر میں لکھا ہے، جب پنجاب دور دراز کے علاقوں میں کیے گئے فیصلوں کے زیر اثر تڑپ رہا تھا تو ماؤنٹ بیٹن ڈھائی ماہ سے بھی کم عرصے میں تاریخ کے عظیم ترین انتظامی اپریشن (عمل) کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا کریڈٹ بڑی دلیری

سے مانگ رہا تھا۔ قتل ہونے والے لاکھوں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی جانب سے اور اُن لاکھوں مہاجرین کی جانب سے جو دونوں ریاستوں کے درمیان لڑکھڑاتے رہے، مؤرخین کا فرض بنتا ہے کہ وہ ماؤنٹ بیٹن کے دعوے کو چیلنج کریں اور اس سے پوچھیں کہ کیا عظیم آپریشن دراصل شرمناک فرار نہیں تھا تاکہ برطانیہ اپنے آپ کو ہندوستان کے فرقہ وارانہ پاگل پن پر صدارت کی ذمہ داری سے الگ رکھ سکے۔" (تقسیم ہند افسانہ اور حقیقت ص ۱۷۰، ۱۷۱)

اِس میں شک نہیں کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستانیوں سے عموماً اور مسلمانوں سے خصوصاً ہمدردی نہ تھی بلکہ ہر انگریز مسلمان کا مخالف تھا، اِس لیے امن قائم کرنے اور رکھنے کے لیے کوئی تجویز سوچے بغیر فوراً تقسیم کا اعلان کر دیا جسے کانگریس اور مسلم لیگ نے فوراً منظور کر لیا، بقول شورش کاشمیری مرحوم:۔

"...... ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ فوج میں سرایت کر چکا تھا، آزاد ہند فوج ملک سے باہر بنی تھی، ان کی رہائی کے لیے مقدمہ نے انگریزی غلامی سے سارے ملک کو ذہنی طور پر برانگیختہ کر دیا تھا، کراچی اور بمبئی سے بحری بیڑے میں نسلی امتیاز کی خبریں آرہی تھیں تمام ملازموں کی ایک بڑی اکثریت ہیجان و اشتعال میں تھی، ہندوستانی افسر فرقہ وارانہ ذہن میں بٹ چکے تھے اور کام نہیں کرتے تھے بلکہ خرابی کا باعث ہو رہے تھے، انگریز افسروں کا ویسے ہی جی نہیں لگ رہا تھا کیونکہ وہ جا رہے تھے اور ان کو کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔

کانگریس ماؤنٹ بیٹن کی پاکستان کی تجویز پر بعجلت قائل ہو گئی کیونکہ وہ پاکستان کو دو ٹکڑے دے کر وہ ایک عظیم ہندوستان کے مالک بن جائیں گے۔

مسلم لیگ کو جلدی تھی کہ کہیں آزادی کے اس نازک مرحلہ پر ہندوستان کی تقسیم کے فیصلے کو منسوخ نہ کر دے، علاوہ ازیں قائدِ اعظم کو تپِ دق کا مرض اور اپنے ساتھیوں پر اعتماد کا فقدان بھی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے بقول راجہ آف محمود آباد بہت سے فیصلے قائدِ اعظم نے عجلت میں کیے ہوں گے کہ شاید موت کسی اور فیصلے کی مہلت ہی نہ دے۔" (سرسید، جناح، مشرقی ص ۴۷، ۴۸ بحوالہ آوازِ دوست از مختار مسعود ص ۱۶۵)

تنبیہ | یہ دُنیا تو گذر رہی ہے اور گذر جائے گی مگر اسلامی عقیدہ کے مطابق جو لوگ راہنماؤں کی غلط تدابیر اور غلط طرزِ عمل کی وجہ سے تباہ حال ہوئے خصوصاً وہ

مسلمان عورتیں اور معصوم بچیاں جو نسلاً بعد نسلٍ مسلمان تھیں وہ ہندوؤں اور سکھوں کے تصرف میں اس طرح آگئیں کہ اب تک کچھ تو چِتا پر جل گئی ہیں اور کچھ اپنی دولتِ ایمان اور بیش قیمت دولتِ عصمت کے لُٹ جانے پر علیحدگی میں آنسوؤں کی بارش میں یہ دُعا کرتی ہوں گی:۔

اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ	اے ہمارے پالنے والے ہمیں اس بستی،
الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ	اس دیس سے نکال جہاں کے رہنے والے
اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا	بڑے ظالم اور بڑے بے ترس ہیں (اور
مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا	یوں ہو کر) اور کر دے ہمارے لیے اپنی
وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ	طرف سے (خود بخود) کوئی دمساز اور
لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ○	کر دے ہمارے لیے اپنی طرف سے
(النساء ع۵۷)	کوئی مدد کرنے والا۔

خاص کر وہ نوجوان معصوم بچیاں جنہوں نے سکھ درندوں سے جان بچانے کے لیے کنوؤں میں چھلانگیں لگائیں اور وہ بچیاں جن کو ان خطرات سے محفوظ کرنے کے لیے اُن کے اپنے بھائیوں نے قتل کر ڈالا تھا جس کی صرف ایک ہی مثال ملک غلام نبی صاحب سابق سیکرٹری مسلم لیگ صوبہ پنجاب کے قلم سے لکھی جاتی ہے:۔

"۱۹۴۷ء کے فسادات میں جس طرح مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی اُسے کون بھول سکتا ہے؟ البتہ ہماری نسل ان قربانیوں سے بے خبر ہے لیکن جن لوگوں نے اپنے پیاروں کے سر کٹتے دیکھے ہیں وہ آج بھی آرام کی نیند نہیں سوتے ہوں گے۔ ایسے مظلوم تو بیشمار ہیں لیکن ایک نوجوان ہمیشہ یاد رہے گا جس نے اپنی بہن کو قتل کیا تھا جو اُسے بہت پیاری تھی، اُس کا نام عبدالرحمن تھا، وہ نوجوانی میں برسوں کا بوڑھا معلوم ہوتا تھا[1]"

اور ادھر ہمارا جو حال ہے وہ سب پر ظاہر ہے، قیامت کے دن یہ مظلوم خواتین جب اللہ تعالےٰ کے حضور اپنی عصمتوں کے تار تار دامن پیش کریں گی تو اُس وقت کیا جواب ہو سکے گا؟

◎

---

[1] روزنامہ جنگ۔ جمعہ میگزین

تقسیم کے بعد سیاسی جماعتوں کی حیثیت اور اُن کا کردار

برصغیر کی آزادی کے لیے مسلمانوں کی کئی سیاسی جماعتوں نے اپنی اپنی حیثیت سے اپنے پروگرام پر عمل کیا اور اپنے آپ کو آل انڈیا جماعت کے عنوان سے روشناس کرایا مگر تحریکِ پاکستان کے شروع ہوتے ہی دوسری جماعتوں کا اثر اس لیے کم ہونے لگا کہ اس تحریک کی بُنیاد لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پر رکھی گئی تھی اور ہندی مسلمانوں کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ "ہم ایک ایسا خطّہ حاصل کرنا چاہتے ہیں جس میں اسلامی نظام قائم ہوگا"۔ ایک مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر دینی اور ذہنی مسرت کیا ہو سکتی تھی کہ انگریز کا منحوس سایہ اُٹھنے پر ایک ایسا خطّہ مل جائے جو غیر مسلموں کی دخل اندازی سے محفوظ ہو اور اس میں خلافتِ راشدہ کا عادلانہ نظام قائم ہو، اس لیے برصغیر کے اُن مسلمانوں نے بھی جن کو یہ یقین تھا کہ تقسیم کے بعد وہ تنہا رہ جائیں گے اور پاکستانی حکومت اور وہاں کے مسلمان اُن کی کوئی مؤثر امداد نہ کر سکیں گے، اس کے باوجود انہوں نے جانی، مالی ہر طرح کی امداد دے کر صرف مسلم لیگ کو مستحکم کیا اور اس کے منشور کو کامیاب بنانے کے لیے سر توڑ کوشش کی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو پاکستان کے حقیقت بننے میں ان مسلمانوں کا بہت بڑا حصّہ ہے جو اپنے اپنے صوبوں اور علاقوں میں عددی لحاظ سے بہت ہی کم تھے، آج جن صوبوں پہ پاکستان کی جغرافیائی حدود قائم ہیں اُن کے عوام کو تو بے شک اس مقدس نعرہ پر پورا اعتماد تھا اور وہ مسلم لیگ کے علاوہ دوسری کسی جماعت کو حاشیۂ خیال میں جگہ دینے کے لیے تیار نہ تھے مگر ان صوبوں کے امراء اور رؤسا کا جو حال تھا وہ کسی سے مخفی نہیں، جبکہ بھارت کے مسلمان اُمراء اور اسلامی ریاستوں کے سربراہوں نے اپنے خزانے اس مقصد کے لیے وقف کر دیئے تھے، خود ریاست حیدر آباد دکن کے سربراہ میر عثمان علی خان مرحوم کو یہ علم تھا کہ آزادی کے بعد کئی ہزار میل دور واقع ہونے والی نئی مملکت پاکستان اُن کی مدد سے قاصر رہے گی اور وہ انگریز جس نے ان کو "یارِ وفادارِ برطانیہ" کا خطاب دیا تھا کانگریس کے منشور کے مطابق ریاست کے انہدام اور بھارت سے انضمام کے وقت کوئی مدد نہ کر سکیگا مگر میر عثمان علی خان مرحوم[1] نے

---

[1] پیر جماعت علی شاہ صاحب مرحوم نے قائدِ اعظم کو ۷ جولائی ۱۹۴۶ء کو ایک خط لکھا جس میں یہ بھی تحریر فرمایا:۔

...... "اس پیغام میں دوسری مبارک باد حضور نظام اور اہلِ حیدر آباد کو دیتا ہوں جنہوں نے آپ کو سونے میں وزن کر کے دس کروڑ مسلمانوں کی لاج رکھ لی۔ کیونکہ حضرتِ آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

۱۹۴۶ء میں قائدِ اعظم کو سونے سے تول کر وہ عزت افزائی فرمائی جو دوسروں کو کم نصیب ہوئی، اور میرا خیال ہے کہ یہی سونا مسلم لیگ کے فنڈ کو ۸۵ لاکھ روپے تک پہنچانے کا قوی ذریعہ تھا، جو تقسیم کے وقت بقول چودھری خلیق الزمان پاکستان مسلم لیگ کو منتقل کر دیا گیا تھا۔

ان تمام قربانیوں کے صلہ میں مسلم لیگ کا یہ فریضہ تھا کہ وہ بھارت میں رہ جانے والے کروڑوں مسلمانوں کے ابدی جانی، مالی، معاشرتی تحفظ کا کوئی عملی اقدام فوراً کرتی، چنانچہ پاکستان مسلم لیگ نے اس مسئلہ کو پہلی ترجیح دے کر اس پر غور و فکر کیا جس کا ذکر اور پھر نتیجہ آئندہ صفحات میں آ رہا ہے۔

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ) سونے سے وزن کرنے کی عزت سوائے آغا خان اور آپ کے کسی بادشاہ کو بھی کسی ملک اور کسی قوم میں نہیں ہوئی، کیونکہ خدا تعالےٰ نے ساری دنیا کے مسلمانوں سے برگزیدہ کر کے آپ کو یہ مرتبہ نصیب فرمایا ہے اس لیے اب آپ کا فرض ہے کہ ان ہزارہا اشغال کو چھوڑ کر اپنے وعدے کے مطابق اس بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہو کر اور دربارِ شریف حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہو کر اس کا شکریہ ادا کریں۔ اور فقیر کے پیغام کو معمولی نہ سمجھیں عید الفطر کے بعد ہوائی جہاز میں سوار ہو کر کراچی سے دوسرے دن مکہ پہنچ جائیں اور پانچ دن میں مناسکِ حج ادا کر کے دو تین گھنٹے میں مدینہ طیبہ حاضر ہو جائیں وہاں ہفتہ عشرہ قیام فرما کر تیسرے دن کراچی واپس پہنچ جائیں، اس میں آپ کے کل بیس دن کے قریب صرف ہوں گے، جس وقت یہ نیاز نامہ پہنچے اسی وقت اپنے عزم بالجزم سے بذریعہ تار علی پور سیداں قلعہ سوبھا سنگھ (تار گھر) کے پتے پر فقیر کو مطلع فرمائیں۔ ع

بر کریماں کارہا دشوار نیست

آپ کے ٹیلیگرام کا سخت انتظار رہے گا۔" الراقم: سید جماعت علی شاہ عفی اللہ عنہ

قائدِ اعظم بنام امیرِ ملت

۱۰، اورنگزیب روڈ دہلی / ۱۳ / اگست ۱۹۴۶ء ——— ڈیئر سید جماعت علی شاہ صاحب

۱۷ / جولائی کے خط کا بہت بہت شکریہ! آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں تیزی کے ساتھ جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اُن کی بنا پر میرے لیے اس وقت ہندوستان سے دور ہونا ممکن نہیں۔ آپ کے شکریئے کے ساتھ۔

آپ کا مخلص: ایم اے جناح

(از کتاب: "قائدِ اعظم خطوط کے آئینے میں"، مرتبہ خواجہ رضی حیدر، شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی)

حصولِ پاکستان کے بعد حل طلب مسائل

اللہ تعالیٰ کی مشیت سے برِ صغیر تقسیم ہو کر ایک حصہ پاکستان اور دوسرا بھارت یا ہندوستان کے نام سے موسوم ہو گیا، مگر یہ آزادی ایسی بربادی لائی کہ جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی جس کا کچھ حصہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ اب دونوں حکومتوں کے سامنے کئی مسائل تھے، پاکستان کے سامنے داخلی اور خارجی مسائل تھے جن میں پاکستان میں صوبائی تعصب کو جو سر اٹھا رہا ہے فوراً دفن کر دیا جائے اور پاکستانی قومیت کا تحفظ کیا جائے۔ خارجی مسائل میں سے سب سے اہم مسئلہ بھارت کے پانچ کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کا تحفظ تھا جو کئی لحاظ سے ضروری تھا، اور اس کی ذمہ دار وہی جماعت ہو سکتی تھی جس کے کہنے پر ان صوبوں کے مسلمانوں نے بھی پاکستان کے حق میں رائے دی تھی جو اپنے صوبے، اپنے علاقے میں بہت ہی کم تعداد میں آباد تھے۔

اس کے لیے ابتدائی طور پر یہ طے ہوا کہ جناب چوہدری خلیق الزمان صاحب جو انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے ہندوستانی دستور ساز اسمبلی کے معزز ممبر ہیں، وہ بھارت جائیں اور اپنی صوابدید کے مطابق ایسا لائحہ عمل طے کریں جس سے وہ پانچ کروڑ مسلمان مطمئن ہو کر زندگی گذار سکیں، یہ معاملہ بہت ہی مشکل تھا، جن ہندوؤں کے خلاف تقریباً پچاس سال سے نفرت کا بیج بویا گیا تھا اور اُن کے ساتھ زندگی گذارنے کو دینی، معاشی، معاشرتی ہر لحاظ سے ناممکن بتایا گیا تھا وہ کب مسلمانوں کو صدقِ دل سے تحفظ دے سکتے تھے؟ ان کو رام کرنے کے لیے کسی ایسے مدبّر کی ضرورت تھی کہ جو ان کی نظروں سے ماضی کے آثار مٹا سکے اور آئندہ کے لیے ان مسلمانوں کو صرف بھارت کا وفادار شہری ثابت کر سکے، اگرچہ یہ طرزِ عمل معتذرانہ تھا مگر اس کو اپنانے سے بھی کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا تھا۔

دوسرا طریقِ کار ان پانچ کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کے تحفظ کا یہ تھا کہ اس جماعت کا تعاون حاصل کیا جائے جس نے جنگِ آزادی میں ہندوؤں سے بھی بہت پہلے قدم اٹھایا تھا اور پھر ہندوؤں میں یہ جذبہ پیدا ہوتے ہی ان کے ساتھ مل کر ہر طرح کی قربانیاں دی تھیں اور اس سلسلہ میں اپنوں ہی کی ملامت کا نشانہ بنے تھے، یہ افراد اور جماعت معتذرانہ طریقہ پر نہیں بلکہ مجاہدانہ طریقہ پر ہندوستان کی حکومت کی آنکھ میں آنکھ ملا کر یہ کہہ سکتی تھی کہ آج جس تخت و طاؤس پہ تم بیٹھے ہو اس پر بٹھانے کے لیے اگر تمہارا پسینہ بہا ہے تو ہمارا خون بہا ہے، تمہارے لیڈر اگر پابندِ سلاسل رہے ہیں تو ہمارے قائد بھی دار و رسن کو بوسہ دے چکے ہیں،

چونکہ مسلم لیگ نے کبھی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ کیا تھا اس لیے اُس نے نمائندگی کی لاج رکھتے ہوئے بھارتی مسلمانوں کے تحفظ کے لیے چوہدری خلیق الزمان نے پیشقدمی فرمائی اور وہ بھارتی مسلمانوں کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے دہلی تشریف لائے اور بھارت کی رسم پرچم کشائی میں حصّہ لیا، جس کا مختصر سا حال ان ہی کی مرتبہ کتاب " شاہراہِ پاکستان " سے درج کیا جاتا ہے اور پھر قائدِ اعظم نے بحیثیت گورنر جنرل پاکستان اس پر جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے :۔

چوہدری صاحب نے ۲۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی میں ہندوستانی جھنڈے (جس میں اشوک کا چکرا ہے) کو تسلیم کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو کی افتتاحی تقریر کے بعد اس کی تائید میں تقریر کی اور پنڈت نہرو نے ان کو مبارکباد دی، اور اُن کی اس تقریر کے بعد مسٹر حسین شہید سہروردی نے چوہدری صاحب کو ۱۰ ستمبر ۱۹۴۷ء میں ایک طویل خط میں یہ بھی تحریر کیا :۔

" آجکل یہاں (کلکتہ میں) ہندوؤں اور مسلمانوں میں اچھے احساسات ہیں اور ہم اُمید کر سکتے ہیں کہ یہ قائم رہیں گے جس کی بڑی وجہ ہماری انڈین فلیگ کا قبول کرنا اور جے ہند نعرے کا اپنانا ہے "

اس طویل خط پر تبصرہ کرتے ہوئے چوہدری خلیق الزمان نے تحریر فرمایا ہے کہ :۔

" شہید سہروردی کی یہ رائے بالکل صحیح تھی کہ دو قومی نظریئے نے مسلمان اقلیتوں کے لیے ہندوستان میں ایک مہیب شکل اختیار کر لی تھی جس سے ان کا مستقبل ملک میں بہت تاریک ہو گیا ہے اور اس کے انسداد کے لیے کوئی نہ کوئی معقول تدبیر سوچنی پڑے گی اس لیئے میں بھی سوچتا تھا کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کو اپنی سیاست کسی دوسرے نہج پر ڈھالنی پڑے گی "

جناب شہید سہروردی کے اس خط کے فوراً بعد سر ظفر اللہ نے جو (بد قسمتی سے) پاکستان کی طرف سے یو۔ این۔ او (U.N.O.) میں نمائندہ تھا، ۲۶ ستمبر کو مندرجہ ذیل بیان کے ذریعہ گورنمنٹ ہند کو آگاہ کیا :۔

" اگر اس نے مسلمانوں کی جانی قربانی کو ختم نہ کیا تو پاکستان یونائیٹڈ نیشن میں شکایت کرے گا اور اگر اس سے اطمینان نہ ہو سکا تو حکومتِ پاکستان کو راست اقدام کیلئے غور کرنا ہوگا "

یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ ظفراللہ نے خود اعتراف کیا تھا کہ یہ بیان خود اس نے بلا اجازت حکومت پاکستان کے داغ دیا ہے۔ اِدھر تو مسلمان لیڈر مسلمانوں کے تحفظ کے لیے امن اور صلح کی راہ تلاش کر رہے تھے اِدھر ظفراللہ نے بھارتی حکومت کو غصہ دلانے کے لیے راست اقدام کی دھمکی دے ڈالی اسی کا اظہار چوہدری صاحب نے ۲۰ ستمبر کو لکھنؤ میں اپنے ایک بیان میں فوراً فرما دیا :۔

"میرا خیال ہے کہ سر ظفراللہ نے ہندوستانی حالات کے متعلق ایسا بیان دینے سے پہلے اور وہ بھی بلا پاکستان گورنمنٹ کے احکام کے جائزہ نہیں لیا"

ظفراللہ نے چوہدری صاحب کے اس بیان کو بہانہ بنا کر بنی بنائی بات کو توڑنے کیلئے قائدِ اعظم کے ایسے کان بھرے کہ قائد نے چوہدری صاحب کو ۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کراچی طلب کر لیا، تین دن کے انتظار کے بعد گیارہ بجے چوہدری صاحب کو باریابی کا موقع ملا۔ چوہدری صاحب اور گورنر جنرل پاکستان محمد علی جناح کے درمیان جو گفتگو ہوئی اُس کا خلاصہ چوہدری صاحب کے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے :۔

"میں ۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو تین بجے شام کراچی پہنچ گیا اور اسی دن شہید سہروردی جنرل (SMAY) لیسے کے ساتھ کراچی پہنچے، میں نے کراچی پہنچتے ہی گورنر جنرل کے ملٹری سیکرٹری کو مطلع کر دیا اور ان سے ملاقات کے لیے وقت مانگا، تین دن کے بعد ۵ اکتوبر کو گیارہ بجے مجھے باریابی کا موقع ملا، اور ملاقات کے وقت شہید سہروردی بھی موجود تھے مسٹر جناح ملاقات کے کمرے میں میرا وہ بیان ہاتھ میں لیے ہوئے داخل ہوئے جو میں نے سر ظفراللہ خان کے بیان کے سلسلہ میں دیا تھا معمولی صاحب سلامت کے بعد انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر میرا بیان مجھے اس طرح سُنانا شروع کیا جیسے میرا چارج شیٹ پڑھا جا رہا ہے، اس کو پڑھنے کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا: "خلیق تمہارا یہ بیان تین دن ہندوستان کے ریڈیو پر نشر کیا گیا، تین دن"۔ میں نے کہا مسٹر جناح! اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ میں بہر نوع ہندوستان کی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں مسلمانوں کا لیڈر ہوں اِس لیے ہندوستان نے اس کو بڑی اہمیت دی ہے۔ مسٹر جناح نے کہا اِس سے ہم کو بہت نقصان پہنچا ہے"۔ میں نے جواب دیا اپنے نزدیک میں نے ہندوستان

کے مسلمانوں کے فائدے کے خیال سے یہ بیان دیا ہے اور آپ نے بھی اپنے ۶ جولائی کے بیان میں ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی حکومت کے وفادار رہیں۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کو میرا بیان ناپسند ہے اس لئے ملک کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی سے یہیں سے اپنا استعفیٰ بھیجدوں گا اور ہندوستان واپس نہ جاؤں گا تاکہ کوئی دوسرا اس بار کو اٹھالے جس کو آپ کا اعتماد بھی حاصل ہو اور وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمت بھی کر سکے۔

اس کے بعد وہ شہید سہروردی سے مخاطب ہوئے جنہوں نے ان کو اپنی تجاویز دکھائیں انہوں نے ان کو پڑھ کر بلا کسی تبصرہ کے واپس کر دیا اور ہمارا انٹرویو ختم ہو گیا۔

ملاقات کے دوران اور واپس آنے کے بعد گھر پر میں اپنے دل میں سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچتا رہا کہ آخر جناح صاحب کا اس قصے کے کھڑے کرنے سے کیا مقصد تھا! جو پاکستان کے اُس وقت حالات تھے اس میں وہ خود مسلم اقلیتوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے، اور میرے نزدیک سر ظفر اللہ خان کا یہ بیان کہ مجبوراً پاکستان کو کوئی راست اقدام کرنا پڑے گا، ایک بے معنی اور فضول دھمکی تھی۔ ان حالات میں اگر میں نے ہندوستان کی مسلم اقلیت کی طرف سے ایک مصالحانہ قدم اٹھایا تھا تو جناح صاحب کا یہ اعتراض مجھے بالکل حق بجانب نظر نہ آیا خصوصاً جبکہ وہ ہندوستان کی مسلم اکثریت کو اکثر اپنی گفتگو میں یہ کہہ چکے تھے کہ انہوں نے ان کو رائٹ آف (ختم) کر دیا ہے، پھر رائٹ آف شدہ پانچ کروڑ کی اقلیت اگر اپنی بچت کی کوئی معقول صورت نکالنے کی کوشش کرے تو اس پر اُن کو چراغ پا ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔[1]

یہ سب کچھ چوہدری سر ظفر اللہ خان کے اشارہ پر ہوا، اُس نے ایک تو ۶ ستمبر کو ہندوستانی حکومت کو راست اقدام کا الٹی میٹم دے کر امن و عافیت کے عمل میں روڑا اٹکا دیا اور دوسرا گورنر جنرل پاکستان کو اُن کے پرانے مخلص کارکن سے ناراض کر دیا، جبکہ راست اقدام کی غرض و غایت بیان

---

[1] از شاہراہ پاکستان، مؤلفہ چوہدری خلیق الزمان صفحہ ۱۱۰۴ تا ۱۱۰۶

کرتے ہوئے کہا:۔

"کیونکہ یہ واقعات (قتل و غارت) ہمارے وطن کے قریب ہو رہے ہیں جس سے ہمارے اعزا و اقربا کی جان و مال سب فوری خطرہ میں ہے"[1]

یعنی سر ظفر اللہ کو اپنے اعزہ و اقربا کی جان و مال کا فکر تھا، چنانچہ اس کے اقربا بلکہ سب قادیانی بخیر و عافیت لاہور پہنچ گئے، جیسا کہ اُس وقت کے آنجہانی خلیفۃ المسیح مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے ایک خطبہ میں کہا تھا:۔

"تمام قادیانی قادیاں سے بالکل محفوظ و مامون لاہور آگئے"[2]

معلوم ہوتا ہے کہ قائدِ اعظم بہت زیادہ ناراض ہو گئے تھے اور مسلم لیگ سے بھی دستبردار ہونے والے تھے، یہاں تک کہ حسبِ روایت مولانا محمد اسمٰعیل ذبیح:۔

"خود نواب اسمٰعیل خان مرحوم نے مجھے حکم دیا کہ تم فوراً پاکستان چلے جاؤ اور مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری لیاقت علی خان سے مل کر قائدِ اعظم کو راضی کرو کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کا آخری اجلاس کراچی میں بلائیں...... چنانچہ میں کراچی پہنچکر اس جلسہ کا اہتمام کرنے میں کامیاب ہو گیا جو ۱۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو خالق دینا ہال میں آل انڈیا مسلم لیگ کے آخری اجلاس کے طور پر قائدِ اعظم کی صدارت میں منعقد ہوا"[3]

چنانچہ یہ اجلاس جس میں قائدِ اعظم شکستہ دل و مغموم حالت میں تھے، اس اجلاس میں ایک کونسلر جمال میاں فرنگی محلی نے بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ قائدِ اعظم سے یہ کہا:۔

"ہم ہندوستان میں بے یار و مددگار رہ گئے، آپ وہاں آئیں اور ہماری قیادت کریں، قائدِ اعظم نے کہا کہ مسلم لیگ کونسل نے مجھے پاکستان کا گورنر جنرل بنایا ہے تاکہ میں ملک کو بحران سے نکال سکوں، لیکن اگر اب کونسل یہ فیصلہ کرے تو میں گورنر جنرل کے عہدے سے مستعفی ہو کر نتائج کی پرواہ کیے بغیر ہندوستان جانے کو تیار ہوں، لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کب تک میری قیادت پر بھروسہ

---

[1] از شاہراہِ پاکستان، مؤلفہ چوہدری خلیق الزمان ص ۱۰۸۶ [2] الفضل لاہور ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۹ء [3] روزنامہ نوائے وقت ۱۰ اگست ۱۹۹۲ء

کیسے بیٹھے رہیں گے، اگر میں مر جاؤں تو آپ کیا کریں گے؟[1]

اس اجلاس کے بعد ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے مستقبل کے لیے کافی غور وخوض کیا گیا اور مختلف آراء پیش کی گئیں۔ ایک رائے یہ بھی تھی کہ چوہدری خلیق الزمان جو کہ مسلم لیگ کے مخلص اور بے لوث کارکن سمجھے جاتے تھے یہ ہندوستان ہی میں رہیں اور مسلم لیگ کی تنظیم نو کریں اور الیکشن میں مسلم لیگ کی طرف سے ہندوستان کی قومی اسمبلی کے قائد بن جائیں، مگر وہ جلد ہی ہندوستان سے باقاعدہ ہجرت کر کے پاکستان آگئے، لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر ان کا استقبال کالی جھنڈیوں سے کیا گیا مگر وہ پاکستان مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے، لیکن ۱۳ اگست ۱۹۵۰ء کو مہاجرین نے ان کی رہائش گاہ کے سامنے بہت بڑا مظاہرہ اسلیئے کیا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو بے سہارا چھوڑ کر یہاں آگئے، آخر چوہدری صاحب نے استعفیٰ دے دیا جسے روزنامہ نوائے وقت نے قیام پاکستان کے بعد اس ملک کے عوام کی پہلی فتح قرار دیا۔

اسی طرح متحدہ بنگال کے سابق وزیر اعظم حسین شہید سہروردی نے ہندوستان میں رہنے کا ارادہ کر لیا تھا تاکہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جاسکے، مگر یہ ارادہ ارادہ ہی رہا اور سہروردی صاحب[2] مستقل طور پر پاکستان آگئے۔ اسی طرح دوسرے سرکردہ مسلم لیگی لیڈر جنہوں نے اسلام کے نام پر مسلمانوں سے ووٹ لیے تھے یکے بعد دیگرے پاکستان آتے رہے اور ہندوستان کے مسلمان بے آسرا رہ گئے،

جب پانچ کروڑ بھارتی مسلمانوں کا یہ سہارا بھی ٹوٹ گیا اور ان کے وجود و عدم کو برابر سمجھا گیا، اس کی بڑی وجہ یہی سمجھ آتی ہے کہ اب پاکستان حاصل کرنے والی مسلمانوں کی واحد نمائندگی کی دعویدار جماعت پاکستان میں اپنا وجود برقرار رکھنے بلکہ اپنا قد بڑھانے کی فکر میں متحرک ہو گئی۔ اور مسلم لیگی حضرات نے جو طرز عمل اختیار کیا وہ جناب ڈاکٹر صفدر محمود صاحب کے الفاظ میں:۔

> "ان سیاسی کھلاڑیوں نے یہ مطلق احساس نہ کیا کہ ملک بڑے نازک دور سے گذر رہا ہے اور مسلم لیگ کے جن راہنماؤں کو تحریک پاکستان میں قیادت کا شرف حاصل رہا ہے انہیں قیام پاکستان کے بعد ایک سال سے بھی کم عرصے کے اندر محض اقتدار کے لیے سیاست کا یہ کھیل زیب نہیں دیتا"[3]

---

[1] مسلم لیگ کا دور حکومت ص۴۸ [2] کتاب مذکور ص۵۲ [3] مسلم لیگ کا دور حکومت ص۶۰

اس سیاسی کھیل کے نتیجہ میں مسلم لیگ پاکستان کے لیے کیا بنی؟ اس کا فیصلہ عوام خود ہی کر رہے ہیں کہ حسب وضاحت چوہدری خلیق الزمان مرحوم:۔

"اگر مسلم لیگ نے پاکستان کے عوام کی حالت بہتر بنانے کا راستہ اختیار نہ کیا تو یہ جماعت لوگوں کے لیے رحمت اور برکت کا باعث بننے کی بجائے لعنت ثابت ہوگی"[1]

مسلم لیگ نے عوام کی کیا خدمت کی؟ اس کیلئے سردار شوکت حیات کا بیان ملاحظہ فرمالیں:۔

"قائدِ اعظم کی سفارش پر مجھے ایک کروڑ روپے کے لائسنس مل گئے، قائدِ اعظم نے فرمایا تم جس قوم کی خدمت کر رہے ہو اُس قوم کو اپنے لیڈروں کی جیبوں میں بہت زیادہ روپے کی آواز سننے کی عادت ہے"[2]

بیکسوں کا سہارا

سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

معزز قارئین کی خدمت میں التماس ہے کہ ہمارا مقصد سیاسی امور کا بیان کرنا نہیں نہ ہمارا یہ منصب اور حیثیت ہے، اس مختصر مگر مدلل بیان سے صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ جب ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت کا یہ حال ہو گیا تو اب بھارت میں رہ جانے والے پانچ کروڑ مسلمانوں کا سہارا کون ہو سکتا تھا؟ وہ صرف وہی مجاہد جلیل اور خیر خواہِ انسانیت ذات تھی جسے حسین احمد کہا جاتا تھا ـــــ حضرتؒ نے نہایت شفقت اور دلی ہمدردی سے ان کو سینہ سے لگالیا، حضرتؒ کی شفقت اور انسانی مروت کا چشم دید حال مشہور عالم علامہ ابوالحسن علی ندوی نے تحریر فرمایا:۔

"آخر وہ دور آیا کہ جن لوگوں نے مسلمانوں کے جذبات میں یہ تحریک پیدا کی تھی (حضرت مدنیؒ کے خلاف طوفانِ بے تمیزی برپا کرایا تھا) وہ ان کو بے یار و مددگار چھوڑ کر اپنی بنائی ہوئی دنیا میں چلے گئے، مسلمانوں میں سخت مایوسی، مستقبل سے ناامیدی

---

[1] مسلم لیگ کا دورِ حکومت ص ۱۰ [2] روزنامہ خبریں ۲۸ اپریل ۱۹۹۵ء

اور اپنے بارہ میں بے اعتمادی اور احساسِ کمتری رونما تھا، ان کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا ہر شخص ایک تیمی اور کسمپرسی کی سی کیفیت محسوس کرتا تھا۔ اب مولانا مدنیؒ اور اُنکے رفقاء کی جماعت تھی کہ انہوں نے مسلمانوں میں خود اعتمادی، مستقبل کی طرف سے اطمینان، اپنے وطن میں رہنے اور ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم پیدا کرنے کی تبلیغ کی۔" (پرانے چراغ از سید ابوالحسن علی ندوی ص ۱۰۵)

—— "تقریباً چودہ سو لڑکیاں برآمد کرکے ورثاء کے حوالے کی گئیں اور ہفتوں کے بعد خوفزدہ مسلمانوں کے حواس لوٹے اور مسجدوں میں اذانیں شروع ہوگئیں، مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ حکومت سے ٹکراؤ کی پالیسی ترک کردیں اور بہادرانہ طریقہ پر بھارت میں رہنے کیلئے مناسب تدابیر پر عمل کریں، حیدرآباد دکن سے آئے ہوئے وفد سے فرمایا کہ اگر وہ ٹکراؤ کی پالیسی ترک کردیں تو ہم ان خطرناک حالات میں بھی حکومت سے یہ کفالت دلوا سکتے ہیں کہ وہ بیس۲۰ سال تک ریاست کی داخلی آزادی کو تسلیم کرے گی، مگر مٹھی بھر جوشیلے رضاکاروں نے یہ بات نہ مانی اور حیدرآباد بھی دوسری اسلامی ریاستوں کی طرح ہاتھ سے نکل گیا اور وہ تباہی ہوئی جس کا اندازہ کرنا مشکل ہے"۔ (واقعات ص ۲۲۲)

حضرت مدنیؒ اور اکابر علماء کے بے نظیر کارنامے

فسادات کے بعد ذرا سانس لینے کا موقع ملا تو جمعیۃ علماء نے لکھنؤ میں ایک آل انڈیا آزاد مسلم کانفرنس کا انعقاد کیا، ہندوستان میں مسلمانوں کا اتنا بڑا اجتماع اس سے پہلے شاید ہی کبھی ہوا ہو، یہی وہ کانفرنس تھی جس کے بعد ہندوستان کے اُفق پر مسلمانوں کے عزائم، ارادوں اور جرأت و عزیمت کا پرچم بلند ہوا اس میں جمعیۃ علماء کے ناظمِ عمومی مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ نے فرمایا:۔

"مسلمان ناانصافی اور ناحق بات کو کبھی برداشت نہیں کرسکتا، خوف وہراس، بزدلی اور کم ہمتی کو دل سے نکال دو اور یہاں عہد کرکے جاؤ کہ ہر ظلم اور ہر ناانصافی کا ڈٹ کر مقابلہ کروگے، ہم نے جس طرح مسلم فرقہ واریت کا مقابلہ کیا ہے اسی طرح جن سنگھ، ہندو مہاسبھا، آر ایس ایس اور ہندو فرقہ واریت کو بھی پیروں سے کچل کر دم لیں گے۔ کانگریس اور حکومت کا یہ فرض ہے کہ آزادیٔ رائے اور آزادیٔ ضمیر کی فضا اور ملک کی یکجہتی کے لیے اپنی آخری کوششیں صرف کردے۔"

مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ کو حق تعالیٰ نے ایک امتیازی صفت یہ بھی عطا فرمائی تھی کہ مسائل پر اُن کے

تجزیئے اور دلائل کو رَد کرنا بہت مشکل ہوتا تھا، اُن کی تقریر اور بحث کے مقابلے میں بڑے سے بڑے مقابل کو قائل اور ساکت ہونا پڑتا تھا۔ اِس وصف کے ساتھ اخلاص، جرأت، ذہانت اور علم بھی قدرت نے وافر مقدار میں عطا فرمایا تھا، ایسا اِنسان مخالفین کے لیے دودھاری تلوار ثابت ہوتا ہے، مولانا موصوف کے ساتھ مولانا احمد سعید صاحب کی راہنمائی بھی شامل تھی، وہ سحبان الہند مشہور تھے، ان کی زبان بیان اور پیرائیہ اظہار میں جو مٹھاس، شگفتگی اور دلنوازی تھی وہ تو اپنی جگہ پر تھی اس پر مستزاد یہ تھا کہ اُن کا دل دُکھا ہوا اور جذبات اور احساسات مجروح تھے۔ جب وہ دِلی ایڈمنسٹریشن کی زیادتیوں اور مسلمانوں کی حالتِ زار کا تذکرہ کرتے تھے تو سُننے والوں کو ضبط کا یارانہ رہتا تھا، گاندھی جی بڑے اہتمام سے روزانہ ان کی رپوٹیں اور مشاہدات سنتے تھے اور اس معاملے میں ان کے علاوہ کسی کا اعتبار نہ کرتے تھے۔ تاریخ کے صفحات اس کی گواہی دیں گے کہ یہ انھی نیشنلسٹ مسلمانوں کا دل گُردہ تھا حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی جماعت کی سرفروشی تھی اور جمعیۃ علماءٗ کی فہم و فراست اور عظمت و عزیمت تھی کہ گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو، چوہدری برہم پرکاش، برج موہن، شریمتی سبھدرا جوشی، مسز مردولا سارا بائی اور سینکڑوں دوسرے منصف مزاج اور سیکولر مزاج والے کانگریسی مسلمانوں کی آبادی اور حفاظت کے لیے جی جان سے تیار ہو گئے تھے، مشرقی پنجاب کے مسلمان ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تھے مگر چند اللہ کے بندے ایسے بھی تھے جنھوں نے سر پر کفن باندھ کر اپنے قدموں اور عزائم کو ثابت و قائم رکھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لُدھیانویؒ نے دہلی میں عارضی قیام اختیار کیا اور لُدھیانہ میں اپنے مکان کی بازیابی کا مطالبہ جاری رکھا، جلد یا بدیر ان کا مکان واپس ملا اور کئی مسجدیں خالی کرائی گئیں اور اس طرح مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی آبادکاری دوبارہ شروع ہوئی۔ مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی پانی پتؒ میں بلاخوف و ہراس قائم و دائم رہے اور کسی قیمت پر پانی پت چھوڑنا گوارا نہیں کیا، آج وہاں مسلمان موجود ہیں۔ عبدالغفار صاحب پوری بے خوفی اور عزیمت کے ساتھ انبالہ میں مقیم رہے اور ہر قسم کی مشکلات اور خطرات کو اپنی جان پر جھیل کر مسلمانوں کا استحقاق ثابت کیا، آج وہاں دوسروں کے ساتھ مسلمان بھی آباد ہیں۔ میوات میں وہاں کی ریاستوں بھرت پور، الور اور خاص جماعتوں نے طے کر لیا تھا کہ ایک ایک مسلمان کو اکھاڑ پھینکیں گے، مگر جمعیۃ علماء نے ایڑی چوٹی تک کا زور لگا کر انہیں وہاں ثابت قدم رکھا۔

حضرتؒ نے اس بڑھاپے، ضعف اور عمر کے آخری حصے میں اپنی طاقت اور ہمت کی آخری رمق اس کارِ عظیم کے لیے قربان کر دی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق اور حیثیت کمزور نہ ہونے پائے۔

سرتاج الاولیاءؒ

مرشدنا سیّد حسین احمد مدنی قدّس سرّہٗ العزیز کی

آخری آرامگاہ

سالِ ولادت : عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا
۶ ۹ ۲ ۱ ھ

سالِ رحلت : قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
۷ ۵ ۹ ۱ ء

دلّی میں تبلیغی جماعت کا مرکز واقع ہے جہاں ہزاروں مبلغین ہر لمحہ موجود رہتے تھے اور وہیں نظام الدین ریلوے اسٹیشن سے دلّی سے اُجڑے ہوئے مہاجرین کے قافلے اسپیشل ٹرینوں کے ذریعے روزانہ پاکستان کے لیے یا راستے میں شہید ہونے کے لیے روانہ ہُوا کرتے تھے۔ بہت سے مخلص اور با اثر لوگ جماعت کے امیر مولانا محمد یوسف صاحبؒ پر زور دیتے تھے کہ اپنی جماعت کے ساتھ پاکستان روانہ ہو جائیں۔ یہ واقعات مولانا زکریا صاحبؒ کی زبان میں زیادہ دلچسپ ہیں:

"یہ مسئلہ بھی تین چار ماہ تک بہت ہی معرکۃ الآراء رہا کہ پاکستان جانے والے احباب حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر بہت ہی شدید اصرار کرتے تھے بعض اکابر تو روزانہ پچیس تیس ہوائی جہاز کے ٹکٹ لے کر آتے تھے کہ مولانا محمد یوسفؒ کو مع اُن کے گھر والوں کے لے کر جائیں، ان کا اصرار تھا کہ مسلمان بکثرت وہاں منتقل ہو گئے ہیں اس لیے مولانا محمد یوسف صاحبؒ کا وہاں جانا اُن کی دینی اصلاح کے لیے بہت ضروری ہے، نیز اس وقت یہاں کی جو متزلزل حالت تھی اور یوپی اور دہلی کا جو انخلاء ہو رہا تھا اس کی وجہ سے یہاں دینی کام کی امیدیں کم معلوم ہوتی ہیں۔ مگر حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کا ایک ہی جواب تھا کہ اگر بھائی جی (مولانا زکریا صاحبؒ) تشریف لے جاویں گے تو مَیں بھی جاؤں گا ورنہ نہیں۔"

تبلیغی جماعت کے اس مرکز سے ہندوستان اور دلّی میں رہ جانے والے مسلمانوں کو بڑی ڈھارس اور تقویت تھی، اگر اُس وقت مولانا محمد یوسف صاحبؒ رختِ سفر باندھ لیتے تو لاکھوں مسلمان چشمِ زدن میں دِلّی اور یُوپی سے اُکھڑ جاتے۔

اپنے وقت کے مشہور بزرگ حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ رائے پور ضلع سہارنپور میں دریائے جمنا کے قریب نہر جمن مشرقی کے کنارے اپنی خانقاہ میں رونق افروز تھے، آس پاس کی صدہا بستیوں کے ہزاروں مسلمان آپ کے مرید اور معتقد تھے، خانقاہ میں رات دن سینکڑوں سالکین اور زاہدین کا مجمع رہتا تھا جمنا کے ایک کنارے پر مشرقی پنجاب تھا جہاں سے مسلمانوں کا صفایا ہو چکا تھا، دوسرے کنارے پر ضلع سہارنپور کی سرحد تھی جہاں مسلمان کثیر تعداد میں آباد تھے اور اسی خانقاہ سے اپنے حوصلوں، عزائم اور ہمت کے لیے طاقت اور غذا حاصل کرتے تھے۔ مولانا عبدالقادرؒ اصلاً مغربی پنجاب ہی کے رہنے والے تھے اور اپنے

پیرومرشد مولانا عبدالرحیم صاحبؒ کے بعد ان کی گدی نشینی کی وجہ سے رائے پور میں رہ رہے تھے، اُن کے مریدین میں بڑی تعداد مشرقی اور مغربی پنجاب کے لوگوں پر مشتمل تھی جو ہر ہر طریقے سے اُن پر زور ڈال رہی تھی کہ پاکستان ہجرت کر چلیں اور سفر کی ساری ضروریات مہیا کرنے میں مصروف تھے، مگر مولانا موصوف فرماتے تھے کہ میری رائے اور سفر حضرت مولانا مدنیؒ اور حضرت مولانا زکریا صاحبؒ پر موقوف ہے اور میں انہی کے ساتھ ہوں۔ پھر حضرت مدنیؒ سے فرمایا،۔

"حضرت! اپنے سے تعلق رکھنے والے تو سارے مشرقی اور مغربی پنجاب کے تھے اور حضرت قدس سرہٗ (اعلیٰ حضرت رائے پوری) کے متعلقین بھی زیادہ تر انہی دو جگہوں کے تھے، مشرقی تو سارا مغربی کی طرف منتقل ہو گیا، ان سب حضرات کا بہت اصرار ہو رہا ہے کہ میں بھی پاکستان چلا جاؤں، اور میرا تو مکان بھی مغربی پاکستان میں ہے اور ان مظلومین کی دلداری بھی اسی میں ہے، مگر میں نے آپ دونوں کے مشورے پر اپنا جانا معلق کر رکھا ہے"۔

مولانا یوسف صاحبؒ حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کے تابع تھے اور مولانا عبدالقادر صاحب ہمارے حضرت (مدنیؒ) اور حضرت مولانا محمد زکریا صاحب پر انحصار کیے ہوئے تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ اگر ایسے موقع پر ہندوستان سے ترکِ سکونت فرماتے تو مدینہ طیبہ جاتے جہاں حضرتؒ کے شایانِ شان استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اپنا ذاتی وسیع اور آرام دہ گھر موجود تھا، بھائی، بھتیجوں، معتقدین اور تلامذہ کی ایک جماعت چشم براہ تھی بلکہ اصرار کر رہی تھی کہ اب ہندوستان میں قیام کی کوئی وجہ باقی نہیں ہے، اور مدینہ طیبہ میں دینی اور علمی و تعلیمی خدمات کے لیے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بہت ضرورت ہے۔ سعودی حکومت علماء، صلحاء اور اتقیاء کی خدمت اور پذیرائی کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ حضرتؒ اس کے حسنِ انتظام، امن و امان اور کتاب و سنت کی خدمات کے معترف و مدّاح بھی تھے۔ حضرت (رحمۃ اللہ علیہ) کے ان خیالات کا تذکرہ ہم آگے کسی باب میں پیش کر رہے ہیں۔ حضرتؒ کے خاندان اور اس کی دینی و علمی خدمات کی سعودی حکومت کی نگاہوں میں بڑی قدر و منزلت تھی، ایک اشارہ ہو جاتا تو ہر قسم کی سہولتیں اور راحتیں مہیا ہو سکتی تھیں۔

اِس موقع پر یہ بھی یاد کر لیجئے کہ مالٹا سے آنے کے بعد بمبئی ہی سے حضرتؒ کی طبیعت میں مدینہ طیبہ کی واپسی کا تقاضا شروع ہو گیا تھا اور اس کے بعد سے آج تک کم و بیش چالیس برس تک یہ آتشِ شوق

تیز تر ہوتی گئی تھی، انتظار صرف اس بات کا تھا کہ پیرو مرشد اور استاذ جو بار امانت سپرد کر گئے تھے اس کا حق ادا ہو جائے اور اُن کے حکم کی تعمیل ہو جائے۔ یہ ماحول تھا اور حالات تھے جن میں حضرت مولانا زکریا صاحب اور مولانا عبدالقادر صاحب نے حضرتؒ سے ہجرت کے بارے میں مشورہ کیا اور اس حقیقت کا اظہار بھی کیا کہ اب ہمیں یہاں رہنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں ہے۔ حضرتؒ نے فیصلہ کن انداز میں وضاحت اور صفائی کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ میں کسی کو روکتا نہیں ہوں مگر خود مسلمانوں کو اس حالت میں چھوڑنا کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا اور انہی کے ساتھ مرنے جینے کا فیصلہ کرتا ہوں، یہ حکایت بھی مولانا زکریا صاحبؒ ہی کی زبان سے سنیئے:-

"حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوریؒ نے فرمایا کہ یہاں تو پھر بھی اللہ کا فضل ہے، اہل اللہ موجود ہیں مگر وہاں اللہ اللہ کرنے والوں کا سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا ہے، کچھ شہید ہو گئے کچھ اُجڑ گئے، اور تقریباً حضرت کی گفتگو کا رُخ یہ تھا کہ وہاں قیام ضروری ہے۔ اس سب کو سُن کر حضرتِ مدنی قدس سرہٗ نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ ہماری اسکیم تو فیل ہو گئی، اگر ہماری تجویز مان لیتے تو نہ کُشت و خون ہوتا نہ تبادلۂ آبادی کی نوبت آتی، اب میں تو کسی کو جانے سے روکتا نہیں، اگرچہ میرا وطن مدینہ ہے اور محمود (برادرِ خورد) وہاں بلانے پر اصرار بھی کر رہا ہے مگر میں ہندوستانی مسلمانوں کو اس بے سروسامانی اور دہشت و قتل و غارتگری میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ جسے اپنی جان و مال، عزت و آبرو، دین و دُنیا یہاں کے مسلمانوں پر قربان کرنی ہو وہ یہاں ٹھہرے اور جس کو تحمل نہ ہو وہ ضرور چلا جائے۔ حضرت قدس سرہٗ کے اس ارشاد پر میں جلدی سے بول پڑا کہ میں تو حضرت ہی کے ساتھ ہوں، اس پر حضرتِ اقدس مولانا رائے پوری نے فرمایا کہ تم دونوں کو چھوڑ کر میرا جانا بھی مشکل ہے۔"

آج چالیس برس بعد حضرتؒ کے اس مدبرانہ فیصلہ کی عظمت کا اندازہ شاید نہ لگایا جا سکے مگر ممکن ہو تو اس کی قدر و قیمت اُن مسلمانوں سے پوچھئے جو اُس وقت موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھے، اُس ماحول سے دریافت کیجئے جو اُس وقت آگ و خون برسا رہا تھا، اور اُس زمین و آسمان سے معلوم کیجئے جس نے اُس وقت دُنیا کے سب سے بڑے حادثے کا بوجھ اپنے سینے پر اٹھا رکھا تھا کہ حضرتؒ کے اس اعلان اور

عزم وارادے نے رِستے ہوئے ناسُور کس طرح مندمل کردیئے، ٹپکتے ہوئے زخم کس خوبی سے بھر دیئے اور اُجڑی ہوئی بستیاں کتنی آسانی سے پھر سے بسا دیں۔

جہادِ آزادی میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی جاں بازیوں اور سرفروشیوں کی داستان اس باب کے ساتھ ختم ہوتی ہے، چلتے چلاتے آخر میں یہ بات خوب ذہن نشین کرتے چلیئے کہ یہ جنگِ آزادی میں ملک کے ساتھ شانہ بشانہ جدوجہد ہی تھی، ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کا نظریہ ہی تھا اور متحدہ قومیت ہی کا موقف تھا جس نے نیشنلسٹ مسلمانوں کو، جمعیۃ علماء کو اور حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو یہ حوصلہ استحقاق دیا کہ انہوں نے ملک کی فرقہ پرست طاقتوں کو پوری جرأت و شہامت کے ساتھ للکارا، حکومت کو خم ٹھونک کر جھنجوڑا اور مسلمانوں کو حوصلے اور ہمت کے ساتھ ثابت قدم رہنے پر اُبھارا ۔

تاریخ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں
اِک سلسلۂ دار ورسن ہم نے بنایا

حضرت کی ایک تقریر اس زمانہ میں حضرت شیخ الاسلامؒ کس قسم کی تقریریں فرماتے تھے، اسکا اندازہ آپ کی ایک تقریر کے حسب ذیل اقتباس سے ہوسکتا ہے :-

——— " عام شہری زندگی میں جو تلخی اِس وقت موجود ہے وہ عارضی ہے، یہ تقریباً ڈیڑھ سو سالہ تفرقہ انگیز برطانوی پالیسی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے اور گذشتہ دس سال کی رجعت پسند اشتعال انگیز تحریک نے اس کو ہوا دی ہے، یقین ہے کہ جلد ہی یہ تلخی خوشگوار تعلقات کی شیرینی سے بدل جائے گی، اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کا مستقبل زیادہ شاندار اور روشن ہو تو اُن کا فرض ہے کہ اپنے عمل و کردار سے اپنی اہمیت اور افادیت ثابت کریں، انڈین یونین کے لیے وہ جس قدر زیادہ مفید ثابت ہوں گے اُتنی ہی اُن کی عزت و وقعت ہوگی۔ جمہوری نظام حکومت میں نسل، مذہب، خاندان ترقی کا مدار نہیں ہوتا بلکہ خدمت و قابلیت معیارِ ترقی ہوا کرتی ہے۔ ملک و ملت کی خدمت کا صحیح جذبہ اور بہترین قابلیت پیدا کریں، لامحالہ کامیابی و کامرانی اُن کے ہم آغوش ہوگی۔ تقسیم ہند نے مسلم مفادات بھی تقسیم کر دیئے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ جو چیز پاکستانی مسلمانوں کے لیے مفید ہو وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بھی مفید ہو بلکہ ممکن ہے کہ کوئی معاملہ پاکستانی مسلمانوں کے لیے مفید ہو اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے تباہ کن ہو۔ ظاہر ہے کہ ہم پر پاکستانی مسلمانوں کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی وہ خود اپنے ذمہ دار ہیں،

ہم پر انڈین یونین کے چار کروڑ مسلمانوں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، ہمیں ہر موقع پر وہ صورت اختیار کرنی ہے جو انڈین یونین کے مسلمانوں کے لیے مفید ہو۔ ہم اسلامی تعلیمات کا گہری نظر سے مطالعہ کرکے جس قدر اس پر صحیح طور سے عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں گے اُسی قدر ہم وطنِ عزیز کے بہترین بہادر محافظ اور اس کے اہم ترین جز ثابت ہوں گے۔ بیشک پاکستان بن جانے کے بعد مسلمان مجموعی طور پر بھی اور صوبہ جاتی لحاظ سے بھی غیر مؤثر اقلیت بن کر رہ گئے ہیں، لیکن کیا اقلیت کا مستقبل تاریک ہوا کرتا ہے؟ اپنے زمانہ حکومت میں مسلمان اس سے کہیں کم تھے، ۱۸۵۷ء کی مردم شماری میں مسلمان چار کروڑ تھے، حقیقت یہ ہے کہ عددی اکثریت یا اقلیت پر مستقبل کا مدار نہیں بلکہ مستقبل کا مدار اہلِ ملت کے کردار، اعمال اور اخلاق پر ہے۔ آج جو کچھ مسلمانوں کی تعداد اور اُن کے علمی آثار آپ ہندوستان میں دیکھ رہے ہیں کیا یہ ان کی اکثریت کے باقیات ہیں؟ یا سیف وسنان کی یادگار؟ بے شک ہندوستان میں آٹھ سو برس سے زیادہ مسلمانوں کی حکومت رہی مگر کثرتِ تعداد ان کی شوکت وحشمت کا نتیجہ نہیں، یہ نتیجہ ہے اُن پاکباز بندگانِ خدا کے اخلاق کا جنہوں نے اسلامی تعلیمات کا نمونہ بن کر دوسروں کے دلوں میں جگہ لی، ان ستودہ صفات انسانوں نے دوسروں کی جاگیروں اور ملکیتوں پر قبضہ نہیں کیا بلکہ اپنے خصائل وشمائل سے ان کے دلوں کو مسخر کر لیا، دماغوں کو گرویدہ کر لیا اور ان کے جذبات کو اس قدر فریفتہ کر لیا کہ جو پرائے تھے اپنے بن گئے اور جو بیگانہ تھے یگانہ ہو گئے۔ آج قرآن کریم کے حکم ومواعظ آپ کے سامنے ہیں، اگر آپ صحیح طور پر ان پر عمل کریں تو تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرا سکتی ہے اور ایسے پاک نفوس سامنے آسکتے ہیں جو مرجع خلائق ہوں اور ہر فرقہ وجماعت کے نیک سیرت انسان ان کی تعظیم وتکریم پر مجبور ہوں۔ آج مسلمانوں کو جہاد کا لفظ یاد رہ گیا ہے مگر یہ یاد نہیں رہا کہ باشندگانِ مکہ جیسے معاندین اسلام اور دشمنانِ ملت کے مقابلہ میں صبر واستقامت اور ضبط وتحمل کے ساتھ اعلیٰ اخلاق کے مظاہرہ کو جہادِ کبیر فرمایا گیا ہے وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا (الفرقان ۵۲) اور خود اپنے نفس کے غیر صالح جذبات، غلط خواہشات اور اخلاقِ رذیلہ کو پامال کرنے اور ان کی بجائے صالح جذبات پیدا کرنے اور مکارمِ اخلاق کے ساتھ مزین ہونے کو جہادِ اکبر سے تعبیر کیا گیا تھا کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجعنا من الجھاد الاصغر الی الجھاد الاکبر۔ اس جہادِ اکبر اور جہادِ کبیر میں نہ تیغ وتفنگ ہے، نہ خنجر وسناں ہے بلکہ ان میں مضبوطی اور پختگی کے ساتھ عمل ہے۔ ان ارشاداتِ ربانی پر جو تیغ وتفنگ سے بدرجہا مفید اور توپ وبندوق سے بہت زیادہ زود اثر ثابت ہوتے ہیں اور جن پر عمل پیرا ہونے کے لیے میدانِ جنگ

سے کہیں زیادہ ضبط وتحمّل اور صبر واستقلال سے کام لینا پڑتا ہے، ارشاداتِ ربانی جا بجا ہمیں ضبط وتحمل کی تلقین کرتے ہیں، بار بار ہدایت ہورہی ہے کہ درگذر اور معافی کو اپنی خصلت بنالیں، چھیڑ خانی کے مقابلہ میں چشم پوشی اختیار کریں، بُرائی کا بدلہ بھلائی سے دیں اور ہمیشہ جوابدہی کی وہ صورت اختیار کریں جو سب سے بہتر ہو۔ غرض مسلمان اگر چاہتے ہیں کہ اُن کی گئی ہوئی عظمت پھر لوٹے تو شرطِ اوّل یہ ہے کہ وہ صحیح اسلامی اخلاق پیدا کریں۔ صحابۂ کرامؓ کو جب دُنیا کا اقتدار عطا فرمایا گیا تو اس کی غرض وغایت یہ بتائی گئی ہے کہ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَہَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (الحج ۴۱) کیا اچھا ہو کہ مسلمان اس نکتہ کو سمجھیں اور انتقام در انتقام کے افسانوں پر خاک ڈال کر اسلامی اخلاق، احکام وتعلیمات کو اپنا پروگرام بنائیں خدائے تعالیٰ کی نصرت ان کے ساتھ ہوگی کما قال اللہ تعالیٰ: وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ (الحج ۴۰)

غرض اس طرح کی تقریریں جا بجا فرما کر آپ نے مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی اور ان کی بھگدڑ کو روکا، اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کی کوششوں اور دعاؤں کی برکت سے پھر حالات کو مائل باصلاح فرمایا، اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ بفضلہٖ تعالیٰ حالات میں بہت بڑا تغیر ہوگیا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ۴۷ء کے بعد حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ خاموش ہوکر بیٹھ گئے اور وہ زور وشور جو انگریز کے مقابلہ پر تھا ۴۷ء کے بعد وہ نہ رہا۔ لیکن یہ بالکل غلط اور صحیح حالات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، انگریز کے دور میں ایک بیرونی حکومت سے مقابلہ تھا اور اس کے مقابلہ کی یہی صورت تھی کہ تحریکات چلا کر اس کو پریشان اور آزادیٔ ہند پر مجبور کیا جائے، ۴۷ء کے بعد صورتِ حالات بدل گئی، اگر دو پیش ایک بہت بڑی اکثریت سے واسطہ پڑا، انگریز اور غلط قسم کے لیڈروں نے اس قدر اشتعال پیدا کردیا تھا کہ اکثریت کا دماغ ماؤف تھا، اِن حالات میں سابقہ طریقوں پر کام کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اس علاقہ سے مسلمانوں کا نام ونشان بالکل مٹ جاتا، اکثریت اور زیادہ مشتعل ہوجاتی۔ حکومت میں ایک طبقہ تو فرقہ پرستوں کا ہمنوا تھا ہی دوسرا غیر متعصب فرقہ جو حالات درست کرنے کی کوشش کررہا تھا اگر مسلمانوں کی طرف سے کوئی اشتعال انگیزی ہوتی تو وہ بھی مخالف ہوجاتا اور مسلمانوں کا ہندوستان میں وجود ناممکن ہوجاتا، اس لیے حالات کا تقاضا اور مسلمانوں کا مفاد اسی میں تھا کہ ایک طرف اکثریت کے اشتعال کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے اور حکومت کے غیر متعصب طبقہ کے تعاون سے حالات کو سازگار بنایا جائے، دوسری طرف مسلمانوں میں عزم وحوصلہ بڑھا کر اُن کے انخلاء کو روکا جائے جس میں ہندوستان کے مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ پاکستان کا بھی

بہت بڑا فائدہ تھا۔ چونکہ کثرتِ مہاجرین کی وجہ سے پاکستان کو شدید اقتصادی مشکلات کا سامنا تھا یہاں تک کہ پنڈت سُندر لال جب لاہور گئے تھے تو مسٹر لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان اور دیگر زعماء پاکستان نے اُن سے کہا تھا کہ اگر مہاجرین کی پاکستان میں درآمد کا یہی حال رہا تو پاکستان کا توازن قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کی کوششیں نہایت برمحل اور دانشمدانہ تھیں جن سے نہ صرف انڈین یونین کے مسلمان تباہی و بربادی سے بچ گئے بلکہ پاکستان کو بھی زبردست فائدہ پہنچا ورنہ مشرقی پنجاب کے مہاجرین کی درآمد سے پاکستان جن مشکلات میں گھر گیا تھا اگر مغربی یوپی کے مسلمانوں کا بھی اس پر اضافہ ہو جاتا تو نہ معلوم کس قدر تباہی و بربادی کا سامنا ہوتا اور کیسے کیسے وحشتناک مصائب اور اندوہناک حالات پیش آتے، اس لیے حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا انڈین یونین کے مسلمانوں پر ہی نہیں پاکستان پر بھی زبردست احسان ہے۔ یہ وجوہات تھیں جن کی بناء پر ۱۹۴۷ء کے بعد حضرت شیخ الاسلامؒ نے مسلمانوں کی بہتری اسی میں سوچی کہ وہ بجائے ٹکراؤ کے صبر و سکون اور تدبر کے ساتھ حالات کا مقابلہ کریں، یہی مشورہ حیدر آباد کے علماء کو دیا گیا تھا مگر وہاں کے رضا کاروں نے ٹکراؤ سے وہ تباہی کرائی جس کا اندازہ مشکل ہے، آپؒ نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا :۔

"آج تم اس ملک میں کروڑوں کی تعداد میں ہو پھر بھی تمہارے خوف کا یہ عالم ہے کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے ہو، آخر کہاں جا رہے ہو، کیا تم نے کوئی ایسی جگہ دیکھی ہے جہاں تم کو موت پا نہیں سکتی؟ جُبُن، بُزدلی اور خوف کو اپنے دلوں سے نکال دو، اسلام اور بُزدلی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، صبر اور استقلال کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کرو اور فساد کی ابتداء نہ کرو اگر فسادی تم پر چڑھ آئیں تو اُن کو سمجھاؤ لیکن اگر وہ نہ مانیں تو پھر تم معذور ہو، بہادری کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرو اور اس طرح مقابلہ کرو کہ فسادیوں کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے، تمہاری تعداد خواہ کتنی ہی تھوڑی ہو مگر قدم پیچھے نہ ہٹاؤ اور اپنی غیرت و حرمت کی حفاظت کرتے ہوئے جان دے دو، یہ عزت و شہادت کی موت ہوگی۔"[1]

حضرتِ مدنیؒ اور عمائدینِ جمعیۃ العلماء کی ایسی تقاریر اور عملی اقدامات سے ہندوستان کی

---

[1] خطبۂ صدارت حیدر آباد دکن ۱۹۵۶ء

حکومت کی نظروں میں وہ دارالعلوم دیوبند بھی کھٹکنے لگا جس نے نوّے سال بلکہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ لگاتار انگریزی حکومت کے خلاف علمِ جہاد بلند رکھا تھا اور مختلف بہانوں سے دارالعلوم دیوبند کو اپنی نظروں میں رکھا، حتیٰ کہ گائے کی قربانی کا بہانہ بنا کر دارالعلوم کی تلاشی لی اور جب صرف وہ اشتہارات ہاتھ لگے جو قربانی کے مسائل کے متعلق تھے تو وہ بھی ضبط کر لیے۔ حضرت مدنیؒ اور حضرت مہتمم (مولانا قاری محمد طیبؒ) صاحب سفر پر تھے، واپسی پر سارے ہندوستان میں صدائے احتجاج گونجنے لگی۔

اس موقع پر ایک شاعر نے ہندوستانی حکومت اور ہندوؤں کو تنبیہ کرتے ہوئے ایک نظم کہی تھی جو افادۂ عام کے لیے یہاں نقل کی جاتی ہے:-

اپنی کثرت پر نہ اتراؤ خدا تم بھی نہیں

آج توہینِ ملامت کا نشانہ ہوں میں
آج نیرنگِ زمانہ سے تماشہ ہوں میں

آج حسین احمد و آزاد کا آنسو ہوں میں
کسی ناکام وفا کا ہی پہلو ہوں میں

کیا یہی آپ کا انصاف رواداری ہے
وہی شئے آپ کی دشمن جو ہمیں پیاری ہے

دیوبند جس نے کیے سیکڑوں غازی پیدا
جس نے لاکھوں کیے انگریز کے باغی پیدا

اس ادارے کی تلاشی و اہانت افسوس
ضامنِ امن وامان اور یہ خیانت افسوس

آہ تقدیرِ صداقت کے پرستاروں کی
موسمِ گل میں بھی بوچھار ہے انگاروں کی

آج کہتے ہو مسلمان وفادار نہیں
سچ کہو تم تو جفا کیش جفاکار نہیں

کس نے گو تم کو دیا زہر کا پیالہ بولو
رام کو کس نے دیا دیش نکالا بولو

پاک سیتا پہ ہوئی دست درازی کس کی
کہیئے پانڈو پہ ہوئی تیغ نوازی کس کی

کس نے گاندھی سے وفا کیش کو مارا افسوس
جو تھا بھارت کی نگاہوں کا تارا افسوس

اپنے محسن کو جو ڈس لے اسے کیا کہیئے گا
ہے یہی مسلکِ آئینِ وفا کہیئے گا

قوم کی موت ہے اخلاق سے عاری ہونا
تنگیٔ ظرف کے معنی ہیں بھکاری ہونا

قابلِ فخر مسلمان بزرگانِ جلیل
قاسمؒ و سیّدؒ و محمودؒ شہید اسماعیلؒ

یاد ہوگا تمہیں وہ میرا جمالِ افغانیؒ
مایۂ قوم وہ محمود حسنؒ زندانی

میرے ٹیپو سے بہادر کو بھی کیا بھول گئے
شیرِ میسور کا اعلانِ وفا بھول گئے

شوکت و اجمل و انصاری وہ جوہر ہیں یاد
اور وہ کاکوروی کے اشفاق کی خونیں کو داد

یاد ہے کیا تمہیں ہنگامۂ قصّہ خوانی
یاد تحریکِ خلافت کی نہیں قربانی

سینہ و دل میں پھپھولوں کے نشاں باقی ہیں
اب بھی انگریز کے گولوں کے نشاں باقی ہیں

اپنے چھوڑے تمہیں سینے سے لگایا ہم نے
خون اپنا سرِ میدان بہایا ہم نے

ہم نے رنگیں بنایا ترے افسانے کو
گلشنِ ناز میں بدلا ترے ویرانے کو

وحدتِ قوم کی عظمت کے علمبردار ہیں ہم
تمہیں ہر زد سے بچایا وہ خطا کار ہیں ہم

ایک دن مالک و مختار ہم بھی تھے
ایک دن ہند کے سردار یہاں ہم بھی تھے

ہم نے آنکھوں پہ بٹھایا تمہیں ایسا سمجھا
تم نے نظروں سے گرایا ہمیں کانٹا سمجھا

کیا یہی آپ کا آئینِ جہاں داری ہے؟
جس کے ادراک سے ہر فہم و خرد عاری ہے

ہم ہیں غدار تو پابندِ وفا تم بھی نہیں
اپنی کثرت پہ نہ اتراؤ خدا تم بھی نہیں

مگر ان تمام صعوبتوں اور تکالیف کے باوجود حضرتِ مدنیؒ اور آپ کی جماعت نے فسادات کے زمانہ میں جو حیدری شجاعت کو عملی جامہ پہنایا یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج صرف صوبہ یوپی میں مسلمان ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ ہیں اور کل بھارت میں ان کی تعداد بیس کروڑ سے زیادہ ہے، اور ۱۹۹۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق یہ تعداد ۲۵ کروڑ ہے۔

تقسیم کے بعد حضرت مدنیؒ کی مصروفیات

ہندوستان سے انگریز رخصت ہوا مگر اپنے بُرے اثرات چھوڑ کر گیا۔ ہندوستان میں بسنے والوں نے بجائے انسانیت، مروّت کے حیوانیت اور بربریت کا وہ مظاہرہ کیا جس کی مثال پانچسو سالہ سابقہ دور میں نہایت ملتی۔ آزادی کے بعد ایک دردمند انسان کی طرح حضرت مدنیؒ کی مصروفیات میں کافی اضافہ ہو گیا۔ دارالعلوم کی تدریسی خدمات، خانقاہی نظام کی نگہداشت اور سب سے بڑا مسئلہ ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایسی تجاویز بروئے کار لانی جن سے ان کروڑہا مسلمانوں کا مستقبل بہتر ہو جائے، سیاسی حقوق کے حصول کے لیے جمعیۃ العلماء ہند کی تنظیم نو پر خصوصی توجہ دینی، چنانچہ ان سب کاموں کی طرف حضرتؒ نے حسب عادت پوری توجہ فرمائی۔

دارالعلوم کی دینی اور تعمیری ترقی کی ضرورت اب پہلے سے زیادہ اس لیے لاحق ہوگئی کہ پاکستان بن جانے کے بعد جس طرح یہاں کے طلباء کا دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کیلئے جانا آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا اسی طرح بھارت سے ہجرت کر کے آنے والے وہ مخیر مسلمان جو دارالعلوم کی مالی امداد فرمایا کرتے تھے اب معذور ہو گئے، خود پاکستان کے مخیر حضرات کے لیے دارالعلوم کی مالی امداد کرنی کئی وجوہ سے بند ہو گئی، اس لیے حضرتؒ کی مصروفیت اور ذمہ داری بہت بڑھ گئی مگر حضرتؒ کی تدریسی اور تعلیمی برکات سے دارالعلوم کے طلباء کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور مالی مصارف کے لیے بھی اللہ تعالیٰ امداد فرماتا رہا اور دارالعلوم کو کبھی بھی مالی مشکلات کا سامنا نہ ہوا۔

اسی طرح حضرتؒ نے دوسرے دینی مراکز اور مدارس کی طرف پوری توجہ دی حتیٰ کہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ جس کا کردار تقسیم سے پہلے علماء کرام کے حق میں ناگفتہ بہ تھا، ادھر بھی حضرتؒ نے پوری توجہ فرمائی اور سارے ملک میں دینی مدارس اور تبلیغی مراکز کا جال بچھا دیا، چونکہ مولانا ابوالکلام آزادؒ اس وقت کی حکومت کے پہلے وزیر تعلیم تھے اس لیے ان کے زیر سرپرستی حکومتی امداد اور تعاون میں اضافہ ہوتا گیا، وہی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جس کے طلباء نے علیگڈھ ریلوے اسٹیشن پر مولانا آزاد کے سامنے پتلونیں اُتار کر ننگا ناچ کیا تھا اُسے پھر آپ نے حکومتِ ہند کے ہر قسم کے تعاون سے مُستحکم فرمایا اور آج بھی وہ یونیورسٹی اسی طرح قائم ہے۔

مگر حضرتؒ کا دل افسردہ رہتا تھا مشرقی پنجاب، یُوپی، دِلّی کے واقعات نے قلب وجگر پر گہرے اثرات ڈالے ہوئے تھے خصوصاً سکھوں کی چیرہ دستیوں سے تو بہت زیادہ افسردہ رہتے تھے، بھارت کی انتظامیہ کچھ اپنی قوم کی ناراضگی کے خطرے سے مسلمانوں کا تحفظ اُس طرح نہ کرتی تھی جس طرح کرنا چاہیئے تھا۔ اور کچھ ان ہندوؤں کی سرکشی بھی تھی جن کو تقریباً ایک ہزار سال بعد اتنے بڑے ملک پر حکمرانی حاصل ہوگئی تھی، ان مسلمانوں پر ظلم وستم کی انتہاء کر دی تھی جنہوں نے ان پر اپنے انعامات کی ہمیشہ بارش کی تھی اگر وہ متعصب ہوتے تو ایک ہزار سال کے بعد بھارت میں سب آبادی مسلمان ہوتی۔ حالات اس قدر ناگفتہ بہ تھے کہ رحم اور امن کی بات کہنے والا بھی بھارت کا دشمن سمجھا جاتا تھا، ہندوؤں کے سب سے بڑے مُحسن گاندھی جی کا قتل بھی اسی کا شاخسانہ تھا۔ حکومت کی بے رُخی اور بے التفاتی کے پیشِ نظر حضرتِ مدنی قدس سرہٗ العزیز نے حکومت پر اعتماد ختم کر دیا تھا، جیسا کہ ایک خط کے جواب میں ارشاد فرمایا:۔

"میرا تعلق اربابِ حکومت سے تقریباً بالکل ہی منقطع ہے، نہ میں اُن کے پاس جاتا ہوں نہ وہ مجھ کو پوچھتے ہیں ؎

میری اُن سے رسمِ اُلفت مٹ گئی مُدتیں گذریں زمانہ ہوگیا"[1]

البتہ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی غیر مُلکی اہم شخصیت کی ہندوستان آمد کے موقع پر حکومتِ ہند کا یہ پروگرام ہوتا تھا کہ حضرتؒ اُن سے اہم ملاقات کریں مصر کے مشہور لیڈر اور سابق صدر انور السادات اُس وقت وہ شاید مصر کے مذہبی امور کے وزیر اور جمال عبدالناصر کے بڑے مُعتمد تھے، حکومتِ ہند نے اُن کی دیوبند حاضری کا اہتمام کیا حضرتؒ نے حسبِ عادت اُن کے ساتھ اخلاقِ کریمانہ اور عزت افزائی کا معاملہ کیا۔ اس موقعہ پر ایک خاص واقعہ یہ پیش آیا کہ بوقتِ رُخصت انور السادات نے حضرتؒ کے ساتھ فوٹو کھنچوانے کی خواہش ظاہر کی اور عرض کیا کہ ایک منٹ کے لیے میرے ساتھ کھڑے ہو جائیں حضرتؒ

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام جلد ۴ ص ۲۵۴

کو خیال بھی نہ آیا کہ اس کھڑے ہونے کا کیا مطلب و مقصد ہے، چلتے چلتے کھڑے ہو گئے، فوٹو گرافر نے کیمرہ سامنے کیا تب بھی حضرتؒ نہیں سمجھے کہ یہ کیا چیز ہے اور کیوں سامنے لائی گئی ہے، مگر جب فلیش کی چمک ہوئی تب حضرتؒ کو یاد آیا کہ ایسی روشنیاں تو جلسوں جلوسوں میں فوٹو کھینچنے کے وقت ہوتی ہیں، فوراً ترشروئی کے ساتھ الگ ہو گئے اور تلخی کے ساتھ سادات کو مخاطب کیا کہ آپ کو معلوم ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سب سے پہلے دوزخ میں جو لوگ جائیں گے وہ مصوّرین ہی ہوں گے۔

ہندوستان کے پہلے صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بھی حضرتؒ سے ملاقات اور مدرسہ میں حاضری کے لیے دیو بند آنے کا ارادہ کیا، صدر جمہوریہ کے باڈی گارڈ عملہ نے اعتراض کیا کہ صدر دمہ اور قلب کے مریض ہیں، دیو بند چھوٹا سا قصبہ ہے اس میں راحت رسانی کے انتظامات نہیں ہو سکتے ــــــ مگر راجندر پرشاد کے اصرار پر حکومت کو مجبور ہونا پڑا اور آخر کار وہ دیو بند آئے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مزاجی خوش خلقی کے ساتھ ان کی تواضع فرمائی۔

سابق وزیر اعظم ہندوستان لال بہادر شاستری آستانے پر حاضر ہوئے، اُس وقت وہ حکومتِ ہند میں ریلوے منسٹر تھے، متواضع اور منکسر المزاج انسان تھے، حضرتؒ کی مجلس میں ایک فرو تر جگہ پر بیٹھ گئے، حضرتؒ نے مجلس کی ممتاز جگہ پر اشارہ کر کے فرمایا کہ اب آپ وزیر ہیں اس جگہ تشریف رکھئے، انہوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ حضرت آپ کو یاد نہیں رہا جیل میں بھی آپ کے دربار میں میری یہی جگہ مقرر تھی آج بھی میں یہیں بیٹھوں گا۔

ایک دوسرے مرکزی وزیر مہابیر تیاگی بھی بغیر کسی رسمی تکلفات کے حضرتؒ کے دولت کدے پر آ کر ملے۔ پنڈت گووند ولبھ پنت جس وقت یوپی کے وزیر اعلیٰ تھے اس زمانے میں کسی سرکاری دورے پر دیو بند آئے اور حاضری کا ارادہ کیا، حضرتؒ نے کثرتِ مشاغل کی بنا پر عذر فرمایا مگر اُن کے میزبان انہیں عصر کے بعد کی عام مجلس میں لے آئے جس میں ہر کس و ناکس کو باریابی کی اجازت تھی، جب وہ آ ہی گئے تو حضرتؒ نے حسبِ عادت و مزاج خندہ پیشانی کے ساتھ ان سے ملاقات فرمائی ــــــ اسی طرح مرحوم رفیع احمد قدوائی بھی ایک دن بلا اطلاع تشریف لائے اور عام حاضرین کی صف میں فروکش ہو گئے، کسی نے انہیں پہچانا بھی نہیں، کچھ دیر بعد حضرت اندرونِ خانہ سے برآمد ہوئے تب لوگوں کو پتہ چلا کہ یہ قدوائی صاحب ہیں ــــ اس قسم کی ملاقاتوں کے علاوہ کبھی کبھی قومی اور ملی تقاضوں پر حضرتؒ اور حکومت کے ذمہ داران

راجندر پرشاد، جواہر لال نہرو اور مولانا ابو الکلام آزاد کے درمیان مراسلت بھی ہوتی تھی، افسوس کہ اس درویشانہ اور فقیرانہ ماحول میں اس کی کبھی کوئی اہمیت نہ سمجھی گئی کہ ان مراسلات کی نقول رکھی جائیں اسلئے کہ حضرتؒ اس قسم کی رسمی اور غیر ضروری باتوں کی طرف کبھی توجہ نہیں فرماتے تھے۔

حکومتِ ہند نے خدمات کے اعتراف کے طور پر حضرتؒ کو پدم وبھوشن کا خطاب دیا، اس خطاب کے ساتھ کوئی تمغہ، خلعت اور تا حیات کوئی ماہوار رقم پیش کی جاتی ہے۔ جس مجلس میں قاصد نے اس خطاب کی اطلاع دی حضرتؒ نے اسی مجلس میں ارشاد فرمایا کہ حکومت کو لکھ دیا جائے کہ میں یہ خطاب نامنظور اور واپس کرتا ہوں اس بارے میں جو خط حضرتؒ نے حکومتِ ہند کو لکھا وہ انکار کی صحیح وجہ پیش کرتا ہے:-

بحضور جناب فیض مآب صدر جمہوریہ ہند دام اقبالکم

بعد از آداب عرض آنکہ اگرچہ اب تک مجھ کو باقاعدہ کوئی اطلاع نہیں دی گئی مگر اخباروں میں شائع شدہ اطلاعات سے معلوم ہوا کہ جناب نے پدم وبھوشن کے تمغہ سے بنا بر صدارت جمعیۃ علماء ہند اور خدماتِ علمیہ دار العلوم دیوبند اور جد وجہد آزادئ وطن میری عزت افزائی کی ہے، اگر واقعہ صحیح ہے تو میں آپ کی اس عزت افزائی اور قدر دانی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور عرض رساں ہوں کہ چونکہ ایسا تمغہ میرے نزدیک پبلک کی نگاہوں میں بے لوث، آزاد خادمانِ ملک وملت کی آزادئ رائے اور اظہارِ حق کو مجروح کرنا اور قومی حکومت کی صحیح اور سچی راہنمائی کی راہ میں ایک قسم کی رکاوٹ ہے اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ بصد شکریہ اس تمغہ کو واپس کر دوں۔''

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

۲ رستمبر ۱۹۵۴ء

آزاد حکومت کے ساتھ حضرت کا تعلق بس انہی حدود تک محدود رہا، قومی اور ملکی معاملات کے علاوہ حضرتؒ نے حکومت سے نہ کوئی لفظ کہا اور نہ لکھا اور نہ از خود کبھی کسی ذاتی معاملات کے لیے تشریف لے گئے۔[1]

---

[1] شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ مرتبہ فرید الوحیدی ص ۶۹۰ تا ۶۹۲

حضرت مدنیؒ کا آخری حج

حضرت اپنی حیاتِ مبارکہ میں کئی دفعہ زیارتِ حرمین شریفین سے مشرف ہو چکے تھے، پہلے دو حج (۱۳۱٦ھ، ۱۳۲۹ھ) تو قیامِ مدینہ منورہ کے دوران ہی کرنے کی سعادت ملی اور ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱٦ء میں تیسرا حج اسارتِ مالٹا کی گرفتاری سے پہلے حضرت شیخ الہندؒ کی رفاقت میں ادا فرمایا، اس کے بعد بھی کئی حج فرمائے۔ حج کا سفر بھی حضرتؒ کا امتیازی سفر ہوتا تھا کہ کئی سعادتمند معتقدین، علماءِ کرام، صوفیاءِ عظام آپ کی زیرِ امارت یہ سفر کرتے تھے۔ آپ کے نزدیک بہتر یہ تھا کہ پہلے مدینہ منورہ جاتے اور پھر وہاں سے احرام باندھ کر حج کے لیے آتے۔ اس میں ایک تو سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حج مبارک کی عملی اِتباع ہو جائے گی جو قبولیت کے لیے ایک قوی ذریعہ ہے اور دوسرا حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے قبولیتِ حج بھی یقینی ہو جائے گی، جیسا کہ آپ نے جب ۱۳۴۷ھ میں حج کے ارادہ سے محمدی جہاز میں سفر فرمایا اور اس مبارک سفر میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے مہتمم جناب مولانا محمد سعید صاحب بھی آپ کے ہمرکاب تھے، تو مولانا نے حضرتؒ سے چند امور کا استفسار کیا جن میں سے ایک مندرجہ بالا مسئلہ بھی تھا حضرتؒ نے مندرجہ ذیل جواب ارشاد فرمایا :۔

"میرا خیال تو یہی ہے کہ اوّلاً مدینہ منوّرہ حاضر ہوں اور وہاں اوائل ذی الحج تک مقیم رہ کر مکّہ معظمہ کو روانہ ہوں، یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ پہلے مکّہ معظمہ جانا افضل ہے یا مدینہ منوّرہ مگر آیت وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ○ (سورۃ النساء آیت ٦۴)[1] اور قاعدہ شفاعت کا اس کا مقتضی ہے کہ پہلے

---

[1] ترجمہ: اور اگر یہ لوگ جب ظلم کرتے اپنے آپ پر آپ کے پاس آتے اور یہاں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے اور اللہ تعالیٰ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے لیے مغفرت کی شفاعت کرتا تو یقیناً اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پاتے۔

شفیع کی خدمت میں حاضر ہوں اور اسی کو لے کر شہنشاہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں، اسی کو ترجیح دیتے ہیں کہ مدینہ منورہ اوّل حاضر ہوں۔" (مکتوبات ج ۳ ص۱)

اس کی مزید تشریح اپنے ایک گرامی نامہ میں جو آپ نے اپنے مسترشد مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو تحریر فرمایا تھا اس میں یہ بھی ارشاد فرمایا:۔

"میں پہلے عریضہ میں عرض کر چکا ہوں وہی میرے نزدیک ان دونوں عبادتوں کے لیے اصل الاصول ہے اُسی کو مطمح نظر بنائیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا رسالہ فیوض الحرمین[1] بھی راستہ میں مطالعہ کر ڈالیے، سفر حرمین شریفین اور وہاں کی اقامت وغیرہ کے متعلق بھی بہت سی معتبر معلومات حاصل ہوں گی۔ مدینہ منورہ کی حاضری محض جناب سرورِ کائنات علیہ السلام کی زیارت اور آپ کے توسل کی غرض سے ہونی چاہیئے، آپ کی حیات نہ صرف رُوحانی ہے جو کہ عام مؤمنین و شہداء کو حاصل ہے بلکہ جسمانی بھی ہے اور از قبیل حیاتِ دُنیوی بلکہ بہت سی وجوہ سے اس سے قوی تر ہے، آپ سے توسل نہ صرف وجودِ ظاہری کے زمانہ میں کیا جاتا تھا بلکہ برزخی وجود میں بھی کیا جانا چاہیئے۔ محبوبِ حقیقی تک وصال اور اس کی رضا صرف آپ ہی کے ذریعہ سے اور وسیلہ سے ہو سکتی ہے، اس لیے میرے نزدیک یہی ہے کہ حج سے پہلے مدینہ منورہ جانا چاہیئے اور آپ کے توسل سے نعمت حج و عمرہ کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے۔" (مکتوبات ج ۱ ص۱۳۰)

---

[1] **مختصر تعارف فیوض الحرمین** | شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں مجھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں میں سے یہ نعمت بھی عطا فرمائی کہ مجھے توفیق دی حج بیت اللہ اور زیارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنہ ۱۱۴۳ھ میں، اور اس سے بڑی نعمت یہ ملی کہ میراحج مشاہدہ کے ساتھ ہُوا اور معرفت کے ساتھ۔ (مقدمہ فیوض الحرمین) اس کی تفصیل اپنے مشاہدہ میں فرماتے ہیں:" اور میں نے دیکھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اکثر امور میں اُسی صورت میں جس میں آپ تھے بار بار، باوجودیکہ میری کمال آرزو تھی کہ روحانیت میں دیکھوں جسمانیت میں نہ دیکھوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو، مجھ کو دریافت ہُوا کہ آپ کا خاصہ ہے رُوح کو صورتِ جسم میں کرنا اور یہی بات جو فرمایا آپ نے کہ انبیاء کرام نہیں مرتے اور نماز پڑھتے ہیں اپنی قبور میں اور زندہ ہیں اور جو جو فرمایا ہے، اور جب میں نے آپ پر درود پڑھا تب ہی مجھ سے خوش ہوئے اور انشراح فرمایا اور ظاہر ہوئے اور یہ اس واسطے کہ آپ رحمۃ للعالمین ہیں۔" (فیوض الحرمین)

آپ نے آخری حج ۱۹۵۵ء میں ادا فرمایا جس کو ہم حجۃ الوداع سے تعبیر کر سکتے ہیں کہ اس حج کے بعد آپ ۱۹۵۷ء میں رحلت فرما گئے، یہ حج ایک خاص لحاظ سے مقبولیت کا حج تھا کہ وہ سرزمین حجاز جہاں سے آپ کو اور آپ کے استاذ محترم اور دیگر چند رفقاء کو ۱۳۳۵ھ میں اُس وقت کی حکومت نے پابند سلاسل کر کے مالٹا روانہ کر دیا تھا۔ عالم اسباب میں بہت ہی کم مخلص اور جان نثار نظر آتے تھے، تقریباً ۴۰ سال بعد وہی حسین احمد جب حج بیت اللہ اور زیارت بیت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سرزمین حجاز پر قدم رکھتا ہے تو حکومت عرب آپ کو اپنا مہمان خصوصی بنانے کی سعادت حاصل کرتی ہے اور شاہی اہتمام سے اس مقدس عبادت کو کرتے ہیں۔ وہ سید حبیب اللہ نور اللہ مرقدہ جو عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں مخمور ہو کر عالم غربت میں مسافر آخرت ہو جاتا ہے آج اُسی کا پوتہ سید حبیب (زید مجدہم) سعودی عرب کے ممتاز شرفاء میں شمار ہو رہا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۔
(العنکبوت ۶۹)

اور وہ لوگ جو ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم اُن کے لیے کئی راستے کھول دیتے ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ مخلص لوگوں کے ساتھ ہے۔

۱۹۵۵ء میں حضرتؒ نے اپنی زندگی کا آخری حج کیا، جیسے جیسے وقت گذر رہا تھا حضرتؒ ضعیف اور کمزور ہوتے جا رہے تھے، عمر بھی اب کم و بیش ۸۰ برس کی ہو گئی تھی، اس لیے جیسے ہی حضرتؒ کے سفر حج کے بارے میں لوگوں کو علم ہوا تو مریدین منتسبین اور خدام کی ایک اچھی خاصی تعداد ہمرکاب ہونے کی خواہشمند ہوئی، چند حضرات کے نام یاد رہ گئے ہیں جو اس سفر میں ساتھ تھے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی دو صاحبزادیاں اور ان کے صاحبزادے مولانا ہارون صاحب مرحوم، قاری اصغر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ خادم خاص اور خلیفہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مولوی قاضی سجاد حسین صاحب مرحوم صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی، حاجی بدرالدین صاحب انیچولی، مولانا مولوی بایزید شہید پاڈورنا ڈیتھ افریقہ خلیفہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ہمراہیوں کے اسماء قابل ذکر ہیں، اس سفر میں بھی چھوٹے بڑے سبھی اہل خانہ مع خدام اور حضرتؒ کے بھتیجے مولانا وحید احمد مدنی مرحوم کے بیٹے ڈاکٹر رشید الوحیدی کے شریک سفر تھے، حکومت سعودی عرب کے فرمانروا اُس وقت ملک سعود بن عبدالعزیز تھے اُن کی طرف سے حضرتؒ کے حج کے جملہ انتظامات کی پیشکش ہوئی، اگرچہ یہ بات حضرتؒ کی عادت اور مزاج کے خلاف تھی مگر بوجوہ چند

منظور فرمایا اور چھ سات موٹر کاریں حج کے نقل و حمل کے لیے حاضر ہوگئیں، جدّہ میں قیام بھی شاہی اہتمام کے ماتحت ہوا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی مولانا سید محمود احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بہت اصرار کیا اور ہر قسم کے انتظامات کی پیشکش کی کہ حضرتؒ اب ہندوستان کے قیام کو ترک کر کے مدینہ طیبہ ہی میں رہ جائیں یا جاکر واپس آجائیں مگر حضرتؒ نے منظور نہ کیا اور فرمایا کہ ہندوستان کے مسلمان اس وقت ایسی حالت میں ہیں کہ اپنی آسائش اور آسانیوں کے لیے انہیں چھوڑ کر کہیں چلے جانا کسی طرح صحیح نہیں ہے، میں کچھ کر سکوں یا نہ کرسکوں مگر وہاں صرف موجودگی سے بہت سے احباب اور دوستوں کو حوصلہ ملتا ہے۔ چھوٹے بھائی کے علاوہ مدینہ طیبہ کے بہت سے معززین نے حضرتؒ سے مدینہ کے قیام پر اصرار کیا مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے عذر فرما دیا۔

حضرتؒ کی تشریف آوری پر حجاز مقدس کے اخبارات المنہل، البلاد، مکۃ المکرمۃ، أم القرٰی، المدینۃ وغیرہ نے حضرتؒ کے حالات اور ترحیبی مقالات شائع کیے۔ اور جب تک مدینہ طیبہ اور حجاز میں قیام رہا شائقینِ علومِ حدیث اور طالبانِ علومِ نبوت خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے رہے، ان میں وہ حضرات بھی تھے جو حضرتؒ سے پہلے بھی شرفِ تلمذ حاصل کر چکے تھے اس قیام کے دوران بھی حسبِ اسفارِ سابق مواجہ شریف میں طویل اوقات کے لیے حاضری اور ساکت وصامت کھڑے رہنا حضرتؒ کا معمول رہا، رخصت ہوتے ہوئے مکمل تین گھنٹہ ایک طرح کھڑے ہو کر اشکبار رہے۔

اس آخری سفرِ حج میں آپ کے شاگردِ رشید مولانا قاضی سجاد حسین صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی بھی آپ کی خدمت میں حاضر تھے، آپ نے دربارِ رسالتِ عظمٰی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حضور میں حضرتِ مدنیؒ کے قرب کا جو حال بیان فرمایا ہے اس کا خلاصہ ان ہی کے کلمات میں درج ذیل ہے۔

> "۱۹۵۵ء کے سفرِ حج میں جو سعادت اس خادم کو میسر ہوئی اس میں حضرت شیخؒ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ایک وقت تو وہ تھا جب زمانۂ طالبِ علمی میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے قریب رہا لیکن وہ وقت ایسا نہ تھا جس میں شیخ کے مقام کو پہچان سکتا البتہ اس سفر کی تقریباً دو ماہ کی شب و روز کی معیت میں حضرتِ شیخ کو خوب

دیکھا اور خوب سمجھا، مدینہ طیبہ حضرت شیخ کے ساتھ چالیس روز قیام رہا اس پیرانہ سالی اور ضعف ونقاہت میں بھی شیخ کا معمول تھا کہ نماز حرم نبوی میں حاضر ہو کر ادا فرماتے تھے اور عصر کی نماز کے بعد تو مسجد نبوی میں معتکف رہ کر عشاء کی نماز ادا فرمایا کرتے تھے عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر کافی دیر بعد مواجہہ شریف میں حاضری دیا کرتے تھے، بارگاہ رسالت میں حضرت شیخ کی یہ حاضری بھی عجیب پُر کیف ہوا کرتی تھی، حضرت شیخ رح نے حاضری کا یہ وقت غالباً اس لیے منتخب فرمایا تھا کہ زائرین کا قدرے ہجوم کم ہوتا تھا، اُس وقت حضرت شیخ کی خواہش یہ ہوا کرتی تھی کہ اپنے وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ یَا وَلَدِیْ [1] فرمانے والے جدِ بزرگوار کے سامنے تنہائی میں حالِ دل پیش فرمائیں، لیکن پھر بھی ہم جیسے وابستگان اس بیتابانہ حاضری کے پُرسعادت لمحات میں دُور و قریب رہ کر معیت کا شرف حاصل کر ہی لیا کرتے تھے۔ ہم نوجوان تھے لیکن ہماری مادی جوانی حضرت شیخ کی روحانی طاقت اور زیارتِ نبوی کے جذبۂ شوق کی تاب نہ لاتی تھی حضرت شیخ رح کا یہ وہ وقت تھا جبکہ گھٹنے تقریباً جواب دے چکے تھے، نشست و برخاست میں بھی تکلیف ہوتی تھی لیکن بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر جس وقت مراقب ہو جاتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ حضرت ہمہ تن وفورِ شوق میں غرق ہیں، ایک ایک گھنٹہ مراقبہ کی حالت میں اس طرح کھڑے رہتے تھے کہ پیروں کو جنبش تک نہ ہوتی تھی ہم لوگ کچھ دیر اپنے اوپر خشوع وخضوع کی کیفیت طاری کرتے تھے مگر تھوڑی دیر بعد اپنے آپ کو درماندہ پا کر کچھ فاصلہ پر دُور بیٹھ جایا کرتے تھے۔" (الجمعیۃ دہلی، شیخ الاسلام نمبر ص۹۴)

◎

---

[1] قاضی صاحب کا یہ ارشاد اس واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اسارتِ مالٹا سے پہلے رونما ہوا تھا اور اس کا چرچا سارے مدینہ طیبہ میں یوں تھا کہ ایک ہندی نوجوان نے جب سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور الصلوٰۃ والسلام علیك یا رسول اللہ کے ساتھ سلام پیش کیا تو اندر سے وعلیکم السلام یا ولدی کا ایسا پرکیف جواب بآوازِ بلند آیا جسے اُس وقت کے سب زائرین نے سُنا اور وہ نوجوان حسین احمد تھا۔ (مرتب)

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا آخری تبلیغی سفر

یہ تقریر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۶ جولائی ۱۹۵۷ء کو بعد نماز جمعہ بمقام ارکونم ضلع شمالی آرکاٹ (مدراس) میں ایک تبلیغی اجتماع میں فرمائی، تاثر کا یہ عالم تھا کہ سارا مجمع رو رہا تھا، اس کے بعد بنگلور میں حضرتؒ کو سانس کی تکلیف شروع ہو گئی، بنگلور وانم باڑی میں تقاریر فرمائیں مگر بیماری کی وجہ سے سفر ملتوی کر دیا، یہ حضرتؒ کی زندگی کا آخری سفر تھا۔ (مرتب)

آغازِ تقریر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفیٰ وَسَلَامٌ عَلیٰ عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفیٰ، اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ:
لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ[1] (آل عمران ۱۶۴)

محترم بھائیو اور بزرگو! اللہ تعالیٰ کے احسانات تمام مخلوقات پر خصوصاً انسانوں پر نہایت زیادہ ہیں جن کی کوئی حد نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے حقیقتاً ہم تمام انسانوں کو اپنی نعمتوں سے ڈھانک لیا ہے، ارشادِ باری ہے:
اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَۃً (لقمٰن ۲۰)

اللہ تعالیٰ نے تمام عالمِ انسانیت کو چھپی ہوئی اور کھلی ہوئی نعمتوں سے ڈھانک رکھا ہے اپنی تمام مخلوقات میں خدا تعالیٰ نے سب سے زیادہ شرافت اور بڑائی انسان کو عطا کی ہے۔

پروردگار نے اپنے فضل و کرم سے ہماری نجات کے واسطے ہر قسم کی بھلائی کا عالمِ ارواح میں، ماں کے

---

[1] (ترجمہ) حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان میں انہیں کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب اور فہم کی باتیں سناتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ اس سے قبل صریح غلطی میں تھے۔

پیٹ میں، طفولیت کے عالم میں سامان کیا ہے اُسے کوئی حاجت نہیں کہ ہم کو نجات ملے وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ (الانعام ۱۳۴)

اس کی شفقت ہے کہ آخرت کے لیے بھی ہر قسم کی بھلائی کا سامان کیا، اس نے اپنا فضل فرمایا ہے کہ ہم کو پیدا کیا، انسان بنایا اور تمام اعضا مکمل کر دیئے، عقل دی، ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک وغیرہ سب اعضاء دیئے، یہ کافی ہے اس کو حجت قائم کرنے کے واسطے، لیکن پروردگار نے اپنی شفقت سے دوسری چیز بھی مقرر کی اُس نے ہر زمانے میں اپنے مقرب بندوں کو ہماری اصلاح کے لیے بھیجا جنہوں نے ہماری اصلاح کیلئے اپنی جان کی بازی لگا کر کوشش کی اور ہماری بھلائی کی فکر کی اور ہر ظلم و ستم کو برداشت کیا، ابتدا سے یہ سلسلہ جاری ہے، تمام انبیاء علیہم السلام کے واقعات سنتے آئے ہیں، ہمارے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم تمام پیغمبروں کے سردار جن کے لیے عالم ارواح میں انبیاء (علیہم السلام) سے عہد لیا گیا تھا: وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ (آل عمران ۸۱) انبیاء کی روحوں کو جمع کر کے اُن سے عہد لیا گیا کہ اگر تمہارے زمانے میں وہ پیغمبر آجائے تم اس پر ایمان لانا اور مدد کرنا۔

وہ پیغمبر جو سب انبیاء علیہم السلام کے علوم کو جمع کرنے والا نبی آخر الزمان ہے ہم کو عطا فرمایا، پھر انبیاء علیہم السلام سے پوچھا: ءَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي کیا تم نے اقرار کیا؟ قَالُوا أَقْرَرْنَا کہا ہم نے اقرار کیا۔ (آل عمران ۸۱)

ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں ایسا پیغمبر عطا فرمایا اور ہماری بدقسمتی ہے کہ اُن کے طریقہ پر عمل کرنے میں کوتاہی کریں۔ اللہ کا محبوب اور سب سے اونچا پیغمبر بغیر مانگے ہم کو عنایت فرمایا حالانکہ پہلی اُمتوں نے مانگا تھا اور ان کو نصیب نہیں کیا، شفقت والا، رحمت والا، کمال والا، علم والا اور زہد و تقویٰ والا پیغمبر ہم کو عطا فرمایا، یہ اُس کا احسان ہے، ہماری نالائقی ہے کہ ایسے پیغمبر کو پانے کے بعد بھی ہم اُس کی اطاعت نہ کریں۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ یعنی بیشک اللہ پاک نے مومنوں پر احسان فرمایا ہے کہ اُن ہی میں سے ایک عظیم الشان پیغمبر مبعوث فرمایا۔ ہمارا ہادی اگر کوئی فرشتہ یا جن ہوتا تو اُس کو ہم پر ایسی شفقت نہ ہوتی۔

بہرحال آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم ہماری اصلاح کیلئے بھیجے گئے، اللہ نے ہمیں اپنی عبادت کیلئے پیدا

کیا، اور اس کے لیے جن چیزوں کی ضرورت تھی قوتِ علمی و عملی سب دے دی، شدتِ رحمت کی وجہ سے اُس نے اسی پر اکتفاء نہ کیا کہ عقل اور سمجھ دے دی اور اسی پر عمل کا مطالبہ نہ کیا۔ جیسا کہ آپ اپنے فرزند کو سرمایہ دے کر تجارت کرنے کو کہتے ہیں کہ اگر نقصان کیا تو سزا ملے گی۔ اگر ایسا اللہ بھی فرماتا تو کوئی اعتراض کی بات نہ تھی لیکن اللہ تعالٰے کی شفقت ہے کہ اس نے انبیاء علیہم السلام کو بھی روانہ کیا۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (النساء [165])

پیغمبروں کو اس لیے بھیجا کہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ ہمیں دنیا میں راستہ دکھانے والا نہیں آیا تھا۔ راستہ دکھانے والے اخیر زمانے میں ہمارے آقا کو جو رحمتِ مجسّم ہیں بھیجا، وہ ۲۳ برس منصبِ نبوّت پر فائز رہے، ۴۰ برس کی عمر میں تاجِ رسالت پہنایا گیا، ۶۳ برس کی عمر میں دُنیا سے رخصت ہوئے۔ اس عرصہ میں آپ کو کتنی تکلیفیں دی گئیں اور کتنا ستایا گیا؟ آج وہ بھی تکلیف دے رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کے خلاف کر رہے ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ستا نہیں رہے ہیں؟ بیٹا اگر خلاف کرے تو صدمہ ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہفتہ میں دو مرتبہ اعمال پیش ہوتے ہیں، باپ کو اولاد سے محبت ہوتی ہے، نبی کو اپنی اُمت سے باپ سے زیادہ محبت و شفقت ہوتی ہے، جب آپ کے سامنے پیش کیا جائے کہ آپ کا فلاں اُمتی غیروں کا متبع ہے داڑھی منڈاتا ہے، تو آپ کو صدمہ نہ ہوگا؟

ایک بار ایران کا سفیر بادشاہِ دہلی کے پاس آیا، مرزا بیدل کا صوفیانہ کلام پڑھ کر لوگ اُس کو قطب سمجھتے تھے، بادشاہ کے دربار میں سفیرِ ایران آیا تو مرزا کا تعارف بھی کرایا گیا، داڑھی خشخشی تھی، پوچھا "آغا ریش می تراشی"؟ مرزا نے کہا "ریش می تراشم ولیکن دل کسے را نمی خراشم"۔ سفیر نے جواب دیا "بلے دلِ رسول اللہ می خراشی"۔ مرزا صاحب کمال تھے، غلطی معلوم ہوئی تو سر نیچا کر لیا، گھر گئے اور تین دن تک شرمندگی سے باہر نہ آئے۔

آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اعمال جب پیش ہوں کہ فلاں اُمتی یوروپین فیشن کرتا ہے، کرزن فیشن کرتا ہے تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دلِ مقدسہ کو صدمہ نہ ہوگا؟ پہلے بھی بتائے گئے۔

لَقَدْ اُوْذِيْتُ فِي اللّٰهِ مَا اُوْذِيَ اَحَدٌ مِّثْلِيْ وَلَقَدْ اُخِفْتُ فِي اللّٰهِ مَآ اُخِيْفَ اَحَدٌ مِّثْلِيْ۔ (الحدیث)

میں اللہ کی راہ میں اتنا ستایا گیا کہ کوئی اس قدر نہیں ستایا گیا اور مجھے اللہ کی راہ میں اس قدر ڈرایا گیا کہ کسی کو اس قدر ڈرایا نہ گیا۔

غرض ہر طرح سے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے تکلیفیں اُٹھائیں اور آج سُنّت کی خلاف ورزی

کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ستاتے ہیں۔

مُنیب صحابیؓ بنی سُلیم کے کہتے ہیں کہ (ایام جاہلیت میں) مَیں حج کو گیا تھا عرفات کے میدان میں دیکھا کہ ایک جوان سُرخ عبا پہنے ہوئے یہ کہتا جارہا ہے "یٰاَیُّهَا النَّاسُ وَحِّدُوا اللّٰهَ تُفْلِحُوا۔ یٰاَیُّهَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا۔ اے لوگو! ایک اللہ کو مانو فلاح پاجاؤ گے ــــ اے لوگو! لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ لو کامیاب ہوجاؤ گے"۔ ایک شخص اس کے پیچھے پتھر مارتا ہے اور کہتا جاتا ہے: یٰاَیُّهَا النَّاسُ لَا تَسْمَعُوْا اَنَّهٗ کَذَّابٌ۔ اے لوگو! اس کی بات نہ سنو یہ بڑا جھوٹا ہے۔ نعوذباللہ

مَیں نے پوچھا یہ کون ہے؟ کہا گیا وہ شخص قریش کا ایک نوجوان ہے جو پیغمبری کا دعویٰ کرتا ہے، پتھر مارنے والا اُس کا چچا ابولہب ہے۔

ایسے متعدد واقعات پیش آئے، ۲۳ برس تک آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم دین کی دعوت دیتے رہے اور طرح طرح کے مظالم سہتے رہے، بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے تاکید آتی رہی۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝[1] (النحل ۱۶)

دوسری جگہ ارشاد ہے: وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ[2] (حٰم السجدہ ۳۴)

صبر کرو اور تحمل کرو اور غمگین نہ ہو، تنگدل نہ ہو، بھلائی اور بُرائی دونوں برابر نہیں ہوتیں، پتھر کا جواب پتھر سے اور گالی کا جواب گالی سے مت دو بلکہ پتھر کا جواب پھولوں سے دو، گالی کا جواب تعریفوں سے دو، وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (الفرقان ۶۳) جب جاہلوں سے مقابلہ ہوجائے تو سلام کہہ کر چلے جاؤ ــــ مکّہ کی تیرہ سالہ زندگی ایسی ہی گذری، کفار ظلم کرتے رہے اور آپ صبر کرتے رہے، اس کے بعد مدینہ ہجرت فرمائی، ہر چیز قربان کی، اپنی راحت اور گھر بار چھوڑا، مدینہ پہنچکر بھی آپ کو کفار نے چین لینے نہ دیا اعلان کیا گیا کہ جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا سر لائے اس کو ہر ایک کیلئے سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے۔ دشمنوں نے ہر جگہ ڈھونڈنا شروع کیا مگر آپ کا محافظ خدا تھا اُس نے اپنے لطف و کرم سے آپ کو چھپا کر مدینہ پہنچا دیا۔ مدینہ والوں کو مکّہ سے زور دار خط بھیجا گیا کہ ان کو ہمارے حوالہ کردو ورنہ جنگ

---

[1] (ترجمہ) اور آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خدا ہی کی توفیق سے ہے اور ان پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ تدبیریں کیا کرتے ہیں ان سے تنگدل نہ ہوجئے، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو پرہیزگار ہوتے ہیں اور جو نیک کردار ہوتے ہیں۔ [2] (ترجمہ) نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی (بلکہ ہر ایک کا اثر جدا ہے) تو اب آپ (مع اتباع) نیک برتاؤ سے (بدی کو) ٹال دیا کیجئے۔

ہو گی، تمہارے مردوں کو قتل کر دیں گے، عورتوں کو باندی اور بیٹوں کو غلام بنا کر تمہارے باغوں کو اُجاڑ دینگے۔ یہ سنکر بڑے بڑے بوڑھوں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، مدینہ کے بُڈھے تجربہ کار کہتے تھے کہ ہم قریش سے لڑ نہیں سکتے، قریش سب سے زیادہ قوت والے پیرزادے اور سارے عرب اُن کے طرفدار ہیں۔ نوجوانوں نے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا اور ہر قبیلہ کے نوجوان حمایت کیلئے تیار تھے، بوڑھے مقابلہ سے ڈرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو (کفارِ مکہ کے) حوالے کرنے پر آمادہ تھے، قریب تھا کہ آپس میں تلوار چل جاتی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو سمجھایا یہانتک کہ سکون ہو گیا، قریش کو جواب دیا گیا کہ جو چاہو کر لو ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرینگے۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے قاتل تھے یا کسی کی جائداد چھین لی تھی؟ ابتدا سے وہ سب کے ساتھ احسان کرنیوالے، سچ بولنے والے، امانت رکھنے والے اور سب کی خدمت کرنے والے تھے، آپ صرف یہ فرماتے تھے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، پتھروں کو نہ پوجو، اِس کے سوا اور کوئی بات نہ تھی۔

اس جواب پر سب کے سب چراغ پا ہو گئے، کانفرنس کی گئی اور طے کیا گیا کہ مدینہ پر چڑھائی کریں گے، خوب چندہ کیا گیا، ایک ہزار اونٹ سامان خرید کر لانے کیلئے ملکِ شام بھیجے گئے۔ غرض آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم صرف توحید کی تبلیغ کرتے رہے، کسی کا مال نہیں چھینا، کسی کی عزت پر حملہ نہیں کیا، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کی دعوت دی، ۲۲ سال تک ہر طرح سمجھایا، اصلاح کی، آخر حجۃ الوداع میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریباً ایک لاکھ چھبیس ہزار صحابہ کرامؓ کے مجمع میں اونٹ پر بیٹھ کر ایک عظیم الشان خطبہ دیا جو بہت طویل تھا، گویا ۲۳ برس کی تعلیم کا نتیجہ پیش کر دیا، پھر تین مرتبہ فرمایا اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ کیا میں نے اللہ کے احکام پہنچا دیئے؟ سب نے ایک زبان ہو کر تین مرتبہ کہا قَدْ بَلَّغْتَنَا وَنَصَحْتَنَا، بے شک آپ نے اللہ کے احکام کی تبلیغ کی۔ اس پر تین مرتبہ آپ نے فرمایا اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ، اے اللہ! تو گواہ رہ کہ میں نے تبلیغ کر دی۔

بھائیو! آپ کی یہ مجلس تبلیغ کی ہے، یہ تبلیغ اصل میں وظیفہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، وہ کام جو تم کر رہے ہو معمولی نہیں ہیں، تم کو کیسی خدمت سپرد کی ہے، حقیقت میں کام لینے والا اللہ ہے، اگر وہ نہ چاہتے تو تم کیا کرتے؟ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ [1] (۲۹ التکویر) ارشاد ہے: یَمُنُّوْنَ عَلَیْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللہُ یَمُنُّ عَلَیْكُمْ اَنْ ھَدٰىكُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ [2] (الحجرات ۱۷)

خدا کا فضل ہے کہ اس نے تمہارے دلوں میں اس چیز کو ڈالا ہے، اسی ہندوستان میں ہمارے باپ دادا

---

[1] ترجمہ: اور تم بدون خدائے رب العالمین کے چاہنے کے کچھ نہیں چاہ سکتے [2] ترجمہ: یہ لوگ اپنے اسلام لانے کا آپ پر احسان رکھتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ رکھو بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی ہدایت دی بشرطیکہ تم سچے ہو۔

اور بہت سے لوگ گذر گئے جو آپس میں لڑتے رہے اور دُنیا کے پیچھے پڑے رہے لیکن اُن کو تبلیغ کا کبھی خیال نہیں آیا، خدا تعالیٰ نے ہمارے زمانے کے علماء اور اہلِ خیر کو اس کی توفیق دی، تم بہت سے بندگانِ خدا کو دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کر رہے ہو، جو کلمہ اور نماز نہیں جانتے تھے کیا وہ مستحقِ دوزخ نہ تھے؟ تم ان کو سمجھا کر اللہ کے راستے پر چلاتے ہو تو کیا دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل نہیں کر رہے ہو؟ اللہ جس کو چاہتا ہے بچاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گراتا ہے ؎

منت منہ کہ خدمتِ سُلطان ہمی کُنی　　　منت شناس ازو کہ بخدمت گذاشتت

خدا کا شکر کرو کہ اس نے تمہیں اس کی توفیق دی، یہ بات ضرور ہے کہ بہت سے لوگ تمہاری بات نہیں مانیں گے، تم کیا ہو؟ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہ مانی اور آپ کے ساتھ کیا کیا نہیں کیا؟ تم گھبراؤ نہیں! پریشان نہ ہو! اگر بیوقوف اور جاہل بُرا بھلا کہیں، طعنہ دیں تو سُن لو، یہ سُنّت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور سُنّت ہے انبیاء سابقین کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَقَدْ أُوذِيتُ فِي اللّٰهِ ... الخ "اگر تمہیں کامیابی نہ ہوئی اور کوئی بھی سیدھا نہ ہوا تو اس کے باوجود تمہارا بڑا درجہ ہے اور تمہیں پورا اجر ملے گا"، تم اطمینان رکھو تمہارا کام اللہ کے دربار میں مقبول ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خیبر فتح کرنے کیلئے بھیجتے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا جاتے ہی قتال شروع کر دوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہاں جا کر ٹھہرو اور لوگوں کو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی طرف بلاؤ اگر نہ مانیں تو دوسرا معاملہ کرنا، اسلئے کہ "لَأَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا[1]، ایک آدمی کو بھی تمہارے ذریعہ اللہ تعالیٰ ہدایت کر دے تو وہ تمہارے لیے دُنیا و مافیہا سے بہتر ہے"۔

دوسری روایت میں ہے کہ تم کو جوان اونٹوں کے ملنے سے بھی بہتر ہے۔

بھائیو! تم نے جو قدم اٹھایا ہے وہ مبارک ہے، اللہ پاک تمہاری جدوجہد سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے اور تم سے اسلام کی خدمت لے، تم ہرگز تنگدل مت ہو، تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی، جیسے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام کو اٹھانی پڑیں۔ کیا تم کو خبر ہے کہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عرب سے کیوں نکلے؟ وہ عراق میں پہنچے، شام، ایران، افغانستان، سندھ، یو۔پی، بہار اور جنوب میں دکن تک پہنچے، یہاں تک کیوں پہنچے؟ ان کا مقصد کیا تھا؟ کیا ملک فتح کرنا تھا؟ کیا دولت لُوٹنی تھی؟ ہرگز نہیں!

---

[1] (ترجمہ) اور البتہ اگر ہدایت دیدیں اللہ تعالیٰ تیری وجہ سے کسی آدمی کو بہتر ہے تیرے لیے دنیا اور اس کے اندر جو کچھ ہے اُس سب سے۔ ۱۲

اُن کا اصل مقصد صرف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی دعوت دینا تھا، دنیا کو سچے دین پر لانا تھا، اللہ کے بچھڑے ہوئے بندوں کو اللہ سے ملانا تھا اور دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کرنا تھا، بعد والوں نے بیوقوفی کی کہ دُنیا کے پیچھے پڑ گئے۔

تاریخ گواہ ہے کہ ہند میں باہر سے آنے والے مسلمانوں کی تعداد صرف چار پانچ لاکھ تھی مگر تقسیم ہند کے وقت دس کروڑ پچیس لاکھ مسلمان تھے۔

ہمارے اسلاف بزرگ نے اور اولیاء کرام نے تبلیغ دین کیلئے بہت ہی کوششیں کیں۔ ایک انگریز مصنف لکھتا ہے کہ "حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک پر نوے لاکھ ہندو مسلمان ہوئے" اُنکے پاس کیا تھا؟ کوئی فوج تھی؟ فقط اللہ کی معرفت کا خزانہ تھا۔ ہر جگہ اللہ کے سچے بندے گذرے ہیں جنہوں نے دین کی تبلیغ کی۔ میں نے تاریخ ترکی میں دیکھا کہ تُرک قوم کے تین لاکھ خاندان ایک دن میں مسلمان ہوئے، اللہ کا کرم کہ تبلیغ کی کوشش وہ پھل لائی کہ ایک زمانے میں بعض حکام کو یہ تدبیر کرنی پڑی کہ وہ اپنی رعایا کو مسلمان ہونے سے روکیں۔

ننانوے ہجری میں خلافت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں خراسان کے حاکم کو یہ خطرہ ہوا کہ جزیہ بند ہونے سے خزانہ خالی ہو جائے گا اسلیئے اعلان کرنا پڑا کہ کسی کا اسلام اُس وقت تک قبول نہ کیا جائے گا جب تک وہ بوڑھا نہ ہو، یہ تکلیف دہ بات تھی اِس حکم کے جاری ہونے سے اسلام کی ترقی رُک گئی، اب خلیفہ کو اطلاع ملی کہ والئ خراسان نے اسلام پر پابندی لگادی ہے تو آپ نے اس کو معزول کر کے دوسرے کو مقرر کردیا اور فرمایا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے آئے تھے کہ اس پر اسلام کو موقوف رکھا جائے؟

میرے بھائیو! ہمارے اسلاف کی کوششوں سے، اہل اللہ علماء کرام اور عام مسلمانوں کی کوششوں سے دس کروڑ پچیس لاکھ مسلمان ہوگئے، اگر غلط کاری نہ ہوتی تو یقیناً ہندوستان کا اکثر حصہ مسلمان ہو جاتا ـــــ میرے بزرگو! اللہ نے آپکے دلوں میں تبلیغ کی محبت ڈالی، یہ مبارک کام ہے اور آپ مبارکبادی کے مستحق ہیں، اللہ آپ کو اس سے زیادہ خدمت کی توفیق عطا فرمائے، اپنی بھی اصلاح کرو اور اپنے بھائیوں کی بھی، اللہ آپ کو مزید ہمت عطا فرمائے ـــــ بھائیو! تنگدل نہ ہوں، اللہ کی رحمت کے اُمیدوار رہو، سب کو اللہ کی رضا اور خوشنودی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف بلاؤ، خود بھی عمل کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت بناؤ، سیرت اختیار کرو ـــــ میں نے آپ بزرگوں کی بہت سی سمع خراشی کی اب میں آپ حضرات کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوا آپ سے جدا ہوتا ہوں اور امیدوار ہوں کہ میری معروضات پر غور و فکر فرمائیں گے اور عملی کاروائیوں میں پُر زور حصہ لیں گے، خدا آپ کی اور ہماری مدد فرمائے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

(بشکریہ ماهنامۂ "الارشاد" جولائی ۱۹۷۵ء)

مرضِ وفات

دم واپسیں برسرِ راہ ہے　　　عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اسفار کے پروگرام ہفتوں، مہینوں بلکہ سال سال بھر پہلے سے مرتب اور طے ہوتے تھے، ان ترتیبات میں کبھی کوئی خلاف اور خلل واقع نہیں ہوتا تھا۔ قیام کی مدتیں بھی ایک دن، دو چار دن، ہفتہ اور کبھی کبھی مہینہ مہینہ بھر کے لیے مقرر ہوتی تھیں۔ ان تمام پروگراموں کی حیرتناک طور پر پابندی ہوتی تھی۔ اسی معمول کے مطابق ۴ر جولائی ۱۹۵۷ء کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ مدراس کے سفر پر روانہ ہوئے، اس صوبے کے مختلف مقامات پر کم و بیش ڈیڑھ ماہ کے سفر کا پروگرام تھا مگر دس پندرہ روز بعد ہی اچانک واپس تشریف لے آئے، دیکھنے والوں کو نہایت حیرت اور صدمہ پہنچا کہ زندگی بھر میں پہلی بار بالکل خلافِ معمول درمیان سفر میں واپسی کی کوئی غیر معمولی ہی وجہ پیش آئی ہوگی۔ دریافت حال پر معلوم ہوا کہ سانس لینے میں تنگی محسوس ہوئی اور خطرہ ہوا کہ یہ بڑھ نہ جائے اس لیے واپسی مناسب معلوم ہوئی۔ ایسی ایسی تنگیاں، تکلیفیں اور معمولی عوارض زندگی میں ہزاروں ہی بار تو پیش آئے ہوں گے معمولات میں فرق تو کجا کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ سننے والوں نے سن تو لیا کہ سانس میں تنگی محسوس ہوئی مگر دلوں پر اس خبر سے قیامت گذر گئی۔ دو ہی چار دنوں کے بعد سینے میں حوالیٔ قلب میں درد محسوس ہوا اور یہ ضیقِ نفس عارضۂ قلب میں تبدیل ہوگیا، شروع شروع میں جب تک درد قابلِ برداشت رہا معمولات حسبِ دستور جاری رہے، حدیث شریف کے درس بھی ہوتے رہے، نمازیں مسجد میں باجماعت اور جمعہ کی نماز جامع مسجد میں، عام مجلس میں تشریف آوری برابر جاری رہی مگر مرض بھی آہستہ آہستہ زور پکڑتا رہا، تکلیف بڑھ گئی تو مقامی ڈاکٹروں کی طرف رجوع کرنا پڑا اور انہوں نے قلب کا پھیلاؤ یا قلب کا بڑھ جانا تجویز کیا۔ عین اسی دوران سہارنپور اور رائپور کا سفر درپیش آیا اور یہی اس دنیا کا آخری سفر ثابت ہوا۔ ۵ محرم کو سہارنپور گئے تھے، وہاں کے ایک قدیم اور مشہور ڈاکٹر برکت علی مرحوم نے ایکسرے، کارڈیوگرام، بلڈ ٹیسٹ وغیرہ کا معائنہ کیا اور نہایت احتیاط، مکمل آرام اور حتی الامکان سکوت و سکون کی تاکید کی، مگر واپسی کے بعد بھی ہمت، توکل علی اللہ اور عزم و ارادہ کے بل پر معمولات

ملاقاتیں عبادتیں اور سبق وغیرہ جاری رہے۔ یہ چاہتے تھے کہ چاہیے اسٹریچر پر سوار ہو کر جائیں مگر بخاری شریف کے درس کا ناغہ نہ ہو۔ دیوبند کے ایک قدیم اُستاذ اور استاذ الکل حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مشکوٰۃ شریف پڑھایا کرتے تھے، حضرتؒ ان کا بہت احترام اور خیال فرمایا کرتے تھے، وہ بیمار ہوئے اور مرض نے طول پکڑا تو حضرتؒ سے درخواست کی کہ اب مشکوٰۃ شریف کا سبق میرے بس کا نہیں رہ گیا ہے مجھے اس سے معذور رکھا جائے مگر حضرتؒ نے یہ درخواست منظور نہ کی، مولانا عبدالسمیع صاحبؒ نے بہت خوشامد کی تو اتنی بات منظور فرمالی کہ دفتر تعلیمات کے انتظام میں مشکوٰۃ شریف کا درس تو آپ ہی کے ذمہ رہے گا مگر کوئی عارضی انتظام ہو جائے گا جب شفاء ہو جائے گی تو انشاء اللہ آپ ہی کو پڑھانا پڑے گا۔ مولانا عبدالسمیع صاحبؒ نے بادلِ نخواستہ اسے منظور کیا مگر اسی بیماری میں اُن کا وصال ہو گیا، ان کی تعزیت کے جلسہ میں مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے استاذ (مولانا عبدالسمیع صاحبؒ کو دیوبند کے اکابر اسی لقب سے مخاطب کرتے تھے) کی درخواست ایسی سختی سے رَدّ کی کہ ہمیں حیرت ہوئی، حضرتؒ کی یہ عادت نہ تھی اور استاذ کا تو وہ بہت خیال فرماتے تھے، مگر آج یہ محسوس ہوا کہ حضرتؒ کی خواہش یہ تھی کہ مولانا عبدالسمیع صاحبؒ حدیث شریف کے اشتغال اور تدریس ہی کی حالت میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دیں اور قیامت میں جب ائمہ اُمّت اور خدامِ حدیث کی صف آراستہ ہو تو اُسی قطار میں اُستاذ بھی رونق افروز ہوں۔ آج حضرتؒ کو بھی وہی وقت اور وہی حالت درپیش تھی۔ اطبّاء نے، خدّام نے، حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے اور علماء دیوبند نے ہر طرح سبق ملتوی کرنے پر اصرار فرمایا مگر اشتغالِ حدیث کے ترک پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے۔ پکڑ کر، اٹھا کر اور سہارا دے کر کسی نہ کسی طرح دارالحدیث میں تشریف فرما ہوتے رہے اور دو دو تین تین گھنٹے کے درس میں حق تعالیٰ کی جانب سے اتنی دیر کے لیے ایسی طاقت عود کر آتی رہی کہ سُننے والے اور دیکھنے والے اندازہ بھی نہ کر پاتے تھے کہ یہ محدّثِ عصر قلب کے امراض اور بیماریوں کے اعراض میں چُور ہو چکا ہے لیکن محض عزم و ہمت ہی کے سہارے یہ معمول کب تک نبھ سکتا تھا، آخر کار یہ سلسلہ باچشمِ گریاں اور بادلِ نخواستہ منقطع کرنا پڑا اور حضرتؒ نے ۲۸ محرم ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۵ اگست ۱۹۵۷ء کو بخاری شریف کا سبق پڑھا کر دارالحدیث کو، دارالعلوم کو، طلبائے حدیث کو اور مسندِ محدّثین کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہا ۔

جان کر منجملۂ خاصانِ مے خانہ مجھے
مُدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

حضرت مدنیؒ کا آخری درس بخاری شریف اور احقر کی اس میں منامی شرکت

حضرت مدنی قدس سرہ العزیز نے آخری سال ۶/ ذیقعدہ ۱۳۷۶ھ بروز بدھ درس بخاری شریف کا آغاز فرمایا، طلباء دورۂ حدیث کی تعداد ۱۸۴ تھی اور حسب معمول درس سننے کے لیے عام آدمیوں کا ایک انبوہ کثیر درس گاہ میں موجود تھا[1] ٹھیک دس بج کر چار منٹ پر آپ نے خطبۂ مسنونہ اور حدیث پڑھنے کے بعد تقریر کا آغاز کیا اور فرمایا ہم اس وقت فن حدیث میں داخل ہوتے ہیں، علماء کرام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ہر فن میں تین اصولی چیزیں ہوتی ہیں ۱۔ غایۃ ۲۔ موضوع اور ۳۔ غرض، یہ مبادی ثلاثہ کہلاتی ہیں۔ بخاری شریف کی جلد اوّل چالیس دن میں پڑھائی باب الفھم فی العلم کا سبق آپ کا آخری درس تھا، درس گاہ میں آپ اس دن ایک گھنٹہ تین منٹ تشریف فرما رہے، جس میں سے تیرہ ۱۳ منٹ حاضری لینے میں صرف کیے، تین ۳ منٹ خطبۂ مسنونہ اور عبارت پڑھنے میں لگے اور چھبیس ۲۶ منٹ درس دیا، طلباء سے آپ کے آخری خطاب کے کلمات یہ تھے:۔

"غبطہ کا معنیٰ یہ ہے کہ دوسرے کے پاس نعمت دیکھ کر اس چیز کی تمنا کرنا اور اس تمنا کا مقصد اس چیز کا ازالہ نہ ہو"۔

بخاری شریف کی دوسری جلد پر آپ نے کل ۲۳ روز درس دیا۔ بخاری مطبوعہ نور محمد میں صفحہ ۱۰۷ پر باب قتل ابی رافع آخری عبارت تھی جو آپ نے خود پڑھی تھی، آپ کی درس گاہ میں ۶ بجکر ۲۳ منٹ پر تشریف آوری ہوئی اور سات بجکر ۵۵ منٹ پر آپ نے سبق پڑھایا، اس طرح تین ماہ پندرہ دن بعد آپ نے آخری درس ختم کیا تھا[2]۔

یہ آپ کا آخری درس تھا اس کے بعد دارالحدیث دارالعلوم دیوبند ہمیشہ کے لیے آپ کے فراق میں روتا رہے گا۔

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد جب احقر آستانۂ مدنی پر حاضر ہوا تو صاحبزادۂ محترم

---

[1] دارالعلوم دیوبند میں کئی بیرونی حضرات صرف حضرت مدنیؒ کی زیارت اور درس سننے کے لیے آجایا کرتے تھے اور کئی کئی ماہ قیام کرتے تھے [2] نئی دنیا شیخ الاسلام نمبر ص ۱۸

مولانا محمد اسعد مدنی دامت برکاتہم نے اپنی شفقت سے اس خاکروب کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وہ آخری درسِ بخاری سنایا، یہ درس باب قتل ابی رافع پر مشتمل ہے۔ وہ لہجہ مبارک، وہی ذکرِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت انوار کی روشنی، وہی صحابۂ کرام کے ذکر کے وقت رضی اللہ عنہ وعنہم کی ایمان افروز ترضی، یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ خادم خود دارالحدیث کے درس میں حاضر ہے، اس درس کا عجیب پہلو یہ بھی ہے کہ:۔

"حضرتؒ کے وصال سے کچھ عرصہ پہلے احقر کے سکونتی مکان سے اُس وقت چوری ہوگئی جب اہلِ خانہ موجود نہ تھے اور میں بھی باہر تھا گھر آنے پر علم ہوا اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ چور چور نہ تھا بلکہ مجھے ذہنی طور پر تکلیف دینے کے ارادہ سے آیا تھا، کیونکہ گھر کی تمام اشیاء حتیٰ کہ مستعمل کپڑے بھی لے گیا۔ چونکہ احقر کا احترام سب لوگوں کے دلوں میں تھا اس لیے کسی پر شک وشبہ میں نہ کرسکا البتہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا رہا کہ وہ اصلی مجرم کو بے نقاب کردے تاکہ وساوس سے نجات ملے، قدرتِ خداوندی سے اصلی مجرم اس طرح ظاہر ہوگیا کہ انکار کی گنجائش نہ تھی، میں نے کئی وجوہ سے قانونی چارہ جوئی نہ کی مگر دل پر اثر اس لیے رہا کہ اس آدمی کے بارہ میں اس قدر ظلم کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ اسی اثنا میں خواب میں دیکھا کہ حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ اُس آدمی کے مکان کے ایک حصّہ کے چھت پر تشریف فرما ہیں اور دو تین آدمیوں (جن کو احقر پہچان نہ سکا) کے علاوہ احقر بھی موجود ہے۔ حضرت مدنیؒ نے بخاری شریف کھول کر باب قتل ابی رافع پڑھ کر اس حدیث کی تشریح فرمائی، آنکھ کھل گئی۔ دیوبند کی بجائے حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہ العزیز کی خدمت میں سارا خواب لکھ بھیجا، آپ نے فرمایا کہ یہ آدمی توبہ کرے ورنہ اس کا یہ مکان بالکل نیست ونابود ہوجائے گا اور باقی کا بھی خطرہ ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ کچھ عرصہ بعد اس ظالم کا وہ سارا مکان اس طرح توڑ پھوڑ کر اس کا سارا ملبہ حتیٰ کہ بنیادوں میں لگے ہوئے پتھر بھی فروخت کردیئے گئے اور وہ خانہ برباد ہوگیا۔ بیشک اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ"۔

اس طرح احقر حضرتؒ کے درس مسطورہ بالا میں شرکت سے مشرف ہوگیا۔ فللّٰہ الحمد علیٰ ذٰلک

اس اُمید میں کہ اللہ کرے گا حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس عارضی علالت سے پھر اُٹھ کر کھڑے ہوں گے ، حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب شیخ الحدیث مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد سے درخواست کی گئی اور انہوں نے عارضی طور پر بخاری شریف اور ترمذی شریف کے اسباق شروع کر دیئے اور بالکل مجبور ہو کر حضرتؒ سارے معمولات سے دستکش ہو گئے۔ اب تک توانائی سکت تھی کہ کسی نہ کسی طرح نمازیں گھر سے متصل مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا فرماتے رہے مگر اب یہ آخری قوت بھی آہستہ آہستہ رخصت ہو رہی تھی، ناچار بڑی مشکل سے حجرۂ استراحت سے اُٹھ کر مہمان خانے تک تشریف لاتے اور نمازیں وہیں جماعت سے ادا فرماتے، مگر ابھی تک اُٹھنے اور چلنے میں کسی کا سہارا لینے سے انکار فرماتے رہے اور ساری نمازیں کھڑے ہی ہو کر پڑھتے رہے۔

اِس درمیان میں دوسرے معالجین کے ساتھ لکھنؤ سے ڈاکٹر حکیم مولانا سید عبد العلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے چھوٹے بھائی مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے ہمراہ معائنے کے لیے تشریف لائے، ڈاکٹر صاحب موصوف حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔ مولانا علی میاں مدظلہم فرماتے ہیں کہ بھائی صاحب سفر نہیں کیا کرتے تھے مگر ایک بار حضرتؒ کے بھتیجے مولانا وحید احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے معائنے اور علاج کیلئے ٹانڈہ ضلع فیض آباد تشریف لے گئے تھے اور دوسری بار حضرت رحمۃ اللہ علیہ کیلئے دیوبند تشریف لائے۔ نہایت توجہ کے ساتھ معائنہ تشخیص و تجویز فرمائی، ان کے بعد اپنے وقت کے مشہور ماہر قلب معالج لکھنؤ ہی کے ڈاکٹر عبد الحمید بھی آئے یہ بھی اپنی بے پناہ مشغولیت اور رجوع خلق کے باعث کسی حالت میں اپنا مطب نہیں چھوڑتے تھے، ان ڈاکٹر حضرات کی تشخیص بھی قلب کا پھیلاؤ رہی اور سخت تاکید رہی کہ باہر نکلنا، زیادہ ملاقاتیں کرنا اور کسی قسم کی مشغولیت میں مصروف ہونا بالکل ترک کر دیا جائے۔ آخر کار وہ وقت بھی آ ہی پہنچا کہ حضرتؒ اپنے کمرے ہی میں محدود ہو گئے۔ خدام، مریدین، منتسبین اور تلامذہ جوق در جوق آتے اور گھنٹوں گھنٹوں مہمان خانہ میں سراپا انتظار بیٹھ کر محروم واپس چلے جاتے۔ تکلیف برابر بڑھتی ہی رہی اور اسی کے ساتھ کمزوری میں بھی اضافہ ہوتا رہا، اوّل تو خوراک ہوتی ہی کیا تھی اور جو تھی بھی اس میں ڈاکٹروں نے نمک کی ممانعت کر دی تھی اسلئے اب صرف برائے نام ہی رہ گئی تھی، معالجین اس پر اصرار کر رہے تھے کہ نمازیں کھڑے ہو کر نہ پڑھی جائیں مگر حضرتؒ اس پر آمادہ نہ ہوئے، ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ جیتے جی بیٹھ کر نماز پڑھنے پر تیار نہ ہوں گے، مگر ایک ایسا حملہ ہوا کہ لیٹنا متعذر ہو گیا، جیسے ہی لیٹتے تھے دل میں درد شروع ہو جاتا تھا اسلئے دن رات سارا وقت بیٹھے ہی بیٹھے گذرنے لگا

اور اس حالت میں جسم وجان کی رہی سہی قوت بھی تحلیل ہو کر رہ گئی، نماز کے لیے اُٹھنا، کھڑے ہونا مشکل ہوا تو چوکی پر بیٹھ کر نماز ادا فرماتے، ایک دن نمازِ فجر کے لیے چوکی پر سر چکرا گیا اور چوکی سے نیچے آرہے۔ آخر بالکل ہی پا افتادہ اور دل شکستہ ہو کر بیٹھ کر نمازیں شروع کیں مگر مسجد نہ جاسکنے مہمان خانے میں جماعت نہ کرسکنے، کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکنے کا دل پر بہت گہرا صدمہ گذرا اور اسی دکھ سے زندگی میں پہلی بار اب کراہنے لگے۔ ایک خادم نے عرض کی کہ جو بھی جس وقت بھی آپ سے پوچھتا ہے کہ اب طبیعت کیسی ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ الحمد للہ بالکل اچھا ہوں مگر کراہتے ایسا ہیں کہ سُننے والوں کا کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔ فرمایا کہ میں اس لیے کراہتا ہوں کہ ساری عمر بے مصرف اور بیکار گذر گئی اور کچھ نہ کرسکا اور اب بالکل ہی معذور ہو کر پڑ گیا ہوں' دروازے ہی پر مسجد ہے' مہمان خانے میں لوگ نمازیں پڑھتے ہیں اور میں سب سے محروم ہو کر کمرے میں اور بیٹھ کر نماز پڑھتا ہوں۔

اسی عالم میں ایک روز مولانا فخر الدین صاحبؒ (جو حضرتؒ کی جگہ حدیث پڑھا رہے تھے) مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوئے، حضرت نے اُن سے اپنے قلبی احساسات بیان فرمائے کہ اب اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کا وقت آگیا ہے کوئی عمل اپنے پاس نہیں ہے، نمازیں بھی تیمم کرکے اور بیٹھ کر پڑھ رہا ہوں، توشۂ آخرت بالکل خالی ہے، مغفرت کا کوئی سامان نہیں ہے، دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ جوش میں آجائے اور میرا بیڑا پار ہو جائے۔ اس بیان کے درمیان حضرتؒ کا دل بھر آیا، آنکھوں سے زار وقطار آنسو رواں ہو گئے اور آہستہ آہستہ آنسو ہچکیوں میں تبدیل ہو گئے، بیاسی برس کی زندگی میں یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ کسی نے حضرتؒ کی آنکھوں میں آنسو اور مزاج پر گریہ کا اثر دیکھا تھا۔

غذا وغیرہ تو قریب قریب چھوٹ ہی گئی تھی، کوشش کی جاتی تھی کہ کسی نہ کسی بہانے کوئی پھل وغیرہ ہی استعمال میں آجائے۔ ایک دن فرمایا کہ کیا بازار میں سردہؔ نہیں ملتا؟ واقعی اس وقت سردہ بازار میں موجود نہیں تھا، ایک خادم اس کی تلاش میں سہارنپور، میرٹھ، مظفر نگر اور دہلی تک پہنچا مگر کہیں نہ ملا، واپس آیا تو حضرتؒ نے دریافت فرمایا کہ دو روز سے کہاں تھا؟ عرض کیا کہ سردے کی تلاش میں گیا تھا۔ فرمایا کہ نفس کی ایک خواہش کے نتیجے میں اتنی تکلیف اور اخراجات برداشت کرنے کی کیا ضرورت تھی!

ؔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی وفات سے کچھ پہلے سردہ طلب فرمایا تھا۔ (مؤلف)

اس قسم کی خواہشات نفس اور شیطان کے غلبہ سے پیدا ہوتی ہیں، میں نے تمام عمر کبھی کسی چیز کی خواہش نہیں کی مگر آخری وقت میں یہ کمزوری بھی صادر ہو ہی گئی''، حالانکہ واقعہ کے اعتبار سے حضرتؒ نے کوئی خواہش یا فرمائش نہیں کی تھی بلکہ صرف دریافت فرمایا تھا۔ خادم بیان کرتا ہے کہ یہ کلمات اور خصوصاً خواہشات سے اس درجہ احتراز سُنکر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بعد میں سردہ پاکستان سے بذریعہ ہوائی جہاز آیا بھی مگر اس کا استعمال برائے نام حد تک ہی رہا، کوئی افاقہ نہیں ہوا تو یونانی علاج کا مشورہ ہوا۔ چنانچہ اس وقت کے سارے ہی ہندوستان گیر شہرت کے مالک معالجین حکیم عبدالجلیل صاحب، حکیم محمد اسمٰعیل صاحب صدیقی دواخانہ دہلی، حکیم محمد عمر صاحب دارالعلوم دیوبند، حکیم شفیق احمد صاحب دیوبند، حکیم محمد یٰسین صاحب نگینہ، حکیم محمد صدیق صاحب بریلی، حکیم ذکی احمد صاحب جانشین مسیح الملک حکیم اجمل خان، حکیم عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ دہلی وغیرہ سارے ہی یونانی اطباء جمع ہوئے اور نہایت غور وفکر کے ساتھ دوائیں، علاج اور غذائیں تجویز کی گئیں۔ اس علاج سے حیرتناک طور پر افاقہ ہوا اور حضرت ایک طویل مدت کے بعد حضرت باہر تشریف لائے، اس واقعہ سے اور تشریف آوری کی خبر سے چاروں طرف مسرت وشادمانی کی لہر دوڑ گئی۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝

مگر پھر اچانک حالت دن بدن کمزور ہوتی چلی گئی، اب تک دن رات کے بیچ میں ایک آدھ گھنٹہ نیند آجاتی تھی اب اس سے بھی معذوری ہو گئی، ایک منٹ کے لیے بھی لیٹ نہیں سکتے تھے، جیسے ہی تکیے پر سر رکھتے تھے سانس پھولنے لگتا تھا اور مجبور ہو کر بیٹھ جاتے تھے، سارا دن ساری رات بیٹھے ہی بیٹھے گذرتا تھا، ٹیک لگانے سے اور آگے پیچھے دائیں بائیں کسی قسم کا سہارا لینے سے بھی معذوری ہو گئی تھی اور سانس پھولنے لگتا تھا، جب تک جسم میں ذرا بھی طاقت رہی اُٹھنے بیٹھنے یا کھڑے ہونے میں کسی قسم کا سہارا نہیں لیا تھا، نماز بھی کھڑے ہو کر پڑھتے تھے مگر اب لیٹنے اور بیٹھنے میں دوسروں کی مدد لازمی ہو گئی تھی، غذا کا اوّل تو نام ہی نام رہ گیا تھا مگر جو کچھ بھی رقیق سیال ایک آدھ چمچہ پیٹ میں چلا جاتا تھا فوراً قے ہو جاتی تھی، کوئی چیز ایک منٹ بھی نہیں رُکتی تھی۔ کمزوری، مرض کی شدت، بے خوابی، عدم راحت اور بے چینی اپنی جگہ پر تھی اس پر ہر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد قے کی تکلیف نے بالکل ہی نڈھال کر دیا، اس حالت میں بھی ضروری کا غذات

دیکھتے، ہدایات دیتے اور دستخط کرتے رہے، عیادت کرنے والوں سے باتیں بھی کرتے رہے، ان کے احوال اس طرح پوچھتے رہے کہ گویا عام حالات کی معمول کے مطابق ملاقاتیں ہیں، امیر جماعتِ تبلیغ مولانا محمد یوسف صاحب، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ وغیرہ تشریف لائے تو نہایت بشاشت سے ان کے ساتھ باتیں کیں، اپنی بیماری، کمزوری اور تکلیفوں کا کوئی شکوہ و تذکرہ نہیں فرماتے تھے، مزاج پرسی پر بھی یہی فرماتے رہے کہ الحمد للہ اچھا ہوں۔ ہاں بزرگانِ دین و علمائے کرام کے سامنے مسجد کی عدم حاضری، جماعت سے محرومی اور بیٹھ کر نمازوں کی ادائیگی پر صدمہ اور دکھ کا اظہار فرماتے تھے۔

پہلی یا دوسری دسمبر کو تنفس کی شکایت میں بہت افاقہ ہوگیا، بڑی راحت محسوس فرمائی، کچھ آرام بھی فرمایا۔ اہلِ خانہ میں، خدام میں اور مریدین و معتقدین میں یہ مسرت افزا خبر پھیل گئی کہ اب مرض کا ازالہ ہو رہا ہے صرف کمزوری باقی ہے۔

۱۳ جمادی الاول[1] ۱۳۷۷ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء بروز جمعرات) کی ایک ابر آلود صبح کو نو یا دس بجے کے قریب کمرے سے نکل کر بغیر کسی مدد کے چھڑی کے سہارے صحن میں تشریف لائے اور آرام فرمایا۔ بہت دنوں کے بعد صحت اور طاقت کی یہ معمولی سی نشانی نظر آئی تھی، امید اور اطمینان کے لیے یہ تھوڑا سہارا بھی بہت کافی تھا، منٹ منٹ پر افاقہ اور اطمینان کی خبریں مدرسے میں، شہر میں اور شہر سے باہر علاقوں میں پھیل رہی تھیں، لوگوں کی خوشی و مسرت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ درمیان میں باتیں بھی کرتے رہے، مسکراتے اور ہنستے بھی رہے اور ہشاش و بشاش رہے، بارہ بجے کے قریب کمرے میں واپس آئے، کسی طرح غذا تناول فرمائی، بچوں اور اہلیہ محترمہ سے باتیں کیں، پان کھایا، اہلیہ محترمہ اور سب بچوں کو حسنِ خلق، حسنِ معاملہ اور پابندیٔ شریعت کے بارے میں نصیحتیں فرماتے رہے، اس کے بعد کمرہ خالی کر دیا گیا، دروازہ بند کر دیا گیا اور سب ہی لوگ اس خیال سے باہر آگئے کہ کچھ دیر نیند آجائے۔ اس کے آدھ پون گھنٹے یا شاید ایک گھنٹے کے بعد کوئی لڑکا کمرے میں داخل ہوا، حضرتؒ آرام کے ساتھ محوِ خواب تھے، اس نے خوشی میں غور سے دیکھا تو پیشانی اس طرح پھڑک رہی تھی جیسے آنکھیں پھڑکتی ہیں یا گوشت کا کوئی ٹکڑا خود بخود مرتعش ہو جاتا ہے، خیال بھی نہ گذرا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات ہو سکتی ہے اور باہر آگیا، اس کے ایک یا ڈیڑھ گھنٹے کے بعد گھر کے

---

[1] ۱۳ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) بروز جمعرات بعد از ظہر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ وفات تھی۔

لوگ نماز کے لیے بیدار کرنے کی غرض سے اندر گئے، پکارا، جگایا اور آخر میں ہلایا مگر کوئی جواب کوئی حرکت نہ دیکھی تو لوگ سراسیمہ اور بدحواس ہو کر دوڑے بھاگے، ڈاکٹروں حکیموں کو بلایا، انہوں نے معائنہ فرمایا اور تھوڑی ہی دیر میں اعلان کر دیا کہ حضرت شیخ العرب والعجم، امام العصر، محدثِ دوراں، قطبِ وقت، مجددِ اُمت، جانشین شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، سجادہ نشین قطبِ عالم مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، یادگار حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، نقیبِ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، نائبِ رسول اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مولانا مرشدنا وشیخنا سید حسین احمد صاحب مہاجر مدنی کا وصال ہو چکا ہے، سدا رہے نام اللہ کا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

ع آسمان راحق بود گر خون ببارد بر زمیں

جسم پر وفات اور موت کا ذرہ برابر اثر نہ تھا بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سکون کی نیند سو رہے ہیں ذرا آواز ہوئی تو ابھی آنکھیں کھول دیں گے، چہرے پر فرشتوں جیسی معصومیت طاری تھی اور وہ دائمی مسکراہٹ بھی جو زندگی بھر ہونٹوں کا طرۂ امتیاز رہی تھی[1]۔ ابھی دو دن پہلے حسبِ معمول نہایت اطمینان سے حجامت بنوائی تھی جس کی وجہ سے بالوں، داڑھی، مونچھ اور چہرے کی صفائی و ترتیب میں کوئی فرق نظر نہیں آرہا تھا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کشش اور جمال میں اور اضافہ ہو گیا۔ وصال کے وقت آس پاس کے اور دور دراز کے اضلاع میرٹھ، مظفر نگر، بجنور، مراد آباد، دہلی، علی گڑھ وغیرہ وغیرہ کے مخلصین و مریدین دردولت پر حاضر تھے۔ فوراً ہر جگہ تار، ٹیلیفون اور فرستادہ دوڑ گئے، تھوڑی ہی دیر بعد آل انڈیا ریڈیو نے وصال کی اطلاع نشر کی، بہت سے شہروں کے بازار بند ہو گئے، ختمِ قرآن کا اہتمام ہونے لگا اور لوگ دیوانہ وار دیوبند کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسپیشل ٹرینیں اور بسیں، لاریاں، ٹرک، موٹریں، تانگے، ٹریکٹر، سائیکلیں، پیدل، موٹر سائیکلیں، غرض جس کو جو سواری میسر آئی اُس کے ذریعے دیکھتے ہی دیکھتے تھوڑی دیر میں انسانوں کا

---

[1] حاجی محمد صالح صاحب دہلویؒ کوٹھی علی جان والے نے حضرتؒ کے چہرہ کی زیارت کے بعد جناب مہتمم صاحب اور دوسرے بزرگوں سے فرمایا کہ اگر میں حضرتؒ کی زیارت خود اپنی آنکھوں سے نہ کر لیتا اور کوئی مجھ سے کہتا کہ مولانا حسین احمد موت کے بعد مسکرا رہے تھے تو میں اس بات کا یقین نہ کرتا مگر کیا کروں اپنی آنکھوں کو نہیں جھٹلا سکتا لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ (سورۃ یونس، آیت ۶۴) کی کیسی صحیح تفسیر اور کیسی حسین تفسیر تھی حضرت مدنیؒ کی زندگی بھی اور موت بھی۔ (الحرم میرٹھ مدنی نمبر ص۶)

ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر مدرسہ دیوبند اور حضرت قدس اللہ سرہ کے دولت کدہ پر جمع ہو گیا، لاکھوں انسانوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، لوگ ہچکیاں اور سسکیاں لے کر رو رہے تھے، ہزاروں آدمی دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، بعض لوگ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں، کہیں کہیں یہ خبر صاعقہ اثر سنکر کئی لوگوں کے ہارٹ فیل ہو گئے، غم نصیبوں اور حسرت زدوں میں مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی برابر کے شریک تھے بہت سے حضرات کو اس جگہ تک پہنچا یا گیا جہاں جسدِ مبارک رکھا ہوا تھا۔ ان محبین و عاشقین کی حالت بہت قابلِ رحم تھی، قابو سے باہر ہو رہے تھے مگر پاس ادب سے آواز نہیں نکلنے دیتے تھے، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی قدس اللہ سرہٗ تشریف لائے، حضرتؒ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور ایسا پھوٹ پھوٹ کر روئے کہ دیکھنے والوں کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ ڈھائی تین بجے وصال ہوا تھا، مغرب یا عشاء کے بعد اُسی جگہ پر جہاں وفات ہوئی تھی مولانا عبدالاحد صاحب صدر مدرس دارالعلوم دیوبند اور مولانا ارشد حسن صاحب نبیرہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمہم اللہ نے غسل دیا، ان کے ساتھ مولانا محمد حسین صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند، مولانا سید عزیز احمد صاحب فیض آبادی، مولانا مولوی شوکت خان صاحب رحمہم اللہ اور حضرتؒ کے دو مخصوص تلامذہ مولوی محمد عثمان ہزاروی اور مولوی محمد زکریا کراچوی شریک رہے۔ اس کے بعد آخری حج کے احرام کی چادر کا کفن تیار کیا گیا اور اس میں حضرتؒ کے مشائخ اور اساتذہ حدیث کے تبرکات حضرتؒ کی خواہش کے مطابق منسلک کر کے کفن پہنا دیا گیا، نو بجے تک جنازہ تیار کر کے تھوڑی دیر کے لیے اہلیہ محترمہ، صاحبزادیوں اور اعزہ خواتین کی زیارت کے لیے وہیں رکھا رہا اور پھر تقریباً ساڑھے نو بجے جنازہ اٹھایا گیا۔ مجمع کا، بے تابیوں کا، آہ و بکا کا اور رنج و صدمہ کا حال بیان کے بس کی بات نہیں ہے، کئی سال گذر جائیں گے اور یہ دلخراش و جگر سوز داستان ختم نہ ہوگی، گھر سے مدرسہ تک پانچ منٹ کا یہ راستہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا، جنازہ کی نماز حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے پڑھائی، اس کے بعد جنازہ زیریں دارالحدیث میں عام زیارت کے لیے رکھ دیا گیا، تین ساڑھے تین گھنٹے تک لائن بنا کر نظم و ضبط کے ساتھ زیارت ہوتی رہی۔ آخر رات کو دو بجے کے بعد جنازہ اپنے سفر پر قبرستان کے لیے روانہ ہوا، اِس پانچ چھ منٹ کے راستے میں ڈیڑھ پونے دو گھنٹے لگ گئے۔ قبرستان میں ہزاروں علماء، صلحاء اور اکابرینِ اُمت کے ساتھ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب، شیخ الحدیث مولانا فخرالدین صاحب، امیر جماعتِ تبلیغ مولانا محمد یوسف صاحب، مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب،

مولانا سید محمد میاں صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب قدس اللہ اسرارہم وغیرہ موجود تھے، قبر میں مولانا عبدالاحد صاحب، مولانا راشد حسن صاحب عثمانی، مولانا شوکت علی خاں صاحب اور حضرتؒ کے بڑے صاحبزادہ مولانا مولوی محمد اسعد مدنی صاحب نے اتارا۔ ایسے خوش قسمت صاحبزادگان بھی دنیا میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ زندگی میں، کمزوری میں، علالت میں، مرض الوفات میں تو راحت رسانی اور خدمت کا حق ادا ہی کیا۔ جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ انسانوں سے آخری بار رخصت ہو کر اپنے مولیٰ کے ساتھ خلوت اور مراقبہ میں چلے گئے تو آخری انسان یہ بیٹا ہی تھا جو آخر تک باپ کا بدن دباتا رہا اور وصال سے چند ہی منٹ پہلے جدا ہوا اور آخر کار اپنے ہاتھوں سے پیوندِ زمین کیا۔ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ ۙ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۔

آپ کا مزار حضرت شیخ الہندؒ کے قدموں میں ہے، اس طرح آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے جناب میاں اصغر حسین رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت شیخ الہندؒ کا یہ فرمانا "بھائی تم کہاں کہاں انکی برابری کروگے"! حرف بحرف صادق آگیا، آپؒ کے جلیل القدر تلامذہ میں سے آپ کے قدموں میں ابدی آرام کرنے کی سعادت صرف حضرت مدنیؒ کو ملی اور قرآنی ارشاد کے مطابق قیامت کے دن بھی اسی طرح باہر تشریف لائیں گے۔ ذٰلک الفوز العظیم۔

حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اُمت کی خدمت میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی۔ جوانی، بڑھاپا، گھر بار، دنیا کی تمام انسانی مسرّتوں کو اُمّت کی خدمت پر قربان کر دیا، نہ کسی سے احسان کے بدلہ کی تمنا کی نہ کسی دشمن کی ایذا رسانی پر شکوہ! اکیاسی سال اس عالمِ رنگ و بُو میں گذار کر مسلمانوں کو یہ پیغام دے کر راہیٔ خُلدِ بریں ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

(ف) اس رُباعی میں فقیرانہ (کا) کلمہ صرف شاعرانہ تخیّل نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے، حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ ہمارا خاندان فقیروں کا خاندان ہے اس لیے نوزائیدہ بچے کو تین دن مادر زاد ننگا رکھا جاتا تھا۔
(مکتوب حضرت مولانا سید محمد اسعد مدنی زید مجدہم بنام حضرت مؤلف رحمۃ اللہ علیہ)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد عرفاء علماء کو جو بشارات دی گئیں، خواب میں جو ارشادات

فرمائے گئے اُن کی تفصیل بہت زیادہ ہے، اس گنہگار (مرتب) نے ان ہی ایام میں مندرجہ ذیل نقشہ خواب میں دیکھا :-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالَّذِىْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ٥ (الزمر ۳۳)

سرتاج اولیا حسین احمد مدنی

تاریخ رحلت

قُلْ اِنَّ صَلَاتِىْ وَنُسُكِىْ وَمَحْيَاىَ وَمَمَاتِىْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الانعام ۱۶۲)

۱۳۷۷ھ

(ف) حضرت مدنیؒ کی تاریخ وفات کئی علماء کرام نے آیاتِ قرآنِ عزیز اور احادیث مبارکہ سے اقتباس کی ہے۔ شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمہ اللہ کا استخراج سب سے زیادہ عظمت اور برکت کا حامل ہے، آپ نے فرمایا:-

"حضرتِ مدنیؒ کی رحلت کے بعد ایک دن فجر کی نماز کے بعد تلاوتِ قرآنِ کریم کر رہا تھا، تو جب سورۃ الروم کی آیت ۱۵ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِىْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ٥ (ترجمہ: "پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اُن کے لیے جنّت کے باغوں میں آؤ بھگت") پر پہنچا تو یک بیک دل میں خیال آیا کہ شاید فِىْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ٥ سے سالِ وفات کے اعداد برآمد ہوں، تو جب معلوم کیا تو ٹھیک ۱۳۷۷ھ برآمد ہوا"۔

(روزنامہ الجمعیۃ دہلی شیخ الاسلام نمبر ص ۴۵ مطبوعہ گوجرانوالہ)

(ف) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد شفیق الحق صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ جامعۃ العلوم ڈاک خانہ گاسباڑی سلہٹ (سابق مشرقی پاکستان) نے مادۂ تاریخ وفات درج ذیل صورت میں نکالا:۔

ولادت قطب العالم قدس سرہٗ العزیز ۱۲۹۶ھ

۴۳۱	۴۳۶	۴۲۹	۱۲۹۶
۴۳۰	۴۳۲	۴۳۴	۱۲۹۶
۴۳۵	۴۲۸	۴۳۳	۱۲۹۶
۱۲۹۶	۱۲۹۶	۱۲۹۶	۱۲۹۶

وصال الشیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۱۳۷۷ھ

۴۵۸	۴۶۳	۴۵۶	۱۳۷۷
۴۵۷	۴۵۹	۴۶۱	۱۳۷۷
۴۶۲	۴۵۵	۴۶۰	۱۳۷۷
۱۳۷۷	۱۳۷۷	۱۳۷۷	۱۳۷۷

(ف) میرٹھ کے ایک مشہور نقشہ نویس محمود حسن صاحب نے حضرت مدنیؒ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے ہجری اور عیسوی سال کے اعتبار سے تاریخ وفات ایسے چوکھٹے میں نکالی کہ اسے جس طرف سے پڑھیں مکمل جملہ اور وہی تاریخ نکلتی ہے۔

۱۹۵۷ء

ہجری	اُو شبلیِ دیں ۷	جنیدِ دوراں ۷	اُو رہبرِ ما ۳	حسین احمد ۱
عیسوی	بہیں محدّث ۷	فقیہ حق بیں ۵	برفت زینجا ۹	بسوئے ابقاء ۱
ہجری	حسن دُعا کُن ۷	بجو دا ایزد ۷	بہیں بتو رخ ۳	جلیل کُملاء ۱
عیسوی	امامِ ملّت ۷	حسین احمد ۵	بہشت یابد ۹	بروزِ فردا ۱

(روزنامہ الجمعیۃ دہلی، شیخ الاسلام نمبر ۱۳۷۷ھ مطبوعہ محبوب المطابع)

ازواج صالحات

حضرت کا پہلا نکاح ۱۳۱۲ھ میں قتال پور ضلع اعظم گڑھ میں ہوا جبکہ آپ کی عمر سولہ برس تھی اور آپ دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے) جو آپ کے ساتھ مدینہ منورہ تشریف لے گئیں، اُن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام زہرا تھا، اہلیہ محترمہ کا ۱۳۲۶ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال ہوا جبکہ محترمہ زہرا دمشق میں ۱۳۳۷ھ میں فوت ہوگئیں۔ رحمہا اللہ

دوسرا نکاح قاری غلام احمد مرحوم کی صاحبزادی سے بہ کفالت حضرت شیخ الہندؒ ہوا جن سے دو صاحبزادے الطاف احمد اور اشفاق احمد پیدا ہوئے مگر یہ دونوں اور ان کی والدہ ماجدہ حضرتؒ کے زمانہ اسارتِ مالٹا میں مدینہ منورہ میں وفات پاگئے۔

تیسرا نکاح: حضرت کا تیسرا نکاح دوسری اہلیہ مرحومہ کی چھوٹی بہن سے ہوا جن سے صاحبزادہ مولانا محمد اسعد اور صاحبزادی ماجدہ خاتون مرحومہ پیدا ہوئیں۔ ماجدہ خاتون کا انتقال بچپن میں سلہٹ میں ہوا، محترمہ والدہ مولانا محمد اسعد کا انتقال ۱۳۵۵ھ میں ہوا، آپ کا مزار دیوبند ہی میں حضرت مدنیؒ کے پاس ہے۔

چوتھا نکاح اپنے تایازاد بھائی محمد بشیر صاحب کی بیوہ لڑکی سے چند ایام بعد ہوا جن سے اللہ تعالے نے آپ کو سات اولادیں عطا فرمائیں، سب سے چھوٹے صاحبزادہ محمد اسجد کی ولادت کے وقت حضرتؒ کی عمر تقریباً اسی برس تھی۔

حضرتِ مدنیؒ کی ذریّتِ طیّبہ

وصال کے وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد تین صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں۔ مولانا سید محمد اسعد میاں، مولانا سید حافظ محمد ارشد میاں، سعادت آثار سید محمد اسجد میاں عمر صرف ۱½ سال ریحانہ سلمہا اللہ تعالے، عمرانہ سلمہا اللہ تعالے، صفوانہ سلمہا اللہ تعالے، فرحانہ سلمہا اللہ تعالے۔

مولانا محمد اسعد حضرتؒ کی تیسری اہلیہ محترمہ کے بطنِ اطہر سے ہیں جبکہ باقی سب اولاد حضرتؒ کی چوتھی اہلیہ محترمہ زید مجدہا کے بطنِ اطہر سے ہے۔

آج بوقت ترتیب چراغ محمد، مولانا محمد اسعد مدنی دامت برکاتہم جمعیۃ العلماء ہند کے صدر اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں، دار العلوم دیوبند کی ترقی ان کی مرہونِ منت ہے، مولانا محمد ارشد مدنی دار العلوم دیوبند میں استاذ حدیث ہیں، مولانا محمد اسجد مدنی ناظمِ دفتر جمعیۃ علماء ہند ہیں۔

محترمہ ریحانہ نور اللہ مرقدہا آج سے تقریباً ۲ دو سال پہلے واصل باللہ ہو چکی ہیں جن کی اولاد بفضلہٖ تعالےٰ موجود ہے، باقی سب صاحبزادیاں سلامت ہیں والدہ محترمہ بقیدِ حیات ہیں اور گلشنِ مدنی مہک رہا ہے، اللہ تعالےٰ اسے سدا بہار اور گلستانِ بے خزاں رکھے۔ آمین

(ف) آج (۱۴۱۵ھ ۱۹۹۴ء) اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے اخلافِ صدق مندرجہ ذیل ہیں:۔

مولانا محمد اسعد مدنی	اولاد	حافظ محمد امجد، سید احمد، حافظ محمود، حافظ محمد مسعود، حافظ محمد، حافظ مودود
مولانا محمد ارشد مدنی	اولاد	حافظ ازہد، حافظ ازہر، حافظ حسین احمد، حافظ حبیب اللہ، حافظ محسن۔
مولانا محمد اسجد	اولاد	حافظ سید حسن
محترمہ ریحانہ نور اللہ قبرہا	اولاد	احمد، حافظ قاری اخلد، حافظ اشہد
محترمہ عمرانہ زید مجدہا	اولاد	قاری حاجی مفتی محمد سلمان، حافظ سید محمد عفان
محترمہ صفوانہ زید مجدہا	اولاد	حافظ محمد حارث، حافظ محمد معاذ، محمد اسعد، محمد بشار۔ سلمہم اللہ تعالیٰ

حضرتؒ کا حلیہ

سانولا رنگ اور میانہ قد (دوہرا بدن) بارعب کتابی چہرہ، بھری ہوئی سیاہ داڑھی (حضرتؒ خضاب استعمال فرمایا کرتے تھے تاکہ مجاہدوں کی طرح جوان معلوم ہوں، آزادی کے بعد چھوڑ دیا تھا) کشادہ اور نورانی پیشانی پر سجدوں کے نشانات، روشن آنکھیں، گفتگو کا انداز سلجھا ہوا، پُر اعتماد لب و لہجہ کہ مخالف بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے اٹھتے تو احساس مرعوبیت لے کر، نپے تلے الفاظ، جملے ایسے کہ جیسے سانچے میں ڈھلے ہوں، چال میں شیروں کی سی بے خوفی لیکن دل میں راہبوں سے زیادہ انکسار، ایسا مجاہدانہ انداز جسے دیکھ کر جوان بھی شرمائیں......

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ترکہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کے ترکہ کے متعلق آپ کے صاحبزادۂ گرامی قدر اور جانشین حضرت مولانا سید محمد اسعد مدنی مدظلہ اپنے ایک مکتوب گرامی (محررہ ۷ شعبان ۱۳۷۸ھ) بنام مرتب "چراغ محمد" میں لکھتے ہیں:-

(۱) حضرت قدس اللہ سرہ العزیز نے کوئی قرض نہیں چھوڑا حالانکہ تمام عمر قرضہ اور اسکی ادائیگی کا سلسلہ جاری رہتا تھا لیکن قدرت کو ایسے موقع پر جبکہ تقریباً نصف ذی الحجہ سے حضرت قدس اللہ سرہ العزیز (جبکہ سفر مدراس پر روانہ ہوئے تھے) مدرسے سے تنخواہ نہیں لے رہے تھے اور علالت اور علاج وغیرہ کے اخراجات کے علاوہ تقریباً ایک ہزار سے بھی زیادہ ماہوار خرچ گھر میں ہو رہا تھا، یہ منظور نہ تھا کہ حضرت دنیا سے مقروض جائیں۔

(۲) حضرت قدس سرہٗ نے (جو) ترکہ چھوڑا اس میں ٹانڈے کا مکان اور گھر کے استعمال (کا) سامان اور روپیہ بھی تھا اور کتابیں بھی، روپیہ کی صورت یہ ہوئی کہ دو ہزار کی ایک (رقم) جب مہتمم صاحب برما گئے تو اُن کے ذریعے حضرت قدس سرہ کے کچھ شاگردوں اور مریدین نے حضرت قدس سرہٗ کو ہدیۃً بھیجی جو مہتمم صاحب نے وصال سے پانچ چھ دن قبل حضرت قدس سرہٗ کے پاس بھیجی اُس میں سے دو سو روپیہ خرچ ہوئے، اٹھارہ سو حضرت قدس سرہٗ کے بیگ میں سے نکلے۔ اور ایک رقم احقر کے پاس رہتی تھی، جو وقتاً فوقتاً خدام کے علاج وغیرہ کے اخراجات کیلئے باوجود شدید انکار کے پیش فرماتے رہتے تھے وہ بھی وصال کے بعد ترکہ میں چھوڑی، البتہ عمر شریف کے برسہا برس بلکہ اکثر ایسے گذرے ہیں کہ زکوٰۃ بھی حضرت قدس سرہٗ پر واجب نہ ہوتی تھی، اکثر فرماتے تھے کہ مجھ پر تو نہ قربانی واجب ہے اور نہ زکوٰۃ (حالانکہ ہر سال سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت گنگوہی، حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہما اور دادا صاحب، دادی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہما کی طرف سے قربانی کرتے تھے) ہم لوگوں سے فرماتے ہم لوگ فقیر ہیں اگر مہمانوں کا خیال نہ ہو تو گھر کا سارا سامان بانٹ دوں، جب کوئی چیز مہمانوں کی ضرورت (کیلئے) ہم لوگ ظاہر کرتے فوراً منگا لینے، فرماتے کہ ہمارا خاندان فقیروں کا (خاندان) ہے۔

ملاءِ اعلیٰ کی نوازشات

اسلامی تاریخ میں ایسے کئی واقعات ثقہ اور متقی حضرات سے منقول ہیں کہ کسی مقبولِ خداوند تعالےٰ اور منظورِ رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ آخرت سے پہلے ان پاکباز بزرگوں کو بذریعہ کشف یا بذریعہ خواب اطلاع کردی جاتی تھی اور ان کے سفرِ آخرت کا منظر بھی دکھایا جاتا تھا، جیساکہ امام بخاریؒ کے قصبہ خارتنگ نزد ثمرقند سے دُور ایک قصبہ میں ایک محدث عبدالواحد بن آدم نے خواب میں سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل کیا جبکہ آپ کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت بھی تھی، عبدالواحد نے دربارِ عالی میں سلام عرض کرکے اس جگہ قیام کی وجہ دریافت کی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میں محمد بن اسمٰعیل بخاری کے انتظار میں ہوں"۔ اس خواب کے چند دن بعد اس محدث کو معلوم ہوا کہ جس وقت اُسے یہ مشاہدہ منامی ہوا اُسی وقت امام بخاری کا انتقال ہوا تھا۔ رحمۃ اللہ علیہ (طبقاتِ کبریٰ از امام سبکی جلد ۲ ص۱۴)

اسی طرح حضرت مدنیؒ کے سفرِ آخرت سے پہلے کئی اہل اللہ کو ایسے خواب آئے، یہاں صرف ایک مشاہدہ جناب پروفیسر محمد احمد ایم اے اسلامیہ کالج سکھر کے مضمون سے درج کیا جاتا ہے:۔

"وفات سے ایک روز پہلے کا واقعہ ہے کہ ایک طالب علم جو حضرت کے ہاں روحانی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور تصوف کی منازل طے کر رہے تھے وہ حضرت کے یہاں باہر بیٹھے تھے کہ انہوں نے دو گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سُنی کہ بہت تیزی سے آرہے ہیں، اچانک ایک سفید پوش انسان نے ان کی آنکھوں کو بند کرلیا اور کہا بھی کہ اپنی آنکھیں بند کرلو، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لارہے ہیں۔ اور دوسرا گھوڑا زین کسا ہوا ساتھ ہے، طالب علم نے عرض کیا کہ خالی گھوڑا کس کیلئے ہے؟ فرمایا کہ یہ خالی گھوڑا حسین احمد کیلئے ہے میں حسین احمد کو لینے آیا ہوں، خالی گھوڑے پر ایک انڈا رکھا ہوا تھا اُس طالب علم نے سوال کیا یہ انڈا کیسا ہے؟ فرمایا یہ مقام محدثین کا ہے، پھر اس طالب علم نے آنکھیں کھول لیں۔ اسی شام کو سہارنپور کے سول سرجن صاحب اور دیگر ڈاکٹروں نے معائنہ کے بعد فرمایا کہ سائنس کی رُو سے مولانا حسین احمد صاحب کو ایک منٹ بھی زندہ نہ رہنا چاہیئے حضرت فقط اپنی روحانی طاقت سے زندہ ہیں"۔ (سرتاج الاولیاء ص۱۳)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو خراجِ عقیدت

حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت سے دینی، علمی اور روحانی طور پر بظاہر جو نقصان پہنچا اُس کا خلاصہ تو حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مندرجہ ذیل شعر میں یُوں ہے ؎

آج تو قاسم و امداد سب ہی مرتے ہیں
اس کا ذکر کیا کہ برباد ہوئے تُم یا ہم

مگر پھر بھی چند حضرات کے تاثرات ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

(۱) مرشد العلماء حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحؒ نے ارشاد فرمایا:۔

"جب ہم نے اس مردِ مجاھد کو آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو جہاں شیخِ مدنی کے قدم تھے وہاں اپنا سر پڑا دیکھا۔"

(۲) امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری نوّراللہ مرقدہٗ کا خراجِ عقیدت

حضرتِ مدنیؒ کی رحلت پر مرکز حقّہ شیرانوالہ میں علماءکرام اور دوسرے مسلمانوں کا ایک عظیم تعزیتی جلسہ ہُوا جس میں مقررین حضرات نے اپنے اپنے تاثراتِ غم واندوہ کا اظہار فرمایا حضرت مولانا احمد علی صاحب نوّراللہ مرقدہٗ نے اپنے اُسی جذبۂ عقیدت کو پھر بیان فرمایا جو آپ کئی مرتبہ منبر پر بیان فرما چکے تھے، آپ نے فرمایا کہ:۔

"مَیں نے چودہ بار حرمین کی زیارت کی ہے، مجھے اللہ تعالیٰ نے وہ نورِ بصیرت عطا فرمایا ہے کہ مَیں اہل اللہ کو پہچان لیتا ہوں، حرم کعبہ شریفہ میں ہر وقت کئی اولیاء کرام کا اجتماع رہتا ہے مَیں نے جب اپنی روحانی نظر سے دیکھا تو کسی کو بھی حضرت مدنیؒ کا ہم پلّہ نہ پایا، اُن کی رحلت سے اسلامی دُنیا کو عظیم علمی، دینی اور رُوحانی نقصان پہنچا ___ آپ نے آخر میں فرمایا کہ مَیں نہ تو حضرتِ مدنیؒ کا شاگرد ہوں نہ

مُرید ہوں جو کہتا ہوں یہ حقیقت ہے۔"

(ف) حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ حرمِ کعبہ میں ہر وقت تقریباً تین سو ساٹھ اولیاء کرام کا مجمع رہتا ہے۔ (دار العلوم دیوبند الاحسان نمبر ص ۱۳۳)

(۳) دار العلوم دیوبند کے مہتمم مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے ایک طویل تعزیتی بیان میں فرمایا۔

حضرتِ ممدوح کی وفات اس صدی کا سب سے بڑا المناک سانحہ اور ایک عظیم علمی نقصان ہے جس کی تلافی بظاہر اسباب مشکل ہے، ایسی جامع ہستیاں دیر سے بنتی ہیں اور جب اُٹھ جاتی ہیں تو اُن کی جگہ لمبی مُدت تک خالی رہتی ہے ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت ممدوح کی ہستی نادر روزگار ہستی، عزم و ثبات، ہمتِ مردانہ، اٹل ارادہ، علم و بصیرت اور ایمان و فراست کا ایک متحرک پیکر تھی، آپ نے آج کے لادینی اور مادّی دَور میں جن دینی، اخلاقی اور علمی اصولوں کا دائرہ خواص و عام کے لیے وسیع کیا اور انسانیت کی جن قدروں کو اُجاگر کیا دُنیا اُن پر ہمیشہ فخر کرے گی۔

حضرتِ ممدوح کا فیضان نہ صرف ہندوستان کی چہار دیواری تک محدود رہا بلکہ عرب و عجم میں بھی پھیلا، آپ نے دار العلوم دیوبند سے تحصیلِ علم سے فراغت پا کر حرمِ نبوی میں درسِ قرآن و حدیث و تدریسِ علوم و فنون کا آغاز فرمایا اور دس بارہ برس اس سرچشمۂ علومِ نبوت میں بیٹھ کر علومِ نبوی کی خدمت کی خدمت کی جس سے عرب و عجم کے لوگ سیراب ہوئے اور آپ کے تلامذہ ایشیائے کوچک سے لے کر یورپین ترکی تک پہنچے، اور آخر کار عمر کے آخری حصّے میں ۳۲ برس کامل دار العلوم دیوبند کی صدارت اور تدریس پر فائز رہے، مشرق و مغرب کے لوگوں کو علوم کے آبِ حیات سے سیراب فرمایا۔ (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر)

(۴) عالمِ اسلامی کے ممتاز عالمِ دین مولانا ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم نے اپنے ایک طویل تعزیتی بیان کے آخر میں ارشاد فرمایا:۔

مولانا کی وفات سے علم و سیاست کی بزم میں جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا افسوس کرنے والے اور اس خلا کو محسوس کرنے والے بہت ہیں، لیکن اخلاق و انسانیت کی صفِ اوّلین اور رشد نشین میں جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا احساس کرنے والے شاید کم ہیں، شاید اس لیے کہ انسانیت کو کوئی ایسا مرتبہ نہیں

سمجھا جاتا کہ کسی بزرگ یا عالم کو اس معیار سے جانچا جائے اور کسی مردِ کامل کے اُٹھ جانے سے کوئی خلا محسوس کیا جائے مگر میرے نزدیک آدمیت کے اس قحط اور انسانیت اور انحطاطِ عام کے دور میں مولانا مدنی کا حادثہ وفات ایک بڑا اخلاقی خسارہ اور انسانی حادثہ ہے ؏

ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خاموش ہے

(پرانے چراغ ص۱۵۱)

⑤ امیرِ تبلیغ حضرت الحاج مولانا محمد یوسف صاحب نوّر اللہ مرقدہ نے "جامع انسانیت کے لیے حادثۂ عظمٰی" کے عنوان سے اپنے طویل تعزیتی بیان میں فرمایا ۔

حضرة شیخ العرب والعجم المجاهد الاعظم محب الهجرة والجهاد متبع السنة حامل لواء العلم امام العلماء محدث زمانه فقیه اهل عصره الزاهد فی الدنیا الراغب فی الاٰخرة کثیر الاجتهاد کثیر السخاء قلیل التکلف مولانا السید حسین احمد مدنی رحمه الله رحمةً واسعةً واعطاه من اعلیٰ درجات الجنة ویلقاه یضحك الیه و هو یضحك الیه (اٰمین) کی ذاتِ گرامی اُن نفوسِ قدسیہ میں سے تھی جن کے انتقال کے صدمہ میں اس وقت اُمت کے حساس اور شعور والے دردمند انسان مبتلا ہیں اور جو حقیقت میں ایک عالَم (جہان) کے عالِمؒ کی مصیبت کے مترادف ہے، اُن کی ذاتِ گرامی کے بارے میں جو کچھ بھی ذکر کیا جائے گا وہی ہوگا جو آنکھوں نے دیکھا یا کانوں نے سُنا۔ اصل دولت انسان کے اندرون میں ہوتی ہے جہاں تک انسانوں کی رسائی مشکل ہوتی اور کور چشم اس سے بالکل ہی محروم رہتے ہیں۔ کیفیات اور جذبات اور انوارات اس عالم میں انسان کے اندر مضمر ہوتے ہیں اگلے عالم میں ظاہر کیے جاتے ہیں ، اب خداوند قدوس جل مجدہٗ ہی جانے کہ انھوں نے اس مبارک ہستی میں کیا کچھ اپنے لیے بے پایاں جذبات و کیفیات بھر دی تھیں جن کے تقاضوں پر انھوں نے اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو انتہائی تکالیف اپنی جان پر برداشت کرتے ہوئے اپنی باطنی انتہائی ترقیات کے ساتھ ہر طرح کے باطل کے اس عالم سے مِٹ جانے اور حق کے ہر پہلو کی حیات اور سرسبزی اور قوت پذیر ہو جانے پر محنتِ تامہ کاملہ کرتے ہوئے اپنی آخری اوقات کو تصور میں نہ آنے والی ندامت اور گریہ وزاری والی دعاؤں میں منہمک ہوتے ہوئے اپنی جان جان کے محبوب و مربی مالک کے سپرد کر دی ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۰

(۶) حکیم الامت حضرت تھانوی کے خلیفہ ارشد حضرت مولانا خیر محمد جالندہری نوراللہ قبورہم نے اپنے تعزیتی بیان میں فرمایا:۔

سلف میں دو قسم کے بزرگ ہیں، ایک علوم شریعت میں ماہر اور باکمال اور دوسرے وہ جو علوم طریقت میں انتہائی مقام کو پہنچے ہوئے تھے۔ حضرت مدنی ان اکابر لوگوں میں تھے جو ظاہر و باطن دونوں کے جامع تھے اور صحیح معنوں میں شیخ الاسلام تھے اور ان کو حضرت مولانا محمد قاسمؒ سے تواضع و انکساری اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے استقلال اور استقامت ورثہ میں ملی تھی۔

(۷) مولانا محمد اسعد اللہ مہتمم مدرسہ عالیہ مظاہر علوم سہارنپور نوراللہ مرقدہٗ نے اپنے ایک طویل تعزیتی بیان میں ارشاد فرمایا:۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال پر صرف آنکھیں ہی نہیں بلکہ قلوب بھی گریاں ہیں، دُنیا کے ہر گوشے میں ان کو خراج عقیدت وارادت پیش کیا جارہا ہے، جن افراد کو حضرتؒ سے سیاسی اختلافات تھے وہ بھی حضرتؒ کے تقدّس اور تبحرِ علمی کی بناء پر محزون و غمگین ہیں، قلم و زبان اور زبان و قلم سے ان کی مختلف محاسن کے تذکرے ہو رہے ہیں اور لکھنے والے اُن کی زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ پر دل کی گہرائیوں اور روح کی پنہائیوں سے عقید تمندانہ جذبات کا اظہار کر رہے ہیں اور ان کے لیے یہ جذباتِ عقیدت ہر طبقہ اور مکتبِ خیال سے ہے، عوام سے لے کر خواص تک، خوردوں سے لے کر بزرگوں تک، گداؤں سے لے کر شاہوں تک، اَن پڑھوں سے لے کر علوم کے ماہرین تک اس سلسلہ میں شامل ہیں اور سب سے بڑھ کر قابلِ اہمیّت بات یہ ہے کہ ان قابلِ قدر جذبات کا اُن مقبول ترین بندگانِ خدا کی جانب سے زیادہ اظہار ہو رہا ہے جو خود شریعت اور طریقت کے آفتاب و مہتاب ہیں اور اس سے حضرتؒ کی مقبولیّت کا اندازہ باآسانی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ وہ اس عالم میں آج نہیں ہیں لیکن آج بھی کتنے ہی تلامذہ اور تلامیذ تلامذہ ان کے عام علمی فیضان رسانی کی شکل میں موجود ہیں جن کا میں کسی تردّد کے بغیر پچاس ہزار سے کم کا اندازہ نہیں کر سکتا، جہاں تک مجھے علم ہے حضرتؒ کے خلفاء مجازین کی تعداد پونے دو سو کے قریب ہے اور حضرت اپنے جانے کے بعد بھی فیوض و برکات کی ابد تک باقی رہنے والی ایک تابندہ کائنات چھوڑ گئے ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً (الجمعیۃ دہلی مدنی نمبر)

(۸) شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد یوسف بنوری نے بعنوان "دین و علم دین، مدرسہ و خانقاہ کا حادثۂ کبریٰ" اپنے تعزیتی بیان میں فرمایا:۔

جب وقت کے بڑے بڑے محقق اور اہلِ کمال حضرات حضرت (مدنی) علیہ رحمۃ اللہ کو اپنی خصوصیات و کمالات میں آیۃ من آیۃ اللہ اور حجۃ اللہ علی الخلق سمجھتے تھے، میری بساط ہی کیا ہے کہ کچھ کہا جا سکے، بہرحال اتنا کہہ سکتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند کی مسندِ صدارت پر تقریباً ایک صدی سے جس قوی النسبۃ عارفین محدث جلوہ افروز تھے حضرت مولانا علیہ الرحمۃ اس کی آخری شخصیت تھے اکابر دیوبند کے قافلے کے آخری مسافر تھے جو دُنیا سے چل بسے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرتؒ کا وجود ہندوستان کے اہلِ علم اور اہلِ اسلام کے لیے عالمِ اسباب میں آخری سہارا تھا جو اب نہیں رہا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ چلے گئے تو حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ اسمٰعیل شہید جیسے خلف چھوڑ گئے، اگر حضرت مولانا محمد قاسم گئے تو حضرت گنگوہی اور حضرت شیخ الہندؒ جیسی ہستیاں جگہ پُر کرنے کے لیے زندہ تھیں، حضرت شیخ الہند گئے تو حضرت تھانوی، حضرت مدنی، حضرت مولانا انور شاہ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب ایسے حضرات جانشین موجود تھے لیکن حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ ایسی حالت میں اُمت کو چھوڑ گئے کہ اُن کے کمالات کسی ایک کمال میں اُن کا کسی درجہ میں جانشین نظر نہیں آتا، یہی وہ چیز ہے جو اُمتِ اسلامیہ کے لیے صبر آزما حالت ہے۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کو حجاج نے جب شہید کیا تو خواب میں حجاج کو کسی نے دیکھا تھا کہ ہر شہید کے قتل کے عوض مجھے ایک مرتبہ قتل کیا گیا، لیکن سعید بن جبیر کے قتل پر مجھے ستر مرتبہ قتل کیا گیا۔ امام احمد بن حنبلؒ سے کسی نے پوچھا کہ حجاج نے تو صحابہ کو بھی قتل کیا تھا اور سعید بن جبیر تو تابعی تھا، یعنی اس فضیلت کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا کہ حجاج نے سعید بن جبیرؒ کو ایسے زمانے میں قتل کیا کہ روئے زمین پر ایسا کوئی نہ تھا جو سعید بن جبیر کے علم کا محتاج نہ ہو۔ درحقیقت ہندوستان کے مسلمان اور اہلِ علم، خانقاہ و مدرسے والے آج یتیم ہو گئے۔۔۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللّٰھم اغفرلہ اللّٰھم ارحمہ رحمۃً واسعۃً برفع الدرجات۔ (آمین) ۔۔۔ (الجمعیۃ دہلی، مدنی نمبر)

(۹) مشہور روحانی پیشوا حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے آستانہ کے گدی نشین خواجہ حسن نظامی کے خلف الصدق خواجہ حسن نظامی ثانی نے ایک طویل تعزیتی بیان میں فرمایا ہے:۔

حضرت مدنیؒ نے ایک نہیں کئی نسلوں کی براہِ راست تربیت فرمائی اور ایسے جانشین بھی چھوڑ گئے جنہوں نے ان کے کام کو جاری رکھا، ان کے چراغ سے بیشمار چراغ جلے ہیں، خود مجھے بھی یہ فخر ہے کہ اُن کے شاگردوں کا شاگرد ہوں اور میرے خاندان کا اُن کے خاندان سے خصوصی تعلق رہا ہے، والدی و مُرشدی حضرت خواجہ حسن نظامیؒ حضرتِ مدنی علیہ الرحمۃ کے خواجہ تاش تھے یعنی دونوں نے حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کا فیض پایا تھا اور تعلیم کے زمانے میں حضرت مدنیؒ کے بھائی صاحب سے خواجہ صاحبؒ کی ایسی دوستی تھی کہ مدینہ منورہ میں پندرہویں شعبان میسّر آئی تو خواجہ صاحبؒ نے شب بیداری کے لیے ان ہی کے گھر کا انتخاب کیا تھا۔ (حیات و کارنامے ص۳۵۲)

(۱۰) مجاھدِ جلیل آغا شورش کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا تعزیتی اداریہ :۔

اس تعزیتی خبر سے اسلامی دُنیا کے ثقہ افراد بے شبہ رنج و قلق کا شکار ہوئے ہیں کہ ایشیا کی سب سے بڑی دینی درسگاہ کے رئیس الجامعہ شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد مدنی ۵ دسمبر کو ۲ بج کر ۴۵ منٹ پر دیوبند میں اس جہانِ فانی سے رُخصت ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ان کا سنِ شباب تھا کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ اختیار کیا اور دین و سیاست میں انہی کی سیادت قبول فرمائی، پھر اُن سے پہلے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ چلے گئے، روضۂ اطہر کے سامنے بیٹھ کر حدیث شریف کا درس پڑھا اور پڑھایا، وہیں پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں انگریزوں نے مُرشد و مرید دونوں کو گرفتار کر لیا اور مالٹا کے جزیرہ میں نظر بند رکھا، وہاں آپ پر جو مظالم روا رکھے گئے اُن کا ذکر یہاں بیکار ہے کیونکہ زخموں سے کھیلنے والوں کو زخم سہنے والوں کی کہانی سنانا بجائے خود زخموں کی اہانت کرنا ہے۔

رہائی کے بعد ہندوستان پہنچے اور تحریکِ خلافت میں شریک ہو گئے پھر جب تک انگریز اس برصغیر سے نکل نہیں گئے آپ نے کسی موڑ پر بھی اپنے بڑھاپے کو جھکنے نہیں دیا، شب و روز گذرتے رہے۔

آپ نے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی، کسی کے خلاف کلمۂ اہانت نہیں کہا، اختلافِ فکر و نظر کے باوجود ہر شخص کی عزت کی، دین کو دین کی سطح پر رکھا کاروبار کا ذریعہ نہیں بنایا، غیرت اور جرأت دو ایسے وصف تھے جو آپ کے خون میں دوڑتے تھے۔

حضرتؒ تقوٰی کی اس منزل میں تھے کہ مولانا الیاس دہلوی (بانی جماعتِ تبلیغ) نے سیاست کی

گرم بازاری کے دنوں میں کہا تھا کہ "آپ سیاستاً جو کچھ کہتے ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آتا اگر سمجھ میں آسکتا تو میں آپ کے ہمراہ دوڑتا پھرتا، مگر اللہ کے نزدیک آپ کا جو درجہ ہے میں اس سے کماحقہٗ واقف ہوں، اس لیے آپ کی مخالفت کر کے جہنم کی آگ نہیں خریدنا چاہتا"۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ ایک بیش بہا متاع تھے، زندہ[1] ہندوستان میں ہوتے تو آج بھارت کے پرچم آپ کے غم میں سرنگوں ہوتے لیکن آپ اس ملک میں اجنبی تھے۔ (ہفت روزہ چٹان لاہور ۹ ردسمبر ۱۹۵۷ء)

(۱۱) آل انڈیا ریڈیو دہلی

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے برگزیدہ نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہوئے قلب پر عجیب عالم گذر رہا ہے، اُن کی موت نے لاکھوں محبت بھرے دلوں کو غم و حُزن کا مسکن بنا دیا ہے، نہ جانے کتنی آنکھیں آج اُن آنسوؤں کی جلوہ گاہ ہوں گی جن میں انتہائی خلوص و گداز شامل ہے۔

جنگِ آزادی کا عظیم راہنما، حبِ وطن کا ایک بحرِ موّاج، عزم و استقلال کا ہمالہ، حلم و انکسار کا ایک سدا بہار گلستاں، جود و کرم کا ابرِ گہربار، علم و عمل کے اُفق کا آفتاب آج حجاباتِ ظاہری کی محفل سے اُٹھ کر عالمِ باطنی کی خلوت میں محوِ خواب ہے۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون

سید حسین احمد! ہاں وہ مردِ عظیم، انسانیت کی آبرو، عرفان و ایقان کا تجمّل، شریعت کا ہادی، طریقت کا مُرشد، مدرسہ و خانقاہ میں خشیتِ الٰہی سے سراپا گداز، میدانِ عمل میں جرأت و ہمّت کا کوہِ گراں، وہ خطیب شعلہ فشاں جس نے غیور ہندوستانیوں کے سینوں میں جذبۂ آزادی کی چنگاری روشن کی۔

ریشمی رومال کی تنظیمِ جہاد ہو یا جنگِ عظیم میں برطانیہ کی شدید مخالفت، مالٹا کا زندان ہو یا کراچی کی قید، تحریکِ خلافت ہو یا جدوجہدِ آزادی، نمک سازی کی ستیہ گرہی ہو یا شراب خانوں کا احتساب، نعرۂ انقلاب ہو یا نظریۂ تقسیم کا دلیرانہ استرداد، غرض ہندوستان کی کتابِ آزادی کا ایک ایک ورق حضرت مولانا کے انوار، ایثار و قربانی سے تابناک ہے۔

ایک طرف جہد و عمل کا یہ وسیع میدان دوسری طرف مسندِ علم و عرفان سے علومِ نبوت کی گہر ریزیاں اور گل باریاں، سچ تو یہ ہے کہ اس دور میں یہ امتیاز خاص حضرتؒ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو گیا۔

---

[1] یعنی بھارت بھی حضرت مدنیؒ کے مقام سے بے خبر رہا۔ (مرتب)

شیخ الاسلام، ہادیٔ کُل حضور رحمۃ للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُسوۂ حسنہ کے والہ و شیدائی تھے شفقت و رحمت، حلم و تواضع، عفو و کرم، جُود و نوازش، ایثار و اخلاص اور خدمت و مدارات کے حُسن و پاکیزگی نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کو انتہائی دلآویز بنا دیا تھا۔

دینِ حنیف کی شمع جاوداں، حریمِ چشتیاں کا چراغ ابد فروغ، دن علوم و معارف کی خدمت و اشاعت سے روشن، راتیں ذکر و خشیتِ الٰہی سے پُرنور، قائم اللیل و فارس النہار کی تفسیرِ جمیل، دشنام طرازوں اور کیچڑ اُچھالنے والوں پر عفو و کرم کے پھول برسانے والا، بدخواہوں کا سچا دُعا گذار، ہاں حسین احمد اپنے ہادیٔ برحق کے نقشِ قدم کا دیوانہ، رُحَمَآءُ بَینَہُم کے جمالِ دلنشین کا پرتو، جس کی زندگی تھی ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست　　　بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

کروڑوں ہندوستانیوں اور بے شمار دُوسرے مُلکوں میں رہنے والے عقیدت مندوں کے غمزدہ قلوب کی تسلّی کے لیے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی پاک رُوح عالمِ باقی کے جھروکوں سے اشارہ کر رہی ہے

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔

⑫ ریڈیو سعودی عرب جدّہ

حضرت شیخ الاسلام کی وفات کی اطلاع یہاں بجلی بن کر گری، پنجشنبہ ۱۳ جمادی الاوّل کو یہ خبر ہندوستان اور پاکستان کے ریڈیو نے نشر کی، سعودی عرب ریڈیو کی اردو نشریات کا پروگرام مُلتوی کر کے مندرجہ ذیل تعزیتی تقریر نشر کی گئی:-

حضرتِ مدنیؒ جمعیۃ علماء ہند کے صدر، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جہادِ حُریت کے اوّلین سپہ سالاروں میں تھے، انہوں نے اپنی پوری زندگی دین کی خدمت، ترویجِ سُنت اور احادیثِ نبوی کی تدریس میں گذار دی، وہ بزرگوں کے بزرگ، اُستادوں کے اُستاد، بڑے بڑے مُرشدین کاملین کے مُرشد اور بہتیرے مسلم لیڈروں کے مربّی اور اُستاد تھے، ان کے نقشِ حیات کا ایک ایک صفحہ عظمت کی بارگاہ ہے، نہ صرف ہندوستان و پاکستان بلکہ برما، انڈونیشیا، افغانستان، مشرقی و جنوب مشرقی افریقہ میں اُن کے شاگرد ہزاروں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ قوت و عزیمت کے کوہِ گراں تھے جو اپنے مؤقف سے بال برابر بھی ہٹنا گناہ سمجھتے تھے۔ اُن کی شخصیت ایک ہشت پہل نگینہ کے مانند تھی۔ اگر ایک طرف گاندھی جی، موتی لال نہرو اور دوسرے ہندوستانی لیڈر اُن کے مدّاح و قدرداں تھے، اُن سے مشورہ لیتے

تھے اور ان کے تعاون پر اعتماد و فخر کرتے تھے تو دوسری طرف وہ عظیم ترین رُوحانی مربّی اور شیخ کامل تھے ایک خدا رسیدہ بندے کی معراج یہی ہے کہ وہ نہ لوگوں کی مدح خوانی سے متاثر ہو نہ اُن کے سبّ وشتم سے اگر دُنیا اس کے قدموں میں آجائے اُس کے احساسِ بندگی و بے مائیگی پر غرور کی پرچھائیں نہ پڑے اور اگر ساری دُنیا اُس سے منہ موڑ لے تو اللہ کی معیت و نصرت میں خود کو تنہا محسوس نہ کرے، جو لوگ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے قریبی واقفیت رکھتے ہیں وہ گواہی دیں گے کہ حضرتؒ ان اوصاف کے بہترین حامل تھے۔

شیخ الاسلام کا لقب حضرتؒ پر حقیقی معنوں میں صادق آتا ہے، حق بات تو یہ ہے جسکے کہنے میں ہم کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے ہیں کہ حضرت مدنیؒ اس وقت دُنیائے اسلام کے سب سے بڑے دینی و رُوحانی بزرگ تھے، سنتِ نبوی کو اگر کوئی زندہ شکل میں دیکھنا چاہتا تو حضرتؒ کی رُوحانی رفتار و گفتار کا جائزہ لے لیتا، چند دن آپ کی صحبت میں گذارتا تو اُسے معلوم ہو جاتا کہ سلف صالحین کا اندازِ نشست و برخاست اور طریقِ بود و باش کیسا تھا۔

آج تمام مسلمانوں کے لیے یوم الحزن ہے اور ہر کلمہ گو تعزیت کا مستحق ہے، حق تعالیٰ حضرتؒ کے درجات بلند فرمائے اور اُن سے راضی ہو۔ (ملخّص)

(۱۴) افغانستان میں حضرت کو خراجِ عقیدت

افغانستان میں حضرت مدنیؒ کی وفات پر کابل کی جامع مسجد میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں افغانستان کے علماء کرام کے علاوہ جناب امیر خان گرامی پریس اٹاچی دولتِ خداداد افغانستان نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

حضرت مدنیؒ کی شخصیتِ گرامی نہ صرف ہند میں ممتاز تھی بلکہ آپ کو افغانستان میں خاص طور اور دوسرے اسلامی ملکوں میں عام طور پر قدر و منزلت، اخلاص و محبت کے بہترین مقام حاصل تھے! افغانستان جو ایک اسلامی اور دیندار ملک ہے اس کے علومِ دینی کے پروانے جہاں مصر کے جامعۂ ازہر میں حصولِ علم کیلئے جاتے رہے ہیں وہاں وہ ہند میں اور خاص طور پر دار العلوم دیوبند میں کافی تعداد میں آتے رہے ہیں اور حضرت مولانا مدنیؒ کے فیوض و برکات سے علمِ مقدس کی بے بہا نعمتیں افغانستان لے آتے ہیں جن کی یادگار افغانستان میں اس وقت تک تابندہ اور پائندہ رہے گی جب تک یہ دُنیا قائم ہے! افغانستان کے علماء کرام بلا امتیاز مولانا مدنی صاحبؒ کی ممتاز شخصیت کے نہ صرف مخلص ہیں بلکہ وہ ہر محفل میں ان کے مداح بھی ہیں حضرت مولانا مدنیؒ

کی قدر افغانستان کے باشندے نہ صرف ان کے متبحر عالم ہونے کی حیثیت سے کرتے ہیں بلکہ ان کو مجاہدینِ آزادی کے دوست، وطن پرور، قوم پرست اور استعماری مخالفین کا ہیرو بھی سمجھا جاتا ہے میں یقینِ کامل کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مولانا مدنی مرحوم کی وفات کی خبر نے افغانستان کے علمی حلقوں میں خاص طور اور عوامی حلقوں میں عام طور پر ماتمی صفیں بچھا دی ہوں گی اور جس خلوص کے ساتھ ہندوستان میں حضرت مولاناؒ کے اخلاص کیش طبقے آپ کی مغفرت کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں اسی طرح افغانستان میں بھی آپ کو ایصالِ ثواب پہنچایا جا رہا ہے۔ (الجمعیۃ دہلی، مدنی نمبر)

(۱۴) مجاہدِ سرحد بادشاہ خان (باچا خان) کا خراجِ عقیدت

حضرت مدنیؒ کی رحلت پر دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں ایک عظیم تعزیتی جلسہ زیرِ صدارت حضرتؒ کے تلمیذِ رشید شیخ الحدیث مولانا عبد الحق صاحبؒ منعقد ہوا جس میں علاقہ بھر کے علماء کرام کے علاوہ دیگر شرفاء نے بھی اپنے اندوہ و غم کا اظہار کیا خصوصاً تحریکِ شیخ الہندؒ کے نامور مجاہد بادشاہ خان (باچا خان) صاحب نے فرمایا:۔

”حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے سانحۂ ارتحال سے ہندوستان ایک عظیم شخصیت سے محروم ہو گیا اور ہم سے حضرت شیخ الہند نوّر اللہ مرقدہٗ کے جانشین جدا ہو گئے — آپ نے رقت آمیز انداز میں کہا: اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت تو یقیناً فرما چکے ہوں گے لیکن پسماندگان کو دعائے استقامت کی ضرورت ہے“

(۱۵) شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حقیقی برادرزادہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن نے فرمایا:۔

بیسویں صدی ملک و ملت کے جن چند ممتاز ترین فرزندوں پر فخر کر سکتی ہے اُن میں سے ایک مائۂ ناز فرزند شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب قدس سرہٗ بھی تھے، حضرت شیخ الاسلامؒ نے ملک و قوم پر اتنے احسان کیے ہیں کہ سرزمینِ وطن اُن کی شکر گذاری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی، آپ کا شمار صفِ اول کے اُن قائدین میں ہوتا تھا جن کے طفیل برطانیہ جیسی جابر و قہار طاقت کے پنجۂ آہنی کی گرفت سے ملک آزاد ہوا، ایک عظیم المرتبت پیشوائے دین کی حیثیت سے آپ نے مسلمانوں میں آزادی کی روح پھونکی، اُن کے دل و دماغ تک اسلام کی حقیقی تعلیم کی اسپرٹ پہنچانے کی زبردست کوشش کی اور مذہب کی اجتماعی تعلیمات کو مجاہدانہ شان کے ساتھ اُجاگر کیا، آپ کے سینہ میں ایک

ایسا دل تھا جو خدا کی مخلوق کی خدمت کے لیے تو ریشم سے زیادہ نرم رہتا ہے لیکن حق و باطل کے معرکہ میں فولاد سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے ؎

ہو جو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

جہاد و آزادی کے اس برگزیدہ ترین راہنما نے صرف یہ کہ اپنی جدوجہد کا صلہ نہیں چاہا بلکہ اس کی پرچھائیوں سے بھی دور رہے، بے شبہ وہ اوّل درجہ کے سخی تھے کبھی کسی کا دل نہیں دکھلاتے تھے، کوئی بُری اور نازیبا بات کبھی اُن کی زبان سے نہیں نکلی، اُنہوں نے بُرا چاہنے والوں کی خطاؤں سے درگذر فرمایا۔ اس کارخانۂ رنگ و بُو کے کام تو ہر حال میں چلتے ہی رہیں گے مگر اس مردِ مجاہد اور عابد و زاہد کی جدائی سے اس پر جو ویرانی اور پژمردگی چھائی ہے وہ دور نہ ہو سکے گی۔ (الجمعیۃ دہلی شیخ الاسلام نمبر)

اکابر علماء کرام اور صوفیائے عظام کی آراء اس قدر زیادہ ہیں کہ اُن کے لیے مستقل تالیف کی ضرورت ہے، ہم فی الحال ان ہی آراء پر اکتفاء کرتے ہیں۔

عمائدینِ حکومت کے پیغامات

ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند مجھے یہ سنکر بے حد افسوس ہوا کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء ہند وفات پا گئے۔ آن کی ایک بہت بڑی شخصیت تھی، وہ ایک عالم دین اور بزرگ تھے اور ہندوستان کی جنگِ آزادی کے بہت بڑے مجاہد۔ اُن کی وفات سے جو خلاء پیدا ہو گیا ہے وہ پُر نہ ہو سکے گا۔ میں غمزدہ خاندان سے اور دیوبند کے بڑے تعلیمی ادارہ سے جسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے اپنی ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں۔

مسٹر جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہندوستان مجھے مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی اطلاع سُنکر شدید صدمہ پہنچا، اُن کی موت ایک محبِ وطن کی موت ہے، انہوں نے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں قائدانہ انداز میں حصہ لیا، میں اس

سانحہ پر اُن کے خاندان اور دارالعلوم دیوبند سے اظہارِ ہمدردی کرتا ہوں۔

مجھے پُرانا زمانہ یاد آتا ہے جب مولانا حسین احمدؒ نے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں حصّہ لیا...... مولانا مرحوم نے پُرانے زمانے میں ہمیں کچھ سبق دیئے ہیں جو اِس نئے زمانہ کو یاد رکھنے چاہئیں...... (پنڈت) جواہر لال نہرو (وزیر اعظم ہند)

مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم حکومت ہند

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مرحوم نے ملک کی جو خدمتیں کی ہیں اُنکی بڑی قدر و قیمت ہے اور وہ اس قدر شاندار ہیں کہ ہم انہیں فراموش نہیں کر سکتے...... انہوں نے اپنے تئیں آزادی کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا، کانگریس کی تحریک میں انہوں نے مردانہ وار حصّہ لیا اور قید و بند کی مصیبتیں سہیں، اس سے بھی زیادہ وہ مصیبتیں تھیں جو اپنے ہی ہم مذہبوں کے ہاتھوں انہیں پیش آئیں...... اُن کی ذات محترم تھی، اُن کا انتقال قومی نقصان ہے، مجھے یقین ہے کہ سب کے دل میرے ساتھ ہیں اور سب اُن کی وفات کو قومی نقصان سمجھتے ہیں۔ درگاہِ خداوندی میں دُعا ہے کہ وہ انہیں اپنی رحمت سے سرفراز فرمائے۔ (حضرت مولانا) ابوالکلام آزاد

شکریہ اور پسماندگان کا فریضہ

از: مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے سانحہ ارتحال سے متاثر ہو کر عقیدت کیش اور مخلصین نے حجاز، مصر، شام، افریقہ، کناڈا اور پاکستان وغیرہ بیرونِ ہند اور ہندیونین کی ریاستوں سے ہزاروں خطوط اور تار دفتر جمعیۃ علماء ہند میں بھیجے، اربابِ صحافت نے ادارتی مقالات اور آرٹیکلوں میں گہرے تاثرات قلمبند کرکے یہ اخبارات و رسائل دفتر جمعیۃ علماء ہند کو ارسال فرمائے، جمعیۃ علماء ہند کے ذمہ دار خادم کی حیثیت سے ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی فرض ہے، فرداً فرداً ہر ایک صاحب کی خدمت میں تشکّر و امتنان کے خطوط روانہ کرنے سے میں قاصر ہوں، اسلئے شیخ الاسلام نمبر کے ذریعہ ان تمام حضرات کی خدمت میں اُنکی بے لوث خلوص و محبت اور حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ ان کی ارادت و عقیدت کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور حضرت حق جل مجدہٗ کی بارگاہِ احدیت میں دستِ بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضرتؒ کے نقشِ قدم پر چلنے کی سعادت نصیب فرمائے اور جو ذمہ داریاں حضرتؒ کی وفات نے ہم سب پر ڈال دی ہیں اُنکے پورا کرنے کی توفیق میسّر ہو۔ (آمین)

خادمِ ملک و ملّت، محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہٗ ـــــــ (روزنامہ الجمعیۃ دہلی، شیخ الاسلام نمبر صـ۵)

منظوم ہدیۂ عقیدت و اظہارِ اندوہ و غم

حضرت مدنیؒ کی رحلت پر جس طرح عالم اسلامی نے اپنے رنج و غم کا اظہار تعزیتی جلسوں، تعزیتی بیانوں میں کیا اسی طرح کئی زبانوں میں ادباء حضرات نے مرثیئے بھی تحریر فرمائے۔ اُردو، فارسی، عربی، گجراتی، بنگالی، پشتو زبان میں دردانگیز مرثیئے مرتب کیے گئے۔ جناب مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی مفتی جامعہ اشرفیہ لاہور، شیخ الاسلام مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور فاضل محمد بن المامون مدنی وغیرہم علماء کرام نے فصیح اور بلیغ زبان میں اظہارِ عقیدت فرمایا مگر اختصار کے پیشِ نظر یہاں صرف ایک جامع اور مختصر مرثیہ اردو زبان میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے:۔

ہمیں چھوڑ کر آج باچشمِ گریاں ۔۔۔ وہ قطبِ زماں، آہ وہ جانِ جاناں
چلا جا رہا ہے وہ جنت بداماں ۔۔۔ فرشتوں کی صف میں خراماں خراماں
فلک پر ملک مرحبا کہہ رہے ہیں
ہمیں ہیں جو فرقت کا غم سہہ رہے ہیں

اِدھر شاہِ دُنیا و دیں مسکرائے ۔۔۔ اِدھر جبرئیلِ امیں مسکرائے
سلف سارے زیرِ زمیں مسکرائے ۔۔۔ بہشتِ بریں کے مکیں مسکرائے
زمیں رو رہی ہے فلک ہنس رہا ہے
مسرت سے ہر اک ملک ہنس رہا ہے

اُدھر انبیاء کا پیام آرہا ہے ۔۔۔ اِدھر اولیاء کا سلام آرہا ہے
وہ رضواں پئے انتظام آرہا ہے ۔۔۔ کہ جنت میں وہ خوش خرام آرہا ہے
کھڑے ہو گئے صف میں غلمانِ جنت
زیارت کو آئی ہیں حورانِ جنت

درِ خُلد رضواں کھولے کھڑا ہے ۔۔۔ بشوق و ادب مرحبا کہہ رہا ہے
فرشتوں کا رستہ میں ہر سو پرا ہے ۔۔۔ بڑے دھوم سے خیر مقدم ہوا ہے
بہشتِ بریں کو سجایا گیا ہے
درِ خُلد کو جگمگایا گیا ہے

صدائے سلامٌ علیکم، کہیں ہے　　کہیں دعوتِ فَادْخُلُوْا خَالِدِیْن ہے
چلے آیئے، آپ گھر یہیں ہے　　یہی آج آوازِ خُلدِ بریں ہے

وہ دیکھو شہیدوں کی صف آرہی ہے
ملاقات کو سر بکف آرہی ہے

رشید اور امداد کا دِل ہوا خوش　　ہوئے اس سے مل کر سبھی اولیاء خوش
اسے دیکھ کر ہوگئے انبیاء خوش　　خدا سے وہ راضی ہے اُس سے خدا خوش

پیار اُس کو رُوحِ نبی کر رہی ہے
محبت کی ہر سمت جلوہ گری ہے

پئے خیر مقدم بہت سے ہیں عالم　　بڑھے ایک جانب سے محمود و قاسم
ملے ترمذی اور بخاری و مسلم　　قدم بوس آکر ہوئی روحِ حاتم

ہجومِ خلائق ہے بہرِ زیارت
نہیں اُس کو جنت میں بھی آج فرصت

◎

(از مولانا قاری فخرالدین صاحب، گیا)

حضرت مدنیؒ کی تصانیف

اگرچہ آپ کے ہزاروں شاگرد چلتی پھرتی ایسی تصانیف ہیں جن کا علمی فیض جاری رہے گا، مگر پھر بھی رسمی طرز پر آپ کی تصانیف بہت کم ہیں، جس کی وجہ ظاہر ہے کہ آپ کی ساری عمر درس و تدریس، جہادِ آزادی کے لیے جدوجہد میں گذری، تصنیف اور تالیف کے لیے جس دلجمعی کی ضرورت تھی وہ آپ کو صرف مالٹا اور ہندوستان کے جیل خانوں میں میسر آئی تھی۔ اسارتِ مالٹا میں شیخ کی خدمت کے ساتھ ساتھ ترجمۃ القرآن میں آپ کے علمی مشورے شامل ہیں مگر تالیف کوئی مستقل نہ فرماسکے، البتہ اسیرِ مالٹا سفرنامہ آپ کا مرتبہ ایک جامع اور قیمتی دستاویز ہے اسی طرح نقشِ حیات ۱۹۴۴ء کے زمانہ اسارت میں اسیرِ رفقاد کے شدید اصرار پر مرتب فرمائی جو نہ صرف علمی بلکہ سیاسی طور پر ایک بیش بہا خزانہ ہے، آپ کی چند تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ اسیرِ مالٹا ۲۔ نقشِ حیات ۲ جلد ۳۔ مکاتیب کا مجموعہ ۴ جلد ۴۔ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ باتیں (ایک رسالہ) ۵۔ مودودی دستور کی حقیقت ۶۔ عمل و عقیدہ ۷۔ شہاب المذہبین (ردِ فتنۂ بریلویت) ۸۔ نزول امام مہدی علیہ السلام (جو تاحال طبع نہ ہوسکا) ۹۔ متحدہ قومیت ۱۰۔ داڑھی کا فلسفہ ۱۱۔ ایمان و عمل۔

ترمذی شریف کی تقریر آپ کے شاگردانِ باسعادت نے اردو زبان میں شائع فرمائی، ہندوستان میں مولانا عزیز احمد قاسمی صاحب نے اور پاکستان میں شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب نور اللہ مرقدہٗ بانیٔ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نے حقائق السنن کے نام سے کئی جلدوں میں جمع فرمائی جس کی جلد اول طبع ہوچکی ہے باقی عنقریب طبع ہوں گی۔ اِن شاء اللہ

بخاری شریف کی تقریر مرتبہ مولانا نعمت اللہ اعظمی استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند جلد اول طبع ہوچکی ہے۔

خود مصنف "چراغ محمد صلی اللہ علیہ وسلم" حضرت اقدس مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی رحمہ اللہ نے بھی عربی میں تقریر ترمذی و بخاری، دورۂ حدیث شریف کے سال ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں لکھی تھی جو کہ غیر مطبوعہ ہے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے نامور تلامذہ کی

اجمالی فہرست

حضرتِ مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے تقریباً پچاس سال تدریسِ علوم خصوصاً تدریسِ علمِ حدیث سے طلباءِ کرام کو اپنے فیوض و برکات سے نوازا ہے جن کی صحیح تعداد تو اس لیے نامعلوم ہے کہ آپ کے شاگردوں کا حلقہ برِصغیر سے باہر چینی ترکستان، مشرقِ وسطیٰ، مشرقِ بعید، افریقہ وغیرہا تک وسیع ہے اور اُن سے آج تک کوئی باقاعدہ رابطہ قائم نہ ہوسکا تاہم یہ بات تو یقینی ہے کہ ۵۰ ہزار کے لگ بھگ ہوں گے۔ ہم یہاں صرف بعض اُن حضرات کا ذکر کرتے ہیں جو اپنی جگہ ایک ادارہ، ایک دار العلوم، ایک انجمن کا مقام رکھتے ہیں، ورنہ بقول محدثِ کبیر حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہند و پاک میں جس قدر دینی مدارس ہیں سب میں حضرت مدنی رحؒ کے بالواسطہ یا بلاواسطہ شاگرد کام کر رہے ہیں۔

ہندوستان

(۱) مولانا سید محمد اسعد مدنی صاحب دامت برکاتہم صدر جمعیۃ علماء ہند

(۲) مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب خلف الصدق حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ

(۳) مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب حال مہتمم دار العلوم دیوبند

(۴) مولانا سید منت اللہ رحمانی مرحوم امیرِ شریعت صوبہ بہار

(۵) مولانا قاضی سجاد حسین صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی

(۶) مولانا معراج الحق صاحب مرحوم سابق شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

(۷) مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

(۸) مولانا زین العابدین سجاد میرٹھی

(۹) مولانا رشید الدین صاحب مہتمم جامعہ قاسمیہ شاہی مسجد مراد آباد

(۱۰) مولانا محمد ابراہیم صاحب افریقی

(۱۱) مولانا نیاز محمد ترکستانی

(۱۲) مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صدر فقہی کونسل بہار

(۱۳) مولانا عبد الحق صاحب شیخ الحدیث شاہی مسجد مراد آباد

(۱۴) مولانا مسیح اللہ خان خلیفہ اجل حضرت تھانوی رح جلال آباد

(۱۵) مولانا نعمت اللہ صاحب شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

سعودی عرب

مدینہ منورہ میں قیام کے زمانہ میں آپ کے تلامذہ کی فہرست نایاب ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ آپ کے شاگردوں میں سے بہت سے تعلیم، تدریس، قضا اور انتظامی محکموں کے بڑے بڑے منصبوں پر فائز ہوئے جن میں سے کچھ وفات پا چکے ہیں (رحمۃ اللہ علیہم) اور کچھ حضرت رح کے وصال کے وقت زندہ تھے اُن میں سے،

(۱۶) مولانا عبد الحفیظ کردی رُکن مجلس کبریٰ

(۱۷) مولانا احمد بساطی نائب قاضی مدینہ منورہ

(۱۸) محمد عبد الجواد صدر بلدیہ مدینہ منورہ ——— اور

(۱۹) الجزائر کی تحریک آزادی کے مشہور مجاہد شیخ محمد بشیر ابراہیمی وغیرہم قابل ذکر ہیں۔ (ماہنامہ المنہل مکہ مکرمہ)

(۲۰) شیخ الحرمین مولانا حبیب اللہ صاحب رح ابن شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رح

پاکستان

(۲۱) شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (جن کے شاگردوں کی تعداد ساڑھے چھ ہزار ہے) آپ حضرت مدنی رح کا عکس جمیل تھے۔

(۲۲) مولانا سلیم اللہ خان صاحب صدر وفاق المدارس و شیخ الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

(۲۳) مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی سابق مفتیٔ اعظم جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

(۲۴) حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ ـــ دورِ حاضر کے امام الاولیا حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے خلف الصدق تھے، اوائلِ عمر ہی میں حضرتِ مدنیؒ کے آستانہ پر حاضری کا شرف حاصل رہا، حضرتؒ اُن نامور تلامذہ میں سے تھے جنہوں نے علمی، دینی اور روحانی امور میں اپنے گرامی قدر والد کی جانشینی کا پورا حق ادا کیا، پاکستانی سیاستِ حقہ کے روحِ رواں تھے کلمۂ حق کہنا اور باطل سے ٹکرلینی اکابر سے ورثہ میں ملی تھی، اب خُلدِ آشیاں ہیں۔

(۲۵) حضرت مولانا عبید اللہ صاحب، آپ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری قدس سرہ العزیز کے خلف الصدق اور حضرتِ مدنیؒ کے نامور تلامذہ میں سے ہیں، حضرت مفتی صاحب کی رحلت کے بعد جامعہ اشرفیہ لاہور جیسے عظیم دار العلوم کے مہتمم ہیں۔ (مدظلہم العالی)

(۲۶) مولانا محمد ایوب جان بنوری مہتمم دار العلوم سرحد پشاور

(۲۷) مولانا سید بادشاہ گل صاحب مرحوم بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک

(۲۸) مولانا عبد الحلیم صاحب زرولویؒ سابق صدر المدرسین دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

(۲۹) مولانا گل بادشاہ صاحبؒ سابق امیر جمعیۃ العلماء صوبہ سرحد و رکن مجلسِ عاملہ جمعیۃ العلماء ہند

(۳۰) مولانا عبد الکریم صاحب بانی و مہتمم دار العلوم نجم المدارس کلاچی ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان

(۳۱) مولانا عبد القدوس صاحب (مرحوم) سابق چیئرمین شعبہ اسلامیات پشاور یونیورسٹی و جسٹس وفاقی شرعی عدالت پاکستان

(۳۲) مولانا خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم شیخ الحدیث مدرسہ احمد المدارس سکندر پور (ہزارہ)

(۳۳) مولانا قاضی مظہر حسین صاحب امیر تحریک خدام اہلسنت و مہتمم دار العلوم اظہار الاسلام چکوال (پنجاب)

(۳۴) مولانا قاضی عبد اللطیف صاحب مہتمم و بانی دار العلوم تعلیم الاسلام جہلم

(۳۵) مولانا سید حامد میاں صاحب مرحوم بانی جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور

(۳۶) مولانا ضیاء الحق مرحوم سابق صدر مدرس جامعہ اشرفیہ لاہور

(۳۷) مولانا قاری محمد امین صاحب بانی و مہتمم دار العلوم عثمانیہ راولپنڈی

(۳۸) مولانا حافظ محمد امین صاحب مرحوم بانی و مہتمم مدرسہ امینیہ چک لالہ (راولپنڈی)

(۳۹) مولانا عبد الغنی صاحب (آف جلالیہ ضلع اٹک) شیخ الحدیث دار العلوم کھڈہ کراچی)
(۴۰) مولانا عرض محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دار العلوم مطلع العلوم، کوئٹہ (بلوچستان)
(۴۱) مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم مہتمم دار العلوم ٹنڈو الہ یار (سندھ)
(۴۲) مولانا سرفراز خان صاحب صفدر شیخ الحدیث نصرۃ العلوم گوجرانوالہ ـــ آپ محدّث اور مفسّر ہونے کے علاوہ مسلکِ اہلِ حق کے ترجمان ہیں۔
(۴۳) مولانا حکیم صوفی عبد الحمید صاحب سواتی ـــ آپ حضرتِ مدنی کے شاگردِ رشید دار العلوم نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے مہتمم اور مفسرِ قرآنِ عزیز ہیں۔
(۴۴) مولانا عبد الحمید ارشد ڈیروی ـــ آپ بھی حضرتِ مدنیؒ کے شاگردِ رشید اور صاحبِ تصانیف ہیں فتنہ انکارِ حدیث کے دفاع پر آپ نے قابلِ قدر تحریری خدمات سرانجام دی ہیں۔ (رحمۃ اللہ علیہ)
(۴۵) مولانا عبد السبوح پشاوری ـــ آپ بھی حضرتِ مدنیؒ سے فیضیافتہ ہیں، علومِ جدیدہ سے بہرہ ور ہیں، کئی سال جامعۃ الملک عبد العزیز جدہ (سعودی عرب) میں تعلیمی خدمات سرانجام دیتے رہے۔
(۴۶) مولانا عبد الحلیم چشتی صاحب شارح مرقاۃ
(۴۷) مولانا مفتی محمد عبد اللہ صاحب شیخ الحدیث خیر المدارس ملتان
(۴۸) استاذ القراء مولانا فتح محمد صاحب مہاجر مدنیؒ
(۴۹) مولانا حبیب اللہ فاضل رشیدیؒ شیخ الحدیث جامعہ رشیدیہ ساہیوال
(۵۰) مولانا مفتی علی محمد صاحب مہتمم و شیخ الحدیث دار العلوم کبیر والا ملتان
(۵۱) مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ بانی تحریک تنظیم اہلِ سنت والجماعت پاکستان (ملتان)
(۵۲) مولانا لطف الرحمٰن سواتی ـــ آپ حضرتِ مدنیؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے ہیں، دورۂ حدیث کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی، آجکل جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں شعبہ فقہ و قانون کے انچارج ہیں۔
(۵۳) مولانا سید احمد شاہ بخاریؒ ـــ آپ حضرت مدنیؒ کے تلمیذِ رشید تھے، فراغت کے بعد تبلیغی، اصلاحی اور تعلیمی بہت کام کیے۔ دار الہدیٰ چوکیرہ کا قیام، دار المبلغین کا قیام، ماہنامہ الفاروق کا اجراء بھی فرمایا، ۱۹۶۹ء میں وفات ہوئی۔
(۵۴) مولانا محمد یوسف خان کشمیری ـــ فراغت پر پلندری (آزاد کشمیر) کے دار العلوم میں شیخ الحدیث کی

مسند پر رونق افروز ہوئے، اپنے قابل قدر شیخ رح کی طرح سیاسیات اور مذہبی تحریکوں میں مجاہدانہ حصہ لیا۔ ڈوگرہ راج کے خلاف، تحریک ختم نبوت اور جمعیۃ العلماء کشمیر وغیرھا ملی اور سیاسی امور میں قائدانہ حصہ لیتے ہیں۔ (مد ظلہم العالی)

(۵۵) مولانا رحمت اللہ مدظلہ، مدرسہ عربیہ مؤدب چک $\frac{17}{D.N.B}$ ڈاکخانہ ہیڈراز قان ریاست بہاولپور
آپ نے ۴۷-۱۹۴۶ء میں حضرت مدنی رح سے دورۂ حدیث پڑھا آپ کو حضرت مدنی رح نے خلافت سے بھی نوازا۔

(۵۶) مولانا محمد زکریا صاحب بلاک ۱۰ فیڈرل ایریا کراچی
آپ نے ۱۹۵۸ء میں حضرت مدنی رح سے دورۂ حدیث پڑھا، آپ کو حضرت مدنی رح کے غسل میں شرکت کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

(۵۷) مولانا محمد محی الدین صاحب گارڈن ٹاؤن لاہور
آپ نے ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء میں حضرت مدنی رح سے دورۂ حدیث پڑھا۔

بنگلہ دیش

(۵۸) مولانا سراج الحق صاحب شیخ الحدیث موضع پران گاؤں ڈاکخانہ کلیر بھنگا ضلع سلہٹ
آپ کو حضرت مدنی رح نے خلافت سے بھی نوازا۔

ایران

(۵۹) مولانا عبدالعزیز بن سید محمد صادق ساداتی دارالعلوم زنگیان، سراوان، ایران
آپ نے ۱۳۶۶ھ میں حضرت مدنی رح سے دورۂ حدیث شریف پڑھا۔

خلفاءِ طریقت کے اسماءِ گرامی

ویسے تو حضرت مدنیؒ سے بلا مبالغہ لاکھوں سعادتمند بیعت ہوئے اور ان کے عقائد، اعمال، اخلاق شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں اصلاح پذیر ہوئے مگر جن سعادتمندوں نے احسان وسلوک کی وہ تمام منازل جو بزرگانِ طریقت نے قرآن وحدیث کی روشنی میں متعین فرمائے ہیں اُن کو اپنی محنت اور ریاضت سے طے کر لیا تھا اور وہ مرتبۂ احسان پر فائز ہو چکے تھے اُن کو حضرتؒ نے اِس امر کا مجاز فرمایا تھا کہ وہ اس طریقۂ عالیہ کی اشاعت فرمائیں اور طالبانِ ہدایت کو بیعت کریں، اُنکی فہرست درج ذیل ہے:۔

چونکہ بنگال میں حضرتؒ کے دو ماہ پورے تبتّل[1] کے ساتھ گذرتے تھے اس لیے وہاں کے سعادتمندوں نے حضرتؒ سے بہت زیادہ اکتساب فیض کیا اس لیے اُن کی تعداد زیادہ ہے۔

نمبر شمار	اسماءِ گرامی خلفاء مجازین	نمبر شمار	اسماءِ گرامی خلفاء مجازین
	حال بنگلہ دیش	۵	مولوی مقدس علی صاحب محلہ شیخ ضلع سلہٹ
۱	مولوی تخلیص حسین صاحبؒ 〃 سید پور ضلع سلہٹ	۶	مولوی سید عبد الخالق صاحبؒ سید پور 〃
۲	حاجی عبد الباری صاحب جھنگا باڑی 〃	۷	ڈاکٹر علی اصغر نوری صاحب غفر گاؤں 〃
۳	حاجی ابرو میاں صاحب تال باڑی 〃	۸	مولوی حبیب الرحمٰن صاحب رائے پور 〃
۴	مولانا بشیر احمد صاحب باگا 〃	۹	سلیمان لقا خاں صاحب مولوی بازاری 〃
		۱۰	مولوی عبد الرحیم صاحب چری پاڑہ 〃

[1] تبتّل کا مفہوم یہ ہے کہ سارے کاموں سے فارغ ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کی یاد میں محو ہو جائے، جیسا کہ سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا
وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ہ (المزمّل ۸)

نمبر شمار	اسمائے گرامی خلفاء مجازین
۱۱	مولوی مجاہد علی صاحب گنگا جل ضلع سلہٹ
۱۲	مولوی عبدالمتین صاحب چوہدری پھول باڑی 〃
۱۳	مولوی عبدالرحمٰن صاحب دھولیا 〃
۱۴	مولانا تجمل علی صاحب آنگور احمد پور 〃
۱۵	مولوی علاؤالدین صاحب بنیا چنگ 〃
۱۶	مولوی عبدالمنان صاحب اٹھالیا 〃
۱۷	مولوی عبداللطیف صاحب، نائی ہوری 〃
۱۸	مولوی سراج الحق صاحب، پُران گاؤں 〃
۱۹	مولوی عبدالحق صاحب، غازی نگر 〃
۲۰	مولوی عبدالمومن صاحب، پُران گاؤں 〃
۲۱	مولوی یونس علی صاحب، رائے گڈھ 〃
۲۲	مولوی عبدالمنان صاحب، گنوئی 〃
۲۳	مولوی عبدالغفار صاحب، احمر دخانی 〃
۲۴	مولوی محمد علی صاحب، بلرام پور 〃
۲۵	مولوی ریاض الرب صاحب، ڈھاکہ دکھن 〃
۲۶	مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ، پوڑ کھائی 〃
۲۷	مولانا حسن علی صاحبؒ، گورٹن گھاٹ 〃
۲۸	مولانا لطف الرحمٰن صاحب، حامد نگر 〃
۲۹	مولانا حافظ عبدالکریم صاحب، اسلام آباد 〃
۳۰	مولانا بدر عالم صاحب، مغل بازار، مدرسہ 〃
۳۱	مولانا مسعود الحق صاحب، پٹیا ضلع چاٹگام
۳۲	مولانا مفتی احمد الحق صاحب، مدرسہ معین الاسلام 〃
۳۳	مولوی عبدالستار صاحب، فتح پور ضلع چاٹگام
۳۴	مولوی احمد شفیع صاحب، مدرسہ معین الاسلام 〃
۳۵	مولوی عبیدالرحمٰن صاحب، امام نگر 〃
۳۶	مولوی عبدالرحمٰن صاحب، گیچی 〃
۳۷	مولوی محمد نعمان صاحب، اندھرپاہ 〃
۳۸	مولوی محمد ادریس صاحب، سارنگ سنتوش پور 〃
۳۹	مولوی عبدالحلیم صاحب، پیر کھن 〃
۴۰	مولوی شمس الدین صاحب، کنچن نگر 〃
۴۱	مولوی عبدالغنی صاحب، ضلع پابنہ
۴۲	مولوی ریحان الدین صاحب، فرید پور ضلع نواکھالی
۴۳	مولانا دلاور حسین صاحب چاندپوری، فینی 〃
۴۴	مولوی عزیز الحق صاحب، عدیل پور 〃
۴۵	مولوی کلیم اللہ صاحب، ننگل پور ضلع پٹرہ
۴۶	مولوی محب الرحمٰن صاحب، فینوا 〃
۴۷	مولوی اشرف علی صاحب، سیرام پور 〃
۴۸	مولانا امین الحق صاحب میمن سنگی، محلہ لال باغ ڈھاکہ
۴۹	مولوی محمد یونس صاحب باقر گنجی، چرخلیفہ ضلع باقر گنج
۵۰	حافظ طیب علی صاحبؒ
۵۱	مولوی عبدالواحد صاحب، ملا گرام ضلع کچھاڑ
۵۲	مولوی سعید علی صاحب، امام مسجد درگاہ بٹرشی 〃
۵۳	مولانا مقدس علی صاحب، موضع بوڑی باٹل 〃
۵۴	مولانا عبدالجلیل صاحب، بدر پور 〃

نمبر شمار	اسماء گرامی خلفاء مجازین
۵۵	مولانا مصدر علی صاحب، دارالعلوم بانسکندی ضلع کچھاڑ
۵۶	مولوی بشارت علی صاحب، 〃 〃
۵۷	مولانا احمد علی صاحب، 〃 〃
۵۸	مقبول علی صاحب، 〃 〃
۵۹	ماسٹر غلام احمد صاحب، 〃 〃
۶۰	مولوی معین الدین صاحب، 〃 〃
۶۱	مولوی جواد علی صاحب، 〃 〃
۶۲	ہرمز علی صاحب، تاراپور 〃
۶۳	حافظ محمد مستقیم صاحب، محلہ بیرنگا سلچر 〃
۶۴	حافظ اکرم علی صاحبؒ، بانسکندی 〃
۶۵	حافظ شفیق الرحمٰن صاحب، 〃 〃
۶۶	مولوی محمد اسمٰعیل صاحب، جلال پور 〃
۶۷	مولوی قاری عبدالمطہر صاحب، بھگاڈڑ 〃
۶۸	مولوی قاری عبدالصمد صاحب، بوڑی باٹل 〃
۶۹	مولوی عبدالمصور صاحب، مہاقل 〃
۷۰	مولوی معتصم علی صاحب، محمد پور 〃
۷۱	مولوی مظفر علی صاحب، اسگاپور 〃
۷۲	مولوی عبدالحق صاحب، محمد پور 〃
۷۳	مولوی عبدالحق صاحب عاصم گنجی، سات گھری 〃
۷۴	حافظ عبدالنور صاحب کریم گنجی، گندرنجسانی 〃
۷۵	مولوی جلال الدین صاحب، کھودراکندی 〃
۷۶	حافظ عبدالرحیم صاحب، ملاگرام 〃

نمبر شمار	اسماء گرامی خلفاء مجازین
۷۷	محمد نجابت علی صاحب، کھدراکندی ضلع کچھاڑ
۷۸	حاجی عبدالمالک صاحب، بٹرشی 〃
۷۹	حاجی شمس الحق صاحب، 〃 〃
۸۰	حاجی محبت علی صاحب، سوناباری گھاٹ 〃
۸۱	مولوی رحیم الدین صاحب، بانسکندی 〃
۸۲	مولوی محسن علی صاحب، 〃 〃
۸۳	فرمان علی صاحب، 〃 〃
۸۴	مولوی اصد علی صاحب، ردپائی بالی 〃
۸۵	مولوی عبدالرزاق صاحب، انگاپور 〃
۸۶	مولوی منذر علی صاحب، تاراپور 〃
۸۷	مولوی امان اللہ صاحبؒ کریم گنجی، شومڑی کنڈی 〃
۸۸	مولوی کریم الدین صاحب، بانسکندی 〃
۸۹	موی سعید احمد صاحب، رنگ پور 〃
۹۰	مولوی عبدالباری صاحب، نیتائی نگر 〃
۹۱	مولوی محمد اسحٰق صاحب، گڈی ماری 〃
۹۲	مولوی ضمیر الدین صاحب، ڈھوبری ضلع گوالپاڑہ
	بھارت (صوبہ بہار)
۹۳	مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحبؒ، مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ
۹۴	اطہر حسین صاحب، پورائن ضلع بھاگلپور
۹۵	حاجی محمد ایوب صاحب، چیلمل 〃
۹۶	خلیل الرحمٰن صاحب، 〃 〃

نمبر شمار	اسماء گرامی خلفاء مجازین
۹۷	مولوی محمد یعقوب صاحب، موضع بُھورا ضلع بھاگل پور
۹۸	اشرف علی صاحب ، عظمت پور ״
۹۹	عبدالرحمٰن صاحب ، ״ ״
۱۰۰	حاجی مظہر الحق صاحب، سمریا ״
۱۰۱	مولوی محمد انور صاحب، کیتھاٹیکر ״
۱۰۲	حکیم فدا حسین صاحب، سمریا ״
۱۰۳	مولانا عبدالسلام صاحب، کوروڈیہہ ״
۱۰۴	حاجی احمد حسن صاحب، سنہولی ״
۱۰۵	مولانا قاری فخرالدین صاحب، جامعہ قاسمیہ شہر گیا
۱۰۶	مولانا بشیر حسن صاحب، کوڈرٹی ضلع گیا
۱۰۷	حاجی منہاج الدین صاحب، دھامی ٹولہ شہر گیا
۱۰۸	مولوی عبداللہ صاحب چھپروی، مانجھا اسٹیٹ ضلع سارن
۱۰۹	حاجی محمد عاقل صاحب، بلاسپور، ضلع دربھنگہ
۱۱۰	مولوی محمد ازہر صاحب، رتھوس ״
۱۱۱	مولوی عبدالرشید صاحب، مبارکپور ضلع مونگیر
۱۱۲	قاری مہدی بخاری صاحب، جامع مسجد شہر مونگیر
۱۱۳	مولوی ادریس صاحب، نوکٹہ ضلع پورنیہ
۱۱۴	مولوی اظہر صاحب اورنگ آبادی حال برواڈیہہ ضلع ہزاری باغ
۱۱۵	مولانا نعیم اللہ صاحب ، بھوسے پور، ضلع فیض آباد (یوپی)
۱۱۶	مولوی عبدالجبار صاحب، ہنسور ״
۱۱۷	مولوی حافظ محمد طیب صاحب (نابینا) قصبہ بھدرسہ ״
۱۱۸	مولوی فیض اللہ صاحب گونڈوی، مدرسہ احمدیہ شہر فیض آباد
۱۱۹	مولانا اویس صاحب ، نگرام ضلع لکھنؤ
۱۲۰	مولانا محمد یونس صاحب، بگھرہ ضلع مظفر نگر
۱۲۱	حافظ عبداللطیف صاحب، گڑھی پختہ ״
۱۲۲	حکیم محمد سلیمان صاحب، نولی ضلع غازی پور
۱۲۳	مولانا قاری اصغر علی صاحب، مدنی منزل دارالعلوم دیوبند
۱۲۴	مولانا سید محمود حسن صاحب، پٹھیڑ کلاں ضلع سہارنپور
۱۲۵	مولوی ہدایت علی صاحب، کرہی ضلع بستی
۱۲۶	مولوی قطب اللہ صاحب، جھکھیا ״
۱۲۷	مولوی سید محمد احمد صاحب، نگینہ ضلع بجنور
۱۲۸	مولوی عزیز الرحمٰن صاحب مہتمم یتیم خانہ شہر بجنور
۱۲۹	مولوی سید احمد شاہ صاحب مرادآبادی، انٹر کالج ״
۱۳۰	مولوی عبدالحئی صاحب، انجان شہید ضلع اعظم گڈھ
۱۳۱	مولوی صفات اللہ صاحب، بلاقی پورہ ״
۱۳۲	مولوی مشتاق احمد صاحب، قاضی دلموں پورہ ״
۱۳۳	حاجی محمد احمد صاحب ، مہگاؤں ضلع الہ آباد
۱۳۴	کریم بخش صاحب ، گلی کرنیل گنج ، شہر کان پور
۱۳۵	مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی، امروہہ ضلع مرادآباد
۱۳۶	مولوی محمود احمد صاحب ، حسن پور ״
۱۳۷	مولانا احمد اللہ صاحب، برن پور (صوبہ مغربی بنگال) ضلع بردوان
۱۳۸	مولوی عبدالخالق صاحب، شانتی باغ ״
۱۳۹	غلام محی الدین صاحب ، رحمت نگر ״
۱۴۰	مولوی عبداللہ صاحب، کوارٹر ۳۲ لائن ۵۷ ״

نمبر شمار	اسماء گرامی خلفاء مجازین
۱۴۱	مولانا محمد طاہر صاحب کریم گنجی مدرسہ عالیہ شہر کلکتہ
۱۴۲	حافظ عبد اللطیف صاحب (نابینا)، بیجناتھ پور، ضلع رنگپور ([illegible] دیش)
۱۴۳	جناب سی بشیر احمد صاحب، پرنام بٹ، ضلع شمالی ارکاٹ ״
۱۴۴	مولانا شیخ حسن صاحب مالاباری ״ ״
۱۴۵	مولانا نیاز محمد صاحب، قصبہ نوح ضلع گوڑگاؤں (مشرقی پنجاب)
۱۴۶	مولوی جمیل احمد صاحب ״ ״
۱۴۷	میاں جی محمد رمضان صاحب، مالیب ״
۱۴۸	جناب مفتی اللہ دیہ صاحب، تبلیغی مرکز نظام الدین نئی دہلی (دہلی)
۱۴۹	قاری عبد الشکور صاحب سہنس پوری، حوض والی مسجد ״
۱۵۰	مولانا احمد بزرگ صاحب، سملک، ضلع سورت (بمبئی)
۱۵۱	مولانا عبد الصبور صاحب کاچھوی رح ״
۱۵۲	مولانا عبد الصمد صاحب، وانکانیر ״
۱۵۳	مولانا عبد الغفور صاحب قریشی مدرسہ فرقانیہ شہر عثمان آباد
۱۵۴	سید سلیمان شاہ صاحب قادری ״
۱۵۵	سید بدیع الدین صاحب ضلع عثمان آباد
۱۵۶	مولانا عبد الحکیم صاحب ״
۱۵۷	سید طالب علی صاحب، شاستنور ״
۱۵۸	مولوی عبد الصمد صاحب شاستور ضلع عثمان آباد

نمبر شمار	اسماء گرامی خلفاء مجازین
۱۵۹	قطب دکن مولانا عبد الغفور صاحب مہتمم مدرسہ قاسم العلوم و بانی خانقاہ چشتیہ صابریہ رحمت نگر حیدرآباد دکن [1]
	پاکستان
۱۶۰	مولوی نور رشید احمد صاحب، عبد الحکیم، ضلع ملتان
۱۶۱	مولوی حامد میاں صاحب رح، مسلم مسجد چوک انارکلی لاہور
۱۶۲	مولانا حکیم عبد الحکیم صاحب، فیض باغ لاہور
۱۶۳	مولوی مظہر حسین صاحب، بمقام بھیں ضلع چکوال
۱۶۴	مولوی رحمت اللہ صاحب، چک 17/D.N.B ریاست بہاولپور
۱۶۵	مولوی عبد الحق صاحب دامانی، شیرو کہنہ ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان
	برما
۱۶۶	مولوی مظفر احمد صاحب، موضع ملینگزی، ضلع اکیاب
	جنوبی افریقہ
۱۶۷	مولانا بایزید صاحب شہید، رسٹن برگ، ٹرانسوال
۱۶۸	صاحبزادۂ محترم مولانا محمد اسعد صاحب مدنی زید مجدہم مدنی منزل دیوبند

(اخبار الجمعیۃ دہلی شیخ الاسلام نمبر بابت ۲۵ رجب ۱۳۷۷ھ / ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء جلد ۴۳ ص ۱۰۹)

[1] از ماہنامہ دار العلوم دیوبند ستمبر ۱۹۹۶ء

شیخ الاسلامؒ سے برزخ میں ایک مکالمہ

از صاحبزادہ مولانا سید محمد انظر شاہ مدرس دارالعلوم دیوبند خلف الصدق حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری نوراللہ مرقدہٗ

جناب سید محمد انظر شاہ صاحب کے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں تاثرات ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں، آپ نے فرمایا۔

"امام المسلمین، امیر المؤمنین فی الحدیث، پیکرِ شجاعت، مجسمۂ عبادت، قافلۂ زہد و قناعت، فرنگی اقتدار کے لیے موت کا سناٹا، غیر ملکی استبداد کے لیے قیامتِ کبریٰ، جس کا دن قال اللہ و قال الرسول سے معروف، اوائل شب مہمانوں کی خدمت میں، انتہاء شب بحضور رب العالمین، سپیدۂ سحری انہیں مصروفِ بکاء پاتا، آفتاب کی کرنیں طلوع کے لیے بے تاب ہوتیں تو وہ خانۂ خدا میں سجدہ ریز، جمعیۃ العلماء ہند کے صدر، دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین، ہندوستان کی متعدد جیلیں اس وجودِ مقدس سے نکلے ہوئے کلمۂ ہو و حق کی امین، مہمان نوازی میں اسوۂ ابراہیم پر مستقیم، اعلاء کلمۃ الحق میں جلالِ فاروقی کے مظہر، مدتوں سکونت و اقامت مدینہ منورہ رہی اس زمین پاک سے عربی طور و طریق اور اخلاق نبوی کے حامل بن کر چمکے تو ظلمت کدۂ ہند میں نورِ سنت کی ضوفگنی ان کے عصر میں ان کے حصہ میں آئی، فرنگی اقتدار سے نفرت و وحشت اکابر نے ان کے آتش دان سینہ میں منتقل کر دی پھر وہ خود ہی فرنگیوں کے خلاف کوہِ آتش بن گئے، ۱۹۴۷ء میں جب وہ شباب سے نکل شیب میں داخل ہوئے تو یورپ کے اقتدار کا آفتاب نیم روز ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ اس طرح وہ اُن خوش بخت لوگوں میں تھے جنہوں نے اپنی جہد کی کامیابی اپنی زندگی ہی میں دیکھ لی"۔ (مکمل تاریخ دارالعلوم دیوبند ۱۹۸)

چلنے والے کے قدم "دار الحدیث" کی مقدس درسگاہ کے قریب پہنچ کر اچانک رک گئے اور نگاہیں در و دیوار سے گذر کر اس مسندِ علم و فضل پر جم گئیں جہاں بیٹھ کر ربع صدی تک عرب و عجم کے شیخ نے علم و فضل کے موتی لٹائے تھے، معرفت و سلوک کے دریا بہائے تھے، یہ وہی مسند ہے جس پر عربی لباس میں ملبوس ایک نورِ مجسم قال اللہ وقال الرسول کو عربی لب و لہجہ میں شروع کرتا تھا تو اس کی وجد آفریں آواز پر در و دیوار ہمہ تن گوش بن جاتے، قدوسیوں کے ہجوم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سننے کے لیے آسمان سے اتر آتے، یہ وہی جگہ ہے

جہاں پر اپنے خدا کا ایک مقدّس بندہ زُہد و توکّل، عفاف و غنا، تورع و تقوی کی ایک متحرک تصویر بن کر سامنے آتا جس کے فرق سے تا بقدم اتباعِ شریعت کے ثبوت بہم پہنچتے، اور جس کی زندگی کا ہر گوشہ شریعت مصطفوی کا نکتہ شناس اور رازداں نظر آتا، وہ تلامذہ کے ہجوم میں خرام ناز کرتا ہوا یہاں سے چل کر آتا، وہ علم و کمال کا کوہِ گراں سُبک گامی کرتا ہوا یہاں سے نکلتا، وہ چل کر آتا تو مشامِ جاں اس کی عطر بیزیوں سے معطّر ہو جاتے، وہ جدھر سے نکل جاتا تو عود و عطر کے جھونکے دل و دماغ کو راحت دیتے ہوئے گذر جاتے۔ غرضیکہ نگاہوں میں ایک ایک منظر گھوم رہا تھا اور دماغ کے تمام گوشوں میں مرحوم کی یاد تازہ ہو رہی تھی، چلنے والے تے استغراق کے عالم میں اپنے قدم آگے بڑھائے لیکن رنج و غم کی کلفتیں بھی اس کے ساتھ ہولیں، تمام رات فرش و بالیں پر اضطراب سے کروٹیں لیا کیں، ہر تار بستر، خار بستر ثابت ہوا، وہی تصوّر، اسی کی یاد، خیالات کے ہجوم، افکار کے بادل سر پر منڈلاتے رہے، صبح کی آمد آمد ہے، رات اپنی تاریکیوں کے ساتھ رخصت ہوا جاہتی ہے، باہر نکل کر دیکھا تو اُفقِ عالم پر چاند اپنی پھیکی روشنی کے ساتھ زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے، ستاروں کا ہجوم غمگساری کے لیے موجود ہے لیکن نور کے یہ ٹمٹماتے ہوئے چراغ بھی بڑھ کر خاموش ہو رہے ہیں، انسانوں کی بستی سے بہت دُور کنارۂ عالم پر صبح کی سپیدی تیزی کے ساتھ پھیلنا شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے منوّر صبح کے ہنگاموں سے ساری کائنات لبریز ہو گئی، یہ طائرانِ خوش آواز کے ہجوم ہیں جو آشیانوں سے نکل رہے ہیں، یہ نسیم سحری کے دلنواز جھونکے ہیں جو فضا کو معطّر کرنے کے لیے پوری قوت سے دوڑ رہے ہیں، ہر طرف زندگی رقصاں نظر آتی ہے اور ہر سُو ایک نئی حیات تمام ولولوں کے ساتھ اُچھلتی پھر رہی ہے لیکن کائنات کے ان ہنگاموں میں اور قدرت کی ان تمام چارہ سازیوں سے اس الم رسیدہ کی کوئی تسلّی نہ ہو سکی جس نے رات کی گھڑیاں ایک مقدّس انسان کی یاد میں گذاری تھیں وہ بستر سے اُٹھا، لڑکھڑاتا ہوا سوئے گورِ غریباں چل دیا، انسانوں کی اس خاموش آبادی میں پہنچکر اچانک اس کے قدم ٹھہر گئے اور اس بُقعہ نور کی ضیاء پاشیوں نے تھوڑی دیر کے لیے اس کو اپنی طرف متوجّہ کر لیا کہ خدایا یہ کون سی جگہ ہے جس کے حسین مناظر، خوشگوار ہوائیں، پھولوں سے لدے ہوئے درخت، گل و ریحان سے لبریز کیاریاں جنّت کے باغات کا منظر پیش کر رہے ہیں، یہ سوچتا ہوا باغ کی رُوپہلی جدولوں اور مرمریں روشوں سے گذر کر کھڑا ہوتے والا جب سامنے آکر کھڑا ہوا تو چند نورانی چہرے، جن کے نورانی اجسام پر پاکیزگی بکھری ہوئی نظر آتی تھی، جن کے بشروں پر مسرت و فرحت کی چمک رقصاں دکھائی دیتی تھی، کوئی مصحف در بغل، کوئی تسبیح در دست، کوئی مصروف ذکر جلی تو کوئی استغراق کی کیفیت میں ڈوبا ہوا نظر آیا، یہ مناجات کر رہا ہے، وہ مشاہدۂ حق میں گم ہے، یہاں اللہ، ہُوَ القادر کے نعرے ہیں تو وہاں ہُو حق کی مترنم آوازیں ہیں۔ غرضیکہ ایک نیا منظر، ایک نئی دُنیا نگاہوں کے سامنے ہے ع

ع ایں کہ می بینم بیدار یست یارب یا بخواب

اِن نورانی چہروں میں ایک مانوس شکل نظر آئی، نگاہوں نے تجسس کیا تو وہی پیکرِ حسن جلوہ گر نظر آیا جس کو آنکھیں تلاش کرتی تھیں، جس کو نگاہیں ڈھونڈتی تھیں، وہی تر و تازہ جسم، وہی منور شکل و صورت، چہرہ و بشرہ پر کچھ خاص چمک، نئی رونق، مستزاد، بڑھ کر پوری نیازمندیوں کے ساتھ کہنے والے نے کہا کہ السلام علیکم یا اھل القبور یغفر اللہ لنا ولکم انتم سلفنا و نحن بالاثر، قدوسیوں کے ہجوم نے جواب دیا۔ اس عالم میں یہ دیکھ کر کہ میری آواز کو سب سن رہے ہیں، خیال ہوا کہ آخر کیوں نہ ان سے پوچھ لیا جائے کہ سلام کرنے والے کو پہچانتے بھی ہیں یا نہیں؟ گفتگو کا یہ سلسلہ اسی نورِ مجسم سے شروع ہوا جو میرے مقصود اور متجسس نگاہوں کا مرکز تھا، میں نے آگے بڑھ کر کہا کہ اے عرب و عجم کے شیخ کیا آپ نے مجھ کو پہچانا؟

نورِ سرور کی اس متحرک تصویر نے جواب دیا ہاں کیوں نہیں! اس عالم میں ہم اُن سب کو پہچانتے ہیں جن سے دنیا میں تعارف اور شناسائی تھی۔

شیخؒ نے اپنی عادت کے مطابق یہاں بھی حدیث سے استشہاد کرتے ہوئے فرمایا کہ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد تو سنا ہی ہوگا کہ:۔

"جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی قبر پر گذرتا ہے جس کو دنیا میں پہچانتا تھا، اور اس کو سلام کرتا ہے تو مُردہ اس کو پہچانتا بھی ہے اور سلام کا جواب بھی دیتا ہے" ——— (رواہ ابن عبد البر)

مَیں نے عرض کیا کہ ٹھیک ہے لیکن یہ تو بتائیے کہ یہ چند نورانی اجسام جو سرور و فرحت کے پتلے، نورِ ایمان کی شمعیں نظر آتی ہیں، کون ہیں؟

میرے اس سوال پر اب اس خدا رسیدہ انسان نے ایک ایک کا تعارف یوں شروع کیا کہ دیکھو سامنے یہ ایک بزرگ جن کے شباب پر کہولت کے آثار ہیں، جن کا لباس نورانی اور جن کا چہرہ انوار و تجلیات کا مرکز نظر آتا ہے، مولانا محمد قاسم صاحبؒ ہیں، جو عمر بھر جاء الحق وزھق الباطل کی زندہ تفسیر بنے رہے آج یہ اپنی منزل پر پہنچ چکے ہیں اور منزل پر پہنچنے کے بعد راحت و آرام سے ہمکنار ہیں، ان کی زندگی میں جو جدوجہد تھی اس کے صلے صبح و شام لیتے لیتے یہ تھکے جاتے ہیں تم نے ان کے متعلق بہت کچھ سنا ہوگا اس لیے ان کا یہ مختصر تعارف کافی ہے۔

ان کی بغل میں جو ایک بوڑھے نظر آ رہے ہیں یہ وہی ہیں جن کے بڑھاپے میں شباب مچل رہا تھا اور جن کی انقلابی طاقتوں سے عالم کا عالم لرزتا تھا، یجاھدون فی سبیل اللہ والی جماعت انہیں کی قیادت میں کام کرتی تھی، یہ آج اس تصور سے خوش ہیں کہ ہندوستان آزاد ہے، پاکستان آزاد ہے، انڈونیشیا آزاد ہے، ملایا آزاد ہے اور مشرقِ وسطیٰ آزادی کے لیے مچل رہا ہے لیکن ابھی ان کا خواب ادھورا ہے، ان کے خواب کی تعبیر

کے لیے تم کو کچھ اور سہانی صبحوں کا انتظار کرنا ہوگا۔ تم نے جان لیا ہوگا کہ یہ آقاؤ مولانا محمود حسن ہیں جن کے لیے ہم سب نے "شیخ الهند" کا تعظیمی خطاب تجویز کیا تھا۔ یہ اس جانب میں سادگی کا پیکر، تقویٰ و تورّع کی نشانی، انسانیت کی تصویر، علم و عمل کی محراب جو تم کو نظر آرہی ہے قطب عالم مولانا عزیز الرحمٰن ہیں جو تفقہ فی الدین کی عظمتوں سے مالا مال تھے، آج بھی یہ اپنے میں گم ہیں اور یہاں بھی اخفائے احوال کی انہیں کوششوں میں لگے ہوئے ہیں اس لیے ہم ان کو پہچانتے ہیں لیکن پھر بھی نہیں جانتے۔

اسی دوران میں ابدی آرام گاہوں کے ایک کونہ سے ایک عجیب و غریب شکل سامنے آتی ہوئی دکھائی دی، منحنی جسم، دُبلا پتلا انسان، ہاتھ میں ایک بڑی تسبیح، جس کے دانے ایک دوسرے پر گرتے تو قدسیوں کے کان کھڑے ہو جاتے، اس شخص کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی اور اس کی ہر ہر ادا سے ارادوں کی بلندی نمایاں معلوم ہوتی، یہ شخص کوششوں کی کامیابی کا ثبوت نظر آتا تھا۔

میں نے گھبرا کر دریافت کیا کہ یہ سامنے سے آنے والے کون ہیں؟ شیخ نے فرمایا کہ یہ وہی ہیں جن کے ناخنِ تدبیر کی گرہ کشائیوں کو دیکھ کر وانزلنا الحدید فیہ باس شدید کا منظر سامنے آتا تھا یعنی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی۔ اور دیکھو یہ ایک چہرہ جس پر علم کا وقار، عفت و پاکبازی کی رونق، ایمان کا نور، انجام کا سرور نظر آرہا ہے جن کی عینک کے پیچھے سے دو بڑی بڑی آنکھیں جھانک کر آج دار العلوم اور اپنے ہزاروں شاگردوں کی علمی ترقیوں کا جائزہ لے رہی ہیں، حضرت مولانا اعزاز علی ہیں، یہ تمہارے مربّی اور محسن ہیں تم نے ان کو خوب پہچان لیا ہوگا۔

میری اس گفتگو کے درمیان جو بہت سے متحرک اجسام وہاں آکر جمع ہو گئے تھے اُن میں اِن دو چار ہی نمایاں اشخاص کے متعلق دریافت کر کے میں نے بات بدلتے ہوئے کہا کہ دُنیا میں آپ نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو اپنی آنکھوں سے تو دیکھا نہیں تھا پھر یہاں کیسے پہچانا؟ کیا مُردے ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں؟ مقدس انسان نے میرے اس سوال کے جواب میں کہا کہ ہاں ہم ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں، اور شیخ نے پھر اس موقع پر یہ حدیث مجھ کو سنائی کہ،

"اُمّ بشر بن البراء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ کیا مُردے آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: اری خاک میں ملی! اروح مطمئنہ جنت میں سبز پرندوں کے قالب میں ہوتی ہے، سو اگر پرندے درختوں کی ڈالیوں میں ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں (اور ظاہر ہے کہ پہچانتے ہیں) تو وہ ارواح بھی ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔" (اخرجه ابن سعد)

میں نے دریافت کیا کہ کیا آپ جب یہاں آئے تھے تو اُسی وقت ان سب سے ملاقات ہوئی یا کچھ عرصہ کے بعد؟ شیخ نے کہا کہ یہ سب اُسی وقت جمع ہو گئے تھے۔ اور یہاں بھی شیخ نے یہ کہہ کر ایک حدیث پیش کی جس کا حاصل یہ تھا کہ:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مومن کی رُوح قبض کی جاتی ہے تو خدا کے مرحوم بندے اِس طرح آگے بڑھ کر اُس سے ملتے ہیں جس طرح دنیا میں کسی خوشخبری لانے والے سے ملتے ہیں"

(اخرجہ ابن ابی الدنیا)

اب مَیں نے پوچھا کہ اے مقدس پیکر! اپنے اس ظاہری جسم کو دفن کرنے کے لیے خاص اس موقع کا انتخاب آپ نے فرمایا یا اس میں کوئی لطیفۂ قدرت ہے؟

اِس سوال کے جواب میں تھوڑی دیر کے لیے شیخ چپ ہو گئے، اور کچھ سوچ کر فرمایا کہ فیصلہ تو قدرتی ہی ہے لیکن میرا بھی رجحان ادھر ہی تھا۔

مَیں نے عرض کیا کہ کیا پاکیزہ ارواح کے لیے تو جگہ جگہ کے قبرستان بھی تمنا کرتے ہوں گے؟ شیخؒ نے فرمایا کہ ہاں تمہارا خیال ٹھیک ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:۔

"جب مومن مرتا ہے تو تمام مواقع قبر اس کے مرنے پر اپنی آرائش کرتے ہیں ان میں کوئی حصہ ایسا نہیں ہوتا جو اس بات کی تمنا نہ کرتا ہو کہ وہ اس میں مدفون ہو" (رواہ ابن عدی)

اَب مَیں نے یہ بھی سوال کر لیا کہ جس روز ہم بدقسمت آپ کے جنازے کو گریاں و بریاں اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے آرہے تھے، انسانوں کا ہجوم تو وہ تھا کہ جس کا نہ شمار اور نہ حساب! لیکن یہ تو بتائیے کہ کیا آپ کے جنازے کے ساتھ کوئی اور بھی مخلوق تھی؟

مولاناؒ نے فرمایا کہ فرشتوں کا ہجوم ساتھ ساتھ چلا آتا تھا جن کو تم نہیں دیکھ پاتے تھے لیکن مَیں خوب دیکھ رہا تھا۔ تم نے یہ حدیث تو ضرور پڑھی ہو گی کہ:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک روز حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خداوند تعالیٰ سے عرض کیا کہ بارِ الٰہا! جو لوگ جنازے کے ساتھ چلتے ہیں اُن کی اِس عبادت کا تیرے یہاں کیا اجر ہے؟ ارشاد ہُوا کہ اس کا صلہ یہ ہے کہ میرے فرشتے اس کے جنازے کے ساتھ چلیں گے اس کے لیے دُعا کریں گے" (اخرجہ ابن العساکر)

اب گھبرا کر مَیں نے دریافت کیا مولانا! دفن کرنے کے بعد تنگیٔ قبر کی تو کہیئے، اس کے تصوّر سے تو جان نکلی جاتی ہے؟ میرے اس سوال پر روحانیوں کا امام ہنس پڑا اور فرمایا کہ:۔

"مومن کے حق میں تو قبر کا دبانا ایسا راحت بخش ہے جیسے مشفق ماں سے اس کا بیٹا دردِ سر کی شکایت کرے تو ماں اس کا سر نرم نرم دبائے" (اخرجہ البیہقی)

مَیں نے یہ بھی پوچھا کہ دُنیا کی زندگی میں تو عقیدتمندوں کا ہجوم آپ کے چہار جانب رہتا تھا، یہاں کی

تنہائی میں آپ کی طبیعت کیا گھبراتی ہے؟ اس قبر میں آخر آپ کے ساتھ کون ہے؟ مونس و غمگسار ہیں یا نہیں؟

مولانا فرمانے لگے کہ ہاں تمہارے داغ نے تو حسرت و ارمان کو اپنا مونس بنایا تھا، تم نے اس کا وہ مشہور شعر ضرور سنا ہوگا کہ ؎

قبر میں حسرت و ارمان غنیمت ہیں اے داغ   رفتہ رفتہ انہیں یاروں سے بہل جاؤں گا

لیکن علماء کے لیے ان کا علم مونس و دمساز ہوتا ہے، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:۔

"جب عالم مرجاتا ہے تو اللہ اس کے علم کی ایک صورت بنا دیتا ہے وہ قیامت تک اس کی انیس رہتی ہے اور کیڑے مکوڑوں کو اس سے ہٹاتی ہے"۔ (اخرجہ الدیلمی)

میں سوال کر رہا تھا اور ادھر شیخ پوری بشاشت کے ساتھ جواب دے رہے تھے، اسی دوران میں میں ان سے ایک عجیب و غریب سوال کرنے لگا، پوچھنے سے پہلے تو نہیں لیکن دریافت کرنے کے بعد اس استفسار پر مجھے خود ہی ندامت ہوئی، یعنی میں نے ان سے دریافت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کا معاملہ دنیا کی زندگی میں عجیب و غریب رہا، ایک طرف آپ کے دسترخوان کی وسعت تھی جس پر سینکڑوں آدمی زلہ ربائی کرتے تھے، مہمانوں کی کثرت، واردین و صادرین کا ہجوم دیکھ کر بارہا خیال ہوا کہ آپ شاید کوئی رئیس یا پھر ایک بڑے سرمایہ دار ہیں جس کے گھر میں تجوریوں کا سلسلہ اور نقدیوں کے انبار ہوں، دوسری جانب آپ کی سادگی، معمولی لباس، معمولی قسم کا کھانا پینا، عیش و راحت سے بہت دور زندگی اور راحت کوشیوں سے ناواقف اوقات دیکھ کر محسوس ہوتا کہ آپ ایک غریب گھر گرہستی کے آدمی اور سادہ زندگی کے مالک ہیں، پھر بتائیے کہ آپ کیا تھے اور اپنے پیچھے آپ نے کیا چھوڑا ہے؟

اس مقدس انسان نے اس نازیبا سوال پر کسی ناگواری کے بغیر کہا کہ:۔

میں نے دنیا کی زندگی ایک غریب کی طرح شروع کی اور غربت ہی پر اس کو ختم کر آیا ہوں، نہ میں سرمایہ دار تھا نہ رؤسا کے زمرے میں میرا شمار، میں نے اپنے بعد نہ روپیوں کے انبار چھوڑے نہ مال و متاع کے ذخیرے، اور یہاں آکر معلوم ہوا کہ دنیا کا طمطراق، تزک و حشم کچھ بھی کام نہیں آتا، سب کچھ وہیں پڑا رہ جاتا ہے اگر کام آتا ہے تو وہی دو چار چیزیں جن کی اطلاع دیتے ہوئے صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:۔

"جب آدمی مرجاتا ہے تو تین چیزوں کے علاوہ اس کے تمام اعمال موقوف ہو جاتے ہیں، یعنی صدقہ جاریہ، علم نافع یا نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہو"۔ (اخرجہ البخاری)

میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ آجکل آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟ اس استفسار پر فرمایا کہ زیادہ تر قرآن

ہی کی تلاوت سے کام رہتا ہے، دنیاوی زندگی میں بھی قرآن مجید کی تلاوت بڑی سرور بخش تھی۔ میں نے حیرت سے دریافت کیا کہ کیا آپ قرآن پڑھتے ہیں، حفظ پڑھتے ہیں یا ناظرہ؟ شیخ نے فرمایا کہ ایک روایت میں ہے کہ:۔

"مومن کو قبر میں مصحف دیا جاتا ہے جس میں وہ پڑھتا ہے" (اخرجہ ابن مندہ)

اور اسی طرح دوسرے اعمال و عبادات بھی چلتی رہتی ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ اب ہم مکلف نہیں ہیں صرف اپنی لذت و راحت کے لیے اس قسم کی عبادتیں کرتے رہتے ہیں۔

اب صبح ہو چکی تھی، آفتاب کی کرنیں آسمان سے زمین پر اتر کر آ رہی تھیں اور اُن کی تمازت سے فضا میں حرارت و برودت کا ایک حسین امتزاج بنتا جا رہا تھا، زائرین کے قدموں کی چاپ سے روحانیوں کے ہجوم میں کچھ کھلبلی سی پڑ گئی اور اچانک یہ منظر میرے سامنے سے ہٹا دیا گیا۔ پھر اسی دنیا کی وہی صبح و شام تھی اور وہی زمین و آسمان۔ (ماہنامہ "الحرم" میرٹھ، مدنی نمبر)

مزارِ پاک پر

مولانا رشید الوحیدی

یہاں کا ذرہ ذرہ گلستاں معلوم ہوتا ہے
خدایا ترا لطف و کرم بیکراں معلوم ہوتا ہے

ہر اک تارِ نفس کو اک نیا پیغام ملتا ہے
کوئی اسرارِ حق کا رازداں معلوم ہوتا ہے

اس آبادی میں تنویرِ حرم کا عکس ملتا ہے
یہاں ہر شے پہ رحمت کا نشاں معلوم ہوتا ہے

یہاں ہے رحمتِ حق عام ارواحِ مقدس پر
یہ ویرانہ مکانِ قدسیاں معلوم ہوتا ہے

میرے حالِ زبوں پر ہمصفیر و رحم فرماؤ
میرا سوزِ دروں کچھ کم یہاں معلوم ہوتا ہے

تلاشِ حق کی خاطر خود ترے مرقد پہ آئے ہیں
مزارِ پاک گویا آستاں معلوم ہوتا ہے

تری فرقت کو دنیا موت سے تعبیر کرتی ہے
مجھے یہ حادثہ اک امتحاں معلوم ہوتا ہے

سناؤں کس کو اپنا قصۂ خونیں جگر ہمدم
بہر سو قلبِ مومن خونچکاں معلوم ہوتا ہے

اسی خاکِ مقدس کی طرف دل اپنے مائل ہیں
یہاں پنہاں متاعِ کارواں معلوم ہوتا ہے

چراغِ راہ بن کر ظلمتِ شب میں جو چمکا تھا
وہی اب زینتِ بزمِ جناں معلوم ہوتا ہے

وہ گوشہ زندگی کا جو ترے ارشاد پر گذرے
وہی حصہ مجھے گنجِ گراں معلوم ہوتا ہے

حدیثِ معرفت، اعلانِ حق تحریکِ بیباکی
اب ان خاکوں میں حسرت کا دھواں معلوم ہوتا ہے

رشید اک تم نہیں مصروفِ غم اس بزمِ امکاں میں
یہ عالم کشتۂ دردِ نہاں معلوم ہوتا ہے

حصہ دوم

روحانی یکسوئی کے ایّام

حضرت مدنیؒ کی زندگی کا مشاہدہ کرنے والے اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ حضرتؒ کا سارا وقت دین وملت کی خدمت میں گذرتا تھا، اس قدر بے پناہ مصروفیت میں بھی آپ اپنی عبادات اور معمولات کو پورا فرما لیتے تھے، مگر رمضان المبارک کا پورا مہینہ تو آپ کی یکسوئی اور تبتّل[1] کا مہینہ ہوتا تھا، جونہی دارالعلوم دیوبند میں بخاری شریف کا ختم ہوا فوراً اسی وقت سلہٹ کے لیے روانگی ہوگئی، پھر وہاں سارا وقت تلاوت اور ذکر اذکار، بیعت وارشاد میں ہی صرف ہوتا، دوسرے کام بالکل ترک یا کم سے کم رہ جاتے تھے۔ آپ نے سلہٹ سے دارالعلوم آنے پر بھی سلہٹ کو اپنی علمی، دینی اور روحانی برکات سے محروم نہ فرمایا یہ دو ماہ آسام اور بنگال کے لیے نزولِ برکات کے ہوتے تھے، ایسا وقت بھی آتا کہ لاؤڈ سپیکر پر بیعت کے الفاظ پڑھائے جاتے۔ اس قدر زیادہ تعداد کو فرداً فرداً الفاظِ بیعت کہلانے میں وقت زیادہ صرف ہوتا مختصر الفاظ میں قیامِ سلہٹ کی برکات اور حضرت کی مصروفیات کو ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے:۔

جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت مدنیؒ نے سلہٹ کے قیام کے دوران آسام بلکہ بنگال کے مسلمانوں کے دلوں کو اس قدر مسخر فرمالیا تھا کہ وہ کسی حال میں بھی آپ کو اپنے ہاں سے جدا کرنے کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ہر طرح کے آرام اور تعاون کی پیشکش کی مگر یہاں کوئی دنیاوی یا مادی فائدہ یا عزوجاہ کا مسئلہ نہ تھا بلکہ اپنے اس عظیم مرکز کو سنبھالنا تھا جس کی کشتی میں انہوں ہی نے اس قدر چھید کر دیئے تھے کہ اس کا ساحلِ مراد تک پہنچنا ناممکن تھا، کشتی کے ملّاح بے بس ہوکر کسی ایسے کشتی بان کی تلاش میں سرگرداں حضرت تھانویؒ (اس وقت دارالعلوم دیوبند کے سرپرستِ اعلیٰ) کی خدمت

---

[1] تبتّل کا معنیٰ یہ ہے کہ سب سے کٹ کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو، جیسا کہ سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝ (المزمل ۸)

میں پہنچے اور مشورہ طلب کیا، حضرت تھانویؒ نے حضرت مدنیؒ کو سلہٹ سے بلانے کے لیے حکم فرمایا، حضرت مدنیؒ کو غیر واضح الفاظ میں بذریعہ ٹیلیگرام دیوبند بلایا گیا، حضرت مدنیؒ کو یہ دونوں حضرات (مولانا حبیب الرحمن مہتمم، حضرت مولانا حافظ احمد صاحبؒ) خلوت میں لے گئے اور اپنی پگڑیاں آپ کے قدموں پر ڈال دیں اور رونے لگے، حضرتؒ نے وعدہ تو فرمالیا مگر اہلِ بنگال کو راضی کرنا مشکل تھا، آخر اس شرط پر وہ لوگ راضی ہوئے کہ حضرت دیوبند میں بخاری شریف کا ختم ہوتے ہی بنگال کیلئے روانہ ہو جائیں گے، حضرتؒ نے منظور فرمالیا اور آخر تک اس عہد کو نبھاتے رہے۔ یہاں حضرتؒ کے سفرِ سلہٹ، وہاں کے قیام اور برکات کا اجمالی تذکرہ عرض ہے[1]۔

آسام کے مخلصین و معتقدین سال بھر رمضان المبارک اور حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے ورودِ مسعود کے اشتیاق میں گھڑیاں گن گن کر گذارتے تھے، رمضان المبارک سے ایک ماہ پہلے ہی سے دعوتی خطوط اور تاروں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا، حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ عموماً ۲۷، ۲۸ شعبان تک بخاری شریف ختم کر کے سلہٹ کے لیے روانہ ہو جاتے تھے، آپ کے ساتھ یہاں سے بھی بہت سے تشنگانِ علوم طریقت ہمرکاب رہتے تھے جن کی تعداد اخیر زمانہ میں بہت بڑھ گئی تھی، حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا سلہٹ پہنچنا اہلِ سلہٹ کے لیے گویا ہلالِ عید کا طلوع ہوتا تھا، تمام آسام و بنگال سے مخلصین و معتقدین خدمتِ اقدس میں حاضری کا شرف حاصل کرتے تھے، کچھ تو زیارت کر کے واپس ہو جاتے تھے کچھ تزکیۂ نفس و حصولِ معرفت کے لیے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ قیام کرتے تھے، تقریباً چار سو پانچسو حضرات کا مجمع روزانہ حاضر رہتا تھا۔

رمضان المبارک کے مشاغل

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے مشاغل یہ رہتے تھے کہ مختصر افطار کے بعد نمازِ مغرب سے فراغت حاصل کرنے کے بعد نوافل میں مشغول ہو جاتے تھے اور حسبِ معمول سوا یا ڈیڑھ پارہ کی تلاوت فرماتے تھے، پھر تراویح شروع ہوتی جس میں حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ خود قرآنِ کریم سناتے تھے، اس میں بھی سوا یا ڈیڑھ پارہ ہوتا تھا مگر ترتیل و تجوید کے ساتھ ہونے کی وجہ سے تقریباً دو، سوا دو گھنٹہ میں اس سے فراغت ہوتی تھی، اس کے بعد حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کچھ وعظ و نصیحت فرماتے تھے، دورانِ وعظ ہی میں اہلِ سلہٹ کی طرف سے نہایت خاموشی کے ساتھ چائے بھی پلائی جاتی، چائے اور

---

[1] حیات و کارنامے ص۱۰۳

وعظ کے بعد تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹہ آرام فرماتے اور پھر نوافل شروع ہو جاتے جن میں حضرت دو ڈھائی پارے سے لے کر چھ سات پارے بھی پڑھ جاتے، پھر سحری سے فراغت کے بعد نماز صبح پڑھ کر تقریباً دو ڈھائی گھنٹے آرام فرماتے، اس کے بعد بیدار ہو کر خطوط کے جوابات وغیرہ میں مشغول ہو جاتے تھے، لوگوں سے ملاقات کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔

کبھی کبھی معتقدین اپنے مکان پر برکت کے لیے اور وعظ کے لیے لے جانا چاہتے تو اُسی وقت یہ کام بھی انجام پاتا تھا، دوپہر کو تھوڑی دیر قیلولہ فرماتے، ظہر کی نماز کے بعد سے عصر تک اور عصر کے بعد مغرب سے کچھ پہلے تک قرآنِ کریم کے دَور کا سلسلہ رہتا، تمام رمضان المبارک میں یہی پروگرام رہتا۔ نمازِ عید کے بعد روانگی ہوتی اور آسام سے دیوبند تک مختلف مقامات پر قیام فرماتے ہوئے، جس کا بہت عرصہ پیشتر لوگ حسبِ ضرورت و اشتیاق آپ سے وعدے لیتے تھے، عموماً آخر شوال تک دار العلوم دیوبند واپس تشریف لاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں کا بھی کچھ عجیب دستور ہے کہ اُس کے مقرب بندے جتنا تنہائی کو چاہتے اور دُنیا واہلِ دُنیا سے بھاگتے ہیں اُتنا ہی دُنیا واہلِ دُنیا اُن کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور وہ مرجعیت و مقبولیتِ خلائق، لوگوں کا ازدحام و مجمع، نیاز مندی وحلقہ بگوشی جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی ان درویش منش حضرات کیلئے ایک معمولی بات ہوتی ہے، اور جو اس کیلئے دن رات کوششیں کرتے ہیں، تدبیریں سوچتے ہیں اس کی تمنا میں مرتے ہیں، وہ محروم ہی رہتے ہیں۔ کتنا سچا مقولہ ہے کہ "دنیا سایہ کی طرح ہے تم اس کے پیچھے چلو تو تمہارے ہاتھ نہ آئے، اس سے منہ موڑ کر چلو تو تمہارے پیچھے پیچھے آئے"۔ اہل اللہ اور اربابِ معرفت کے حالات ایسے ہی عجیب ہوتے ہیں۔

حضرتؒ کے سفر کی شان

پچھلے بزرگوں کی مقبولیت و مرجعیت کے حالات سُن سُن کر تعجب ہوا کرتا تھا لیکن حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے حالات نے وہ تعجب ختم کر دیا۔ جس طرف بھی نکل جاتے تھے مخلوقِ خدا پروانوں کی طرح اُمڈی چلی آتی تھی، اگر کہیں لوگوں کے کانوں میں بھنک پڑ جاتی کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فلاں گاڑی سے اسٹیشن سے گذریں گے، بس پھر کیا تھا اسٹیشن پر ہجوم ہو جاتا تھا، آمد و رفت کا تانتا بندھ جاتا، کوئی نفیس نفیس کھانے لیے چلا آرہا ہے، کوئی چائے پکوا کر لا رہا ہے کوئی طرح طرح کے پھل لیے آرہا ہے، کوئی قسم قسم کی مٹھائیاں لیے حاضر ہے۔ اب گاڑی آتی ہے، اسٹیشن کے ایک سرے سے دُوسرے سرے تک آدمی تعینات ہیں ہر ایک ہمہ تن چشم ہے، جس ڈبہ میں حضرت نظر آجاتے ہیں سب دیوانہ وار اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں حضرتؒ سے مصافحہ اور چند الفاظ

مزاج پرسی کا موقعہ مل جانا گویا ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے جس کے لیے پروانہ وار ہر ایک جھپٹتا ہے ۔حضرتؒ کا مسکرا کر بات کرلینا، تحفہ قبول فرما لینا، مٹھائیوں یا پھلوں میں سے ایک دانہ قبول فرمالینا، چائے میں سے ایک پیالی پی لینا، کھانے میں سے چند لقمے لے لینا، ہلالِ عید دیکھنے کی خوشی سے کسی طرح کم نہ ہوتا تھا جس کا ہفتوں مزے لے لے کر ذکر ہوتا رہتا تھا، دل میں ایک لذت مہینوں باقی رہتی تھی، آئندہ ایسے موقع کا انتظار رہتا تھا پھر جب یہ مبارک موقعہ آجاتا تو پہلے سے زیادہ ہی بات ہوتی، استقبال کے لیے دو ایک اسٹیشن پہلے لوگ پہنچ جاتے کچھ لوگ اگلے اسٹیشنوں تک رخصت کرنے کے لیے جاتے تاکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت، زیارت یا ہمکلامی کی مبارک ساعتیں کچھ طویل ہو جائیں۔ اسٹیشن پر غیر معمولی ہجوم اور پھر اس کی بھاگ دوڑ دیکھ کر ناواقف لوگ تعجب سے پوچھتے کہ کیا معاملہ ہے؟ کوئی جواب دے دیتا کہ مولانا مدنی تشریف لا رہے ہیں تو اب وہ لوگ بھی دوڑ پڑتے غیر مسلم بھی بسا اوقات اس سعادت کے حاصل کرنے میں حصہ لیتے۔ بعض اوقات افسران، اسٹیشن ماسٹر وغیرہ میں سے جو آپ کے چہرہ کو دیکھ لیتا اُس کا دل رعب و احترام سے بھر جاتا مگر چہرہ دیکھنے سے دل نہ بھرتا، کوئی کہتا کہ مولانا مدنی کے چہرہ پر عجب نور ہے، کوئی کہتا کہ دل چاہتا ہے کہ انہیں برابر دیکھتے ہی رہیں غرض ہر شخص متاثر ہوتا اور متاثر رہتا تھا مقبولیت و محبوبیت کا یہ حال کسی ایک علاقہ کے لیے مخصوص نہ تھا بلکہ برِ اعظم ہندوستان کے جس علاقہ میں بھی گذر ہوتا یہی حال رہتا تھا، بلکہ چشم دید گواہوں کے بیان کے مطابق سرزمینِ حجاز، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پہنچکر بھی کثرتِ زائرین کا یہی حال رہتا تھا۔ وہ تو یہ کہیئے کہ ہندوستان کے حالات اور آپ کی مصروفیات نیز تواضع و اخفاء کے مادے نے آپ کو دیگر دور دراز ممالکِ اسلامیہ میں جانے آنے اور اُن ممالک کے باشندوں کو آپ سے رُوشناس ہونے کا موقعہ نہیں دیا ورنہ ان ممالک میں بھی یہی حال ہوتا۔

حضرت مدنیؒ کا قیام نئی سڑک سلہٹ میں زیادہ ہوتا، نماز تراویح میں قرآنِ عزیز خود سناتے، آپ خود بھی اور دیگر کئی حضرات بھی نئی سڑک کی مسجد میں اعتکاف فرماتے، ویسے دوسرے مواضعات میں بھی کسی وقت تشریف لے جاتے مگر مستقل قیام نئی سڑک کی مسجد میں ہوتا۔

◎

اَوراد و وظائف

جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے حضرت مدنیؒ کے ذاتی وظائف اور اَوراد قرآنِ عزیز کی تلاوت، درود شریف (آپ عظیم محدث تھے اور محدث سے زیادہ درود شریف کون پڑھتا ہوگا) اور نوافل پر آپ کا سفر و حضر میں عمل رہتا تھا، البتہ اپنے مسترشدین یا دوسرے پریشان حالوں کو آپ اوراد و وظائف کی تلقین اور اجازت وسعتِ قلبی کے ساتھ عطا فرمایا کرتے تھے۔ اُن چند وظائف کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے جن میں سے چار کا تعلق احقر کی اپنی ذات کے ساتھ ہے۔

① حزب البحر کی اجازت اور افادیت کا ذکر آپ کے مکاتیبِ گرامی کے حوالہ سے گذر چکا ہے۔

② ختم ہفت سلاطین: احقر جب ۱۹۴۳ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر گھر آیا تو کئی مسائل درپیش تھے والد صاحب مرحوم کا سایہ چھ سال پہلے اُتر چکا تھا، حقیقی بھائی کوئی نہ تھا، کوئی مخلص ہمدرد نہ تھا، اپنی پریشانیوں کے لیے دُعا کا حضرت مدنیؒ کی خدمت میں عرض کیا تو حضرتؒ نے سورۃ یٰس شریف کے ختم کی اجازت اور طریقہ بھی تجویز فرما کر بھیجا، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ ختم آج ۱۹۹۴ء تک جاری ہے اور اس کی برکات محسوس طور پہ نازل ہو رہی ہیں۔ اس کا طریقہ یہ فرمایا کہ کلمہ یٰس گیارہ بار پڑھ کر بارہویں بار تلاوت جاری کر دی جائے ہر مُبِین پر از سر نو اسی طرح کلمہ یٰس گیارہ بار پڑھ کر بارہویں بار تلاوت جاری کر دی جائے، یہی طریقہ ہر مُبِین پر کیا جائے لیکن آخری مُبِین (فَاِذَا ھُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْن) پر واپس نہ لوٹے بلکہ سورۃ پوری کر لی جائے اور مندرجہ ذیل بزرگانِ دین کے نام ایصالِ ثواب کر کے اللہ تعالیٰ سے اپنی مشکل آسان کرنے کی دعا مانگے، احقر کا عمل یہ ہے کہ سوموار کے دن ایصالِ ثواب بہ نام حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ اور منگل کے دن بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اور بدھ کے دن محمد حسین سنجر رحمۃ اللہ علیہ اور جمعرات کے دن حضرت احمد خضرویہ رحمۃ اللہ علیہ، جمعہ کے دن حضرت قاضی اسماعیل سامانی رحمۃ اللہ علیہ، ہفتے کے دن

ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ اور اتوار کے دن حضرت سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے روح پر ایصالِ ثواب کیا جائے۔

احقر کا اپنا معمول یہ بھی ہے کہ ہر اتوار کو کوئی چیز برائے ایصالِ ثواب ان حضرات اور دیگر اکابر اولیاء کرام کی ارواحِ مبارکہ کے لیے دیدیتا ہوں، اللہ تعالیٰ برکات کا نزول فرماتے ہیں۔

(۳) ۱۹۴۴ء میں موسم سرما میں احقر آشوبِ چشم کا ایسا شکار ہوا کہ پڑھنا اور دیکھنا بھی مشکل ہو گیا علاج اور ادویات کا استعمال کیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا، آخر حضرتؒ کی خدمت میں عریضہ لکھوا کر بھیجا تو آپ نے قصیدہ بردہ الداد کا مندرجہ ذیل شعر سات بار پڑھ کر آنکھوں پر دم کرنے کا فرمایا، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فوراً آرام ہو گیا اور آج تک اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس مرض کا شکار نہیں ہوا، عُمر کے تقاضا کے لحاظ سے کبھی کبھی کچھ اثر ہو جاتا ہے لیکن اُس طرح کی تکلیف پھر نہیں ہوئی۔ اپنا معمول اُس وقت سے ہے کہ ہر فرض نماز کے بعد سات بار پڑھ لیتا ہوں، اور کسی بھی بدنی تکلیف کے لیے کالی سیاہی اور کلک کے قلم کے ساتھ لکھ کر مریض کو پلانے کے لیے دے دیتا ہوں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے شفاء ہو جاتی ہے، وہ شعر درج ذیل ہے ؎

کَمْ اَبْرَأَتْ وَصِبًا بِاللَّمْسِ رَاحَتُهٗ

وَاَطْلَقَتْ اِرْبًا مِّنْ رِبْقَةِ اللَّمَمِ

(۴) ۱۹۴۵ء میں ہمارے علاقہ کے ایک بزرگ پر کپڑے کے راشن کے کی خلاف ورزی کے الزام میں بعض شرپسندوں نے انتظامیہ کے بعض ارکان کے ساتھ مل کر مقدمہ بنا دیا، آپ کو گرفتار کر لیا گیا، دوسرے دن ضمانت پر رہائی ہوئی، حضرت نوّر اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں دُعا کی درخواست کی گئی تو آپ نے دعاء کے ساتھ سورۃ الفتح اور سورۃ الطور روزانہ ایک ایک بار پڑھنے کا ارشاد فرمایا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نہ صرف آپ کو باعزّت بری کیا گیا بلکہ مجسٹریٹ نے ضبط شدہ کپڑا بھی واپس کرنے کا حکم دیا اور پولیس کے خلاف ہتکِ عزّت کا دعویٰ دائر کرنے کی اجازت بھی دے دی۔

(۵) اولاد کے لیے حضرت مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مندرجہ ذیل عمل ارشاد فرمایا کرتے تھے ۔۔

اکہ سالم لونگ لے کر ان میں سے ہر ایک پر سات بار سورۃ النور کی آیت اَوْ کَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ...... کامل آیت پڑھ کر دم کر دی جائے اور وہ لونگ وہ عورت روزانہ رات کو سوتے وقت منہ میں چبالے،

لونگ کے ساتھ پانی وغیرہ نہ لے بلکہ خشک چبالے اور لونگ کھانے کے بعد رات کو کچھ نہ کھائے، یہ عمل ۴۱ رات بلاناغہ (ایام ماہواری میں بھی) کرے، ان شاء اللہ اولاد ہوجائے گی۔

احقر نے کئی بے اولاد خواتین کو لونگ دم کرکے دیئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بعض کو گیارہ سال بعد اور بعض کو اٹھارہ سال بعد بھی اولاد عطا ہوئی ہے۔

(۶) حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک پریشان حال مرید کو ستر بار درود شریف تنجینا پڑھنے کا فرمایا کہ اس سے ان شاء اللہ سب پریشانیاں دور ہوجائیں گی۔

از مرتب: یہ درود شریف ہمارے اکابر کے ہاں معمول رہا ہے، میرے والد ماجد نوراللہ مرقدہٗ بعد از نماز فجر ہم سب کو ساتھ بٹھا کر ۳۱۳ بار پڑھا کرتے تھے۔

اب چند وظائف روزنامہ الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر سے نقل کیے جاتے ہیں

(۷) مولانا عبدالسلام فیض آبادی نے فرمایا: ایک مولوی صاحب نے کہا کہ میں ایک مصیبت میں گرفتار تھا، دشمن سازشیں کر رہے تھے، دامن مدنیؒ میں پناہ ڈھونڈی، فرمایا روزانہ پانچ سو مرتبہ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْل پڑھ لیا کرو، چنانچہ چند ہی دن مداومت کرنے پر بادل چھٹ گئے اور دشمن ذلیل وناکام ہوگئے۔

(۸) ایک مجنون کے لیے دعا کی درخواست کی گئی، فرمایا کہ ایک گھڑے پانی پر سورۃ فاتحہ مع بسم اللہ ۴۱ مرتبہ اور آیت کریمہ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ (ابراہیم ۱۲) ۱۱ مرتبہ پڑھ کر دم کرکے مریض کو شب یک شنبہ وشب سہ شنبہ کی سات راتوں میں ۱۱ بجے کے بعد اور ۱۲ بجے سے پہلے چوراہے پر لے جاکر غسل دے دیں، اگر خارجی اثر ہوگا تو زائل ہوجائے گا۔ یہ عمل کیا گیا اور وہ مریض بالکل شفایاب ہوگیا۔

(۹) ایک شخص نے ضعفِ بصر کی شکایت کی، فرمایا ہر فرض نماز کے بعد تین مرتبہ اول آخر درود شریف اور تین مرتبہ آیت کریمہ فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝ (قٓ ۲۲) پڑھ کر ہاتھ کے دونوں انگوٹھوں کی پشت پر دم کرکے آنکھوں پر پھیر لیا کرو۔

(۱۰) فرمایا نظرِ بد کے لیے سات مرچیں لے کر سات بار سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کرکے مریض کے سر کے گرد پھرا کر آگ میں ڈال دے۔

(۱۱) فرمایا سل و دق کے لیے کورے برتن میں پانی لے کر باوضو درود شریف اوّل آخر گیارہ مرتبہ سورۃ فاتحہ معہ بسم اللہ بوصل میم رحیم ولام الحمد ۱۰۱ مرتبہ اور معوذتین گیارہ گیارہ مرتبہ اور آیت قُلْنَا یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰی اِبْرٰهِیْمَ گیارہ مرتبہ پڑھ کر دم کریں اور بوقتِ صبح قبل طلوع شمس نہار منہ جس قدر پیا جا سکے زیادہ سے زیادہ پلا دیں پھر آدھ گھنٹہ تک کوئی دوا یا غذا نہ دیں، پھر رات دن میں جب بھی پانی پینا ہو یہی پانی دیتے رہیں، اگلے دن پھر دوسرا پانی لے کر پھر دعائیں دم کریں اور حسب مذکور طریقہ سے پلاتے رہیں اور جو پانی بچ جایا کرے کہیں کنارے پر جہاں بے ادبی کا احتمال نہ ہو ڈال دیں، اسی طرح چالیس دن متواتر بلاناغہ یہی عمل جاری رکھیں، برتن وہی رہے ہر روز نیا بدلنے کی حاجت نہیں۔ اسی طرح چالیس دن متواتر بعد نمازِ عصر سورۂ مجادلہ تین بار پڑھ کر ہر مرتبہ مریض کے سر سے پیر تک دم کر دیا جائے، فرمایا یہ عمل بہت مجرّب ہے۔

(۱۲) فرمایا دفع سحر و آسیب کے لیے نمک پر ایک ہزار ایک مرتبہ آیت وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا تا تَعْقِلُوْنَ باوضو معہ اوّل آخر درود شریف ۱۱ مرتبہ پڑھ کر دم کر کے مریض کو کھانے میں دیا کریں۔

(۱۳) فرمایا ضعفِ دماغ کے لیے ایک دانہ بادام ایک دانہ مرچ سیاہ اور ہم وزن مصری رات کو سوتے وقت کھائیں، دوسرے دن دو دانہ بادام اور دو دانہ مرچ ہم وزن مصری اور تیسرے دن تین دانہ معہ ہم وزن مصری، اسی طرح روزانہ ایک ایک دانہ بادام اضافہ کرتے جائیں اور مرچ کی تعداد نہ بڑھائیں وہ تین عدد ہی رہے، جب چالیس دانہ تک بادام پہنچ جائے تو ایک ایک گھٹانا شروع کریں، حتّٰی کہ ایک عدد تک آجائے، فرمایا ضعفِ دماغ کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔

◎

آپؒ کے تفرّدات

آپؒ قرآن وسُنّت کی روشنی میں چند اعمال میں منفرد تھے، جیساکہ:۔

① **قنوتِ نازلہ**: قرآن عزیز نے مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن یہود ونصاریٰ بتلائے ہیں۔ وہ سورۂ فاتحہ جو ہر مسلمان نماز میں اصلاً یا تبعاً پڑھتا ہے اس سورۃ میں مغضوب علیھم اور ضآلّین کے راستے کو مسلمانوں کے لیے مُہلک قرار دیتے ہوئے اس پر نہ چلنے کی دُعا بتائی ہے۔

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کے روزِ اوّل سے لے کر آج تک جس قدر ملّی اور مُلکی نقصان ان قوموں نے پہنچایا ہے دوسری قوموں نے اس قدر نہیں پہنچایا جس کا عملی مشاہدہ حضرتِ مدنیؒ نے اسارتِ مالٹا میں بھی کیا ہُوا تھا، اِس لیے آپ جب دیوبند میں ہوتے تو نمازِ فجر کی امامت خود فرماتے تھے اور قنوتِ نازلہ اس قدر غضبناک لہجہ میں پڑھتے تھے کہ گویا ابھی محراب میں شگاف پڑ رہا ہے۔

(ف) قنوتِ نازلہ کا مطلب یہ ہے کہ جب مسلمانوں پر کوئی تکلیف آئے تو اس کے دور کرنے کے لیے دوسرے اسباب بھی استعمال کریں مگر دُعائے قنوت بھی پڑھیں۔ اس کی اصل یہ ہے ۴ھ میں بیرِ معونہ کے لوگوں نے سیّدِ دوعالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں درخواست کی کہ ہماری اولاد کو اور ہم کو قرآنِ عزیز پڑھانے اور دیگر اسلامی احکام سے واقف کرنے کے لیے کچھ صحابۂ کرام ہمارے ساتھ بھیجے جائیں، چنانچہ سیدِ دوعالم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ۷۰ قُراء صحابۂ کرامؓ اُن کے ساتھ روانہ فرما دیئے مگر ان بدبختوں نے ۶۹ کو شہید کر ڈالا جس کا سیّدِ دوعالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو سخت صدمہ ہُوا، آپ نے پورا ایک ماہ نمازِ فجر میں رکوع کے بعد اُن کے لیے بد دُعا اور لعنت کے نزول کی دُعا فرمائی، تمام صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اس پر عمل کرنا ثابت ہے، فقہاء حنفیہ کے ہاں بوقتِ ضرورت اس کا پڑھنا جائز ہے ——— اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہوسکتی تھی کہ جس وطن پر مسلمانوں نے تقریباً

ایک ہزار برس حکومت کی وہ حکومت عیسائی درندوں نے چھین لی اور سارے وطن کو عیسائی بنانے اور اہل وطن خصوصاً مسلمانوں کو ذلیل بنانے کے منصوبوں پر عمل شروع کر رکھا تھا۔ (مکتوبات شیخ الاسلام جلد ا ص۴۵)

(۲) چونکہ انگریز نے دوسرے مظالم کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تمام صنعتوں کو برباد کر دیا تھا تاکہ انگلستان کا بنا ہوا مال یہاں فروخت ہو، اسے اپنی ایک عظیم منڈی بنا لیا تھا۔ یہ تصوّر آج تک مسلمانوں کے ذہنوں میں اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ اپنے وطن کی یا دوسرے اسلامی ممالک کی مصنوعات کے مقابلہ میں ولایتی چیز کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ حضرت مدنیؒ اس لیے ہر دیسی چیز کے استعمال کو ترجیح دیتے تھے، بلا شدید ضرورت کے ولایتی مال سے اجتناب فرماتے تھے، اسی وجہ سے جس میت کا کفن ولایتی لٹھے کا ہوتا اس کی نماز جنازہ پڑھ تو لیتے تھے مگر خود نماز جنازہ کی امامت نہ فرماتے تھے، آپ کے معتقدین میت کو دیسی کپڑے کا کفن پہنایا کرتے تھے۔ اس میں ایک گونہ سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی اتباع تھی جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقروض میت کا جنازہ پڑھانے سے انکار فرما دیا کرتے تھے، جب کوئی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس کا قرض ادا کرنے کی ضمانت دیتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنازہ پڑھا دیا کرتے تھے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ انگریز کو عالم اسلامی کا عموماً اور ہندوستان کا خصوصاً سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے اس لیے انگریز کو کوئی بھی نقصان پہنچانے کو مندرجہ ذیل ارشادِ قرآنی کی روشنی میں نیک عمل سمجھتے تھے، جیسا کہ فرمایا:۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ۔ (التوبۃ ع۱۲)

یہ اس لیے ہے کہ ان مجاہدوں کو پیاس، تھکان اور بھوک جو اللہ کی راہ میں پہنچتی ہے اور جب یہ کسی ایسی جگہ چلتے ہیں جس سے کافر جلتے ہیں اور کوئی بھی چیز ان دشمنوں سے جب حاصل کرتے ہیں تو ان کیلئے نیک عمل کا ثواب لکھا جاتا ہے۔

اسلئے آپؒ کی صحبت کا جو سب سے بڑا اثر پڑتا تھا وہ انگریز سے نفرت ہوتی تھی، جیسا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا:۔

"دیوبند کے قیام کی برکت تھی کہ انگریزوں سے نفرت جس کے جراثیم میرے اندر

موروثی طور پر تھے اس میں شدت پیدا ہوگئی، بعد میں اتنا اضافہ ہوا کہ ایک انگریز ہی نہیں سارا یورپ ہی اس وقت کفر و مادیت کا علمبردار ہے اور اس کے زوال کے بغیر دین و اخلاق کا عروج اور اسلام کی دعوت کا پھلنا پھولنا مشکل ہے[1]

حضرت مدنیؒ نے کئی بار شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے موسم گرما میں پہنے ہوئے باریک ململ کے کرتے کو بوقت ملاقات گریبان سے پکڑ کر پھاڑ دیا تھا، اسی طرح ہر انگریزی چیز سے نفرت فرماتے تھے۔

(۳) بیاہ شادی کی ناجائز رسوم کی وجہ سے مسلمان بہت زیادہ اقتصادی طور پر مقروض رہتے تھے اس لیے آپ نے ایسی رسوم سے بچنے کی بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے جس پر آپ کا ذاتی عمل اور مخلص معتقدین کا ذاتی طرز حیات گواہ ہے، اسی سلسلہ میں عام طور پر لوگ مہر بہت زیادہ مقرر کر دیتے تھے اور آج بھی ہے، وہ مہر کو ایک شرعی حکم کی بجائے معاشرتی رُکن سمجھتے ہیں، زیادہ مہر مقرر کرنے کو باعث عزت سمجھتے ہیں، حالانکہ مہر کا ادا کرنا بہت ہی ضروری ہے، اگر مہر ادا کرنے کے بغیر مر گیا تو اُس پر جو قرض تھے اُن سب قرضوں میں سے پہلے بیوی کا مہر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اِس لیے آپؒ جس نکاح میں تشریف لے جاتے مہر فاطمی مقرر کرنے کا حکم فرماتے، اس میں ایک تو مالی طور پر مہر ادا کرنے میں آسانی ہے اور دوسرا نکاح کو بابرکت بنانے کا ایک قوی سبب بھی ہے کہ سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر سیدہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی نسبت سے مہرِ فاطمی رکھا گیا ہے۔

(ف) مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صاحبزادی کے نکاح میں مہرِ فاطمی رکھا جس کی اطلاع حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کو جب ملی تو آپ نے فرمایا کہ سلیمان کی حکومت میں رعایا کی حق تلفی کیوں کی گئی اور مہر مثل جو عروسہ (دُلہن) کا شرعی حق تھا محروم رکھا گیا، یہ روایت راقم الحروف کو اعظم گڑھ میں پہنچی تھی۔ حضرت مولانا مدنی مدظلہ العالی (رحمہ اللہ) کا مہرِ فاطمی پر اصرار دیکھ کر خلجان ہوا کہ یہ دونوں بزرگ مشائخ اور ائمۂ وقت ہیں اس طرح کا اختلاف مسائلِ فقہ میں کوئی خاص اہمیت نہیں

---

[1] پرانے چراغ ص۱۰۱

رکھتا تاہم رفع خلجان کے لیے بارگاہ مدنی میں رجوع کرنا پڑا اور وہاں سے) یہ والا نامہ حاصل ہوا۔

"(۱) مہر فاطمی کے متعلق حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے سمجھنے سے قاصر ہوں (اوّلاً) حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی، حضرت شیخ الہند قدس اللہ اسرارہم نے اپنے اپنے متعلقین کا نکاح مہرِ فاطمی پر کیا جو کہ یقیناً حضرت تھانویؒ سے اعلیٰ و ارفع تھے اور اُن کے اساتذہ تھے۔ (ثانیاً) ہندوستان کے رواج عامہ میں مہر وصول نہیں کیا جاتا ہے، اگر کبھی ضرورت ہوتی ہے تو طلاق یا موت کے بعد صاحب جائیداد کے یہاں ہوتی ہے ورنہ عموماً مہر کا مانگنا، وصول کرنا نہ قبل العقد نہ بعد العقد (جیسا کہ عرب کا دستور ہے) کبھی نہیں ہوتا بلکہ عادتاً نہایت معیوب شمار ہوتا ہے، کیا یہ حق تلفی نسواں نہیں ہے، اگر اس عادت کو چھوڑ دیا جائے اور مہر کے ادا کرنے کی رسم جیسی کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ وغیرہ میں جاری ہے کر دی جائے تو یقیناً عورتوں کو بہت سی آسانیاں اور کشائش ہو جائے گی، یہ حق تلفی کیوں کی جا رہی ہے؟ (ثالثاً) مہر مثل بہت سے خاندانوں کے اتنے ہیں کہ موجودہ زمانہ کا ہندوستانی مسلمان اس کے ادا کرنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ واقعیت تو درکنار کتبِ فقہ میں یہ جزئیہ موجود ہے کہ اگر نکاح میں زوج کا ارادہ مہر ادا کر دینے کا نہ ہو نوز و جین کا اجتماع سفاح ہوگا۔ بتلائیے کہ وہ خاندان جو کہ زمانہ حکومتِ اسلامیہ میں لاکھوں بلکہ کروڑوں کے مالک تھے، آج بھی ان کے یہاں لاکھوں کی مقدار پر یا ہزاروں کی مقدار پر مہر چلے آتے ہیں اور بہت سے خاندان والے زیادہ سے زیادہ مہر کی عادت کیے ہوئے ہیں محض تفاخر اور نام آوری کے لیے، اور اس پر بھی باراتوں میں ردّ و قدح اس قدر ہوتی ہے کہ جس کی حد نہیں، شرافت اور عالی خاندانی کا معیار ہی ان بیوقوفوں کے یہاں مہر کا غالی تر ہونا ہو گیا ہے۔ ان صورتوں میں زوج کیسے ارادہ ادائے مہر کر سکتا ہے؟ اُس کے گھر میں اتنے کپڑے نہیں بھی نہیں جتنا مہر باندھا جاتا ہے۔ زبان زد عام یہ ہو گیا ہے کہ بیوی سے معاف کرا لیں گے، بلکہ بعض بیوقوف تو یہ کرتے ہیں کہ بیوی کو پہلی شب ہی مجبور کر کے معاف کراتے ہیں، ایسی صورتوں میں ارادہ ادائے مہر کہاں پایا جاتا ہے؟ (رابعاً) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیوں نہ اس

حق تلفی کا احساس کیا اور مغالاۃ فی الصداق سے کیوں منع کیا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج اور بنات کو نظیر میں پیش کیا۔ (خامساً) جس طرح غلط رسوم کی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے اس کی بھی ہونی چاہیئے۔ ایک سو بتیس[۱۳۲] تولہ چاندی (۵۰۰ درہم) ایسی مقدار ہے کہ عام طور پر مسلمان ادا کر سکتا ہے اور اس کا ارادہ بھی رکھ سکتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ ایک متبرک طریقہ خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا کا ہے جس سے فالِ حسن اور برکاتِ عظیمہ کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہندوستانی اذہان میں مہر کا وصول کرنا موجود ہی نہیں ہے اور اس کو معاوضۂ بضع شمار کیا جاتا ہے بلکہ شرعی رسم خیال کر کے اس کو ذکر کر دینا ضروری سمجھا جاتا ہے تو کیوں نہ وہ عدد لیا جائے جو سب میں برکت والا ہو، نہ ادنیٰ ترین مقدارِ مہر (۱۰ درہم) ہو اور نہ اعلیٰ ترین (قنطارِ مُقنطرۃ) ہو۔ شرافت اور عزت اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ سیدۃ نساء اھل الجنۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) اور سرورِ کائنات علیہ السلام کے جسمِ مبارک کے ٹکڑے کا یہ مہر ہے فاطمۃ بضعۃ منی، حدیث پر غور فرمائیے۔

باوجود ان امور کے میں خود اگر کوئی نکاح پڑھتا ہوں تب تو یہ شرط ہوتی ہے اور اگر پڑھنے والا کوئی دوسرا ہوتا ہے تو شرط نہیں ہوتی شریک ہو جاتا ہوں[۱]"۔

والسلام، ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

رمضان المبارک ۱۳۷۰ھ

(۴) اتباعِ سنتِ سیدِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم

ہر عالم باعمل کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کا کوئی عمل شریعت کے خلاف نہ ہو، پھر وہ شیخ الحدیث جو لاکھوں انسانوں کا مرشد اور ہزارہا علماء کا استاذ ہو، جس کا رات دن قَالَ اللّٰہُ وَقَالَ الرَّسُوْلُ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس کلمات پڑھنے اور پڑھانے میں بسر ہوتا ہو وہ کس طرح اتباعِ سنت سے دور رہ سکتا ہے ؟ حضرتِ مدنی نوراللہ مرقدہٗ کی زندگی سفر و حضر میں حتیٰ کہ جیل کی چاردیواری میں بھی اتباعِ سنت میں

---

[۱] مکتوباتِ شیخ الاسلام جلد ۲ ص ۸ تا ۱۰

گذرتی تھی، جیساکہ پہلے گذر چکا ہے کہ جیل میں رمضان کے روزوں کی پابندی، نماز تراویح کا اہتمام اور اس کے لیے خود قرآنِ عزیز سُنانا بلکہ ہر نماز باجماعت ادا ہوتی تھی۔ آپ کے ساتھ ریل میں سفر کرنے والے خُدّام کا مشاہدہ ہے کہ آپ چلتی گاڑی میں بھی نماز کھڑے ہو کر ادا فرماتے تھے اور اکثر نماز باجماعت ہُوا کرتی تھی۔ فرائض و واجبات اور سُنن و مستحبات کا پابندی سے التزام کرنا یہ تو تھا ہی حضرتِ مدنیؒ اسلامی تہذیب اور اسلامی معاشرت پر بھی پوری سختی سے عمل پیرا تھے، یہاں صرف ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے:۔

"مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی وزارتِ تعلیم کے زمانہ میں حضرت مدنیؒ اور چند مخصوص علماء کی دعوت کی اور کھانے کا اہتمام میز کرسی پر کیا، حضرتؒ نے چند لقمے میزبان کی خاطر کھا تو لیے مگر طبیعت پر سخت انقباض ہُوا اور ایک لطیف اشارہ مولانا کی طرف بھی کر دیا، مولانا آزادؒ بھی عالم باعمل اور متبع سُنت تھے اور اولیاء کرام کے مزاج شناس تھے، چنانچہ چند دنوں کے بعد دوبارہ دعوت کی اور کھانے کا انتظام فرش پر فرمایا۔"[1]

اسی طرح حضرتِ مدنیؒ عبادات کے کس قدر پابند تھے؟ اس کے لیے مندرجہ ذیل واقعہ ہم سب کے لیے نورِ بصیرت ہے:۔

"۱۹۳۸ء میں وصل نگر میں کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا اتنے میں نماز مغرب کا وقت ہو گیا، حضرتِ مدنیؒ نے اجلاس ہی میں اذان فرمائی اور پھر مسلمان شرکاء کے ساتھ نماز باجماعت ادا کی۔"[2]

(ف) مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ قیام روس کے زمانہ میں کمیونزم کے خصوصی اجلاس اجلاس میں باقاعدہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ (سرگذشتِ کابل ص ۸۹)

---

[1] ماہنامہ الحرم میرٹھ مدنی نمبر [2] صدقِ جدید لکھنؤ ۱۱ر مارچ ۱۹۳۸ء

کرامات و برکات

اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا اظہار جب کسی نبی علیہ السلام کی معرفت فرماتے ہیں تو اس کو معجزہ کہا جاتا ہے جس کا ظہور اصل میں اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے ہوتا ہے مگر ہاتھ نبی علیہ السلام کا ہوتا ہے ، جیسا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ظہور تو آپ کے ہاتھ پر ہوا مگر حکم اللہ تعالیٰ ہی کا تھا ، قرآنِ عزیز کا ارشادِ گرامی ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قیامت کے دن یہ فرما دیں گے ۔

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۔

(سورۃ المائدہ آیت ۱۱۰)

اور جب تو بنا رہا تھا کیچڑ سے پرندوں کی شکل کی طرح میرے اذن سے پھر تو اس میں پھونک مارتا تو وہ اڑنے لگتا میرے اذن سے اور تو چنگا کر دیتا تھا مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے اذن سے اور جب تو مُردوں کو قبروں سے زندہ نکالتا تھا میرے حکم سے ۔

اسی طرح اگر کسی انسان کی عمومی طاقت سے خارج کسی برگزیدہ انسان کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ظہور ہو تو اسے کرامت کہا جاتا ہے ، جیسا کہ سیدہ حضرت مریم علیہا السلام کے ہاں بے موسم کے پھلوں کا آنا اور آپ کا یہ فرمانا کہ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (آل عمران ۳۷)

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک حواری (اُمتی) کا چشم زدن میں بلقیس کا تخت یمن سے اٹھا کر دربارِ سلیمانی میں پیش کرنا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ فرمانا هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ (النمل ۴۰) کرامت کے ثبوت کے لیے قوی دلیل ہے ۔

اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں صحابہ کرامؓ سے لیکر آج تک ایسے صلحاء اُمت پائے جاتے ہیں جن کے دستِ حق پرست پر کئی ایسے کاموں کا ظہور ہو جاتا ہے جو عام انسانوں کی دسترس سے بعید ہوتا ہے ۔ چونکہ شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہ العزیز اللہ تعالیٰ کے

مقرب بندے تھے اس لیے ان سے بھی کئی کرامات اور کشوف کا ظہور ہوا ہے، یہاں چند کرامات اور چند کشوف کا ذکر کیا جاتا ہے مگر اس سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ حضرت مدنیؒ نے دیگر اولیاء کرام کی طرح ہمیشہ اپنی عبدیت اور عجز و انکسار کا اظہار فرمایا ہے، اور یہی علماء حق اور اولیاء کرام کی صفتِ عالیہ ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت سے ان کا سینہ اس قدر مُجلّٰی اور مُصَفّٰی ہو جاتا ہے کہ نسبتِ فاروقی کی تجلیات گاہ بگاہ اس پر نازل ہوتی رہتی ہیں حضرت مدنیؒ کی کرامات ویسے تو بہت زیادہ ہیں مگر یہاں صرف چند درج کی جاتی ہیں۔

آپ کی سب سے بڑی کرامت تو یہ ہے کہ عین اس زمانہ میں کہ انگریزی حکومت کا سورج نصف النہار پر تھا اور سکولوں میں اساتذہ بچوں سے یہ دعا کروایا کرتے تھے: "خدا سلامت رکھے جارج پنجم کو"، اور بڑے بڑے مشائخ عظام جلیانوالہ باغ میں ہندوستانیوں کے خون کی نہریں بہانے والے گورنر کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے تھے اور ملت کی بہی خواہی کا دعویٰ کرنے والے بعض لیڈروں کو سَر کا خطاب دیا جا رہا تھا، ایک مردِ حق آگاہ نے کراچی جیل سے یہ پیشین گوئی کی کہ ؎

جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں

پھر اسی کا اعادہ ۱۹۴۳ء میں مراد آباد کی جیل سے اپنے ایک گرامی نامہ میں یوں فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید قوی ہے کہ قریبی ایام میں انقلاب حکومت کی بھی ضرورت پیش آئے گی، اس صورت میں ہماری سیاسیات کا مشغلہ بھی ختم ہو جائے گا، اب اللہ تعالیٰ کی یاد میں بقیہ عمر گذارنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔" (مکتوبات جلد ۱ ص ۳۴۴)

اس سے بڑی کرامت اور کشف کیا ہو سکتا ہے کہ جب انگریزی حکومت کا سورج دوپہر کے سورج کی طرح بھڑک رہا تھا ایک مردِ حق آگاہ نے اس کے انقلاب کی خوشخبری سنائی۔

اسی طرح آپ کی سب سے بڑی کرامت دارالعلوم کی وہ ترقی ہے جو آپ سے پہلے کسی صدرِ مدرس کے دور میں نہیں ہوئی جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔ آپ دارالعلوم میں بطور شیخ الحدیث، صدر مدرس اس وقت تشریف لائے کہ دارالعلوم کی عمارت سخت زلزلہ کی زد میں تھی مگر آپ نے اس ادارہ کو نہ صرف سنبھالا بلکہ بتیس ۳۲ برس تک آپ دارالعلوم کے سرپرست رہے جبکہ آپ سے پہلے یہ شرف کسی کو حاصل نہ ہوا۔ ان کراماتِ عظیمہ کے علاوہ حضرتؒ کی عرفاً چند کرامات ذکر کی جاتی ہیں:۔

① دُعاء کی برکت

سلہٹ میں ایک مرتبہ شہر کے کسی حصہ میں آگ لگ گئی، حضرتؒ اس وقت سلہٹ ہی میں موجود تھے، لوگوں نے آپ سے دُعاء کی درخواست کی، آپ کا دُعاء میں مصروف ہونا تھا کہ اچانک آگ بُجھ گئی، لوگ یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔

(مولانا لطف الرحمٰن صاحب برنوی)

② ٹرین واپس آگئی

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ سلہٹ سے دیوبند کیلئے مراجعت فرما رہے تھے، سلہٹ اسٹیشن پر مغرب کا وقت ہو گیا، گاڑی روانہ ہونے والی تھی مگر حضرتؒ نے جماعت کے ساتھ نماز مغرب شروع فرمادی، ابھی آپ نماز سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ٹرین روانہ ہو گئی، تمام لوگ پریشان تھے لیکن حضرتؒ نے انتہائی اطمینان و سکون کے ساتھ نماز پوری فرمائی، ٹرین کافی دور تک جا چکی تھی کہ اچانک لوگوں نے دیکھا وہ واپس آرہی ہے، خدا جانے انجن میں کیا خرابی پیدا ہو گئی تھی کہ اُسے دوبارہ پلیٹ فارم پر آنا پڑا اور تمام حضرات ٹرین میں سوار ہو گئے۔ (مولانا لطف الرحمٰن صاحب برنوی بحوالہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب للہ بازاری)

③ چارپائی سے ذکر کی آواز

مولوی عبدالباری صاحب بی گنجی ہیڈ ماسٹر جے کے اسکول فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ کریم گنج تشریف لائے ہوئے تھے ملاقات کی غرض سے میں بھی وہاں گیا، حسنِ اتفاق سے اسی دن بدرپور میں جلسہ تھا، خاکسار وہاں بھی پہنچا، مدرسہ کے صحن میں ایک چھوٹی سی چارپائی پڑی ہوئی تھی میں اُس پر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر گذری تھی کہ محسوس ہوا کہ ذکر کی آواز آرہی ہے، ساتھ ہی چارپائی میں ارتعاش پیدا ہوا، مجھ پر خوف اور گھبراہٹ کی کیفیت طاری ہوئی اور میں وہاں سے اُٹھ گیا، میں نے تفتیش کی تو پتہ چلا کہ حضرت شیخؒ نے اس چارپائی پر بیٹھ کر وضو فرمایا ہے اور یہ چارپائی اسی غرض سے رکھی گئی ہے۔ مولوی عبدالباری صاحب نے یہ واقعہ مولانا برنوی سے بیان کیا جبکہ آپ اعتکاف میں تھے۔

④ کھانے میں حیرت انگیز برکت

حاجی احمد حسن صاحب (مکھیا) دیوبند بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ دیوبند میں جمعیۃ علماء کا اجلاس تھا اس موقع پر میں نے پچاس مہمانوں کو مدعو کیا، ان میں سے پچیس ۲۵ مہمان کانفرنس کے تھے اور پچیس ۲۵ مہمان حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے تھے، مختصر یہ کہ میں نے پچاس افراد کے کھانے کا انتظام کیا جب کھانا تیار

ہوگیا تو مولانا عثمان صاحب نے مولانا سلطان الحق صاحب سے کہا کہ جاؤ حضرتؒ کو بلا کر لے آؤ، مولانا سلطان الحق صاحب حضرتؒ کی خدمت میں تشریف لے گئے، لیکن وہاں سے واپس آکر مولانا عثمان صاحب سے سرگوشی کے انداز میں بات کی اور مولانا عثمان صاحب نے مجھ سے کہا کہ مولانا تمہارے بلائے ہی آئیں گے تم خود چلے جاؤ، یہ سُنکر میں حضرتؒ کے مکان پر پہنچ گیا، آپ تیار ہو کر پہلے ہی باہر آچکے تھے آپ نے باآوازِ بلند فرمایا کہ سب مہمان چلے آئیں، تمام مہمان چلے آئے جن کی تعداد تین اور چار سو کے درمیان تھی، مہمانوں کو دیکھ کر میں گھبرا گیا، بھائی اسعد صاحب نے مجھے پریشان دیکھ کر سبب معلوم کیا تو میں نے صاف بات ظاہر کردی کہ میں نے تو صرف پچاس ساٹھ مہمانوں کے لیے کھانے کا انتظام کیا ہے اور مہمانوں کی تعداد آپ دیکھ ہی رہے ہیں اور وقت اس قدر تنگ ہے کہ مزید انتظام کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی، بھائی اسعد صاحب نے مشورہ دیا کہ یہ صورتحال تم خود جا کر حضرتؒ سے بیان کر دو، میں نے جا کر حضرتؒ سے عرض کر دیا کہ اس وقت کھانا کم تیار ہے اور مہمان بہت زیادہ ہیں، اب کیا کرنا چاہیئے؟ یہ سُنکر حضرتؒ کھانے کے پاس تشریف لائے، روٹی کا ٹوکرا پلاؤ کی دیگ کے پاس ہی رکھوایا اور دیر تک کچھ پڑھنے کے بعد کھانے پر دم کر دیا اور فرمایا کہ کھانا کھلانا شروع کرو، کھانا نکالنے کے بعد دیگ کو بند کر دیا کرنا اور وہاں میرے لیے ایک چارپائی منگادو میں یہیں لیٹ جاؤں گا۔ چنانچہ فوراً چارپائی بچھائی گئی اور آپ اس پر لیٹ گئے، مہمانوں نے کھانا شروع کر دیا، جب تین محفلیں کھانا کھا کر فارغ ہوگئیں تو چوتھی اور آخری محفل میں حضرتؒ بھی شریک ہوئے، جب آخری محفل بھی اُٹھ گئی تو ہم منتظمین نے اطمینان کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ پچاس ساٹھ آدمیوں کے کھانے میں اللہ تعالیٰ نے اس قدر برکت عطا فرمائی کہ تقریباً چار سو آدمی شکم سیر ہوگئے ــــ بہر حال مہمانوں کے جانے کے بعد ہم چند آدمی رہ گئے اور خیال تھا کہ چاولوں کا تو نام ونشان بھی نہ ہوگا البتہ روٹیاں کافی بچ گئی ہیں اسی پر اکتفاء کرلیں گے، مگر جب میں دیگ کے قریب گیا اور اس کے اندرونی حصّے کا جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ اس میں چاول اس قدر موجود تھے جسے ہم سب مل کر کھاسکیں۔

(۵) رُوحانی تصرّف اور برکت

غالباً ۱۹۳۸ء میں حضرتؒ لاہر پور تشریف لائے، کانگریس کا جلسہ بھی انہی تاریخوں میں تھا جس میں آنریبل حافظ ابراہیم صاحب نے بھی شرکت فرمائی تھی، کھانا تقریباً دس آدمیوں کے لیے پکوایا گیا لیکن شب کے کھانے میں باہر دسترخوان

پر نیس پینتیس آدمی ہوگئے اور تقریباً اتنی ہی مقدار زنان خانہ میں تھی، گھر میں بحلف بیان کرتی ہیں کہ انہوں نے تقریباً ستر اسّی آدمیوں کا کھانا نکالا لطف یہ ہے کہ صبح کو کافی کھانا دیگوں میں بچا ہوا پایا گیا، یہ محض حضرتؒ کا روحانی تصرّف تھا۔

⑥ ایک حیرت انگیز کرامت مدینہ منوّرہ میں قبلہ دکن جانب ہے، قُبہ خضرا پورب کے گوشہ میں واقعہ ہے، پچھم جانب باب الرحمت کے متصل دالان میں حضرتؒ درس دے رہے تھے، قُبہ خضراء کی جالیاں سامنے تھیں، تلامذہ میں سے ایک صاحب کو حیات النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق کافی شکوک تھے، دورانِ درس ایک بار انہوں نے جو نگاہیں اٹھائیں تو سامنے قُبہ خضراء تھا اور نہ جالیاں، بلکہ حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم خود تشریف فرما ہیں، انہوں نے کچھ کہنا چاہا (شاید دوسرے طلباء کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں) تو حضرتؒ نے اشارے سے منع فرمایا، اب جو دیکھتے ہیں تو سب چیزیں اپنی سابقہ حالت پر تھیں۔ اِس وقت مجھے مطلق یاد نہیں آرہا ہے کہ یہ واقعہ مجھ سے کہاں بیان کیا گیا ہندوستان میں یا مدینہ منوّرہ میں؟

⑦ اللہ تعالیٰ حافظ و ناصر ہے مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ پر جس زمانے میں سر سکندر حیات کی حکومت نے ایک مقدّمہ چلا رکھا تھا جس میں پھانسی کی سزا کا اندیشہ تھا اور لوگ سخت پریشان تھے، اس وقت کچھ لوگ نہایت متفکرانہ انداز میں حضرتؒ کی خدمت میں دُعاء کی درخواست کرتے آئے، حضرتؒ سب کی سُنتے رہے، آخر میں کچھ فرمایا جس کا خلاصہ غالباً یہ تھا کہ راہِ حق میں قربان ہو جانا تو بڑی سعادت ہے اس میں فکر کی کونسی بات ہے، بہرحال اللہ حافظ و ناظر ہے۔ کچھ دنوں کے بعد حضرتؒ کی یہ پیشینگوئی پوری ہوئی اور شاہ صاحب موصوف بری ہوگئے۔

⑧ زیارتِ حرمین ایک مرید نے حج بیت اللہ کیلئے دعا کرائی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور اس کو سات بار حج بیت اللہ اور زیارتِ بیت الرسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سعادت ملی ـــــ (ف) آپکے مریدوں کو کئی کئی بار زیارتِ حرمین نصیب ہوئی، عقائد درست ہوگئے، قرآن وحدیث سے محبت پیدا ہوگئی، چہرے سنت الانبیاء علیہم السلام کے نور سے منوّر ہوگئے۔

⑨ پھانسی کا حکم منسوخ ہوگیا منشی محمد حسین صاحب کاوی نے ایک واقعہ صاحبزادہ مولانا اسعد صاحب سلّمہٗ سے یہ نقل کیا کہ جس زمانے میں

حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ سابرمتی جیل میں تھے اُسی زمانہ میں منشی محمد حسین صاحب بھی وہاں سیاسی قیدی کی حیثیت سے تھے، منشی محمد حسین صاحب حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے قرآن شریف اور دینیات پڑھا کرتے تھے، ایک اخلاقی قیدی کو پھانسی کی سزا کا حکم ہوگیا اُس نے منشی محمد حسین صاحب سے ذکر کیا کہ تم اپنے باپو سے کہو کہ میرے لیے دُعا کریں کہ رہا ہو جاؤں، منشی محمد حسین صاحب نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی، دو ایک مرتبہ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ڈانٹ دیا، پھر ایک دن منشی محمد حسین صاحب نے بہت اصرار کیا تو فرمایا کہ اچھا اُس سے کہو کہ فلاں وظیفہ پڑھا کرے، چنانچہ اس نے دو تین روز تک وظیفہ پڑھا مگر اس کے دل کو تسکین نہ ہوئی پھر اس نے کہا کہ باپو سے کہو دعا کریں، منشی محمد حسین صاحب حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بہت مُصر ہوئے تو حضرتؒ نے فرمایا کہ اچھا جا کر اس سے کہو کہ وہ رہا ہوگیا، منشی محمد حسین صاحب نے اس قیدی سے جا کر کہا کہ باپو نے کہہ دیا کہ تُو رہا ہوگیا، دو ایک روز گذرنے کے بعد اس قیدی نے پھر بے چینی کا اظہار کیا کہ اب تک کوئی حکم نہیں آیا اور میری پھانسی میں چند روز ہی رہ گئے ہیں، منشی محمد حسین نے پھر آکر عرض کیا تو فرمایا ”میں نے کہہ تو دیا کہ وہ رہا ہوگیا“ اس کے بعد دو ایک یوم مقررہ تاریخ میں رہ گئے تھے کہ اس کی رہائی کا حکم آگیا۔

⑩ خبیث جوگی کے تصرف سے نجات دلادی

حضرتؒ کے خلیفہ مجاز مولانا عبدالحق دامانیؒ فرماتے ہیں کہ کانپور کا ایک شخص دیوبند آیا اور اس نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ چودہ سال ہوئے میں اپنے وطن میں ایک کنوئیں پر پانی بھر رہا تھا کہ ایک جوگی گذرا اور اُس نے مجھ پر نگاہ ڈالی بس وہ دن ہے اور آج کا دن میں اُس جوگی کے ساتھ ہوں میں کہیں بھی جاتا ہوں تو وہ جوگی اپنی روحانی قوت سے مجھے کھینچ لیتا ہے، اب میں بہت پریشان ہوں کہ کیا کروں، میں مسلمان ہوں؟ اس پر حضرتؒ نے اُسے ایک تھپڑ مارا اور ایک وظیفہ بتایا کہ اسے پڑھو، چنانچہ رات کو اُس نے وہ وظیفہ پڑھا اور سو گیا، صبح اُٹھ کر اُس نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے ایک خواب بیان کیا کہ رات میں نے دیکھا کہ ایک شیر مجھ پر حملہ آور ہوا تو آپ نے ایک تلوار لے کر اُس شیر پر حملہ کیا اور اُسے قتل کر دیا، اب جب صبح میں اُٹھا ہوں تو اُس جوگی کی محبت قطعاً میرے دل میں نہیں ہے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ خواب سُنکر فرمایا کہ اچھا تم آج ہی فوراً کانپور چلے جاؤ چنانچہ وہ شخص کانپور چلا گیا۔

⑪ مقدمہ سے باعزت برأت

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی دعاءِ مستجاب سے اللہ تعالیٰ نے کئی پریشان حالوں کی پریشانیوں کو دور فرمایا ہے، یہاں صرف ایک

واقعہ کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے :۔

"نواب محمد اللہ ایس جنگ کے صاحبزادہ خلیل اللہ برطانوی فوج میں کیپٹن کے عہدے پر فائز تھے کسی لغزش کی وجہ سے آپ کو کلکتہ میں کورٹ مارشل کے سپرد کر دیا گیا، ساری قانونی تگ و دو ناکام ہونے پر حضرتؒ کی خدمت میں دعاء کے لیے حاضر ہوئے، حضرتؒ نے دعاء بھی فرمائی اور پڑھنے کے لیے بھی ایک ورد ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے سنگین ترین سزا سے برأت ہو گئی، تقسیم کے وقت دہلی کے خونریز ہنگاموں سے جان بچا کر لاہور آ کر مقیم ہو گئے تھے"۔[1]

(۱۲) خصوصی انعامات، کرامات

اللہ تعالیٰ نے حضرت مدنیؒ پر اپنے زمانہ میں جو خصوصی انعامات نازل فرمائے ہیں، ان میں سب سے بڑی نعمت مدینہ منورہ میں طویل عرصہ تک اقامت کی سعادت ہے، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، اس دور میں ایسی سعادت بہت ہی کم لوگوں کو میسر ہوئی ہے کہ دربارِ نبوت میں حاضر باشی، مسجدِ نبوی میں تدریسِ علوم خصوصاً درسِ حدیث، مدینہ منورہ کی پُرنور فضاء میں احسان و سلوک کی منازل کی تکمیل، یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رافت اور شفقت آپ پر بہت زیادہ تھی، کئی بار خواب میں بلکہ عالمِ مثال اور عالمِ مشاہدہ میں بھی زیارت کا شرف حاصل ہوا، یہاں ایک واقعہ عرض کیا جاتا ہے :۔

"مارچ ۱۹۵۲ء میں آپ کے جسم مبارک کا داہنا حصہ سُن ہو گیا، ڈاکٹروں نے فالج کا حملہ تشخیص کیا، علاج کی تجویز ہو رہی تھی کہ دوسرے ہی روز آپ کو آرام ہو گیا اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ آج رات خواب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی آپ نے دعا فرما کر اپنا داہنا ہاتھ مبارک میرے بدن پر پھیرتے ہوئے فرمایا کہ حسین احمد تشویش کی کوئی بات نہیں، ہم صرف تمہاری عیادت کیلئے آئے ہیں"۔[2]

---

[1] مکتوباتِ شیخ الاسلام جلد ۱ ص ۳۰۷ [2] ماہنامہ الصدیق ملتان، شعبان ۱۳۷۱ھ

حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے تلمّذ اور ارادت کی برکات

جب بھی کوئی انسان ارادت اور اخلاص کے ساتھ کسی بھی مردِ حق آگاہ کی زیارت کرتا ہے تو وہ اس کے انوار اور برکات کا مشاہدہ کر لیتا ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ رحمتِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جو آدمی اخلاص اور تلاشِ حق کی نیت سے آیا وہ فوراً مشرف بہ اسلام ہو گیا، ایسے کئی واقعات احادیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں یہاں صرف ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے:-

"یہودِ مدینہ کے مفتی جو عبداللہ بن سلام کے نام سے مشہور اور معروف ہوئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تلاشِ حقیقت کے لیے حاضر ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ جونہی میں نے چہرۂ انور پر نظر ڈالی میرے دل اور دماغ نے یہ فیصلہ کیا یہ چہرہ غلط بات کہنے والے کا نہیں ہو سکتا، چنانچہ وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے"۔

رحمتِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نیک انسانوں کی علامت یہ فرمائی ہے۔

اِذَا رُاُو ذُکِرَ اللّٰہ۔ (الحدیث) (ترجمہ: "جب ان کو دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ یاد آ جائے"۔

چنانچہ صلحاءِ اُمت اور علماءِ حق کے ایسے کئی واقعات منقول ہیں بلکہ ایسے حالات تاریخ میں موجود ہیں کہ بعض معاند اُن کو قتل کرنے کے لیے آئے مگر حلقہ بگوش ہو کر لوٹے، یہی حال ہمارے دور کے اولیاءِ کرام اور علماءِ عظام کا ہے اور رہا ہے بشرطیکہ حاضر ہونے والا روحانی اور دینی طور پر مزکوم نہ ہو۔ دورِ حاضر کے امام الاولیاء شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری

نوراللہ مرقدہٗ کی زیارت کی برکات کو دورِ حاضر میں عالم اسلامی کے ممتاز فاضل حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہم العالی نے حضرتِ لاہوری ؒ کے متعلق ایک طویل مضمون میں ارشاد فرمایا۔

"میری زندگی میں وہ بڑا مبارک دن اور بڑی سعید گھڑی تھی جب مولانا احمد علی صاحب لاہوری ؒ امیر انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ لاہور سے نیاز حاصل ہوا....

تصحیح عقائد، اصلاحِ رسوم، ربط بالقرآن کا فائدہ زیادہ ہوا، یہ درحقیقت مولانا احمد علی صاحب ؒ کے تقویٰ اور روحانیت اور اخلاص و ایثار کی برکت تھی......

سامعین کے دل ان تذکروں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے، چنانچہ قدسؒ یہ عقیدت و محبت ان کے دل سے سننے والوں کے دلوں کو منتقل ہوتی تھی اور بجلی کی کرنٹ کی طرح دوسروں کے جسم و جان میں بھی دوڑ جاتی تھی"۔ (منقول از پرانے چراغ جلد ۱)

ف) یہ امر واضح ہے کہ اب بھی حضرت لاہوری ؒ کے سلسلۂ ارادت میں آنے والے سعادتمندوں کو تین نعمتیں (منجانب اللہ) عطا ہوتی ہیں : (۱) عقیدہ صحیح ہو جاتا ہے۔ (۲) قرآنِ عزیز سے محبت ہو جاتی ہے (۳) بار بار زیارتِ حرمین کی سعادت ملتی رہتی ہے اور یہی سب سے بڑی برکت ہے۔

اسی طرح شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نوراللہ مرقدہٗ جنہیں حضرت لاہوری ؒ اپنے وقت کے اولیاء اللہ میں عظیم تر فرماتے تھے، ان کی خدمت میں حاضر ہونے والے سعادتمندوں نے جن برکات کو محسوس فرمایا اُن کا شمار ممکن نہیں، تصحیح عقائد، تحسینِ اعمال، اکابر سے تعلق اور جذبۂ جہاد ان خوش نصیبوں کی زندگی میں نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔

اسی طرح حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین کو اللہ تعالیٰ حسنِ خاتمہ کی سعادت سے مشرف فرماتے ہیں، آپ کے مریدوں کا خاتمہ بھی بفضلہ تعالیٰ قابلِ رشک ہوتا ہے۔ یہاں صرف تین ۳ واقعات ہدیۂ ناظرین ہیں جو احقر کے سامنے ہوئے ہیں اور ان کے دیکھنے والے آج بھی بحمداللہ موجود ہیں۔

(۱) جناب حافظ نور محمد صاحب ؒ جو کہ حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردِ جلیل اور آپ سے بیعت تھے، عصری علوم میں بھی فائق ہونے کی وجہ سے گورنمنٹ کالج تلہ گنگ کے

پرنسپل تھے، عیدالفطر کی نماز اپنے گاؤں لاوہ میں (جو کہ تلہ گنگ کے قریب ہے) پڑھا کر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اسی جگہ واصل باللہ ہو گئے۔

(۲) جناب میاں محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ حسن ابدال کے قریب برہان کے موضع "فتح اللہ" کے رہنے والے تھے، امداد العلوم کے نام سے مدرسہ قائم فرمایا اور وہیں تمام عمر خدمتِ دین میں گذاری، نہایت متقی، صالح بزرگ مرجع عوام و خواص تھے۔ حضرت مدنیؒ کے نہایت عقیدتمند اور عاشق صادق تھے، حضرت مدنیؒ کی آپ بیتی "نقشِ حیات" آپ کو زبانی یاد تھی۔

آپ کی وفات کا واقعہ بھی نہایت قابلِ رشک ہے، اکتوبر ۱۹۷۹ء میں اپنی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھانے کیلئے تشریف لائے، وعظ فرمایا، عربی خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے، پہلا خطبہ پڑھ کر بیٹھے ہی تھے کہ وہیں منبر پہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥

(۳) جناب حافظ مولانا محمد امین صاحب شیخ الحدیث و بانی دار العلوم امینیہ چک لالہ روڈ راولپنڈی ـــ آپ حضرت مدنیؒ کے شاگرد، نہایت متشرع اور متقی عالمِ دین تھے، دورۂ حدیث حضرت مدنیؒ سے دار العلوم دیوبند میں پڑھا، حضرت مدنیؒ کے نہایت عقیدتمند تھے، تمام عمر درسِ حدیث میں گذاری، آپ کی وفات کا واقعہ بھی قابلِ رشک ہے ـــ عشاء کی نماز پڑھانے اپنی مسجد میں تشریف لائے، پہلی رکعت میں سورۂ والضحیٰ پڑھ رہے تھے، جب وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی ٥ پر پہنچے تو وہیں مصلّی پر گر گئے، جب نمازی دوڑ کر پہنچے تو آپ اپنے رب کے ہاں پہنچ چکے تھے۔

ع این سعادت بزورِ بازو نیست

ـــ "مرتب چراغِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے طبع بار دوم کے لیے "حضرتِ مدنیؒ سے تلمذ اور ارادت کی برکات" کے عنوان سے اس مضمون کو شروع فرمایا اور اپنے مبارک قلم سے چار عدد لکھے، تین حضرات کے نام خود تحریر فرمائے اور چوتھا عدد خالی چھوڑ دیا، یہ آپؒ کی کرامت ہے کہ آج اس عدد کے ذیل میں آپ کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ"

(۴) مرتب چراغِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم" قطب العالم حضرت اقدس مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی نور اللہ مرقدہٗ کو اپنے مربی، شیخ اور استاذ سے جس عقیدت، محبت اور عشق کا تعلق تھا وہ کتاب ہٰذا (چراغ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی سطر سطر سے عیاں ہے، آپ نے دورۂ حدیث شریف ۱۹۳۲ء میں حضرت مدنیؒ سے پڑھا، بیعت کی سعادت سے مشرف ہوئے، حضرتِ مدنیؒ نے آپؒ کو تلقینِ ذکر اور اصلاح و ارشاد کی اجازت سے مشرف فرمایا۔

حضرت مدنیؒ کے متوسلین کے حسنِ خاتمہ کا تذکرہ لکھ رہے تھے کہ اپنا وقتِ موعود آپہنچا، ساری زندگی حسنِ خاتمہ کی دعائیں فرماتے رہے، حضرت مدنیؒ سے تعلق اور محبت کی برکت سے اللہ نے آپ کو حسنِ خاتمہ کی ایسی سعادت سے نوازا کہ آج ہر ایک کے لیے قابلِ رشک ہے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰہِ

۵ محرم ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۳ مئی ۱۹۹۷ء بروز منگل حیاتِ مستعار کا آخری دن اپنے تمام معمولات کی تکمیل سے گزارا، تہجد، ذکر بالجہر، آغوشِ رحمت (حزب الاعظم) کا وِرد، صبح کی اذان سے نماز تک مراقبہ، صبح کی نماز باجماعت مسجد میں پڑھی، صاحبزادۂ گرامی قدر حضرت مولانا قاضی محمد ارشد الحسینی مدظلہ کا درسِ قرآن پاک سنا اور وہیں مشغول رہے، اشراق کے بعد گھر تشریف لے گئے، تھوڑی دیر آرام فرمایا پھر وضو کرکے نوافل میں مشغول ہو گئے، نمازِ چاشت کیلئے مسجد تشریف لائے، وہیں تلاوت، تصنیف، خطوط کے جوابات، مہمانوں سے ملاقات، بیعت، دعوت وارشاد اور درسِ بخاری شریف، مُنیۃ المصلّی، پندنامہ طلباء کو پڑھایا، ظہر کے بعد گھر میں کتاب ھٰذا (چراغِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر کام کیا اور عصر سے پہلے گھر میں پوتی کو تفسیر پڑھائی، عصر تا مغرب مسجد میں اوراد و وظائف میں مشغول رہے، عشاء کی نماز جو آپ کی آخری نماز تھی مدینہ مسجد میں باجماعت پڑھ کر گھر تشریف لے گئے، رات بارہ بجے دل کی تکلیف شروع ہوئی تو صاحبزادہ صاحب مدظلہ فوراً سی۔ ایم۔ ایچ اٹک لے گئے، خود چل کر گاڑی میں بیٹھے، ہسپتال میں گاڑی سے اتر کر بیڈ تک پیدل چل کر پہنچے، ڈاکٹروں نے معائنہ کے بعد آکسیجن تجویز کی، ڈاکٹر ابھی تیاری ہی میں تھے کہ آپ نے تین بار اللہ اللہ کہا اور اپنی خواہش کے مطابق اپنے بستر سے دورِ سحری کے وقت جو آپ کے لیے تمام عمر وصالِ محبوب کا وقت تھا اپنے کریم آقا جل شانہ کے ہاں پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

یوں علم و تقویٰ کا یہ ماہتاب زیرِ زمین روشن ہو گیا، حضرت مدنیؒ کی عقیدت و محبت کا ایک باب جو پون صدی تک اپنے شیخ کی تعلیمات کی اشاعت اور حضرتِ مدنیؒ کی عظمت کو لوگوں کے دلوں میں اُجاگر کرتا رہا ۶ محرم الحرام ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۴ مئی ۱۹۹۷ء بروز بدھ اپنی روشن باقیاتِ صالحات کو مسلمانوں کی ہدایت کے لیے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ؎

ہزاروں منزلیں ہوں گی ہزاروں کارواں ہونگے
یہ دُنیا ہم کو ڈھونڈھے گی نہ جانے ہم کہاں ہونگے

(از: احقر نثار احمد الحسینی غفرلہٗ)

حضرت مدنیؒ کی خدمتِ خلق

حضرت مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ کو اللہ تعالیٰ نے وہ دردمند دل عطا فرمایا تھا جس کی نظیر اس دور میں نہیں ملتی۔ آپ کسی بھی پریشان حال کی پریشانی کو برداشت نہ کرسکتے تھے، ویسے تو ایسے حالات بہت زیادہ ہیں مگر یہاں صرف چند واقعات ہدیۂ ناظرین باانصاف ہیں:۔

(۱) مدرسہ کے قانون کے مطابق اگر کسی طالب علم یا چند طلباء کا کھانا بند ہو جاتا یا بوجہ علالت کے اُسے پرہیزی کھانے کی ضرورت ہوتی تو اس کے لیے سیّد عالی نسب کا دروازہ کھلا تھا، خبر ملتے ہی اُس کا کھانا فوراً لگوا دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ آجکل نوجوان جو کہ اپنے آپ کو دین کے لیے وقف کرتے ہیں ان کی ہمت افزائی نہایت ضروری ہے، یہ فیاضی ہر وقت جاری رہتی تھی۔

(۲) کوئی سائل آجاتا تو اس کی مشکل فوراً حل فرما دیتے تھے، یہ گنہگار خانقاہ میں حاضر تھا کہ بعد از نمازِ عصر ایک عرب سائل آیا (یہ ۱۹۴۰ء سے پہلے کی بات ہے جب عرب سعودی عرب نہیں بلکہ حجازِ عرب تھا) حضرت کے پاس اُس وقت نقد رقم نہ تھی، اندر تشریف لے گئے اور تانبے کا ایک بہت بڑا دیگچہ لاکر اُسے فرمایا کہ یہ بازار میں فروخت کرکے اپنی ضرورت پوری کرلیجئے۔ اُس اللہ تعالیٰ کے بندے نے بھی غنیمت سمجھا اور وہ دیگچہ لے گیا۔

(۳) ان سب واقعات سے زیادہ عجیب اور انسانی ہمدردی کا عملی نمونہ ایک واقعہ ہے جو بزبان حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ درج کیا جاتا ہے:۔

"سفر میں آپ نے دیکھا کہ ایک جنٹلمین قسم کا مسافر (ریل گاڑی کے) بیت الخلاء کا دروازہ کھولتا ہے مگر پھر بجائے اندر جانے کے اپنی جگہ پر آکر بیٹھ جاتا ہے، چند بار اُس نے یونہی کیا ادھر اس کے چہرہ پر گھبراہٹ اور انقباض کے آثار نظر آرہے تھے، آپ نے نیچے پڑے ہوئے سگریٹ کے خالی ڈبے لیے اور اپنا لوٹا، جو سفر میں آپ کے ساتھ

ہُوا کرتا تھا لے کر بیت الخلاء میں تشریف لے گئے، واپس آکر اُس مسافر سے فرمایا کہ اب آپ تشریف لے جائیں، اُس نے اندر جاکر دیکھا تو بیت الخلاء بالکل صاف تھا، ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد معذرت کا طلبگار ہُوا تو آپ نے فرمایا کوئی بات نہیں، آپ محسوس نہ کریں"[1]

یہ خدمت گری کا شرف حاصل کرنے والا نجیب الطرفین سید ہے، دارالعلوم دیوبند کا شیخ الحدیث اور ہزاروں انسانوں کا پیرِ طریقت اور ہزاروں علماء کا استاذ ہے، اور سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ سالہاسال گنبدِ خضراء (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام) کے سائے میں بیٹھ کر درسِ حدیث دیا اور ایسی خدمت سرانجام دی کہ جو باپ بیٹے کی یا بیٹا باپ کی بھی نہیں کرتا، اور بڑی بات یہ ہے کہ نہ کوئی شناسائی نہ واقفیت بلکہ یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ مسلم ہے یا غیر مسلم، اُس کی انسانی طبعی پریشانی کو آپ کا دردمند دل برداشت نہ کر سکا اور اپنے مبارک ہاتھوں سے بیت الخلاء کو صاف فرما کر اُسے اس پریشانی سے نجات دلائی۔ نہایت افسوس ہے کہ ع سروری در دینِ ما خدمت گری کہنے والے نے یہ نہ سوچا کہ وہ کس کے بارہ میں ع مصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست کہہ رہا ہے جس کی ساری زندگی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی اتباع میں گذر رہی تھی، یہ واقعہ بھی سیرتِ مقدسہ کی پیروی ہے۔

صحیح روایات میں ہے کہ سیدِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرامؓ کے ساتھ مسجدِ نبوی میں رونق افروز تھے کہ ایک اعرابی نے آکر مسجد کے ایک کونہ میں پیشاب کر دیا، صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اُس کو روکنے کے لیے اُٹھے تو حضور انور رحمتِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے روک دیا، جب وہ پیشاب سے فارغ ہُوا تو اُسے نصیحت فرمائی کہ یہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے تجھے یُوں نہ کرنا چاہیئے تھا، اِدھر صحابۂ کرامؓ کو فرمایا کہ بھیگی ریت کو نکال دو اور پاک ریت ڈال کر اُس پر چند ڈول پانی کے ڈال دو۔

سیرت اور حدیث کی کتابوں میں ہے کہ رحمتِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس شفقت سے متاثر ہو کر وہ شخص نہ صرف خود مسلمان ہُوا بلکہ اس کا سارا قبیلہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

---

[1] نئی دنیا دہلی شیخ الاسلام نمبر ص ۵

(۴) بعض عرفاء کا یہ قول ہے کہ سَیّد میں مندرجہ ذیل صفات نمایاں ہوتی ہیں: (۱) سَیّد سخی ہوتا ہے (۲) سَیّد خوبصورت ہوتا ہے (۳) سَیّد غیُّور ہوتا ہے۔

حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہر لحاظ سے سخی تھے، علم کی دولت تو ہر وقت لٹاتے تھے، عملیات اور اوراد و وظائف میں بھی آپ بہت زیادہ سخی تھے، ایک دفعہ یہ گنہگار (مرتب کتاب ہٰذا) بھی حاضرِ خدمت تھا کہ پنجاب سے ایک بہت بڑے عالم صاحب حاضرِ خدمت ہوئے اور انہوں نے آپ سے چند عملیات کی اجازت مانگی (آپ کے متعلق یہ مشہور تھا کہ آپ عملیات میں کامل ہیں بلکہ جنّات بھی آپ کے مسخّر ہیں) آپ اندر تشریف لے گئے اور اپنی خاص عملیات کی وہ کاپی جس کے اوراق یہ بتا رہے تھے کہ یہ خاندانی عملیات کی بہت پرانی کاپی ہے، آپ نے وہ ساری کاپی اُن کے حوالے کر دی اور فرمایا اس میں سے جو چاہیں نقل کر لیں، سب کی اجازت ہے۔ چند اور طالب بھی تھے انہوں نے بھی یہی درخواست پیش کی، فرمایا سب کو سب عملیات کی اجازت ہے۔

(۵) نمازِ عصر کے بعد خانقاہ کے صحن میں چارپائیاں بچھ جاتی تھیں، حضرت خود بھی تشریف فرما ہوتے اور طلباء بھی ہوتے، حضرت خود یا مخدوم و محترم حضرت اسعد مدنی صاحب جو اُس وقت خورد سال تھے اندر سے عموماً مدینہ منورہ کی کھجوریں لاتے اور سب شرکاء میں تقسیم فرما دیتے۔

(۶) جن طلباء کا کھانا مدرسہ کے نظم و نسق کو برقرار رکھنے کے لیے بند کر دیا جاتا اُن کا کھانا خود گھر سے عطا فرما دیتے اور طلباءِ علومِ دینیہ کی قدر فرماتے، آپ ۱۹۴۳ء میں مرادآباد جیل میں اسیرِ فرنگ تھے کہ چند طلباء کا کھانا بند کر دیا گیا، آپ نے جیل سے حضرت قاری محمد طیب صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ کو جو خط لکھا اُس کی چند سطور درج ذیل ہیں:-

"..... اس کا مجھ کو سخت صدمہ ہوا کہ تقریباً اَسّی ۸۰ طالب علم مدرسہ سے خارج کر دیئے جائیں، اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ موجودہ زمانہ میں جس قدر بھی ہم سے ممکن ہے لوگوں کو مسلمان اور صحیح العقیدہ مسلمان بنائیں اور حسبِ فرمانِ نبوی (علیہ السلام) فاستوصوا بہم خیراً ممکن سے ممکن حد تک طلبہ کو راہِ راست تک کھینچیں تاکہ (یہ نوجوان پڑھ لکھ کر اپنی حالت بھی درست کریں اور مسلمانوں کی بھی حالت درست کریں اور اسلام کے سچے مبلغ بنیں)، اخراج کرنا اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم کر دینا ہے۔" (مکتوبات جلد ۲، ص ۱۹۸)

⑦ خود بیتی کا ایک واقعہ

احقر کو جس رات مؤرخہ ۲۶ شعبان ۱۳۵۵ھ / ۱۳ نومبر ۱۹۳۶ء شب جمعہ کو بیعت کا شرف بخشا تو احقر نے حضرتؒ سے اپنا عباء مبارک حاصل کرنے کی خواہش کی، صبح جب حضرتؒ دارالحدیث جانے لگے تو اندر سے عباء مبارکہ لے آئے اور مجھے عنایت فرما دیا۔ اُس وقت مولانا عبدالسمیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ استاذ دارالعلوم دیوبند اور حبیبِ مکرم مولانا عبدالقدوس صاحب (سابق چیئرمین اسلامیات پشاور یونیورسٹی جو اُس وقت پڑھ رہے تھے، وہ اور دیگر چند حضرات بھی موجود تھے۔ وہ چُغہ مبارک اب بھی میرے پاس ہے اور میں نے وصیت کی ہے کہ اسے میرے کفن کا ایک حصّہ بنا دیا جائے تاکہ اس کے ذریعہ مغفرت ہو جائے جیسا کہ احادیث میں ہے کہ :

> "رحمتِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں ایک صحابیہ رضی اللہ عنہا نے نیا کرتہ پیش کیا کہ آپ اسے زیبِ جسدِ اطہر فرما کر شرف بخشیں۔ آپ کی خدمت میں حاضر ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے درخواست پیش کر دی کہ یہ مجھے عطا فرما دیا جائے، اجود العرب والعجم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے وہ کُرتہ اس سعادتمند کو اُسی وقت عطا فرما دیا، چند صحابہ کرامؓ نے اُس کے اس امر کو پسند نہ فرمایا تو اُس سعادتمند صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے تو اس لیے طلب کیا کہ یہ میرا کفن ہو، چنانچہ ایسا ہی ہوا اُن کی وفات کے بعد وہ کُرتۂ منوّر و مُعطّر اُن کا کفن ہُوا" (مشکوٰۃ)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کی شرح میں فرمایا ہے: "وفیہ التبرّک بآثار الصالحین"۔ (فتح جلد ۳ ص ۱۱۵)

⑧ تواضع

یہ وصف آپ میں اس قدر نمایاں تھا کہ ہر واقف کار اس کا مشاہدہ کرتا تھا اپنے اسمِ گرامی کے ساتھ ننگِ اسلاف لکھنا تواضع کی دلیل تھی، سیدِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادِ گرامی: مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللہُ (جس نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے تواضع اختیار کی اُسے اللہ تعالیٰ رفعت عطا فرماتے ہیں) پر پورا پورا عمل تھا خصوصًا مہمانوں کے ساتھ تو یہ معاملہ اس قدر عجیب تھا کہ خود مہمان بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ مہمانوں کے ہاتھ دُھلانے، اُن کے جُوتے سیدھے کرتے، اگر مہمان رات کو رہا تو اس کے پاؤں دبانے بلکہ اُس کی ہر ضرورت کو پورا کرنے کا

خود اپنے مبارک ہاتھوں سے اہتمام اور التزام فرمایا کرتے تھے۔ سندھ کے عظیم روحانی اور سیاسی راہنما جی ایم سید نے اپنا مشاہدہ بیان فرمایا کہ:-

"سید صاحب چند رفقاء کے ہمراہ دیوبند حاضر ہوئے اور حضرتِ مدنیؒ کے ہاں قیام فرمایا، جب واپس آنے لگے تو حضرت مدنیؒ نے ان سب مہمانوں کے جوتے اپنے ہاتھوں سے سیدھے کیے۔ اس کیفیت کو بیان فرماتے ہوئے جی ایم سید صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔"

(۹) مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے روایت ہے کہ یوپی میں میری تقریر تھی رات کو تین بجے تقریر سے فارغ ہو کر لیٹ گیا، بین الیقظہ والنائم مجھ کو محسوس ہوا کہ کوئی میرے پیروں کو دبا رہا ہے، میں نے کہا خیر مجھ کو عادت بھی ہے کوئی دوست ہو گا، مگر اسی کے ساتھ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ یہ مٹھی تو عجیب قسم کی ہے باوجود راحت کے نیند رخصت ہوتی جا رہی ہے، سر اٹھایا تو دیکھا کہ حضرت شیخ مدنیؒ ہیں، فوراً پھڑک کر چارپائی سے اتر پڑا اور ندامت سے عرض کیا حضرت کیا ہم نے اپنے لیے جہنم جانے کا خود سامان پہلے سے کیا کم کر رکھا ہے کہ آپ بھی ہم کو دھکا دے کر جہنم بھیج رہے ہیں! شیخ نے جواباً فرمایا کہ آپ نے دیر تک تقریر کی تھی آرام کی ضرورت تھی اور آپ کی عادت بھی تھی اور مجھ کو سعادت کی ضرورت، ساتھ ہی نماز کا وقت قریب تھا میں نے خیال کیا آپ کی نماز چلی نہ جائے، تو بتائیے حضرت میں نے کیا غلطی کی؟

(مکتوبات ج ۱ ص ۱۲)

(۱۰) مہمان نوازی حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اس وصف میں ممتاز تھے، آپ کے ہاں مہمانوں کی آمد و رفت کا کوئی وقت تھا نہ کوئی سلسلہ واقفیت، اس لیے آپ کے ہاں مہمانوں کی بھی کئی قسمیں تھیں، جو آ گیا بس وہ مہمان ہی سمجھا گیا۔ بعض دیہاتی لوگ جو دیوبند میں اپنی کسی ضرورت کے لیے آتے تھے، مثلاً مقدمات کے سلسلے میں اگرچہ اُس وقت دیوبند تحصیل تھا ضلع نہ تھا مگر پھر بھی ایسے مقدمات کے لوگ آتے تھے اور کئی کئی دن ہماری اصطلاح میں بن بلائے مہمان ہو جاتے تھے، اگر کسی ناواقف خادم نے کسی ایسے مہمان کو جھڑک دیا یا نکال دیا تو جب تک اُسے حاضر نہ کیا جاتا کھانا موقوف رہتا۔ حضرتؒ مہمانوں کے ساتھ بنفسِ نفیس شریکِ طعام ہوا کرتے تھے، رات کو مہمانوں کی خدمت حتّٰی کہ حقہ تک تازہ کرتا، پاؤں دبانا جو تھکے ماندے خوابِ خرگوش میں

مدہوش ناواقف دیہاتیوں کے لیے باعثِ سکون ہوتا، آپ اس کا التزام اُس وقت بھی کرتے جب ماحول نیند میں ہوتا۔ سنّتِ ابراہیمی اور شفقتِ محمدی علیہما السلام کا عملی نمونہ آپ کی ذاتِ گرامی تھی، جب تک آخری مہمان کھانا ختم نہ کرلیتا آپ تھوڑا تھوڑا تناول فرماتے رہتے تاکہ مہمان پیٹ بھر کر کھالے۔ آپ کے دسترخوان پر تیس چالیس مہمانوں کا ہونا تو معمول تھا کبھی کبھی زیادہ بھی ہو جاتے، سب کو ایک ہی کھانا دیا جاتا، ناواقف مہمان کو اپنا لحاف دے کر خود رات چھپّہ میں گذار دیتے تھے، مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب نے فرمایا:۔

"مولانا خاندانی یا ذاتی حیثیت سے کوئی رئیس و متموّل شخص نہ تھے مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کو اہل اللہ اور نائبینِ انبیاء علیہم السلام کا سا حوصلہ اور ظرف عطا فرمایا تھا، الید العلیا خیرٌ مِّنَ الید السّفلیٰ پر ساری زندگی عمل رہا، وہ بہت کم دوسروں کے ممنون ہوئے اور انہوں نے ایک عالم کو ممنون کیا، اُن کا مہمان خانہ ہندوستان کے وسیع ترین مہمان خانوں اور ان کا دسترخوان ہندوستان کے وسیع ترین دسترخوانوں میں تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ اُن کا قلب اس سے بھی زیادہ وسیع تھا، بعض واقفین کا اندازہ ہے کہ پچاس مہمانوں کا روزانہ اوسط تھا، پھر اس میں ہر طبقہ اور ہر حیثیت کے لوگ ہوتے تھے، مولانا کی بشاشت، انتظام، مستعدی اور اہتمام بتلاتا تھا کہ اُن کو کس قدر قلبی مسرّت اور روحانی لذّت حاصل ہورہی ہے۔

ضیافت و مہمان نوازی اور اطعامِ طعام اُن کی روحانی غذا اور طبیعتِ ثانیہ بن گئی تھی، پھر مہمانوں کے ساتھ وہ جس تواضع اور انکساری اور جس اعزاز و احترام کے ساتھ پیش آتے تھے اُس کو دیکھ کر قدیم عرب شاعر کا یہ شعر بے اختیار یاد آتا تھا۔

وَاِنّیْ لَعَبْدُ الضَّیْفِ مَادَامَ نَازِلًا
وَمَاشِیمۃ لِیْ غیرھا تشبہ العبدا

(میں مہمان کا غلام ہوں جب تک وہ میرے گھر مہمان رہے، اور زندگی کا یہی موقع ہے جس میں میں غلام معلوم ہوتا ہوں) ـــــ صرف میزبانی اور مہمانی نہیں ہر موقع پر وہ کوشش کرتے تھے کہ ان کا ہاتھ اونچا رہے اور استفادہ کی

بجائے ان کو نفع اور افادہ کا موقع ملے، اگر کسی نے ذرا بھی ان کے ساتھ سلوک کیا اور کسی موقع پر کوئی خدمت انجام دی تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس فکر میں رہتے تھے کہ اس کے ساتھ کوئی سلوک کریں اور اس کے حق کو ادا کریں۔ ہم نے اہلِ بیت کرام کی سخاوت و شہامت و حوصلہ مندی کے جو واقعات پڑھے ہیں اُن کا پرتو مولانا کی زندگی اور اُن کے بعض معاصرین کبار کے اخلاق میں پایا۔[1]

استغنا — الید العلیا خیر من الید السفلیٰ ارشادِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے اوپر والا ہاتھ (یعنی دینے والا ہاتھ) نچلے ہاتھ (یعنی مانگنے والے ہاتھ) سے بہتر ہے۔ حضرت مدنیؒ نے ساری زندگی کسی امیر کے دروازہ پر دستک نہ دی تھی نہ کسی امیر کا قصیدہ لکھا بلکہ اپنے اسلاف کی طرح اللہ تعالیٰ پر توکل رکھا اور کسی کا احسان نہیں اٹھایا۔

(۱۱) صبر و تحمل — آپ صرف نسباً حسینی نہ تھے بلکہ عملاً بھی حسینی تھے۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں مخالفوں نے وہ کون ساحر یہ تھا جو آپ کے خلاف استعمال نہیں کیا۔ اخبارات، رسائل، تقاریر کو چھوڑ کر آپ کی ذاتِ عالی پر حملے، قتل کے منصوبے، امرتسر، جالندھر، انبالہ، سیدپور، بریلی وغیرھا کے واقعات میں جو خدام ساتھ تھے ان کو روکنا، دفاعی تدابیر نہ کرنا بلکہ حسینؓ ابنِ علیؓ کا پرتو بن کر یزیدیوں کے ظلم سہنا آپ کا شیوہ تھا۔ آپ نے جوابی دلائل میں بھی کوئی کلمہ ایسا نہیں بیان فرمایا نہ تحریر فرمایا جو شرافت کے معیار کے خلاف ہو بلکہ آپ نے ان کے لیے بددعا تک بھی نہ فرمائی اور بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی:-

"جہاں تک مجھے معلوم ہے تہجد اور سحور کے وقت مولانا کو ان ناشناسوں کے حق میں گریہ وزاری کے ساتھ دُعا کرتے سُنا گیا ہے"۔[2]

آپ کے اس صبر و تحمل میں بھی اتباع سیدِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی بدبخت قوم نے کس قدر تکالیف پہنچائیں، خصوصاً طائف کے تبلیغی سفر میں آپ کے جسدِ اطہر سے خون کے فوارے بہہ نکلے تھے مگر آپ نے پھر بھی یہ دعا فرمائی۔- اللّٰھم اھد قومی فانھم لا یعلمون۔ حضرت مدنیؒ نے بھی ان کے حق میں ہدایت کی دعا فرمائی کہ یہ اس وقت جس نشہ میں مدہوش ہیں

---

[1] پرانے چراغ ص ۱۱۳، ۱۱۴ [2] ایضاً ص ۱۱۲

ان کو کیا پتہ ہے کہ ان کا حشر کیا ہوگا؟

اسی طرح آپ نے مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے ایک انتخابی امیدوار کے لیے اس کے علاقہ کا دورہ کیا مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دوسرے کئی معتقدین آپ کے ہمراہ تھے کہ نماز جمعہ کا وقت آگیا، مولانا ندوی نے اپنا مشاہدہ بیان فرمایا ہے کہ :۔

"جمعہ کی نماز ایک قصبہ کی جامع مسجد میں پڑھی خطیب صاحب حضرات دیوبند کی تکفیر کرنے والوں میں سے تھے، انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھاکر بعض بزرگوں کے متعلق بہت کچھ کہا، مولانا سنتوں سے فارغ ہوکر خاموش بیٹھے، نماز ہوئی خاموش تشریف لے آئے، سفر کے آخر تک کبھی بھول کر بھی خطیب صاحب کا تذکرہ نہیں کیا۔ امیدوار صاحب نے کھانے کا پُر تکلف اہتمام کیا تھا، جیساکہ امیدوار صاحبان کرتے ہیں اور حلقہ انتخاب کے مقربین توقع رکھتے ہیں، مولانا نے اپنے ساتھ (مجھے) شریک کیا اور اس قدر جلد ہاتھ اٹھالیا کہ میں سمجھ گیا کہ وہ قوتِ لایموت کے طور پر اس کھانے کا استعمال جائز سمجھتے ہیں"۔ لہ

تبصرہ از مرتب "چراغِ محمد" حضرت مدنیؒ روحانیت کے بہت اونچے مقام پر فائز تھے، خوراک کی حقیقی حلت اور حرمت پر ان کی نظر تھی اسلیے جلد ہاتھ اٹھالیا، جیساکہ دورِ حاضر کے امام الاولیاء مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہٗ کھانا سامنے آنے پر اپنی روحانی بصیرت سے اس کی حقیقت کو محسوس فرماکر یا تو صاف انکار فرمادیتے تھے یا چند لقمے لے کر ہاتھ اٹھالیا کرتے تھے۔

خُلاصہ یہ کہ حضرت مدنیؒ کی زندگی سراپا اتباعِ سنّت تھی اور اسی کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اتباعِ سنّت کا ہمیشہ خیال رکھیئے، یہی کمال ہے، یہی مطلوب ہے، یہی رضاءِ خداوندی کا موجب ہے"۔ ۲ہ

◎

لہ پرانے چراغ صـ۱۰۳ ۲ہ مکتوبات جلد ۱ صـ۲۳۳

حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مکاتیب کی جامعیت اور اُن کی مُمتاز حیثیّت

علماء کرام اور صوفیائے عظام کے خطوط بھی اُن کے زبانی ارشادات اور تالیفات کی طرح راہنما ہوتے ہیں بلکہ خطوط میں یک گونہ زیادہ نفع ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام اور صوفیائے عظام کے خطوط جمع کیے گئے اور پھر شائع بھی کیے گئے۔ سیّدالاولیاء حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت مجدد الف ثانی رحمہا اللہ اور دیگر رُوحانی راہنماؤں کے مکتوبات اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہیں۔

یہاں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوباتِ مبارکہ کی چند خصوصیات درج کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوسکتا ہے کہ آپؒ کے مکتوبات کی ہمارے لیے کیا اہمیت ہے:۔

(۱) حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا، علمائے کرام، صوفیائے عظام اور عام مسترشدین بلکہ بعض اوقات سیاسی راہنما بھی آپ کی طرف تحریری طور پر رجوع کرتے تھے، آپؒ کے خطوط کئی ہزار ہیں اور وہ مختلف زبانوں میں ہیں، اردو، فارسی، عربی، ترکی میں بھی ہیں جن کا پورا احاطہ تو بہت ہی مشکل ہے۔ اگرچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بعض خطوط متفرق اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہے مگر کتابی شکل میں سب سے پہلے اسیرِ مالٹا مولانا وحید احمد صاحب کے خلف الصدق مولانا فرید الوحیدی نے ۱۹۴۲ء میں تین سو خطوط کا مجموعہ بنام "مکاتیبِ شیخ الاسلام" شائع کیا، مگر خطوط کا وہ مجموعہ جو تقریباً ۶۰۰ مکاتیب پر مشتمل ہے مولانا نجم الدین اصلاحیؒ[1] نے پندرہ سالہ محنت کے بعد نہایت ہی

---

[1] مولانا نجم الدین اصلاحی مشہور اور معروف عالمِ دین تھے، آپ نے اسلامی علوم حاصل کرنے کے بعد مولانا حمید الدین فراہی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مفید حواشی کے ساتھ چار جلدوں میں مرتب فرمایا جن میں سے پہلی دو جلدیں حضرت مدنیؒ کی حیات میں شائع ہو چکی تھیں اور دو بعد میں شائع ہوئیں۔

(۲) حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے فراستِ مومنانہ سے نوازا تھا مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی حالات پر آپ کی گہری نظر تھی اس لیے حالات اور زمانہ کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے آپ نے مسلمانوں کی ایسی راہنمائی فرمائی کہ آپ کے مکتوبات انشاء اللہ امتِ مسلمہ کے لیے راہنما ہوں گے۔

(۳) حضرت رحمۃ اللہ علیہ جیسے عدیم الفرصت انسان کو اتنا وقت کب مل سکتا تھا کہ سب خطوط کو حسبِ عادت پڑھ کر اُن سب کا فوراً جواب دیں، اس لیے خطوط کے جواب کے لیے سفر کا وقت میسر ہو جاتا تھا۔ آپ کے اکثر خطوط چلتی ریل گاڑی میں یا اسٹیشن پر لکھے ہوئے ہیں۔ ایک سفر میں یہ خادم بھی ساتھ تھا، یہ آپ کی عجیب کرامت تھی کہ چلتی ہوئی ریل گاڑی کی حرکت سے آپ کے قلم کو ذرا بھی جنبش نہ ہوتی تھی اور نہ مسافروں کی بھیڑ یا ان کی بول چال اور دیگر مشاغل توجہ گرامی پر اثر انداز ہوتے کیونکہ آپ اکثر ریل کے تیسرے درجے میں سفر کیا کرتے تھے ۔۔۔ یا پھر آپ کو جیل میں فرصت ملتی تھی، اس لیے بعض خطوط کے جوابات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خطوط آپ کی خدمت میں کافی عرصہ پہلے لکھے گئے تھے مگر جواب کی فرصت اُس وقت نہ ملی۔

(۴) خطوط جس زبان میں آپ کے نام آتے اُسی زبان میں آپ جواب ارشاد فرماتے، چنانچہ بعض

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

سے بھی اکتسابِ فیض کیا اور پھر ان ہی کے مدرسہ الاصلاح میں مدرس ہو گئے، آپ کے شاگردوں میں مولانا صدرالدین اصلاحی اور جماعت اسلامی ہند کے سابق امیر مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی جیسے علماء کرام بھی تھے، جناب ابوالاعلیٰ مودودی کے حلقۂ اثر میں دُوسرے علماء کرام کی طرح یہ بھی آگئے تھے مگر پھر جلد ہی اُن سے تعلقات ختم کر لیے، آپ کی عقیدت کا اصل مرکز مولانا حمیدالدین فراہی اور شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ تھے، ان کے بارہ میں فرمایا کرتے تھے کہ ان دونوں سے زیادہ پاکیزہ اور حسین زندگی کسی کی نہیں دیکھی، آخر میں تو حضرت مدنیؒ ہی کے ہو کر رہ گئے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مدنیؒ ہی کی دُعا کا فیض ہے کہ اللہ نے اچھے حال میں کر دیا۔ افسوس ہے کہ مولانا کا انتقال ۹۴ سال کی عمر میں ۱۴ اگست ۱۹۹۴ء کو ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ (معارف ستمبر ۱۹۹۴ء)

خطوط عربی زبان میں ہیں۔ اکثر خطوط کا جواب تو خود تحریر فرماتے مگر بعض خطوط کے جوابات تحریر کرنے کے لیے جناب قاری اصغر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو فرماتے اور جواب کا مضمون بھی اجمالاً تحریر کروا دیتے۔

(۵) خطوط کا جواب دیتے وقت سائل کے سوالات کا پورا جواب عطا فرماتے تھے کبھی مختصر اور کبھی تفصیل کے ساتھ، اس لیے بعض خطوط تو چند سطور پر مشتمل ہیں اور بعض کئی صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں:۔

(۶) سب سے بڑی اور ممتاز خصوصیت حضرت کے مکتوبات کی یہ ہے کہ سفر میں تحریر کیے ہوئے خطوط میں جن کتابوں کے حوالے آپ تحریر فرماتے اُن میں سے کوئی کتاب بھی سفر میں آپ کے پاس نہ ہوتی تھی۔ سامان بہت مختصر ہوتا تھا، اور جواب تحریر کرتے ہی کسی بھی ریلوے اسٹیشن کے لیٹر بکس میں سپردِ ڈاک فرما دیتے تھے، اس لیے آپ کے خطوط نہ صرف رسمی جوابات ہیں بلکہ علم و معرفت کا بیش بہا خزینہ ہیں ـــــ اگر کسی وقت حضرت رحؒ کے سارے خطوط حتی الامکان جمع کرکے شائع کیے جائیں تو ان سے بہت سے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں ـــــ یہاں حضرتِ مدنیؒ کے نو مکتوبات ھدیۂ ناظرین ہیں:۔

(۱)

یہ مکتوب گرامی عبداللطیف فاروقی سہارنپوری صاحب کے نام ہے، فاروقی صاحب حضرت رحؒ کے مرید تھے، چند خطوط حضرتؒ کے قلم سے ان کے پاس تھے جو مجھے عنایت فرما دیئے تھے ان میں سے ایک خط ہدیۂ ناظرین ہے:۔

محترم المقام زید مجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا والا نامہ میرے سامنے ہے، آپ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کا شوق ہے اس لیے کوئی طریقہ اس کا بتلائیں۔ بناءً علیہ عرض ہے کہ جُمعہ کی شب میں (یعنی جمعہ کے دن سے پہلے کی رات میں) نہا کر اور ستھرے کپڑے پہن کر خوشبو لگائیں اور صاف جگہ میں دو رکعت نماز نفل ادا کریں، ہر رکعت میں بعد سورۃ فاتحہ کے پچیس پچیس مرتبہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۰ پڑھیں اور سلام پھیرنے کے بعد ایک ہزار مرتبہ مندرجہ ذیل درود شریف پڑھیں:

صَلَّی اللّٰہُ عَلٰی مُحَمَّدِنِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ ۔ اس کے بعد قبلہ رُو سو جائیں، اسی طرح بار کی رات

ہیں اور اتوار کی رات میں ہر شب میں یہی عمل جاری رکھیں، انشاء اللہ ایک ہفتہ نہ گذرے گا کہ زیارت نصیب ہو جائے گی، غرضیکہ یہ عمل زیارت نصیب ہونے تک برابر جاری رہنا چاہیئے۔
واقفین پرسانِ حال سے سلام مسنون عرض کر دیں۔ والسلام
ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۳۵۹ھ

(۲)

حضرت مدنیؒ کے اُس مکتوب گرامی کی نقل جو شاہی قلعہ لاہور میں منعقدہ نمائش مؤرخہ ۱۰ جنوری ۱۹۵۸ء کو رکھا گیا تھا

محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مزاج شریف
میں اس وقت سفر میں ہوں، لاہور اور سہارنپور کے درمیان گاڑی چل رہی ہے، ایسے ہی اوقات میں فرصت ملتی ہے۔ پہلا والا نامہ میرے سامنے نہیں ہے یکم ربیع الثانی کا والا نامہ سامنے ہے، والدین کی اطاعت ہر اس چیز میں واجب ہے جو از قسم معصیت نہ ہو، لاطاعۃ للمخلوق فی معصیۃ الخالق، نیز والدین اگر غیر مسلم بھی ہوں تو ان کی خدمت گذاری اور حسنِ معاشرت ضروری ہے وَاِنْ جَاھَدٰكَ عَلٰٓی اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا (لقمٰن ۱۵) اگر خلافِ طبع ابن مفارقۃ زوجہ کا حکم کریں تو ابن کو زوجہ کا طلاق دینا ضروری ہے، جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کو حضرت عمر (رضی اللہ عنہم) نے فرمایا۔ بہرحال مکرہ اور منشط مجبوری اور خوشی میں والدین کو راضی رکھنا اور خدمت گذاری ضروری ہے، اِلَّا فی معصیۃ ــــ میں حسبِ ارشاد دُعا کرتا ہوں[1]

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ

(۳)

حقوق و فرائض زوجین

حضرت مولانا السید حسین احمد صاحب مدنی نوراللہ مرقدہٗ دینِ اسلام کی بنیادی قدروں سے پوری طرح واقفیت سے ممتاز تھے، اس لیے شریعتِ مطہرہ کے ہر حکم کو واجب العمل قرار دیتے تھے، آج تعمیر اور تجدید کا نام لے کر دینی اساس کو متزلزل کیا جا رہا ہے، یہ مکتوبِ گرامی اُن لوگوں کیلئے چشمۂ بصیرت ہے،

---

[1] ماہنامہ الارشاد اٹک مدنی نمبر رجب المرجب ۱۳۹۶ھ مطابق جون ۱۹۷۶ء

جو دینی قدروں سے ناواقف ہوتے ہوئے غیر مسلموں کے شاغبہ (پروپیگنڈہ) سے متاثر ہو جاتے ہیں اور دین میں قطع و برید کے ارتکاب کرنے کو اجتہاد اخدمتِ دین سمجھتے ہیں۔ یہ مکتوب منیف ایک بہن کے خط کے جواب میں ہے جس میں حقوقِ زوجین، حقوقِ نسواں اور اسلامی آئین کی افادیت پر مفصّل تبصرہ ہے۔ یہ مکتوب شریف "استقلال" دیوبند مورخہ ۲۸ اپریل ۱۹۳۷ء سے نقل کیا گیا ہے۔

بجناب صدر مدرس صاحب دیوبند زاد اللہ تعالیٰ درجاتہم

آداب و تسلیم قبول باد!

برائے مہربانی مسئلہ ھذا کے متعلق صحیح جواب دے کر ممنون فرمائیں ــــ وہ مسئلہ یہ ہے کہ کیا جس طرح مرد اپنی عورت کو طلاق دے سکتا ہے عورت خلع کرنے کرانے کی مالکہ نہیں؟ ضرور مالکہ ہے! یہ مسئلہ شیعہ سنّی دونوں فریق کے ہاں مشترک ہے کتاب فقہ موجود ہے، مگر بمبئی کے قاضی صاحب مرغا اندر کا بیان ہے کہ عورت کو کسی طرح کا حق ہی نہیں ہے۔ کیا اسلامی شریعت کا یہی انصاف ہے؟ اگر ایسا ہے تو اسلام کو دُور سے سلام ہے۔ براہ مہربانی اس کا جواب واپسی ڈاک فی الفور عنایت فرما کر ممنون کیجئے، اگر اردو اور انگریزی دونوں میں ہو تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ مسئلہ مقدمہ کی صورت قبول کرنے والا ہے۔

جواب از حضرت مدنیؒ

محترمہ زید مجدہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

آپ کا خط موصول ہوا جس کو دیکھ کر آپ کی ناواقفیت اور پست ذہنیت پر افسوس ہوا اور سب سے زیادہ افسوس اس بات پر ہوا کہ آپ کو اپنی غلطی کا احساس نہیں ہے اور پھر اس کو اسلام کے سر تھوپنا چاہتی ہیں۔

(۱) میری محترم بہن! اسلام ایک ایسا مقدس اور مکمل قانون ہے جس نے بہتر سے بہتر ذریعے تحفظِ حقوقِ انسانی کیلئے قائم کیے ہیں اور جس نے انسانی دنیا کے تمام وسائل ترقی و زندگانی کا تکفل کیا ہے وہ ہر قسم کی بھلائی کا ذمہ دار ہے، خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، خواہ سیاسی ہو یا اقتصادی، خواہ جسمانی ہو یا روحانی، خواہ دُنیاوی ہو یا اُخروی، خواہ مالی ہو یا ذرائع مال و دولت والی وغیرہ وغیرہ۔ ہاں ہر ذہن اور ہر عقل کسی معمولی ماہر فن کی باریک اور اعلیٰ باتوں کے سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے چہ جائیکہ کسی فوق العادۃ

اور غیر معمولی ہستی کی باریک باتیں اور اس کے بنائے ہوئے اعلیٰ قوانین ہوں مگر کسی قانون سے نفع اُس وقت حاصل ہوسکتا ہے جبکہ اس کو جاری کیا جائے اور اس پر عملدر آمد ہو، اگر قانون عمدہ سے عمدہ بنا دیا گیا مگر اس پر عمل نہیں کیا جاتا تو کوئی ثمرہ اور نتیجہ حاصل نہ ہوگا۔ علیٰ ھٰذا القیاس عمل صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ اس قانون کے پہلوؤں کو، اس کے دفعات کو سیکھا جائے اور ان پر عمل کی کوششیں عمل میں لائی جائیں۔

(۲) (الف) میری محترم بہن! تمام قوموں اور تمام ملکوں اور حکومتوں کا تسلیم شدہ قانون ہے کہ جو معاملات دو شخصوں کے درمیان مبادلہ کے جاری ہوتے ہیں اُن میں سے ہر ایک شخص کا اپنی چیز میں تصرف کرنے کا اختیار اُس وقت تک رہتا ہے جب تک کہ وہ معاملہ طے نہ ہو جائے اور جب طے ہو گیا اور ہر ایک نے اپنی رضامندی سے اس معاملہ کے تمام امورِ ضروریہ کو انجام دے دیا تو پھر اب پہلی چیز سے اس کا حق تصرف اُٹھ جائے گا، ہاں اُس چیز میں جو کہ اُس کو اس معاملہ کی وجہ سے ملی ہے حقِ تصرف حاصل ہو جائے گا۔ دُنیا میں تمام معاملات خرید و فروخت کے، اجارہ اور ٹھیکہ داری کے، تجارت اور صناعات کے اسی طرح جاری ہوتے ہیں، خرید و فروخت تمام ہو جانے کے بعد بیچنے والے کو اپنے مال سے کسی قسم کا تعلق باقی نہیں رہتا۔ علیٰ ھٰذا القیاس خریدنے والے کو زرِ ثمن سے کسی قسم کا تعلق نہیں رہ جاتا، اگر بیچنے والا مبیع میں یا خریدنے والا زرِ ثمن میں اس کے بعد کوئی مالکانہ تصرّف کرے گا تو قانوناً مجرم قرار دیا جائے گا۔ اس طرح اگر دونوں میں سے کوئی با اختیار خود اس بیع کو توڑنا چاہے تو بغیر دوسرے کی رضامندی کے اُس کو قانوناً یہ حق نہ ہوگا۔

(ب) ہاں اگر بائع یا مُشتری نے معاملہ طے کرتے وقت کوئی جائز شرط لگائی ہے اور اس کے مقابل نے اس کو قبول کر لیا ہے تو اب اس کا حق باقی رہے گا اور حسبِ شرط اس کو اپنی چیز میں تصرف کرنا جائز ہوگا، اسی طرح اگر اُس نے معاملہ کو توڑنے اور فسخ کرنے کی شرط لگا دی تھی تو اس کو بعد معاملہ کے بھی اختیار ہوگا کہ فسخ کر دے خواہ اب اس کا حریف راضی ہو یا نہ ہو۔

(ج) جو معاملات اجارہ اور ٹھیکہ داری کے ہوتے ہیں جن میں ایک طرف نقد اور دوسری طرف منافع کی تملیک ہوتی ہے، اصل چیز تو مالک کے ہی ملک میں باقی رہتی ہے، البتہ متاجر یا ٹھیکہ دار کو اس چیز کے منافع کو حاصل کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے خواہ حسبِ شرط تمام عمر کے لیے ہو یا طویل

مُدت کے لیے یا مہینہ یا دو مہینہ کے لیے ہو۔ جیسے مکانات، مزارع، باغات، جنگلوں، دکانوں اور مزدوروں وغیرہ کے اجارات کا قصہ ہے، ان میں مالکِ زمین و مکان وغیرہ کا معاملہ تمام ہو جانے کے بعد بغیر رضامندی اپنی زمین و مکان وغیرہ کو واپس لینے اور معاملہ کو توڑ دینے کا حق نہیں رہتا لیکن مُستاجر اور ٹھیکہ دار کو حق ہے کہ وہ ان منافع کو چھوڑ دے جن کا کہ وہ بوجہ معاملہ اجارہ مالک ہُوا تھا، البتہ اس کو ان نقود کے واپس لینے کا کوئی حق بغیر رضامندی مقابل نہ رہے گا جس کو اُس نے ادا کیا تھا۔

یعنی معاملہ اگر کسی مکان کے سکونت کے متعلق یا مزدور سے کسی خدمت کے متعلق ہُوا ہے تو وہ مُدتِ معینہ تک صاحبِ مکان کو اپنا مکان اور مزدور کو اپنی مزدوری پیش کرنی ضروری ہے، اگر کوئی اس میں کوتاہی کرے گا تو قانوناً مجرم قرار دیا جائے گا، مگر مستاجر کو یہ حق ہو گا کہ بغیر واپسی زرِ اجارہ مکان کو چھوڑ دے یا مزدور کو آزاد کر دے اور اس سے خدماتِ معینہ نہ لے، صاحبِ مکان یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری مرضی بغیر تجھ کو مکان چھوڑنے کا حق نہیں۔ علیٰ ھٰذا القیاس مزدور یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری بغیر مرضی تجھ کو مجھ سے خدمات نہ لینے اور آزاد کرانے کا حق نہیں اور نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ جس طرح بغیر مرضی تُو مکان چھوڑ سکتا ہے اسی طرح میں تیری بغیر مرضی اپنے مکان کو تجھ سے نکال سکتا ہوں۔ علیٰ ھٰذا القیاس مزدور کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کہے کہ جس طرح تو میری بغیر مرضی مجھ کو خدمات سے آزاد کر سکتا ہے اسی طرح مجھ کو بھی حق ہے کہ میں اپنے آپ کو خدمتِ معینہ سے نکال لوں، یہ مالکِ مکان یا مزدور ایسا کریں گے تو قانوناً مجرم قرار دیئے جائیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ زرِ نقد دینے والے کو ہر وقت یہ اختیار رہتا ہے کہ بغیر واپسی زر جس وقت چاہے اس منافع کو جن معاملہ پر کیا تھا چھوڑ بیٹھے خواہ اس کا حریف راضی ہو یا نہ ہو اور مالکِ مکان یا زمین یا مزدور کو بعد تمامی معاملہ پر اختیار نہیں رہتا، ہاں اگر بوقتِ معاملہ مالک سے کوئی جائز شرط لگائی تھی تو بیشک اس کو بھی حق رہے گا کہ حسبِ شرط جب جی چاہے اپنی چیز کو نکال لے۔ خواہ مکان ہو یا گھوڑا، خواہ زمین ہو یا باغ وغیرہ وغیرہ۔

(د) اگر مالکِ زمین و مکان، مزدور وغیرہ معاملہ کرنے کے وقت بلا شرط معاملہ کر لیتے ہیں اور معاملہ طے ہو جاتے، زرِ نقد پر قبضہ کر لیتے، معاملہ کے رجسٹرڈ ہو جانے، شہادتوں کے قائم ہو جانے کے بعد چاہتے ہیں کہ بغیر رضامندی فریقِ مقابل اپنی چیز کو مُستاجر اور ٹھیکہ دار کے قبضہ سے نکال لیں تو یقیناً

جج کا یہی فیصلہ ہوگا کہ تم کو ہرگز اختیار نہیں ہے اگر تم ایسا کرو گے تو مستحقِ سزا ہوگے، اگر تم کو ایسا کرنا تھا یا ایسی مشکلات کا کھٹکا تھا تو تم کو قانون کی دفعات اجازت دیتی تھیں کہ تم معاملہ کے وقت ایسی شرطیں لگا لینتے جن سے تم کو آج یہ مجبوری پیش نہ آتی، اب تمہارے لیے ماسوائے تسلیم کوئی چارہ نہیں تم نے اپنے پیر پر خود کلہاڑی ماری، تم نے کیوں نہیں شرطیں لگائی تھیں۔

میری محترم بہن! یہی حالت عقدِ نکاح کی ہے، اسلام نے عقدِ نکاح کو مثل عقدِ اجارہ قرار دیا ہے، جس طرح مکان یا زمین کا مالک کسی طویل یا قلیل مُدت کے لیے بمقابلہ زرِ نقد معجل یا موجل منافع مکان کو بیچتا ہے اور ٹھیکہ دار یا مستاجر کو ان منافع کے وصول کرنے کا حق دیدیتا ہے، اسی طرح عورت تمام عمر کے لیے اپنے منافع انوثیت و ولادت کو مرد مستاجر کے ہاتھ بیچ دیتی ہے اور حق استفیاد دیدیتی ہے زرِ مہر اس کا عوض ہے۔ فقط فرق اتنا ہے کہ یہاں کوئی مدت معیّن نہیں ہوتی تمام عمر کا اجارہ ہوتا ہے، اور وہاں کبھی کبھی مدت معین ہوتی ہے اور کبھی تمام عمر سالہا سال کا اجارہ ہوتا ہے۔ اسلام نے عورت کو اختیار دیا ہے کہ وہ نکاح کرتے وقت جائز شروط کر لے، اُن کے بعد اُس کو خُلع اور طلاق کا پورا اختیار ہوگا اور بلا رضامندی شوہر اپنے آپ کو حسبِ شروط طلاق دے سکے گی۔ مثلاً اگر یہ شرط ہو کہ تم نے بعد از نکاح مجھے نان و نفقہ نہ دیا یا تُو نے مجھے ماہوار اتنے روپے نہ دیئے یا تُو نے زرِ مہر اتنے دنوں میں نہ دیا یا تُو نے مجھ کو مارا پیٹا یا تُو نے میرے بعد کسی اور عورت سے نکاح کر لیا وغیرہ وغیرہ، تو مجھ کو اختیار ہوگا کہ میں اپنے اوپر ایک یا دو یا تین طلاق واقع کر لوں۔ اگر یہ شرط خاوند نے مان لی اور گواہوں کے سامنے اس کا اقرار کر لیا یا کابین نامہ میں تحریر کر دیا یا قاضی کے رجسٹر میں لکھوا دیا تو عورت کو حسبِ شرط اختیار ہو گا کہ وہ بلا رضامندی شوہر طلاق واقع کر لے شوہر کی ایک نہ سُنی جائے گی۔

ہاں اگر عورت نے یا اُس کے ماں باپ نے یا اُس کے وکیل ولی نے نکاح کرتے وقت بلا شرط معاملہ کر لیا تو پھر استحقاقِ طلاق و خلع بغیر رضامندی اور عبارتِ شوہر نہیں ہوگا، شوہر نے زرِ مہر خرچ کیا ہے اُسی کو اختیار ہوگا کہ ان منافع کو جو بعوض زرِ مہر ملک میں آئے تھے چھوڑ دے یا نہ چھوڑے، عورت کو اس میں دم مارنے کی اجازت نہ ہوگی۔ اس صورت میں الزام قانونِ اسلام پر ہرگز عائد نہیں ہو سکتا اس کی تمامتر ذمہ داری عورت پر اور اس کے اولیاء وغیرہ پر ہے کہ انہوں نے بوقتِ عقدِ نکاح کیوں نہیں جا سمجھا۔

میری محترم بہن! جو فتویٰ قاضی مرغا صاحب نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے وہ اسی صحیح قانون پر مبنی ہے، اس کے معنی یہ نہیں کہ عورت ہر وقت میں اور ہر طرح مجبور محض ہے اور اس کو کسی وقت بھی اختیار نہیں ہے، بلکہ جس طرح ابتدائی معاملہ کے وقت (یعنی عقدِ نکاح کے وقت) میں بغیر مرضی کے عورت کا نکاح نہیں ہو سکتا اور کسی شخص کو خواہ باپ ہو یا بھائی یا اور کوئی رشتہ دار ہو عاقل، بالغ عورت پر جبر کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، نہ نفسِ نکاح کے متعلق اور نہ کسی معیّن شخص کے متعلق۔ اسی طرح زرِ مہر معیّن کرنے کا حق بھی عورت ہی کو ہے۔ ماں باپ، رشتہ دار، وکیل وغیرہ اسی کی مرضی سے جو چاہیں مقرر کر سکتے ہیں اور اگر وہ نہ کریں گے تو مہرِ مثل لازم آئے گا۔ علیٰ ھٰذا القیاس اس عورت کو اور اس کے اولیاء کو شروط کا حق تھا، جب انہوں نے بلا شرط عقدِ نکاح کیا تو اب خُلع کا بغیر مرضئ شوہر حق ہرگز نہیں رہا۔

آپ کا یہ فرمانا کہ (کیا اسلامی شریعت کا یہی انصاف ہے، اگر ایسا ہے تو اسلام کو دُور سے سلام ہے) آپ کی ناواقفیت کی دلیل ہے، اگر آپ کو یا آپ کے کسی رشتہ دار کو اس قسم کی کوئی مشکل پیش آ گئی ہے تو خود اپنے قصور کی وجہ سے پیش آئی ہے، آپ نے نکاح کے وقت کیوں ایسی شرطیں نہ لگائی تھیں جن سے آج کی مشکلات کا ازالہ ہو جاتا۔ اسلام نے آپ کے ہاتھ پیر کھول دیئے تھے، آپ کو مردوں کے برابر حقوق دیئے تھے، وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرہ ۲۲۸) (عورتوں کو اس قسم کے حقوق حاصل ہیں جس قسم کے اُن پر مردوں کے ہیں) البتہ چونکہ مرد زرِ مہر خرچ کرنے والا مثل مُستاجر اور ٹھیکہ دار کے ہے اور عورت زرِ مہر کو لینے والی اور اپنے منافع خاصہ کو بعوض مہرِ مثل مالک زمین و مکان سونپنے والی ہے۔ اور چونکہ فطری طور پر مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اس لیے مرد کو ان حقوق پر کچھ زیادتی ہو گی (وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرہ ۲۲۸)) "مردوں کو حقوق میں عورتوں سے قدرے زیادتی ہے" اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ (النساء ۳۴) "مرد عورتوں پر حکومت رکھتے ہیں اس بناء پر کہ خداوند تعالیٰ نے بعض کو بعض خلقت پر فضیلت دی ہے اور اس بناء پر کہ انہوں نے اپنے مال خرچ کیے"۔

غرض کہ اسلام اور اس کے قوانین نے آپ کو ہرگز مجبور و مقیّد نہیں کیا تھا، آپ اپنی خود مرضی یا غلط کاری کی وجہ سے مجبور ہوتی ہیں، اب آپ اس منصفانہ قانون کو روندنا چاہتی ہیں جس کو تمام

معاملات میں آپ خود اور دنیا کی تمام قومیں انصاف اور عدل سمجھ کر جاری کرتی ہیں۔ آپ کا یہ فرمانا کہ "ایسا ہے تو اسلام کو دُور سے سلام ہے" انتہائی ظلم اور غلط کاری پر مبنی ہے اس سے توبہ کیجئے ورنہ اسلام آپ کو دُور سے سلام کرے گا۔ یوریپین قوموں اور اُن کی غلط اور انصاف کُش دُور از عقل کاروائیوں اور خیالات سے ہرگز ہرگز متاثر مت ہوئیے، اسلام نہایت شفقت اور عدل کا مذہب ہے اور اس میں ذرہ برابر بے انصافی اور کمزوری نہیں۔ شکر کیجئے اور مضبوطی سے اس کو پکڑیئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہم کو ہدایت فرمائے۔ میں نہایت عدیم الفرصت ہوں اسی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی، معاف فرماویں۔

والسلام

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

(۴)

پنجاب کے مشہور سجادہ فتح اللہ شریف کے سجادہ نشین حضرت مولانا محمد یعقوب نور اللہ مرقدہٗ کے نام حضرت مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا گرامی نامہ۔

محترم المقام زید مجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ، مزاج شریف

والا نامہ ۶ ربیع الثانی اس وقت میرے سامنے ہے، مجھے افسوس ہے کہ میری معروضات لاہور اور پشاور کو آپ نے دل شگاف دیکھا اور آپ کو اس سے تکلیف ہوئی معافی کا خواستگار ہوں۔ میرا یہ عرض کرنا کہ کسی قابل اور کامل کو تلاش کیجئے، اظہارِ حقیقت نہیں تو کیا ہے۔ اکابر کی ہمیشہ نصیحت رہی ہے کہ بیعت خوب سمجھ بوجھ کر آزما کر تجربہ کر کے کسی متبع سنت وشریعت سالک طریقت، صحبت یافتہ اہل اللہ، تارک دنیا، متقی و پرہیزگار سے ہونا چاہیئے، مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے است　　پس بہر دستے نباید داد دست

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: المرء علیٰ دین خلیلہ فلینظر من یخالل۔

میرے محترم اُسنی سُنائی باتوں پر اعتماد کر لینا غلط کاری ہے پورا تجربہ ہونا چاہیئے،

ع　کہ خبثِ نفس نگردد بسالہا معلوم

میرے محترم! بیشک مجھ کو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اہل اللہ اور مخلصین کی دریوزہ گری اور ان کے در کی خاکروبی نصیب ہوئی مگر حسب قول شاعر ؎

تہیدستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل ... کہ خضر از آب حیوان تشنہ می آرد سکندر را

نفس پرستی، تکاسل، محنت اور جفاکشی در راہِ طریقت وسلوک سے جان چرانے اور لایعنی امور میں انہماک نے ہر طرف محرومی کی راہ دکھلائی ؎

سودہ گشت از سجدۂ راہ بتاں پیشانیم ... چند بر خود تہمت دینِ مسلمانی نہم

از نقطۂ مقصود نہ شد فہم حدیثے ... لاَ دین وَلاَ دنیا بیکار بماندیم

پھر اس پر طرّہ یہ ہوا کہ احباب کو حسنِ ظن خلافِ واقع یہ پیدا ہوا کہ آپ زبدۃ العارفین، رئیس السالکین وغیرہ الفاظ لکھ رہے ہیں جو کہ نفس الامر سے بالکل دور ہیں، ایک نفس کے کتے دنیا دار، ننگِ اسلاف کے لیے ایسا لکھنا اور سمجھنا کس طرح جائز ہے ؎

بظن النّاس بی خیرًا و انّی ... لشر الخلق ان لم یعف عنّی

میرے محترم! اگر میں واقعیت کا اظہار کروں اور خیر خواہانہ نصیحت کروں اور یہ کہوں کہ کسی ایسے پیر کی تلاش کرو جس میں مرشدی کی شرائط موجود ہیں تو آپ شکستہ خاطر ہوں اور دل شکافی سمجھیں، آپ ہی بتلائیے کہ کہاں کا یہ انصاف ہے، میں اگر حلف کھا کر کہوں کہ میں انتہائی درجہ کا گندہ، مبتلائے معاصی ونجاست، ارذل خلق اللہ اپنے اعمال کی وجہ سے ہوں تو مجھ کو یقین ہے کہ میں حانث نہ ہوں گا، بے شک اللہ تعالیٰ کی نعمتیں مجھ پر لاتعداد ولا تحصی ولا تحصر ہیں مگر میری تقصیرات اور دیدہ دیری اور بے حیائی اور بے غیرتی بھی تو لامحدود ہے، آپ کو غلطی میں نہ پڑنا چاہیئے، یہی عرض میری اب بھی ہے اور اگر آپ کو میری باتوں پر اعتماد نہیں ہے اور اس غلط روی کو چھوڑنا نہیں چاہتے تو کم از کم سات مرتبہ اس امر کے لیے استخارہ مسنونہ ضرور کریں اگر اس میں کوئی اشارہ اس امر کے لیے ہوا تو کوئی صورت کی جائے گی، یا آپ دیوبند تشریف لانے کی زحمت گوارا کریں یا میں انشاء اللہ کسی قریب کے شہر یا مکان میں جب جانا ہوگا تو آپ کو اطلاع دوں گا، انشاء اللہ۔ (۲) وساوسِ مذہبیہ کے لیے ظاہری علاج تو یہ ہے کہ آپ "تقریر دلپذیر" مصنفہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

کتب خانہ اعزازیہ دیوبند سے منگوا کر مطالعہ فرمایا کریں' عملی حیثیت سے یہ کریں کہ مٹی کے کورے برتن میں جس میں لکھنا اور دو تین لوٹا پانی رکھنا ممکن ہو پہلے مع بسم اللہ سورۂ والناس لکھیں پھر اس میں پانی بھر دیں اور اس پانی سے پئیں اور وضو کریں' جب تک وہ پانی باقی رہے اُسی کو پیا کریں' یہ عمل چودھویں رات میں ہونا چاہیئے' نیز ہر نماز کے بعد تین تین مرتبہ سورۂ الم نشرح اول و آخر درود شریف تین تین دفعہ پڑھ کر سینہ پر دم کر لیا کریں اور ہاتھوں پر دم کر کے چہرہ اور سر پر پھیر لیا کریں۔ (۳) اقتصادی حالت کے لیے سورۃ لایلٰف قریش روزانہ عشاء کے بعد ایک سو ایک دفعہ' اوّل و آخر درود شریف گیارہ گیارہ مرتبہ پڑھا کریں۔

والسلام: ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہ
۲ رجمادی الاول ۱۳۶۱ھ

(۵)

۱۹ ذیقعدہ ۱۳۵۳ھ

اخی المحترم سلمکم اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

وصلنی مکتوبکم المنیف نشکرت اللہ تعالیٰ علیٰ صحتکم واما ما ذکرتم من الرؤیا فعسی اللہ تعالیٰ بمنہ وکرمہ یصدق ذٰلک واما البیعۃ فان شاء اللہ العزیز تتحقق بعد ما نتلاقی واما اجازۃ حزب البحر فقد اجزتکم کما اجازنی بہ مشائخی الکرام واما قرأۃ الفاتحۃ فی الوقف علیٰ کل ایۃٍ فھٰذہ عادۃ النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم فی قرأتھا کما ھو مذکور فی الصحاح من الحدیث۔

والسلام ختام والمرجوان لا تنسونی من الدعوات الصالحۃ

داعیکم حسین احمد غفرلہٗ (مطبوعہ مکتوبات شیخ الاسلام جلد ۳ ص ۱۱۹)

مکتوب گرامی کا پس منظر احقر کے نام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ پہلا مکتوبِ گرامی ہے جس کا پس منظر یہ ہے کہ:۔

احقر شعبان کے آخر میں امتحان سے فراغت پر حضرت نوراللہ مرقدہٗ کی اجازت اور خصوصی سند کے عطیہ کے بعد گھر آ گیا، رمضان شریف مصروفیت میں گذرا اور حضرتؒ بھی حسبِ معمول سلہٹ تشریف

لے گئے، شوّال میں طلباء کی آمد شروع ہو گئی، اس میں مصروف رہا معلوم ہوا کہ حضرتؒ بھی دیوبند تشریف لا چکے ہیں، تو پہلا عریضہ عربی زبان میں ارسالِ خدمت کیا، بظاہر یہ ایک قسم کی حماقت تھی مگر دیوانہ بہ کارِ خویش ہشیار، مقصد یہ تھا کہ اردو خطوط کے جوابات تو اکثر قاری اصغر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لکھوائے جاتے ہیں مگر عربی خطوط کے جواب حضرتؒ خود تحریر فرماتے ہیں، اس لیے یہ عربی زبان میں تحریر کیا گیا جس میں مندرجہ ذیل گذارشات تھیں۔

(۱) بیعت کی درخواست، حضرتؒ کی عادت تھی کہ ویسے بھی خواہشمند حضرات کو تھانہ بھون یا رائپور جانے کا حکم فرماتے تھے اور طلباء کو تو بہت کم بیعت فرماتے تھے وہ بھی کامل استخارہ کے بعد۔ احقر نے اپنا وہ خواب تحریر کر دیا جس میں سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی نقل کر دیا کہ بیعت ضرور کی جائے۔ (یہ خواب مکتوبات میں درج کیا گیا ہے)

(۲) دعائے حزب البحر کی اجازت کی درخواست تھی۔ یہ دعا میرے والد ماجد نور اللہ مرقدہٗ بالالتزام پڑھا کرتے تھے اور اس کی کئی برکات ہیں۔ اس لیے اکثر سلاسل کے پیشوا اس کا ورد فرماتے ہیں، احقر کو اس دعا کی اجازت حضرت حافظ محمد ابراہیم صاحب قدس سرہٗ سابق سجادہ نشین موسیٰ زئی شریف، حضرت حاجی صاحب ترنگزئی، حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب، حضرت مولانا حسین علی صاحب نور اللہ قبورہم سے حاصل تھی مگر حضرتؒ کی اجازت بھی ضروری تھی۔

(۳) جب کبھی حضرتؒ کی اقتداء میں جہری نماز پڑھنے کی سعادت ملتی تو حضرتؒ بالالتزام سورۃ فاتحہ کی ہر آیت پر وقف کرتے تھے، اس التزام کی وجہ دریافت کرنی تھی۔

چنانچہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے اس نورنامہ میں تینوں درخواستوں کو قبول فرمایا کہ بیعت بوقتِ ملاقات کر لی جائے گی، حزب البحر کی اجازت ہے، سورۃ فاتحہ کی ہر آیت پر وقف سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ تھی۔

احقر نے حزب البحر کا وِرد کئی سال رکھا اور بہت فوائد حاصل ہوئے مگر پھر چھوڑ دیا کہ اس میں جلالی اشیاء کے کھانے سے پرہیز ضروری ہے اور تقویٰ، اعمال کی صحیح ادائیگی اور دیگر کئی امور ضروری ہیں۔ احقر ان سب کو پوری طرح ادا کرنے سے قاصر تھا، ویسے چند دیگر وجوہ بھی تھیں، اس لیے کئی سال وِرد رکھنے کے بعد ترک کر دیا۔ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل

(ف) حضرت مدنیؒ اپنے خطوط کی ابتداء "محترم المقام" سے فرماتے تھے اور آخر میں اپنا دستخط اکثر اوقات "ننگِ اسلاف" سے شروع فرماتے تھے، کبھی کبھی "چراغ محمد" بھی تحریر فرمایا کرتے تھے۔ ہمارے تمام اکابر کے دستخطوں میں عجز، انکساری اور عبدیت آشکارا تھی۔ بانیٔ دارالعلوم دیو بند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ "ہیچمداں محمد قاسم" تحریر فرمایا کرتے تھے، جبکہ حضرت شیخ الہندؒ "بندہ محمود" تحریر فرمایا کرتے تھے۔ یہی حال سب اکابر کا تھا۔ حضرت مدنیؒ نے اس کی وجہ یہ ارشاد فرمائی،۔

"واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے حضرت قطبِ عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ العزیز اور حضرت قطبِ عالم مولانا گنگوہی اور حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز کے دروں تک پہنچایا اور ان مقدسین کے جوتے سیدھے کرنے کی نعمت نصیب ہوئی مگر اپنی نفس پرستی اور کج روی اور بدنصیبی اور کسلمندی کی بناء پر کورا ہی رہا ؎

تہی دستانِ قسمت راچہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضر از آبِ حیوان تشنہ مے آرد سکندر

اِسی بناء پر اپنے آپ کو ننگِ اسلاف لکھتا ہوں، یہ لکھنا تکلفاً نہیں بلکہ حقیقت میں اسلاف کرام قدس اللہ اسرارہم کے لیے ننگ و عار ہی ہوں، اپنی جگہ پر سخت شرمسار ہوں، اپنی حالت پر نفرتیں بھیجتا ہوں، لوگوں کا میری نسبت حسنِ ظن بالکل غیر واقعی ہے، اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم اور احباب کے حسنِ ظن سے مجھ کو بخش دے تو یہ اُس کا جُود وفضل ہے ورنہ میں کسی کام کا نہیں ہوں ؎

یظن الناس بی خیرًا وانی
لشر الناس ان لم یعف عنی"[1]

ف:۔ مقامِ قرب میں عبدیت کا جوہر زیادہ واضح ہو جاتا ہے، نماز میں حالتِ قیام میں حمد وثنا ہوتی ہے مگر رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم اور سجدہ میں جو اللہ تعالیٰ کے قرب کا سب سے بڑا مقام ہے بندہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی کامل عبدیت کا اظہار کرتا ہے۔

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام جلد ۲ ص ۱۶۹

(۶)

حضرتِ مدنی نوراللہ مرقدہٗ کا گرامی نامہ اپنی بڑی صاحبزادی[1] کے نام

آج رمضان کی ۱۱ تاریخ ہوگئی یعنی ہم کو تم سے جدا ہوئے پندرہ دن (آدھا مہینہ) گذر گیا مگر تم نے اپنے ہاتھ سے آج تک کوئی خط نہیں بھیجا، اس کا جواب تو یہ تھا کہ میں بھی تم کو خط نہ لکھتا مگر تمہاری آپا کی خفگی سے پہلے بھی خط لکھ چکا ہوں اور آج بھی لکھ رہا ہوں۔ یہاں آنے کے بعد سے اب تک تین مرتبہ بارش سخت آندھی کے ساتھ ہو چکی ہے، گرمی اور لُو کا نام تک نہیں ہے، رات کو اچھی ٹھنڈک ہو جاتی ہے، کھانے نہایت عمدہ ملتے ہیں تمہاری آپا تو ایسے کھانے کہاں کھلاتی ہے، یہاں کئی سو مہمانوں کا کھانا روزانہ پکتا ہے، ہم نو بجے شب سے تراویح میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور ساڑھے گیارہ بجے کے بعد فارغ ہوتے ہیں، آدھ گھنٹے کے بعد بارہ بجے سو جاتے ہیں، ایک بجے پھر نفلوں میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور پونے تین بجے فارغ ہو کر سحری میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ہم سے کوئل نے خواب میں شکایت کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ تم اُس کی خبر گیری نہیں کرتی ہو، اس کا پنجرہ بدل دو، سب کو سلام اور دُعا کہہ دو۔

ننگِ اسلاف حسین احمد بانسکنڈی آسام (۱۱ رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ)

۱؎ یہ گرامی نامہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی صاحبزادی کے نام ہے جو اب جنت الفردوس میں مقیم ہیں۔ اس گرامی نامہ میں اپنی اہل و اولاد کے ساتھ حسنِ معاشرت کا پاکیزہ نمونہ ہے کہ عالمِ اسلامی کا ایک عظیم محدث، وقت کا قطب الارشاد، مجاہدِ جلیل سیرتِ نبوی پر پورا عامل ہے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهٖ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِيْ

آپ نے گھر میں ایک کوئل پال رکھی تھی شاید اُسکی آواز سے اُنس ہو، اسی طرح چمپہ کے پھول بھی آپ کو محبوب تھے جبکہ خانقاہ کے وسط صحن میں مدینہ منورہ کے کیکر کا پودا تھا جو اب خشک ہو چکا ہے۔

(ف) رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار صاحبزادیاں حضرتِ زینب، حضرتِ رقیہ، حضرتِ ام کلثوم، حضرتِ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہن تھیں، تین پہلی تو حضور انور کی حیاتِ مبارکہ میں ہی خُلد آشیاں ہوگئی تھیں، حضرتِ فاطمہ رضی اللہ عنہا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ آخرت سے بعد رخصت ہوئیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر پر جاتے تو سب سے آخر میں حضرتِ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو شرفِ زیارت بخشتے اور جب واپس تشریف لاتے تو سب سے پہلے آپ کے ہاں رونق افروز ہوتے، حضرتِ فاطمہؓ حاضرِ خدمت ہوتیں تو اُن کی پیشانی کو چومتے۔ حضرتِ مدنی کا اپنی بچیوں کے ساتھ اس قدر پیار اور محبت بھی سیرتِ نبوی کا عکسِ جمیل ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

۷

مسئلہ تصوّرِ شیخ

حضرت مدنیؒ نے وفات سے ایک ماہ پہلے باوجود انتہائی ضعف و نقاہت کے ایک سائل کے جواب میں تصوف و سلوک کے ایک اہم مسئلہ "تصوّرِ شیخ" پر شافی جواب اپنے قلم سے تحریر فرمایا، یہ مکتوب مبارک ۵ نومبر ۱۹۵۷ء کو لکھا گیا اور ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو آپ کا وصال ہوگیا، اس مکتوب سے وجع القلب کی شدید کیفیت میں بھی آپؒ کے استحضارِ علمی اور اُمت کی ہدایت کے اشتیاق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، آپ فرماتے ہیں :-

خلاصہ یہ ہے کہ خطرات کے دُور کرنے اور خیالات کو جمع کرنے اور ہمت کو قوی بنانے کی عبادت میں جس قدر اہمیت ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے اور چونکہ تصوّرِ شیخ کی تاثیرات امر میں انتہائی درجہ مفید ہے، فان الشیخ فی قومہٖ کالنبیّ فی اُمتہٖ اس لیے تجربہ اور نصوص نے اکابر امت کو اس طریقے کے جاری کرنے پر آمادہ کیا تھا، امت کو اس سے بیشمار فوائد حاصل ہوئے جیساکہ حضرت عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے ظاہر ہے مگر چونکہ متاخرین غلط کاروں نے اس میں محظورات اور ناجائز اشیاء داخل کردیں مثلاً شیخ کو ہر جگہ حاضر و ناظر اعتقاد کرنا یا اسکے تصوّر اور توجہ الی الشیخ میں اس قدر منہمک ہوجانا کہ مقصودِ حقیقی اور محبوبِ تحقیقی سے مستغنی اور غافل ہوجائیں یا شیخ کو مثل کعبہ ہر نماز میں قبلہ اور متوجہ الیہ بنا لینا، باطن مرید میں شیخ کو متصرف سمجھنے لگنا (متصرف باستقلال کی نفی مراد) یا اس کی صورت یا شیخ کی حد سے زیادہ تعظیم کرنے لگے یا اس سے ناعاقبت اندیشوں اور احمقوں کا صورت پرستی حقیقی اختیار کرنا جیسے مختلف مبتدع پیروں کے یہاں رائج ہوگیا ہے، اس لیے سمجھ دار اکابرین پر لازم ہوگیا کہ اس پر نکیر فرمادیں اور ذریعۂ شرک و کفر جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔

بہرحال یہ امر نہ مطلقاً ممنوع ہے نہ مطلقاً ضروری ہے فتویٰ دینے اور عمل کرنے میں غور و فکر اور سوچ سمجھ سے کام لینا چاہیئے۔ واللہ اعلم (تذکرہ دیوبند بابت جون، جولائی ۱۹۶۷ء صا ۲۶)

(ف) حضرت تھانویؒ نے ایک حدیث سے استدلال کرتے ہوئے تصوّرِ شیخ کو ثابت فرمایا ہے مگر بوجہ غلبہ جہل اہلِ زمانہ کے اس کو متقین نے منع فرمایا ہے۔ (التکشف ص ۴۲۷)

(۸)

شیخ الاسلام حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کا آخری مکتوب گرامی جو آپ نے اپنی وفات سے ۲۳ روز پہلے مولانا عزیر گل کے بھائی مولانا عبدالحق نافع کا کا خیلی سابق استاذ دارالعلوم دیوبند کو اُن کے چھوٹے چھ سالہ صاحبزادہ محمد ابراہیم کی وفات پر انتہائی ضعف ونقاہت کی حالت میں اپنے دستِ مبارک سے لکھا۔

کتبت و لو انی مع الشوق قادر ؎ | لکنت مکان السطر فی طی قرطاس
وکنا کندمانی جذیمۃ حقبۃ | من الدھر حتی قیل لن یتصدعا
فلما تفرقنا کانی و مالکا | لطول اجتماع لم نبت لیلۃ معا [1]

سیدنا المحترم لا زلتم فی عیشٍ و دعۃٍ امین غب اھداء
التحیات والسلام التی سنہا سید الانام علیہ وعلی اٰلہ وصحبہ
الف الف صلوٰۃ وسلام۔

آنکہ مدت ہائے طویلہ کے بعد ناگاہ اس مہینہ میں والا نامہ باعثِ حیات روحانی ہوا، بڑے بھائی صاحب مدظلہ العالی نے تو اس قدر مقاطعت فرمائی ہے کہ جس سے صاف نمایاں ہوتا ہے کہ کبھی تعارف تھا ہی نہیں ؎

کیا ہو گئی وہ الفت یاران جان نثار | اب فاتحہ کو بھی نہیں آتے مزار پر

بہر حال مژدۂ خیر و عافیت سے بہت خوشی ہوئی وما کم اللہ وایاھم قلل المرادات فی الدارین۔ آمین

---

[1] زیر ترجمہ اشعار میں یہ خط لکھ رہا ہوں اور اگر میں اپنے شوق کے مطابق عمل کرنے پر قادر ہوتا تو کاغذ کے صفحات پر ہر ہر سطر کی بجائے میں خود ہوتا اور آپ تک پہنچ جاتا۔ ہم دونوں بھائی زمانہ دراز تک آپس میں یوں جڑے رہے جیسا کہ جذیمہ ابرش کے وہ دو تاریخی ندیم گذرے ہیں، ہمارے آپس کے تعلق و محبت کو دیکھ کر لوگ یوں کہتے تھے کہ یہ دونوں تو ہرگز ہرگز کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے لیکن جب ہم دونوں میں جدائی آگئی اور ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے تو پھر ایسے جدا ہو گئے کہ مدت دراز تک ساتھ رہنے بسنے کے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا میں اور مالک (شاعر کا بھائی) ایک رات بھی ساتھ مل کر نہیں رہے ہیں اور کبھی گویا دوستی تھی ہی نہیں۔

صاحبزادہ محمد ابراہیم مرحوم کے انتقال پُر ملال سے بہت صدمہ ہُوا، اجعلہ اللہ اجرًا و فرطًا وذخرًا للابوین والجدات واجعلہ خیرًا للآخرۃ من الاُولیٰ۔

اس کی والدہ ماجدہ اور جدۂ محترمہ کی خدمت میں کلماتِ صبر و تسکین حسب بشارتِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ پیش فرما دیجئے، اللہ تعالیٰ پسماندوں میں برکاتِ غیر متناہیہ ظاہر فرمائے۔ آمین

مَیں ماہ محرم الحرام سے وجع الفواد میں مبتلا ہو گیا ہوں تقریبًا نصف محرم سے آج تک کوئی سبق نہیں پڑھا سکا، معالجین کی طرف سے نقل و حرکت حتیٰ کہ جمعہ و جماعت کی بھی ممانعت تھی مگر اب مردانہ مکان میں جماعتِ خمسہ میں حاضری اور بعد از عصر احباب سے ملاقات کی اجازت تقریبًا پندرہ دن سے ہو گئی ہے، اس سے زیادہ چلنے کی طاقت نہیں ہے، سانس اکھڑ جاتا ہے، قلب اور سینہ پر نہایت زیادہ ناگوار اثر پڑتا ہے علاج اور پرہیز جاری ہے، تقریبًا ڈیڑھ ماہ ڈاکٹری علاج رہا مایوس ہو کر یونانی علاج جاری کیا گیا اس سے نفع ضرور ہے مگر نہایت تدریج سے، بہر حال آپ بزرگوں کی دُعاؤں کی بہت ضرورت ہے، گھر میں سب بچے اسعد، ارشد، ریحانہ، عمرانہ، صفوانہ، فرحانہ اور ریحانہ کا بچہ احمد بہت بہت سلام و آدابِ پیش کرتے ہیں اور یہ سب مع اپنی والدہ کے نہایت اخلاص کے ساتھ تحیاتِ مسنونہ اور استدعائے دعواتِ صالحہ پیش فرماتی ہیں۔

دار العلوم میں بحمد اللہ خیر و عافیت ہے، امسال طلباء کی تعداد چودہ سو ہے، دورہ میں ۲۸۱ طلباء ہیں، سالانہ بجٹ مصاریف کا تقریبًا سات لاکھ تک پہنچ گیا ہے، جلسہ دستار بندی کے لیے تحریکات جاری ہو رہی ہیں، (چند مہینوں سے) مولوی محمد عثمان صاحب گذشتہ پانچ سال سے چیئرمین (رئیس البلدیہ) دیوبند کے تھے اب اس سال میں بھی وہ ہی منتخب ہوئے ہیں یعنی اگلے پانچ سالوں کے لیے انشاء اللہ، انہوں نے اپنے زمانہ میں شہر کی خدمات اچھی انجام دی ہیں، ہم سبھوں کو آپ دونوں بھائیوں کی زیارت کا بہت اشتیاق ہے۔ والسلام

واقفین پرسانِ حال خصوصًا مولانا یوسف صاحب بنوری کو سلام عرض کر دیجئے۔

حسین احمد

از دار العلوم دیوبند

۸ ار ربیع الثانی ۱۳۷۷ھ

(روزنامہ الجمعیۃ دہلی شیخ الاسلام نمبر صـ ۳۲۹، ۳۳۰ مطبوعہ گوجرانوالہ)

(۹)

ہم اس عنوان کو حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے اُس مکتوبِ گرامی پر ختم کرتے ہیں جو آپ نے دورِ حاضر کے امام الاولیاء مولانا احمد علی لاہوری نور اللہ مرقدہٗ کو تقسیمِ برصغیر کے بعد تحریر فرمایا' وطن کی تقسیم سے جو اثرات مرتب ہوئے ان میں مسلمانوں کے دینی، علمی اور روحانی رشتوں کا انقطاع سب سے زیادہ افسوسناک اور اندوہناک ہے۔ جمعیۃ علماء ہند نے پاکستانی ارکانِ جمعیۃ کو یہ مشورہ دیا کہ اب آپ لوگ اپنی صوابدید کے مطابق کام کریں، اِس مرکز سے اب تمہارا تعلق منقطع کیا جاتا ہے۔ حضرتِ لاہوری رحمۃ اللہ جیسے گوہر شناس کو اس سے صدمہ ہوا تو آپ نے حضرت مدنی رحؒ کی خدمت میں ایک عریضہ میں یہ بھی تحریر فرمایا: "جن حضرات کے دامن سے وابستہ ہو کر ہمیں قیامت کے دن نجات کا بھروسہ تھا انہوں نے ہمیں الگ کر دیا" اس کا جواب حضرتِ مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے مندرجہ ذیل فرمایا جس کے بارہ میں حضرتِ لاہوریؒ نے فرمایا کہ اس مکتوبِ گرامی کو میں نے فریم میں محفوظ کر کے حرزِ ایمان بنا کر رکھا ہوا ہے۔

وہ یہ ہے

سیّدنا المحترم زید مجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

والا نامہ باعثِ سرفرازی ہوا، مندرجہ مضامین سے سخت متاثر ہوا۔ محترما! کیا آپ سے علاقہ کسی انجمن کے وجود و عدم اور اس کی ممبری پر موقوف ہے جس پر آپ متاثر ہوتے ہیں؟ کلّا واللہ ہم اور آپ حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز کے دربار کے دریوزہ گر اور اس بناء پر خواجہ تاش ہیں، یہ روحانی تعلق کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا، اگر مادّی اسباب حائل بھی ہو جائیں تو کیا ہے، ہماری ارواح ایک ہی دربار کی حاضر باش ہیں۔ حفظنا اللّٰہ وایّاکم من کلّ سوءٍ ورزقنا جمیعاً رضاہ فی الدنیا والآخرۃ۔ امین

گھر کے لوگوں اور صاحبزادوں اور دیگر احباب پرسانِ حال سے سلام مسنون عرض کر دیں، دعواتِ صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ والسلام

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

از دار العلوم دیوبند ۳ ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ

آپ کے پسندیدہ اشعار

حضرت مدنیؒ اور دیگر علمائے کرام وصوفیائے عظام منظوم کلام بھی کبھی پڑھا کرتے تھے اور تحریر بھی فرمایا کرتے تھے، جو کہ ایک لحاظ سے سیرت نبی رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہے، اس عنوان میں چند اشعار عربی، فارسی اور اردو کے درج کیے جاتے ہیں:۔

① حضرت مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ مندرجہ ذیل عربی رباعی زیادہ پڑھا کرتے تھے ؎

إِنَّ الَّذِيْ أَنْتَ تَرْجُوْهُ وَتَأْمُلُهٗ   مِنَ الْبَرِيَّةِ مِسْكِيْنُ ابْنِ مِسْكِيْنٍ

فَاسْتَرْزِقِ اللّٰهَ عَمَّا فِيْ خَزَائِنِهٖ   فَإِنَّ الْأَمْرَ بَيْنَ الْكَافِ وَالنُّوْنِ

(ترجمہ) بے شک وہ آدمی جس سے تجھے امیدیں وابستہ ہیں وہ تو خود محتاج ہے اور اس کا باپ بھی محتاج تھا، اس لیے اس اللہ تعالیٰ سے رزق مانگ جو اس کے خزانہ میں ہے کیونکہ وہاں تو حکم کاف اور نون میں ہے، یعنی کُنْ فرمایا تو کام ہو گیا۔

② کبھی کبھی مندرجہ ذیل شعر بھی بڑے سوز و گداز کے ساتھ پڑھا کرتے تھے ؎

ذَهَبَ الَّذِيْنَ يُعَاشُ فِيْ أَكْنَافِهِمْ   بَقِيَ الَّذِيْنَ حَيَاتُهُمْ لَا تَنْفَعُ

(ترجمہ) وہ لوگ تو چلے گئے جن کے سایہ میں زندگی گذاری جاتی تھی، وہ لوگ رہ گئے جن کی زندگی کچھ کارآمد نہیں

③ محی الدین ابن عربیؒ کا مندرجہ ذیل شعر بھی تحریر فرمایا جو آپ نے ایشیائے کوچک کے سلطان عزالدین کے جواب میں تحریر فرمایا تھا ؎

أُرِيْدُ أَرَى دِيْنَ النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ   يُقَامُ وَدِيْنُ الْمُبْطِلِيْنَ يَزُوْلُ

(ترجمہ) میری دلی خواہش ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین پھیل جائے اور باقی سب ختم ہو جائیں۔

④ فَلَيْتَكَ تَحْلُوْ وَالْحَيٰوةُ مَرِيْرَةٌ   وَلَيْتَكَ تَرْضٰى وَالْأَنَامُ غِضَابُ

(ترجمہ) کاش کہ آپ کی محبت کی مٹھاس مجھے حاصل ہو جاتی پھر چاہے زندگی کتنی تلخ ہوتی، اور کاش کہ آپ

مجھ سے راضی ہوجاتے خواہ ساری دُنیا ناراض ہوجاتی ۔

(۵) یظن النّاس بی خیرًا وّانّی   لشرّ النّاس ان لم یعف عنّی

(ترجمہ) لوگ مجھ پر نیکی کا گمان کرتے ہیں حالانکہ میں سب سے زیادہ گنہار ہوں اگر وہ اللہ تعالےٰ مجھ سے درگذر نہ فرمائے ۔

(۶) اذا صحّ الودّ منہ فالکلّ ھیّنٌ   وکلّ ما فوق التّراب تراب

(ترجمہ) جب اُس ذات اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبت صحیح ہو تو سب تکالیف پھر آسان ہیں، اور جو کچھ بھی مٹی پر ہے وہ سب کا سب مٹی ہونے والا ہے ۔ سب کائنات فانی ہے صرف اللہ تعالےٰ باقی ہے اس لیے اسی کے ساتھ تعلق قائم رکھنا ضروری ہے)

(۷) مولانا عبدالباری لکھنوی مرحوم کو اپنے مکاتیب گرامی میں چند اشعار درج فرمائے ہیں جن میں بعض عربی میں ہیں اور بعض فارسی میں ہیں ـــ

والنّفس کالطّفل ان تہملہ شبّ علیٰ   حبّ الرّضاع وان تفطمہ ینفطم

(ترجمہ) اور نفس کی حالت تو اُس شیر خوار بچے کی طرح ہے جو دودھ پیتا ہے اگر اس کے دُودھ کو بچپن (مدت پوری ہونے پر) ہی نہ چھڑا دیا گیا تو جوان ہونے پر دشواری ہوگی ۔

(۸) ساشکر عمروًا ان تراخت منیّتی   ایادی لم تمنن وان ھی جلّت

فتیٰ غیر محجوب الغنیٰ عن صدیقہ   ولا مظہر الشکویٰ اذا النعل زلّت

رایٰ خلّتی من حیث یخفی مکانہا   فکانت قذی عینیہ حتّیٰ تجلّت

(ترجمہ شعر ۱) جب تک میں زندہ ہوں عمرو کے احسانات کا شکریہ ادا کرتا رہوں گا اگرچہ اُس کے احسانات بہت زیادہ ہیں ۔

(ترجمہ شعر ۲) یہ ایسا نوجوان تھا جو اپنے دوست پر اپنا مال نثار کرتا تھا اور اگر کبھی دوست سے کچھ لغزش ہو جاتی تو پھر بھی زبان سے شکوہ و شکایت کا اظہار نہ کرتا تھا ۔

(ترجمہ شعر ۳) اُس نے میری دلی محبت کی وجہ سے میری ان تکالیف کو بھی بھانپ لیا تھا جو سب سے پوشیدہ تھیں، ان تکالیف کو جب تک اُس نے دُور نہ کر لیا ہوتا اس کی آنکھوں میں کھٹکتی رہتی تھیں ۔

⑨ جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ مارچ ۱۹۴۲ء کے خطبۂ صدارت کی ابتداء اس شعر سے فرمائی ؎

وَلَئِنْ نَطَقْتُ بِشُكْرِ بِرِّكَ مُفْصِحًا — فَلِسَانُ حَالِي بِالشِّكَايَةِ أَنْطَقُ

(ترجمہ) اور اگر تیرے احسان کا زبان سے شکریہ ادا کروں مگر میں زبانِ حال سے بہت زیادہ شکایت کرنے والا ہوں۔

⑩ أَمُرُّ عَلَى الدِّيَارِ دِيَارِ لَيْلَى — أُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارِ وَذَا الْجِدَارَا

وَمَا حُبُّ الدِّيَارِ شَغَفْنَ قَلْبِي — وَلٰكِنْ حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّيَارَا

(ترجمہ) میرا گذر لیلیٰ کے شہر پر ہوا تو میں نے گھر والوں اور اس گھر کی دیواروں کو بھی چوما۔
اگرچہ مجھے اس بستی سے کوئی محبت نہیں لیکن اس بستی کے مکین کی محبت نے میری نظر میں ان مکانوں اور دیواروں کو بھی محبوب بنا دیا ہے۔

فارسی زبان کے اشعار

① وصال و قرب چہ خواہی رضائے دوست طلب — کہ حیف باشد از و غیر از یں تمنائے

یعنی، تو وصال اور قرب کیا چاہتا ہے تجھے صرف اپنے محبوب کی رضامندی کی طلب ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ سے اس کے بغیر کچھ اور مانگنا یہ نا انصافی ہوگی۔

② جہاں اے برادر نہ ماند بہ کس — دل اندر جہاں آفریں بند و بس

یعنی: اے بھائی! یہ جہاں کسی کے کام نہیں آتا اس لیے اپنا دل صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ لگا لے اور بس۔

③ بجز تو شاہ دیگر نہ دارم بجز درِ تو درے دارم — الیک اسعیٰ و منک ارجو و ان سالت بہ کم سوالی

(ترجمہ) اے بادشاہِ حقیقی میرا تیرے بغیر کوئی نہیں اور تیرے دروازے کے بغیر میرے لیے کوئی دروازہ نہیں میں بوقتِ ضرورت تیری ہی طرف دوڑتا ہوں اور تجھ ہی سے ہر رحمت کی امید رکھتا ہوں خواہ کتنے ہی سوال کروں۔

④ حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کے نام اپنے مکتوب میں فرمایا ؎

جز یادِ دوست ہر چہ کنی عمر ضائع است — جز سرِ عشق ہر چہ بخوانی بطالت است

سعدی بشوئے لوحِ دل از نقشِ غیرِ حق — علمیکہ راہِ حق نہ نماید جہالت است

(ترجمہ) اپنے محبوبِ حقیقی (اللہ تعالیٰ) کی یاد کے بغیر جو بھی کرے گا عمر برباد کرے گا محبوبِ حقیقی کے عشق کے بغیر

جو بھی پڑھے گا وہ باطل ہے۔ سعدی اپنے دل کی تختی کو اللہ تعالےٰ کی یاد کے بغیر ہر چیز سے دھوڈال جو علم اللہ تعالیٰ کا راستہ نہ دکھائے وہ تو جہالت ہے۔

(۵) اپنے اکابر کا سلوک طریقت بیان کرتے ہوئے فرمایا "ہمارے اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ نے نہایت اعلیٰ اور اشرف طریقہ اختیار فرمایا، ان کا ظاہر نقشبندی (عمل کی پیروی) اور باطن چشتی (سوز و گداز) ہے ؎

بلبل نیم کہ نعرۂ زنم وردسر کنم — قمری نیم کہ طوق بہ گردن در آورم
پروانہ نیستم کہ بسوزم بگردِ شمع — شمعم کہ جاں گدازم و دم بر نیاورم

(ترجمہ) میں بلبل نہیں کہ نعرے لگاکر سر دردی کروں، نہ قمری ہوں کہ گردن میں طوق ڈال دوں، (ظاہری لباس وغیرہ کی نمائش کروں) پروانہ بھی نہیں کہ شمع کے اردگرد چکر لگاتے ہوئے جل جاؤں بلکہ میں تو شمع ہوں خود گل رہی ہوں (دینِ حق کی روشنی پھیلاتے ہوئے) اور آواز تک نہیں نکالتی۔

(۶) اس نااہل خادم کو ایک گرامی نامہ کے شروع میں فرمایا ؎

شبِ تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل — کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

اس نااہل نے عرض کیا تھا کہ کافی دنوں سے گرامی نامہ نہیں آیا، تو فرمایا کہ تجھے کیا پتہ ہے میں کس حال میں ہوں؟ پھر اسی کے ساتھ اردو زبان کا شعر بھی درج فرمادیا ؎

کسی کے درد اور غم کو کسی کا ناز کیا جانے
گذرتی صید پر کیا ہے دلِ صیاد کیا جانے (مکتوبات جلد ۳ ص ۱۱۶)

(۷) از دروں شو آشنا و از بیروں بیگانہ باش — ایں چنیں زیبا روش کمتر بود اندر جہاں

(ترجمہ) اندر (دل) سے لگائے رکھ اور باہر سے بےگانہ رہ (تن بکار) ایسی خوبصورت زندگی اس دنیا میں بہت کم میسر ہوتی ہے۔

(۸) یابم اُورا نیابم جستجوئے میکنم — بشنود یا نشنود من گفتگوئے میکنم

(ترجمہ) میں اسے (محبوبِ حقیقی کو) پاسکوں یا نہ پاسکوں تلاش کرتا رہوں گا، وہ توجہ کرے یا نہ کرے میں دل کا حال بیان کرتا رہوں گا۔

(۹) مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد — دگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

(ترجمہ) میرے دل میں ایک ایسا درد ہے اگر اس کو بیان کروں تو زبان کے جلنے کا خطرہ ہے
اور اگر اسے برداشت کروں تو ڈرتا ہوں کہ ہڈیوں کا گودہ بھی جل جائے گا۔

از مرتب یہ شعر بھی آپ نے جیل ہی سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم کو لکھا کہ جو کچھ میرے خلاف ہو رہا ہے بہتر یہی ہے کہ صبر کر لیا جائے اور معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد رہے۔

(۱۰) عشق چوں خام است بستۂ ناموس وننگ — پختہ مغزانِ جنوں را کے حیا ز بخیر است

(ترجمہ) جو کچے عاشق ہیں وہ تو لوگوں کے تمسخر سے ڈرتے ہیں لیکن جو عشق میں پکے ہیں اُن کے لیے
لوگوں کے طعنے اور استہزاء ہرگز روکنے والے نہیں۔

(۱۱) من آں خاکم کہ ابرِ نو بہاری — کند از لطف بر من قطرہ باری
اگر بر روید از ہر مو زبانم! — ادائے شکر لطفش کے توانم

(ترجمہ) میں وہ مٹی ہوں کہ موسم بہار کا بادل مجھ پر اپنے لطف وکرم سے بارش برساتا ہے
اگر میرے بدن کے ہر بال کو زبان عطا ہو جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کا شکر ادا
کریں تب بھی پورا شکر ادا نہ ہو سکے گا۔

(۱۲) مباش درپے آزار و ہر چہ خواہی کن — کہ در شریعتِ ما جز ایں گناہے نیست

(ترجمہ) یعنی کسی کو بھی دکھ نہ دے (بلکہ رحمت بن) کہ ہماری شریعت میں اس کے سوا کوئی (بڑا)
گناہ نہیں ہمارا اللہ رحمٰن اور رحیم ہے، ہمارے محبوب ہادی رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں
ہمارا دین پیغامِ امن (اسلام) ہے۔

(۱۳) جناب زاہد حسین صاحب کو ذکر اللہ کی ترغیب دیتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

ہر نفس بہر مسیحائیست چست — گر نداری پاسِ اُو از جہل تست
ایں چنیں انفاس خوش ضائع مکن — غفلت اندر شہرِ جان شائع مکن

(مکتوباتِ شیخ الاسلام جلد ۱ صفحہ ۲۳۳)

(ترجمہ) ہر سانس تیری مسیحائی کے لیے ہے اگر تو پرواہ نہ کرے تو تیرا قصور ہے۔ ان خوشگوار
سانسوں کو ضائع نہ کر، اپنے آپ کو غفلت میں مشغول نہ کر۔

(۱۴) مولانا محمد یونس صاحب کو ہندوستان کے مسائل پر مایوسی کے بجائے حوصلہ دلاتے

ہوئے لکھتے ہیں ؎

دورِ گردوں گر دو روزے برمراد ما نگشت دائما یکساں نماند کارِ دوراں غم مخور
ہاں مشو نومید گر واقف نہ از سرِ غیب باشد اندر پردۂ بازیہائے پنہاں غم مخور
گر بہار عمر باشد باز بر طرف چمن چترِ گل بر سر کشی اے مرغِ خوشخواں غم مخور

(مکتوبات شیخ الاسلام جلد ۲ ص ۱۷۸)

(۱۵) حضرت شیخ عبد الحق ردولوی کی مندرجہ ذیل رُباعی آپ کو بہت پسند تھی ؎

ہر آنکو غافل از وے یک زمانست ہماندم کافر است اما نہان است
مبادا غائبی پیوستہ باشد درے اسلام بروے بستہ باشد

(مکتوبات شیخ الاسلام جلد ۴ ص ۳۵۱)

اُردو زبان کے اشعار

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ اکثر اوقات سحری کو مندرجہ ذیل شعر نہایت ہی سوز و گداز سے پڑھا کرتے تھے ؎

(۱) جو چمن سے گذرے تو باد صبا یہ کہنا بلبلِ زار سے
کہ خزاں کے دن بھی ہیں سامنے نہ لگانا دل کو بہار سے

(۲) پڑا فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں

(۳) بدنصیب قوم کی ایذا رسانی پر فرمایا: "ہم تو ایسی سَبّ و شتم کے عادی ہو گئے ہیں سنکر کچھ تغیر نہیں ہوتا" ؎

رنج کا خوگر ہوا انسان جب تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

(۴) میری اُن رسمِ اُلفت مٹ گئی
مُدتیں گذریں زمانہ ہو گیا

⑤ مرادآباد جیل سے ایک مسترشد کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا ؎

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے دن رات
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

یعنی جیل میں اللہ تعالیٰ کی یاد کا وقت زیادہ ملتا ہے۔

⑥ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نوراللہ مرقدہٗ نے مرادآباد کی قید کا کچھ پس منظر آپ کو تحریر فرمایا تو آپ نے جواب میں جو گرامی نامہ جیل ہی سے مولانا کے نام تحریر فرمایا اُس میں یہ تحریر فرمایا ؎

نہ مرتے مرتے محبّت سے نہ مُنہ پھیرائیں نے
جفائیں سیکڑوں جھیلیں وفا پہ اپنی نازاں ہوں

یعنی اپنے شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیرِ مالٹا نے جو امانت آپ کے سپرد کی تھی اس کو ہر حال میں ادا کیا اور ہر تکلیف برداشت کی۔ (نوّراللہ مرقدہٗ)

⑦ ؎ عشق میں اُن کے کوہِ غم سر پہ لیا جو ہو سو ہو
عیش و نشاطِ زندگی چھوڑ دیا جو ہو سو ہو

⑧ ؎ یا یا رشتہ سب سے توڑ
یا یا رشتہ حق سے جوڑ

⑨ ؎ گر پائیں گے رقیب تو ٹکڑے اڑائیں گے
ہرگز نہ دیں گے اس بُتِ رعنا کے ہاتھ میں

⑩ ؎ اے دل خدا کے سوا کوئی اور ہمارا محافظ نہیں
اور گردشِ روزگار کے ڈنگ و زہر کا کوئی منتر بھی نہیں

ہندی زبان کا ایک شعر

⑪ ؎ سیّاں انکھیاں پھیریاں بیری ملک جہاں
ٹک جہاں کی اک مہر کی لاکھوں کریں سلام

(مکتوبات جلد ۴ ص ۱۸۳)

تحریکِ مدحِ صحابہؓ کی حمایت

مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے لیے جتنی بھی تنظیمیں اور ادارے سیاسی طور پر قائم ہوئے یا ہوتے ہیں ان میں "مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ" کو اساس بنایا جاتا ہے مگر کوئی سیاسی ادارہ مسلمانوں کے "عقائد کے تحفظ" کو اپنے منشور میں جگہ نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے جو جماعتیں بنائی گئی ہیں ان میں ایسے افراد بھی صرف شامل ہی نہیں کیے گئے بلکہ ان کو اعلیٰ مناصب بھی دیئے گئے جن کے عقائد اسلام کے بنیادی عقائد سے متصادم تھے (جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) البتہ جو سیاسی جماعت مسلمانوں کے حقوق کے حصول کے لیے بنائی جاتی ہے اور اُس کی اساس دین پر ہوتی ہے اس میں اسلامی عقائد کا تحفظ ضروری سمجھا جاتا ہے۔

چنانچہ جمعیۃ علماء ہند نے اپنے منشور میں اس تحفظ کو ضروری قرار دیا ہے، جیسا کہ جمعیۃ علماء ہند کے دستور کی دفعہ ۳ ۔ ۶ کے مطابق اغراض ومقاصد میں سے:۔

"(ب) مسلمانوں کے مذہبی، تعلیمی، تمدنی اور شہری حقوق کی تحصیل وحفاظت"

ایک عظیم مقصد قرار دیا گیا ہے۔

اسی طرح ہر دینی ادارہ، دینی مدرسہ بلکہ ہر عالم دین اسلامی عقائد کے تحفظ کو ضروری قرار دیتا ہے، اسلامی عقائد میں "صحابۂ کرامؓ کی عدالت" کو اولین حیثیت اس لیے حاصل ہے کہ دین سارے کا سارا صحابۂ کرامؓ کی وساطت سے اُمت تک پہنچا ہے۔ اگر صحابۂ کرامؓ کی عدالت کو کسی بھی رنگ میں مجروح کیا جائے گا تو پھر دینِ قیّم کا اُس شکل میں رہنا مشکل ہو جائے گا جس شکل میں سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور اللہ تبارک وتعالےٰ نے صحابۂ کرامؓ کے ایمان کو معیار بناتے ہوئے فرمایا تھا:۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِہٖ — پس اگر ایسا ایمان لے آئیں جیسا کہ اے صحابہ تمہارا

فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۟ (سورة البقرہ آیت ۱۳۷)

ایمان ہے پھر تو یہ ہدایت پا گئے اور اگر ایسے ایمان سے مُنہ موڑلیں تو پھر وہ ضدّی ہیں (اُن کی آپ پرواہ نہ کریں) آپ کیلئے ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کافی ہوگا اور وہ مُنہ کی باتوں کو سُنتا ہے دل کے ارادوں کو جانتا ہے۔

یہ آیت سورۃ بقرہ کی ہے جو مدنی ہے، اور اُس وقت منافقوں کا گروہ بھی نمایاں ہو چکا تھا جو بظاہر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے مگر عملاً اسلام کے مخالف تھے، یہی حکمت ہے کہ جب اہلِ کتاب ایمان لائے تو انہوں نے صرف ایمان کا اعلان ہی نہیں فرمایا بلکہ یہ بھی فرمایا:۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ۝ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ یُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (سورۃ المائدہ آیت ۸۳،۸۴)

اور جب سُن لیتے ہیں وہ کلام جو اتاری گئی اس رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر تو دیکھتا ہے کہ اُن کی آنکھیں (قرآن کی تاثیر سے) آنسو بہاتی ہیں کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لے آئے پس ہم کو بھی قرآن کے عینی گواہوں کے ساتھ لکھ دے۔ اور ہمیں کوئی رکاوٹ نہیں کہ ہم ایمان نہ لائیں اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہمارے پاس آ پہنچی ہے اور وہ حق ہے اور ہم اُمید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو داخل کر دے گا اُس قوم میں جو نیک بخت ہے۔

ان آیات میں واضح ہے کہ اہلِ کتاب نے اللہ تعالیٰ سے دُو دُعائیں مانگیں۔ ایک تو یہ کہ ہم کو اُن لوگوں کے ساتھ لکھ دے جو شاھدین ہیں یعنی جنہوں نے سیّدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت دی ہے اور وہ نزولِ وحی، احکامِ رسالت وغیرہما امور کے عینی گواہ ہیں۔ اور دُوسرا یہ کہ ہم کو اُس قوم کے ساتھ مندرج فرمادے جو کہ صالحین ہیں۔ چونکہ اہلِ کتاب کو اس بات کا علم تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد جو سعادت مند فلسطین کے بادشاہ ہوں گے وہ صحابۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے اور اس کی اطلاع زبور میں دی گئی تھی، جس کی قرآنِ عزیز نے خبر دیتے ہوئے فرمایا:۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا

بے شک ہم نے زبور (آسمانی کتاب) میں لکھ دیا تھا نصیحت کے بعد کہ اس سرزمین (فلسطین) کے

عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ہ (الانبیاء ۱۰۵) وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔

زبور میں صحابۂ کرام کو عباد صالحین سے تعبیر فرمایا گیا، اور یہ وہ سعادت مند گروہ ہے جن پر شبِ معراج سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پڑھا اور اُمت کے لیے نماز میں اس کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے ضروری قرار دیا کہ وہ نماز میں اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ کا اِقرار کرے اور یہ مبارک تحفہ صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے لیے پیش کرے۔

یہ تو زبور کا ذکر تھا، قرآن کریم سے پہلے دوسری دو کتابیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئی ہیں اُن میں تو صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم تک کا حُلیہ بیان فرمایا ہے جس کا ذکر قرآن حکیم نے یوں فرمایا:۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ (الفتح ۲۸)

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور وہ جو اُن کے ساتھ ہیں کافروں پر تو بڑے سخت ہیں آپس میں مہربان ہیں، تو ان کو کبھی رکوع میں کبھی سجدے میں دیکھے گا (ایسا کے کر) وہ اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل اور اس کی رضامندی کے طلبگار ہیں، اُن کی ظاہری نشانی اُن کے چہروں پر سجدوں کے نشان ہیں، یہ اُن کی کیفیت تورات اور انجیل میں ذکر فرمائی گئی ہے۔

جب صحابۂ کرام معیارِ حق ہیں، قرآنِ عزیز سے پہلی کتابوں میں ان کا تذکرہ شاہدین اور صالحین کے مبارک عنوان سے فرمایا گیا ہے اور ان کی علاماتِ ظاہریہ و باطنیہ کو بھی بیان فرمایا گیا تو صحابۂ کرامؓ کی عدالت کے خلاف غوغا آرائی کا دفاع کرنا مسلمانوں پر فرض ہے، خصوصاً ان حالات میں کہ منظم طریقہ پر ان کی قدح کو برسرِ بازار بیان کرنے کا حق طلب کرنا کسی گروہ یا قوم کا شیوہ اور عقیدہ بن جائے پھر تو مسلمانوں پر اس کا دفاع کرنا دینی طور پر لازم اور ضروری ہو جاتا ہے ـــــ ایسی ہی صورتِ حال مارچ ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ میں اُس وقت پیدا کی گئی جبکہ وہاں کانگریسی وزارت تھی مگر اہل السنۃ والجماعۃ کے بنیادی حق مدحِ صحابہؓ پر پابندی عائد کر دی گئی تھی، مسلمانوں کے احتجاج کے نتیجہ میں یو۔پی کی حکومت

تبرّا اور مدحِ صحابہؓ کی شرعی حیثیت کے ثبوت کے لیے ۲۰ اپریل ۱۹۳۷ء میں ایک کمیشن مقرر کیا جس کے دو ممبر تھے۔ ایک الہ آباد ہائیکورٹ کے جج مسٹر جسٹس آلسپ اور دوسرے علیگڈھ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ایچ ایس۔ راس تھے۔ حضرت شیخ الاسلام نے جمعیۃ العلماء ہند کے صدر کی حیثیت سے کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے فرمایا۔

"خلفائے راشدین کی تعریف مستحب ہے لیکن اس سے روکا جائے تو فرض ہے محرم کی دسویں کو اگر شہدائے کربلا کا ذکر کیا جائے تو لازم ہے کہ اس کے ساتھ صحابہ کرام کی تعریف بھی کی جائے تاکہ مخالف فرقوں کے ساتھ مشابہت نہ ہو، مدحِ صحابہؓ کا جلوس اور جلسے بدعت نہیں ہیں، ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی برائی کی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ مجمع عام میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مدح سرائی میں قصیدہ پڑھا جائے"

اس کمیشن سے پہلے بھی حکومت نے کاغذی طور پر اہلسنت والجماعت کا یہ حق تسلیم کر لیا تھا مگر اس پر عملدرآمد کرنے سے روک دیا جاتا تھا۔ امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۱ نومبر ۱۹۳۸ء کو سول نافرمانی کا فیصلہ کر لیا، حکومت نے مولانا عبدالشکورؒ، مولانا ظفر الملکؒ، مولانا عبدالسلامؒ وغیرہ کو صرف جلسہ کا اعلان کرتے ہی گرفتار کر لیا اور ایک ایک سال کی سزا دے دی۔ جمعیۃ علماء ہند نے اپنے دسویں سالانہ اجلاس میں حکومت کی مذمت اور تحریک کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ آخر حکومت نے ان حضرات کو رہا کر دیا۔ حضرت مدنی قدس سرہ العزیز نے جو خط تحریک کے سیکرٹری کے نام لکھا اس کا متن ھدیۂ ناظرین ہے:۔

جناب سکریٹری صاحب مرکزی مجلس تحفظ ناموسِ صحابہؓ لکھنؤ کے نام!

حامداً و مصلیاً و مسلماً۔ محترم المقام زید مجدکم، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ، مزاج مبارک!

مدحِ صحابہ کی مذہبی حیثیت اور وجوب، حضرت خاتم النبیین سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دوستوں اور آپ کے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریفیں قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بہت سی آیتوں میں ذکر کی گئی ہیں، حتیٰ کہ بعض جگہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کی پیدائش سے پہلی کتابوں میں (توریت و انجیل میں) اُن کی ثناء اور صفت ذکر کی گئی تھی سورۃ الحشر میں مہاجرین اور انصار رضی اللہ عنہم اجمعین

۱؎ حیات و کارنامے صفحہ ۴۲۳

کے بعض خصائلِ حمیدہ پر روشنی ڈالنے کے بعد اُن لوگوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو کہ اُن کے بعد آئے یا آئیں گے (تابعین اور اُن کے بعد والے لوگ) اُن کی توصیف اور تعریف میں اُن کا یہ قول بھی ذکر فرمایا گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝ (ترجمہ) "اے ہمارے پروردگار! ہماری اور ہمارے اُن بھائیوں کی جو کہ ہم سے پہلے ایمان لائے تھے (مہاجرین اور انصار یعنی صحابۂ کرام) اُن کی مغفرت فرما اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے متعلق کسی قسم کا کوئی کینہ پیدا نہ کر اے پروردگار تُو بہت محبّت اور مہربانی والا ہے۔"

ظاہر ہے کہ جب یہ قولی صفت بطورِ ثنا صحابۂ کرام کے بعد قیامت تک کے آنے والوں کے لیے ذکر کی گئی ہے اور اس انداز سے کہ اس سے نہ صرف اس قسم کی پسندیدگی ہی معلوم ہوتی ہے بلکہ اس کا حکم بھی مکانی، زمانی، انفرادی اور اجتماعی قیود وغیرہ سے بالاتر ہو کر ٹپکتا ہے تو بعد کے آنے والے مسلمانوں پر اس قول کا کہنا پبلک مقامات، عام مناسب مقامات پر بھی شرعاً مطلوب ہوگا۔ احادیثِ صحیحہ میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ثنا و صفت، اُن سے محبت رکھنے کی تاکید، اُن کی شان میں گستاخی کی مذمت، اُن کی تابعداری کرنے کا حکم، اُن کا ذکر بالخیر کرنے کا ارشاد وغیرہ نہایت کثرت سے مذکور ہے۔ اسی بنا پر مسلمانوں کے اجتماعات عامہ عیدین، حج، جمعہ وغیرہ میں لیکچر دیتے ہوئے، خطبہ پڑھتے ہوئے صحابۂ کرام خصوصاً خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم کی ثنا و صفت کرنی نہ صرف مستحب قرار دی گئی ہے (دیکھو درِ مختار، شامی، عالمگیری وغیرہ) بلکہ حسبِ تصریح امام ربّانی حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ العزیز اس کو شعارِ اہلِ سنت و جماعت بھی قرار دیا گیا ہے، آپ (مکتوبات امام ربّانی جلد ۲ ص ۱۵ میں) فرماتے ہیں:۔

وجوبِ مدحِ صحابہ اور اعلان کی پہلی وجہ

(ترجمہ) خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم کا ذکر اگرچہ خطبہ کے شرائط میں سے نہیں ہے لیکن اہلسنّت کے شعار میں سے ہے کوئی اپنے ارادے اور سرکشی سے اس کو نہیں چھوڑتا مگر وہ شخص جس کا دل بیمار ہو اور اس کا باطن خبیث ہو، اور اگر فرض کریں کہ تعصب اور عناد سے ترک نہ کیا ہو تو وعید من تشبّہ بقومٍ فھو منھم (جس نے کسی قوم کی شباہت اختیار کی وہ ان میں سے ہوگا) کا کیا جواب کہا جائے گا؟ اس قسم کا بدبودار پھول ابتدائے اسلام سے اس وقت تک ہندوستان میں کھلنا معلوم نہیں ہوتا لیکن نزدیک ہے کہ اس

معاملہ سے تمام شہر متہم ہو جائے بلکہ ڈر ہے کہ ہندوستان سے یہ امر اُٹھ جائے، اس قسم کے واقعات سے تغافل برتنا بدعتین کو دلیر بنانا اور رخنہ پیدا کرنا ہے۔ اور چونکہ شعار کا اظہار اور اعلان ہر زمانے اور ہر جگہ میں ضروری ہے، بنابریں اس کا اعلان ہر جگہ ضروری ہوگا "منہاج السنّۃ" میں ہے۔ انّ المسلمین والکفّار اذا کان لھؤلاء شعار وجب اظہار شعار الاسلام فی کلّ زمان وفی کلّ مکان، مسلمانوں اور کافروں کے جبکہ علیحدہ علیحدہ شعار ہوں تو مسلمانوں کے شعار کا ہر زمانہ اور ہر مکان میں ظاہر کرنا واجب ہے۔

وجوب مدح صحابہ کی دُوسری وجہ

جس جگہ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) سے نہ صرف بدظنی پھیلائی جاتی ہو بلکہ اشھد ان علیاً ولیّ اللّٰہ وصی رسول اللّٰہ وخلیفتہٗ بلا فصل بآواز بلند اذان میں کہا جاتا ہو، نیز امام باڑوں، مجلسِ خاصہ اور خصوصی مساجد میں اُن کی طرف غلط اور جھوٹے اہانت آمیز واقعات منسوب کیے جاتے ہوں اور عوام سُنّیوں کا سُننا اور شریک ہونا ممکن اور غلطی میں پڑنا ہو تو سُنّیوں کی اصلاح اور تحفظِ عقائد کے لیے ایسی مجالس کا منعقد کرنا جن میں صحابۂ کرام کے صحیح واقعات ذکر کیے جاتے ہوں اور ان کی ثنا وصفت کی جاتی ہو واجب ہے۔

وجوب مدح صحابہ کی تیسری وجہ

بالخصوص جبکہ دوسری قومیں اور حکومتِ غیر مسلمہ اس کو جُرم قرار دینے لگے اُس وقت اس کا وجوب اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ انہیں امور کی بناء پر لکھنؤ میں مدح صحابہ کا سلسلہ چلا آتا ہے مگر اہلِ شیعہ نے حُکام وقت پر اثر ڈال کر اس میں رکاوٹیں پیدا کیں اور ۱۹۰۸ء سے اس میں تشدّدات ہوئے اور بار بار اس بارے میں گرفتاریاں کی گئیں، مدح صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور اس کے جلسے اور جلوس سُنّیوں کا انسانی اور شہری اور اجتماعی حق ہے۔

دُنیا کا مسلّمہ اصول یہ ہے کہ ہر قوم اپنے مقتدایانِ دین اور اکابرِ ملّت کے کارناموں، ان کی تعلیمات اور اُن کے واقعاتِ زندگی سے متاثر ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے لیے حضور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بالخصوص حضرات خلفاء راشدین کے کارنامے، اُن کی تعلیمات، اُن کے حالاتِ زندگی سرچشمۂ ھدایت ہیں اور نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ تمام انسانی دُنیا کیلئے اُن کے کارناموں کی کھلی ہوئی صاف اور ستھری روشنی موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ ۷ار جولائی ۱۹۳۷ء کے اخبار ھمدم میں

گاندھی جی نے کانگریسی وزراء کو زوردار الفاظ میں ہدایت کی تھی کہ وہ اپنا طرزِ عمل حضرات شیخین حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ جیسا بنائیں۔ یورپین مؤرخین اس کی خصوصی طور سے ہدایت کرتے ہیں اور اسی بنا پر سیرتِ فاروقی رضی اللہ عنہ کو فرانس کی یونیورسٹیوں وغیرہ میں داخلِ نصاب کر دیا گیا ہے۔ نہایت ضروری ہے کہ مسلمانوں کا بچہ بچہ ان کارناموں اور اخلاق و اعمال سے واقف ہو، اور چونکہ مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ دنیا میں اسلام کی اشاعت کریں، اس لیے اُن پر اور بھی لازم ہے کہ ساری نوعِ انسانی کو اِن باتوں سے واقف کریں اور ہر بستی میں عام جلسوں اور جلوسوں وغیرہ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو بتائیں کہ ان بزرگوں نے دنیا میں کیا کارنامے بطور یادگار چھوڑے ہیں، جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت سے کس طرح متاثر ہوئے اور اہلِ عالم کو مذہب، اخلاق، تمدن، معاشرت، اقتصادیات، سیاسیات وغیرہ تمام شعبہ ہائے زندگی و آخرت کے کیسے کیسے عمدہ اور مفید اسباق سکھائے۔

ہندوستان کے کروڑوں مسلمان اور غیر مسلم جاہل محض ہیں، نہ کتابیں پڑھ سکتے ہیں نہ اخبارات، ان بے پڑھے لوگوں کو مقدس ہستیوں کی زندگی کے پاکیزہ حالات اُن کے بلند مرتبہ خیالات اور اُن کے مہتم بالشان کارناموں سے روشناس کرانے کا سوائے اس کے کیا ذریعہ ہے کہ بار بار عام جلسوں اور جلوسوں میں ان کا ذکرِ خیر کیا جائے اور اُن کے نام نامی سے ہر کہ ومہ کو مانوس بنایا جائے، بالخصوص ایسی جگہوں میں جہاں کہ غلط فہمیاں قصداً پھیلائی جاتی ہیں، یہی مقصد سیرت کے جلسوں اور جلوسوں کا ہے۔

ہندوستان جیسے ملک میں تبرا قانونی اور اجتماعی اور اخلاقی جرم ہے اور مدحِ صحابہ اخلاقی، ذاتی اور اجتماعی فریضہ ہے۔ ہندوستان جو کہ مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کا گہوارہ ہے بجز اس کے باامن و باعافیت نہیں رہ سکتا کہ اس میں بین الاقوامی قوانین رائج کیے جائیں اور ایسی چیزوں سے روکا جائے جو بین الاقوامی رواداری اور میل ملاپ کے منافی ہوں۔ کسی شخص یا جماعت کا دوسرے شخص یا جماعت کے پیشواؤں کو بُرا کہنا، اُن کی تذلیل و توہین کرنا علاوہ اخلاقی جرم کے یقیناً بین الاقوامی رواداری اور اتحاد کو فنا کے گھاٹ اتارنے والا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تعزیراتِ ہند دفعہ ۲۹۸ کے ماتحت ہمیشہ سے تبرا ہندوستان میں ممنوع رہا ہے اور اسی وجہ سے موجودہ حکومتِ ایران نے اس کو شدید ترین جرم قرار دیا ہے، اسی طرح بین الاقوامی رواداری کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر شخص اور ہر جماعت کو مکمل آزادی ہو کہ وہ جائز طریقہ پر اپنے پیشواؤں کی ثنا و صفت کر سکے، ان کی قابلِ اقتداء زندگی کو دُنیا میں

دکھلا سکے، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں سناتن دھرم، آریہ سماج، برہمو سماج، جینی، عیسائی، یہودی، شیعہ وغیرہ سب کے سب اپنے اپنے پیشواؤں کے جلوس نکالتے اور جلسے وغیرہ کرتے رہتے ہیں، کسی جگہ اور کسی زمانہ میں ان کو رکاوٹ نہیں ہے، کسی شخص کا اس کے خلاف یہ قول نہیں سنا جاتا کہ ہم کو ان کے مذاہب کے پیشواؤں کے جلوس یا جلسہ سے دلآزاری ہوتی ہے اس لیے اس کو بالکل بند کر دینا، حالانکہ ایک ایک موحد مسلمان کو مورتوں اور شرک و کفر کے مظاہروں سے جس قدر تکلیف اور دلآزاری ہوتی ہے وہ بعید اور بے قیاس ہے مگر اس کو یہ کہہ کر روک دیا جاتا ہے کہ اس مجمع المذاہب ہندوستان میں اگر بسنا ہے تو اس کو سہنا پڑے گا۔ ہر صاحب مذہب کو اپنے ضمیر اور مذہب کی آزادی ہے اور اپنے پیشواؤں کا ذکر کرنے اور تعریف کرنے کا حق ہے، اگر تم ان کے حق میں مداخلت کرو گے تو تم امن و امان میں خلل انداز ہو گے اور اس لیے تم قانونی شکنجہ کے شکار بنائے جاؤ گے، حقوق کی حفاظت کرنا اور غاصبوں کی دستبرد سے بچانا گورنمنٹ کا فریضہ ہے۔

حکومت کا طرزِ عمل

مگر شہر لکھنؤ کی اندھیر نگری میں تقریباً ۳۲/۳۰ برس سے یہ حکم نافذ ہے کہ اہل السنۃ والجماعت (جس کی تعداد شہر میں اسی ہزار سے زیادہ ہے اور ان کے خلاف شیعوں کی آبادی صرف اٹھارہ ہزار ہے) کو اپنے پیشوایانِ مذہب صحابہ کرام خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی مدح و ثنا کی اجازت نہیں ہے، بار بار اس پر قید و بند اور جرمانہ و تکلیف کی نوبت آ چکی ہے، حکومت نے اگرچہ ۳۰ مارچ ۱۹۳۸ء کے اعلان میں یہ الفاظ شائع کر دیئے تھے: "گورنمنٹ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ پہلے تین خلفاء کی مدح پڑھنا خواہ عام مقام پر ہو خواہ کسی شخصی مقام پر، زیر بحث نہیں، یہ حق سنیوں کو بلاشک حاصل ہے!"

مگر افسوس ہے کہ باوجودیکہ تقریباً ایک سال گذر چکا ہے یہ مقالہ مثل سابق گورنمنٹوں کے مقالوں کے اور ۱۸۵۸ء کے اعلاناتِ وکٹوریہ اور ۱۹۱۴ء کے لارڈ جارج کے وعدوں ہی کی طرح ثابت ہوئے۔ یہی نہیں ہوا کہ اس پر عمل نہیں کیا گیا بلکہ نیم پبلک مقامات، چوراہوں اور مساجد وغیرہ میں بھی مدح صحابہؓ سے روکا گیا اور سنیوں کو سزائیں دی گئیں۔ بہت زیادہ مطالبہ پر ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو بمشکل خصوصی مقامات پر یا خصوصی حالات میں مدح صحابہؓ کے جلسے کی اگرچہ اجازت دی گئی مگر پبلک مقامات پر جلسۂ مدح صحابہؓ کو اس نام سے ممنوع ہی قرار دیا گیا اور جلوس کی تو کسی صورت میں بھی اجازت نہیں دی گئی۔

ظاہر ہے کہ اہل سنت والجماعت کے لیے اس سے بڑھ کر تذلیل و توہین اور حق تلفی کا کیا

مظاہرہ ہو سکتا ہے۔ اس سرزمین میں قومیں اور تمام مذاہب تو اپنے اپنے مذہبی اور شہری جلسوں اور جلوسوں سے بلا قیدِ وقت و مکان نفع اٹھائیں اور سُنّیوں کو امن کے بہانہ سے روکا اور گرفتار کیا جائے۔ بوالعجبی یہ ہے کہ صاحبِ حق کو امن وامان کا ذمّہ دار قرار دیا جاتا ہے اور غیر صاحبِ حق، معتدی، حق چھیننے والا اور غصب کرنے والا امن توڑنے کا ذمّہ دار قرار نہیں دیا جاتا، صاحبِ مال کی سرزنش کی جائے اور ڈاکو اور چور کی ہمت افزائی کی جائے، کیا اس کی مثال بجز برطانوی حکومت کے کہیں دُنیا میں پائی جاتی ہے؟

بہرحال اب ہم تمام اہلسنت وجماعت کو لازم ہے کہ اپنے اس مذہبی، انسانی، اخلاقی، شہری حق حاصل کرنے کے لیے پورے تیقظ کو کام میں لائیں اور سردانہ وار ہر قسم کی جائز سعی کو میدانِ عمل میں پیش کر دیں۔ اِسی سلسلہ میں چار پانچ مرتبہ قانون شکنی اور گرفتاریوں کی نوبتیں آچکی ہیں مگر اصل مقصد کے اعتبار سے وہ بالکل ہی بے فائدہ ثابت ہوئیں، بنابریں اس مرتبہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس میدان میں اپنی زندگی اور ثابت قدمی کا ثبوت پیش کریں اور یہ دکھلا دیں کہ مسلمان اپنے مذہبی امور میں حتی الوسع ذرہ بھر بھی مداخلت گوارا نہیں کریں گے اور نہ کر سکتے ہیں۔

آج ۳۱ر مارچ ۱۹۳۹ء کو مسلمانوں کو چاہیئے کہ بعد نمازِ جمعہ جلسہ کریں اور اس میں گورنمنٹ کے اس فعل پر کہ اُس نے مسلمانوں کے مذہبی، انسانی، شہری حق مدح صحابہؓ میں ناجائز مداخلت کر کے اُن کے صحیح جذبات کو ناقابلِ برداشت ٹھیس لگائی ہے جس کی وجہ سے ہزاروں مسلمان پروانہ وار جیل کی کوٹھڑیوں میں بند ہو چکے ہیں، صدائے احتجاج بلند کریں اور مطالبہ کریں کہ جلد از جلد مدح صحابہؓ کے جلسوں اور جلوسوں پر سے ہر قسم کی پابندیاں اُٹھالے اور جس طرح دوسری اقوام اور مذاہب کے لیے آزادی ہے کہ وہ اپنے پیشواؤں کے جلسے اور جلوس پبلک مقامات پر عمل میں لا سکتے ہیں اسی طرح سُنّیوں کا بھی عمل حق تسلیم کرلے اور جاری کرا دے اور اگر کوئی شخص یا قوم سُنّیوں کو اس حق پر عمل کرنے سے روکے تو اس کو قرار واقعی سزا دے اور اُن مجاہدینِ ملّت کو مبارک باد دیں جنہوں نے ملّت اور مذہب اور حقِ قومی کے لیے اپنے آرام و راحت کو تجتے ہوئے قانون شکنی اور سول نافرمانی اختیار فرمائی ہے، اور اسی طرح اُن کے اعزّہ اور اقارب کو بھی اس کی مبارک باد پیش کریں۔

نیز اس سلسلہ میں جس قدر بھی امداد مالی یا بدنی ممکن ہو مجلس تحفظ ناموسِ صحابہ پاٹا نالہ لکھنؤ اور مجلس احرارِ اسلام امین آباد لکھنؤ کو پہنچائیں، ریزولیوشن کی نقلیں اخباروں میں بھیجی جائیں اور ایک ایک نقل گاندھی جی (وشیو گاؤں ضلع واردھا) پنڈت جواہر لال نہرو (آنند بھون الہ آباد) بابو سبھاش چندر بوس کلکتہ اور وزیر اعظم یو، پی لکھنؤ و مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹ بالی گنج سرکلر روڈ کلکتہ) کو بذریعہ ڈاک بھیجی جائیں، کسی کو تار ہرگز نہ دیں۔ اس تاریخ کو ہر جگہ زیادہ سے زیادہ سول نافرمانی کے لیے رضا کار بھرتی کیے جائیں ۔ (مکتوباتِ شیخ الاسلام جلد ۳ ص ۱۷۰ تا ۱۷۲)

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ (۲۸ محرم الحرام ۱۳۵۸ھ)

(ف) حضرتِ مدنی نور اللہ مرقدہٗ دیگر عقائد کی طرح صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق بھی وہی عقیدہ رکھتے تھے جو چودہ سو سال سے متواتر اور متوارث چلا آرہا ہے، جیسا کہ حضرتؒ کے مریدِ خاص جناب احمد شاہ صاحب ستیانہ ضلع جھنگ نے حضرت مدنیؒ کی خدمت میں یہ تحریر کیا ۔

"میرا خیال ہے کہ حضرت عائشہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما میں اور معاویہ اور علی رضی اللہ عنہم میں جمل اور صفین کی جنگ نہیں ہوئی بلکہ یہ واقعات وضع کرلیے گئے ہیں، اگر ان واقعات کو صحیح مان لیں تو قرآن کی آیت وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کا کذب لازم آتا ہے کیونکہ اس آیت کا مطلب ہے کہ تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم باہم رحیم و شفیق تھے، حضور اس مسئلہ میں رائے عالی سے مطلع فرمائیں۔

(حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا جواب درج ذیل ہے)

محترم المقام زید مجدکم السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

مزاج شریف! والا نامہ باعثِ سرفرازی ہوا، رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ اس قسم کی جنگ کے خلاف نہیں ہے، کیا رحمت اور شفقت باعثِ جنگ نہیں ہوسکتی؟ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام میں کس قدر اختلاف ہوا؟ کیا وہ دشمنی سے تھا؟ باپ بیٹوں میں زدوکوب کے واقعات کیا محبت اور رحمت سے نہیں ہوتے ہیں، کیا رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جہادات کو رحمت سے علاقہ نہ تھا، کیا جراح اور ڈاکٹر کا نشتر لگانا اور مریض کو تکلیف دینا مظاہرِ رحمت سے نہیں ہے؟ اجتہادی غلطی میں اگر غور فرمائیں تو عموماً مظاہرۂ رحمت ہی محسوس ہوگا۔ (واللہ اعلم) بہرحال سمجھ میں نہیں آتا کہ متواتراتِ عالم کا انکار کس طرح مفید ہوسکتا ہے؟

والسلام: ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ (۲۲ محرم ۱۳۶۴ھ از دار العلوم دیوبند)
(مکتوبات جلد ۲ ص ۳۲۴)

اسلامی طرزِ معاشرت اور ثقافت کی ضرورت

حضرت مدنیؒ اور دیگر علمائے کرام، اور اولیاءِ عظام کا یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ وہ خود بھی شریعتِ مطہرہ کے تمام احکام پر عمل پیرا رہے اور دوسروں کی بھی اسی طرف راہنمائی فرمائی، حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی ساری زندگی اتباعِ شریعت میں گذری ہے۔ فرائض، واجبات، سُنن، مستحبات سے بڑھکر مباح اشیاء کے استعمال میں بھی احتیاط برتی گئی ہے۔ گھریلو زندگی، سفر و حضر، انفرادی اور اجتماعی طرزِ حیات میں اتباعِ شریعت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ آپ نے اُمت کو اپنا تشخص اور اپنا امتیازی وجود برقرار رکھنے کیلئے جو شرعی اور ملّی فوائد بتائے ہیں اُن کا خلاصہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مکتوبِ گرامی میں بیان کیا گیا ہے جو ھدیۂ ناظرین ہے۔ (از مرتب غفرلہٗ)

محترم المقام زید مجدکم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

والا نامہ باعثِ سرفرازی ہوا، میں نہایت عدیم الفرصت ہوں، پھر اس پر طرہ یہ کہ بعض بیماریوں میں مبتلا ہوگیا ہوں، آج طبیعت کچھ سنبھلی ہوئی ہے تو مختصراً کچھ عرض کرتا ہوں، مقصد پیش کرنے سے پہلے ایک ضروری تمہید پر آنجناب غور فرمالیں۔

(الف) ہر نظامِ سلطنت و سیاست میں مختلف شعبوں کے لیے کوئی نہ کوئی یونیفارم مقرر ہے، پولیس کا یونیفارم اور ہے، فوج کا اور ہے، سوار کا اور ہے، پیادہ کا اور ہے، بری فوج کا اور، بحری فوج کا اور، ڈاکخانہ کا اور ہے، ریلوے کا اور، پھر افسروں کا اور ہے، ماتحتوں کا اور، اور پھر اس پر مزید سختی اور تاکید یہانتک ہے کہ ڈیوٹی ادا کرتے وقت اگر یونیفارم میں کوئی ملازم نہیں پایا جاتا تو مستوجبِ سزا شمار کیا جاتا ہے، خاص بادشاہی فوجیوں کا اور ہی یونیفارم ہے۔ صدر اور وزراء مقربین کا اور، یہ حال تو صرف ایک ہی سلطنت کا ہے کہ اس کے مختلف شعبوں میں علیحدہ علیحدہ یونیفارم رکھا جاتا ہے۔ جس طرح ڈیوٹی دینے والا بغیر یونیفارم مجرم قرار دیا جاتا ہے اسی طرح اگر کسی دوسرے شعبہ کا یونیفارم پہن کر آجائے اور افسروں کو اطلاع ہوجائے تو بھی اسی طرح یا اس سے زائد مجرم قرار دیا جاتا ہے، اور جس طرح یہ امر ایک نظامِ سلطنت و حکومت میں

ضروری خیال کیا جاتا ہے اسی طرح اقوام و ملل میں بھی ہمیشہ اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اگر آپ تفحص کریں گے تو انگلینڈ، فرانس، جرمنی، اٹلی، آسٹریا، امریکہ وغیرہ وغیرہ کو پائیں گے، وہ اپنے اپنے نشانات، جھنڈے، یونیفارم علیحدہ علیحدہ رکھتے ہیں، واقف کار شخص ہر ایک کے سپاہی کو دوسرے سے تمیز کر سکے گا اور اسی سے میدانِ جنگ اور ملکی و سیاسی مقامات میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ ہر قوم اور ہر ملت اپنے اپنے یونیفارم اور نشانوں کو محفوظ رکھنا از حد ضروری سمجھتی ہے بلکہ بسا اوقات اس میں خلل پڑنے سے سخت سے سخت وقائع پیش آجاتے ہیں، کسی حکومت کے جھنڈے کو گرا دیجئے، کوئی توہین کر دیجئے، کہیں سے اکھاڑ دیجئے، دیکھئے کس طرح جنگ کی تیاری ہو جاتی ہے۔ یہ یونیفارم اور نشان صرف لباس ہی میں نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی جسم میں بھی بعض بعض علامتیں رکھی جاتی ہیں، بعض قوموں میں ہاتھ یا جسم میں کوئی گودنا گودا جاتا ہے، بعض میں کان یا ناک چھید کر حلقہ ڈالا جاتا ہے، بعض میں بال باقی رکھے جاتے ہیں، بعض میں سر پر چوٹی رکھی جاتی ہے۔

الغرض یہ طریقۂ امتیاز شعبہائے مختلفہ اور اقوام حکومت و ملل کا ہمیشہ سے ہے اور تمام اقوام میں اطرافِ عالم میں چلا آتا ہے اگر یہ نہ ہو تو کوئی محکمہ کوئی حکومت اور کوئی قوم دوسرے سے ممیز نہ ہو سکے، ہم کو کس طرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ فوجی ہے یا ملکی ہے، پولیس ہے یا ڈاکیا، ریلوے کا ملازم ہے یا بحری جہاز والا کا افسر یا ماتحت جرنیل ہے یا میجر! اسی طرح ہم کس طرح جان سکتے ہیں کہ یہ شخص روسی ہے یا فرانسیسی، امریکن ہے یا آسٹرین وغیرہ وغیرہ، ہر زمانہ اور ہر ملک میں اس کا لحاظ ضروری سمجھا گیا ہے اور سمجھا جاتا ہے۔

(ب) جو قوم اور جو ملک اپنے یونیفارم کی محافظ نہیں رہی وہ بہت جلد دوسری قوموں میں منجذب ہو گئی، حتیٰ کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ اسی ہندوستان میں یونانی آئے، افغان آئے، آریہ آئے، تاتار آئے، ترک، مصری اور سوڈانی آئے، مگر مسلمانوں سے پہلے جو قومیں بھی آئیں آج ان میں سے کوئی ملت اور قوم متمیز ہے؟ کیا کسی کی بھی ہستی علیحدہ بتائی جا سکتی ہے، سب کے سب ہندو قوم میں منجذب ہو گئے، وجہ صرف یہی تھی کہ انہوں نے اکثریت کے یونیفارم کو اختیار کر لیا تھا۔ دھوتی، چوٹی، ساڑھی، رسم و رواج وغیرہ میں ان ہی کے تابع ہو گئے، اس لیے ان کی ہستی مٹ گئی، باوجود اختلافِ عقائد سب کو ہندو قوم کہا جاتا ہے، اور کسی کی قومی ہستی جس سے اس کی امتیازی نشان نہیں باقی رہی، ہاں جن قوموں نے امتیازی یونیفارم رکھا وہ آج اپنی قومیت اور ملیت کا تحفظ اور امتیاز رکھتے ہیں، پرشین قوم ہندوستان میں آئی، ہندو قوم اور راجاؤں نے ان کو ہضم کرنا چاہا، عورتوں کا یونیفارم بدلوا دیا، معیشت اور زبان بدلوا دی مگر مردوں کی ٹوپی نہ بدلی گئی،

بالآخر آج وہ زندہ قوم اور موجودہ ممتاز ملت ہے۔ سکھوں نے اپنی امتیازی وردی قائم رکھی، سر اور داڑھی کے بال کو محفوظ رکھا، آج ان کی قوم امتیازی حیثیت رکھتی ہے اور زندہ قوم شمار کی جاتی ہے۔ انگریز سولہویں صدی کے آخر میں آیا، تقریباً ڈھائی سو برس گذر گئے ہیں، نہایت سرد ملک کا رہنے والا ہے مگر اس نے اپنا یونیفارم کوٹ، پتلون، ہیٹ، بوٹ، نکٹائی اس گرم ملک میں بھی نہ چھوڑا، یہی وجہ ہے کہ اس کو پینتیس[۳۵] کروڑ قوم والا ملک اپنے میں ہضم نہ کر سکا، اس کی قوم و ملت علیحدہ ملت ہے، اس کی ہستی دنیا میں قابلِ تسلیم ہے ــــ مسلمان اس ملک میں آئے اور تقریباً ایک ہزار برس سے زائد ہوتا ہے جب سے آئے ہیں اگر وہ اپنی خصوصی یونیفارم کو محفوظ نہ رکھتے تو آج اسی طرح ہندو قوم میں نظر آتے جیسے کہ مسلمانوں سے پہلی قومیں ہضم ہو کر اپنا نام و نشان مٹا گئیں، آج تاریخی صفحات کے سوا ان کا نشان کرۂ زمین پر نظر نہیں آتا، مسلمانوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ اپنا یونیفارم محفوظ رکھا ہو بلکہ یہ بھی کیا کہ اکثریت کے یونیفارم کو مٹا کر اپنا یونیفارم پہنانا چاہا، چند ہزار تھے اور چند کروڑ بن گئے، صرف یہی نہیں کیا کہ پاجامہ، کرتہ، عبا، قبا، عمامہ و دستار محفوظ رکھا بلکہ مذہب، اسماء الرجال، تہذیب و کلچر، رسم و رواج، زبان و عمارت وغیرہ جملہ اشیاء کو محفوظ رکھا اس لیے اُن کی مستقل ہستی ہندوستان میں قائم رہی اور جب تک اس کی حفاظت ہوتی رہے گی رہیں گے۔

(ج) ہر قوم نے جب بھی ترقی کی ہے تو یہ کوشش کی ہے کہ اس کا یونیفارم، اس کا کلچر، اس کا مذہب، اس کی زبان دوسروں پر غالب اور دوسرے ممالک و اقوام میں پھیل جائے۔ آریہ قوم کی تاریخ پڑھو، فارسیوں کے کارنامے دیکھو، کلدانیوں اور عبرانیوں کی تاریخ کا مطالعہ کرو، یہودیوں اور عیسائیوں کے انقلابات کو غور سے دیکھو، دور کیوں جاتے ہو عربوں اور مسلمانوں کے اولوالعزم اعمال آپ کے سامنے موجود ہیں، زبان عربی صرف ملک عرب کی زبان تھی، عراق، سیریہ، فلسطین، مصر، سوڈان، الجیریا، ٹیونس، مراکش، فارس، صحرائے لیبیا وغیرہ میں کوئی شخص نہ عربی زبان سے آشنا تھا نہ مذہب اسلام سے نہ اسلامی رسم و رواج سے، مگر عربوں نے ان ملکوں میں اس طرح اپنی زبان، اپنا کلچر، اپنی تہذیب جاری کر دی کہ وہاں کے غیر مسلم اقوام آج بھی اسلامی یونیفارم، اسی کلچر، اسی تہذیب اور اسی زبان کو اپنی چیزیں سمجھتے ہیں۔ اسرائیلی قومیں، کلدانی نسلیں، عبرانی خاندان، ترکی برادریاں، بربری ذاتیں وغیرہ وغیرہ ان دیار میں سب کے سب عربوں میں منضم ہو گئی ہیں۔ اگر کسی کو اپنی ذات اور خاندان کا علم بھی ہے تو وہ بھی مثل خواب و خیال ہے، سب کے سب اپنے کو عرب ہی سمجھتے ہیں اور عربیت ہی کے دعویدار ہیں۔ انگلستان کو دیکھئے، یہ اپنے جزیرہ سے نکلتا ہے، کینیڈا، آسٹریلیا،

امریکہ، نیوزی لینڈ، کیپ کالونی، ساؤتھ افریقہ وغیرہ وغیرہ میں پوری جدوجہد کر کے اپنی زبان، اپنا کلچر، اپنی تہذیب، اپنا مذہب، اپنا لباس وغیرہ پھیلا دیتا ہے، جو لوگ اس کے مذہب میں داخل بھی نہیں ہوتے وہ بھی اس کی تہذیب اور فیشن وغیرہ میں منجذب ہو جاتے ہیں۔ اور یہی حال ہندوستان میں روز افزوں ترقی پذیر ہے، ہندو قوم اسی سیلاب کو دیکھ کر اپنی وہ مُردہ زبان سنسکرت جس کو تاریخ کبھی کسی طرح عام زبان ہندوستان یا کم از کم آریہ نسل کی نہیں بتا سکتی، آج اس کی اشاعت کی پُرزور کوشش کر رہی ہے، اس کا لیکچرار کھڑا ہوتا ہے اور فیصدی پچاس یا اس سے زائد الفاظ سنسکرت کے ٹھونس کر اپنی تقریر کو غیر قابلِ فہم بنا دیتا ہے، خود اُس کی قوم ان الفاظ کو نہیں سمجھ سکتی اور بالخصوص اس کا مذہبی واعظ تو بالکل اسّی یا نوّے فیصدی الفاظ سنسکرت یا بھاشا کے بولتا ہے مگر یہ چیز اس کی قوم اس کو بنظرِ استحسان ہی دیکھتی ہے، بڑے بڑے گروکل اور ودیا پیٹھ اس مردہ زبان کو زندہ کرنے کے لیے جاری کیے جا رہے ہیں، حالانکہ روئے زمین پر کوئی قوم یا ملک اس زبان کا بولنے والا موجود نہیں ہے، اور غالباً پہلے کسی زمانہ میں بھی یہ زبان عام پبلک کی زبان نہ تھی۔ وہ انتہائی کوشش کر رہا ہے کہ دھوتی باندھنا نہ چھوڑے، اس کا ایم، ایل، سی، ایم، ایل اے اسمبلی کے پریسیڈنٹ، کونسل کا پریذیڈنٹ، اس کی قوم کا جج، ڈپٹی کلکٹر وغیرہ وغیرہ دھوتی باندھ کر، سر کھول کر قمیص پہنکر برسرِ اجلاس آتا ہے، حالانکہ دھوتی میں پائجامہ سے بدرجہا زائد کپڑا خرچ ہوتا ہے، پردہ بھی پورا نہیں ہوتا، سردی اور گرمی سے بھی پوری حفاظت نہیں ہوتی، باوجود ان سب امور کے پائجامہ پہننا اختیار نہیں کرتا، چوٹی سر پر رکھنا، جنیو لگانا ضروری سمجھتا ہے، یہ کیا چیزیں ہیں؟ کیا یہ قومی شعار، قومی یونیفارم نہیں ہے تو کیا ہے؟ کیا اسی وجہ سے وہ اپنی ہستی کی حفاظت کی صورت نہیں نکال رہا ہے۔ گرونانک اور اس کے اتباع کرنے والوں نے چاہا کہ اپنے تابعداروں کی مستقل ہستی قائم کریں، تو بال اور سر کا نہ منڈانا، داڑھی کا نہ کترانا یا نہ مُنڈانا، لوہے کے کڑے کا پہننا، کرپان کا رکھنا قومی یونیفارم بنا دیا، آج اس شعار پر سکھ قوم مری جاتی ہے، اس گرم ملک میں طرح طرح کی تکلیف سہتی ہے مگر بالوں کا منڈوانا یا کتروانا قبول نہیں کرتی، اگر وہ ان چیزوں کو چھوڑ دے تو دُنیا سے اس کی امتیازی ہستی اور قومی موجودیت فنا کے گھاٹ اُتر جاوے گی۔

مذکورہ بالا معروضات سے بخوبی واضح ہے کہ کسی قوم اور مذہب کا دنیا میں مستقل وجود جب ہی قائم ہو سکتا ہے اور باقی بھی جب ہی رہ سکتا ہے جبکہ وہ اپنے لیے خصوصیات وضع قطع میں، تہذیب و کلچر میں، بود و باش میں، زبان اور عمل میں قائم کرے اسی لیے ضروری تھا کہ مذہب اسلام جو کہ اپنے عقائد، اخلاق، اعمال وغیرہ کی حیثیت

سے تمام مذاہبِ دُنیاویہ اور تمام اقوامِ عالم سے بالاتر تھا اور ہے، خصوصیات اور یونیفارم قائم کرے اور اُن کے تحفظ کو قومی اور مذہبی تحفظ سمجھتا ہُوا ان کے لیے جان اڑا دے، اس کی وہ خصوصیات اور یونیفارم خداوندی تابعداروں اور الٰہی بندوں کی یونیفارم ہوں جن سے وہ اللہ کے سرکشوں اور دشمنوں سے تمیز ہوں اور علیحدہ ہو جائے، ان کی بناء پر باغیان اور بندگانِ بارگاہِ الوہیت میں تمیز ہُوا کرے۔ چنانچہ یہی راز من تشبہ بقوم فھو منھم کا ہے جس پر بسا اوقات نوجوانوں کو بہت غصہ آتا ہے، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تابعداروں کیلئے خاص خاص یونیفارم تجویز فرمایا ہے، کہیں فرمایا جاتا ہے "ہم میں اور مشرکین میں فرق ٹوپیوں پر عمامہ باندھنے سے ہوتا ہے" فرق ما بیننا وبین المشرکین العمائم علی القلانس، او کما قال اسی بناء پر مخالفت اہلِ کتاب سے مانگ نکالنے میں اختیار کی گئی، اسی بناء پر ازار اور پائجامہ میں ٹخنے کھولنے کا حکم کیا گیا تاکہ اہلِ تکبّر سے تمیز ہو جائے۔

اسی طرح بہت سے احکام اسلام میں پائے جاتے ہیں جن کے بیان میں بہت طول ہے اور جن میں یہودیوں سے، نصاریٰ سے، مجوسیوں سے، مشرکوں سے امتیاز و علیحدگی کا حکم کیا گیا ہے اور ان کو ذریعہ امتیاز بنایا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مردوں کو عورتوں سے بھی علیحدہ علیحدہ یونیفارم میں دیکھنا ضروری قرار دیا گیا ہے، عورتوں کے یونیفارم میں رہنے والے مرد اور مردوں کے یونیفارم میں رہنے والی عورت کو لعنت کی گئی ہے۔ ان ہی امور میں عربی میں خطبہ رائج کرنا بھی ہے، ان ہی امور میں سے مونچھ کا منڈوانا اور کتروانا اور داڑھی کو بڑھانا بھی ہے، خالفوا المشرکین وفروا اللحیٰ واحفوا الشوارب (مسلم، بخاری)
جزوا الشوارب ارخوا اللحیٰ خالفوا المجوس (مسلم جلد ۲ صـ ۳۲۷) من لم یاخذ من شاربہ فلیس منا (احمد، ترمذی، نسائی)
ان روایات کے مثل اور بہت سی روائتیں کتب حدیث کے اندر موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مشرکین اور مجوسی داڑھی منڈاتے تھے اور مونچھیں بڑھاتے تھے، جیسا کہ آج عیسائی اور ہندو قوم کر رہی ہے اور یہ امر ان کے مخصوص یونیفارم میں سے تھا، بنا بریں ضروری تھا کہ مسلمانوں کو دوسرے یونیفارم کے خلاف حکم کیا جاوے، نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ لوگوں کا داڑھی منڈانے کے متعلق یہ کہنا کہ یہ عمل اس زمانہ میں عرب کے رواج کی وجہ سے ہے جو کہ ان میں جاری تھا کہ داڑھیاں بڑھاتے تھے اور مونچھیں کٹاتے تھے، غلط ہے، بلکہ اس زمانہ میں بھی مخالفینِ اسلام کا یہ شعار تھا۔ جس طرح اس قسم کی روایاتِ مذکورہ بالا سے یہ معلوم ہُوا کہ یہ یونیفارم مشرکین اور مجوس کا تھا اسلیے ضروری ہُوا کہ مسلمانوں کو ان کے خلاف یونیفارم دیا جائے تاکہ تمیز کامل ہو، اسی طرح حدیث

عشرۃ من الفطرۃ قص الشارب واعفاء اللحیۃ والاستباک ... الخ ابو داؤد وغیرہ بتلا رہی ہے کہ بارگاہ خداوندی کے خاص خاص مقربین اور سابق انبیاء اور مرسلین علیہم السلام کے یونیفارم میں سے مونچھوں کا کتروانا داڑھی کا نہ منڈانا ہے کیونکہ فطرت اُن ہی امور کو اس جگہ میں کہا گیا ہے جو کہ انبیاء علیہم السلام کے شعار میں سے تھے جیسا کہ بعض روایتوں میں لفظ فطرۃ کے من سنن المرسلین یا اس کے ہم معنی موجود ہے۔ خلاصہ یہ نکلا کہ یہ ایک خاص یونیفارم اور شعار ہے جو کہ مقربان بارگاہ الوہیت کا ہمیشہ سے یونیفارم رہا ہے اور پھر دوسری قومیں اس کے خلاف کو اپنا یونیفارم بنائے ہوئے بھی ہیں جو کہ اللہ کے قانون کو توڑنے والی اور اس سے بغاوت کرنے والی ہیں اس لیے دو وجہ سے اس یونیفارم کو اختیار کرنا ضروری تھا۔

علاوہ ازیں ایک محمدی کو حسب اقتضائے فطرت اور عقل لازم ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے آقا کا سا رنگ ڈھنگ، چال چلن، صورت، سیرت، فیشن، کلچر وغیرہ بنائے اور اپنے محبوب آقا کے دشمنوں کے فیشن اور کلچر سے پرہیز کرے، ہمیشہ عقل اور فطرت کا تقاضا یہی رہا ہے اور یہی ہر قوم اور ملک میں پایا جاتا ہے۔ آج یورپ سے بڑھ کر روئے زمین پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا دشمن کون ہے! واقعات کو دیکھئے، اس بنا پر بھی جو ان کے خصوصی شعار اور فیشن ہیں ہم کو اس سے انتہائی متنفر ہونا چاہیئے خواہ وہ کرزن فیشن ہو یا گلیڈسٹون فیشن ہو، خواہ وہ فرنچ فیشن ہو یا امریکن، خواہ وہ لباس سے تعلق رکھتا ہو یا بدن سے، خواہ وہ زبان سے یا تہذیب و عادات سے، ہر جگہ اور ہر ملک میں یہی امر طبعی اور فطری شمار کیا گیا ہے کہ دوست کی سب چیزیں پیاری معلوم ہوتی ہیں اور دشمن کی سب چیزیں مبغوض اور اوپری، بالخصوص جو چیزیں دشمن کی خصوصی شعار ہو جائیں، اسلئے ہماری جدوجہد اس میں ہونی چاہیئے کہ ہم غلامانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور انکے فدائی بنیں نہ کہ غلامانِ کرزن و ہارڈنگ و فرانس و امریکہ وغیرہ۔

باقی رہا امتحانِ مقابلہ یا ملازمتیں یا آفس کے ملازموں کے طعنے وغیرہ! تو یہ نہایت کمزور امر ہے، سکھ امتحانِ مقابلہ بھی دیتے ہیں چھوٹے بڑے عہدوں پر بھی مقرر ہیں، اپنی وردی پر مضبوطی سے قائم ہیں، کوئی اُن کو ٹیڑھی اور ترچھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا، باوجود اپنے قلیل التعداد ہونے کے سب سے زیادہ ملازمتیں اور عہدے لیے ہوئے غرا رہے ہیں، اسی طرح ہندوؤں میں بھی بکثرت ایسے افراد اور خاندان پائے جاتے ہیں، پٹیل کی داڑھی کو دیکھئے، برہمو سماج وغیرہ کے بہت سے بنگالیوں اور گجراتیوں کا معائنہ کیجئے، یہ سب باتیں ہماری کمزوری کی ہیں۔

والسلام: ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

(مکتوبات شیخ الاسلام جلد ۲ ص ۹۵ تا ص ۹۸)

دینی مدارس کیلئے قابلِ غور

از:- حضرتِ مدنی نور اللہ مرقدہٗ

شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز کا دینی مدارس کے نصابِ تعلیم اور طریقِ تدریس اور ضرورتِ دینی مدارس کے متعلق ایک مضمون ماہنامہ "تذکرہ" دیوبند میں شائع ہوا تھا جس کو دینی مدارس کی توجہ کے لیے ماہنامہ "الارشاد" کے شکریہ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کیا جارہا ہے۔ (مرتب)

مولانا عبدالحمید فراہی سے میری ملاقات کلکتہ میں ہوئی، میں آسام سے آرہا تھا اور وہ برما سے آرہے تھے، آپ مدرسہ سرائے میر کے ناظم تھے، میں نے اُن سے پوچھا سُنا ہے کہ آپ نے مدرسے سے انگریزی نکال دی فقط عربی رکھی؟ تو مولانا نے جواب دیا انگریزی رکھی جاتی ہے تو غالب آجاتی ہے عربی پر، طلبہ کے دماغ سے عربی تو نکل جاتی ہے اور انگریزی اس کی جگہ لے لیتی ہے، میں نے تجربہ کر کے دیکھا ہے اسی لیے انگریزی کو نکال دیا۔

میرے بزرگو! جن جگہوں میں دین اور دُنیا کو جمع کیا گیا ہے جہاں دینی علوم کے ساتھ دنیوی علوم کو بھی رکھا گیا ہے وہاں انسانوں کی رغبت دُنیا کی طرف ہوگئی، طبعی طور پر انسان دُنیا کی طرف راغب ہو جاتا ہے، بڑی مشکل سے دین کی طرف رغبت ہوتی ہے، اس لیے آپ دیکھیں گے کہ دُنیا میں پیغمبروں کے نام لینے والے کم ہیں لوگ دُنیا میں غلطاں بہت ہیں، جس زبان سے پیٹ، روپے پیسے کی آمدنی زیادہ ہو اُس کی طرف لوگ زیادہ جھکیں گے اور اس کے حصول کے لیے کوشش کریں گے۔

جس چیز کے اندر ایسے فوائد (ظاہری) نہ ہوں اس کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں ہوتی، اگرچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ انسانوں کے لیے فائدے دین میں ہیں، مگر انسان اس طرف متوجہ نہیں ہوتا اس لیے کہ دین کے فائدے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں، یہی انسان کی کمزوری ہوتی ہے کہ وہ ظاہر کی طرف بہت جلد

متوجہ ہو جاتا ہے۔

ہم کو دنیا کے واسطے مدرسے قائم کرنے، اسکول قائم کرنے اور کالجوں کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں اور خاص کر مسلمانوں کی طرف سے اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ حکومتِ وقت کی طرف سے اس کے لیے کام کیا جارہا ہے، اس کے باوجود ایسے مدرسوں یا کالجوں وغیرہ کے قیام کی طرف مسلمانوں کی توجہ بہت زیادہ ہے مگر دینی علوم کے لیے مدارس کے قیام کی طرف ان کی توجہ نہیں، انہماک نہیں۔ دنیا کے علوم کے لیے کتنی کوششیں کی جاتی ہیں مگر یہ بتائیے کہ روحانیت کے واسطے، آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے لائحہ عمل کے واسطے دنیا کی تعلیم دینے والے اسکولوں کے مقابلہ میں کتنے مدرسے ہیں، ان کی تعداد مقابلتاً کتنی ہے؟ اور مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے انکی تعداد اور ان میں انکی کتنی دلچسپی ہے؟

دنیا کی تعلیم دینے والے اسکولوں کیلئے تو ہر قسم کی آسانیاں ہیں، وہاں فیس بھی دینی پڑتی ہے، داخلہ کی فیس علیحدہ، اگر قیام گاہ ہو تو کمرے کی فیس، کھانے کی فیس، امتحان کی فیس، کتابوں کی فیس علیحدہ ہے، ہر سال کورس بدلا جاتا ہے، مصارف بہت ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود ان سکولوں اور کالجوں میں ہجوم رہتا ہے پڑھنے والوں کا، ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

دینی مدارس ان کے مقابلہ میں تعداد کے لحاظ سے بھی کم ہیں اور ان میں پڑھنے والوں کی تعداد بھی کم ہوتی ہے، دنیا کے اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کی تعداد کے مقابلہ میں دینی مدارس میں پڑھنے والوں کی تعداد صفر ہوتی ہے اس سے یہ معلوم ہوگا کہ کیا حالت ہے؟ لوگوں کی دین کی طرف انکی توجہ کتنی کم ہے؟

بزرگو! کیا ہم کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو بالکل پس پشت ڈال دینا چاہیئے؟ یہ فیصلہ ہمیں کر لینا چاہیئے، اس پر غور کر لینا چاہیئے کہ ہمارے لیے کون سا کام بہت ضروری ہے؟

بھائیو! ہمارے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ دینِ اسلام کو پھیلانے کے لیے کوشش کریں، یہ کام وہ ہے جو بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیتوں میں سے یہ وصیت ہے، ہم کو کہ "دین کو ہر طرف پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت ہو"۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں بہت تاکید فرمائی ہے اور قرآن بھی بہت تاکید کرتا ہے۔

قرآنِ پاک عرب سے نکل کر جو پھیل گیا وہ آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت پر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل تھا، ورنہ کیا اُن کو جنون تھا نعوذ باللہ کہ عرب سے باہر نکلتے؟ گھر سے باہر نکلنا تو حال میں

تکلیف کا باعث ہوتا ہے مگر صحابہ کرامؓ نے اس کام کو فرض جان کر کیا۔ حضور کے وصال کے بعد ایک سال کے اندر صحابہ کرام کی فوجیں نکلیں، ان کا مقصد ملکوں اور قوموں پر قبضہ کرنا نہیں تھا بلکہ قرآن کو اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے لائحہ عمل کو انسانوں تک پہنچانا اور پھیلا دینا تھا، دنیا کمانا اور دوسروں کو محکوم بنا کر اُن پر خود مسلط ہو جانا صحابہ کرامؓ کا مقصد کبھی نہیں رہا۔

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ فوج کے سردار اور سالارِ افواج تھے، آپ ملکِ شام میں اسلامی افواج کے ساتھ تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کے خیمے میں گئے تلاشی لی، دیکھا تو کیا پایا؟ ایک لوٹا تھا، ایک مسواک اور ایک تھیلا، اُس میں ہاتھ ڈالا تو سوکھی روٹی کے چند ٹکڑے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا اے ابو عبیدہؓ! کیا جمع کر رکھا ہے؟ سالارِ افواج نے جواب دیا میں ہمیشہ روزے رکھتا ہوں اس لیے سحری کے لیے یہ روٹی رکھی ہے۔

ایک اور صحابی گورنر تھے، حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شکایت گئی کہ وہ ہفتہ میں ۲ دو دن اجلاس نہیں کرتے، ایک تو منگل کا دن ہے اور دوسرا دن جمعہ کا، حضرتِ عمرؓ نے اُن گورنر صحابی کو بُلا کر پوچھا تمہارے خلاف یہ شکایت ہے، اس سلسلہ میں تمہارا کیا جواب ہے؟ گورنر نے کہا منگل کے دن میں کپڑے دھو لیتا ہوں اُن کے سوکھنے پر پہن کر باہر جاتا ہوں کیونکہ میرے پاس صرف ایک ہی جوڑا ہے، دھو کر ڈال دینے کے بعد کپڑا نہیں رہتا اِس لیے باہر نہیں نکلتا، جمعہ کے روز غسل کرتا ہوں اور جمعہ کی تیاری کرنی پڑتی ہے، یہ عذر تھا اُن شکایتوں کا کہ گورنر ہفتہ میں ۲ دو دن اجلاس نہیں کرتے تھے۔

دیکھئے یہ ہے صحابہ کرامؓ کی زندگی، جنہوں نے ممالک فتح کیے مگر دولت کیلئے نہیں، دنیا کیلئے نہیں صرف قرآن کو پھیلانے کے لیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے دینِ اسلام کو پھیلانے کیلئے۔

رُومیوں نے شام کا رُخ کیا تھا تو وہاں لوٹ مار مچی تھی، اُن کے حملے دولت کیلئے ہوتے تھے اسلام اِس واسطے باہر نہیں نکلا تھا، صحابہ کرامؓ اپنا فریضہ ادا کرنے نکلے تھے، بچھڑے ہوئے بندوں کو اللہ سے ملانے کیلئے نکلے تھے، وہ اسلئے نکلے تھے کہ اللہ کی جنت میں لوگوں کو داخل کرا یا جائے، اللہ کے بندوں کو اللہ سے قریب کرایا جائے۔

دنیا کی تعلیم

آج ہمارے تعلیمیافتہ حضرات کو دیکھئے اُن کے پاس کس قسم کی طاقت ہے؟ نہیں کسی قسم کی طاقت نہیں پھر بھی وہ جمے ہوئے ہیں دنیا ہی کی طرف، ہائے پیٹ ہائے پیٹ کا ذکر ہوتا ہے، اور بس اُن کی ساری مساعی اسی پیٹ کے لیے ہوتی ہیں، دُنیا کا ذکر ہوتا ہے اور پیٹ کے لیے

ذکر ہوتا ہے مگر اللہ کا ذکر نہیں، دین کے لیے توجہ نہیں ہوتی، یہ میں ظاہری حیثیت سے کہہ رہا ہوں، کیونکہ اللہ نے تو فرمایا ہے کہ ہم نے قرآن کو اتارا ہے، ذکر کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔
مگر آپ ظاہری حیثیت سے کہیئے، آپ تعلیم کیلئے اُوپر تلے ہو جاتے ہیں اور یہ تعلیم پیٹ کیلئے ہوتی ہے رُوح کے لیئے نہیں ہوتی۔ اگر کوئی دین کا کام کرتا ہے اور دین کے علم کیلئے سعی کرتا ہے تو اس پر دُنیا کو مسلط کر دیتے ہیں، دُنیا کو غالب کر دیتے ہیں۔ آپ غور فرمائیں گے تو معلوم ہو گا کہ یہ سب کچھ آپ اس لیے کرتے ہیں کہ دُنیا آپ کے رُوبرو ہے، دُنیا کے علم کا فائدہ آپ کو نظر آجاتا ہے مگر دین کے علوم کے فوائد نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں اس لیے ہماری توجہ ان کی طرف نہیں جاتی۔
میرے بزرگو! جب تک ہم زندہ ہیں تب تک ہمارے لیے اپنے دین اور اپنے ایمان کی حفاظت کرنا ضروری ہے اور دوسروں کو بھی اسلام کی طرف متوجہ کرنا چاہیئے، یہ ضروری ہے اور بہت ضروری ہے، اس علم کو دوسروں تک پہنچانا بے انتہا ضروری ہے، یہی حکم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے حکم ہوتا ہے "اے رسول پہنچاؤ لوگوں کو وہ چیز جو تمہارے اوپر اتاری گئی اگر تم نے تبلیغ نہ کی تو تم نے رسالت کا کام انجام نہیں دیا۔
اللہ سے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو جسقدر عشق ہے اس کی پوری تعریف نہیں کی جا سکتی، آپ فرماتے ہیں اگر میرے دل میں کسی قسم کی گنجائش ہوتی تو ابوبکرؓ کو اپنا خلیل اور حبیب بناتا میرے دل میں سوائے خدا کے کسی کی گنجائش نہیں۔ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس قدر تعلق ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ہے امت میں سے کسی سے نہیں، باوجود اس کے آپ کے دل میں جگہ نہیں تھی ابوبکرؓ کیلئے، کیونکہ آپ کے دل میں اللہ کا عشق تھا، اللہ سے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر عشق ہے، بس اسی لیے اللہ کے حکم کی تعمیل میں لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے تھے، انہیں سمجھاتے تھے، اس کام میں تنگی پیش آتی تھی، آپ کو مخلوق کی طرف توجہ کرنے میں سخت تکلیف ہوتی تھی مگر حکم تھا اس لیے یہ کام کرتے تھے۔ فرماتے ہیں میرے دل میں انقباض ہو جاتا ہے تو ستّو مرتبہ استغفار کرتا ہوں، محبوب کی طرف توجہ نہ ہو تو شاق ہوتا تھا اس لیے کہ اللہ کی محبت سے دل بھرا ہوا ہوتا تھا، عاشق کو اپنے محبوب کی طرف توجہ سے راحت ہوتی ہے غیر کی طرف توجہ کرنے سے تکلیف ہوتی ہے۔
آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم تمام عاشقوں کے سردار ہیں، آپ نے عشق کے تمام مراحل طے فرمائے ہیں، بیوی بچوں سب کو چھوڑ کر دن، دو دن یا ہفتہ دو ہفتہ نہیں مہینہ مہینہ اللہ کی یاد میں رہے ہیں، ایک ایک مہینہ بعد گھر تشریف لاتے تھے گھر کی ضروریات پوری کر کے پھر چلے جاتے تھے، یکسوئی سے محبوب کی طرف متوجہ

ہوجاتے تھے، سالہاسال تک آپ نے ایسا کیا ؎

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

دوسرے کاموں کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دل نہیں ہوتا تھا مگر محبوب نے حکم دیا تھا پہنچاؤ جو ہم نے اتارا تم پر دوسروں تک تو محبوب کے حکم کی تعمیل فرمائی، یہ عشق ہی کا نتیجہ ہے کہ عاشق معشوق کے ہر حکم کی تعمیل کرتا ہے۔

بزرگو! مسلمان اس لیے نکلے تھے اپنے گھروں سے ہزاروں میل دور نکل گئے تھے اپنے گھروں سے، کس چیز نے انہیں اپنے گھروں سے نکالا؟ گھر کے آرام کو کس لیے انہوں نے ترک فرمایا؟ ہزاروں میل دُور اس لیے اپنے گھروں سے نکل جاتے تھے کہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کی وصیت فرمائی تھی، اللہ کے حکم کی تعمیل میں وہ ہزاروں میل دُور نکل گئے تھے۔

ہندوستان میں بھی ہمارے بزرگ اسی جذبۂ عشق کے تحت آئے تھے، بڑے بڑے لوگوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے اس ہندوستان میں، ایک انگریز لکھتا ہے "خواجہ معین الدین چشتی رح کے ہاتھ پر نوے لاکھ (ہندو) مسلمان ہوئے" — خواجہ معین الدین چشتی رح کے پاس دولت نہیں تھی کہ جس کے ذریعہ آپ لالچ دے دیکر مسلمان بناتے، تاریخِ اولیاء دیکھی جائے تو سینکڑوں واقعات ملتے ہیں۔

برِصغیر میں اولیاء نے یا علماء نے اسلام پھیلایا، بادشاہ تو لڑتے تھے آپس میں، وہ دنیا کی حکومت کیلئے آپس میں ہی ایک دوسرے کے خلاف جنگیں کرتے تھے، اُن کی لڑائیوں کا مقصد سلطنت کا حصول ہوتا تھا، مگر اسلام پھیلایا تو اولیاء اللہ نے یا علماءِ حق نے۔

اب آپ لوگوں سے عرض کرنا ہے کہ بھائی! آپ کیا ذخیرہ کرکے جارہے ہیں؟ آپ آئندہ نسلوں کو مسلمان رکھنا چاہتے ہیں تو اس کیلئے سعی کیجئے صرف چاہنا ہی کافی نہیں ہے چاہنے کے نتیجہ میں اس کیلئے کام کرنا ہے، مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اپنی ہی بدعنوانیوں اور بے تدبیریوں کی وجہ سے دن بدن گرتی جارہی ہے، وہ اپنے ہی دین کی رغبت نہیں رکھتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت سے بیزار ہیں، مادیت کی طرف چلے جارہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مشرکوں کی صورت نہ بناؤ، داڑھیوں کو بڑھاؤ مونچھوں کو کترواؤ، مگر آج ہمارا بھائی ہے کہ مادہ پرست بنتا جارہا ہے، اس کے پاس دُنیا کی ذرا سی چیز ہے تو مادہ پرست بن گیا، وہ چاہتا ہے کہ اس کی صورت لائیڈ جارج کی طرح ہو، وہ کسی ولی اللہ کی صورت بنانے کیلئے تیار نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے نفرت ہے، قول سے نہیں تو عمل سے، اگر آپ کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو کیا اسکی صورت سے، چال چلن سے نفرت ہوتی ہے؟ پھر یہ کیا کر رہے ہو میرے بھائیو! کیا کر رہے ہو؟ سوچتے کیوں نہیں؟ سوچو، غور کرو اپنے اس چلن پر اپنی اس روش پر۔

ہمارے بھائیوں میں مالدار تو بہت کم ہیں مگر اُنکے ہر کام میں وہ طور طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے جو حضرت کے دشمنوں کا تھا، جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ بھئی داڑھی رکھو تو کہتے ہیں کہ کیا دین صرف داڑھی میں رکھا ہے؟ بھئی کسی کی ناک کاٹ لی جائے تو کیا صورت نہیں بگڑتی؟ اسلام کی صورت ہے، جیسے ناک کاٹنے سے صورت جاتی رہتی ہے اسی طرح داڑھی کاٹنے، مونڈنے سے (اسلام کی) صورت جاتی رہتی ہے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ آپ آنیوالی نسلوں کیلئے کیا کر رہے ہیں؟ اپنے بچوں کو دینی تعلیم دیدو، پہلے قرآن کی تعلیم دو، نماز کی تعلیم، عقائد کی تعلیم، اسکے بعد بچہ کو چاہے تجارت میں لگائیے یا اُسے انجنیئر بنائیے، ڈاکٹر بنائیے چاہے ملک کا وزیرِ اعظم بنا دیجئے یا کسی کام میں ماہر بنا دیجئے مگر پہلے اسکے اندر دین ڈال دیجئے، دماغ میں دینی فکر کی روشنی پہنچا دیجئے۔

میرے بھائیو! جو بچے دینی تعلیم سے بے خبر ہونگے اور ان کو بے دینی کی تعلیم دی جائیگی وہ اس کے بعد اللہ رسول کو جانے گا؟ اس کا جواب اُن بچوں سے مل سکتا ہے جو سکولوں میں یہ تعلیم پا رہے ہیں، رات دن بے دینی تعلیم کا کورس پڑھ پڑھ کر بچے میں دین کہاں رہے گا؟ سکولوں میں پڑھنے والے بچوں کو دیکھئے وہ خواب بھی دیکھتے ہیں تو وہی دیکھتے ہیں۔

میرے بھائیو، بزرگو! سوچو سمجھو! اگر آپنے اس سحر سے بچنے کی کوشش نہیں کی تو بڑی آفت میں مبتلا ہو جائیں گے، آنے والا زمانہ تاریک ہے، کوشش کیجئے، اگر آپ نے دین سکھلا دیا تو پھر بچے کالج میں جائیں یا جہاں بھی جائیں اُنکے پاس اسلام تو رہے گا۔ اسی واسطے علماء رات دن اسی فکر میں ہیں کہ دینی مدرسے ہر جگہ کھولے جائیں۔

بھائیو! میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ محلوں میں دین کی تعلیم کے مدرسے جاری کیجئے، متفق علیہ باتیں بتا دیجئے متنازعہ فیہ مسائل کو نہ اٹھائیے، ہر بچہ میں دین کی جو چیز ضروری ہے وہ ڈال دیجئے وہ بڑا ہو کر چاہے دنیوی تعلیم حاصل کریں۔

میرے بھائیو! ہر جگہ خالص دینی مدارس کی ضرورت ہے تاکہ وہ قیامت اور آخرت کو پہچان سکیں، اس کے بعد وہ جو چاہیں سیکھیں، دین دل میں بٹھا دیجئے انشاء اللہ وہ اس کی ہدایت پر چلتے رہیں گے اور اُن کی دُنیا بھی اچھی رہے گی اور آخرت بھی۔ تمام کو نیک توفیق عطا ہو۔ آمین، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

◎

حضرت مدنیؒ اور جماعت اسلامی

جماعتِ اسلامی کے حقیقی خدوخال پر اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ اب مزید ضرورت نہیں، خصوصاً آج سے چند سال پہلے اس جماعت کا جو کردار رہا ہے اُس نے اس سارے ملمع کو دُور کر دیا ہے جو بانی جماعت اسلامی ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے دینی اور مذہبی رنگ میں اس پر چڑھایا تھا، مگر چونکہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ پر مودودی صاحب سے لے کر آج تک اُن کی جماعت کا "تازہ ایڈیشن" خصوصیت سے سنگباری کی کوشش کر رہا ہے اس لیے چند سطور اس موضوع پر ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

اس جماعت کا اگرچہ پہلا کل ہند اجلاس چوہدری نیاز علی خان صاحب مرحوم[1] کے عنایت کردہ دارالاسلام پٹھانکوٹ میں ۱۹۴۵ء مطابق ۱۳۶۴ھ کو ہوا تھا مگر اس کی باقاعدہ تشکیل ۲ شعبان ۱۳۶۰ھ مطابق ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو

---

[1] پٹھانکوٹ کے ایک دیندار رئیس چوہدری نیاز علی خان صاحب مرحوم کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستان میں ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں شرکاء ادارہ کی صحیح دینی تربیت کی جائے اور وہ اپنے عقائد، ثقافت، تہذیب وغیرہا امور میں سچے مسلمان کا نمونہ ہوں، چوہدری صاحب نے اپنی ذاتی ملکیت پہاڑی زمین کا کافی رقبہ دارالاسلام کے نام سے مخصوص کر دیا تھا، علامہ اقبال اور مودودی صاحب کے ساتھ اس بارہ میں بات چیت ہوتی رہی آخر مودودی صاحب پہلے ۱۹۳۸ء میں کچھ عرصہ رہ کر لاہور آ گئے مگر پھر ۱۹۴۲ء میں دارالاسلام مستقل مقیم ہو گئے، پہلا کل ہند اجلاس وہیں منعقد ہوا اور اسلامی طرزِ حیات کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے مولانا منظور احمد نعمانی جیسے کئی علماء کرام بھی وہاں خیمہ زن ہو گئے مگر پھر جلد ہی دارالاسلام کو خیرباد کہہ گئے تقسیم کے بعد چوہدری صاحب جوہرآباد منتقل ہو گئے اور مودودی صاحب لاہور آ گئے۔ چوہدری نیاز علی خان مرحوم کے احقر کے ساتھ بھی دینی تعلقات تھے تقسیم کے بعد جب نواب ممدوٹ نے محکمہ تعمیرِ ملت قائم کیا اور اس کا سربراہ علامہ محمد اسد نومسلم کو مقرر کیا تو چوہدری صاحب نے مجھے اور علامہ اسد کو پاکستان میں آئین اسلامی کے نفاذ کیلئے قلمی کام کرنے کا مشورہ دیا تھا، چنانچہ علامہ محمد اسد مرحوم نے ایک رسالہ بنام عرفات جاری کیا اور اسکی ایک اشاعت صرف دستورِ اسلامی کیلئے مخصوص فرمائی، احقر نے اگرچہ اپنی نااہلی کی وجہ سے نیاز علی خان اور علامہ اسد مرحومین سے اُسی وقت معذرت کر دی تھی مگر پھر بھی علامہ مرحوم بعض دینی امور میں مشورہ لیتے رہے مگر ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اسی ۱۹۹۴ء میں بعض اخبارات میں چوہدری صاحب مرحوم کے بیٹے ایم اعظم کا ایک طویل مضمون دارالاسلام کے بارہ میں شکوہ کے طور پر شائع ہوا تھا، وہ ان کا آپس میں معاملہ ہے۔ (احقر مرتب چراغ محمد)

ہوئی تھی جبکہ شریک ہونے والے حضرات صرف ۷۵ تھے اور کل ہند اجتماع کے شرکاء ۷۰۰ تک ہوگئے تھے،
مودودی صاحب اپنے رسالہ ترجمان القرآن حیدرآباد دکن کے اور دوسرے بعض جرائد اور اخبارات کے ذریعہ
اپنے عقائد اور نظریات شائع کرتے رہے، اس لیے جلیل القدر علماء کرام ان کی جماعت کو دینی اعتبار سے
مسلمانوں کے لیے خطرناک سمجھتے تھے، اس لیے اس پہلے کل ہند اجتماع میں خصوصیت کے ساتھ
علماء کرام اور مشائخ عظام کو نشانہ بنایا گیا، اور ہر تجویز کو رد کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ:۔

"ہمارا ایمان ہے کہ اس ایک دعوت اور طریقِ کار کے علاوہ دوسری تمام دعوتیں اور طریقہائے کار سراسر باطل ہیں" (ص۱۱)

اسی اجتماع میں جماعت اسلامی کو اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الف الف سلام کا نام دے کر یوں کہا گیا:۔

"اور اسلامی جماعت کے عرب پر چھانے میں اس کیفیت کا کتنا بڑا دخل تھا" (ص۱۱)

جب حساس نظروں نے اس رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر یہ بھانپ لیا کہ یہ جماعت تو سراسر سیاسی ہے
اور جلد ہی دین کے پلیٹ فارم کو حکومت حاصل کرنے کے لیے استعمال کرے گی، تو اس کا ازالہ کرتے
ہوئے یوں کہا گیا:۔

"یہ سب ہم نے اس لیے کیا کہ ہمارے پیشِ نظر کوئی بھیڑ جمع کرکے دوسروں کو مرعوب کرنا یا کسی کونسل یا کارپوریشن میں اپنی نشستوں میں اضافہ کروانا نہیں بلکہ کچھ ایسے مردانِ کار تیار کرنا ہیں جو اہلِ دنیا کو مسلمانوں کی طرح جینا اور مرنا سکھا سکیں اور ان بزرگوں اور عوام کو جو یہ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں اسلامی نظامِ زندگی ممکن العمل نہیں ہے بتا دیں کہ نظامِ اسلامی ہمیشہ کی طرح اب بھی ممکن العمل ہے صرف عزم اور ایمان کی ضرورت ہے" (ص۱۱۳)

چنانچہ اس خوشنما نعرہ کو سُنکر بعض علماء کرام اور دین پسند حضرات ہجرتِ کابل کی طرح اپنا سب کچھ
لٹا کر دارالاسلام آپہنچے، ان کے قیام اور پھر واپسی اور ندامت کی داستانیں اُن کی اپنی کردہ تحریروں میں عام طور پر
دستیاب ہیں۔ ہم یہاں صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ۱۹۴۵ء کے اس عہد پر ۱۹۵۱ء کے الیکشن میں کس
طرح عمل ہوا اور بدترین ناکامی کے بعد امتِ محمدیہ کو مودودی صاحب نے جو خراجِ مذمت پیش کیا وہ

درج ذیل ہے :-

"جونہی کہ یہ قدم ہم نے اٹھایا قیادتِ فاسقہ (حکومت) اور اس کے مددگار سب کے سب یک لخت بھڑک اُٹھے، پاکستان سے لے کر ہندوستان تک خطرے کی گھنٹی بج گئی، پرانے پرانے دشمن جو کبھی جمع نہ ہو سکتے تھے اس خطرے کو آتے دیکھ کر متحد ہو گئے، دیوبند اور بریلی گلے مل گئے، پیروں اور وہابیوں میں اتحاد ہو گیا، اہل حدیث اور منکرینِ حدیث متفق ہو گئے، قادیانیوں اور احراریوں نے مل کر لیگ کا دامن تھام لیا، ہماری دس دس بارہ بارہ سال کی پرانی تحریروں میں سے گمراہیاں ٹپکنی شروع ہو گئیں جو پہلے کبھی نظر نہ آتی تھیں یا دین کے لیے خطرہ نہ سمجھی گئی تھیں، ہندوستان کے کانگریسی علماء تک دینی حمیّت کے تقاضوں سے مجبور ہو گئے کہ اپنے دارالافتاؤں کے گولہ بارُود سے پاکستان مسلم لیگ کی مدد فرمائیں، حد یہ ہے کہ مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم کی جماعت کے بعض مشائخ کو بھی پہلی مرتبہ اسی وقت یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ پوری خدا ترسی اور شان تواضع کے ساتھ جماعتِ اسلامی کی برائیاں گنوا دیں جو اُن کے خیال مبارک میں تھیں، یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر لوگوں کو یقین نہ آئے کہ یہ قدم (الیکشن) ہم نے ٹھیک صحیح رُخ پر اُٹھایا ہے تو نا معلوم اور کن علامات سے وہ حق کو پہچانیں گے۔ ہمیں تو اس عام اضطراب میں شیطان کی اس گھبراہٹ کے آثار صاف نظر آ رہے ہیں جو اسلام کو اپنی آخری پناہ گاہ کے قریب آتا دیکھ کر اُس پر طاری ہوا کرتی ہے"[1]

مندرجہ بالا عبارت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ :-

(الف) جماعت اسلامی کے بننے پر ہی ۱۹۴۲ء میں بعض علمائے حق نے اس جماعت کو خطرناک سمجھا تھا مگر ۱۹۵۱ء تک سارے کے سارے علماء کرام اسی طرح اس سے متنفر ہو گئے تھے۔

(ب) جماعتِ اسلامی کے خلاف سب کے سب علماء کرام نے بلا تخصیص قدم اٹھایا، یہی تو سب سے بڑی دلیل جماعت کے خلاف تھی جسے مودودی صاحب بزعم خود اپنے حق پر ہونے کی دلیل قرار دے رہے ہیں۔

---

[1] جماعتِ اسلامی کا مقصد از مودودی صاحب ص ۱۰۵، ۱۰۶

۱۹۵۱ء میں پاکستان کے پہلے انتخابات میں جماعت اسلامی نے بھرپور حصہ لیا جسے مودودی صاحب نے جماعت کا ٹھیک رُخ قرار دیا اور اپنے مدِمخالف خصوصاً علماء کرام اور پیرانِ طریقت حتیٰ کہ تبلیغی جماعت کو بھی اپنے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا، پھر جماعت اسی ٹھیک رخ پر قدم بڑھاتی رہی حتیٰ کہ ۱۹۷۰ء تک ناکامیابیوں کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا حالانکہ جماعت نے اپنے کئی اصول کرسی کیلئے قربان کردیئے اسقدر طویل تلخ تجربہ کے بعد بانی جماعتِ اسلامی نے اس ٹھیک رُخ کو غلط قرار دیا اور انجام کار نہ صرف وہ خود جماعت سے دل برداشتہ ہوگئے بلکہ اُن کا سارا گھرانہ جماعت سے علیحدہ ہوگیا، جیسا کہ ماہنامہ "میثاق" بابت اکتوبر ۱۹۹۲ء کے مندرجہ ذیل بیان سے ظاہر ہے:۔

ایک اہم واقعہ اور اس کے آثار

مولانا سید وصی مظہر ندوی (جو ۱۹۷۰ء میں جماعت کے عام رکن ہی نہیں اہم عہدیدار اور مرکزی شوریٰ کے رکن تھے لیکن بعد میں "خارج" کر دیئے گئے تھے، اور اس کے بعد سیاست کی وادیوں میں سلوک کی منزلیں طے کرتے ہوئے سابق صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دورِ حکومت کے آخری ایام میں وفاقی وزارت تک پہنچ گئے تھے) راوی ہیں کہ ۱۹۷۱ء ہی میں کسی موقع پر مولانا مودودی جماعت کی مرکزی شوریٰ کے اجلاس میں "بطورِ خاص" تشریف لائے، "بطورِ خاص" اس لیے کہ اس زمانے میں وہ جماعت کے امیر تھے نہ شوریٰ کے رکن اسلئے کہ امارت انہوں نے کچھ عرصہ قبل خود میاں طفیل محمد صاحب کے حوالے کر دی تھی اور شوریٰ کا اس کے بعد اس وقت تک کوئی نیا انتخاب نہیں ہوا تھا) اس اجلاس میں مولانا نے اپنی یہ حتمی رائے پیش کی کہ ۷۰ء کے انتخابات کے نتائج سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ اس ملک میں انتخابات کے ذریعے نظامِ اسلامی کا قیام ناممکن ہے لہٰذا ہمیں متبادل راستہ اختیار کرنے پر غور کرنا چاہیئے۔ اس پر جب میاں طفیل محمد سمیت شوریٰ کے بہت سے ارکان بالخصوص نوجوانوں نے "انتخابی طریق کار" کی مدافعت کی اور اس کے حق میں دلائل دینے شروع کیے تو کسی قدر گفتگو اور ردّ و قدح کے بعد مولانا نے زچ ہو کر اور قدرے بھنّا کر فرمایا کہ: "یہ ساری دلیلیں میں نے ہی آپ لوگوں کو سکھائی تھیں، تاہم میں اب جس نتیجے تک پہنچ گیا ہوں میں نے اسے آپ لوگوں تک پہنچا کر اپنا فرض ادا کر دیا ہے، آگے آپ لوگ

جائیں اور آپ کا کام"۔۔۔ اور اسی دل آزردہ اور دل گرفتہ کیفیت کے ساتھ مولانا رخصت ہو گئے۔

یہ روایت بذاتِ خود بھی ایک "ثقہ" راوی کی ہے، مزید برآں اس کی تائید میں "قرائن کی شہادت" کے طور پر یہ حقیقت بہت سے واقفانِ حال کے علم میں ہے کہ اس کے بعد سے مولانا مرحوم کے انتقال تک پورے آٹھ برس مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے مرکز کے مابین زمینی اور مکانی فاصلے کے ساتھ ساتھ ایک مسلسل "سرد جنگ" کی سی کیفیت بھی جاری رہی جس کے دوران بعض مواقع ایسے بھی آئے کہ جماعت کے کسی راہنما کے بیان پر مولانا نے نہایت غضب آلود تردیدی بیان اخبارات کو بھجوایا جو بعض اخبارات میں تو شائع بھی ہو گیا لیکن اکثر اخبارات میں اشاعت کو جماعت کے مرکز نے اپنے "اثر و رسوخ" کے ذریعے رکوا لیا۔۔۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی عمر کے اس آخری دور کے ذہنی اور نفسیاتی کرب ہی کا مظہر اِس وقت دُنیا کے سامنے بالفعل اس صورت میں موجود ہے کہ مولانا کی اہلیہ صاحبہ اور بیٹوں اور بیٹیوں سمیت پوری اولاد جماعتِ اسلامی سے بالعموم اور اس کی قیادت سے بالخصوص شدید بدظن اور نالاں ہے"۔ (ص ۲۱، ۲۲)

یہ تو جماعتِ اسلامی کی سیاسی نقاب کشائی تھی، مذہبی طور پر بانیٔ جماعتِ اسلامی کے جو عقائد اور افکار تھے اُن کی روشنی میں تمام علماء ہند نے متفقہ طور پر اس جماعت سے مسلمانوں کو علیحدہ رہنے کا حکم دیا، جیسا کہ ۱۹۵۱ء میں علماء ہند کے تمام مکاتیبِ فکر کا متفقہ فیصلہ بہ نام "فتنۂ مودودیت" شائع ہوا اور ساتھ ہی جماعت کے اسلامی اور اصلاحی دعوے کی قلعی کھل جانے پر جو علماءِ کرام جماعت کے ساتھ منسلک تھے آہستہ آہستہ علیحدہ ہو گئے، جن کی مجموعی تعداد حضرت مولانا منظور احمد نعمانی نے تقریباً ستر (۷۰) لکھی ہے۔ جماعت کے ساتھ وہی اُردو خوان رہ گئے جو اپنے سیاسی اغراض جماعت کے پلیٹ فارم سے پورا کرنے کے خواہشمند تھے جس پر دلیل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت مدنیؒ کے ساتھ شدید معاندت کی وجہ

جماعت اسلامی کے اصلاحی خوشنما عنوان سے متاثر ہو کر اکثر علماء کرام شروع میں اس کے ہمنوا ہو گئے تھے، مگر وہ جلیل القدر علماء کرام جو بانیٔ جماعت مودودی صاحب کی ابتدائی تحریروں[1] اور مضامین کو دیکھ کر یہ سمجھ گئے تھے کہ جماعت اسلامی متواتر اور متوارث اسلام کے مقابلہ میں اپنا خود ساختہ اسلام پیش کرتی ہے ان علماء کرام میں حکیم الامۃ حضرت تھانوی، مفتی کفایت اللہ، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہم سر فہرست تھے۔ حضرت مدنیؒ نے قلمی اور زبانی طور پر عوام الناس کو اس جماعت کے حقیقی خدوخال سے متعارف کرانا نہایت ضروری سمجھ رکھا تھا اور کئی رسائل "ایمان و عمل، مودودی دستور کی حقیقت" وغیرہا شائع فرمائے تھے۔ جماعت اسلامی اس تمام اصلاحی جدوجہد کو ذاتی عداوت پر محمول بتاتی تھی، حضرت مدنیؒ پر طعن و تشنیع کرتے ہوئے کئی مضامین سپرد قلم کیے اور ان تمام اعتراضات سے اپنی جماعت کو مبرا ظاہر کرتے رہے، مگر جونہی متفقین کی کچھ بھیڑ جمع ہوتی نظر آئی جماعت نے بھی نقاب اتار کر اصلی چہرہ ظاہر کر دیا۔ جناب مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے (جو اُس وقت جماعت کے سرگرم رکن تھے) اپنی مرتبہ کتاب "دعوتِ دین" میں لکھا:۔

> "ہماری زبان میں اب تک اسلام پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یا تو خالص اکیڈمک قسم کی چیزیں ہیں اور یا مناظرانہ طرز کی ہیں یا معذرت خواہانہ انداز کی ہیں یا پھر متکلمانہ بحث و استدلال کے رنگ میں ہیں، ان میں سے ہر ایک کی نسبت بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ دعوتِ دین کے لیے کوئی چیز بھی نافع نہیں"۔ (صفحہ ۱۱)

اسی طرح تمام دینی اور عصری تعلیمی اداروں کے بارہ میں جناب مسعود عالم صاحب نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا:۔

> "ملک میں جہاں جہاں بھی نئے سکول اور کالج قائم ہوئے انہوں نے سرسید کی کی پالیسی کو اپنا مشعلِ راہ بنایا اور ملک کے جس حصہ میں کوئی مذہبی مدرسہ قائم ہوا عام

---

[1] جن کا ایک حصہ احقر کے مرتبہ رسالہ براءۃ المحدث عن افتراء المحدث میں مذکور ہے۔

جمود اور مسائلِ حیات سے فرار کی پالیسی اس کی روش دیوبند کے نقشِ قدم پر رہی۔"[1]

بالآخر امیر جماعتِ اسلامی مودودی صاحب نے اپنے دل کا حال بیان کرتے ہوئے سرگودھا کے جلسۂ عام میں مؤرخہ ۱۸ رجون ۱۹۵۵ء کو تقریر کرتے ہوئے ظاہر کر دیا :۔

"ہم خالص اسلام پیش کرتے ہیں مگر قدامت پسند گروہ کی طرح نہیں اور ہم لبرل ازم کے قائل ہیں مگر جدت پسند گروہ کی طرح نہیں"[2]

جن رازہائے سربستہ سے امیر جماعت اور جماعت کے سرکردہ ارکان نے بارہ تیرہ سال بعد پردہ اٹھایا اُن سے حضرت مدنیؒ نے جماعت کے ابتدائی دور سے پردہ اُٹھا کر مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کی تلقین فرمادی تھی، اس وجہ سے جماعتِ اسلامی حضرتِ مدنیؒ کے خلاف سب سے زیادہ سرگرم عمل رہی۔ ھدانا اللہ وایاھم

تنبیہ:۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے شاگردِ رشید مولانا صبغۃ اللہ مدراسی بھی مودودی کے دامِ فریب میں آگئے، حضرتؒ نے تعلق منقطع کر لیا، کچھ دنوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق دی تو حضرتؒ نے اسی پر اکتفاء کو ناکافی سمجھتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "اگر آپ کی توبہ صادق ہے تو اعلان فرما دیجیے اور اخباروں میں بھی شائع کروا دیجیے"۔ چنانچہ مؤرخہ ۷ رمارچ ۱۹۵۳ء کے اخبارات میں ان کا توبہ نامہ شائع ہوا تو حضرتؒ نے پھر بیعت فرما لیا۔

◎

---

[1] جماعت کا ہفتہ وار آرگن کوثر لاہور ۲۸ نومبر ۱۹۵۱ء [2] جماعت کا روزنامہ اخبار تسلیم ۲۰ رجون ۱۹۵۵ء

ایک مشاغبہ (پروپیگنڈہ) اور اُس کا جواب

حضرتِ مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ کے خلاف یہ پروپیگنڈہ بھی کیا گیا اور کیا جارہا ہے کہ آپ اور آپ کی جماعت (جمعیۃ العلماء ہند) کانگریس کی ہمنوائی میں پاکستان بنانے کی مخالف تھی اور آخر تک متحدہ ہندوستان کیلئے کوشش کرتے رہے، اس کا جواب یہ ہے کہ:۔

برِ صغیر کی اس طرح کی تقسیم کے مخالف نہ صرف یہ علماء کرام اور اُن کی جماعت تھی بلکہ سوائے مسلم لیگ کے دُوسری تمام جماعتیں احرار، جماعت اسلامی، خاکسار، زمیندارہ لیگ، سُرخ پوش وغیرھا تقسیم کے مخالف تھے خود مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈر ۱۹۴۵ء تک کانگریس میں تھے "سرحد کے مردِ آہن خان عبدالقیوم خان نے ۲۲ اگست ۱۹۴۵ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی تھی" (نوائے وقت ۱۹ مارچ ۱۹۹۶ء)

علامہ اقبال کے فرزند جسٹس (ر) جاوید اقبال کا قول بھی ملاحظہ فرمائیں "تقسیم کا منصوبہ انگریزوں نے بنایا تھا" (نوائے وقت ۱۵ فروری ۱۹۹۶ء)

بلکہ خود قائد اعظم بھی اس کے مخالف تھے۔ پاکستان کے سابق اٹارنی جنرل اور آئینی ماہر سید فخر الدین جی ابراہیم کا مندرجہ ذیل بیان امورِ بالا کی تصدیق اور توثیق کیلئے درج کیا جاتا ہے:۔

"اسلام آباد — نامہ نگار) سابق اٹارنی جنرل اور آئینی ماہر سید فخر الدین جی ابراہیم نے کہا ہے کہ میں اپنے اس بیان پر قائم ہوں کہ قائد اعظم آخری وقت پاکستان کے حق میں نہیں تھے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت کے حق میں تھے اور انہوں نے بمبئی میں طالب علموں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے یوں کہا تھا کہ وہ (DE COMPROMISE) کتاب کا مطالعہ کریں جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ مفاہمت کو کس قدر اہمیت دیتے تھے، انہوں

نے اپنے اس بیان کی بھی تصدیق کی کہ قائدِ اعظم ہندوستان کی تقسیم نہیں چاہتے تھے۔" (روزنامہ خبریں راولپنڈی ۲۲ نومبر ۱۹۹۵ء ص۴)

اِن حالات میں حضرت مدنیؒ کی تقسیمِ ہند کی مخالفت مسلمانانِ ہند کی بہبودی اور مستقبل کے تحفظ کے لیے تھی۔ ورنہ حضرت مدنیؒ کے متعلق یہ خیال کرنا کہ آپ کسی ایسی تجویز کے مخالف تھے جس سے مسلمانوں کو امن اور عافیت سے زندگی بسر کرنے کے ذرائع میسر ہوں سراسر بے انصافی ہے۔ جس شخص نے اپنے شیخ حضرت شیخ الہندؒ کی رفاقت میں دنیا بھر کے مسلمانوں کی عافیت اور تحفظ کیلئے، خلافت جیسی عظیم تنظیم کے بقاء اور تحفظ کے لیے بے نظیر قربانی دی اور مالٹا کی اسارت کو قبول کیا وہ برصغیر کے مسلمانوں کی بہتری اور عافیت کیلئے کیسے مخالف ہو سکتا تھا؟

دراصل بات یہ تھی کہ حضرتِ مدنیؒ ہر اُس تجویز کو برصغیر کے مسلمانوں کیلئے غیر مفید سمجھتے تھے جس سے ایک خطہ یا ایک علاقہ کے مسلمان تو امن و عافیت سے زندگی بسر کر سکیں مگر باقی مسلمان ابدی پریشانیوں کا شکار ہو جائیں، ان کے سامنے ایسی کئی سابقہ تجاویز تھیں جو پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی تھیں۔

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کو خطرہ تھا کہ تقسیم کے وقت انگریز مسلمانوں کو نقصان پہنچائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ معروف مسلم لیگی لیڈر نے اعتراف کیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن (مشن) نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا[1]

یہ محض اندیشہ نہ تھا خود برصغیر کی تاریخ اس پر شاھد ہے، چنانچہ سیدین شہیدین سید احمد بریلوی، سید اسمٰعیل شہید دہلوی اور ان کے رفقاء نور اللہ قبورہم کی بے مثال جدوجہد اور بے نظیر قربانیوں سے برصغیر کے شمال مغربی حصہ میں مجاہدین نے خلافتِ راشدہ کے نمونہ پر حکومت قائم فرمالی اور احکام شرعیہ کا عملی نفوذ بھی شروع ہو چکا تھا، مگر جلد ہی خاندانِ نبوت کے یہ چراغ خود تو جامۂ شہادت سے سرفراز ہو گئے مگر اُن کی محنت کو کامیاب نہ ہونے دیا گیا۔

---

[1] اس کا تفصیلی ذکر کتاب ھٰذا کے ص۴۳۲ پر آچکا ہے۔

خود ہجرتِ کابل کی تحریک میں مسلمانوں نے ہر طرح کی قربانی دی جس سے امان اللہ خان مرحوم کو تو فائدہ پہنچا مگر برصغیر کے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچا، ورنہ برصغیر میں ایک علیحدہ خطّہ کا مطالبہ اس سے پہلے امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ پیش کر چکے تھے جیسا کہ ان کے اُس مکتوبِ[1] گرامی سے ظاہر ہے جو آپ نے ۱۹۲۵ء کو اقبال شیدائی کے نام تحریر فرمایا تھا، اس طویل خط میں مولانا سندھیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ "سب سے پہلا مسئلہ تقسیم کا نظریہ میں نے کابل میں ۱۹۱۶ء میں لکھا تھا"

جبکہ علامہ اقبال نے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں "مسلمانانِ برصغیر کے لیے ایک مسلم ہند کے مطالبہ کو حق بجانب قرار دیا تھا"

مگر ان تمام مطالبات میں برصغیر کے تمام مسلمانوں کے لیے امن و عافیت کی کسی کفالت کا ذکر نہ تھا اور نہ اس طرح کثیر تعداد (اس وقت ایک کروڑ بیس لاکھ) کے متاثر ہو جانے کا خدشہ پیشِ نظر تھا۔ اُن کے پیشِ نظر یہ تھا کہ:-

(الف) اس طرح تقسیم سے اگرچہ ایک خطّے میں مسلمانوں کو امن، عافیت، عزت اور اسلامی احکام پر قانونی طور پر عمل کی آزادی میسر ہو جائے گی لیکن برصغیر کے دوسرے حصّوں میں مسلمان ان تمام نعمتوں سے عملی طور پر محروم رہ جائیں گے۔ حضرت مدنیؒ اور ان کی جماعت کے پیشِ نظر یہ نظام تھا کہ انگریزی حکومت کے خاتمہ کے بعد ملک میں مسلمان ہر جگہ باعزت، باوقار اور اس خطّے میں مستقل حقوق کے مالک تصور ہوں جہاں وہ تعداد کے لحاظ سے کم سے کمتر ہی کیوں نہ ہوں، مثلاً اگر پنجاب میں رہنے والے مسلمان اپنی کثرتِ تعداد کی وجہ سے جمہوری قواعد کے مطابق امن اور عافیت سے زندگی بسر کر سکتے ہوں تو مدراس، بنگلور اور دیگر دور دراز علاقوں میں بسنے والے مسلمان اگرچہ عددی لحاظ سے کم سے کمتر ہوں مگر وہ اپنے آپ کو سارے ملک میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کو اپنی قوم اور اپنا ہمدرد سمجھیں۔ اُن کو اندیشہ تھا کہ اگر ملک تقسیم ہو گیا تو دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کی تہذیبی، ثقافتی، دینی حیثیت کو نقصان پہنچنے کا امکان قوی ہو جائے گا۔

(ب) ان کو یہ اندیشہ تھا کہ برصغیر کی اگر تقسیم کسی بھی وجہ سے ایک دفعہ کر دی گئی تو آئندہ کے لیے اس عمل کو روکنا مشکل ہو جائے گا اور کسی بھی وجہ کو بنیاد بنا کر تقسیم در تقسیم کا عمل حاصل شدہ وطن کو کمزور کر دے گا

---

[1] مولانا سندھیؒ کا یہ خط پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس کی لائبریری میں محفوظ ہے، جس کی تفصیل جناب قاضی محمد حنیف کے مقالہ برائے ایم اے بہ عنوان: برصغیر پاک و ہند میں چار ہمعصر تحریکات کے ص ۱۵۰ پر درج ہے۔ مولانا سندھیؒ نے جمنا، نربدا، سندھ ساگر کے نام سے ایک علیحدہ وطن کا نقشہ بھی پیش کیا تھا۔

جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے خدشہ کو جناب حکیم محمد سعید صاحب دہلوی نے یوں ذکر فرمایا،

"حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ یقیناً قیام پاکستان کے حق میں نہیں تھے، اپنے دلائل میں وہ مضبوط تھے اور پورے استحکام کے ساتھ یہ رائے رکھتے تھے کہ تقسیم ہند درحقیقت برصغیر کے عظیم مسلمانوں کی تقسیم کے منصوبے کا نام ہے جو بہر حال مسلمانوں کے ضعف پر منتج ہوگا۔

جب پاکستان بن گیا تو اُن کی رائے تھی کہ انگریز اپنے منصوبے میں تقسیم فلسطین کے بعد ہندوستان میں تقسیم مسلم میں کامیاب ہوگیا ہے، مگر اب حضرت مولاناؒ قیام پاکستان کے بعد استحکام پاکستان کے لیے دعاگو تھے۔ بہ ایں ہمہ اُن کی حتمی رائے یہ تھی اور اس کا اظہار انہوں نے برملا کیا اور کرتے رہے کہ "مجھے جو پریشانی ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان میں جو عناصر آج جمع ہیں کل وہ صوبائی عصبیتوں کے نرغے میں آجائیں گے اور ان کا یکجا رہنا ہمیشہ معرضِ خطر میں رہے گا۔"

حضرت مولانا آزادؒ نے اپنی اس رائے کا کبھی اخفا نہیں کیا کہ پاکستان کی توانائی کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس سال ہے، اس سے پہلے اور اس کے بعد مختلف عصبیتیں جنم لیں گی اور انتشار پیدا ہوگا جو افتراق پر منتج ہوگا۔ مجھے یقیناً حضرت مولاناؒ کی رائے سے اتفاق نہیں تھا، صحیح تر یہ کہ حضرت محترم کے دلائل و براہین پر یقین کرنے کو میرا دل نہیں چاہتا تھا، قیام پاکستان کے بعد وہ ہندوستان سے مسلمانوں کی ہجرت کے حق میں نہیں تھے، اُن کی رائے میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے یہ ہجرت باعثِ ضعف ہوگی۔ بہ ایں ہمہ ان کا دل اس خدشے سے خالی نہ تھا کہ اس ہجرت کی کثرت سے پاکستان کے لیے مسائل پیدا ہوں گے۔ ۱۹۴۸ء میں ایک محافلے سے انہوں نے دہلی میں خطاب بھی کیا اور فرمایا کہ یہ ہجرت اس اعتراف کی نفی ہے کہ تمہارے آباؤ اجداد نے گنگا اور جمنا کے پانیوں سے وضو کیا تھا، اس خطاب میں بھی انہوں نے اپنی خدشات کا اظہار فرمایا کہ پاکستان تقسیم در تقسیم کے نہایت دردناک خطرات سے دوچار ہو جائے گا۔

آج جب میں پاکستان کو پیش آمدہ مسائل پر سوچتا ہوں اور یہاں کے انسانیت سوز اور اخلاق سوز حالات پر غور کرتا ہوں تو میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے، ٹھیک چوبیس سال بعد مشرقی پاکستان کٹ کر الگ ہو گیا اور بنگلہ دیش بن گیا۔ تقسیم پاکستان کا نہایت المناک حادثہ اور سانحہ پیش آیا تو ٹھیک اس دن کہ جب سقوطِ ڈھاکہ ہوا مغربی پاکستان میں کاروبارِ زندگی معمول کے مطابق جاری تھا، شادیوں اور

دیگر تقاریب کی محافل گرم تھیں اور پاکستان کے مراعات یافتہ طبقوں کے فکر ونظر یہ تھے (جنہیں پاکستان نے بہت کچھ دیا تھا) کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان پر ایک بارِ عظیم تھا اچھا ہوا کہ اس سے نجات ملی اب مغربی پاکستان ترقی کرے گا۔۔۔ ہائے کس قدر دردناک ہے یہ کوتاہیٔ فکر کہ اپنے دس کروڑ بھائی الگ ہو کر اغیار کے رحم وکرم پر چلے گئے اور اربابِ حل وعقد کی آنکھ میں آنسو نہ آیا، کسی ایک دل نے غور نہ کیا کہ تاریخ اسلام کا یہ ایک نہایت خطرناک سانحہ ہے جس کے اثرات دُور رس ہونگے اور مغربی پاکستان جسے "نیا پاکستان" کہا گیا اس میں انتشار اور افتراق کے وہ بیج پڑ جائیں گے جو کل یہاں تقسیم در تقسیم کا عنوان بن جائیں گے۔۔۔ دیکھئے کہ اب "نیا پاکستان" لسانی عصبیتوں، فکری ناتوانائیوں، علاقائی اُلجھنوں میں گرفتار ہو چکا ہے، صوبائی آزادیوں کی باتیں ہو رہی ہیں۔ "ہم ایک ہیں" کا نعرہ لایعنی ہو کر رہ گیا ہے، قرآن و حدیث اور اسلام کی تمام تعلیمات بے اثر ہو گئی ہیں اور برملا کہا جاتا ہے کہ یہ طاقت اسلام، پاکستان کو اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کے لیے کمزور ہو چکی ہے اور اس میں انتشار و افتراق کو روکنے کی مؤثر توانائی باقی نہیں رہی ہے۔"[1]

مولانا آزاد مرحوم نے انہی خدشات کا اظہار کرتے ہوئے یو۔پی سے پاکستان جانے والے ایک گروہ سے فرمایا:۔

"آپ مادرِ وطن چھوڑ کر جا رہے ہیں آپ نے سوچا اس کا انجام کیا ہوگا؟ آپ کے اس طرح فرار ہوتے رہنے سے ہندوستان میں بسنے والے مسلمان کمزور ہو جائیں گے، اور ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب پاکستان کے علاقائی باشندے اپنی اپنی جداگانہ حیثیتوں کا دعویٰ لے کر اٹھ کھڑے ہوں۔ بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچ اور پٹھان خود کو مستقل قومیں قرار دینے لگیں۔۔۔ کیا اُس وقت آپ کی پوزیشن پاکستان میں بن بلائے مہمان کی طرح نازک اور بے کسانہ نہیں رہ جائے گی؟ ہندو آپ کا مذہبی مخالف تو ہو سکتا ہے، قومی اور وطنی مخالف نہیں، آپ اس صورتِ حال سے نمٹ سکتے ہیں۔۔۔ مگر پاکستان میں آپ کو کسی وقت بھی قومی اور وطنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑ جائے

---

[1] روزنامہ نوائے وقت مؤرخہ یکم اپریل ۱۹۹۴ء

گا جس کے آگے آپ بے بس ہو جائیں گے "۔

(ماہنامہ محقق شمارہ ۵ جنوری ۱۹۹۵ء / شعبان ۵ ۱۴۱ھ)

یہ اندیشہ عملی طور پر بہت جلد یوں حقیقت بن گیا کہ حسب تحریر ڈاکٹر صفدر محمود :-

"مشرقی پاکستان میں لسانی تنازعہ کا پس منظر بھی سیاسی تھا اور یہ مسئلہ قیام پاکستان کے صرف چند ماہ بعد ہی پیدا ہو گیا تھا حالانکہ اس وقت ملک نہایت مشکل اور کٹھن مسائل سے دوچار تھا۔ اوائل ۱۹۴۸ء میں طلباء کے ایک گروہ نے بنگلہ کو بھی پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کیلئے ایجی ٹیشن شروع کی جب اس مسئلہ نے سر اٹھایا تو قائد اعظم کو اس میں نوزائیدہ مملکت کے لیے خطرہ محسوس ہوا چنانچہ وہ بہ نفس نفیس ڈھاکہ تشریف لے گئے"[1]

حضرت قائد اعظم نے شدید مصروفیت اور علالت کے باوجود ڈھاکہ جا کر جو خطاب فرمایا اس میں یہ جملے غور طلب ہیں :-

"میں چاہتا ہوں کہ آپ بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچی اور پٹھان وغیرہ کی اصطلاحوں میں بات نہ کریں، میں مانتا ہوں کہ یہ اپنی اپنی جگہ وحدتیں ہیں لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا آپ وہ سبق بھول گئے ہیں جو تیرہ سو سال پہلے آپ کو سکھایا گیا تھا؟ اگر مجھے اجازت دی جائے تو کہوں گا کہ یہاں آپ سب باہر سے آئے ہوئے ہیں، میں پوچھتا ہوں بنگال کے اصلی باشندے کون ہیں؟ وہ ہرگز نہیں جو آجکل بنگال میں رہتے ہیں، پس یہ کہنے کا آخر کیا فائدہ ہے کہ ہم پنجابی ہیں، ہم سندھی ہیں؟ نہیں! ہم مسلمان ہیں۔

اسلام نے ہمیں یہی سبق دیا ہے اور آپ یقیناً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ آپ خواہ کچھ بھی ہوں اور کہیں بھی ہوں آپ اول و آخر مسلمان ہیں، اب آپ باقاعدہ ایک قوم سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے اگر آپ خود کو ایک قوم، ایک عظیم قوم کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں تو خدا کے لیے اس صوبائی عصبیت کو فوراً ترک کر دیجئے، صوبائی عصبیت ....

.... ایک بہت بڑی لعنت ہے"[2]

قائد اعظم کا یہ خطاب ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ہوا جب کہ آپ کی وفات ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء

---

[1] مسلم لیگ کا دور حکومت ص ۲۲۴ [2] روزنامہ نوائے وقت میگزین، ۵ اکتوبر ۱۹۸۴ء

کو ہوئی۔

قائد کی حیات میں تو یہ فتنہ کچھ دب گیا مگر اس نے پھر ایسا سر اٹھایا کہ کسی ہمدرد ناصح کی بات سننا تک گوارا نہ کی، وہ بنگالی مسلمان جو علماء کرام کا بے حد احترام کرتے تھے جب علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے فروری ۱۹۵۳ء میں تیسری پاکستان تاریخ کانفرنس منعقدہ ڈھاکہ میں صدارتی خطبہ کے دوران یہ فرمایا کہ ”بنگلہ زبان میں ہندو ثقافت کی بھرمار ہے اس لیے یہ پاکستان کی ایک قومی زبان بننے کی مستحق نہیں“ اس پر جو احتجاج ہوئے وہ ناقابل تحریر ہیں اور مولانا مرحوم کو بڑی مشکل سے بچایا گیا مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے لیے اس لسانی جھگڑے نے اس طرح شدت اختیار کر لی کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد لاہور پیش کرنے والے شیر بنگال مولوی فضل حق نے بھی اس اساس پر مشرقی پاکستان کو آزاد ملک بنانے کے لیے بیانات دینے شروع کر دیئے، جناب ڈاکٹر صفدر محمود نے فرمایا ہے کہ:۔

”اونٹ کی کمر پہ آخری تنکا فضل الحق کا نیویارک ٹائمز کو وہ انٹرویو تھا جس میں انہوں نے کہا کہ مشرقی پاکستان ایک آزاد ملک بننا چاہتا ہے، اگرچہ فضل الحق نے اس انٹرویو کی بھی تردید کی کہ ان کا مطلب آزادی نہیں بلکہ صوبائی خودمختاری تھا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا، چنانچہ روزنامہ ڈان نے ۲۷ مئی ۱۹۵۴ء کے شمارہ میں لکھا کہ یوں لگتا ہے کہ جیسے فضل الحق نے ابھی تک پاکستان کو دل سے تسلیم نہیں کیا اسلیئے مرکز کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے“[1]

اس داستان کے ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب تقسیم کا عمل کسی ایک وجہ سے شروع ہوا تو اب اس کے لیے دوسری وجہ تیار کی گئی جو زبان کا مسئلہ تھا، اور اب ۱۹۹۴ء میں وطن عزیز میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب پر روشن ہے۔

(ج) تیسری وجہ یہ تھی کہ حضرت مدنیؒ اور دوسرے علماء کو یہ خدشہ تھا کہ نعرہ ”پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ“ یہ صرف انتخاب جیتنے کے لیے ہے اس کے نتیجے میں بے شک مسلم لیگ تو ایک علیحدہ وطن پر برسر اقتدار آجائے گی جس کا نام پاکستان ہوگا مگر یہ وطن ایک جمہوری وطن ہوگا اور یہ وطن دینی یا مذہبی ریاست نہ ہوگی بلکہ اصطلاح جدید میں سیکولر[2] ہوگی جس میں تمام مذاہب کے لوگوں کو اپنے اپنے مذاہب پر عمل کی آزادی ہوگی اور مجلس دستور ساز جو قانون بنائے گی وہی ملک میں رائج ہوگا۔

---

[1] مسلم لیگ کا دور حکومت صفحہ ۱۶۰ [2] اب تو قومی اسمبلی کے اجلاس میں علی الاعلان یہ کہا گیا ہے کہ مسلم لیگ کے منشور میں بھی پاکستان کو مذہبی سٹیٹ بنانے کا ذکر نہیں

دستورِ اسلامی کی مختصر سرگذشت

۹ جون ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا، ۱۱ جون کو علامہ عثمانیؒ کی ملاقات پھر قائدِ اعظم سے ہوئی، علامہ عثمانیؒ نے اس موقع پر قائدِ اعظم کو یاد دلایا کہ ہم لوگوں کی تمام جدّوجہد صرف اِس لیے ہے کہ آپ کے وعدہ کے مطابق پاکستان کا نظام و قانون اسلامی ہوگا، اسی وعدے کی میں پھر تجدید چاہتا ہوں، اس پر قائدِ اعظم نے نہایت واضح الفاظ میں جواب دیا کہ :

"مولانا یقیناً پاکستان میں اسلامی قانون رائج ہوگا اور آپ سب صاحبان ہی اس مسئلہ کو طے کریں گے"۔[1]

قائدِ اعظم ہی نے امریکی عوام کے نام اپنے ایک پیغام میں یہ بھی فرمایا کہ :-

"بہرحال پاکستان ایک مذہبی ریاست (THEOCRACY) نہیں ہوگی جس پر دینی مکاتبِ فکر کے علماء کی حکومت ہو، ہمارے ہاں بہت سے غیر مسلم ہندو، عیسائی اور پارسی ہیں لیکن وہ سب پاکستانی ہیں، وہ ویسے ہی حقوق و مراعات کے مالک ہیں جیسے دوسرے شہری، اور پاکستان کے معاملات میں وہ اپنی ذمہ داریاں پوری کریں گے"۔[2]

اِسی طرح حضرت قائدِ اعظم نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے عوام کے نام اپنی ایک براڈکاسٹ تقریر میں فرمایا :-

"ہمارے ہاں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے پیرو ہیں، ہم اسلامی برادری کے ارکان ہیں جس کے تمام لوگ وقار اور عزتِ نفس میں برابر ہیں، نتیجتہً ہم میں ایک خصوصی اور گہرا احساسِ اتحاد ہے لیکن غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے پاکستان کوئی حکومت علماء یا اس قسم کی چیز نہیں، اسلام ہم سے تمام مذاہب کے ساتھ رواداری کا متقاضی ہے اور ہم ایسے تمام لوگوں کے ساتھ گہرے تعاون کا خیر مقدم کرتے ہیں جو خود چاہے کسی بھی عقیدے کے ہوں، پاکستان کے سچے اور وفادار شہریوں کی حیثیت سے اپنا کردار سرانجام دینے پر رضامند اور تیار ہوں"۔[3]

---

[1] تجلیاتِ عثمانی ص ۶۹۴ [2] قائدِ اعظم محمد علی جناح شخصیت و کردار ص ۴۷ [3] کتاب مذکور ص ۴۸

قائداعظم کے بعد نوابزادہ لیاقت علی خان سے مولانا عثمانیؒ نے قراردادِ مقاصد منظور کروائی،
تجلیاتِ عثمانی کے مرتب نے تحریر کیا ہے کہ:-

"قرارداد مقاصد | علامہؒ جب سے پاکستان پہنچے آپ کی پوری کوشش یہ رہی کہ پاکستان کے قانون کے متعلق کم ازکم میرے سامنے دستور ساز اسمبلی یہ پاس کردے کہ پاکستان کا آئندہ دستور قرآن وسنت ہوگا، چنانچہ اس کے لیے آپ نے پوری قوم کو بیدار کیا، ملک کے لوگوں کی آواز بلند کرائی، اراکینِ دستورساز پر زور دیا، مسٹر لیاقت علی کو فہمائش کی اور اسی مقصد کے لیے ڈھاکہ میں تین روزہ کانفرنس فروری ۱۹۴۹ء میں منعقد ہوئی اور وہاں ایک زبردست خطبۂ صدارت دیا جس میں آپ نے فرمایا:-

"خواہ اربابِ اقتدار ہمارے ساتھ کچھ ہی برتاؤ کریں...... ہم اس کوشش سے کبھی دستبردار نہیں ہوسکتے کہ مملکتِ پاکستان میں اسلام کا وہ دستور اور آئین اور وہ نظامِ حکومت تشکیل پذیر ہو جس کی رُو سے اس بات کا مؤثر انتظام کیا جائے تاکہ مسلم قوم اپنی زندگی انفرادی واجتماعی تقاضوں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق جو قرآن وسنت سے ثابت ہوں مرتب ومنظم کرسکے۔" (ص ۲۴۰)

قراردادِ مقاصد[1] کے منظور کرانے کے لیے حضرتِ عثمانیؒ کو جو جدوجہد کرنی پڑی اس کا حال حضرتِ علامہؒ کے مندرجہ بالا کلمات سے ظاہر ہے، مگر اس قراردادِ مقاصد کی حیثیت کیا ہے؟ وہ مسلم لیگ کا دورِ حکومت نامی کتاب سے درج کی جاتی ہے:-

"قراردادِ مقاصد سے پاکستان کا جو خاکہ ذہن میں اُبھرتا ہے اُس سے واضح ہے کہ پاکستان کو ایک ایسی اسلامی مملکت بنانا تھا جو جمہوری تقاضے بھی پورے کرتی ہو، اس کا مقصد ہرگز خالصتاً مذہبی ریاست کا قیام نہیں تھا اور نہ ہی اس قرارداد کے ذریعے علماء کو کوئی خاص مقام یا اختیارات دیئے گئے۔" (ص ۲۱)

ازمرتب "چراغ"	اسلامی اور مذہبی کے فرق کو ہم جیسے کم علم لوگ کیا سمجھ سکتے ہیں ع

رموزِ مملکت خویش خسروان دانند

---

[1] ۱۲ر مارچ ۱۹۴۹ء کو قراردادِ مقاصد منظور ہوگئی اور مولانا عثمانیؒ ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو انتقال فرما گئے۔ (مرتب)

"۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خان کو شہید کر دیا گیا اور اُن کی جگہ الحاج خواجہ ناظم الدین وزیرِ اعظم مقرر ہوئے، آپ نے تقریباً سوا سال بعد ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی مکمل و مبسوط رپورٹ دستور ساز اسمبلی میں پیش کی...... بنیادی اصولوں کی ایک اہم سفارش اسلامی قانون پر عبور رکھنے والے علماء کے بورڈوں کے قیام کے بارے میں تھی، یہ بورڈ صدر مملکت اور صوبائی گورنروں کو قائم کرنے تھے، تمام مجوزہ قوانین ان بورڈوں کے سامنے یہ معلوم کرنے کے لیے پیش کیے جانے تھے کہ ان میں قرآن و سُنّت کے منافی کوئی بات تو نہیں ہے، اس طرح قانون ساز اداروں کے سلسلہ میں علماء کے بورڈوں کو عملاً حقِ استرداد (ویٹو) دے دیا گیا تھا۔" (ص ۲۴۵)

لیکن بنیادی کمیٹی پر رائے شماری کا منظر کیا تھا؟ بقول ڈاکٹر صفدر محمود:۔

"بعد میں انکشاف ہوا کہ کمیٹی کے اصل ۲۹ ارکان میں سے صرف ۱۶ ارکان نے اس پر توثیقی دستخط کیے تھے، پنجاب کے اکثر سرکردہ لیڈروں نے جو کمیٹی کے ارکان تھے اس رپورٹ سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا تھا۔" (ص ۲۱۸)

"خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے بعد محمد علی بوگرہ (جو کہ امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے) امریکہ کو خوش کرنے کے لیے ان کے چہیتے کو وزیرِ اعظم بنایا گیا۔" ص ۲۶۵)

محمد علی بوگرہ کا قابلِ فخر کارنامہ یہ تھا کہ:۔

"بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی گذشتہ رپورٹ میں یہ فرض علماء کے بورڈ کے سپرد کیا گیا تھا وہ اس بات کا جائزہ لیں کہ قرآن و سُنّت کے منافی کوئی قانون منظور نہ کیا جائے محمد علی بوگرہ فارمولا میں یہ کام سپریم کورٹ کو تفویض کیا گیا اور بلاشبہ یہ اقدام صحیح سمت میں تھا۔" (ص ۲۲۱)

دستورِ پاکستان کو مشرف بہ اسلام کرنے کی طاقت تو علماءِ اسلام سے سلب کر لی گئی کہ بقول ڈاکٹر صفدر محمود:۔

"اس میں یہ خطرہ بھی ڈھکا چھپا نہیں تھا کہ خواجہ ناظم الدین نے جن راسخ العقیدہ علماء کے ساتھ پارلیمنٹ سے باہر کے علماء کے معاملے میں مفاہمت کی تھی وہ کسی بھی

قانون کو اپنی دانست میں غیر اسلامی قرار دے کر اسے ویٹو کر سکتے تھے، یہ امکانی خطرہ بہت مہیب تھا۔ خواجہ ناظم الدین کا اسلامی ریاست کے بارے میں یہ تصور تھا کہ بعض قوانین اور معمولات کے احیاء سے یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا لیکن قرآن وسُنّت کی تعبیر کی اجارہ داری اُن علماء کو حاصل ہو رہی تھی جنہیں عصرِ حاضر کی نوعیت، تقاضوں اور چیلنج کا کما حقہ، علم و احساس نہ تھا" (مسلم لیگ کا دورِ حکومت ص ۲۱۷)

خواجہ ناظم الدین کے بعد محمد علی بوگرہ اور غلام محمد نے تعلیماتِ اسلامیہ کے بورڈ کو جو مقام دیا اس میں وضاحت نہ تھی، مسلمانانِ پاکستان پھر بھی علماءِ اسلام کے مجلسِ آئین ساز میں وجود کو غنیمت سمجھتے تھے، تا آنکہ سکندر مرزا (جو عوامی نمائندہ نہ تھا) وہ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کا صدر نشین ہو گیا، اُس نے دل کی بات کھول کر بیان کر دی جسے جناب جسٹس جاوید اقبال کے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے :۔

"۱۹۵۸ء کے وسط میں مجھے سکندر مرزا نے کراچی طلب کیا، ان ایام میں معاہدۂ بغداد سے وابستہ ممالک کی ہوائی فوج کے چند سربراہ پاکستان آئے ہوئے تھے، شہزادہ علی خان مرحوم اور کیبنٹ لاج بھی کراچی میں موجود تھے، سکندر مرزا نے ایک کھانے پر اُن سب سے میری ملاقات کرائی۔ دوسرے روز مجھے پھر بلوایا گیا، دراصل وہ چاہتے یہ تھے کہ میں کسی نہ کسی صورت میں معاہدۂ بغداد کے سیکرٹریٹ سے منسلک ہو کر بغداد چلا جاؤں، میں نے عرض کیا کہ میں سات سال وطن سے باہر رہنے کے بعد واپس آیا ہوں اس لیے فی الحال میری خواہش پاکستان کو خیر باد کہنے کی نہیں۔ انہوں نے نہایت خلوص سے فرمایا کہ میں تمہیں استعمال کرنا چاہتا ہوں، اگر تمہیں بغداد جانا منظور نہیں تو پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت حال ہی میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا گیا ہے اگر آپ پسند فرمائیں تو مجھے اس کے ساتھ منسلک کر دیجئے، ممکن ہے میں اس سلسلے میں کوئی کارآمد خدمت انجام دے سکوں۔ یہ سُنکر سکندر مرزا ہنس پڑے، کہنے لگے "مگر وہ کمیشن تو محض دکھاوے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے،

اس کا مقصد دراصل کچھ بھی نہیں، کیونکہ نہ تو اسے کوئی کام کرنا ہے نہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ کوئی کام کرے"۔ (مٹے لالہ فام از جسٹس جاوید اقبال صـ۴)

ایسے بورڈوں اور کمیشنوں کی حقیقت

۹ / اگست ۱۹۴۹ء کو بورڈ آف تعلیمات اسلام کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے مندرجہ ذیل ارکان تھے :۔

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ (۲) مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند رحمۃ اللہ علیہ
(۳) ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی استاذ قانون بین الممالک پیرس یونیورسٹی (۴) مولانا عبدالخالق صاحب مشرقی پاکستان
(۵) شیعہ مجتہد جعفر حسین صاحب (۶) مولانا ظفر احمد انصاری (سیکرٹری)

اس بورڈ میں متذکرہ بالا علماء کرام فقہ اسلامی کے محقق علماء کرام تھے، اُمت کو ان پر کامل اعتماد تھا، یہ بورڈ اپریل ۱۹۵۴ء تک کام کرتا رہا اور نہایت عرق ریزی کے ساتھ دستور پاکستان کی سفارشات مرتب کیں، مگر ان کا حشر کیا ہوا؟ وہ حضرت مفتی صاحبؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں :۔

"افسوس کہ اس بورڈ کی تمام سفارشات کسی بھی دور کے آئین میں نہ تو تمام کی تمام روبہ عمل لائی گئیں نہ انہیں ارباب حل وعقد نے شائع کیا"۔[۱]

اس قدر جلیل القدر علماء کرام کے کمیشن کا چیرمین ایک جسٹس تھا جو انگریزی قانون کا تو ماہر ہو سکتا تھا مگر اسلامی آئین کی ابجد سے بھی واقف نہ تھا، اس کا کام کیا تھا؟ یہ بھی جناب مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں :۔

"جناب مفتی صاحبؒ نے جسٹس صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ قانون سازی کے کام کو اسلام کے رُخ پر آپ چلنے نہیں دیتے اور غلط رُخ پر میں نہیں چلنے دوں گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ گاڑی یہیں کھڑی رہے گی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ گاڑی کھڑی رہی"۔[۲]

جناب مفتی صاحب مرحوم نے اپنی مرتبہ تفسیر کے مقدمہ میں فرمایا :۔

"حکومت کے راستے میں کسی دینی انقلاب اور نمایاں اصلاح کی امیدیں خواب و خیال ہوتی جاتی ہیں تاہم عام مسلمانوں میں دینی بیداری اور امور دین کا احساس

---

[۱] ماہنامہ "البلاغ" کراچی مفتی اعظم نمبر صـ۲۲۵ [۲] ایضاً صـ۲۲۷

بحمد اللہ ابھی تک سرمایۂ زندگی بنا ہوا ہے"۔ (معارف القرآن، مقدمہ ص۶۳)

ف:۔ ایسے بورڈوں کے کمیشنوں کا سربراہ کسی جسٹس صاحب کو مقرر کرنا کوئی تعجب کی بات نہ سمجھی جائے کیونکہ جب سارے ملک (مغربی اور مشرقی پاکستان) کا وزیرِ قانون غیر مسلم جوگندر ناتھ منڈل کو مقرر کیا جائے اور پھر یہی اعزاز ایک عیسائی چیف جسٹس کارنیلیس کو بخشا جائے تو ان بورڈوں اور کمیشنوں کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے؟

یہ مختصر سی سرگذشت اس نعرہ کی ذکر کی گئی ہے جس کی بناء پر مسلمانوں کی وحدت کو تقسیم کیا گیا اور اس نعرہ کو صرف انتخاب جیتنے کے لیے ایک نعرہ بتانے والوں کو دشمنِ اسلام اور مسلمانوں کا دشمن کہا گیا، ہم اس مضمون کو تحریکِ پاکستان کے سرگرم رکن مولانا محمد اسماعیل ذبیح کے بیان پر ختم کر کے ناظرینِ با انصاف کو فیصلہ کی دعوت دیتے ہیں۔

ہم کارکنانِ تحریکِ پاکستان اب شرمندہ ہیں

مولانا محمد اسماعیل ذبیح

> جن نوجوانوں نے پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ کے ایمان افروز اور روح افزا نعرہ سے متاثر ہو کر اپنی تمام توانائیاں اس نعرہ کے عملی نفاذ کے لیے پاکستان کو ضروری قرار دیا اور اس کے حصول کے لیے اپنی جانِ عزیز تک قربان کرنے کو اجر و ثواب سمجھا، ان میں مولانا محمد اسمٰعیل ذبیح کا نام نامی سرِفہرست ہے اور بفضلہ تعالےٰ وہ آج تک سلامت ہیں، ذیل میں ان کا گرانقدر مضمون ہدیۂ ناظرین ہے۔ (مرتب)

اکتوبر ۱۹۴۶ء کے الیکشن کا حال حکیم نثار احمد دہلوی ؒ نے اپنی کتاب "شبِ چراغ" میں اس طرح لکھا ہے کہ "نوابزادہ زاہد علی خاں سابق سیکرٹری یو پی مسلم لیگ پارلیمینٹری بورڈ کا یہ اعتراف بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ جب ۱۹۴۶ء کے تاریخی انتخاب میں کانگریس اور جمعیۃ علماءِ ہند کے مشترکہ امیدوار مولانا محمد احمد کاظمی اور مسلم لیگ کے امیدوار لیاقت علی خان کے درمیان کانٹے دار مقابلہ ہوا تو "ہاپڑ" کے ایک تاریخی جلسہ عام میں جس میں مسلم لیگ کی قیادت پورے جوش و خروش کے ساتھ شریک تھی اور جو ایک لاکھ سے زائد حاضرین کا بڑا فیصلہ کن جلسہ تھا ذبیح صاحب نے ایسی معرکۃ الآرا تقریر کی کہ جو فیصلہ کن ثابت ہوئی اور جب خود نوابزادہ لیاقت علی خان تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ جو کچھ اس نوجوان مولانا ذبیح نے کہا ہے وہی میری تقریر ہے اور اگر مجھے پاکستان کی خدمت کرنے کا موقع ملا تو اس کے اصول وہی ہوں گے جو مولانا ذبیح نے اپنی تقریر میں بیان کیے ہیں۔"

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری تقریر کے بعد جب یہ جلسہ ختم ہو گیا تو مسلمانوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے آکر نوابزادہ لیاقت علی خان سے کہا کہ ہمارے سارے ووٹ آپ کے لیے ہیں اور آپ اس حلقے سے کامیاب ہو گئے۔

اس جلسے کی اہمیت اور میری خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کراچی کے "ڈیلی بزنس ریکارڈر" نے

۵ اپریل ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں میری کتاب "اسلام آباد تعمیر تاریخ اور شہری علاقے" پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب مسرت حسین زبیری نے (جو آر سی ڈی کے پہلے سیکرٹری جنرل تھے) نے اپنے طویل تعریفی تبصرے کے آخر میں یہ پیرا اُس انتخاب کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:-

مولانا ذبیح کی ان دوسری خدمات کے سلسلے میں جو انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ایک نمایاں رُکن کے طور پر انجام دیں اُن کا یہ کارنامہ بھی اہم شمار ہوگا جو انہوں نے نوابزادہ لیاقت علی خان کی اہم انتخابی مہم کو کامیاب بنانے کے معاملے کے طور پر انجام دی جو "ہاپڑ" میرٹھ کے حلقے میں ۱۹۴۵ء کے مرکزی انڈین اسمبلی کے انتخاب میں کانگریس کے امیدوار کو شکست دے کر انجام دیا، اور اسی انتخاب نے نوابزادہ لیاقت علی خان کو "قائدِ ملت" کی حیثیت بخشی، مَیں مولانا ذبیح کو اُن کی خدمات پر مبارکباد دیتا ہوں"۔

یہ اتنا اہم انتخابی معرکہ تھا کہ قائدِ اعظم کو بھی ہر لمحہ اس الیکشن کی مہم سے باخبر رکھا جاتا تھا جس کو سُنکر قائدِ اعظم نے مسرت کا اظہار کیا اور مجھے تعریفی کلمات سے نوازا۔ اس انتخاب کے بعد میں نے اپنے روزنامہ قومی اخبار کو جس کا اپنا پریس، اپنی بلڈنگ اور اپنی ٹیلی پرنٹر مشین بھی تھی اور آٹھ صفحات کا کامیاب اخبار مسلم لیگ کے بھرپور پراپیگنڈہ کے لیے وقف کر دیا۔ اس کی اشاعت دہلی سے کلکتہ تک پھیلی ہوئی تھی اسکی ادارت سنبھالنے کے ساتھ ہی یوپی کے اکثر شہروں میں مسلم لیگ کے مقاصد پر چھوٹے بڑے جلسوں میں میرا تقریری سلسلہ بھی جاری رہا اور جب جنوری ۱۹۴۶ء میں صوبائی اسمبلیوں کی انتخابی شکل میں سامنے آیا تو یوپی لیجسلیٹو اسمبلی کے ارکان کی مجموعی تعداد ۲۲۸ تھی جس میں مسلم ارکان کی نشستیں ۶۶ تھیں جن میں شہری تیرہ (۱۳) دیہی اکاون (۵۱) مسلم خواتین شہری ایک (۱) اور مسلم خواتین دیہی ایک (۱) تھی، یوپی کے اس انتخاب میں مسلم ارکان نے پینسٹھ (۶۵) سیٹیں حاصل کرلیں صرف ایک دیہی نشست جمیعتہ العلماء ہند کو مل سکی۔

یوپی کے اس انتخابی معرکے میں مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریس، جمیعۃ العلماء ہند، احرار، سُنّی بورڈ، شیعہ بورڈ، خاکسار اور آزاد امیدوار جگہ جگہ مقابلے پر آئے، ان سب کو ہرا کر مسلم لیگ نے ۵۱۵۲۲۹ ووٹ حاصل کیے جو تمام پارٹیوں کے مجموعی ووٹوں کا ۴۶٫۷ فیصدی تھا۔ اس انتخاب میں کانگریس نے تمام حربے استعمال کیے۔ مجلسِ احرار کے بھی امیدوار کھڑے کیے گئے جن کو ۴۱۵۴۰۱ ووٹ ملے، سُنّی بورڈ ۸۸۱۱۱ شیعہ بورڈ نے بھی مقابلہ کیا جن کو ۵۸۴۷ ووٹ ملے، خاکسار بھی میدان میں ڈٹ گئے جن کو صرف ۷۶۱ ووٹ ملے اور سارے

آزاد امیدواروں کو جو جگہ جگہ مسلم لیگ کے امیدواروں کے مقابل تھے اُن کو صرف ۱۳۱۴۹۱ ووٹ ملے، باقی ووٹ کانگریس اپنے تمام قوم پرستوں (جمعیتہ علماء ہند) کے ساتھ مل کر ۲۸۱۴۱۹ حاصل کر سکی، اگرچہ کانگریس نے پانی کی طرح سرمایہ بہا کر مسلم لیگ کے مقابلے میں مسلم امیدوار کھڑے کیے مگر کانگریس کو شرمناک شکست ہوئی۔

ہندوستان کے سب سے بڑے صوبے یو پی میں جہاں صرف مسلمانوں سیٹیں ۶۶ تھیں جو بعض مسلم اکثریت کے صوبوں سے کہیں زیادہ تھیں، مسلم لیگ کی یہ شاندار کامیابی کانگریس کی مکمل شکست کی صورت میں ظاہر ہوئی اور پھر ان انتخابات کو پورے ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا نے پاکستان کے قیام کے حق میں مسلمانانِ ہند کا ریفرنڈم قرار دے کر قطعی طور سے اعلانِ پاکستان تصوّر کیا جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء میں عملی شکل میں پاکستان کی صورت میں دُنیا کے نقشے پر قائم ہو گیا۔

یو پی کے ان انتخابات میں یو پی کے طول و عرض میں مسلمانوں کی یہ ۶۶ نشستیں شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھیلی ہوئی تھیں اور ان سب تک مسلم لیگ کا پیغام پہنچانا میرے فرائض میں شامل تھا اور اہم شہروں میں بڑی تقاریر کے علاوہ جو بعض اوقات چار چار گھنٹے تک بھی ہوئیں اور جس میں لاکھوں سامعین شامل ہوتے تھے مسلم لیگ کے تمام امیدواروں اور یو پی مسلم لیگ کی صوبائی قیادت اور مرکزی قائدین جیسے نواب اسمٰعیل خان، چوہدری خلیق الزمان، رضوان اللہ، مولانا فرنگی محلی، مولانا عبد الحامد بدایونی، مولانا عبد القیوم کانپوری، علی گڑھ کے طلبہ کے گروہ اور مختلف مدرسوں اور کالجوں کے اساتذہ بھی شہروں، قصبوں اور گاؤں میں پھیل گئے اور ان سب کی پاکستان کے حق میں ووٹ دینے کی ایک ہی دلیل سے کہ "یہ ایک اسلامی مملکت بن رہی ہے جہاں اسلامی نظام کا نفاذ ہو گا، جہاں سرمایہ دار، جاگیردار اور زمیندار کو سیاست اور معیشت پر برتری حاصل نہ ہو گی، اسلامی فلاحی ریاست کا ایسا نمونہ قائم ہو گا جو ساری دنیا کیلئے مثالی ہو گا اور ہر مسلمان اسلامی عدل و انصاف حاصل کر کے بھائیوں جیسے حقوق یکساں طور پر حاصل کرے گا، یہ اللہ کی سرزمین ہو گی اور یہاں اللہ کا قانون نافذ ہو گا۔" یہی تمام مقررین، طلبہ کے وفود اور تمام تحریری مواد کا حاصل تھا جو لاکھوں مسلمانانِ یو پی کو پاکستان کے حصول کے طور پر سنایا گیا جس پر یقین کر کے انہوں نے ایسے حالات میں مسلم لیگ کو ووٹ دیئے۔ صرف شہر اور قصبات نہیں بلکہ ہندو سرمایہ داروں کے گاؤں میں بسنے والے غریب مسلمانوں نے بھی اپنی جان پر کھیل کر مسلم لیگ کو ووٹ دیئے۔ تمام دُور دراز کے دیہات مسلم لیگ کے نعروں سے گونج اُٹھے، کانگریس اور اس کے مسلم گماشتے برابر یہ نعرہ لگاتے رہے کہ "لیگ کے دھوکے میں مت آؤ، یہ اسلامی ملک نہیں بنائیں گے بلکہ یہ سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور انگریزوں کے ایجنٹوں کا ملک ہو گا"، لیکن ان لاکھوں معصوم مسلمانوں نے

بھی جو ہندو اکثریت میں گھرے ہوئے تھے کانگریس کی ایک نہ سُنی اور مسلم لیگ کے پیغام کو سچ سمجھ کر اپنا ووٹ مسلم لیگ کو دیدیا اور دُنیا کا سب سے بڑا مسلم ملک بنانے کا اعزاز حاصل کیا۔

یوپی اسمبلی کے انتخابات کے وہ چند مہینے جو انتخابات کی تیاریوں میں صرف کیے گئے مسلسل ایک طوفانی عمل تھا اور سارے مسلم لیگ کے کارکن علمائے دین کی شکل اختیار کر کے اللہ اور اس کے رسول کی باتیں کرتے تھے اور قسم کھا کر یہ اعلان کرتے تھے کہ "مسلمانو! تمہارا ووٹ نیک کام میں صرف ہو رہا ہے، دُنیا میں تمہیں پاکستان کی سربلندی ملے گی اور جنت تمہیں انعام میں ملے گی"۔

یوپی مسلم لیگ کے انتخابات کا پبلسٹی انچارج بنا کر مجھے جو ذمہ داری سونپی گئی وہ ایک بڑا امتحان بھی تھا اور قومی اعزاز بھی۔ اُس وقت یوپی جیسے وسیع و عریض صوبے میں اڑتالیس ۴۸ ضلعے تھے اور ہر ضلع میں بڑے بڑے قصبات اور آبادیاں تھیں اور شہری حلقوں میں تمام بڑے بڑے شہر شامل تھے میں کانگریس کی پبلسٹی کے جواب میں بہت بڑا پوسٹر ہر دوسرے روز شائع کرتا تھا جو ۶۶ اُمیدواروں کے کئی سو انتخابی حلقوں میں دیواروں پر چپکانے کے لیے اور پمفلٹ اور ہینڈبل کو تقسیم کرنے کیلئے سینکڑوں کی تعداد میں بنڈل ریلوں اور بسوں کے ذریعے پہنچائے جاتے تھے، اس طرح میرے تحریر کردہ بہت سے بڑے سائز کے پوسٹر یوپی کے گاؤں گاؤں میں چسپاں کر دیئے گئے، اس میں نئے نئے مؤثر نعرے اور نئے مُدلل مضامین اور مؤثر جملے اور سیاسی و مذہبی مضامین کے خُلاصے اس انداز میں پیش کیے گئے کہ وہ عوام پر اثر انداز ہوں۔

کانپور میں بیٹھ کر جسے میں نے اپنی پبلسٹی مہم کا مرکز بنایا ہوا تھا بیک وقت کئی چھاپے خانے ان پوسٹروں اور پبلسٹی کے ان مطبوعات کو چھاپتے تھے، اس زمانے کی سُست رفتار مشینیں ہماری الیکشن کی ضرورت پورا کرنے کے لیے کافی نہیں تھیں، اسلئے بڑے بڑے پوسٹروں کے چربے اتار کر الگ چھاپے خانوں میں یہ طبع ہوتے تھے جن پرنٹوں کے حساب سے کاغذ صرف ہوا اور ہر جگہ مسلم لیگی اُمیدواروں کو اُنکی ضرورت کے مطابق پبلسٹی کا میٹریل پہنچا دیا گیا۔

مَیں ایک بندۂ ناچیز ہوں، یہ میری قابلیت یا میری محنت کا نتیجہ نہ تھا کہ مسلم لیگ اس ہمہ گیر شان سے کامیاب ہوئی، یہ صرف قائدِ اعظم کی شخصیت، عوام کی اسلام سے شدید محبت اور قائدینِ مسلم لیگ کی پیہم کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اتنی کامیابی ہوئی البتہ میں نے کانگریس کو اس انداز میں پبلسٹی کی رنگارنگ کاروائیوں سے مسلسل شکست دی جس کو سب سے زیادہ قائدِ اعظم، لیاقت علی خان اور نواب اسمٰعیل خان نے پسند کیا اور اس کے نتیجے میں یوپی کانگریس جو برسرِ اقتدار حکمران پارٹی تھی اُس نے الیکشن کے اختتام کے ساتھ ہی مجھے بار بار جیلوں میں ڈالنا شروع کر دیا۔

۱۴ اگست کو جب پاکستان قائم ہوا تو میرے لیے اپنا اخبار جاری رکھنا اور کانپور شہر میں اپنے والدین اور بچوں کے ساتھ رہنا ناممکن بنا دیا گیا یہاں تک کہ خود نواب اسمٰعیل خاں مرحوم نے مجھے حکم دیا کہ تم فوراً پاکستان چلے جاؤ اور مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری لیاقت علی خاں سے مل کر قائداعظم کو راضی کرو کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کا آخری اجلاس کراچی میں بلائیں چنانچہ میں لاہور جانے کی بجائے جہاں مجھے حمید نظامی مرحوم اور شورش کاشمیری مرحوم کی موجودگی میں اپنے اخبار اور ضبط شدہ پریس کا معاوضہ ملنے کی پوری اُمید تھی اور ظفر احسن لاری کے والد نے اپنے بیٹے کو تاکید کی تھی کہ وہ مجھے لاہور میں پوری سہولتیں پہنچائیں تاکہ میں اپنے نقصانات کا معاوضہ وصول کر سکوں۔ لیکن میں نے نواب اسمٰعیل خاں کے حکم کو بڑی قومی خدمت سمجھا اور کراچی پہنچ کر اس جلسے کا اہتمام کرنے میں کامیاب ہو گیا جو ۱۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو خالق دینا ہال میں آل انڈیا مسلم لیگ کے آخری اجلاس کے طور پر قائداعظم کی صدارت میں منعقد ہوا اور جس میں میں نے جو نمایاں حصہ ادا کیا ہے اُسکی تفصیل شریف الدین پیرزادہ صاحب کی کتاب "فاؤنڈیشن آف پاکستان" جلد ۲ صفحہ ۵۶۹ تا ۵۷۶ میں تفصیلاً درج ہے، مجھے خوشی ہے کہ مجھ سے یہ اہم قومی خدمت بھی تکمیل کے مراحل تک پہنچی۔

اس داستان کو بیان کرنے کا مقصد تاریخ میں ان اہم باتوں کا ریکارڈ کرا دینا ہے کہ کس طرح ہندوستان کے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے ہندو اکثریت کا جبر برداشت کر کے پاکستان کو ووٹ دیکر سو فیصدی کامیاب کرایا اور اس بات پر یقین کیا کہ مسلم لیگ کے بڑے قائدین اور تمام صوبائی زعماء جس قسم کا اسلامی پاکستان بنانے کی یقین دہانی کرا رہے ہیں وہ سچ ثابت ہوگا، اُن کو وہ پاکستان بنا کر نہیں دیا جس کے لیے انہوں نے جانی اور مالی قربانیاں دیں اور ۴۵ سال گذرنے کے بعد بھی وہ وحشی ہندو اکثریت کے مظالم مسلسل برداشت کر رہے ہیں اور ان کو ۴۵ سال گذرنے کے بعد بھی وہ پاکستان بنتا ہوا نظر نہیں آرہا جس پر وہ قربان ہو گئے۔

یہ پاکستان بنانے والی مسلم لیگ کی خود غرضانہ موت تھی کہ قیام پاکستان کے وقت ہم کارکنان تحریکِ پاکستان نے مذہبی، لسانی، صوبائی اور نسلی نعرہ بازوں کو جس طرح شکست دی تھی وہی اب پاکستان دشمنی کی آواز بن گئے ہیں جبکہ ہماری پاکستانیت اور قومی وحدت کو پھر سے پاکستان کی فولادی تعمیر کیلئے بے چین ہو جانا چاہیئے۔

میرا ضمیر اسی دن سے مجھے ملامت کرتا ہے کہ جب ۱۱ ستمبر کو قائداعظم کی رحلت کے کچھ عرصہ بعد لیاقت علی خاں شہید کر دیئے گئے اور خواجہ ناظم الدین کو ملک غلام محمد جیسے بیوروکریٹ نے پاکستان کا صدر بنا کر وزارت عظمٰی سے برخاست کر دیا تو پاکستان کا مسلم لیگی ضمیر مر گیا اور اس کے بعد پاکستان میں ہمیشہ کے لیے وہ لوگ برسرِ اقتدار آئے جو صرف بے ضمیر اقوام میں برسرِ اقتدار ہو سکتے ہیں، جیسے سکندر مرزا، جو ۱۹۴۷ء میں پشاور کا ڈپٹی کمشنر تھا اور اکتوبر ۱۹۵۵ء میں

پاکستان کا صدر بن گیا، جیسے جنرل محمد ایوب خان جو پاکستان کے قیام کے بعد قائد اعظم کا باڈی گارڈ تھا وہ ۱۹۵۸ء کے بعد مسلم لیگ اور ملک کا صدر بن گیا، پھر ایک سربراہِ مملکت یحییٰ خان کے نام سے آیا جو کردار کے لحاظ سے اسلامی مملکت کے لیے ایک لعنت تھا اُس نے اپنے ایک ساتھی ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ مل کر پاکستان کے دو ٹکڑے کرا دیئے اور برصغیر کے مسلمانوں کی آرزوؤں کو پیروں تلے روند ڈالا، وہ ملک جس کا وعدہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں سے ہم کارکنانِ مسلم لیگ نے ہزاروں جلسوں میں بار بار کیا وہ سب دھوکہ ثابت ہوا۔ جو مسلم لیگ، قائد اعظم کے اصولوں کے مطابق پاکستان میں حکمران ہونی چاہیئے تھی اس کا نام و نشان تک پاکستان میں نہیں ہے۔ جاگیرداروں، وڈیروں، کلرک افسروں، فوجی حکمرانوں اور اُن کے ہمنواؤں کا دور ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا، اور ہر دور کی قومی نمائندگی پر یہ چند دولتمند خاندان جو پہلے وڈیرہ شاہی اور سرداری نظام کے ماتحت سیاست کے مالک تھے، ان سے بھی خطرناک عناصر نے جو کسی جسم کے لیے کینسر کا روگ کہلا سکتا ہے اُس نے پاکستان کو گھیرے میں لے لیا ہے اور یہ صوبائی، علاقائی، نسلی اور قومیتوں کے وہ فتنے ہیں جس نے پاکستانی قومیت کے استحکام کو جڑ سے اکھاڑ دینے کی پوری کوشش شروع کر دی ہے۔ ملت کی تعمیر، اسلامی فلاحی ریاست بنانے کا عمل عوام کے اصل طبقات کو نمائندہ حیثیت دینے سے انکاری ہے اور وہ کسی حالت میں بھی پاکستان کو قائد اعظم کے اصولوں پر استوار کرنے، صحیح جمہوریت لانے اور پاکستان کو عوامی اقتدار کا سرچشمہ بنانے پر آمادہ نہیں ہے، یہی وہ مایوسیاں ہیں جن کی بنا پر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے کہ میں نے مسلمانانِ ہند کے ساتھ دھوکہ کیا ہے یہ وہ پاکستان نہیں ہے جس کے لیے برصغیر کے مسلمانوں نے بے مثال قربانیاں دے کر اپنا ملک بنایا۔

سچی بات یہ ہے کہ اگر سرمایہ داروں کی ہوس، جاگیرداروں اور وڈیروں کی لوٹ، غیر محبِ وطن جذبات کے خود غرض بیوروکریٹ اور اقتدار کے غلام سیاستدان پاکستان کے ابتدائی ایام تباہ نہ کرتے تو پاکستان اب تک ویسا ہی عظیم اسلامی فلاحی مملکت بن جاتا جیسی ہر ہندوستانی اور پاکستانی مسلمان کی آرزو تھی، یہ دنیا کا واحد ملک ہے جہاں اس کے اصل بانی پاکستان کی سالمیت، مستحکم پاکستانی قومیت، مضبوط فلاحی ریاست کے اصولوں، مجاہدانہ اور سادہ اسلامی زندگی، قائد اعظم کے فرمودات اور اقبال کے انقلابی اسلامی تصورات کی بنیادوں پر ۴۵ سال گذر جانے کے بعد بھی تعمیرِ وطن کی بات نہیں کر سکتے ہیں۔

یہاں پر بے خوف ہو کر کھلے عام ملک و وطن کے مسلّمہ غدار پورے پاکستانی عوام کے سامنے پاکستان توڑنے اور پاکستان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے والوں کو حکومت کی سرپرستی میں مسلسل انعام و اکرام سے نوازا جاتا ہے

اوران پر دولت کی بارش کی جاتی ہے تاکہ سانپ پل کر اژدھے بن جائیں۔ اب پاکستان میں یہ مقتدر قیادت کے اجزاء ہیں، ان میں ایسے بھی ہیں جن پر پاکستان نے انعام واکرام کی بارش کی مگر وہ پاکستان اور قائداعظم کی سیاست سے نفرت کرنا باعثِ فخر سمجھتے ہیں، ان میں ایسے قائدین کی بھی کثرت ہے جن سے ہر دشمن ملک کا سفارتکار جب چاہے اندرونِ خانہ مسلسل راز و نیاز کر سکتا ہے، یہاں ہر غدارِ وطن حکومت وقت کی سرپرستی میں ہر طرح کے وسائل دولت سے مالا مال کیا جاتا ہے، اور صرف مسلم لیگ کی اصل رُوح کے مفاد اور قدیم وفادارانِ مسلم لیگ اور سچے عاشقانِ نظریۂ پاکستان آنے والے ۱۴ اگست کو ان دعاؤں، حسرتوں اور آرزوؤں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ ناشکر گذار قوم شاید اب پاکستان کے احسانات کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنے فرائض سمجھ سکے۔

اگرچہ ان مایوس کن حالات میں اب مسلم لیگ کا نام سیاسی برسر اقتدار پارٹی کے طور پر چمکا ہے اور نواز شریف اور وائیں جیسے راہنما جم کر مسلم لیگ کے اصولوں کی برتری کا نام لے رہے ہیں لیکن ابھی تک صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے اکثر اراکین اور بہت سے ایسے نو ترقی یافتہ بیوروکریٹ جو نظریۂ پاکستان بلکہ تاریخِ پاکستان سے بھی ناآشنا ہیں پاکستان کے وسائل اور اقتدار کے سرچشموں پر قابض ہیں اور مسلم لیگ کے اصولوں، قائدِ اعظم کی سیاست، ایک مستحکم پاکستانی قومیت اور ایک ہمہ گیر اور مقتدر قومی جماعت کو پورے پاکستان میں کامل اقتدار دینے کیلئے سرگرم نہیں ہیں جو تحریکِ پاکستان اور قیام پاکستان کا لازمی نتیجہ ہونا چاہیئے۔

میرا یہ شرمندہ ضمیر اہلِ وطن اور پاکستان سے وابستہ افراد سے پکار پکار یہی کہہ رہا ہے کہ قائد اعظم کی مسلم لیگ کو سیسہ پلائی دیوار بنا دو تاکہ اندرونی اور بیرونی چیلنجوں کا مقابلہ کر کے فتوحات حاصل کی جاسکیں۔

(بشکریہ روزنامہ نوائے وقت ۲۸ اگست ۱۹۹۲ء جمعہ میگزین صدا)

خود قائد نے اپنی اس تمام محنت اور بے نظیر قربانیوں سے حاصل ہونے والے ملک کے بارہ میں جو فرمایا وہ تحریکِ پاکستان کے سرگرم رکن حاجی دین محمد صاحب کے الفاظ میں درج ذیل ہے:۔

—— "ہم نے یہ ملک اپنی آنکھوں کے سامنے بنتے دیکھا ہمارے پاس ایک ہی لیڈر تھا اور وہ تھا قائدِ اعظم۔ قائد کی زندگی میں ہی مفاد پرست سیاستدان سامنے آگئے تھے اسیلئے قائد نے فرمایا تھا کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔ قائد اعظم نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں سیاستدانوں سے اس قدر مایوسی کا اظہار فرمایا کہ بے اختیار کہہ اُٹھے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ پاکستان پر ایسے لوگ قابض ہو جائیں گے تو کبھی ملک نہ بناتا"——

(فیملی میگزین روزنامہ نوائے وقت صفحہ ۸ بابت ۱۳ تا ۱۹ اگست ۱۹۹۵ء)

از احقر مرتب "چراغِ محمد" صلی اللہ علیہ وسلم

ان حوالہ جات کے ذکر کرنے سے میرا مقصد حاشا وکلاّ کسی فرد یا کسی جماعت کی تنقیص یا تنقید نہیں ہے، جو ہونا تھا وہ ہو گیا، بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ جن خدشات کا اظہار حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ اور دیگر علماءِ حق نے برِصغیر کی تقسیم کے سلسلہ میں کیا تھا اور اس نعرہ یعنی پاکستان کا مطلب کیا؟ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کو مسلمانوں کی مجموعی حیثیت سے مفید قرار نہیں دیا تھا وہ خدشات اب حقیقت بن کر سامنے آ رہے ہیں اور عملی طور پر ان خدشات کی تصدیق کی جا رہی ہے۔ میری ان گذارشات کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ جن کا سارا زورِ قلم حضرت مدنیؒ اور دوسرے علماءِ کرام کے خلاف سبّ وشتم اور دوسرے ناروا حملے کرنے پر صرف ہوتا ہے انہیں اپنے اس کردار سے توبہ کرنی چاہیئے ورنہ قیامت کے دن اُس مواخذہ کے لیے تیار رہیں جو کسی بے گناہ پر الزام اور بہتان کی شکل میں کیا جاتا ہے، ارشادِ ربانی ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَتُوْبُوْا فَلَھُمْ عَذَابُ جَھَنَّمَ وَلَھُمْ عَذَابُ الْحَرِیْقِ ۝ (پ۳۰ سورۃ البروج)۔ (ترجمہ "بے شک جو لوگ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو دین سے بھٹکانے لگے اور انہوں نے توبہ بھی نہ کی تو ان کے لیے جہنم کا عذاب اور آگ کا عذاب ہے۔")

حضرتِ مدنیؒ اور علامہ اقبالؒ

ہمارا یہ عندیہ ہے کہ پاکستان میں بسنے والے لوگوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اب پوری توجہ دیانتداری اور اخلاص کے ساتھ اس وطنِ عزیز کی آبادی اور ہر قسم کے داخلی خارجی انتشار اور فساد سے حفاظت پر مرکوز رکھنی چاہیئے، جو ہونا تھا وہ ہو گیا، جس کسی فرد یا جماعت نے انگریزوں سے نجات کے لیے جو بھی محنت کی ہے اُن سب کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ ہمیں پاکستان کو خالص اسلامی ملک بنانے کے لیے اپنے کردار اور اعمال کی اس طرح اصلاح کرنی چاہیئے کہ لاکھوں شہداء کی ارواح کو اطمینان ہو کہ ان کی قربانی ضائع نہیں ہوئی بلکہ کامیاب ہوئی ہے۔

مگر افسوس ہے کہ بعض افراد اور بعض جماعتیں بے موقع اور بے محل اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لیے قوم کا رُخ داستانِ ماضی کی طرف موڑ دیتے ہیں اور یہ نامناسب طریق کار ابھی تک اس طرح جاری ہے کہ گویا اس کے بغیر پاکستان کی ترقی ہو ہی نہیں سکتی، جیسا کہ جب حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے فرعون کو توحید کی دعوت دی تو اس نے دعوت کو پسِ پشت کرتے ہوئے یہ پوچھا: مَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى (طٰهٰ ۵۱) "یعنی پہلے لوگوں کا کیا حال ہے؟" آپ نے فرمایا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ "اُن کا علم میرے رب کے پاس ہے" یعنی تُو اس سے کیا نکالتا ہے میرے ساتھ بات کر۔

اسی طرح جب لوگ پوچھتے ہیں کہ پاکستان کو بنے ہوئے تقریباً نصف صدی گذر چکی ہے اس مدت میں مشرقی پاکستان تو بنگلہ دیش بن گیا اور جو باقی ہے اس میں بھی پاکستان کا مطلب کیا؟ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی ہلکی سی کرن بھی محسوس نہیں ہوتی تو کہا جاتا ہے کہ فلاں فلاں عالمِ دین نے دو قومی نظریہ کی مخالفت کی تھی جن میں سرِفہرست شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا نام ہے تب ہی تو علامہ اقبال نے اپنے تین اشعار میں آپ پر گرفت کی تھی۔ اور اس تنقید کے بیان کرنے میں افتراء اور اختراع تک کا ارتکاب کیا جاتا ہے، اس لیے نہایت ضروری ہے کہ "چراغِ محمدؐ" میں اس مضمون کو مدلل طریقہ پر بیان کیا جائے تاکہ

ناواقف لوگ اچھی طرح سمجھ جائیں کہ اس افتراء اور اختراع کا پس منظر کیا ہے؟

جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے مالٹا سے واپس آکر اپنی تحریک کے طریق کار کو اس طرح تبدیل فرما دیا تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام لوگوں کو ساتھ ملا کر انگریزوں کو نکالنے کیلئے تحریک جاری کی جائے، اس کے لیے وطنی متحدہ قومیت کا نظریہ اختیار کیا گیا تھا کہ چونکہ ہندوستان میں بسنے والی تمام اقوام انگریزی مظالم کا شکار ہیں اس لیے فی الحال سب کو اپنے اپنے مذہب، تہذیب و ثقافت پر قائم رہتے ہوئے اس غاصب حکومت کا مقابلہ کرنا چاہیئے، جمعیۃ العلماء اور دوسرے مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں نے بھی اسی پر عمل شروع کر دیا تھا، مسلم لیگ کے قائدین بھی شروع میں اسی نظریہ کے ہمنوا تھے مگر بعد میں الگ ہو گئے۔ حضرت مدنیؒ ہمیشہ اپنی سیاسی تقاریر میں ایسی ہی وطنی متحدہ قومیت کی تبلیغ فرمایا کرتے تھے، چنانچہ اوائل جنوری ۱۹۳۸ء کو دہلی کے ایک سیاسی جلسہ میں آپ نے وطنی متحدہ قومیت کے بارہ میں حسب سابق ایک طویل تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں۔ آپ کی یہ تقریر دہلی کے اخبارات میں شائع ہوئی، مولوی مظہر الدین شیرکوٹی[۱] جو پہلے حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت کا رکن تھا بعد میں مسلم لیگ کا سرگرم رکن بن گیا، دلّی سے ایک ہفتہ وار اخبار بہ نام الامان اور ایک روزنامہ اخبار بہ نام "وحدت" جاری کر رکھے تھے، جن کا موضوع صرف اُن علماء کرام کی کردار کشی تھی جو سیاسی طور پر بادلیل مسلم لیگ کی پالیسی کے مخالف تھے، مگر زیادہ زورِ قلم حضرت مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلاف صرف ہوتا تھا، چنانچہ "الامان" اور "وحدت" نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ پر افتراء کرتے ہوئے یہ لکھا کہ حضرت مدنیؒ نے فرمایا ہے "ملت کا دار و مدار وطن پر ہے"، پنجاب کے لیگی اخبارات نے بھی اسی افتراء کو شائع کر دیا، علامہ اقبال نے بلا تحقیق کے اس عبارت کو پڑھ کر مندرجہ ذیل

۱ے مظہر الدین شیرکوٹی کا مختصر تعارف | شیرکوٹ ضلع بجنور وطن تھا، ۱۳۲۶ھ میں دار العلوم سے فراغت حاصل کی، کچھ دنوں تک دار العلوم میں مدرس رہے پھر اخبار مدینہ بجنور کے ایڈیٹر رہے، بعد ازاں دہلی سے پہلے سہ روزہ "الامان" اور پھر روزنامہ "وحدت" جاری کیا، ملک کے مشہور مقرر اور صحافی تھے، انہوں نے کئی تاریخی ناول بھی لکھے ہیں جو اُس زمانہ میں بڑے مقبول تھے، تحریک خلافت میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا، مسلم لیگ کے زبردست حامیوں میں سے تھے، الامان اپنے دور میں ایک مقبول اخبار سمجھا جاتا تھا، ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۸ء میں دفتر الامان میں ان پر قاتلانہ حملہ ہوا اور اسی حملہ میں جان بحق ہو گئے۔ (تاریخ دار العلوم دیوبند جلد ۲ ص ۱۰۲ و تجلیاتِ عثمانی ص ۱۳۶)

تین شعر کہہ ڈالے ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ رسولِ عربی است
بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

چونکہ اس کتاب کے مخاطب اکثر وہ حضرات ہیں جو فارسی زبان سے نابلد ہیں اس لیے ان کا ترجمہ بادل نخواستہ درج کیا جاتا ہے۔

(۱) عجم یعنی عرب کے سوا دوسرے ممالک تاحال دین کی رموز سے ناواقف ہیں اگر واقف ہوتے تو دیوبند کا حسین احمد یوں نہ کہتا جو کہ تعجب کی بات ہے۔

(۲) اُس نے منبر پر بیٹھ کر یہ کہا کہ ملت کا دار و مدار وطن پر ہے اسے رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کی کیا خبر ہے؟

(۳) اپنے آپ کو مصطفےٰ تک پہنچا کہ دین سارا وہی ہے اگر وہاں نہ پہنچ سکا تو پھر سب کچھ بولہبی ہے۔

ان اشعار میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ حضرت مدنیؒ پر یہ طنز اور تشنیع جو کہ تمام حدود کو پھاند چکی ہے صرف اس وجہ سے کی گئی کہ آپ کی طرف ملت کا دار و مدار وطن پر منسوب کیا گیا ہے۔

علامہ اقبال کے ان اشعار کے جواب بہت سے اہلِ علم حضرات نے نظماً و نثراً دیئے جن کا خلاصہ احقر نے بہ نام اذانِ حجاز شائع کیا تھا، مگر سب سے زیادہ جامع اور وقیع مضمون اُس علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا جس کے بارہ میں علامہ اقبال نے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے گرامی نامہ محررہ ۲ / دسمبر ۱۹۱۸ء میں لکھا۔

"آپ اُمت کے خاص افراد میں سے ہیں اور مامور من اللہ، قوم کے خاص افراد کو ہی امر الٰہی ودیعت کیا گیا ہے"۔

اپنے ایک دوسرے گرامی نامہ محررہ ۲۲ / اگست ۱۹۲۲ء میں لکھا۔

"علومِ اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے؟ جتنی آگاہی آپ نے مجھے دی ہے وہ اگر زمانے نے فرصت دی تو باقی عمر

کے لیے کافی ہے"۔ (مکاتیب اقبال بنام سید سلیمان ندوی ص۱۵-۱۶)

اسی سید سلیمان ندوی نوّر اللہ مرقدہٗ نے ڈاکٹر اقبال کے ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مضمون لکھا جس کے بارہ میں غالب خیال یہی ہے کہ آپ نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کو ارسال کر دیا ہوگا اور اسی سے زیادہ متاثر ہو کر آپ نے رجوع کیا ہوگا، آپ کا یہ مضمون اخبار مدینہ بجنور میں ۱۳ اپریل ۱۹۳۸ء کو شائع ہوا جو درجِ ذیل ہے :۔

—— جناب مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے سیاسی خیالات سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو مگر اُن کی شخصی عزت واحترام علمی فضل وکمال اور تقویٰ اور حسنِ نیّت کی نسبت ایک لمحے کے لیے بھی کوئی خلاف بات گوارا نہیں کی جاسکتی۔

دلّی کے بعض اخباروں میں مولانا کی تقریر کے ایک فقرہ کو جس طرح سیاق وسباق سے قطع کر کے اُچھالا گیا ہے اور اس کے جو جو معنی پہنائے گئے وہ صریحاً دیانت کے خلاف تھے اور اسی لیے اُن کا اعتبار کر کے شاعرِ اسلام ڈاکٹر اقبال کا ایک ایسا قطعہ کہہ دینا جس میں حد درجہ کی بُری تلمیح حافظ شیراز کے مشہور شعر کی بنا پر تھی، صاف کہہ دوں کہ باوجود ڈاکٹر صاحب سے میرے خاص تعلّقات ہونے کے میرے لیے بہت اندوہناک تھا، میں بے چین ہو گیا۔

صحیح وفصیح عربی اور قرآن پاک کے محاورے میں "ملّت" کے ایک ہی معنی، اور وہ مذہب کے

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ (سورۃ الحج ۷۸)

قوم کا لفظ عربی ہے، اس کے معنی مطلق گروہ کے ہیں۔ یہ قرآن پاک اور عربی محاورہ میں تینوں معنوں میں آیا ہے، مطلق گروہ اور جماعت کے معنی ہیں جیسے :۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ٥ (المائدہ)	یہ اس لیے کہ یہ لوگ عقل نہیں رکھتے۔
بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ٥ (توبہ)	اس لیے کہ یہ لوگ نہیں سمجھتے۔
اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ٥ (الحجر)	تم انجان لوگ ہو۔

وغیرہ بہت سی آیتیں ہیں، ان آیتوں میں قوم کا ترجمہ لوگ، گروہ اور جماعت ہو سکتا ہے۔

ان اوپر کی سطروں کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کے پیشِ نظر قوم، ملّت اور اُمّت کی جو تشریح ہے وہ فلسفیانہ اصطلاحوں میں صحیح ہو تو ہو مگر قرآن کے لفظوں میں میرے خیال میں صحیح نہیں، لیکن اپنے اس خیال کی

کی قطعیت پر اصرار بھی نہیں کہ و فوق کل ذی علم علیم۔

اب دوسری بات سامنے آتی ہے کہ مسلمان جس ملک میں رہ رہے ہیں اور وہاں دوسری قومیں بھی آباد ہیں تو کیا اس ملک کے نامسلموں کے ساتھ مسلمان مل کر اُس ملک کی کوئی مشترک سیاسی یا وطنی خدمت انجام دے سکتے ہیں یا نہیں! تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس نقطہ میں بھی یہ دونوں بزرگ مختلف نہیں، اقبال کا ہندی ترانہ جب تک موجود ہے اُن کے وطنی جذبہ سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، کیا وہ اقبال ہی نہیں ہیں جنہوں نے ہماری نوجوان نسلوں کو یہ سکھایا ہے[1] ؏

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

مولانا حسین احمد صاحبؒ تو وطن کی محبت میں اس منزل سے بہت پیچھے ہیں، وہ ڈاکٹر اقبال ہی ہیں جنہوں نے ہندوستانی بچوں کو یہ قومی گیت عنایت کیا ہے ؎

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہندی مسلمانوں کو بھی یہ ترانہ انہی کا بخشا ہُوا ہے ؏

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

پھر ڈاکٹر صاحب اسی مضمون میں لکھتے ہیں :۔

"میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مولانا کا یہ ارشاد کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" قابلِ اعتراض نہیں، اسلئے کہ قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف

---

[1] از مرتب :۔ کیا اقبال ہی نے وطن کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے یہ نہیں کہا ؎

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوح نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

(بانگِ درا، مطبوعہ ۱۹۵۹ء، ص ۱۸۷)

یعنی جس وطن کے باشندے مثیلِ کلیم (موسیٰ علیہ السلام) ہیں اور جس کے پہاڑ اسی نسبت سے کوہ طور ہیں اور نوح علیہ السلام کی کشتی جہاں آ کے ٹھہری تھی میرا وطن وہی ہے ـــــــــ اس سے بھی بڑھ کر رام چندر جی کی تعریف میں علامہ اقبال کے فرمودہ اشعار آج تک ان کی کتابوں میں شائع ہو رہے ہیں۔

منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیونکہ ہم سب کرۂ ارضی کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علیٰ ھٰذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے متصادم نہیں ہوتا، ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔"

مولانا حسین احمد صاحب نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا اور نہ اس سے زیادہ اُن کا کچھ اور منشا ہو سکتا ہے، وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ وطن کے مشترکہ مفاد میں اس ملک کی دوسری بسنے والی قوموں کے ساتھ اشتراک کیا جائے اور وہ بھی "ملت" ہی کی خاطر، جیسا کہ ابھی آسام کی ایک تقریر میں فرمایا۔

آخر میں صرف ایک سوال ہے کہ ہم مسلمان ہندوستان میں دوسری قوموں کے ساتھ ایک ملک میں شانہ بشانہ رہتے ہیں اس سے ہمارے اُن کے درمیان ہم وطنی کی جامعیت بہرحال پیدا ہوتی ہے اس جامعیت کی تعبیر کے لیے ہماری زبان میں کونسا لفظ ہے! ملت و اُمت کے لفظ تو قطعاً نہیں ہیں اور اب قومیت کا لفظ بھی نہیں بولنا چاہیئے، تو کیا اس کے "جنسیت" کا لفظ بول سکتے ہیں، مگر بولنے سے پہلے قوم کے مُفتیوں اور مُفتیوں کی قوم سے بہرحال پوچھ لینا چاہیئے۔ مجھے اُمید ہے کہ اب اس فتنہ کو یہیں دبا دیا جائے گا اور ملت کے منتشر عناصر کو ایک غلط روایت کی بنا پر اور زیادہ پراگندہ بنانے کی حکمتِ عملی سے گریز کیا جائے گا۔[1]

اس کے علاوہ بھی خطوط وغیرہ شائع ہوئے، علامہ طالوت نے جو حضرت مدنیؒ اور علامہ اقبال دونوں کے مخلص احباب میں سے تھے ڈاکٹر صاحب کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا، آخر ڈاکٹر صاحب نے مورخہ ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو روزنامہ احسان لاہور میں مندرجہ ذیل بیان شائع فرمادیا۔

"مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریۂ قومیت کے اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری

---

[1] حیات شیخ الاسلام بحوالہ اخبار "مدینہ" بجنور بابت ۱۳ اپریل ۱۹۳۸ء و "سیاسی مطالعہ" شائع کردہ مجلس یادگار شیخ الاسلام کراچی ص ۴۴۳

سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اِس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق اُن پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا، میں مولانا کے جوشِ عقیدت کی قدر کرتا ہوں ــــ میں اُن کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیّتِ دینی کے احترام میں میں اُن کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں۔"

علامہ کا یہ اعلان ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو ہُوا جبکہ آپ کی وفات ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوئی، یعنی جو مباحثہ اوائل جنوری ۱۹۳۸ء سے شروع ہُوا تھا وہ ۲۸ مارچ کو ختم ہوگیا یعنی تین ماہ سے بھی کم عرصہ میں اختتام پذیر ہُوا۔ ہم اس پر اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ علامہ مرحوم کو لفظِ ملّت سے مغالطہ لگا اور انہوں نے پھر ملّت کی جگہ قوم کے کلمے کو اپنی اس تنقید کا موضوع بنایا جو بقول سیّد مظفر حسن برنی مؤلف "محبِ وطن اقبال" کے۔

"ان قطعہ بند اشعار میں گہرا اور سخت طنز ضرور ہے اور لہجہ میں غیر معمولی تلخی اور تندی ہے جو اُن کا شعار نہیں غالباً یہی وہ واحد شخصی طنز ہے جو اُن کی زبان اور قلم سے نکلا۔" (صنہ ۲)

اگرچہ ہمیں برنی صاحب کے اس تجزیہ سے اتفاق نہیں کیونکہ اقبال مرحوم کے کلام میں بڑی بڑی شخصیات پر (جن میں خود قائدِ اعظم بھی ہیں) طنز اور قدح کے ایسے کلمات ہیں جو علامہ اقبال کی شان کے مناسب نہیں، مگر ہم اس بحث میں اُلجھنا مفید نہیں سمجھتے، اتنا ضروری عرض ہے کہ ناظرین کو جدید نظریۂ قومیت سے آگاہ کریں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ساری زندگی جس جدید نظریۂ قومیت کی تردید میں گذری ان کے ذمّے اس نظریہ کی تبلیغ و اشاعت لگانا ایک بہتان اور افترا نہیں تو اور کیا ہے؟ ــــ جدید نظریۂ قومیت کی تشریح صفحہ ۵۹۸ پر آرہی ہے۔

(ف) اقبالیات کے ماہرین اور علاّمہ کے بعض احباب کی یہ رائے ہے کہ علامہ اقبال کے کلام کا آخری مجموعہ "ارمغانِ حجاز" اگر علاّمہ مرحوم کی زندگی میں چھپتا تو آپ ان اشعار کی اشاعت کی اجازت نہ دیتے، خواجہ عبدالوحید نے فرمایا:۔

"ارمغانِ حجاز اگر علامہ علیہ الرحمۃ کی زندگی میں چھپتی تو یہ نظم اس میں شامل نہ ہوتی۔" (اقبال ریویو، جنوری ۱۹۶۹ء)

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید "سرگذشتِ اقبال" میں تحریر کرتے ہیں :۔

"اگر وہ ارمغانِ حجاز کی ترتیب اپنی زندگی میں کرتے تو شاید وہ تین اشعار درج نہ کرتے جن میں مولانا حسین احمد مدنیؒ پر چوٹ کی گئی تھی" [۱]

کیونکہ علامہ اقبال ہی کی یہ نصیحت تھی ؎

وا نہ کرنا فرقہ بندی کیلئے اپنی زباں — چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تیری تحریر سے — دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تیری تقریر سے
محفلِ نَو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ — رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

اسی طرح علامہ مرحوم نے ۱۹۰۵ء میں ولایت جاتے ہوئے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نوّر اللہ مرقدہٗ کے مزار پر جو نظم پڑھی جس کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

مری زبانِ قلم سے کسی کا دِل نہ دُکھے — کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

کیا علامہ مرحوم کے نام اور کلام کے سہارے اپنے حسد و بغض کا اظہار کرنے والے اس نصیحت پر عمل کریں گے؟

خلاصۂ بحث اس تمام طویل ترین بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض اخبارات نے حضرت مدنیؒ پر یہ افتراء کیا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ "ملّت وطن پر موقوف ہے" — اِس سے متاثر ہوکر تحقیق کیے بغیر علامہ اقبال نے — سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است — کہہ دیا، حقیقتِ حال سے باخبر ہونے کے بعد ملّت کی بجائے قوم کا کلمہ درج کر دیا اور اس سے از خود اُس وقت کی جاری وطنی قومیت مراد لیکر دُوسرا اعتراض کر دیا، بعد میں اس سے رجوع فرمالیا — ورنہ علامہ نے خود ایک ملّی ترانہ میں کہا ہے ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا — مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اور ہندی ترانہ میں کہا ہے ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا [۲]
(بانگِ درا، مطبوعہ ۱۹۵۹ء)

---

[۱] سرگذشتِ اقبال ص۴۷۵ بحوالہ شیخ الاسلام نمبر شائع کردہ گوجرانوالہ [۲] اس شعر کو گاندھی جی نے بروڈا جیل میں سینکڑوں بار گایا۔ (محبِ وطن اقبال ص۲۵)

ایک سوال اور اُس کا جواب

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جب حضرت مدنیؒ یہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے اپنے اس کلام (موجودہ دور میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں) میں اس بات کی خبر دی تھی کہ آج کے دور میں قوموں نے اپنی قومیّت کے لیے وطن کو بنیاد بنا رکھا ہے نہ کہ مذہب کو، مگر پھر اس کے ساتھ ساتھ حضرت مدنیؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ وطن کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لیے ہندوستان کے باشندوں کو وطنی متحدہ قومیت اختیار کرنی چاہیئے، ان دونوں باتوں میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے۔

اس کا جواب سمجھنے سے پہلے اس بات کا سمجھنا ضروری ہے کہ دنیا میں وطنی قومیّت کی تین قِسمیں ہیں:۔

(۱) ایک قسم تو یہ ہے کہ کسی وطن کے رہنے والے اپنے مذہبی عقائد، تہذیب اور ثقافت کو بالکل مٹا کر یک رنگ ہو جائیں، اُن کا سب سے بڑا مقصد وطن ہی ہو، جس کی مثال آجکل کے کمیونسٹ ممالک ہیں جن میں مذہب کا تصوّر کرنا بھی جرم ہے، یہ وطنی قومیّت ہر لحاظ سے اسلام کے خلاف ہے۔

(۲) دوسری قسم وہ وطنی قومیّت ہے جس میں وطن کے ساتھ ساتھ اُس وطن میں رہنے والے بظاہر تو مذہب کا نام لیتے ہوں اور خدا پر ایمان کا اظہار کرتے ہوں لیکن ان کے ہاں اوّلین حیثیت وطن کو ہو، مذہب، اپنی وطنی تہذیب اور معاشرت سب کو ثانوی حیثیت دیتے ہوں جس کی مثال میں بیسویں صدی کے شروع میں پیدا ہونے والی وطنی قومیّت کو سمجھنے کیلئے جرمنی کی مثال درج کی جاتی ہے، ہر جرمن کو یہ عہد کرنا ضروری تھا کہ:۔

"ہم خدا پر اس حیثیّت سے ایمان لاتے ہیں کہ وہ زمین پر زندگی اور قوّت کا ازلی مظہر ہے، اللہ پر ایمان جرمن کے لیے ایک فطرتی امر ہے لیکن ہمارا اللہ اور ازلیّت کا تصوّر دوسرے مذہب اور عقیدہ کے تصورات سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا ہم جرمن قوم اور جرمنی کی ازلیّت پر ایمان لاتے ہیں، اس لیے کہ طاقت اور زندگی کی ازلیّت پر ہمارا ایمان ہے ہم زندگی کے قومی اشتراکی تصوّر پر ایمان رکھتے ہیں، ہم اپنے قومی مقاصد

اوران کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں، ہم اپنے قائد اڈولف ہٹلر پر ایمان لاتے ہیں۔"
ہر فرک جرمنی کے وزیرِ داخلہ نے کہا تھا:۔

"حق کا معیار یہ ہے کہ جرمن قوم کو اس سے نفع ہو اور باطل وہ ہے جس سے جرمن قوم کو نقصان پہنچے، مسیحی اور اخلاقی تعلیمات حکومت کے خارجی تعلقات پر منطبق نہیں ہوتیں۔"

جرمنی کی کتاب الایمان میں ہے کہ:۔

"ہٹلر کی خدمت جرمنی کی خدمت ہے اور جرمنی کی خدمت اللہ کی خدمت ہے۔" (مسلمانوں کے تنزل سے دُنیا کا نقصان ص ۱۵۹، ۱۶۰)

یہ نظریہ بھی اسلام کے سراسر خلاف ہے، مسلمان کے عقیدہ میں مذہب کو اوّلین اور بنیادی حیثیت حاصل ہے، وہ کسی حال میں بھی اپنی مذہبی حیثیت کو چھوڑنا گناہ سمجھتا ہے۔

(۳) وطنی قومیت کی تیسری قسم یہ ہے کہ ایک وطن کے رہنے والے اپنے اپنے مذاہب اور اپنی تہذیب اپنی ثقافت پر قائم رہتے ہوئے وطن کے تحفظ اور اس کی بقاء کے لیے متحد ہو کر کام کریں۔ یہ تیسری قسم مذہب سے متصادم نہیں بلکہ اپنے وطن کے لیے نہایت ہی ضروری ہے اور اسی کو حضرت مدنیؒ، ابوالکلام آزادؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ اور دیگر مجاہدینِ ملّتِ اسلامیہ نے ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لیے ضروری قرار دیا، جیسا کہ مولانا محمد علی جوہرؒ نے گول میز کانفرنس لندن کے چوتھے اجلاس منعقدہ ۹ ا نومبر ۱۹۳۰ء کو اپنی آخری تقریر میں فرمایا:۔

"جہاں تک احکامِ خداوندی کے بجالانے کا تعلق ہے میں اوّل بھی مسلمان ہوں، دوئم بھی مسلمان ہوں اور آخر بھی مسلمان ہوں، یعنی مسلمان ہونے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوں۔ یہی حال ڈاکٹر مونجے کا ہے، احکامِ خداوندی کے بجالانے میں اُن کو پہلے ہندو ہونا چاہیئے اور مجھ کو مسلمان، لیکن جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے، جہاں ہندوستان کی آزادی کا سوال ہے یا جہاں ہندوستان کی فلاح و بہبود کا سوال آتا ہے میں اوّل بھی ہندوستانی ہوں دوئم بھی ہندوستانی ہوں اور آخر بھی ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہوں، میں دو برابر کے دائروں سے تعلق رکھتا

ہوں جو ہم مرکز نہیں"۔

مولانا محمد علی جوہرؔ کا یہ آخری عمومی بیان تھا اس لیے کہ آپ کی وفات ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو اسی لندن میں ہوئی اور ارضِ انبیاء علیہم السلام بیت المقدس میں خلد آشیاں ہوئے۔ نور اللہ مرقدہٗ

خود علامہ اقبال نے وطنی قومیت اور اس کے ساتھ محبت کی حیثیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اگر متحدہ قومیت کا معنیٰ حُبّ الوطنی اور ناموسِ وطن کے لیے جان تک قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا جُزو ہے' اس قومیت کا اسلام سے اُس وقت تصادم ہوتا ہے جبکہ وہ ایک سیاسی تصوّر بن جاتی ہے اور اتحادِ انسانی کے بنیادی اصول کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے"۔[1]

اس سے زیادہ وضاحت علامہ مرحوم نے اپنی وفات سے صرف پانچ ہفتے پہلے مارچ ۱۹۳۸ء میں یوں فرمائی:۔

"ہزاروں لاکھوں برس سے قومیں ملکوں سے وابستہ رہی ہیں اور ہم سب ہندوستانی کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں کیونکہ ہم دُنیا کے اُس حصّے میں رہتے ہیں جسے ہندوستان کہا جاتا ہے۔ اسی طرح چینی، عرب، جاپانی، ایرانی سب اپنے ملکوں سے پہچانے جاتے ہیں، مادرِ وطن کا تعرف صرف ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور یہ اسلام کے خلاف نہیں، دوسرے لفظوں میں ہر شخص فطری طور پر اپنے زاد بوم سے محبت کرتا ہے اور اس کیلئے اپنے مقدور بھر قربانی دینے پر آمادہ رہتا ہے"۔[2]

علامہ نے تحریر کیا کہ: "یہ کہنا غلط نہیں کہ قومیں اوطان سے وابستہ ہیں یا ہر قوم کا کوئی نہ کوئی وطن ہے' ہندی محض اسلیئے ہندی کہلاتے ہیں کہ وہ ارض (زمین) کے ایک ایسے خطّے میں آباد ہیں جس کو ہندوستان کہا جاتا ہے، خطّہ یا علاقہ بحیثیت ایک جغرافیائی تصوّر اسلام سے اس لیے متصادم نہیں ہوتا کیونکہ ممالک کی حدود بدلتی رہتی ہیں، گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے پیشتر برما کے لوگ ہندی کہلاتے تھے

---

[1] روزنامہ نوائے وقت ۱۹ اپریل ۱۹۷۷ء [2] محب وطن اقبال بحوالہ ملت اور وطن ص۱۹

لیکن اس ایکٹ کے بعد برمی کہلانے لگے۔ قوم پرستی کا اصول اسی صورت میں اسلام سے متصادم ہوتا ہے جب وہ ایک سیاسی اصولِ زندگی کی حیثیت سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اسلام کسی قوم کی اجتماعی زندگی سے بحیثیت ایک زندہ عنصر خارج کر دیا جائے" (مٹے لالہ فام از جسٹس جاوید اقبال ص ۹۰)

ازمرتب چراغ محمد

۱۹۳۵ء سے پہلے اس خطۂ ہند کے رہنے والے تمام لوگوں کی وطنی قومیت ہندی تھی، برما کے الگ ہو جانے سے برمی اور ہندی ہو گئی، ۱۹۴۷ء کے بعد برصغیر میں تین وطنی قومیتیں برمی، بھارتی، پاکستانی ہو گئیں۔ ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش بن جانے کے بعد اب چار وطنی قومیتیں بن گئیں، برمی، بھارتی، بنگلہ دیشی، پاکستانی ۔۔۔ اس میں اسلام کے خلاف کون سی بات ہے؟ اس سے زیادہ وضاحت متحدہ بنگال مسلم لیگ کے آخری سکریٹری جنرل مولانا ابوالہاشم کا وہ انٹرویو ہے جو روزنامہ نوائے وقت ۲۲ اپریل ۱۹۹۴ء کے میگزین میں چھپا ہے، مولانا نے فرمایا:۔

"جس طرح بھارت میں رہنے والے ہندو، سکھ، عیسائی اور مسلمان ایک قوم ہیں اسی طرح پاکستان میں رہنے والے ہندو، مسلمان، عیسائی اور بدھ ایک قوم ہیں۔ بیسویں صدی میں مذاہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ پاسپورٹ کی بنیاد پر قومیں بنتی ہیں اور پاسپورٹ کے فارم پر قومیت کے خانے میں اسلام[1] لکھ دینے سے مجھے سعودی عرب کا پاسپورٹ فارم نہیں مل سکتا، چنانچہ میرے خیال میں اب اس بحث کو ختم کر دینا چاہیئے۔"

ایسے موقع کے لیے مندرجہ ذیل مصرع پڑھا جاتا ہے ع

زلیخا نے کیا خود پاک دامن ماہِ کنعاں کا

(ف) ایک قوم ہونے سے مراد وطنیت میں ایک ہونا ہے جو لوگ اس کلچر اور تہذیب کا ایک ہونا مراد لیکر علماء حق پر تنقید کرتے ہیں درست نہیں۔ جب سمپورنا نند جی نے یہ بیان دیا کہ وہ کلچر اور تہذیب کے معاملہ میں ہندو مسلمان امتیاز پسند نہیں کرتے تو مولانا آزادؒ نے اس کا رد کرتے ہوئے فرمایا:

"یہ ایسا نظریہ ہے جسے مسلمان کبھی قبول نہیں کر سکتے" (آزادی سے دس سال پہلے مولانا آزادؒ کی تقریر ۔۔۔ از الجمعیۃ دہلی ۷ تا ۱۳ فروری ۱۹۹۷ء)

---

[1] مولانا کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان سعودی عرب جانا چاہے تو پہلے اسے پاسپورٹ بنانا ہوتا ہے جس میں قومیت کا اندراج ضروری ہے۔ مثلاً اگر بنگلہ دیش کا ایک مسلمان سعودی عرب جانا چاہے جو کہ خالص اسلامی ملک ہے اور وہ اپنے پاسپورٹ فارم میں اپنی قومیت اسلام لکھ دے تو اس کو پاسپورٹ نہیں ملے گا جب تک وہ اپنی وطنی قومیت "بنگلہ دیشی" نہ لکھے گا کیونکہ دوسرے ممالک میں اس کی پہچان بطور وطنی قومیت کے ہوگی۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کا توبہ نامہ

حضرت مدنیؒ کے شدید مخالفین میں سے چشتی صاحب سب سے آگے تھے، آپ نے تقریری کم مگر تحریری طور پر حضرت مدنیؒ کے خلاف بہت کچھ لکھا، کیونکہ آپ علامہ اقبال کے کلام کے شارح اور اس پر نظرِ عمیق رکھنے والے تھے اور مسلم لیگ کے اُن عمائدین میں سے تھے جن پر قائد اعظم محمد علی جناح کو پورا اعتماد تھا، پھر آپ انجمن حمایتِ اسلام کے قائم کردہ اشاعتِ اسلام کالج کے پرنسپل بھی تھے اسلئے آپ کا قلم حضرت مدنیؒ کے خلاف رواں دواں رہتا تھا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو خصوصی فضل و کرم کیساتھ حضرت مدنیؒ کے علمی، دینی اور روحانی مقام سے آگاہ فرمایا تو جسطرح آپ نے حضرتِ مدنیؒ کی مخالفت میں علی الاعلان مضامین لکھے تھے اسی طرح ہمتِ مردانہ کیساتھ اظہارِ حق کرتے ہوئے اپنا توبہ نامہ بھی سب سے پہلے ماہنامہ میثاق لاہور بابت فروری ۱۹۷۲ء میں شائع کرایا اور پھر کئی رسائل میں طبع ہوتا رہا اور بعض اداروں نے کتابی شکل میں بھی شائع کیا۔ اس توبۂ صادقہ کے بعد جناب چشتی مرحوم کا سارا وقت ذکر، تلاوتِ قرآنِ کریم اور اصلاحِ نفس کی تبلیغ میں گذرتا تھا، آپ کا حلقۂ احباب لاہور اور کراچی میں بڑا وسیع تھا، آپ نے اسی مقصد کیلئے ایک ادارہ بہ نام ادارہ اصلاحِ نفس قائم کر رکھا تھا اور اسی ادارہ کا ترجمان ایک ماہنامہ بہ نام "ندائے حق" جاری فرمایا تھا، آپ کے درسِ مثنوی اور روحانی محافل سے کئی سعادتمندوں کی دینی اور روحانی اصلاح ہوئی۔ آپ کا وصال ۳؍ فروری ۱۹۸۴ء کو لاہور میں ہوا اور لاہور ہی میں خلد آشیاں ہوگئے۔ ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را — آپکا توبہ نامہ آپ ہی کے کلمات میں ہدیۂ ناظرین ہے۔ (مرتب)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ——— نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا كَثِيْرًا وَّاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْ لِیْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ

مقدمہ

اس تحریر سے دو مقاصد میرے پیشِ نظر ہیں، پہلا مقصد تو یہ ہے کہ گذشتہ زندگی (۱۹۳۷ء تا ۱۹۵۴ء) میں مجھ سے جس قدر گستاخیاں حضرتِ اقدس مجاہدِ اعظم شیخ الاسلام آیۃٌ من آیات اللہ الصمد سیدی و شیخی و سندی الحاج الحافظ المولوی السید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز کی شانِ رفیع البنیان میں سرزد ہوئی ہیں اُن پر اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے سامنے غیر مشروط انداز میں اظہارِ ندامت اور اعترافِ تقصیر اور اقرارِ جرم کروں اور بارگاہِ ایزدی

میں صدقِ دل سے استغفار کروں۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ ایک اہم تاریخی واقعہ کی وضاحت کر دوں اور حقائق کو اُن کی اصل شکل میں پیش کروں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جنوری ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے محض اخباری اطلاع کی بناء پر تین اشعار سپردِ قلم کیے تھے جن کی وجہ سے علمی اور دینی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا تھا، جنابِ طالوت نے ڈاکٹر صاحب کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول و منعطف کرائی کہ حضرتِ اقدسؒ نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ وطن کو اساسِ ملت بنالو، اس لیے دیانت و عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ اب مجھے حضرت مولانا حسین احمد صاحب پر اعتراض کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کا یہ اعلان روزنامہ "احسان" لاہور میں ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو شائع ہوگیا تھا لیکن قوم کی بدقسمتی سے ۲۱ اپریل کو ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوگیا جبکہ اُن کا آخری مجموعۂ کلام موسوم بہ "ارمغانِ حجاز" نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا، اگر یہ مجموعہ اُن کی زندگی میں شائع ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان تین اشعار کو حذف کر دیتے یا حاشئے میں حقیقتِ حال کو واضح کر دیتے کہ میں نے یہ اشعار غلط اخباری اطلاع کی بناء پر لکھے تھے۔ بعد ازاں حضرت مولاناؒ نے اخباری رپورٹ کی تردید کر دی اسلیئے ان اشعار کو کالعدم یا مسترد سمجھنا چاہیئے، لیکن افسوس کہ یہ بیماری سیاست کی دُنیا میں بھی داخل ہوگئی۔

جن لوگوں نے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کا پُر آشوب دَور دیکھا ہے اُن سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ حامیانِ مسلم لیگ اُن تمام مسلمانوں کے اسلام کو شک اور شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے جو اُن سے دلائلِ واضحہ اور براہینِ نیّرہ کی بناء پر اختلاف کرتے تھے، نیز بلا استثناء ان تمام مسلمانوں کو غدّارِ قوم، ضمیر فروش اور ہندوؤں کے زرخرید کہا کرتے تھے، نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی (جب ہوش رخصت ہو جاتا ہے اور صرف جوش کارفرما ہوتا ہے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے) کہ مسلم لیگ کو کفر و اسلام کا معیار بنا لیا گیا تھا، چنانچہ ہر شخص ببانگِ دہل یہ اعلان کیا کرتا تھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" حالانکہ کفر و اسلام کا معیار کسی سیاسی جماعت میں شرکت نہیں ہے بلکہ اتّباعِ شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے، اور طرفہ تماشا یہ ہے جس پر آج میری عقل بھی حیران ہے، کہ مسلم لیگ تو وہ جماعت تھی جس میں داخلے کیلئے نہ مسلمانوں کی سی صورت شرط تھی نہ اُن کی سی سیرت، نہ نماز روزے کی پابندی شرط تھی نہ دین سے واقفیت۔ اہلِ قرآن، اہلحدیث، اہلِ فقہ اور اہلِ تصوّف، بریلوی اور دیوبندی، سُنّی اور شیعہ اور آغا خانی حتّٰی کہ پارسی یعنی آگ کو سجدہ کرنے والے بھی اس کے رُکن تھے، یعنی اس جماعت

میں شرکت کے لیے مسلمان ہونا ضروری نہ تھا اور ۱۹۳۱ء میں اس کا صدر وہ شخص[1] تھا جس کے ہمخیالوں کو اسلام سے خارج قرار دینے کے لیے ۱۹۷۴ء میں کراچی سے لاہور تک زبردست ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ مختصر یہ کہ اُس زمانے میں ہم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جو مسلمان مسلم لیگ میں شامل نہیں ہے وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہے خواہ وہ کتنا ہی بڑا عالمِ دین کیوں نہ ہو۔ یہ تصور کہ جو مسلمان لیگ میں نہیں ہے وہ ہندوؤں کا غلام ہے، ضمیر فروش ہے، غدارِ قوم ہے، عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے خواص کے دماغوں پر بھی مسلط ہو چکا تھا، وہی مولانا ظفر علی خان جنہوں نے حضرتِ اقدس مولانا مدنیؒ کی شان میں یہ شعر کہا تھا ؎

گرمیٔ ہنگامہ تیری آج حسین احمد سے ہے　　جس سے ہے پرچم روایاتِ سلف کا بلند

جب مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو ان کی ذہنی پستی کا یہ عالم ہو گیا کہ انہوں نے اسی حسین احمد سے یوں خطاب کیا اور ایک لمحے کیلئے بھی یہ نہ سوچا کہ میں کس عظیم المرتبت ہستی کو مخاطب بنا رہا ہوں ؎

حسین احمد سے کہتے ہیں مدینے کے خزف ریزے　　کہ لٹو ہو گئے کیا آپ بھی سنگم کے موتی پر

اس شعر سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ سیاسی اختلاف کی وجہ سے شیخ الاسلام، مجاہدِ اعظم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ العزیز کا علمی، اخلاقی اور روحانی مقام مرحوم کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ جن لوگوں نے لیگ سے اختلاف کیا تھا خصوصاً ارکانِ جمعیۃ العلماء ہند، اُن کی نیت نیک تھی، وہ ہرگز ضمیر فروش یا غدارِ قوم یا ہندوؤں کے زرخرید نہیں تھے۔ چنانچہ صدرِ مملکت پاکستان[2] نے بھی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "FRIENDS NOT MASTERS" میں اس بات کا اعتراف کیا ہے، چنانچہ صفحہ ۲۰۰ پر لکھتے ہیں:۔

"سب لوگ جانتے ہیں کہ بہت سے علماء نے قائدِ اعظم سے علی الاعلان اختلاف کیا تھا اور اور پاکستان کے تصور کی تردید کی تھی لیکن میرے اس قول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جن علماء نے تشکیل پاکستان کی مخالفت کی تھی وہ سب ضمیر فروش تھے ان میں قابل اور مخلص لوگ بھی تھے، ہاں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کی تشکیل سے اُن کا اقتدار ختم ہو جائے گا"[3]

---

[1] یعنی سر ظفر اللہ قادیانی، ۱۹۷۴ء میں حکومتِ پاکستان نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔ [2] مراد ہیں سابق صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب، واضح رہے کہ یہ تحریر آج سے کئی سال قبل کی ہے [3] عزت مآب صاحب صدر بالقابہ کے اس خیال سے مجھے کلیۃً اتفاق نہیں ہے۔ (سلیم چشتی)

فی الجملہ حقیقت یہی ہے کہ جمعیتہ العلماء کے ارکان نہ قوم کے بدخواہ تھے نہ ضمیر فروش، بلکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت یہ سمجھتے تھے کہ نہ تو تقسیم سے ہندی مسلمانوں کا مسئلہ حل ہوسکے گا کیونکہ اُن کی ۱/۳ آبادی ہندوستان میں ہندوؤں کے رحم وکرم پر رہ جائے گی اور وہ انہیں اپنے انتقام کا نشانہ بنائیں گے اور نہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہوسکے گی کیونکہ لیگ کے ارباب حل وعقد کی غالب اکثریت نہ دین سے واقف ہے اور نہ اُن کی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے، لیکن حامیانِ لیگ نے مخالفت کے جوش میں اسلامی تہذیب اور علماء دین کے احترام دونوں باتوں کو طاق پر رکھ دیا اور اختلاف کرنیوالوں کے ساتھ ہر قسم کی بدسلوکی روا رکھی بلکہ اس پر فخر کیا، ذیل میں اس کی دو مثالیں درج کرتا ہوں:۔

(۱) جب وہ ٹرین جس میں لیگ کے مخالف مسلمان قائدین سفر کر رہے تھے علی گڑھ پہنچی تو یونیورسٹی کے مسلمان طلباء نے ان کے کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہو کر ایسی نازیبا اور خلافِ تہذیب حرکات کیں جن کی وضاحت بذاتِ خود خلافِ تہذیب ہے، اور اگر وضاحت بھی کی جائے تو کوئی شخص یقین نہیں کرے گا کہ کوئی شریف آدمی ان حرکات کا مرتکب ہوسکتا ہے۔

(۲) جب حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ سید پور ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو حامیانِ لیگ کا ایک انبوہ کثیر پلیٹ فارم پر جمع ہوگیا، ان لوگوں نے حضرتِ اقدس کو گالیاں دیں اور جب حضرتِ موصوف پلیٹ فارم پر اُترے تو مخالفین نے حضرتؒ کو زمین پر گرانے کی کوشش کی اور گریبان پھاڑ دیا اور ایک شخص نے عمامہ سر سے اُتار لیا اور پہلے اُسے پاؤں سے روندا پھر نذرِ آتش کر دیا۔ (حیات شیخ الاسلام ص۲۳۲ تا ۲۳۴)

مَیں نے دل پر جبر کر کے صرف دو واقعات درج کر دیئے ہیں تفصیل سے عمداً اجتناب کیا ہے، مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ اُس زمانے میں حامیانِ لیگ کی ذہنیت ایسی ہوگئی تھی کہ جو شخص اُن سے سیاسی اعتبار سے اختلاف کرتا تھا اس کے ساتھ ہر بدسلوکی اور بے ادبی روا رکھی جاتی تھی بلکہ اسے کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔

آج جب بیس سال کے بعد ایک طرف ہمارے جوش اور ہیجان میں سکون کا رنگ پیدا ہوگیا ہے اور دوسری طرف زندگی کے تلخ ترحقائق نے ہماری آنکھیں بھی کھول دی ہیں تو ہم پرانے مسلم لیگی اُن لوگوں کو رواداری کا اپدیش دے رہے ہیں جو اپنے سیاسی مخالفوں کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں، مثلاً پاکستان کے نامور صحافی م۔ش نے (جسے مَیں اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز رکھتا ہوں) اپنے ایک مضمون میں جو نوائے وقت مؤرخہ ۱۴ نومبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا مسلمانانِ پاکستان کو یہ مشورہ دیا تھا:۔

"۔۔۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم صیہونیت کے پروپیگنڈے کے زیرِ اثر انہیں

(جمال عبدالناصر صدر جمہوریہ مصر) فرعون کی نسل کا علمبردار اور بھارت کے مقابلے میں پاکستان کا نقاد بنا کر اپنے لوگوں کے سامنے پیش کرنا جاری رکھیں، صدر ناصر عقائد کے لحاظ سے پکے اور سچے مسلمان ہیں اور ہمیں مسلمانوں کو مسلمان ہی رہنے دینا چاہیئے۔"

سُبحان اللہ! آج اس درسِ اخوت کی صداقت میں کسی پاکستانی کو شک ہو سکتا ہے؟ لیکن میں بڑے بھائی کی حیثیت سے اپنے پیارے م۔ش سے پوچھتا ہوں کہ جب قوم پرور مسلمان (کانگریسی جمعیتی اور احراری) علمائے مسلم لیگ کی خدمت میں یہی حقیقتِ ثابتہ (یہی درسِ اخوت وانسانیت) بایں الفاظ پیش کیا کرتے تھے کہ:-

"یہ سچ ہے کہ جمعیۃ العلماء اور مجلسِ احرار کے ارکان تقسیمِ ہند کے حامی نہیں ہیں کیونکہ وہ اس کو اپنی فراستِ مومنانہ کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے بہت مُضر سمجھتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم لیگ کے پروپاگنڈے کے زیرِ اثر انہیں ہندوؤں کا حاشیہ بردار اور کفر کا علمبردار اور مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلموں کا حامی بنا کر اپنے (مسلمان) لوگوں کے سامنے پیش کرنا جاری رکھیں۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اور ان کے ہم خیال حضرات عقیدے کے اعتبار سے سچے اور پکے مسلمان ہیں اور ہمیں مسلمانوں کو مسلمان ہی رہنے دینا چاہیئے۔"

تو کون سا مسلم لیگی اُن کی اِس معقول بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوتا تھا یا ہو سکتا تھا؟ اس زمانے میں تو سیاسی اعتبار سے اختلاف کرنے والے مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کا یہ عالم تھا کہ جب "الجمعیۃ" نے علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر طلبہ کی گستاخی اور بدتہذیبی پر صدائے احتجاج بلند کی تو "ڈان" نے بڑے فخر کیساتھ یہ لکھا تھا کہ "گلدستوں کے بجائے ان لوگوں کے حصے میں اینٹ پتھر ہی آئیں گے۔"

میرا مطلب اس تلخ نوائی سے صرف اس قدر ہے کہ اُس زمانے میں ذہنیت ہی اس قسم کی ہو گئی تھی کہ ہم نے حفظِ مراتب کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور یہ راقم سیہ کار بھی اسی کشتی میں سوار اور اسی غلطی کا شکار تھا یعنی میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ جو مسلمان لیگ میں نہیں ہے وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو علماء لیگ میں نہیں تھے ان کی عظمت، عزت اور منزلت میرے دل سے بالکل نکل گئی تھی، حالانکہ بلیس سال کے بعد اس حماقت پر غور کرتا ہوں تو عرقِ ندامت میں غرق ہو جاتا ہوں۔

اب جبکہ حضرتِ اقدسؒ کی جلالتِ شان، للّٰہیت، بزرگی اور بارگاہِ رسالت میں ان کی قدر و منزلت

مجھ پر آشکار ہو چکی ہے اس لیے بصمیم قلب انتہائی عاجزی اور فروتنی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنی خطا اور گستاخی کی معافی طلب کرتا ہوں، استغفار کرتا ہوں، توبہ کرتا ہوں، اظہارِ ندامت کرتا ہوں اور اس اعتراف گناہ کو اس نیت سے شائع کرتا ہوں کہ قارئین میرے حق میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری توبہ کو قبول فرمالے اور میرے گناہوں کو معاف کردے اور قیامت کے دن مجھ سے اُس گستاخی پر مواخذہ نہ کرے جو میں نے اس کے مقرب بارگاہ بندے کی جناب میں روا رکھی تھی۔ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا عَظِیْمًا۔

فصلِ دوم

اکتوبر ۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے کہ میں پی مارکیٹ کراچی میں بس کے انتظار میں کھڑا تھا کہ ایک کار میرے قریب آکر رکی اور اس میں سے حضرت مولانا احمد علی صاحب[۱] لاہوریؒ باہر نکلے اور میری طرف بڑھے، میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا، حضرتؒ نے حسبِ معمول مجھے معانقے سے سرفراز فرمایا، اس کے بعد فرمایا کہ اگر تمہیں فرصت ہو تو میرے ساتھ چلو تم سے ایک ضروری گفتگو کرنی ہے، میں نے عرض کی بسروچشم، حضرتؒ نے ڈرائیور سے کہا کہ برنس گارڈن چلو، وہاں پہنچ کر ہم نے مغرب کی نماز پڑھی اس کے بعد حضرتؒ مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میرے میزبان نے کل مجھ سے کہا کہ ایک صاحب نے جن کا نام پروفیسر یوسف سلیم چشتی ہے "ارمغانِ حجاز" کی شرح میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی شانِ اقدس میں گستاخی بھی کی ہے اور ان اشعار کی شرح میں جو اقبال نے حضرت مدنیؒ کے بارے میں لکھے ہیں اقبال کے اس اعتراف کو بھی نظر انداز کر دیا ہے جس کے بعد ان اشعار کا وجود ہی کالعدم ہو چکا ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ میں نے اُن سے کہا کہ میں شارح کو بخوبی جانتا ہوں، انشاء اللہ لاہور پہنچ کر اُن سے اس معاملے میں گفتگو کروں گا لیکن حسنِ اتفاق سے آج تم مجھے یہیں مل گئے اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ تمہاری توجہ اس طرف مبذول کروں اور تمہاری غلط فہمی کا ازالہ بھی کر دوں۔

---

[۱] حضرت لاہوریؒ سے میرے تعلقات ۱۹۲۹ء میں قائم ہوئے تھے، تقرب کی صورت یہ ہوئی کہ ۱۹۲۹ء میں انجمن حمایتِ اسلام نے علامہ اقبال مرحوم اور سید غلام بھیک نیرنگ مرحوم کی نگرانی میں اشاعتِ اسلام کالج قائم کیا تھا اور کالج کمیٹی نے جس کے صدر حضرت لاہوریؒ تھے میرا تقرر بحیثیت پرنسپل کیا تھا، میں کالج کے نظم و نسق کے سلسلے میں مشورہ کرنے اور ہدایات حاصل کرنے کے لیے حضرت لاہوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔

یہ سنکر میں نے معذرت آمیز انداز میں نیچی نگاہ کر کے عرض کی کہ حضرت بلا شبہ مجھ سے بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے، شرح لکھتے وقت میرا ذہن اس طرف منتقل ہی نہیں ہوا کہ علامہ اقبال نے اپنی وفات سے تین ہفتے پیشتر اپنا بیان روزنامہ "احسان" میں شائع کر دیا تھا کہ حقیقتِ حال منکشف ہو جانے کے بعد اب مجھے مولانا حسین احمد صاحب پر اعتراض کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تینوں اشعار کالمعدوم کا مصداق ہو گئے اور "ارمغانِ حجاز" میں اُن کے اندراج کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔" میرے اظہارِ ندامت اور اعترافِ تقصیر کے بعد حضرتِ لاہوریؒ نے مجھ سے دریافت کیا "تم میری بابت کیا رائے رکھتے ہو؟" میں نے عرض کی کہ "حضرت میں آپ کو ۱۹۲۹ء سے جانتا ہوں اور آپ کو اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندوں میں شمار کرتا ہوں"۔ یہ سنکر فرمایا "میری بات کا یقین کرو گے؟" میں نے کہا "ضرور یقین کروں گا کیونکہ اللہ والے جھوٹ نہیں بول سکتے"۔ یہ سنکر فرمایا "تو سنو! میں تمہاری بدگمانی دُور کرنے کے لیے تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میری رائے میں اور میرے علم کی رُو سے اس وقت روئے زمین پر کوئی شخص روحانیت، تقویٰ اور تعلق مع اللہ کے اعتبار سے حضرتِ اقدس شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی مدظلہ سے بڑھ کر نہیں ہے"۔ میں نے پوچھا "آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟" فرمایا "میں حج کے مواقع پر خاصانِ حق کے اجتماع میں برابر شریک ہوتا رہا ہوں، ان سبھوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس وقت روئے زمین پر حضرت موصوف کا جواب نہیں ہے"۔ میں سراپا حیرت بنا ہوا حضرت لاہوریؒ کی زبان سے حضرت مدنیؒ کی عظمت کا اعتراف سُن رہا تھا، اس کے بعد حضرت موصوفؒ نے فرمایا "حضرت مدنیؒ کی جوتیوں کا تلا بھی میری داڑھی سے زیادہ محترم ہے، بلاشبہ وہ اس زمانے میں اللہ کی ہستی کی نشانیوں میں سے ایک واضح نشانی ہیں، چونکہ میں تمہیں عزیز رکھتا ہوں اس لیے تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ حضرت مدنیؒ کی شان میں تم سے جو گستاخیاں سرزد ہوئی ہیں ان سے رجوع کر لو اور اللہ سے التجا کرو کہ وہ تمہارے گناہوں کو معاف فرما دے، اگر تم حضرتِ اقدسؒ کے مقام سے آگاہ ہوتے تو ہرگز ایسی گستاخی کا ارتکاب نہ کرتے، میں دُعا کروں گا کہ اللہ تم پر حضرتِ اقدسؒ کا مقام واضح کر دے۔ تم اس بات پر غور کرو کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ حضرتِ اقدس کے سیاسی خیالات سے متفق نہیں تھے اس کے باوجود اُن کا نہایت احترام کرتے تھے اور اپنی مجالس میں اُن کی رُوحانی عظمت کا اعتراف کرتے تھے"۔

اس گفتگو کے بعد حضرت لاہوریؒ مجھے میرے مکان پر پہنچا کر اپنے میزبان کے گھر تشریف لے گئے۔ حضرتؒ کی اس تلقین کا اس سیہ کار پر ایسا اثر ہوا کہ دل کی دُنیا ہی بدل گئی، ایسا معلوم ہوا کہ وہ پردہ جو میرے اور حضرت مدنیؒ

کے مابین حائل تھا یک لخت ہٹ گیا اور ان کی عظمت کا ایک نہ مٹنے والا نقش میرے دل پر قائم ہو گیا، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ میں حضرت لاہوریؒ سے ۲۶/۲۵ سال سے واقف تھا اور مجھے یقین تھا کہ جھوٹ اُن کی زبان سے نہیں نکل سکتا، اس لیے اُن کی گواہی کے بعد پھر مجھے کسی دلیل کی حاجت باقی نہیں رہی۔

مارچ ۱۹۵۷ء میں کراچی سے نقل مکانی کر کے لاہور واپس آیا تو زندگی میں پہلا انقلاب یہ رونما ہوا کہ حضرتِ لاہوریؒ کی مجالس ذکر میں شرکت شروع کی، حضرتؒ اس سیہ کار پر خصوصی توجہ فرماتے تھے، یعنی مجلس ذکر میں اپنی بائیں جانب پہلو میں جگہ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ جب کبھی تنہائی میں ملاقات ہوتی تھی تو بالالتزام شیخ الاسلام حضرتِ اقدسؒ کے کمالاتِ روحانی کا تذکرہ فرماتے تھے، ان تذکروں کا میرے دل پر یہ اثر مرتب ہوا کہ چند ماہ کے بعد مجھے حضرتِ اقدسؒ سے وہ رابطۂ قلبی پیدا ہو گیا جسے عشق سے تعبیر کر سکتے ہیں، چنانچہ جب ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو اخباروں سے یہ معلوم ہوا کہ حضرتِ اقدسؒ کا وصال ہو گیا تو مجھ پر زندگی میں پہلی مرتبہ فراق کی کیفیت طاری ہوئی، میں اُس زمانے میں مسجد شاہ چراغ میں ہر اتوار کو مثنوی کا درس دیا کرتا تھا اور اہلِ علم جانتے ہیں کہ مثنوی کا سارا تار و پود عشق اور فراق انہی دو چیزوں سے مرکب ہوا ہے اور کُل مثنوی ان دو ابتدائی شعروں کی تفسیر ہے ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کُند | از جدائی ہا شکایت می کُند

کز نیستاں مرا تا ببریدہ اند | از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

یعنی روحِ انسانی جو ازل سے محبوبِ حقیقی کے عشق میں مبتلا تھی جب دُنیا میں آئی تو فراق کی کیفیت سے دوچار ہو گئی قصہ مختصر عشق اور فراق یہ مثنوی کے دو بنیادی تصورات ہیں اور اس کا قصرِ رفیع انہی بنیادوں پر اُستوار ہوا ہے۔

مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں اپنے محبوب سے جدا ہو گیا ہوں، اللہ اکبر! یہ کتنا عظیم انقلاب تھا جو میرے ضمیر کی گہرائیوں میں رُونما ہوا کہ وہ شخص جس سے مدّتوں تک ن ف ر ت کرتا رہا وہی شخص اب میرا محبوب بن چکا تھا اور اسی لیے اُس کی وفات کی خبر پڑھ کر مجھ پر فراق کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

میں نے مثنوی کا درس ملتوی کر دیا اور مجلس میں یہ اعلان کیا کہ آئندہ مجالس میں حضرت اقدسؒ کے کمالاتِ روحانی کا بیان کروں گا، چنانچہ یہ سلسلہ چار ماہ تک جاری رہا۔ عام قارئین کی آگاہی کیلئے یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرتِ لاہوریؒ کی تلقین پر میں نے "نقشِ حیات" اور "مکتوباتِ شیخ الاسلام" کا مطالعہ کر لیا تھا۔

۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۱ء تک حضرتِ لاہوریؒ کی مجالس ذکر میں شرکت کا سلسلہ جاری رہا اور اس عرصے میں حضرت موصوف نے اپنے ارشادات سے مجھے حضرتِ اقدسؒ کے مقام سے بڑی حد تک آگاہ کر دیا تھا۔ ان ارشادات کی روشنی میں اگرچہ ایک طرف مجھ پر حضرتِ اقدسؒ کے کمالاتِ روحانی سے آگاہی حاصل ہوئی تو دوسری طرف یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ حضرتِ اقدسؒ انگریز کو اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن یقین کرتے تھے، چنانچہ حضرتِ اقدسؒ سے تعلق کی بدولت میرے دل میں بھی انگریزی زبان، انگریزی لباس، انگریزی وضع قطع اور انگریزیت سے زندگی میں پہلی مرتبہ نفرت کا جذبہ پیدا ہوا حالانکہ میں اپنی زندگی کے ساٹھ سال اسی لعنت میں گذار چکا تھا، اور اکبر کا یہ شعر ہو بہو مجھ پر صادق آتا تھا ؎

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں　　بات وہ ہے جو پائنیر میں چھپے

حضرتِ اقدسؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارا اصلی دشمن ہندو نہیں انگریز ہے۔ چنانچہ جب میں نے اس نگاہ سے تاریخِ عالم کا مطالعہ کیا تو اس ارشاد کی صداقت مجھ پر روزِ روشن کی طرح آشکار ہو گئی، اللہ جزائے خیر عطا فرمائے اکبر الہ آبادی کو، انہوں نے ان شعروں میں کتنی سچی بات کہی ہے ؎

زیادہ اُن سے سہو مخترز کہ ہند وسے　　یہ خود ہی سوچ لو، دل میں اگر نہ کچھ کد ہو
یہ چاہتے ہیں کہ ختنہ میاں کا ہو موقوف　　وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانی ہی نہ دارد ہو

اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تشریح سے بلاغت کا خون ہو جائے گا تو ختنے اور مسلمانی کے مفہوم اور ان دونوں میں فرق کو بھی واضح کر دیتا۔

حضرت لاہوریؒ کے وصال کے بعد زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگا، ذکرِ حبیب سننے کو کان ترس گئے، بالآخر ۱۹۶۴ء میں محترمی قاضی زاہد الحسینی مدظلہٗ کو اپنی باطنی کیفیت سے آگاہ کیا اور لکھا کہ تبریز سے جدائی کے بعد دل کسی صلاح الدین کو ڈھونڈتا ہے، انہوں نے ازراہِ لطف اس عاجز کو مشورہ دیا کہ "خوش قسمتی سے حضرتِ اقدسؒ کے خلیفہ مجاز مولانا سید حامد میاں صاحب مدظلہٗ (رحمۃ اللہ علیہ) لاہور میں سکونت پذیر ہیں وہ تمہارے حق میں صلاح الدین بھی ثابت ہوں گے اور حسام الدین بھی"۔

چنانچہ ۱۹۶۵ء میں اس عاجز نے حضرتِ مدنیؒ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا السید حامد میاں مدظلہٗ (رحمۃ اللہ علیہ) مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور سے رشتۂ ارادت و عقیدت استوار کیا اور استواری کے بعد یہ محسوس ہوا کہ نظامی مرحوم نے یہ مصرعہ میرے ہی لیے کہا تھا ع　　شکر کہ جمازہ بمنزل رسید

جب میں نے اس بات کی اطلاع قاضی صاحب موصوف کو دی تو انہوں نے مجھے لکھا اب جبکہ حضرتِ اقدسؒ کا مقام آپ پر واضح ہو چکا ہے اور آپ اُن کے دامن سے وابستہ ہو گئے ہیں تو آپ کو لازم ہے کہ گذشتہ زمانے میں آپ کے قلم اور آپ کی زبان سے جس قدر گستاخیاں حضرتِ اقدسؒ کی شان میں سرزد ہو چکی ہیں ان کا صدقِ دل سے اعتراف کیجئے اور توبہ نامہ شائع کیجئے تاکہ (۱) قیامت کے دن مواخذہ اور عتاب دونوں سے محفوظ ہو جائیں (۲) حضرتِ اقدسؒ کی توجہ اور اُن کے روحانی فیض سے بہرہ ور ہو سکیں (۳) اور اُن لوگوں کا بھلا ہو سکے جو عدم واقفیت کی وجہ سے آج بھی حضرتِ اقدسؒ کی طرف سے سوءِ ظن رکھتے ہیں جس طرح آپ خود عرصہ دراز تک اس غلطی میں مبتلا رہ چکے ہیں۔

دوسری مرتبہ ۲۰ جنوری ۱۹۶۵ء کے خط میں لکھا: "میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اکثر اوقات لوگ اہل اللہ کا صرف ایک ہی رُخ دیکھتے ہیں اللہ نے آپ پر خصوصی فضل فرمایا ہے اگر آپ صیانۃً للناس اس موضوع پر ایک مقالہ سپردِ قلم فرما دیں جس میں حضرت الشیخ نوّر اللہ مرقدہٗ سے آپ کی نسبت کا ذکر بھی آجائے تو بڑا مفید رہے گا اور بہت سے لوگوں کا راہنما ہوگا۔"

تیسری مرتبہ یکم اپریل ۱۹۶۶ء کے خط میں لکھا: "آج ایک بہت پاکیزہ مجلس میں آپ کا ذکرِ خیر آگیا اسلئے بطور یاددہانی عرض ہے کہ ضرور ایک جامع مضمون اپنی انابت پر تیار فرمائیں، اس سے انشاءاللہ دوسروں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔"

چوتھی مرتبہ ۱۲ اپریل ۱۹۶۷ء کے خط میں لکھا: "آپ کے اس مضمون سے انشاءاللہ کئی بھٹکے ہوئے اور گستاخ ذہن انسانوں کو نورِ ہدایت مل جائے گا اور وہ سُوءِ خاتمہ سے محفوظ رہیں گے۔"

پانچویں مرتبہ اپنے ۲۴ اپریل ۱۹۶۸ء کے خط میں لکھا: "کلامِ اقبال کی شرح میں جہاں جہاں جناب کا قلم حدودِ ادب سے تجاوز کر گیا ہے اگر فی الحال بہت جلد ان عبارتوں سے رجوع فرمالیں تو یہ بھی صرف بہتر نہیں بلکہ ضروری ہے۔"

میں نے یہ اقتباسات قصداً درج کیے ہیں تاکہ قارئین پر یہ حقیقت واضح ہو سکے کہ اس قدر تاکید کے باوجود میرا نفس اپنی گستاخیوں، غلطیوں اور کوتاہیوں کے اعتراف پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ قارئین غور کریں کہ اپنی غلطیوں کا اعتراف نفس پر کس قدر شاق گذرتا ہے، قاضی صاحب مسلسل متوجہ کر رہے ہیں مگر نفس ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتا مسلسل مجھ سے یہی کہتا رہا کہ اس اعتراف سے تیری کس قدر سُبکی ہوگی، دُنیا کی

نظروں میں تُو کس قدر ذلیل ہو جائے گا۔ وغیر ذٰلک من الخرافات

اس عرصے میں ایک دفعہ بھی میں نفس کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکا یعنی اس سے یہ نہ کہہ سکا کہ جب قیامت کے دن خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تُو نے میرے مقرّب بارگاہ بندے کی شان میں یہ گستاخی کس بنا پر کی تھی تو کیا جواب دوں گا؟ اور جب فرمائے گا کہ حقیقتِ حال سے آگاہ ہو جانے کے بعد کیا چیز تجھ کو اعتراف گناہ سے روکتی رہی؟ تو کیا عذر پیش کروں گا؟ اور جب بھری محفل میں یعنی اللہ کی بارگاہ میں میری رسوائی ہو گی تو کیا وہ رسوائی اس دُنیا کی سُبکی یا تحقیر سے بدرجہا زیادہ نہ ہو گی؟

سچ ہے ریت سے تیل نکالنا آسان ہے مگر نفسِ امارہ کے پھندے سے اپنے آپ کو نکالنا بہت مشکل ہے، انسان ضعیف الایمان جتنا دُنیا والوں سے ڈرتا ہے اگر خدا سے اتنا ڈرنے لگے تو بلاشبہ فرشتہ بن جائے، سچ کہا شیخ سعدیؒ نے ؎

گر وزیر از خدا بترسیدے　　ہمچناں کز ملک، ملک بودے

جب قاضی صاحب نے دیکھا کہ میں مسلسل لیت ولعل سے کام لے رہا ہوں اور وعدوں کے باوجود ایفائے وعدہ نہیں کرتا تو انہوں نے میری عاقبت سنوارنے کے لیے اپنے دینی ترکش سے آخری تیر نکالا یعنی ۲۲ مئی ۱۹۶۸ء کے خط میں لکھا:

"بہرحال آپ کی طرف سے فی الحال اگر چند سطور ہی "خدام الدین" میں آجائیں تو بہتر ہیں، مثلاً شیخ الاسلام حضرتِ مدنی قدس سرہ العزیز کی شانِ گرامی میں میرے قلم اور میری زبان سے جو کلماتِ ناشائستہ صادر ہو چکے ہیں میں اُن سے صدقِ دل سے نادم ہو کر رجوع کرتا ہوں، اس پر تفصیلی مقالے کا انتظار فرمائیں۔

یہ بھی فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرَات کا مصداق ہو جائے گا، میں آپ سے بار بار اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ سالک کے اکثر مقامات شیخ کی شان میں بے ادبی سے نہ صرف رُک جاتے ہیں بلکہ لطائف بجھ جاتے ہیں۔"

جس وقت میں نے یہ آخری جملہ پڑھا تو مجھ پر جو کیفیت طاری ہوئی اُسے اس مصرعہ سے واضح کیا جا سکتا ہے ؏ تزلزل در ایوانِ شیطاں افتاد

دوسرے لفظوں میں اس فقرے نے میری خودی کو بیدار کر دیا، چنانچہ میں نے اپنی ہمت اور اپنے

اختیار دونوں ہتھیاروں سے بیک وقت کام لے کر نفس سے کہا: میری ہستی عبارت ہے لطائف سے نہ کہ تجھ سے، اگر لطائف ہی بجھ گئے یعنی دل ہی مر گیا تو پھر وجودِ یوسف اور عدمِ یوسف دونوں یکساں ہو گئے! کیا تو نے اقبال کا یہ شعر نہیں پڑھا؟ ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے　　　کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اے نفس!! اگر میرا دل مر گیا تو پھر مجھ میں اور حمار میں کوئی فرق نہیں رہے گا، میں نے برسوں تیرا کہا مانا اور حقیقتِ حال سے آگاہ ہو جانے کے باوجود اعتراف گناہ نہیں کیا لیکن اب میرے سامنے زندگی اور موت کا سوال درپیش ہے اس لیے تیرا کہا نہیں مانوں گا، چونکہ میں اندھا تھا یعنی حضرتِ اقدس کے مقام سے آگاہ نہ تھا اس لیے میں نے واقعی حضرت موصوف کی اپنے قلم اور اپنی زبان سے اُن کی شان میں گستاخیاں کی ہیں، میں غلط پروپاگنڈے کے سحر سے مسحور ہو گیا تھا، حق اور باطل میں تمیز کی صلاحیت مفقود ہو گئی تھی، الحمدللہ کہ اُس نے مجھے قبل وفات توبہ اور انابت کی توفیق عطا فرمائی۔

جب تک خداوند تعالیٰ کے ساتھ رابطہ استوار نہ ہو انسان کسی بدی، کسی برائی، کسی بدکاری اور کسی بدمعاشی سے باز نہیں آسکتا۔

عقل سے صرف یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس دنیا کا بنانے والا کوئی ہے ضرور، یہ خود بخود تو نہیں بن گئی ہے، بس یہاں عقل کا کام ختم ہو جاتا ہے، لہٰذا انسان کا خدا سے رابطہ تو قائم ہو جاتا ہے مگر وہ رابطہ زندہ یا مؤثر نہیں ہوتا یعنی اس کی بدولت زندگی میں انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا، لیکن عشق خدا کی ہستی کا یقین پیدا کر دیتا ہے اور یقینِ کامل کے بعد جو رابطہ پیدا ہوتا ہے وہ زندہ یا مؤثر ہوتا ہے یعنی سالک کی زندگی میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔

دُنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو کسی فلسفی یا منطقی نے اپنے شاگردوں کی زندگی میں انقلاب پیدا نہیں کیا، یہ نعمت صرف عاشقوں کی جوتیاں سر پر رکھنے سے حاصل ہوتی ہے، اسی لیے امیر خسروؒ نے سلطان جی کی جوتیاں سر پر رکھ لی تھیں۔

عام قارئین کیلئے یہ وضاحت ضروری تھی ورنہ وہ محترمی قاضی صاحب کے اس تہدیدی جملے کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ شیخ کی شان میں بے ادبی سے نہ صرف اکثر مقامات رُک جاتے ہیں بلکہ لطائف ہی بجھ جاتے ہیں۔

ان تفصیلات کے بعد اب میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے وفات سے پہلے مجھے توبہ اور انابت کی توفیق عطا فرمائی، اس کے بعد حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کیلئے دُعائے خیر کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے حضرتِ اقدسؒ کے مقام سے آگاہ فرمایا اور اس کے بعد محترم قاضی زاہد الحسینی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ

انہوں نے مجھے اس کارِ خیر پر آمادہ کیا۔ آخر میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا ہوں کہ اے اللہ! اے غافر الذنب وقابل التوب! اے غفور الرحیم! لا الٰہ الّا انت ولا قاضی الحاجات الّا انت ولا غافر الذنوب الّا انت ولا فاعل فی الحقیقۃ الّا انت ولا موجود فی الحقیقۃ الّا انت! رحیم وکریم! میں اپنے گناہوں کا صدقِ دل سے اعتراف کرتا ہوں، میری ساری زندگی نافرمانیوں میں بسر ہوئی ہے

واپس آمد بندۂ بگریختہ — آبروئے خود زعصیاں ریختہ
بے گنہ نگذشت برمن ساعتے — باحضورِ دل نکردم طاعتے

اے ستار العیوب! میں بصمیمِ قلب اقرار کرتا ہوں کہ میں نے تیرے مقبول بارگاہ اور برگزیدہ بندے شیخ الاسلام، مجاہدِ اعظم، قدوۃ العارفین، زبدۃ الکاملین، سیدی وشیخی وسندی ووسیلتی فی الدارین مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ العزیز کی شانِ اقدس میں اپنے قلم اور اپنی زبان سے بڑی گستاخیاں کیں، میں اپنی اس نالائقی اور حماقت کو کسی پردے میں نہیں چھپانا چاہتا، اعلانیہ صاف لفظوں میں اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہوں۔

اے اللہ! میں اندھا و جاہل اور احمق اور عقل وخرد سے بیگانہ ہوگیا تھا، یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے حرمِ نبوی میں بیٹھ کر چودہ سال تک دین کی تعلیم وتبلیغ کی اور ساری عمر اتباعِ رسول میں بسر کردی تھی اسے مقامِ رسول سے بے خبر قرار دیتا رہا بلکہ اس کی شان میں گستاخیاں کرتا رہا اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان گستاخیوں پر فخر کرتا رہا۔

اے اللہ! یہاں کی ذلّت اور رسوائی مجھے منظور ہے! میں تو یوں بھی سراپا خطا اور مجسّمِ گناہ ہوں، مجھ میں اور کونسی خوبی ہے جس پر ناز کرسکتا ہوں، مجھے قیامت میں اپنی خفگی اور اپنے محبوب کی ناراضگی سے محفوظ رکھیو۔

اے اللہ! میں ڈرتا ہوں اور سخت لرزہ براندام ہوں اس بات سے کہ قیامت میں جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ مجھ پر پڑے گی تو آنحضور کہیں مجھ سے اس انداز میں خطاب نہ فرمائیں "اچھا تو تم ہو وہ گستاخ اور دریدہ دہن! جس نے میرے اُس عاشقِ صادق کی شان میں بے ادبی کی تھی جس نے میرے دین کی سربلندی کی خاطر اور میری محبت میں ساری عمر قید وبند کو دعوت دی اور طوق وسلاسل کو لبیک کہا، جس نے میری محبت میں میرے دین کے دشمنوں کے خلاف جہاد کیا اور تادمِ آخر کلمۂ حق کہا، جس نے میری خاطر مالٹا میں مصائب جھیلے، جس نے میری محبت میں کراچی کا جیل کاٹا، جس نے اعلاء کلمۃ الحق کے لیے انگریز (علیہ ما علیہ) سے ٹکر لی، جس نے میری اُمت کی بہبود کے لیے دن میں قرآن وحدیث کا درس

دیا اور رات میں دشمنانِ اسلام کے خلاف لسانی جہاد کیا، جس نے اسلام کی خاطر غیروں کے طعنے سُنے اور اپنوں سے گالیاں کھائیں اور گالیاں کھا کے بے مزہ ہونا تو درکنار اُن گالیاں دینے والوں کے حق میں دعائیں کیں، جس نے اپنی تمام متاعِ حیات مجھ پر نثار کر دی"۔ تو اُس وقت میرا کیا حال ہو گا؟ کون سا آسمان مجھے پناہ دے گا اور کون سی زمین مجھے ٹھکانا دے گی؟

اے اللہ! حضور (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کی ایک نگاہِ عتاب میری عاقبت کو برباد کرنے کے لیے کافی ہے۔

اے اللہ! حضور (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کی اس نگاہِ عتاب سے بچنے کے لیے میں اس دنیا میں ہر قسم کی ذلت اور رسوائی برداشت کرنے کو تیار ہوں۔

اے اللہ! میں صدقِ دل سے توبہ کرتا ہوں، میری لغزشوں، خطاؤں اور گستاخیوں کو معاف کر دے جو میں نے اپنے شیخِ طریقت، مخدومِ ملت، محرمِ رازِ نبوت، واقفِ اسرارِ رسالت اور آشنائے مقامِ محمدی (علیہ افضل التحیۃ والثناء) کی شان میں روا رکھی تھیں۔

اے اللہ! اپنے مقبولِ بارگاہ بندوں کو توفیق عطا فرما کہ وہ میرے حق میں معافی کے لیے دعا کریں، مجھے یقین ہے کہ تُو اُن کے وسیلے سے مجھ پر کرم کرے گا اور مجھے میرے شیخ بلکہ شیخ العرب والعجم حضرتِ مدنی رحؒ کی نسبتِ عالیہ سے حصۂ وافر عطا فرمائے گا اور مجھے اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے گا۔

ربّ تقبّل منّی انّك انتَ
السّمیع العلیم وتب علیّ
انّك انت التوّاب الرّحیم
وصلّی اللہ تعالیٰ علیٰ
حبیبه وعبده
ورسوله
الکریم ط

اس سلسلے میں میں قارئین کی توجہ اُس خطبۂ صدارت کے حسب ذیل فقرے کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں جو بانیٔ پاکستان محمد علی جناح مرحوم نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو مجلسِ دستور سازکے سامنے دیا تھا، یعنی :-

"You may belong to any religion or caste or creed that has nothing to do with the business of the state, you will find that in course of time HINDUS would cease to be HINDUS and MUSLIMS WOULD cease to be MUSLIMS not in the religious sense, because that is the personal faith of every individual, but in the political sense at citizens of the state"

(Ref: Quaid-i-Azam SPEAKS-PAK PUBLICITY KARACHI, 10, 11)

آپ کسی بھی مذہب یا قوم یا عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں اسکا کاروبار مملکت سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ رواں وقت میں مذہبی شعور کے طور پر ہندو حیثیت ہندو، اور مسلمان حیثیت مسلمان نہیں رہے گا۔ کیونکہ یہ ہر ایک کا ذاتی عقیدہ ہے۔ لیکن سیاسی طور پر ریاست کا شہری ہو گا۔

ہم بشرطِ انصاف قارئین کرام سے سوال کرتے ہیں کہ کیا تحریک مسلم لیگ کے قائدِ اعظم اور بانیٔ پاکستان کے مندرجہ بالا الفاظ جو انہوں نے انتہائی ذمہ دارانہ حیثیت میں ارشاد فرمائے تھے، مجاہدِ حریت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ وقدس سرہ کے نظریات سے کسی درجے میں بھی مختلف ہیں؟ بینوا و توجروا

(ف) بانیٔ پاکستان محمد علی جناح مرحوم کے مذکورہ بیان کی مزید وضاحت کے لیے قومی اسمبلی کی مجلسِ قائمہ برائے خزانہ و اقتصادی امور کے چیئرمین حاکم علی زرداری کا انٹرویو ہدیۂ ناظرین ہے :۔

"میں قائدِ اعظم کے ساتھ رہا ہوں تحریکِ پاکستان میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا ہے، قائدِ اعظم نے کبھی اسلامی مملکت کی بات نہیں کی، پاکستان مسلمانوں کا ملک تھا نہ کہ اسلامی، اگر ایسا ہوتا تو قائدِ اعظم منڈل کو اپنا لاء منسٹر کیوں بناتے؟ وہ کسی مولوی یا مُلّا کو وزیرِ قانون بناتے جو اسلامی قوانین بناتا، یہ تو ۱۹۷۳ء کے آئین میں پہلی مرتبہ پاکستان کو اسلامی جمہوریہ پاکستان قرار دیا گیا اس سے پہلے کسی دستور میں نہ تھا، یہ جو لوگ آج کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ یہ غلط بات ہے، اگر ایسا ہوتا تو مولویوں نے اُس وقت پاکستان کی مخالفت کیوں کی تھی؟ اُس وقت یہ سب پاکستان کے مخالف تھے آج پاکستان کے مامے دادے بنے بیٹھے ہیں، مولانا مودودی نے خود اپنی کتاب میں پاکستان کی مخالفت کی تھی اور پاکستان کو پلیتستان کہا تھا، آپ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پڑھ لیں اس میں کہاں لکھا ہے کہ پاکستان اسلامی ملک ہوگا" (روزنامہ جنگ راولپنڈی ص ۲۱ جنوری ۱۹۹۶ء)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ

چراغِ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں جو سفر احقر نے ۱۹۹۳ء میں شروع کیا تھا وہ اب اختتام پذیر ہو رہا ہے اور مسافر منزلِ مقصود کے قریب تر ہو رہا ہے، اللہ تعالےٰ اس سفر کی برکات اور ثمرات سے بہرہ ور فرمائے۔ آمین

جب یہ سفر شروع کیا گیا تھا تو خیال تھا کہ چند ایام میں یہ سفر طے ہو جائے گا مگر جتنا قدم اُٹھتا گیا راستے میں کچھ ایسی مشکلات آتی گئیں جن سے عہدہ برا ہونا مجھ جیسے ناتواں کے لیے اسلیئے مشکل تھا کہ،

(الف) عرصہ چار سال سے وجع القلب کا شکار ہونے کی وجہ سے لکھنا پڑھنا تقریباً متروک ہے، یہ بھی حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی کھلی کرامت ہے کہ ضعیف البنیان کو اللہ تعالیٰ نے اِس قدر ہمّت عطا فرمادی کہ اس موضوع پر کام کرنے کی سعادت میسّر ہوتی گئی۔

(ب) اگرچہ حضرت قدس سرہ العزیز کے حالات پر آپ کی حیاتِ طیبہ ہی میں اجمالاً اور تفصیلاً لکھنے کی سعادت بعض اہلِ قلم کو حاصل رہی ہے مگر اُن میں سے کچھ کتابیں تو آج نایاب ہیں اور کچھ کمیاب ہیں اور بعض تک رسائی مشکل ہے، اِس لیے حضرتؒ کی زندگی کے سب حالات کا احاطہ مشکل امر تھا۔

(ج) حضرت رحمہ اللہ کی حیاتِ مبارکہ کے کئی شُعبے متنوع حیثیّت کے ہیں۔ تدریس و تعلیم، تبلیغ و ارشادات، احسان و سلوک اور سیاسیاتِ ملکی میں نہ صرف شرکت بلکہ راہنمائی وغیرہا ایسے شعبے ہیں جن کے لیے اُن کے متعلقہ لٹریچر کا مطالعہ کرنا ضروری تھا جن کا مہیا کرنا بذاتِ خود ایک مشکل امر تھا۔

مگر اِن سب عوائق کے باوجود اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے یہ کتاب اختصار کے باوجود اِس قدر جامع ہوگئی کہ حضرت قدس سرہا العزیز کے حالات پر اس قدر جامع کتاب

تاحال شائع نہ ہوسکی ، دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرما کر حضرتؒ کے خُدّام اور عامۃ المسلمین کو نورِ بصیرت سے نوازے ۔ آمین

آخر میں احقر اُن تمام احباب اور اعزّہ کا شکر گذار ہے جنہوں نے ترتیبِ کتاب اور طباعت و اشاعت کے مراحل میں اعانت فرمائی ہے، اللہ تعالےٰ سب کو جزائے خیر سے نوازے اور حضرتؒ کے علوم و فیوض سے حظِّ وافر عطا فرما کر اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْن کے فلاح یافتہ گروہ میں داخل فرمائے ۔ آمین

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

(قاضی) محمد زاہد الحسینی

جمادی الثانی ۱۴۱۵ھ / نومبر ۱۹۹۴ء

ماخذ چراغِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

نمبر شمار	نام کتاب
۱	القرآن الکریم ——— مشکوٰۃ شریف
	تالیفاتِ شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ
۲	اسیرِ مالٹا
۳	الشہاب الثاقب
۴	مکتوباتِ شیخ الاسلامؒ (۴ جلد)
۵	نقشِ حیات (۲ جلد)
	دیگر کتب
۶	آبِ کوثر از شیخ محمد اکرام
۷	ابوالکلام آزادؒ از افضل حق قریشی
۸	آپ بیتی از شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ
۹	آپ بیتی از مولانا احتشام الحق تھانویؒ
۱۰	آثارِ رحمت از مولانا امداد صابریؒ
۱۱	ارمغانِ حجاز از علامہ ڈاکٹر محمد اقبال
۱۲	السیرۃ النبویہ از مولانا ابوالحسن علی ندوی
۱۳	الطرائف والظرائف از حکیم الامت حضرت تھانویؒ
۱۴	اعترافِ تقصیر (توبہ نامہ) پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ
۱۵	امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی پیش گوئی
۱۶	ائمہ تلبیس از مولانا رفیق احمد دلاوریؒ
۱۷	الیسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء از مفتی انتظام اللہ شہابیؒ
۱۸	بانگِ درا از علامہ ڈاکٹر محمد اقبال
۱۹	باقیاتِ اقبال
۲۰	برِصغیر پاک و ہند میں چار ہمعصر تحریکات از قاضی محمد حنیف
۲۱	بہادر شاہ ظفر اور اس کا عہد
۲۲	پرانے چراغ از مولانا ابوالحسن علی ندوی
۲۳	تاریخ الادب العربی از بروکلن
۲۴	تاریخ دارالعلوم دیوبند از قاری محمد طیب صاحبؒ
۲۵	تاریخ دارالعلوم (۲ جلد) از سید محبوب رضوی
۲۶	تجلیاتِ عثمانی از پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی
۲۷	تحریکِ شیخ الہندؒ از مولانا سید محمد میاںؒ

نمبر شمار	نام کتاب	نمبر شمار	نام کتاب
۲۸	تحریکِ ہجرت از شاہد حسین	۴۹	سرگذشتِ اقبال از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید
۲۹	تذکرۃ الرشید از مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ	۵۰	سراج الاولیاء از مولانا قاضی محمد زاہد الحسینیؒ
۳۰	تذکرہ صوفیائے بنگال از اعجاز الحق قدوسی	۵۱	سوانح قاسمی ۲ جلد از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۳۱	تذکرہ شاہ عبدالغفور عباسیؒ از کرنل فیوض الرحمٰن	۵۲	سیرتِ مسیح موعود از عرفانی
۳۲	تذکرۃ المفسرین از مولانا قاضی محمد زاہد الحسینیؒ	۵۳	سیاست کے فرعون از وکیل انجم
۳۳	تقسیمِ ہند افسانہ اور حقیقت از ایچ ایم سیروائی	۵۴	شمائلِ ترمذی مع الخصائل
۳۴	تکملۃ الاعتدال از شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ	۵۵	شاہراہِ پاکستان از چوہدری خلیق الزمان
۳۵	جلیانوالہ باغ از ابوالہاشم ندوی	۵۶	شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ۔ از فرید الوحیدی
۳۶	جمعیۃ العلماء ہند از محترمہ روزینہ پروین	۵۷	شیخ الاسلام کے حیرت انگیز واقعات۔ از ابوالحسن بارہ بنکوی
۳۷	حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور ان کے خلفاء از کرنل فیوض الرحمٰن	۵۸	شیخ الاسلام کے حیات و کارنامے از ڈاکٹر رشید الوحیدی
۳۸	حقائق السنن از شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ	۵۹	شیخ اسلام حضرت مدنیؒ ایک سیاسی مطالعہ از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری
۳۹	حکایات و عملیاتِ مدنیؒ از اعجاز احمد سنگھانوی	۶۰	طبقات کبریٰ۔ از امام سبکیؒ
۴۰	حیاتِ شیخ الہندؒ از حضرت میاں سید اصغر حسینؒ	۶۱	علماء ہند کا شاندار ماضی از مولانا سید محمد میاں
۴۱	حیاتِ عثمانیؒ از پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی	۶۲	علماء سرحد کی تصنیفی خدمات از کرنل فیوض الرحمٰن
۴۲	حیاتِ شیخ الاسلام از مولانا سید محمد میاںؒ	۶۳	غلام رسول مہر اور پاکستان سکیم از پیر علی محمد راشدی
۴۳	خدوخالِ اقبال از محمد امین زبیری		
۴۴	خونِ حرمین از سید عبدالغفور شاہ	۶۴	فتنۂ مودودیت از ابوالمظفر محمد بدرالدین بدر
۴۵	دارالعلوم کی روئیداد۔ ۱۹۳۳ء	۶۵	فیوض الحرمین از شاہ ولی اللہ دہلویؒ
۴۶	دعوتِ دین از امین احسن اصلاحی	۶۶	قائد اعظم محمد علی شخصیت و کردار پروفیسر کرم حیدری
۴۷	ذکرِ طیب		
۴۸	رحمتِ کائنات از مولانا قاضی محمد زاہد الحسینیؒ	۶۷	قائد اعظم محمد علی خطوط کے آئینے میں از خواجہ رضی حیدر

نمبر شمار	نام کتاب
٦٨	کشکولِ معرفت از مولانا عبدالقیوم حقانی
٦٩	محبِ وطن اقبال از مظفر حسین برنی
٧٠	مدینہ منورہ از ڈاکٹر صالح لمعی مصطفٰے (بیروت)
٧١	مردِ مومن از عبدالحمید خان
٧٢	مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب از مولانا ابوالکلام آزاد
٧٣	مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کا نقصان از مولینا ابوالحسن علی ندوی
٧٤	مسافرانِ لندن از سر سید احمد خان
٧٥	مسلم لیگ کا دورِ حکومت از ڈاکٹر صفدر محمود
٧٦	مشائخِ دیوبند از مفتی عزیزالرحمٰن بجنوری
٧٧	مقدمہ سوانح قاسمی از مولانا مناظر احسن گیلانی رح
٧٨	مقاماتِ قصلیبہ از محمد اسلم
٧٩	مکاتیبِ رشیدیہ از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رح
٨٠	مکاتیب سر محمد اقبال بنام سید سلیمان ندوی رح
٨١	مئے لالہ فام از جسٹس (ر) جاوید اقبال
٨٢	وفود القبائل از ڈاکٹر حسن جبر

جرائد و رسائل

(ماهنامے)

نمبر شمار	نام کتاب
٨٣	اردو ڈائجسٹ ۔ لاہور
٨٤	الارشاد، اٹک شہر
٨٥	البلاغ، بمبئی
٨٦	البلاغ، کراچی
٨٧	الحرم، میرٹھ (بھارت)
٨٨	الحق، اکوڑہ خٹک
٨٩	الحسن، لاہور
٩٠	الخیر، ملتان
٩١	الصدیق، ملتان
٩٢	الفرقان، لکھنؤ
٩٣	النصیحۃ، چارسدہ
٩٤	برہان، دہلی
٩٥	تذکرہ، دیوبند
٩٦	شریعت، نہٹور (بھارت)
٩٧	عرفات، لاہور
٩٨	قاسم العلوم، دیوبند
٩٩	معارف، اعظم گڑھ
١٠٠	میثاق، لاہور
١٠١	ندائے شاہی، مرادآباد
١٠٢	نقوش خطوط نمبر، لاہور
١٠٣	نقیبِ ختمِ نبوت، ملتان

هفت روزہ

نمبر شمار	نام کتاب
١٠٤	آئینہ دارالعلوم، دیوبند

نمبر شمار	نام کتاب
۱۰۵	استقلال، دیوبند
۱۰۶	چٹان، لاہور
۱۰۷	خدام الدین، لاہور
۱۰۸	صدقِ جدید، لکھنؤ
۱۰۹	کوثر، لاہور
۱۱۰	مدینہ، بجنور
۱۱۱	ہریجن سیوک
	سہ روزے
۱۱۲	زمزم، لاہور
	روزنامے
۱۱۳	الجمعیۃ، دہلی
۱۱۴	آزاد، لاہور
۱۱۵	انصاری، دہلی
۱۱۶	جنگ، راولپنڈی
۱۱۷	خبریں، راولپنڈی
۱۱۸	نوائے وقت، لاہور
۱۱۹	نئی دُنیا، دہلی

(ف) جرائد و رسائل میں سے ماہنامہ عرفات لاہور، ہفت روزہ استقلال دیوبند، سہ روزہ زمزم لاہور اور روزنامہ آزاد لاہور اب بند ہو چکے ہیں۔

حیاتِ مدنی نور اللہ مرقدہٗ کا خلاصہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

- اسم گرامی : سید حسین احمد — تاریخی نام : چراغ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
- والد ماجد : سید حبیب اللہ (نور اللہ مرقدہٗ)
- ولادت باسعادت : سنہ ۱۲۹۶ھ / سنہ ۱۸۷۹ء
- داخلہ دار العلوم دیوبند : سنہ ۱۳۰۹ھ / سنہ ۱۸۹۱ء
- فراغت : سنہ ۱۳۱۶ھ / سنہ ۱۸۹۷ء
- دستار بندی : سنہ ۱۳۲۸ھ / سنہ ۱۹۱۰ء
- بیعت قطب الارشاد حضرت گنگوہیؒ : سنہ ۱۳۱۶ھ
- اعطاء خلافت : سنہ ۱۳۳۹ھ / سنہ ۱۹۲۱ء
- ہجرتِ مدینہ منورہ : سنہ ۱۳۱۶ھ / سنہ ۱۸۹۹ء
- قیام مدینہ منورہ : ۱۴ سال
- اسارتِ مالٹا : تین سال سات مہینے
- رہائی : ۲۰ رمضان سنہ ۱۳۳۸ھ مطابق ۸ جون سنہ ۱۹۲۰ء
- مقدمہ کراچی میں اسارت : ۲ سال قید بامشقت
- قیام سلہٹ بطورِ شیخ الحدیث : ۶ سال
- آمد دار العلوم دیوبند بطور شیخ الحدیث : سنہ ۱۳۴۶ھ تا وقتِ وفات (۳۲ برس)
- اسارتِ مراد آباد (دو بار) : جون سنہ ۱۹۴۲ میں چھ ماہ قید بامشقت پھر توسیع غیر معینہ مدت کے لیے
- صدارت جمعیۃ العلماء ہند : از سنہ ۱۹۴۳ء تا وفات
- رحلت : ۱۳ جمادی الاول سنہ ۱۳۷۷ھ / ۵ دسمبر سنہ ۱۹۵۷ء
- تلامذہ حدیث : ۴۴۸۳ — مجازِ طریقت خلفاء : ۱۶۷ — مزارِ پر انوار : دیوبند

ہیں عام ہمارے افسانے دیوارِ چمن سے زنداں تک